درسِ تفسیر
تبیان الفرقان
الجزء الرابع
افادات
شیخ التفسیر مولانا
عبد المجید لدھیانوی
امیر مرکزیہ
بانی مجلس تحفظ ختم نبوت

تبیانُ الفرقان

فہرست

سورۃ الاعراف

الٓمّٓصٓ ۚ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَرِیۡشًا

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِىٍّ

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا

اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ سَیَنَالُهُمۡ غَضَبٌ

وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡیَةِ الَّتِیۡ كَانَتۡ حَاضِرَةَ الۡبَحۡرِ

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ

سورۃ الانفال

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً

وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ

سورۃ التوبۃ

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ

عرض مدعا

اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل وکرم اور محض اسی کی توفیق سے (بندہ کا اس میں کوئی کمال نہیں) استاذ مکرم، حکیم العصر حضرت الشیخ مولانا عبدالمجید صاحب لدھیانی دامت برکاتہم العالیہ امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی درسی تفسیر ''تبیان الفرقان'' کی چوتھی جلد (جو سورۃ الاعراف، سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ پر مشتمل ہے) کو شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس حقیر پُرتقصیر کی اس کوشش کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول فرمائیں اور عوام الناس کے لیے ہدایت وراہنمائی کا ذریعہ بنائیں اور جن حضرات نے اس کی تیاری (کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، چھپائی وغیرہ) میں حصہ لیا اور اس کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اپنی قیمتی آراء سے نوازا اور اس میں معاون بنے ان کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنی شایان شان اجر عطا فرمائیں (آمین)

دعا گو

ابوطلحہ ظفر اقبال غفرلہ

اٰیاتها ۲۰۶ | ۷ سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ ۳۹ | رکوعاتها ۲۴

سورۃ اعراف مکی ہے اس کی ۲۰۶ آیات اور ۲۴ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓصٓ ۚ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ

المص ﴿۱﴾ یہ کتاب ہے جو اتاری گئی ہے تیری طرف پس نہ ہو تیرے سینے میں تنگی

مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ

اس کتاب کی طرف سے تاکہ تو ڈرائے اس کے ساتھ اور نصیحت کرے اس سے نصیحت کرنا مومنین کے لیے ﴿۲﴾ پیروی کرو اس چیز کی جو اتاری گئی

اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا

تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نہ پیروی کرو اللہ کو چھوڑ کر اولیاء کی، تم لوگ بہت کم نصیحت

تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ

حاصل کرتے ہو ﴿۳﴾ اور کتنی ہی بستیاں ہیں ہم نے ان کو ہلاک کر دیا پس آگیا اس بستی کے پاس ہمارا عذاب اس حال میں کہ وہ لوگ رات گزارنے والے تھے

هُمْ قَآئِلُوْنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ

یا وہ دوپہر کو آرام کرنے والے تھے ﴿۴﴾ پس نہیں تھی ان کی پکار جب ان کے پاس ہمارا عذاب آیا مگر

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ

یہی کہ کہا انہوں نے بے شک ہم ہی قصوروار تھے ﴿۵﴾ پس البتہ ضرور پوچھیں گے ہم ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے

وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّ مَا كُنَّا

اور البتہ ضرور سوال کریں گے ہم ان لوگوں سے جو بھیجے گئے ﴿۶﴾ پھر البتہ ضرور بیان کریں گے ہم ان لوگوں پر اپنے علم کے ساتھ اور بے شک ہم

غَآئِبِيْنَ ﴿۷﴾ وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ

چھپنے والے نہیں تھے ﴿۷﴾ جس دن یہ واقعات پیش آئیں گے اس دن وزن حق ہے پس وہ شخص کہ بھاری ہو گیا اس کا ترازو

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ

پس یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿۸﴾ اور وہ لوگ کہ ہلکے ہو گئے جن کے ترازو پس یہی لوگ ہیں

الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ﴿۹﴾

جنہوں نے خسارے میں ڈالا اپنے نفسوں کو بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات پر ظلم کیا کرتے تھے ﴿۹﴾

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا

البتہ تحقیق ہم نے تمہیں ٹھکانہ دیا زمین میں اور بنائے ہم نے تمہارے لیے اس زمین میں تمہاری زندگی کے لیے اسباب تم بہت کم

مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۰﴾ ع

شکر ادا کرتے ہو ﴿۱۰﴾

تفسیر:

مکی، مدنی سورتوں کی تقسیم اور اس کا مفہوم:

سورۂ اعراف مکی ہے اور مکی کا مطلب یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دو حصے ہیں، ایک حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کہلاتا ہے اور ایک حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کہلاتا ہے، جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول شروع ہوا تھا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تھے اور وحی کا نزول شروع ہونے کے بعد تیرہ سال تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں رہے اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور ہجرت فرمانے کے بعد مدنی زندگی کا آغاز ہوا، مدینہ منورہ میں تشریف لے جانے کے بعد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دس سال حیات رہے، اس عالم ظاہر میں دس سال تک زندہ رہے یہ تیئس سال کا عرصہ ہے جس میں قرآن کریم اترا تو پہلے تیرہ سال ہجرت سے قبل کے یہ آپ کی زندگی مکی کہلاتی ہے اور ہجرت کے بعد دس سال یہ آپ کی زندگی مدنی کہلاتی ہے۔

قرآن کریم تیئس سال میں اترا ہے بہت سا حصہ اس کا مکہ معظمہ میں اترا ہے اور کثیر حصہ اس کا مدینہ منورہ میں اترا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ میں تشریف لے جانے کے بعد، تو جو قرآن کریم کی آیات یا سورتیں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں خواہ وہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہوں یا مکہ معظمہ کے باہر کسی سفر میں لیکن ہجرت سے پہلے

نازل ہوئی ہیں ان کو مفسرین کی اصطلاح میں مکی سورتیں کہا جاتا ہے تو مکی سورت کا یہ معنیٰ نہیں کہ یہ مکہ میں اتری ہے بلکہ مکی سورت کا مطلب یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں اتری چاہے مکہ شہر میں اتری ہو چاہے شہر سے باہر کسی سفر میں اتری ہو، تو "سورۃ الاعراف مکیۃ" کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ سورۃ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمانے سے پہلے نازل ہوئی ہے یعنی یہ آپ کی مکی زندگی میں اتری ہے۔

اور جن سورتوں کے شروع میں لکھا ہوگا "مدنیۃ" اب اس کا مطلب سمجھ میں آگیا کہ "مدنیۃ" وہ سورتیں ہوں گی جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے کے بعد آپ کی مدنی زندگی میں اتری ہیں تو سورۃ مدنیہ کا یہ مطلب ہے کہ یہ وہ سورت ہے جو کہ ہجرت کے بعد اتری ہے پھر چاہے مدینہ منورہ شہر میں اتری ہو اور چاہے کسی سفر کے دوران میں اتری ہو حتیٰ کہ اگر آپ حجۃ الوداع کے لیے تشریف لائے یا فتح مکہ کے لیے تشریف لائے مکہ معظمہ شہر میں بھی جو آیات اتری ہوں گی وہ بھی مدنی کہلائیں گی کیونکہ مدنی کا یہ معنیٰ نہیں کہ مدینہ شہر میں اتریں بلکہ مدنی کا معنیٰ یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں اتری ہیں اس دور میں اتریں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تو "مدنیۃ" اور "مکیۃ" یہ دو قسم کے الفاظ سورتوں کے شروع میں آئیں گے ان کا مطلب اس طرح سے سمجھ لو ایک دفعہ جو بات سمجھا دی جائے پھر اس کو بار بار کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تو سورۃ الاعراف یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کے اندر نازل ہوئی ہے یعنی ہجرت سے قبل۔

مکی سورتوں کے مضامین کا خلاصہ:

یہ سورۂ اعراف ہے اور اس کے متعلق آپ کے سامنے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ مکی ہے، قرآن کریم میں آپ تفصیل کے ساتھ پڑھیں گے کہ مکی سورتوں میں احکام زیادہ تر نہیں ہیں، مدنی سورتوں میں احکام ہیں، اور مکی سورتوں میں زیادہ تر خطاب مشرکین مکہ کو ہے اور مدنی سورتوں میں زیادہ تر خطاب اہل کتاب کو ہے یہود و نصاریٰ کو اور مشرکین کو بھی خطاب ہے لیکن نسبتاً کم اور مکی سورتوں میں زیادہ تر خطاب مشرکین کو ہے اور اہل کتاب کا ذکر بھی آتا ہے لیکن نسبتاً کم۔

مکی سورتوں میں زیادہ تر اصول ذکر کیے گئے ہیں، اصول کا معنیٰ بنیادی عقائد، سب سے بڑا مختلف فیہ مسئلہ جو مشرکین کے ساتھ تھا وہ توحید ہے اور اسی طرح وہ لوگ آخرت کے قائل نہیں تھے، مرنے کے بعد جی اٹھنے

کے قائل نہیں تھے، اور ایسے ہی وہ رسالت کے منکر تھے کہ انسانوں کی طرف انسان اللہ تعالیٰ کا رسول بن کر آجائے، یہ بات ان کے خیالات میں صحیح نہیں تھی اور یہی ایمان کے تین بنیادی رکن ہیں توحید، رسالت اور معاد تو مکی سورتوں میں زیادہ تر اللہ تعالیٰ نے انہیں عقائد کو ذکر کیا ہے۔

توحید کو ثابت کرنے کے لیے دلائل دیے ہیں اور توحید کے بارے میں جو ان کے شبہات تھے جن کی بناء پر وہ شرک کرتے تھے ان کو رد کیا ہے تو اثبات توحید اور رد شرک، آخرت کے واقع ہونے کے متعلق دلائل دیئے کہ آخرت ضروری ہے اور وہ ہوگی اور وہ کہتے تھے کہ مرنے کے بعد مٹی ہو جانے کے بعد جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو دوبارہ زندہ کون کرسکتا ہے تو گویا کہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اوپر شبہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی آخرت کا ذکر کیا ہے وہاں زیادہ تر اپنی قدرت کو واضح کیا ہے کہ میرے لیے یہ کوئی مشکل نہیں کہ جب میں ایک دفعہ انسان کو پیدا کر چکا تو دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل نہیں ہے، مختلف انداز اختیار کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس قدرت کو واضح کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ آخرت ہوگی اور آخرت میں اللہ کے سامنے ہر کسی نے پیش ہونا ہے اور اپنی زندگی کا حساب دینا ہے۔

اور پھر یہ مخلوق اور اللہ کے درمیان میں واسطہ انبیاء ﷩ اور رسل کا جو قرار پایا ہے کہ براہ راست انسان اللہ تعالیٰ کے احکام معلوم نہیں کر سکتا ہے اور نہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ ہر کسی کو خود بتاتا پھرے کہ میرا یہ حکم ہے اور میرا یہ کام ہے تم پر کرو، یہ بات اللہ تعالیٰ کی عظمت کے منافی ہے، اور نہ ہر انسان کے اندر یہ صلاحیت ہی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے براہ راست احکام لے لے، اور عقل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے کیا نہیں چاہتا؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کی وجہ سے اپنی حکمت کے ساتھ مخلوق اور اپنے درمیان واسطہ قرار دیا ہے رسولوں کو اور رسولوں تک اپنی کلام اکثر و بیشتر فرشتوں کی وساطت سے پہنچائی تو گویا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام مخلوق تک جو پہنچتے ہیں تو اس کے درمیان دو واسطے ہیں ایک واسطہ فرشتوں کا ہے اور ایک واسطہ انبیاء ﷩ کا ہے تو ان دونوں واسطوں کو اللہ تعالیٰ نے خوب اچھی طرح ثابت کیا کہ یہ دونوں بالکل ثقہ واسطے ہیں، قابل اعتماد ہیں یہ کوئی کسی قسم کی گڑبڑ نہیں کرتے، اپنی طرف سے کوئی اس میں آمیزش نہیں کرتے اور نہ رسولوں کے اندر جرأت ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اس کے خلاف بیان کریں یا اس میں کوئی اپنی طرف سے آمیزش کریں ان دونوں باتوں کو قرآن کریم کے اندر خوب اچھی طرح سے واضح کر کے ذکر کیا گیا ہے یہ دونوں واسطے قابل

اعتماد ہیں اس لیے فرشتے لے کر آئے انبیاء علیہم السلام پر، انبیاء علیہم السلام نے آگے تمام انسانوں میں جو واضح کیا وہی صحیح دین ہے جو اس وساطت کے ساتھ اللہ کی طرف سے بندے تک پہنچا ہے۔

پھر ان اصولوں کے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مکی سورتوں میں انسان کو متاثر کرنے کے لیے ترغیب و ترہیب کا سلسلہ ہے ترغیب کا معنی ہے رغبت دلانا، بسا اوقات انسان رغبت دلانے سے متاثر ہوتا ہے کہ اگر تم مان جاؤ گے تو دنیا کے اندر تمہیں یہ راحت پہنچے گی، دنیا میں تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کے یہ انعامات ہوں گے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح سے حور و قصور دے گا اور آخرت کی نعمتیں یوں ملیں گی یہ ترغیب کا شعبہ ہے اور ترہیب کا مطلب یہ ہے کہ ڈرایا کہ اگر نہیں مانو گے تو نہ ماننے کی صورت میں دنیا میں تباہ کر دیے جاؤ گے جس طرح سے پچھلی تاریخ دہرا کر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ دیکھو! انبیاء علیہم السلام پہلے آئے تھے اور ان کی باتیں جن لوگوں نے نہیں مانیں ان کو کس طرح مختلف عذابوں کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا اس لیے پہلی امتوں کے ہلاک کیے جانے کے واقعات مکی سورتوں کے اندر بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور سورۂ اعراف میں بھی آپ کے سامنے بہت تفصیل کے ساتھ آرہے ہیں اور ایسے ہی آخرت کی ترہیب ہے دوزخ کو ذکر کر کے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کی بات نہیں مانو گے تو آخرت میں تمہارے ساتھ اس طرح سے ہوگا، یوں عذاب ہوگا جہنم کے قصے جو سنائے ہیں وہ انسان کو متاثر کرنے کے لیے ہیں یہ ترغیب و ترہیب کہلاتا ہے تو یہ ساتھ ساتھ انسان کے دماغ کو سازگار کرنے کے لیے ہے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ باتوں کو تسلیم کر لے اور کج روی اختیار نہ کرے یہ قرآن کریم کا حصہ اس طرح سے آگیا۔

اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے ترغیب جہاں دی ہے تو اپنے دنیاوی احسانات بھی شمار کرائے ہیں، احسانات کے ساتھ بھی متاثر کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ انسان کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ یہ احسان سے متاثر ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے "اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ" یہ انسان احسان کا بندہ ہے، اگر کسی کی طبیعت میں ذرہ برابر بھی شرافت موجود ہو تو محسن کی انسان قدر کیا کرتا ہے اور اس کے سامنے آنکھ نہیں اٹھایا کرتا، احسان کرنے والے کے سامنے آنکھ اٹھانا یا اس کے سامنے اکڑ جانا یا اترانا یہ انسانیت سے بعید ایک جہالت ہے اور شیطنت ہے ورنہ فطرت انسانی کا تقاضہ یہ ہے کہ محسن کے سامنے اس کا سر جھک جاتا ہے اور وہ اپنے محسن کی قدر کرتا ہے اور اس کی بات کو مانتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے کثرت کے ساتھ اپنے احسانات کو بیان فرمایا۔

شخصی طور پر بھی جو اللہ تعالیٰ نے بدن میں احسان کیے کہ آنکھ دی، ناک دیا، کان دیے اور زبان دی اور اسی

طرح دوسری صلاحیتیں دی ہیں اور مادی طور پر بھی اللہ تعالیٰ نے کس طرح سے تمہارے لیے زمین کا دسترخوان بچھا دیا، یہ زمین اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا گودام ہے، اس میں تمہیں چھوڑ دیا تم اپنی مرضی کے ساتھ ضروریات اس میں سے نکالتے جاتے ہو کھاتے جاتے ہو اللہ تعالیٰ کا یہ گودام ختم ہونے میں نہیں آتا یہ علیحدہ بات ہے کہ تم اپنی سستی کی بناء پر نکالو نہیں یا تم جہالت کی بناء پر نکالنے کا طریقہ نہ جانو ورنہ اس میں سے جو نکالنا چاہو وہ نکلتا ہے اور نکالتے جاؤ اور کھاتے جاؤ کتنا بڑا اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، پھلوں کے نام شمار کروائے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ بنایا، یہ بنایا پانی، ہوا، آگ تک کو ذکر کیا، یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے انعام کے طور پر قائم کی ہیں یہ مادی احسانات ذکر کیے ہیں۔

روحانی احسانات ذکر کیے کہ اللہ نے تمہیں کس طرح مکرم بنایا، عزت دی فرشتوں کو سلام کرنے کے لیے تمہارے باپ کے سامنے جھکا دیا، تم اتنے باعزت لوگ ہو، اتنے مکرم ہو پھر شیطان تمہارے اوپر حسد کر کے اس طرح سے تمہارا دشمن بنا تو تم اپنی شرافت کو یاد رکھو جو شریف ہوا کرتے ہیں وہ ہمیشہ اپنی شرافت کی رعایت رکھا کرتے ہیں، وہ رذیل اور کمینی حرکتیں نہیں کیا کرتے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک بھنگی اور جمعدار سڑک کے اوپر جھاڑو دیتا ہوا شرماتا نہیں ہے کیونکہ اس کے سامنے اس کا وہی منصب ہے لیکن اگر محلے کے چوہدری کو کہہ دیا جائے کہ آج سڑک کے اوپر جھاڑو دو تو وہ شرم کے مارے پسینہ پسینہ ہو جائے گا اور اپنے اندر وہ ہمت اور طاقت نہیں پائے گا کہ راستے سے وہ گند اٹھاتا پھرے، نالیاں صاف کرتا پھرے اور جھاڑو دیتا پھرے اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا منصب نہیں ہے تو اپنے منصب کے مطابق حرکت کرنی آسان ہوتی ہے اور اپنے منصب کے خلاف کسی قسم کا کردار اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ انسان کو اس کا منصب یاد دلاتا ہے کہ تم تو اس طرح سے مکرم ہو، مشرف ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، تم تو مسجود ملائک ہو، اللہ نے تمہارے سامنے فرشتوں کو جھکا دیا تو اگر تم اس قسم کی حرکتیں کرو کہ شیطان کو بھی دیکھ کر شرم آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے منصب سے واقف نہیں ہو تو اللہ تعالیٰ نے روحانی انعامات جو کیے ہیں وہ بھی یاد دلاتا ہے، مکی سورتوں کے اندر زیادہ تر یہی مضامین ہیں اور یہی مضامین آپ کے سامنے سورۃ اعراف کے اندر تفصیل کے ساتھ آرہے ہیں۔

حروف مقطعات کا مفہوم:

"المص" یہ حروف مقطعات ہیں ان کو علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھا جاتا ہے، توڑ توڑ کے پڑھا جاتا ہے، اور یہ

مفسرین کے نزدیک متشابہات میں داخل ہیں، متشابہات قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جن کا معنیٰ سرور کائنات ﷺ کی طرف سے ہمارے سامنے واضح نہیں کیا گیا، یہ حروف بھی ایسے ہی ہیں کہ ان کا مفہوم آپ ﷺ نے بیان نہیں فرمایا، کسی صحیح روایت کے اندر نہیں آتا اس لیے جب یہ الفاظ آتے ہیں تو ترجمہ کرنے والے یوں کہہ دیں گے "اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِکَ الْحُرُوْفِ" ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں ہمارے سامنے ان کا مفہوم ذکر نہیں کیا گیا ہے اس لیے ان کا کوئی ترجمہ نہیں کیا جائے گا یہ اسی طرح سے آئیں گے "المص" یہ حروف مقطعات ہیں، ہم یقینی طور پر ان الفاظ کا مفہوم بیان نہیں کر سکتے، باقی جن لوگوں نے کچھ تاویلات کر کے ان کا مفہوم بتانے کی کوشش کی ہے وہ اجتہادی باتیں ہیں، وہ ایک تاویل ہے اس کے اوپر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

حضور ﷺ کا امت کے لیے تڑپنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی:

سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی عظمت کو بیان کیا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے اتاری گئی حضور ﷺ کی طرف، اللہ کی طرف سے آئی جب اللہ کی طرف سے آئی تو حضور ﷺ پر ذمہ داری عائد ہوگئی کہ آپ اس کے ذریعے سے لوگوں کو سمجھائیں اور جہالت سے، کفر سے، شرک سے نکال کر سیدھے راستے کی طرف لائیں اور آپ کے دل میں مخلوق کے لیے شفقت بھی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی اور رسول اللہ ﷺ کو اس طرح سے یقین ہوتا ہے اللہ کی باتوں کا جس طرح سے دوپہر کے وقت آنکھوں والے انسان کو سورج کا یقین ہوتا ہے کہ سورج چڑھا ہوا ہے اس لیے اللہ نے یہ کہہ دیا کہ اس غلط راستے پر چلنے والے ہلاک ہوں گے دوسرا آدمی کوئی شک کرے تو کرے رسول کو شک نہیں ہوتا، وہ سمجھتا ہے کہ اس راستے پر جو چلا جا رہا ہے یقیناً آگے گڑھے میں گرے گا پھر جب اس چلنے والے کے ساتھ محبت بھی ہو، اس کے ساتھ تعلق بھی ہو تو اس کو سمجھانے میں انسان کسی قسم کی کمی نہیں کرتا وہ صبح شام، رات دن اس کے پیچھے پڑتا ہے کہ کسی طرح یہ اپنے نفع ونقصان سے واقف ہو جائے لیکن آگے انسان جاہل ایسا ہوتا ہے کہ بار بار سمجھانے کے باوجود سمجھتا نہیں تو اس سے حضور ﷺ کو بہت تکلیف ہوتی تھی اتنی تکلیف ہوتی تھی کہ آپ غم کے اندر مبتلاء تھے اور اس غم کے اندر گھلتے جاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بار بار تسلی دی ہے جیسا کہ سورۂ اعراف کے اندر لفظ آئیں گے "لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا" کہ ایسے لگتا ہے کہ آپ تو اپنے آپ کو ہلاک ہی کر دیں گے ان کے پیچھے اگر یہ

ایمان نہ لائے تو یہ جو غم کی کیفیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کے اوپر طاری ہوتی تھی لوگوں کے نہ ماننے کی وجہ سے اور اس کتاب کی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بار بار تسلی دی ہے، تو یہ لفظ بھی تسلی کے ہیں کہ اس کتاب کے بارے میں آپ کے دل میں تنگی نہ ہو، آپ کا کام تو انذر ہے اور یہ تو ایمان لانے والوں کے لیے نصیحت ہے اور آپ انذر کر رہے ہیں کہ کتاب ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں اگر کوئی شخص اپنے انجام سے نہیں ڈرتا یا اس کتاب سے کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتا تو آپ کیوں غم کرتے ہیں، آپ کی ذمہ داری پوری ہوگئی اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے۔

آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے دل میں اس بات کی کتنی فکر اور کتنی اہمیت ہوتی تھی کہ انسان سیدھے راستے پر آجائیں اور ان کے نہ سمجھنے سے کتنا غم ہوتا ہے، ہم تو صرف اپنے نفع و نقصان کو جانتے ہیں اور وہ ساری مخلوق کے خیر خواہ بن کر آتے ہیں جیسے وہ اردو کا شعر آتا ہے کہ

خنجر چلے کسی پہ تو تڑپتے ہیں ہم غریب لوگ
سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں ہے

یہ تو اس نے کوئی تکلف ہی کیا ہوگا، بناوٹ ہی کی ہے، کون کسی کے لیے تڑپتا ہے؟ خنجر کسی پر چلے اور تڑپے کوئی یہ کچھ مبالغہ ہے لیکن انبیاء علیہم السلام پر یہ بات صحیح معنوں میں صادق آتی ہے کہ ایک آدم کا بچہ بھی اگر اپنے لیے جہنم اختیار کرتا ہے اور جہنم کے راستے پر چلتا ہے تو انبیاء علیہم السلام بھی اسی طرح تڑپتے ہیں جس طرح کوئی ذاتی نقصان پر تڑپتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی دی گئی کہ آپ اس تنگی میں نہ پڑیے سورۃ طٰہٰ میں لفظ آئے گا "مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى" ہم نے آپ پر قرآن اس لیے تو نہیں اتارا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں، یہ کیا رات دن، صبح شام رونا دھونا، قوم کے پیچھے ہر وقت پھر رہے ہو آپ کی تو زندگی اجیرن ہو رہی ہے، ہم نے کوئی قرآن آپ پر اس لیے اتارا ہے کہ آپ اتنی مشقت میں پڑ جائیں؟ یہ سب تسلی کے الفاظ ہیں تو یہ بھی اسی طرح سے تسلی ہے کہ آپ کے دل میں اس کتاب کی طرف سے کوئی کسی قسم کی تنگی نہ ہو، یہ تو اس لیے اتاری گئی ہے تا کہ آپ اس کے ذریعے سے ڈرائیں۔

انذار ایسے ڈرانے کو کہا کرتے ہیں جو شفقت سے ناشی ہوتا ہے اور ڈرانا دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو پولیس والے دھمکاتے ہیں اور ایک ماں باپ دھمکایا کرتے ہیں تو آپ کے نزدیک دونوں کے دھمکانے کا فرق ہے یا نہیں

ہے؟ ماں باپ کا جو دھمکانا ہے یہ انذار ہے یعنی شفقت سے ناشی ہوتا ہے وہ اس نقصان کا تصور کر کے جو آپ کو پہنچنے والا ہے وہ برداشت نہیں کر سکتے اس لیے وہ کہتے ہیں کہ کسی طرح بچے پر سختی کریں تو شاید سیدھا ہو جائے تو جو ڈرانا شفقت کی بناء پر ہوتا ہے مستقبل کے نقصان سے اور مستقبل میں کسی نیکی کی طرف لانا ہوتا ہے اس کو کہتے ہیں انذار اور سرور کائنات ﷺ کا ڈرانا ایسے ہی تھا۔

اور یہ کتاب نصیحت ہے مؤمنین کے لیے، نصیحت تو سارے جہان کے لیے ہے "ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ" لیکن فائدہ چونکہ مومنین اٹھاتے ہیں اس لیے یہاں مؤمنین کا ذکر کر دیا، ایمان لانے والے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس لیے "ذِكْرٰى" کو خاص کر دیا گیا مؤمنین کے ساتھ۔

قرآن کریم کی اتباع کا حکم:

"اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ" جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا، اتاری یہی کتاب گئی جس کا ذکر آیا یہ اللہ کی طرف سے قانون اور قاعدہ ہے، یہ اللہ کی طرف سے طرز عمل ہے، طرز زندگی ہے جو آپ نے اختیار کرنا ہے اس کی پیروی کرو اور من گھڑت اولیاء جو تم نے اپنی طرف سے کارساز بنا لیے، جو دوست بنا لیے ہیں ان کی بات نہ مانو، اللہ کے قاعدے کے مقابلے میں، اللہ کے قانون کے مقابلے میں ان کی اتباع نہ کرو، نہ اتباع کرو اللہ کے علاوہ اور رفیقوں کی، رفقاء کی، اولیاء کی، کارسازوں کی "قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ" یہ ایک قسم کی شکایت ہے انسان کی کہ تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو جتنا تمہیں سمجھایا جاتا ہے اس سے سمجھتے نہیں۔

گذشتہ قوموں کے حالات سے نصیحت حاصل کرو:

آگے وہ ترتیب آگئی جیسے کہ میں نے مضامین کا اجمال ذکر کرتے ہوئے آپ کے سامنے ذکر کیا تھا، یہ ترتیب ہے کہ کتنی ہی بستیاں ہیں جن کی تفصیل آپ کے سامنے اسی سورت میں آرہی ہیں اب اگر فاء کو تاکید کے لیے بنانا ہے تو ترجمہ یوں ہوگا ہم نے ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو ان کے پاس ہمارا عذاب آگیا اور فاء کو تفصیل کے لیے بنانا ہو تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور ہلاک کرتے وقت ان کے پاس ہمارا یہ عذاب آگیا تو ہلاک کرنے کی یہ تفصیل ہے، ہم انہیں ہلاک کیا یا ہلاک کرنے کا ارادہ کیا دونوں مفہوم میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیے؟ ہم نے ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو ان کے پاس ہمارا عذاب آگیا۔

یہاں دو وقت ذکر کیے گئے ہیں ایک رات کا اور ایک دوپہر کا اور دوسری جگہ قرآن کریم میں یہ لفظ بھی ہیں کہ ان کے پاس ہمارا عذاب چاشت کے وقت میں آجائے جب وہ کھیل کود میں لگے ہوئے ہوں، تو ان سب باتوں کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوئی وقت متعین نہیں کہ سوئے ہوئے کو بھی پکڑتا ہے، جاگتے ہوئے کو بھی پکڑتا ہے، رات کو بھی آسکتا ہے، دوپہر کو بھی آسکتا ہے، چاشت کے وقت میں بھی آسکتا ہے چاہے تم کھیل کود میں لگے ہوئے ہو، چاہے آرام کرنے کے لیے لیٹے ہوئے ہو، چاہے تم سوئے ہوئے ہو جب بھی اللہ کا عذاب آجائے انسان کے اندر طاقت نہیں کہ اس کو دفع کر سکے، یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر ہم جاگتے ہوتے تو شاید عذاب سے بچ ہی جاتے یا ہم سوئے ہوئے ہوتے تو ہمیں شاید عذاب کا احساس نہ ہوتا، ایسی بات نہیں جس وقت اللہ کا عذاب آتا ہے چاہے رات کو آجائے، چاہے دن کو آجائے، چاہے دوپہر کو آجائے، چاہے صبح کے وقت آجائے اس عذاب کے آنے کے بعد پھر کسی کا بچ نکلنا یا اس عذاب کے اندر مداخلت کر لینا یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے، مختلف اوقات میں امتوں کے اوپر عذاب آیا تفصیل آگے آرہی ہے "قَائِلُوْنَ" کا مفہوم بھی ذکر کر دیا کہ یہ قیلولہ سے ہے تو جس وقت انبیاء علیہم السلام قوم کو سمجھاتے ہیں تو آپ کے سامنے آئے گا کہ قوم کس طرح سے آگے سخت مزاج واقع ہوئی، کیسی کیسی اکڑ دکھاتے ہیں اور اپنے مال پر، اپنی اولاد پر، اپنے جاہ پر وہ کس طرح سے اعتماد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم ایسے ہیں ہمیں کون پکڑ سکتا ہے؟ ہم ایسے طاقت ور ہیں ہمارا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ انبیاء علیہم السلام کو دھمکاتے ہیں کہ اگر تم باز نہیں آؤ گے تو ہم یوں کر دیں گے؟ یہ تفصیل ساری ان واقعات میں آرہی ہے۔

یہ اس وقت تک ہی ہے جب تک کہ اس قوم کے سامنے اللہ کا عذاب منکشف نہیں ہوتا اور جس وقت اللہ کے عذاب کے آثار نظر آجاتے ہیں تو سب شیخی کرکری ہو جاتی ہے پھر کوئی اکڑ نہیں رہتی اور کوئی کسی قسم کی پھوں پھاں باقی نہیں رہتی، اکڑتے اس وقت تک ہیں جب تک اللہ کا عذاب سامنے نہیں آیا، جب اللہ کی طرف سے عذاب سامنے آجاتا ہے تو پھر اس کے بعد کوئی چیخ و پکار نہیں ہوتی، پھر یہی بات ہوتی ہے کہ واقعی قصوروار ہم ہی تھے ورنہ انبیاء علیہم السلام نے تو ہمیں بہت سمجھایا، انبیاء علیہم السلام کی طرف سے ہم کو سب کچھ بتا دیا گیا تھا، ہم نہیں مانے تو قصور ہمارا ہی تھا لیکن وہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ پھر قصور کا اعتراف کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں جیسے آپ کے سامنے تفصیل کے ساتھ بات آئے گی فرعون کے متعلق کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کس طرح سے سمجھایا اور وہ اپنی سلطنت مصر کے اوپر ناز کرتا ہوا کس طرح سے اکڑا "الیس لی ملك مصر وهذه الانهٰر تجري من تحتي" کیا میں ملک مصر کا

بادشاہ نہیں ہوں؟ کیا نہریں میرے نیچے سے نہیں چلتیں اس طرح سے وہ اکڑتا تھا کہ دیکھو میں بادشاہ ہوں اور اس طرح سے میرے محلات ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمندر میں ایک ہی غوطہ دیا گیا اور ناک میں پانی پڑا تو ساری فرعونیت ختم ہوگئی، فوراً ہی کہنے لگا "اٰمَنْتُ بِرَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ" اب مان گیا رب موسیٰ و ہارون کو لیکن جواب یہ ملا "اٰلْئٰنَ" اب مانتے ہو، اب ماننے کا وقت نکل چکا تو انسان میں یہی ایک خامی ہے کہ وہ قبل از وقت سوچتا نہیں اور جب سر پر ڈنڈا لگتا ہے اور کھوپڑی پھٹتی ہے اس وقت اس کی ساری کی ساری اکڑ اور تکبر نکلتا ہے لیکن پھر نکلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، نیک بخت وہی ہوا کرتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے سمجھانے کے ساتھ یا انبیاء علیہم السلام کے نائب ان علماء کے سمجھانے کے ساتھ یا والدین کے سمجھانے کے ساتھ، استاذ کے سمجھانے کے ساتھ جو قبل از وقت سمجھ جائے نیک بخت وہی ہوتا ہے ورنہ جس وقت وہ رگڑا لگ گیا تو رگڑا لگنے کے بعد سمجھے نہ سمجھے پھر تو دونوں برابر ہیں پھر کیا فائدہ؟

آخرت کا ذکر:

"فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ" البتہ ضرور سوال کریں گے ہم ان سے بھی، جب آخرت کا وقت آئے گا جس طرح سے دنیا کا عذاب ذکر کر کے ترہیب کی ہے اب یہ آخرت کا ذکر آ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم رسولوں سے بھی پوچھیں گے کہ تم نے دین پہنچایا اور لوگوں نے ان کو کیا جواب دیا اور اس طرح سے جن کے پاس رسول بھیجے گئے ہیں ان سے بھی پوچھا جائے گا کہ رسول تمہارے پاس آئے تھے تم نے کتنا مانا یہ محاسبہ ہے یا آخرت کا ذکر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس طرح سے آخرت میں سوال کریں گے "فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ" پھر ہم لوگوں پر اپنے علم کی بناء پر بیان کریں گے اور جب یہ لوگ کام کیا کرتے تھے اس وقت ہم کوئی غیر حاضر نہیں ہوتے تھے کہ ہم وہاں موجود نہ ہوں بلکہ جو بھی لوگوں نے اپنی زندگی کے اندر طرزِ عمل اختیار کیا ہر عمل کے وقت ہم موجود ہوتے تھے، ہم غائب نہیں تھے اس لیے ہمارے پاس صحیح معلومات ہیں جب یہ صحیح معلومات ہیں تو ہم اپنے علم کی بناء پر سب حالات لوگوں پر واضح کر دیں گے کہ تم نے یہ کیا اور وہ کیا۔

وزنِ اعمال کا ذکر:

"وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ" يَوْمَئِذٍ کے آخر میں جو تنوین ہے یہ نحو میں آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ یہ مضاف الیہ کا عوض ہے مفہوم اس کا یہ ہوتا ہے "يَوْمَ اِذْ كَانَ كَذَا" جس دن ایسا ہوگا یہ اس کا لفظی ترجمہ ہے جس دن ایسا

ہوگا اس لیے اشارہ ہے پچھلے واقعات کی طرف کہ جب ہم رسولوں سے پوچھیں گے اور جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا ان سے پوچھیں گے اور ہم پھر اپنے علم کے مطابق باتیں بیان کر دیں گے چونکہ جس وقت مخلوق کوئی کام کیا کرتی تھی ہم موجود ہوتے تھے ہم کوئی غیر حاضر نہیں ہوتے تھے جب یہ واقعات پیش آئیں گے "یَوْمَئِذٍ" کا یہ مفہوم ہوا "یَوْمَ اِذْ کَانَ کَذَا" کا معنی ہوا جب واقعات پیش آئیں گے یعنی قیامت کے دن یہ سارے کے سارے واقعات پیش آنے ہیں تو جس دن ایسا ہوگا اس دن تول برحق ہے، تولنا حق ہے یا وزن حقیقی ثابت ہے۔

اب یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ تولا کس چیز کو جائے گا؟ کس طرح سے تولا جائے گا؟ کیونکہ عام طور پر تو ہم دیکھتے ہیں خاص طور پر پچھلے زمانے میں یہ لوگوں کو اشکال تھا جس کو آج کل کے حالات نے کچھ تھوڑا سا حل کر دیا ہے پہلے زمانے میں لوگ اشکال کیا کرتے تھے کہ انسان کے جتنے اعمال ہیں وہ اقوال ہوں یا افعال ہوں وہ سارے کے سارے اعراض ہیں، اعراض عرض کی جمع ہے منطق میں آپ یہ لفظ پڑھیں گے ایک ہوتا ہے عرض اور ایک ہوتا ہے جوہر، جوہر وہ ہوتا ہے قائم بالذات ہو اور عرض وہ ہوتا ہے جو قائم بالذات نہ ہو مثلاً ایک آپ کا کپڑا ہے اور ایک کپڑے کا رنگ ہے، کپڑے کا اپنا وجود ہے اور رنگ کپڑے کے ساتھ قائم ہے، کپڑا ہوگا تو رنگ ہے کپڑا نہیں تو رنگ بھی نہیں اس کو عرض کہتے ہیں تو انسان کے اعمال خواہ وہ افعال ہوں یا اقوال ہوں یہ اعراض ہیں یعنی وجود میں آتے ہی مٹتے چلے جاتے ہیں یہ باقی نہیں رہتے مثلاً میں بول رہا ہوں تو پہلا لفظ میری زبان سے نکل کر ختم ہو جاتا ہے تو دوسرا لفظ باہر آتا ہے اور آپ نے جو کام کیا وہ آپ کی ذات کے ساتھ قائم تھا کام ہو گیا اور اس کے بعد آپ کسی دوسرے کام میں لگ گئے تو پہلا کام ختم ہو گیا اس کا وجود ہی نہیں ہے جب اس کا وجود ہی نہیں ہے تو پھر تولا کس چیز کو جائے گا یہ پرانے زمانے کے اندر ایک اشکال ہوتا تھا۔

وزن اعمال پر ہونے والے اشکالات کو جدید ایجادات نے ختم کر دیا:

اور آج اس اشکال کو بہت حد تک جدید ایجادات نے ختم کر دیا ہے، وہ کس طرح سے کہ اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں بول رہا ہوں لیکن میرے بولے ہوئے الفاظ ضائع نہیں جا رہے بلکہ وہ ریکارڈ میں آ رہے ہیں اور جس وقت آپ چاہیں گے آپ اس کو دوبارہ موجود کر لیں گے ایک نکتے کا فرق نہیں ہوگا، جس وقت آپ چاہیں گے آپ انہیں موجود کر لیں گے اسی طرح آپ کے سامنے ایک کیمرہ ہے ایک چیز اس کے سامنے سے گزرتی جاتی ہے

اور اس کے اندر اس کا عکس آتا جاتا ہے اور وہ محفوظ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ یہ ٹیلی وژن کے اصول پر جو تصویریں لی جاتی ہیں اس میں صرف تصویر ہی نہیں آتی بلکہ حرکت بھی آتی ہے یعنی آپ نے جس طرح سے ہاتھ ہلایا تھا دوسرے وقت میں جب اس فلم کو چلایا جائے گا تو آپ کا ہاتھ بھی اسی طرح سے ہلتا ہوا نظر آئے گا، بات کرتے ہوئے جس طرح سے آپ کے ہونٹ ہل رہے ہیں تو جس وقت آپ کی تصویر سامنے آئے گی تو اسی طرح سے آپ کے ہونٹ بھی ہلتے ہوئے نظر آئیں گے تو وہ جتنی کیفیات تھیں وہ ساری کی ساری ضبط میں آگئیں اور ان میں سے کوئی ضائع نہیں ہوئی چاہے آپ دس سال کے بعد چاہیں تو آپ وہی نقشہ دیکھ سکتے ہیں اور بالکل اسی طرح سے اس کو موجود کر دیا جائے گا تو اس سے معلوم ہو گیا کہ جن کو پہلے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اعراض ہیں جو باقی نہیں رہ سکتے آنے والی ایجادات نے بتا دیا کہ یہ باقی رکھی جا سکتی ہیں تو جب ایک انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل دی وہ اس چیز پر قادر ہے کہ انسان کے اقوال اور افعال کا ذخیرہ محفوظ کر لے تو جو خالق کائنات ہے، خالق انسان ہے اور انسان کو عقل دینے والا ہے کیا وہ انسان کی زندگی کے افعال اور اقوال کا ریکارڈ نہیں رکھ سکتا؟ یقیناً رکھے گا۔

اس لیے آپ کی آنکھ میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک مشین ہے، ایک کیمرہ ہے جب سے آپ نے ہوش سنبھالی ہے جو کچھ آپ دیکھتے چلے جا رہے ہیں وہ سارے کا سارا اس میں ریکارڈ ہوتا چلا جا رہا ہے، آپ کا کان یہ بھی اسی طرح سے ایک مشین ہے جو کچھ آپ سنتے جا رہے ہیں وہ سارے کا سارا آپ کے کان میں ریکارڈ ہوتا جا رہا ہے، آپ کے ہاتھ جو ہیں اس کے اندر بھی اللہ نے ایک چیز رکھی ہے کہ جو کچھ آپ ان ہاتھوں کے ذریعے سے کرتے ہیں وہ ساری فلم اس کے اندر تیار ہوتی چلی جا رہی ہے، قدموں میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ جدھر آپ چل کر جاتے ہیں وہ سارے کا سارا ریکارڈ ہوتا چلا جا رہا ہے آپ کے دل میں جس قسم کے جذبات ہیں وہ سارے کے سارے اس میں ریکارڈ ہوتے چلے جا رہے ہیں آپ سمجھتے ہیں کہ ختم ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے اندر اس کا ذخیرہ اسی طرح سے موجود ہے۔

اسی طرح یہ زمین آپ کے لیے ایک ریکارڈ مشین ہے اس کے اوپر بیٹھ کر جو باتیں آپ کرتے ہیں، اس کے اوپر بیٹھ کر آپ جو کام کرتے ہیں وہ سارے کے سارے اس کے اندر محفوظ ہوتے چلے جا رہے ہیں چنانچہ یہی چیز ہے جس کی طرف ہم کو شریعت نے بار بار متوجہ کیا کہ تم اپنی نقل وحرکت کو یوں نہ سمجھو کہ یہ ضائع جا رہی ہے بلکہ اللہ کے ہاں اس کا ریکارڈ تیار ہے جس وقت اللہ کے سامنے پیش ہو گے تو تمہیں ساری زندگی کی فلم دکھا دی جائے گی

تمہیں خود پتہ چل جائے گا کہ تم نے کیا کیا کیا تھا، زبان بتادے گی کہ اس سے کیا کیا باتیں کی گئی تھیں، آنکھ بتادے گی، کہ اس کے ذریعے سے کیا کیا دیکھا گیا تھا، ہاتھ بتادیں گے کہ ان کے ذریعے سے کیا کیا کام کیا گیا تھا، قدم بتادیں گے کہ آپ ان کے ذریعے سے کدھر کدھر چل کر گئے تھے اور اسی طرح سے یہ زمین بولے گی "یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا" قرآن کریم میں جس طرح سے آتا ہے "اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا" زمین کو جس دن جنبش دی جائے گی زلزلہ دیا جائے گا اس میں آگے جاکے آئے گا "یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا" یہ زمین اس دن ساری خبریں سنادے گی۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اس کی خبریں یہی ہیں کہ یہ بتائے گی کہ میری پشت پر فلاں انسان نے یہ کام کیا تھا، فلاں نے یہ کام کیا تھا، فلاں نے یہ کام کیا تھا، زمین کے جن قطعات کے اوپر آپ نے نماز پڑھی ہے وہ شہادت دیں گے کہ آپ نے اس کے اوپر نماز پڑھی ہے، اور زمین کے جس قطعے کے اوپر آپ نے کوئی گناہ کیا ہے، معصیت کی ہے تو یہ بیان کرے گی کہ میری پشت کے اوپر اس نے یہ گناہ کیا ہے، اس لیے یوں سمجھو کہ آپ کے چاروں طرف قدرت کے کیمرے لگے ہوئے ہیں اور آپ کی نقل وحرکت اور آپ کے اقوال جو کچھ بھی ہیں وہ سب محفوظ ہوتے چلے جارہے ہیں، قرآن کریم نے اور سرور کائنات ﷺ کے اقوال نے ہمیں بار بار اس بات پر متنبہ کیا ہے۔

پرانے زمانے میں لوگ ایمان بالغیب کے طور پر مانتے تھے کہ ہاں یہ ساری کی ساری چیزیں محفوظ ہوں گی اور ایک وقت پر سامنے آجائیں گی لیکن آج کی ایجادات نے ہمارے سامنے اس حقیقت کو بہت ہی نمایاں کردیا ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ انسان کی نقل وحرکت بھی محفوظ رکھ لی جائے اور اس کے اقوال اور افعال جو ہیں ان کا ریکارڈ بھی رکھ لیا جائے بعینہ اسی طرح محفوظ رکھ لیا جائے جس طرح کوئی کام کیا گیا ہے جب وہ قیامت سامنے آگئی تو وہی بات ہوگی جو قرآن کریم نے کہی "وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا" جو کچھ انسانوں نے کیا ہوگا سب کو اپنے سامنے حاضر یعنی موجود پائیں گے اور ان کے سامنے آجائے گا کہ واقعی ہم نے یہ کام کیا تھا، واقعی ہم نے یہ بات کی تھی، واقعی ہم نے یہ جرم کیا تھا، واقعی ہم نے یہ غلطی کی تھی "وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا" جو کچھ کیا ہوگا سب موجود ہوجائے گا۔

انقلابی عقیدہ:

اور یہ عقیدہ ایسا بنیادی عقیدہ ہے کہ انسان کی زندگی کو سنوارنے میں جتنا یہ عقیدہ مؤثر ہے شاید کوئی دوسرا

عقیدہ اتنا مؤثر نہ ہو یعنی اپنی زندگی کے متعلق یہ استحضار کہ ہم جو کچھ کرتے جا رہے ہیں وہ سب خفیہ کیمروں کے اندر ریکارڈ ہوتا چلا جا رہا ہے اور ایک دن ہمارے سامنے یہ ساری کی ساری تصویر آ جائے گی، ہم اپنی زندگی کی فلم خود دیکھ لیں گے اور اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے سب کچھ موجود کر دیں گے، یہ عقیدہ ایک ایسا عقیدہ ہے کہ اگر کسی انسان کے دل کے اندر یہ راسخ ہو جائے تو وہ شخص کبھی بھی بے فکری کی زندگی نہیں گزار سکتا۔

ایک چیز ہے جس کو آپ معصیت یا گناہ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں بعض اقوال ایسے ہیں جن کا زبان سے ادا کرنا آپ سمجھتے ہیں کہ گناہ ہے، بعض افعال ایسے ہیں جن کو آپ سمجھتے ہیں کہ ان کا کرنا گناہ ہے، معصیت ہے آپ اپنے ضمیر کی طرف دھیان کیجئے آپ کے سامنے ایک حقیقت نمایاں ہوگی کہ گناہ اور معصیت کا مدار جذبہ اخفاء پر ہے، چھپانے پر موقوف ہے، اس بات کو سمجھیں اور اپنے دماغ میں بٹھائیں سرور کائنات ﷺ سے ایک دفعہ ایک شخص نے پوچھا کہ یارسول اللہ! "مَا الْاِثْمُ" گناہ کی نشانی کیا ہے ہم کس طرح سے سمجھیں کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں یہ گناہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مَا حَاكَ فِیْ صَدْرِكَ" ایک جگہ تو یہ فرمایا اور دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے "وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ" گناہ وہ چیز ہے کہ جس وقت تو کرنے لگے تو تیرا دل دھڑکنے لگے کہ میں یہ کیا کرنے لگا ہوں اور آپ جب چاہیں تجربہ کرلیں کہ جب تک عادت پوری طرح راسخ نہ ہو اس وقت تک انسان گناہ کرتے ہوئے ڈرتا ہے اور کسی گناہ کرنے کی عادت راسخ ہو جانے کے بعد دل میں قساوت آ جاتی ہے، سنگ دلی آ جاتی ہے، پھر تو انسان کو حیوانوں کی طرح پتہ ہی نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہا ہوں کیا نہیں کر رہا، پھر احساس ختم ہو جاتا ہے، جب تک قلب کے اندر ایمان باقی ہوتا ہے تو انسان کا دل دھڑکتا ہے کہ میں یہ کیا کرنے لگا ہوں اور پھر آپ نے دیکھا ہوگا کہ دل بھی دھڑکتا ہے اور انسان چاروں طرف دیکھتا ہے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، چور جس وقت چوری کرنے لگتا ہے تو کس طرح چاروں طرف گھوم کر دیکھتا ہے، اور اگر کوئی اندر گھس کر گناہ کرنے لگا ہے تو کس طرح سے دروازوں اور کھڑکیوں کی طرف جھانکتا ہے کہ کوئی روشن دان کھلا تو نہیں، کوئی کھڑکی کھلی تو نہیں اور جس وقت بھی انسان کوئی معصیت کرنے لگے تو یوں اس کی عادت ہے کہ چاروں طرف دیکھے گا کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور اگر اس کو کوئی شبہ پڑ جائے کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے، یہ روشن دان ہے اس میں بیٹھا کوئی شخص دیکھ رہا ہے یا اس کھڑکی میں سوراخ ہے اور باہر سے کوئی آدمی اندر جھانک رہا ہے تو آپ ذرا دیانت داری کے ساتھ بتلایئے کہ اگر آپ کے دل میں یہ خیال ہو کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے یا کوئی دور سے دوربین لگائے ہوئے ہے اور میری نقل و حرکت جتنی بھی ہے وہ اس کے سامنے ہے اور اس کے ہاتھ میں کیمرہ ہے، میں جو کچھ کروں گا وہ تصویر بنا لے گا تو بتایئے کیا آپ کو گناہ کرنے پر جرأت ہو سکتی ہے؟ کبھی بھی جرأت نہیں ہوگی جرأت انسان گناہ کرنے کی تب کرتا ہے جب اس

کا خیال یہ ہوتا ہے کہ مجھے کوئی دیکھ نہیں رہا ہے اور میرا یہ فعل چھپا رہ جائے گا، کسی کو پتہ نہیں چلے گا تب جا کر انسان گناہ پر جرأت کرتا ہے۔

اور اگر اس کے دل و دماغ کے اندر یہ چیز سرایت کر جائے کہ تم پتھر کی چٹان کے اندر گھس جاؤ جس کا کوئی دروازہ نہیں، کوئی روشن دان نہیں ہے، اندر گھس کر بھی جو کچھ تم کرو گے وہ بھی ظاہر ہو جائے گا، چھپے گا نہیں، رات کی تاریکیوں میں جو کچھ تم کرو گے اس وقت بھی تمہارے اوپر دیکھنے والے پہرے دار بیٹھے ہیں اور تمہارے ساتھ ہی اس قسم کی ریکارڈ مشینیں لگی ہوئی ہیں کہ جن کے اندر تمہارا ہر قول اور فعل ریکارڈ ہوتا چلا جائے گا اور ایک دن ساری مخلوق کے سامنے تمہاری فلم نمایاں کر دی جائے گی اور تم خود بھی دیکھو گے اور وہ نامہ اعمال جس وقت سامنے آئے گا تو اس کو دیکھ کر کہو گے "مَا لِهٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً" ہائے اس کتاب کو کیا ہو گیا اس نے نہ تو میری کوئی چھوٹی بات چھوڑی اور نہ بڑی بات چھوڑی ہے سب کچھ اکٹھا کر کے لے آئی۔

اگر یہ عقیدہ راسخ ہو جائے تو پھر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دن کی روشنی ہے یا رات کی تاریکی ہے، تم تنہائی میں ہو یا مجمع کے سامنے ہو، تمہارے اوپر کوئی پہرے دار ہے یا نہیں ہے، تمہاری کوئی نگرانی کرنے والا ہے یا نہیں، اگر یہ حقیقت آپ کے دل کے اندر اتر جائے تو آپ ہر وقت ایک سنجیدہ، عقل مند، اللہ سے ڈرنے والے اور اپنی ذمہ داری محسوس کرنے والے رہو گے اور آپ کے قول اور فعل کے اندر کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ تمہیں کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں، اگر کوئی دیکھنے والا ہوگا تو بھی گناہ سے بچو گے اور اگر نہیں دیکھنے والا ہوگا تو بھی گناہ سے بچو گے۔

اور قرآن کریم نے ہمیں یہی سبق پڑھایا ہے اور یہی بتایا ہے کہ فرشتے تمہارے اوپر علیحدہ نگران ہیں، اگر تم کہیں برا کام کرنا چاہتے ہو تو اس کی کوئی تدبیر کرو کہ فرشتوں سے چھپ جاؤ، پھر تمہارے بدن کا ایک ایک حصہ جو ہے وہ تمہارے اعمال کو ریکارڈ کر رہا ہے تم اپنے بدن سے نکل کر کہاں چلے جاؤ گے زمین کے ٹکڑے پر اگر تم گناہ کرو گے تو زمین کا ٹکڑا تمہارا گواہ بن جائے گا تو جب یہ ساری کی ساری شہادتیں دینے والی چیزیں موجود ہیں اور اللہ کا علم علیحدہ "وَمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ" ہم بھی ہر وقت سر پر موجود ہوتے ہیں، ہم بھی عمل کے وقت غائب نہیں ہوتے تو جب یہ ساری کی ساری حقیقت آپ کے سامنے ہوگی تو آپ کو یقین ہو جانا چاہیئے کہ آپ کتنا ہی چھپ کر گناہ کریں لیکن یہ ایک دن نمایاں ہو جائے گا چھپا نہیں رہے گا۔

کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں:

تو جس وقت اس نے نمایاں ہونا ہے تو بیٹو! کام وہی کرو جس کا نمایاں ہونا آپ کو پسند ہے اور جس کا

نمایاں ہونا آپ کو پسند نہیں ہے وہ کام چھوڑ دو، جس کام کے متعلق آپ چاہتے ہیں کہ اگر علی الاعلان بھی کہہ دیا گیا کہ فلاں نے یہ کام کیا ہے تو ہمیں کوئی شرم ساری نہیں ہوگی، ہم کوئی ذلت اور رسوائی محسوس نہیں کریں گے جس کام کے متعلق آپ کا یہ عقیدہ ہو وہ کام دھڑ لے سے کیجیے اور جس کام کے متعلق آپ کا یہ جذبہ ہو کہ کہیں کسی کو پتہ نہ چل جائے، سینما دیکھنے جانا ہے تو راستہ ایسا اختیار کرنا ہے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے، کوئی اور حرکت کرنی ہے تو ایسی جگہ تلاش کرنی ہے جہاں کسی کی نظر نہ پڑے تو یہ حماقت اور جہالت کے علاوہ کوئی بات نہیں ہے، اس حماقت اور جہالت کا انسان کو وقتی طور پر احساس نہیں ہوتا بعد میں پتہ چلے گا کہ یہ تو وہی بات ہے جو عام طور پر مشہور ہے، کبوتر بازوں کو پتہ ہوگا کہ حقیقت اس کی کیا ہے کہ کبوتر پر جب بلی حملہ آور ہوتی ہے کبوتر کو دبوچنے کے لیے تو کہتے ہیں کہ کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے، وہ آنکھیں بند کر کے اپنے دل کو تسلی دیتا ہے کہ جیسے میں اس کو نہیں دیکھ رہا ویسے وہ بھی مجھے نہیں دیکھ رہی تو جب میں اس کو نظر ہی نہیں آ رہا تو وہ مجھے پکڑے گی کیسے یعنی اپنی آنکھیں بند کر کے وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں اس کو نظر نہیں آ رہا اب یہ بات سنتے ہیں تو آپ ہنستے ہیں کہ واقعی کبوتر کی حماقت ہے کہ اپنی آنکھیں بند کرنے سے دوسروں سے کیسے چھپ گیا؟ یہ تو ہو گیا کہ آپ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو دوسرا آپ کو نظر نہیں آ رہا ہے لیکن آپ کی اپنی آنکھیں بند کرنے سے دوسرے سے آپ کیسے چھپ جائیں گے تو جس طرح سے یہ کبوتر کی حماقت ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ آنکھیں بند کر لی جائیں تو بلی دیکھ نہیں سکتی لیکن پتہ اسی وقت چلتا ہے کہ جب بلی صاحبہ آ کر گردن مروڑ لیتی ہے پھر اس کو پتہ چلتا ہے کہ آنکھیں بند کرنا یہ بچنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔

بالکل اسی طرح حماقت اور جہالت ہماری ہے کہ ہم خود چھپتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی نظروں سے چھپ گئے، ہم خود پردے تانتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں سے پردے میں آگئے ہیں لیکن یہ یقین کرو کہ دوسروں سے پردے میں آپ نہیں ہیں تو یہ عقیدہ ایسا ہے جو انسان کی عملی زندگی سنوانے کے لیے بہت قیمتی عقیدہ ہے، جو شخص جتنی جلدی اپنے دل اور دماغ کے اندر اس خیال کو جما لے گا اتنی جلدی ہی وہ ایک صالح انسان بن جائے گا اور جتنی دیر لگائے گا اس بات کے سمجھنے میں اتنی دیر تک اس کی زندگی بگڑی رہے گی۔

آج آپ تہیہ کر لیجیے کہ ہم نے خلوت میں وہی کام کرنا ہے جو ایک میدان میں بیٹھ کر کر سکتے ہیں، اور ہم نے رات کی تاریکی میں وہی کام کرنا ہے جو ہم دن کی روشنی میں کر سکتے ہیں، اور ہم نے تنہائی میں وہی کام کرنا ہے جو دس آدمیوں کی موجودگی میں کر سکتے ہیں، اگر آج آپ یہ طرز عمل اختیار کر لیں تو اس طرز عمل کے اختیار کرنے کے

بعد آپ سمجھیں گے کہ خود ہی آپ کی زندگی میں انقلاب آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے ایک بات واضح کی ہے کہ انسان کا کیا ہوا عمل ضائع نہیں جاتا، یہ سارے کا سارا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے۔

وزنِ اعمال کی مختلف صورتیں:

تو جب یہ ساری کی ساری چیزیں موجود ہیں، اب وہ بات نہیں کہ اعراض ہیں جو ساتھ ساتھ مٹتے جاتے ہیں اب اعراض کا بھی وجود ہو گیا، اب انہی اعمال کو آخرت میں تولا جائے گا پھر دو صورتیں ہوں گی یا تو انہی اعمال کو موجود کر لیا جائے گا جس طرح سے آپ نے سنا ہوگا کہ نیک عمل حسین شکل میں آئے گا جو انسان کے لیے انس کا باعث بنے گا، محبت کا باعث بنے گا، نماز ہے وہ ایک شکل میں آئے گی، اور روزہ ہے وہ اپنی شکل میں آئے گا، کوئی آپ کو دودھ کی شکل میں ملے گا، کوئی آپ کو کسی شکل میں ملے گا تو عالم مثال کے اندر ان اعمال کی کوئی نہ کوئی مثال اور کوئی نہ کوئی صورت ہے یا تو ان عملوں کو اللہ تعالیٰ وجود دے کر اس طرح سے حاضر کر لیں گے اور ان کو تولا جائے گا یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہو سکتی ہے۔

یا یہ ہے کہ تولنے کے لیے ہمارے ذہن میں جو اشکال آتا ہے تو اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید تولنے کے لیے یہی ترازو اور یہی بٹے ہوتے ہیں اگرچہ میزان کا مطلب اس زمانے میں لوگ یہی سمجھتے تھے اور سرور کائنات ﷺ نے بھی اسی طرح سے سمجھایا پلڑے کا لفظ آیا، اس کے کانٹے کا لفظ آیا یہ ساری کی ساری چیزیں آتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاثر یہی دیا گیا ہے کہ اسی طرح کی میزان ہوگی لیکن آخرت کی چیزیں جتنی ہیں ان کا دنیا کی چیزوں کے ساتھ ایک نام کے اعتبار سے اشتراک ہے باقی حقیقت ایک نہیں ہے، جنت میں آپ کو کھانے کے لیے انار ملیں گے انار آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں بھی موجود ہیں تو اگر آپ یہ سمجھ بیٹھے کہ آخرت میں بھی انار ملتے ہیں تو آپ کہیں گے کہ جس دن ہم کھا لیتے ہیں نزلہ ہو جاتا ہے تو کیا جنت میں بھی انار کھانے کے بعد نزلہ ہو جائے گا، جس طرح سے یہاں یہ نزلہ کر دیتا ہے وہاں بھی نزلہ کرے گا اگر آپ یہ تصور کریں گے تو یہ غلط تصور ہوگا کہ یہ صرف ایک نام کا اشتراک ہے کہ جو نعمت وہاں ملے گی وہ کسی اعتبار سے انار جیسی ہے، جس کو آپ لفظ انار کے ساتھ پہچانیں گے باقی دنیا کے انار کو آخرت کے انار سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

اسی طرح سے آپ کو آخرت میں کھانے کے لیے بیر ملیں گے "سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ" ایسی بیریاں ہوں گی جن کے کانٹے نہیں لیکن یہ بیر اور وہ بیر بالکل مختلف ہیں، وہاں آپ کو کیلا ملے گا "طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ" جس طرح سے یہ لفظ

بھی قرآن کریم میں آیا وہ کیلا اور یہ کیلا بہت مختلف ہیں، اسی طرح سے وہاں شہد ہوگا، دودھ ہوگا، پانی ہوگا لیکن ان چیزوں کو دنیا کی ان چیزوں کے ساتھ کوئی کسی قسم کی نسبت نہیں انسان چونکہ انہیں لفظوں کو پہچانتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کا تعارف انہی الفاظ کے ساتھ کرایا ہے۔

اسی طرح سے میزان ہے اور جب قرآن کریم میں یہ لفظ اتر رہا تھا تو اس وقت میزان یہی تھی جس کے دو پلڑے ہوتے ہیں اور یوں پکڑ کر اٹھایا جاتا ہے اور ایک کانٹا ہوتا ہے اور وہ بتاتا ہے کہ کدھر جھکاؤ ہے اور کدھر نہیں ہے بالکل وہ بھی اس کا مصداق ہے لیکن آخرت کی میزان اور دنیا کی میزان مختلف ہو سکتی ہیں، اب آپ آج بھی دیکھ لیجئے کہ میزان کتنی قسم پر ہے ایک میزان تو وہ ہے جس کے ساتھ یہ دالیں وغیرہ تولتے ہیں، ایک میزان سونارے کی ہے جس سے وہ سونا تولتا ہے، ایک میزان وہ ہے جس کے بڑے بڑے کانٹے ہیں جس پر آپ کے یہ ٹرک تلتے ہیں، یہ چونگیوں کے پاس جو لگے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی تو آخر میزان ہی ہے، اور ایک میزان ڈاکٹر کے پاس ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ آپ کا بخار تولتا ہے کہ آپ کے اندر حرارت کتنی ہے، وہ میٹر جو ہوتا ہے آپ کی حرارت دیکھنے کے لیے، بخار دیکھنے کے لیے وہ بھی تو ایک میزان ہے، باقی ان سائنسی مراکز میں جا کر دیکھو گے تو ہوا تولنے کی میزانیں ہیں، بارش کتنی ہوگی اس کو تولنے کی میزانیں ہیں، دریا میں کتنا پانی گزر رہا ہے اس کو تولنے کی میزانیں ہیں، بجلی اس تار میں سے کتنی گزرے گی اس کو تولنے کی میزان ہے، سوئی گیس اس پائپ میں سے کتنا چلا گیا ہے اس کو تولنے کی میزان ہے، اور شہروں کے اندر ہی پانی جو گھروں میں دیا جاتا ہے پائپ لگے ہوئے ہیں تو اس کو تولنے کی میزان ہیں، میٹر لگے ہوئے ہیں وہ دیکھ کر آپ کو بتا سکتے ہیں کہ ایک مہینے کے اندر آپ نے کتنا پانی استعمال کیا ہے، وہ دیکھ کر آپ کو بتا سکتے ہیں کہ اس مہینے میں آپ نے کتنی بجلی استعمال کی ہے اور وہ اپنے میٹر کے ذریعے سے بتا دیتے ہیں کہ آج بارش کتنی ہوئی ہے اور اپنے میٹر کے ذریعے سے بتا دیتے ہیں کہ ہوا چل رہی ہے تو اس کی کتنی رفتار ہے اور اس ہوا کے اندر پانی کا وزن کتنا ہے، یہ ہر روز اخبار کے اندر آتا ہے، نمی کا تناسب کہ صبح کے وقت ہوا میں نمی کا تناسب اتنا تھا اور شام کے وقت نمی کا تناسب اتنا ہے یعنی اس ہوا کے اندر پانی کی ملاوٹ کتنی ہے، صبح کو کتنی تھی، شام کو کتنی تھی کون سی چیز ایسی ہے جس کو انسان نے تول نہیں لیا ہاں البتہ تولنے کے لیے ترازو اور میزان اپنی اپنی شکل کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

اسی طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ بھی ہمارے ایمان کو تولے گا اور ہمارے اعمال کو تولے گا، ہمارے اقوال کو

تولے گا، میزان ہوگی اس کی کیا حقیقت ہے وہ اللہ بہتر جانتے ہیں، ہر چیز کے متعلق میزان اسی طرح کی ہوسکتی ہے اس لیے اب کوئی اشکال نہیں جب بیسیوں قسم کی میزانیں آپ نے نکال لیں اور ہر چیز کو تولنے کے لیے آپ نے اس کی شان کے مطابق میزان بنالی اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ کے افعال واقوال کو تولنے کے لیے اگر اس کے مطابق میزان بنالے تو اس میں کون سی اشکال کی بات ہے۔

بعض روایات سے یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن اوراق پر آپ کے اعمال لکھے جائیں گے وہ اوراق تولے جائیں گے اور ان کا وزن اس حقیقت کے مطابق ہوگا جو اس میں لکھی ہوئی ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ ہے۔

ایک ٹکڑے کا وزن ننانوے دفتروں سے بھی زیادہ:

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص اللہ تبارک وتعالیٰ کی دربار میں پیش ہوگا اللہ تعالیٰ اس کو ننانوے دفتر دیں گے، بڑے بڑے رجسٹر جن کے اندر اس کے اعمال لکھے ہوئے ہوں گے یعنی ایک کم سو اور وہ اتنے بڑے بڑے ہوں گے کہ انسان جہاں تک نظر پھیلائے گا یوں معلوم ہوگا کہ اس کا نامہ اعمال پھیلا ہوا ہے اور وہ سارے ہی نامہ اعمال ایسے ہوں گے جس میں ایک بھی نیکی نہیں ہوگی، سارے کے سارے گناہوں سے بھرے ہوئے ہوں گے، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اس کے سامنے پھیلا دے گا انسان اپنے نامہ اعمال کو پھیلا ہوا دیکھے گا، سامنے کھلا ہوا دیکھے گا تو جس وقت وہ کھلا ہوا نامہ اعمال سامنے آئے گا انسان نظر دوڑائے گا تو اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے ٹھیک ہے؟ وہ کہے گا کہ جی بالکل ٹھیک ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میرے لکھنے والے نگہبانوں نے تیرے اوپر کوئی زیادتی تو نہیں کی کہ تو نے تھوڑا کیا ہو اور انہوں نے زیادہ لکھ دیا ہو یا تو نے نہ کیا ہو اور انہوں نے لکھ دیا ہو؟ وہ کہنے لگا نہیں جی بالکل نہیں جو کچھ لکھا ہے بالکل ٹھیک لکھا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیری نیکی بھی ہمارے پاس ہے تو وہاں حدیث شریف میں لفظ آتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ایک بطاقہ اس کو دیں گے، بطاقہ کہتے ہیں ایک کاغذ کے ٹکڑے کو، اتنا کاغذ کا ٹکڑا اس کو دیں گے جس پر لکھا ہوگا "لا الہ الا اللہ" جو اس شخص نے کلمہ پڑھا تھا اور وہ ٹکڑا دے کر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے "فَيَقُوْلُ اُحْضُرْ وَزْنَكَ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ مَاهٰذِهِ الْبِطَاقَةُ؟" (ترمذی ص ۹۲ ج ۲) جاؤ اور اس کو تلوا کر لاؤ، اب کہاں ننانوے دفتر اتنے بڑے بڑے پھیلے ہوئے کہ جہاں تک نظر جاتی ہے اور وہ

سارے ہی معصیت کے ساتھ بھرے ہوئے اور کہاں وہ ایک ٹکڑا جس کے اوپر "لا الہ الا اللہ" لکھا ہوا ہے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جاؤ جا کر وزن کروا کر لاؤ کہ وزن کس میں زیادہ ہے۔

وہ وہیں اپنے نتیجے سے آگاہ ہوگا اپنے خیال کے مطابق کہے گا یا اللہ! کیا ضرورت ہے وزن کروانے کی کہاں یہ ایک ٹکڑا اور کہاں یہ ننانوے دفتر؟ میں ان کو تلوا کر کیا کروں گا جس طرح انسان پر پہلے ہی مایوسی طاری ہو جاتی ہے کہ نتیجہ تو واضح ہے اب ایک پلڑے میں جا کر ننانوے رجسٹر رکھ دیے جائیں گے اور ایک پلڑے میں کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھا جائے گا وہ کہے گا کیا کروں گا یہ ایک بطاقہ ہے یہ ان کا کیا مقابلہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ نہیں ہمارے قاعدے کے مطابق جاؤ جا کر وزن کروا کر لاؤ، کہتے ہیں وہ جائے گا اور میزان کے ایک پلڑے کے اندر اپنے وہ ننانوے دفتر رکھے گا اور دوسرے پلڑے کے اندر کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھے گا، کاغذ کے ٹکڑے والا پلڑا جھک جائے گا اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ کے نام کے مقابلے میں کوئی چیز وزنی نہیں ہوسکتی جس ٹکڑے کے اوپر "لا الہ الا اللہ" لکھا ہوا تھا وہ ننانوے دفتر کے مقابلے میں وزنی ہو جائے گا اور وہ جنتی قرار دیا جائے گا۔

غالباً یہ وہ شخص ہوگا جس نے زندگی بھر تو گناہ کیے، شرک کیا، معصیت کی لیکن آخر وقت میں اس کو کلمہ نصیب ہوگیا تو آپ جانتے ہیں کہ جس کو آخر وقت میں کلمہ نصیب ہو جائے گا تو زندگی کے سارے گناہ ختم ہو جاتے ہیں تو مقابلہ کرتے وقت اس ایمان کی برکت سے اس کے سارے کے سارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور وہ شخص نجات پا جائے گا۔

لیکن اس روایت سے اتنا معلوم ہوگیا کہ کاغذ کے ٹکڑے میں وزن اس کے اندر جو درج ہے اس کی حقیقت کے اعتبار سے ہوگا، یہ نہیں کہ ایک ہی وزن ہے، چاہے اس پر نیکی لکھی ہوئی ہو تو بھی اس کا وہی وزن، برائی لکھی ہوئی ہو تو بھی اس کا وہی وزن، جتنی نیکی میں خلوص زیادہ ہوگا اتنا اس کے اندر وزن نمایاں ہوگا اور جتنا اس میں خلوص کم ہوگا اتنا اس میں وزن کم ہوگا بہر حال اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ یہ سارے کے سارے معاملات طے پا جائیں گے۔

اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اشخاص کو ہی تول لیا جائے بعض روایت سے یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ نیکی بدی کے اعتبار سے اشخاص کے وزن میں بھی فرق پڑے گا اب یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ہے کہ جس طرح سے چاہے وہ انسانوں میں فیصلے کرلے اور اس فیصلے کے ساتھ حق اور باطل مومن اور کافر یہ سارے کے سارے جدا ہو جائیں گے

نقصان پہنچایا تھا، کوئی کہے گا یا اللہ! اس نے میرے پیسے دبا لیے تھے، اس طرح دعویدار بھی بہت آتے چلے جائیں گے، کسی کو اس نے مالی نقصان پہنچایا ہوگا، کسی کی عزت کو نقصان پہنچایا ہوگا، کسی کو بے وجہ گالی دی ہوگی، کسی کو بے وجہ مارا ہوگا، یہ دعویدار بھی آتے چلے جائیں گے۔

اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس دن چونکہ روپیہ پیسہ تو ہوگا نہیں تو وہاں فیصلہ جو اللہ تعالیٰ نے کرنا ہے وہ ظالم کی نیکیاں لے کر مظلوم کو دی جائیں گی، جو آتا جائے گا دعویٰ ثابت ہوتا چلا جائے گا تو اس کی نیکیوں میں سے اٹھا کر اس کو دیتے چلے جائیں گے حتیٰ کہ اس کی نیکیاں ساری کی ساری ختم ہو جائیں گی جب نیکیاں ساری کی ساری ختم ہو جائیں گی تو پھر بھی دعویدار باقی ہوں گے تو پھر دعویداروں کے گناہ لے کر اس کے اوپر ڈالنا شروع کر دیں گے، چونکہ نیکیاں تو دینے کے لیے ہوں گی نہیں پھر دعویداروں کے گناہ لے کر ڈالنا شروع کر دیں گے حتیٰ کہ جس وقت فیصلہ ہوگا سارے دعویداروں کے دعوے ختم ہوں گے تو اس شخص کے پاس اسی طرح سے گناہوں کے ڈھیر لگ جائیں گے جس طرح سے پہلے یہ نیکیوں کے ڈھیر لے کر گیا تھا آپ ﷺ نے فرمایا یہ حقیقت میں مسکین ہے۔

یہ مسکین اس لیے کہ ایسے موقع پر لٹ گیا کہ اب اس کے پاس سنبھلنے کا موقع بھی کوئی نہیں یعنی دنیا کے اندر اگر کوئی شخص لٹ جائے، ڈاکو اسے لوٹ کر لے جائیں، کسی وجہ سے اس کا سرمایہ ختم ہو جائے تو پھر کمانے کا موقع ہوتا ہے لیکن یہ شخص ایسے موقع پر لٹ گیا جس وقت سنبھلنے کا موقع نہیں، زندگی بھر کی کمائی بھی دے بیٹھا اور دوسروں کے گناہ جو تھے وہ بھی اپنے سر ڈلوا لیے سب سے بڑھ کر مسکین یہ ہے، تو یہ لوگ ہیں خسارے میں پڑنے والے جن کی نیکیوں کے ترازو ہلکے ہو جائیں گے یا تو ان کے پاس نیکیاں ہوں گی نہیں یا نیکیاں بھی تھیں لیکن اس کے مقابلے میں اس قسم کا کردار اختیار کیا ہوا تھا کہ نیکیاں اس وقت میں لٹ گئیں، تو یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال لیا ہے۔

یہ باتیں سمجھنے کی ہیں، دل اور دماغ میں حاضر رکھنے کی ہیں، اس لیے ابتداء ابتداء میں ان باتوں کی وضاحت آپ کے سامنے کر رہا ہوں کہ اگر کوئی سنبھلنا چاہے تو اس کی زندگی کا رخ بدلنے کے لیے کافی ہے، یہی تاثیر ہے قرآن کریم کی جس وجہ سے اس کو انقلابی کتاب کہتے ہیں کہ انسانوں کی حالت بدلنے میں جتنا موثر کردار اس نے ادا کیا ہے کوئی کتاب انسان کے اندر اتنا اثر پیدا نہیں کر سکی، اس کا ایک ایک جملہ ایسا ہے کہ انسان کی زندگی کا رخ بدل کر رکھ دیتا ہے وہ یہی جملے ہیں جو آپ کے سامنے آ رہے ہیں ان حقیقتوں کو اگر آپ اپنے ذہن میں بٹھا لیں

گے تو زندگی کا رخ بدل جائے گا، برائی سے نیکی کی طرف رجحان ہو جائے گا، ایک برا انسان جو ہے لمحوں کے اندر اس میں نیکی کے جذبات ابھر سکتے ہیں بشرطیکہ ان حقائق کو اپنے دل کے اندر بٹھانے کی کوشش کرے یہی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا۔

خسارے میں پڑنے کی وجہ:

"بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ" اور خسارے میں پڑنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہماری آیات کا حق ادا نہیں کرتے، ہماری آیات پر ظلم کرتے تھے اور ظلم کا معنیٰ ہے حق تلفی، ہماری باتیں جو ان کے سامنے آتی تھیں وہ ان کو حق نہیں پہچانتے تھے، اگر ان کو حق پہچانتے، ان کے مطابق عمل کرتے تو آج خسارے میں نہ ہوتے۔

"بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ" ظلم کا صلہ زیادہ تر علیٰ آیا کرتا ہے "ظلم علیه ،ظلموا علی انفسھم" اور یہاں صلہ باء آ گیا اس لیے باء یا تو علیٰ کے معنیٰ میں ہے کہ ہماری آیات پر ظلم کرتے تھے یا پھر یہاں تضمیم ہو جائے گی تضمیم کا معنیٰ ہوتا ہے کہ ایک فعل کے ضمن میں دوسرا معنیٰ ڈال دیا جائے تو پھر وہ یوں نکل آئے گا "بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ أَنْفُسَهُمْ" "يَظْلِمُونَ" کا مفعول علیحدہ نکال لیجئے "كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِنَا" لوگ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے "وَيَظْلِمُونَ أَنْفُسَهُمْ" اور اپنے نفسوں کے اوپر ظلم کیا کرتے تھے اپنے نفس پر ظلم کرنا یہ بھی حق تلفی کے معنیٰ میں ہی ہے تو یہاں تک جو مضمون آپ کے سامنے آیا یہ ہے آخرت کے احوال ذکر کرنے کے بعد ڈرانا تا کہ آخرت کا تصور کر کے ان باتوں کو سوچ کے لوگ برائی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کی طرف آئیں۔

اللہ تعالیٰ کے مادی احسانات:

اگلے جملے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر جو انعامات ہوئے وہ احسانات جتلائے جا رہے ہیں کیونکہ احسان بھی ایک ایسی چیز ہے کہ جو محسن کا فرمانبردار بنا تا ہے، جب آپ کو بتایا جائے گا کہ آپ پر فلاں احسان کیا، فلاں احسان کیا اگر طبیعت کے اندر شرافت موجود ہو تو پھر انسان محسن کی رعایت رکھا کرتا ہے اور محسن کے سامنے جھکتا ہے، اس کی اطاعت کرتا ہے۔

پہلے یہ مادی احسان ہے "وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ" البتہ تحقیق ہم نے تمہیں زمین میں ٹھکانہ دیا "وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ" اور تمہارے لیے اس زمین میں اسباب زیست پیدا کیے، معایش کا معنیٰ آپ کے

سامنے ذکر کیا تھا کہ معایش یہ جمع ہے معیشت کی یہ مصدر میمی ہے "عاش یعیش" سے، "عاش یعیش" کا معنی ہے زندگی گزارنا تو یہاں "معایش" سے مراد ہے اسباب معیشت، زندگی گزارنے کے اسباب یعنی ہم نے تمہیں زمین میں ٹھہرادیا، ٹھہرانے کے بعد ایسے نہیں چھوڑ دیا کہ نہ تمہیں کچھ کھانے کو ملے، نہ پہننے کو ملے، نہ کوئی رہنے کو ٹھکانہ ملے، یہ بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے روٹی، کپڑے اور مکان کا پورا انتظام کیا اس زمین میں، جو چیز آپ کو کھانے کے لیے چاہیے تھی اللہ تعالیٰ نے یہاں زمین میں وہ بھی پیدا کی، جو آپ کو علاج معالجے کے لیے چاہیے تھی اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر وہ بھی پیدا کی، راحت، آرام، آرائش، زیبائش کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے وہ ساری کی ساری پیدا فرمائیں، آپ غور فرمائیں کہ زمین اللہ کا اتنا بڑا گودام ہے کہ بنی آدم اس میں سے اپنی ضرورت کی چیزیں نکال رہے ہیں اور استعمال کر رہے ہیں کوئی چیز بتاؤ جو آپ کی زندگی کے اندر استعمال میں آرہی ہو اور وہ زمین سے نہ نکلتی ہو، یہ گھڑی ہے یہ بھی زمین سے نکلی، یہ عینک ہے یہ بھی زمین سے نکلی، کوئی چیز ایسی نہیں جو براہ راست آسمان سے اتری ہو سب کچھ یہیں سے نکلتا ہے پس نکالنے کا طریقہ معلوم ہونا چاہیے اور نکالنے کی ہمت ہونی چاہیے۔

اور اگر آپ ہی ہاتھ باندھ کر بیٹھ جائیں اور کوئی کام ہی نہ کریں تو اس زمین میں سوائے گرد مٹی کے آپ کو کچھ نہیں ملے گا، باہر منہ کھول کر بیٹھ جاؤ تو سارا دن مٹی کے ساتھ آپ کا منہ بھر جائے گا اس سے زائد آپ کو کوئی چیز نہیں ملے گی، نہ مٹھائی ملے، نہ کوئی لذیذ پھل ملے، منہ کھول کر بیٹھ جائیں گے تو اڑنے کی مٹی آپ کے منہ کو بھر دے گی، ست آدمیوں کے لیے یہاں سوائے مٹی کے کچھ بھی نہیں ہے، کاہل آدمی، ست آدمی، بدعمل آدمی، جاہل آدمی کہ جو جانتا بھی کچھ نہیں اور کرتا بھی کچھ نہیں اس کو اس زمین میں سے سوائے کرکری مٹی کے اور کچھ بھی نہیں ملے گا لیکن جتنا جتنا آپ علم حاصل کرتے چلے جائیں گے، جتنا جتنا عملی زندگی اختیار کرتے چلے جائیں گے تو دنیا کی کونسی نعمت ہے جو دنیا میں موجود نہیں، اپنے ہنر کے ساتھ اور اپنی ہمت کے ساتھ نکالو، سونا اس میں، چاندی اس میں اور آپ کی جتنی بھی ضروریات زندگی ہیں ساری کے ساری اسی میں ہیں، بس اسی کو چھانتے جاؤ اور اس میں سے نکالتے جاؤ اور پھر تمہیں اللہ تعالیٰ کے انعام کا احساس ہوگا کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے ہماری ضروریات اس زمین میں کس قدر مہیا کی ہیں۔

انسانوں کی جہالت کا نتیجہ:

یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے آپ کو ایک علم کے حامل قرار دے کر جو حقیقت کے اعتبار سے جہالت ہے اللہ تعالیٰ نے اس زمین کے اندر نعمتیں رکھی تھیں اس لیے رکھی تھیں کہ انسان راحت اور آرام کے ساتھ زندگی گزارے اور پھر اپنے مولا اور محسن کو یاد کرے اس کی اطاعت کرے، اسی کو غلط ترکیبیں دے دے کر لوگوں نے انسانوں کی ہلاکت کے اسباب بھی اسی میں سے نکال لیے، انسانوں کو مارنے کے لیے آج جو کچھ آپ کے سامنے عجیب وغریب قسم کے بم اور دوسری چیزیں ہیں وہ بھی تو زمین سے نکلی ہیں لیکن یہ انسان کی جہالت ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں علم پر چل رہا ہوں، یہ جہالت ہے کہ اسی زمین کو جس میں اللہ تعالیٰ نے اسباب معیشت رکھے تھے انہیں اسباب معیشت کی غلط ترکیب دے کر اپنے لیے ہلاکت کا سامان بنالیا یہ غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔

ورنہ اللہ تعالیٰ نے تو زمین کو انسان کے لیے راحت کا باعث بنایا ہے اور اس میں انسان کی راحت کے اسباب پورے کے پورے رکھے ہیں، یہی لوہا ہے جس کو آپ اپنی زندگی کے اندر استعمال کرتے ہیں، کتنے کام ہیں جو لوہے کے ذریعے سے ہوتے ہیں اگر لوہا نہ ہوتا تو آپ کو کپڑے سینے کے لیے سوئی نہ ملتی یعنی چھوٹے چھوٹے کام سے لیکر بڑے بڑے کام تک دیکھو لوہا کتنا استعمال ہو رہا ہے، ہم نے لوہا اتارا جس میں لوگوں کے لیے منافع ہیں اور دوسری صورت بھی ہے کہ اس میں "بَاْسٌ شَدِیْدٌ" بھی ہے اس سے آپ تلوار بھی بناتے ہیں، نیزے بھی بناتے ہیں اور اسی سے آپ دوسری چیزیں بھی بناتے ہیں لیکن وہ بوقت ضرورت اپنے دشمن کو دفع کرنے کے لیے ہے کوئی شیر آپ پر حملہ آور ہو گیا، کوئی دوسری چیز آپ پر حملہ آور ہو گئی تو دفاع کے اندر بھی لوہا استعمال ہوتا ہے۔

اب یہ علیحدہ بات ہے کہ انسانوں نے انسان کو ہلاک کرنے کے لیے سب سے زیادہ استعمال ہی اسی کا شروع کر دیا بہر حال یہ اپنے اپنے فہم کی بات ہے اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر اس قسم کے اسباب زیست اس زمین کے اندر رکھے ہیں چاہے آپ نے ہلاکت کے اسباب بھی بے شمار اس کے اندر نکال لیے یہ اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے شکوہ:

"قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ" یہ ایک قسم کا شکوہ ہے، شکایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو اتنے انعامات ہوں

لیکن تم بہت کم شکر کرتے ہو، شکر کا معنیٰ قدر دانی، اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت کی قدر دانی کم کرتے ہو، نعمت کی قدر دانی کیا ہے؟ نعمت کی قدر دانی یہ ہوتی ہے کہ یہ احساس ہو کہ ہمارے منعم اور محسن نے دی ہے اس تصور کے ساتھ اس کو استعمال کریں اور پھر ہمارے دل میں دماغ میں دینے والے کی عظمت ہو اور اس دینے والے کی فرمانبرداری ہو یہ ہے شکر گزاری، نسبت اللہ کی طرف ہو، یہ نہ ہو کہ ہم نے اپنے کمال سے پیدا کرلی، یہ خیال کہ مجھے یہ چیز میرے کمال سے مل گئی یہ شکر گزاری کے منافی ہے۔

شکر کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سوال اور اللہ کا جواب:

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یا اللہ! تیری نعمتیں تو اتنی ہیں جو شمار میں نہیں آسکتیں، اتنی زیادہ نعمتیں ہیں خود قرآن کریم میں آئے گا "اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" کہ اگر تم اللہ کے احسانات کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کرسکو گے تو ان ساری نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے اور اگر کسی نعمت پر شکر کرنے کی توفیق ہو جائے تو وہ مستقل تیری نعمت ہے اس کا آگے سے کس طرح شکر ادا کیا جائے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سوال ہے اللہ تعالیٰ پر کہ یا اللہ! اول تو تیری نعمتیں بے شمار ہیں ان کا شکر کس طرح سے ادا کریں اور اگر کسی نعمت پر شکر ادا کرنے کا موقع مل ہی جائے تو یہ مستقل تیری نعمت ہے کہ شکر ادا کرنے کا موقع مل گیا تو کوئی ایسی چیز ہے کہ جس کے ساتھ انسان اس ذمہ داری سے نکل جائے کہ واقعی میں نے اللہ کا شکر ادا کردیا اول تو نعمتیں شمار میں نہیں ہیں جیسے گلستان کی ابتداء میں جہاں ہمارے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ترغیب دی ہے وہاں آپ نے دیکھا ہوگا کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ہم سانس لیتے ہیں تو سانس کا اندر جانا ہماری زندگی بڑھاتا ہے، سانس کا باہر آنا ہمارے لیے راحت کا باعث ہے، ایک سانس میں دو نعمتیں موجود ہیں اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے تو ایک سانس میں دو دفعہ الحمدللہ کہو تو صرف ایک سانس کا شکر ادا ہوتا ہے اور باقی دوسرے کام کیا ہوئے اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے پوچھا کہ اے اللہ! تیرا شکر ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی تیری نعمتیں ہیں اور ہم شکر کیسے ادا کریں اور اگر کسی نعمت کا شکر ادا ہو جائے تو وہ مستقل تیری نعمت ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ موسیٰ! بس یہ خیال رکھنا کہ جو کچھ مل رہا ہے میری طرف سے مل رہا ہے میرے شکر ادا

اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا" وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ "اس دن وزن حق ہے اس دن تول حق ہے یا وزن حقیقی اس دن ثابت ہے اور یہ ترہیب ہے آخرت کے ذکر کرنے کے ساتھ کہ جو کچھ تم کرتے ہو قیامت کے دن سارے کا سارا تولا جائے گا اور یہ تولنا برحق ہے، اس میں کوئی کسی قسم کی شک کی گنجائش نہیں تو اپنی زندگی گزارتے ہوئے یہ بات بھی مستحضر رکھا کرو کہ تم بھی تولے جاؤ گے، تمہارے اقوال بھی تولے جائیں گے اور تمہارے افعال بھی تولے جائیں گے۔

وزنِ اعمال کا نتیجہ:

اور اس تولنے کے نتیجے میں "فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ "پھر جس کے تول بوجھل ہو جائیں گے یعنی نیکی کے تول جس کے ترازو بوجھل ہو جائیں گے یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے تو یہاں "موازن" سے نیکی کے "موازن" مراد ہیں جس کی نیکی کے وزن زیادہ ہوں گے وہ فلاح پانے والے ہیں، کامیاب ہونے والے ہیں۔

"وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ" اور جس کے تول ہلکے ہو گئے یعنی نیکیاں اس کے پلڑے میں نہ ہوئیں یا ہوئیں تو گناہوں کے مقابلے میں ہلکی ہو گئیں "فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ" تو پھر یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا، خسارے میں پڑنے والے، نقصان میں پڑنے والے وہی لوگ ہیں کہ جن کی نیکیوں کے پلڑے قیامت میں جا کر ہلکے ہو جائیں گے، سب سے زیادہ خسارے میں یہ لوگ ہیں۔

حقیقی مسکین:

جیسے ایک حدیث میں آتا ہے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہ تمہارے اندر مسکین کون ہے تم مسکین کس کو سمجھتے ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا یا رسول اللہ! مسکین وہ ہے جس کے پاس درہم دینار نہ ہوں جیسے ہم آج کل مسکین اسے کہتے ہیں جس کے پاس سونا نہیں، چاندی نہیں، روپے نہیں ہم کہتے ہیں کہ یہ مسکین ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حقیقی مسکین وہ ہو گا میری امت میں سے کہ جو قیامت کے دن آئے گا جس وقت آئے گا تو اس کے پاس نیکیوں کے ڈھیر ہوں گے، نماز ہو گی، روزہ ہو گا، حج ہو گا، زکوۃ ہو گی، تلاوت ہو گی، تسبیحات ہوں گی، بہت ساری نیکیاں وہ لے کر آئے گا لیکن جس وقت وہ نیکیاں لے کر آئے گا تو اس کے مقابلے میں دعویدار بھی آ جائیں گے کوئی کہے گا یا اللہ! اس نے مجھے بے وجہ گالی دی تھی، کوئی کہے گا یا اللہ! اس نے مجھے بے عزت کیا تھا، میری عزت کو

کرنے کے لیے کافی ہے یعنی یہ نہ تمہارے دل میں خیال آئے کہ ہم نے ہی اپنے ہنر سے کمالیا، اپنی قابلیت سے حاصل کر لیا، ہر وقت تمہارے دھیان میں یہ ہو کہ جو کچھ ملتا ہے اللہ کی طرف سے ملتا ہے ہمارا اس میں کوئی کمال نہیں، یہ اللہ کا احسان ہے یہ جذبہ اگر انسان کے دل کے اندر رہے تو سمجھو کہ انسان شکرگزار ہے لیکن یہ جذبہ بنیاد ہے اگلی نیکی کی کہ جب ہر وقت آپ کو احساس ہو گا کہ کھانے کو وہ دیتا ہے، پینے کو وہ دیتا ہے، پہننے کو وہ دیتا ہے، صحت ہمیں اس نے دی، مال ہمیں اس نے دیا، دولت ہمیں اس نے دی، جائیداد اس نے دی، دو کان اس نے دی، جب یہ تصور آپ کے دل میں رہے گا تو "اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ" کہ انسان احسان کا بندہ ہے جب اس کے تصور میں یہ ہوتا ہے کہ یہ انعامات مجھے فلاں نے دیے ہیں تو پھر اطاعت اور عبادت اور محبت عظمت یہ ساری چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ انسان کی زندگی ایک صالح اور شکرگزار بندے کی زندگی بن جاتی ہے " قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ" تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا

البتہ تحقیق پیدا کیا ہم نے تمہیں پھر ہم نے تمہاری صورت بنائی پھر کہا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو

لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾

آدم کو پھر انہوں نے سجدہ کر دیا سوائے ابلیس کے، ابلیس سجدہ کرنے والوں میں سے نہ ہوا (۱۱)

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کس چیز نے روکا تجھے سجدہ کرنے سے جب میں نے تجھے حکم دیا تھا ابلیس نے کہا میں اس آدم سے بہتر ہوں،

خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ

پیدا کیا تو نے مجھے آگ سے اور پیدا کیا اس آدم کو مٹی سے (۱۲) اللہ تعالیٰ نے فرمایا نیچے اتر جا

مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ

جنت سے پس نہیں ہے تیرے لیے کہ تو بڑا بنے اس آسمان میں پس تو نکل جا بے شک تو

الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ

ذلیلوں میں سے ہے (۱۳) ابلیس نے کہا مجھے مہلت دے دے اس دن تک جس دن میں لوگ اٹھائے جائیں گے (۱۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بے شک تو

مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ

مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے (۱۵) ابلیس نے کہا تیرے مجھ کو گمراہ کر دینے کے سبب سے البتہ ضرور بیٹھوں گا میں ان کے لیے تیرے

الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ

سیدھے راستے پر (۱۶) پھر البتہ ضرور آؤں گا میں ان بنی آدم کے پاس ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے

وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾

اور ان کی دائیں طرف سے اور ان کی بائیں طرف سے، اور تو نہیں پائے گا ان میں سے اکثر کو شکر گزار (۱۷)

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو نکل جا آسمان سے اس حال میں کہ تو برائی بیان کیا ہوا ہے اور دھتکارا ہوا ہے جو شخص تیرے پیچھے لگے گا ان میں سے البتہ ضرور بھر دوں گا میں

جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

جہنم کو تم سب سے ﴿۱۸﴾ اے آدم تو اور تیری بیوی سکونت اختیار کرو جنت میں

فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا

پھر تم دونوں کھاؤ جہاں سے تم چاہو اور اس متعین درخت کے قریب نہ جانا پھر ہوجاؤ گے تم اپنا

مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا

نقصان کرنے والوں میں سے ﴿۱۹﴾ وسوسہ ڈالا ان دونوں کے لیے شیطان نے تاکہ ظاہر کردے وہ ان دونوں کے لیے

وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ

وہ چیز جو چھپائی گئی تھی ان دونوں سے ان کی شرم گاہوں سے اور اس ابلیس نے کہا کہ نہیں منع کیا تم دونوں کو تمہارے رب نے اس

الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

درخت سے مگر اس بات کو ناپسند کرنے کی وجہ سے کہ تم فرشتے بن جاؤ یا ہوجاؤ تم ہمیشہ رہنے والوں میں سے ﴿۲۰﴾

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا

ابلیس نے بار بار قسم کھائی کہ بے شک میں تمہارے لیے خیرخواہوں میں سے ہوں ﴿۲۱﴾ ان دونوں کو مائل کرلیا ابلیس نے دھوکے کے ساتھ، جب

ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا

ان دونوں نے چکھا اس درخت کو تو ظاہر ہوگیا ان کا ننگ، وہ دونوں رکھنے لگ گئے اپنے اوپر

مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا

جنت کے پتے، اور آواز دی ان دونوں کو ان کے رب نے کیا میں نے تم دونوں کو اس

الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا

درخت سے روکا نہیں تھا اور تم دونوں سے کہا نہیں تھا کہ شیطان تمہارا صریح دشمن ہے ﴿۲۲﴾ وہ دونوں کہنے لگے

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ

اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر زیادتی کی اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور تو ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم ہوجائیں گے

الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي

خسارہ پانے والوں میں سے ﴿۲۳﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اتر جاؤ سارے تمہارا بعض بعض کے لیے دشمن ہوگا اور تمہارے لیے

الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ

زمین میں ٹھہرنے کی جگہ اور فائدہ اٹھانا ہے ایک وقت تک ﴿۲۴﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسی زمین میں تم زندگی گزارو گے

وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع

اور اسی کے اندر تمہیں موت آئے گی اور اسی زمین سے تم نکال لیے جاؤ گے ﴿۲۵﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انسانوں پر مادی احسان ہوا تھا اس کا ذکر پچھلے رکوع کی آخری آیت میں آیا، زمین میں قدرت دینا، اقتدار بخشنا، ٹھکانہ دینا، اور کھانے پینے کا سامان وافر مقدار میں مہیا کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کا ایک مادی احسان ہے جو انسان پہ ہوا جس کے ساتھ انسان اپنی بدنی زندگی کو باقی رکھتا ہے، اگلے رکوع میں جیسے کہ آپ نے ترجمہ سن لیا، اللہ تعالیٰ آدم اور اولاد آدم کی روحانی کرامت جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی تھی اس کو ذکر کر رہے ہیں کہ کس طرح سے اللہ تعالیٰ نے عزت بخشی اور تمہیں اتنے اونچے مقام پر پہنچایا، مسجود ملائک بنایا تو تمہیں چاہیے کہ تم اپنے منصب کی اور مقام کی رعایت رکھو اور اپنی اس عزت کو بچانے کی کوشش کرو جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں دی ہے۔

انسان کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی آدم کے بنائے جانے کے بعد جب یہ انسان کا سلسلہ شروع ہوا تو پیدا ہوتے ہی جس قسم کے حالات پیش آئے تھے اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کے سامنے آپ کی وہ ابتدائی تاریخ دھراتے ہیں، بہت اہم واقعہ ہے جس کو ذکر کیا جا رہا ہے، بہت سوچنے کی بات ہے، ذکر یہ کیا جا رہا ہے کہ تمہیں جس وقت پیدا کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ کرامت بخشی تھی کہ اپنی جانب سے روح پھونکی اور روحانی کمالات عطا کیے، فرشتوں کو جس قسم کے اشکالات تھے تمہاری فضیلت کے متعلق وہ اشکالات اللہ تعالیٰ نے دور فرمائے جیسے کہ سورۃ

البقرۃ میں آیا ہے اور پھر تمہاری عزت اور کرامت ظاہر کرنے کے لیے آدم کو تمہارے باپ کو اور آدم کا وجود چونکہ تمام انسانیت کا ایک اجمالی وجود ہے تو یوں سمجھو کہ سارے انسانوں کو فرشتوں کے لیے مسجود بنایا۔

ابلیس جنات میں سے ہے:

اور یہ ابلیس جو کہ اصل کے اعتبار سے جنات میں سے ہے، یہ فرشتہ نہیں سورۂ کہف کے اندر صراحت آئے گی آپ کے سامنے "وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ" وہ جنات میں سے تھا جو اپنے رب کے حکم کے سامنے سرکش ہو گیا نافرمان ہو گیا "كَانَ مِنَ الْجِنِّ" وہاں صراحت ہے، آدم کے پیدا ہونے سے پہلے جنوں کی آبادی تھی یہ جو تھا ابلیس جس کا نام بعض کتابوں کے اندر عزازیل نقل کیا گیا ہے جیسا کہ کریمہ میں آپ نے پڑھا تھا "تکبر عزازیل راخوار کردبزندان لعنت گرفتار کرد" تو یہ عبادت گزار تھا، بہت زیادہ عبادت کرتا تھا، بہت بڑا صوفی اور پرہیزگار تھا اور اس کی آمد و رفت آسمان پر تھی جیسے سرور کائنات ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے عام شیاطین اور جنات بھی آسمان کی طرف جاتے تھے روایات میں جس طرح آتا ہے، قرآن کریم کی آیات میں بھی اشارہ ہے کہ حضور ﷺ کے تشریف لانے کے بعد ان کو دھتکارا گیا اور آسمان کے پاس ان کا جانا ممنوع ٹھہرا دیا گیا ورنہ ان کی آمد و رفت اوپر تک تھی بادلوں سے اوپر تک خبریں سننے کے لیے یہ آیا جایا کرتے تھے بعض آیات کے اندر اس کی تفصیل آئے گی تو یہ بھی جاتا تھا، ان فرشتوں میں شامل رہتا تھا، فرشتوں میں یہ ظاہری طور پر شامل تھا۔

لیکن یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ یہ فرشتوں کا استاذ تھا، استاذ ملائکہ تھا یہ بظاہر واعظوں کی بنائی ہوئی بات ہے، ورنہ روایات سے اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں نکلتا کہ یہ فرشتوں کا استاذ تھا، استاذ ملائکہ کے طور پر اگر اس کو ذکر کیا کرتے ہیں تو یہ انہی لطیفوں میں سے ہے جس قسم کے لطیفے واعظ اپنے ذہن سے تراشتے رہتے ہیں، یہ بھی انہیں باتوں میں سے کوئی بات معلوم ہوتی ہے باقی استادی وغیرہ اس کو کچھ حاصل نہیں۔

ابلیس کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار اور اس کی وجہ:

ہاں عملاً ان میں شامل رہتا تھا جب یہ شامل رہتا تھا تو جتنے اس وقت آسمان پر موجود تھے اللہ تعالیٰ نے سب کو حکم دیا کہ میں جو اس کو خلیفہ بنا رہا ہوں یہ خلیفہ فی الارض ہے، میں اس کو زمین کے اندر اپنا نائب بنانے والا

ہوں تو تم اس کے سامنے سجدہ کر کے اس کی عزت نمایاں کرو اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا اور فرشتوں کا تو کام ہے کہ "یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ" کہ وہ تو وہی کرتے ہیں جو اللہ کی طرف سے حکم آجاتا ہے "لَا یَعۡصُوۡنَ اللّٰہَ مَاۤ اَمَرَہُمۡ" جو حکم اللہ تعالیٰ دے دے وہ نافرمانی نہیں کرتے، جب حکم ہوا تو وہ سارے کے سارے سجدے میں گر گئے۔

یہ چونکہ وہیں ان میں شامل تھا تو سجدہ کرنے کا حکم اس کو بھی تھا کہ آدم کے سامنے سجدہ کر، اگرچہ کسی آیت کے اندر یہ صراحتاً نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو کہا تھا کہ تو سجدہ کر پھر اس نے انکار کیا لیکن یہ "اِذۡ اَمَرۡتُکَ" کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ جب سجدے کا حکم فرشتوں کو ہوا تھا "اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ" تو اس میں یہ ابلیس بھی شامل تھا، یہ "اِذۡ اَمَرۡتُکَ" کا لفظ صراحتاً بتاتا ہے اگرچہ "اُسۡجُدُوۡا" کا حکم بظاہر فرشتوں کو ہے اور کسی جگہ بھی "اُسۡجُدُوۡا" کا خطاب ابلیس کو نہیں ہے لیکن "اِذۡ اَمَرۡتُکَ" کا لفظ بتاتا ہے کہ اس حکم کے اندر یہ بھی شامل تھا ورنہ وہ عذر کر سکتا تھا کہ جی آپ میرے پر ناراض کیوں ہو رہے ہیں مجھے تو آپ نے حکم ہی نہیں دیا لیکن اس نے یہ عذر نہیں کیا وہ سمجھتا تھا کہ اس حکم میں میں بھی شامل تھا جو آدم کے سامنے جھکنے کے متعلق دیا گیا ہے، اس حکم میں میں بھی شامل ہوں وہ بھی سمجھتا تھا لیکن اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

کیوں انکار کر دیا؟ حسد میں مبتلاء ہو گیا گویا کہ وہ امیدوار تھا کہ شاید یہ خلافت ارضی میرے حصے میں آئے گی لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک نئی مخلوق کھڑی کر دی اس خلافت کو سنبھالنے کے لیے اور وہ اپنے آپ کو سمجھتا تھا کہ میں جو اتنا عبادت گزار ہوں، اتنا نیک ہوں اور اتنی اللہ کی اطاعت وعبادت کرتا ہوں تو مستحق میں ہوں بس اس کے دل میں یہ جو استحقاق آیا تو آدم کی عزت کو دیکھ کر جل گیا، یہ حسد کی بیماری سب سے پہلے اس کا ظہور آدم کے مقابلے میں ابلیس سے ہوا ہے کہ وہ آدم کی عزت کو دیکھ کر برداشت نہیں کر سکا اور دیکھ کر جل گیا۔

آسمان پر پہلی معصیت اللہ تبارک وتعالیٰ کی جو ہوئی ہے وہ یہی حسد کے رنگ میں نمایاں ہوئی کہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام پر حسد کیا اور اس کی عزت کو برداشت نہیں کر سکا اس لیے اس کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کیا جیسا اللہ کو مطلوب تھا، انکار کر دیا جب انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ڈانٹ دی کہ میں نے جب کہا تھا تو تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ یاد رکھیے اس بات کو یہ بعض بعض چیزیں نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں کہ جب ایک دفعہ کوئی شخص کسی معاملے میں

اڑ جائے اور تہیہ کر لے کہ میں نے یہ کام نہیں کرنا پھر کہنے والے کی عظمت، اس کا جلال، اس کی عزت کوئی چیز بھی سامنے نہیں ہوتی وہ سب چیزیں پردے میں چلی جاتی ہیں، پھر انسان بے حیاء ہو کر، بے غیرت ہو کر جب ڈٹ جاتا ہے، اڑ جاتا ہے تو پھر کوئی چیز اس کو ڈرا نہیں سکتی۔

حیرت کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست کلام فرما رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال جس کے سامنے فرشتوں کی اور انبیاء علیہم السلام کی بھی بات نہیں بنتی، اس کی عظمت اور جلال کے سامنے ان سب کی زبان بند ہوتی ہے اور اس کے خوف کے سامنے ہر کوئی دبتا ہے لیکن جب یہ آدم کے مقابلے ضد میں آیا تو اللہ کے سامنے بھی ڈٹ گیا اس کی عظمت اور جلال سب پردے میں چلے گئے، پوری ڈھٹائی کے ساتھ کہتا ہے کہ میں کیوں سجدہ کروں، میں اس سے اچھا ہوں اور یہ مجھ سے گھٹیا ہے، جب یہ مجھ سے گھٹیا ہے تو گھٹیا کو چاہیئے کہ اعلیٰ کو سجدہ کرے، اعلیٰ ادنیٰ کو کیوں سجدہ کرے گویا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو اپنے خلاف حکمت قرار دیا اور ساتھ دلیل بھی ٹھوک دی، اپنے اچھے ہونے کی دلیل بھی ٹھوک دی ساتھ ہی کہتا ہے تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے، یہاں لفظ صرف اتنا ہی ہے مطلب اس کا سمجھ میں آ گیا کہ آگ مٹی کے مقابلے میں افضل ہے، مٹی ظلمانی ہے اور آگ نورانی ہے تو جب میں آگ سے بنا ہوں تو میں اچھا ہوں اور یہ مٹی سے بنا ہے تو یہ گھٹیا ہے، آگ اوپر کو جاتی ہے مٹی نیچے کو جاتی ہے، آگ کا ابھار تو اوپر کو ہوتا ہے اور مٹی جو ہے وہ نیچے کو جاتی ہے تو میں اس کو سجدہ کیوں کروں یہ اس نے آگے سے بے حیائی کے ساتھ جواب دیا۔

ابلیس کا اللہ تعالیٰ سے مکالمہ اور اللہ تعالیٰ کی ڈانٹ:

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آگے اس کی دلیل کا جواب نہیں دیا کہ تجھے غلط فہمی ہو گئی ہے، مٹی آگ سے گھٹیا نہیں ہے بلکہ مٹی افضل ہے اور آگ اگر مٹی سے افضل بھی ہے تو جو چیز آگ سے بنائی جائے ضروری نہیں ہے کہ ہر چیز جو مٹی سے بنائی جائے اس کے مقابلے میں افضل ہو، افضل بھی ہو تو بھی جب میں نے حکم دیا تھا، تجھے چاہیے تھا کہ تو مان جاتا، اس قسم کی چیزیں جیسے دلیل کے ساتھ کسی مقدمے کو توڑا جاتا ہے یہ انداز اللہ نے نہیں اپنایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ آگے سے اس کا انداز بھی متکبرانہ ہے اور جس وقت اس کا آگے سے انداز متکبرانہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے بھی پھر حاکمانہ جوتا دکھایا جواب یہی دیا کہ چل مردود نکل یہاں سے، پھٹکارا ہوا میرے سامنے اس قسم کی حجتیں کرتا ہے،

دفع ہو جا یہاں سے، نکل جا یہ حاکمانہ انداز ہے۔

اب چاہیے تو یہ تھا کہ وہ کم بخت کچھ بھی غیرت کرتا تو جب ایک بات اس کے منہ سے نکل گئی تھی پھر دیکھا کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو گئے تو پھر ہی وہ جھک جاتا لیکن وہی آگ والی صفت جو تھی وہ جھکنے کیسے دے، ایک دفعہ جب اکڑ آ گئی تو پھر وہ نکلے کیسے، اب اللہ تعالیٰ کی جھڑکیاں سن کر بھی وہ پتلا نہیں ہوا، اس میں نرمی نہیں آئی بلکہ وہ حسد جو تھا وہ حسد اس کو دوسرے راستے پر ڈال گیا اس کے سامنے یہ بات آ گئی کہ یہ آدم ہے جو اللہ نے بنایا ہے اور اس کی عزت نہ کرنے کی وجہ سے آج میں ٹھکرایا جا رہا ہوں تو جس کا مطلب یہ ہے کہ آدم اللہ کا بڑا لاڈلا اور بڑا پیارا ہے اور اس کی وجہ سے آج مجھے ٹھکرایا جا رہا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے کہ اچھا ناراض تو ہو گئے ہو، مجھے ذرا مہلت دو، اس کے کمالات میں دکھاؤں گا کہ یہ کیا چیز ہے اور جس کو سجدہ نہ کرنے کی بناء پر مجھے ٹھکرا رہے ہو مجھے ذرا چھٹی دو میں بتاؤں گا یہ کیا چیز ہے؟ اس کو اور اس کی اولاد کو ایسا بہکاؤں گا کہ ان میں سے اکثر تیرے نہیں رہیں گے، دیکھو ذرا چھٹی دے کر تمہیں اس لاڈلے کے کمالات دکھاؤں گا یہ آگے سے جس طرح سے حسد کرنے کی بناء پر بات ہوا کرتی ہے اکڑ کے ساتھ، بے غیرتی کے ساتھ وہ یوں ہو گیا گویا کہ آدم کی وجہ سے چونکہ وہ مردود ہوا تھا تو آدم کو مد مقابل ٹھہرا کر اللہ کو چیلنج دے رہا ہے، اپنے اسی دماغ کے ساتھ کہ میں ثابت کروں گا کہ یہ گھٹیا ہے اور میں اچھا ہوں آپ مجھے چھوڑ دو تو سہی مہلت تو دو جیسے آگے آپ کے سامنے آئے گا غالباً سورۃ بنی اسرائیل میں "لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ" مجھے ذرا چھوڑو میں اس کی اولاد کو ڈھاٹی مار لوں گا "لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ" احتنکن کا معنی ہوتا ہے "احتناك دابه" یہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض بیل یا گدھے گھوڑے جو ذرا سرکش ہو جاتے ہیں اور وہ کاشتکار سے زمیندار سے سنبھالے نہیں جاتے تو اس کے جبڑے کے رسی باندھ لیتے ہیں منہ میں سے رسی گزار کر جبڑے باندھ لیتے ہیں تو جس وقت اس کا جبڑا باندھ لیا جاتا ہے تو پھر وہ سرکش سے سرکش جانور جو ہے وہ بھی قابو آ جاتا ہے اس کو کہتے ہیں "احتناك دابه" اردو میں اس کو کہتے ہیں ڈھاٹی مار لینا کہتے ہیں مجھے چھوڑ دو تو سہی اس کی اولاد کو ڈھاٹی نہ مار لوں تو کہنا یعنی ان سب کو اس طرح سے باندھوں گا جس طرح سے سرکش جانور کو باندھا جاتا ہے یہ اس کے غرور کی انتہاء ہے جو اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے ظاہر کیا حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلے میں کہ میں اس کی اولاد کو اچھی طرح لگام دے لوں گا اور اس طرح سے قابو کر لوں گا جس طرح گھوڑے کا جبڑا باندھ کر اس کو قابو کر لیا جاتا ہے، اپنی بڑائی پر

اس کو اس طرح سے ناز تھا۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی وہی جواب دیا کہ جا دفع ہو، تو بھی جا اور جو تیرے پیچھے لگیں گے وہ بھی جائیں، میرا کیا بگاڑیں گے جو تیرے پیچھے لگیں گے سب کو اٹھا کر جہنم میں پھینک دوں گا، میرا کیا نقصان ہے اس میں، وہاں بھی وہی حاکمانہ انداز ہے کہ جا جا دفع ہو بہکا لینا جس کو بہکانا ہے میرا کیا نقصان کرو گے، ان میں سے اگر کوئی تیرے پیچھے لگ جائے گا، تیرا کہنا ماننے لگ جائے گا میرا کیا نقصان ہے تجھے بھی اور ان کو بھی سب کو اکٹھا کر کے جہنم میں پھینک دوں گا اگلے جواب کا حاصل یہ ہے، اب وہ تو چڑ گیا اور چڑ کر وہ مشتعل ہو گیا آدم کے خلاف اور اللہ نے کہا کہ بہت اچھا تو بھی زور آزمائی کر لینا، جا میری طرف سے چھٹی ہے، قیامت تک اس نے مہلت مانگی تھی قیامت تک ہی اس کو زندگی دے کر مہلت دے دی گئی لو ایک پہلوان تیار ہو گیا۔

ابلیس کا حضرت آدم علیہ السلام کو پھسلانا:

اب دوسری طرف آدم ہے، حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آدم! اب تو جا جنت میں، تو بھی اور تیری بیوی بھی دونوں جنت میں رہو لیکن دیکھنا ایک بات کا خیال کرنا وہ دشمن چیلنج دے گیا ہے، تمہارے متعلق وہ یوں کہہ گیا ہے اب اس کی باتوں میں نہ آنا اور باقی جنت میں جہاں چاہو کھاؤ پیو کھلا میدان ہے لیکن یہ درخت جو ہے اس سے ذرا بچ کر رہنا، اس کی تاثیر اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی رکھی ہوئی تھی جس کے بعد وہی اثرات نمایاں ہونے تھے جس قسم کے ہوئے، بس اس سے بچ کے رہنا اور اس بات کا خیال رکھنا کہ دیکھو تمہاری وجہ سے وہ مردود ہوا ہے اور تمہارے متعلق اس کے جذبات بہت خطرناک ہیں اس سے ہوشیار رہنا یہ کہہ کر ہمارے ابا جان کو اور ہماری اماں جان کو جنت میں ٹھہرا دیا، عزت کا لباس پہنایا، رہنے کے لیے اچھی جگہ دی، کھانے کے لیے نعمتیں دیں اب وہ کھاتے پھر رہے ہیں۔

اب شیطان جو تھا وہ تو اس تلاش میں پھرتا تھا کہ کوئی بات بنے تو میں اپنا انتقام لوں کہ جس کی وجہ سے میں دھتکارا گیا ہوں تو ذرا اس کا کمال بھی ظاہر کر دوں تو اس نے آدم اور حواء کی ایک خامی سے فائدہ اٹھایا اور وہ خامی اس نے تاڑی تھی اسی وقت ہی جب حضرت آدم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ نے تابوت بنا کر رکھا ہوا تھا، یہ ڈھانچہ بنا کر رکھا ہوا تھا ابھی روح نہیں ڈالی تھی اس وقت ہی حضرت آدم علیہ السلام کی اس نے کمزوری تاڑی تھی حدیث شریف میں آتا

ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ نے وجود بنایا کیونکہ اس طرح سے تو نہیں بنا جس طرح سے ہم بنے، پیدا ہوئے چھوٹے تھے بڑھتے گئے ایسا تو نہیں تھا وہ تو ایک دم ہی بنا تھا مٹی کا بنا کر اس میں روح ڈال دی جب اس کا سارے کا سارا وجود جو تھا وہ بنا پڑا تھا تو ابلیس آیا اور اس نے اردگرد گھوم کر دیکھا کہ یہ اندر سے کھوکھلا ہے جب اندر سے کھوکھلا ہے تو کہتا ہے کہ "خَلَقَ خَلْقاً لَا يَتَمَالَكُ" اللہ تعالیٰ نے یہ ایک ایسی مخلوق بنائی ہے جو اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکے گی یعنی اس کو بہکایا جا سکے گا، ہوا دی جا سکے گی، وسوسے اس میں ڈالے جا سکیں گے اس کا رخ موڑا جا سکتا ہے "خَلَقَ خَلْقاً لَا يَتَمَالَكُ" اللہ نے ایک ایسی مخلوق بنا دی ہے کہ جو اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکے گی، اس کے کھوکھلے پن کو دیکھ کر اس نے یہ اندازہ لگایا۔

اب اسی سے اس نے کام شروع کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ قوت دی ہے کہ نظر نہیں آتا اور اس کے خیالات جو ہیں وہ مختلف طریقوں کے ساتھ انسان کے قلب تک پہنچتے ہیں، وسوسہ کا معنیٰ یہی ہے کہ آہستہ آہستہ اس نے بات پہنچانی شروع کی، کچھ حواء کو پہنچائی اور کچھ آدم کو پہنچائی، چلتے پھرتے ہیں سب کچھ کھاتے پیتے ہیں آخر دل میں خیال آنے لگ گیا کہ اس درخت سے اللہ نے جو روکا ہے اس سے کیوں روکا ہے؟ اس میں کیا وجہ ہے یہ روکنے میں کیا حکمت ہے؟ تو یوں انسان کا ذہن حرکت کرتا ہے، دل میں خیال آیا کہ شاید اس میں کوئی نقصان کا پہلو ہو، پھر دل میں خیال ڈالا کہ نہیں نہیں، نقصان کا پہلو تھا اس لیے اللہ نے روکا ہے لیکن اس وقت تھا جب تم نئے نئے جنت میں آئے تھے اور یہ درخت بڑا قوت والا ہے اور تم اس وقت اس کو ہضم کرنے پر قادر نہیں تھے اب جنت کی نعمتیں کھاتے کھاتے تمہارا معدہ قوی ہو گیا ہے، اب اگر تم کھاؤ گے تو اب یہ ہضم ہو جائے گا اللہ تعالیٰ کا روکنا ٹھیک ہے یہ نہیں کہ روکنا غلط ہے، روکنا ٹھیک ہے لیکن یہ روکنا ایسے ہے جیسے دودھ پیتے بچے کو منع کریں کہ بھائی گوشت نہیں کھانا، دودھ پیتے بچے کو گوشت نہیں دیا جاتا کیونکہ اس کی انتڑیاں، اس کا معدہ اس کو ہضم نہیں کر سکتا، سنبھال نہیں سکتا مر جائے گا وہ کھانے سے لیکن جس وقت وہ تھوڑا سا جوان ہو جاتا ہے، دودھ پی پی کر اس میں قوت آ جاتی ہے پھر وہ سیروں گوشت کھا جاتا ہے، کیا ہوتا ہے اس سے قوت آتی ہے اس طرح سے یہ درخت ایسا ہے کہ جو اس کو کھالے فرشتہ بن جاتا ہے اور یہ درخت ایسا ہے کہ جو اس کو کھالے موت سے بچ جاتا ہے، ہمیشہ کی زندگی اس کو حاصل ہو جاتی ہے، یہ شجرۃ الخلد ہے، دائمی حیات والا درخت ہے، جس طرح سے آپ نے مشہور کر رکھا ہے کہ ایک آب حیات بھی ہے کہ

جو شخص وہ پانی پی لے وہ مرتا نہیں ہے اسی طرح سے یہ شجرۃ الخلد ہے دائمی حیات کا درخت ہے کہ جو اس کو کھا لے وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

اب آدم کچھ اپنے حالات کے طور پر سمجھتا تھا کہ فرشتے کو بھی ایک بہت بڑی کرامت حاصل ہے اور موت سے بچنے کا اگر یہ نسخہ ہے تو پھر تو واقعی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے لیکن وہ بات پھر یاد آجاتی کہ اللہ نے روکا ہے، پھر کچھ تاویلیں ہوتیں پھر وہ آتا ہے اور بار بار آکر قسمیں کھاتا ہے کہ اے آدم! میں جو تمہیں کہہ رہا ہوں اب اس کو کھالو موقع آگیا ہے بڑا اس کا فائدہ ہوگا، اللہ کی قسم، رب کی قسم، جس طرح سے ہمارے ہاں بہکانے والے کہا کرتے ہیں، قرآن کی قسم، ایمان سے کہتا ہوں کہ میں تمہارا بڑا خیر خواہ ہوں، تمہارے فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔

انسان ہمیشہ خیر خواہ بن کر ہی دوسرے کو متاثر کرتا ہے:

شیطان کا ہتھکنڈا جب شروع ہوتا ہے تو یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ پہلے وہ اپنے آپ کو آپ کا خیر خواہ بن کر آپ کے سامنے ظاہر کرے گا، خیر خواہ بن کر آپ سے دوستی لگائے گا، خیر خواہ بن کر آپ کو مشورے دے گا، آخر اس قسم کے ہلاکت کے گڑھے میں جا گرے گا کہ پھر یہاں سے اٹھنے کا موقع نہیں ہوگا، یہ ہمیشہ شیاطین الانس یا شیاطین الجن جو ہوں دشمن بن کر سامنے سے کوئی نہیں آتا، پہلے آپ کے ساتھ دوستی لگائیں گے اور آپ کو یقین دلائیں گے کہ میں تیرا خیر خواہ ہوں، میں تیرا ہمدرد ہوں، اچھا آدمی بھی متاثر کرے گا تو یہی کہہ کر متاثر کرے گا، انبیاء علیہم السلام جس وقت لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے تو یہی کہتے تھے کہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں، میں تمہارا خیر خواہ ہوں، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں "وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ" لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے، میں تمہارا خیر خواہ ہوں، انبیاء علیہم السلام بھی یہی کہتے ہیں۔

اور وہ دجال جس نے گمراہ کرنا ہوتا ہے وہ بھی خیر خواہ بن کر آتا ہے، پہلے آپ سے دوستی لگائے گا، آپ کو بہکائے گا، یقین دلائے گا کہ میں تمہارا بڑا مخلص دوست ہوں، میری دوستی میں تمہارے بڑے فائدے ہیں، میں بہت تمہارا خیر خواہ ہوں، جو تمہیں کہتا ہوں تمہارے فائدے کے لیے کہتا ہوں، میرا اس میں کوئی مطلب نہیں ہے اور قسمیں کھا کر یقین دلائیں گے پھر اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر کے ہلاکت کے گڑھے میں جا گرائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے یہ فرق کرنا سب سے بڑا مشکل ہے کہ حقیقی خیر خواہ کون ہے، کون

نہیں ہے، آپ کا بدخواہ کون ہے، خیر خواہ کون ہے؟ یہ فرق کرنا سب سے بڑا مشکل مسئلہ ہے، خاص طور پر اس عمر میں جس عمر سے آپ لوگ گزر رہے ہیں، یہاں بہت مغالطہ لگتا ہے کہ انسان بدخواہوں کو خیر خواہ سمجھ لیتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری خیر خواہی کے مشورے دے رہے ہیں اور مشورہ ہوتا ہے اپنی ہلاکت کا، جوان اسی طرح تباہ ہوتے ہیں، بچے اسی طرح سے غلط راستوں پر چل پڑتے ہیں کہ بہکانے والے بہکاتے ان کو اسی راستے سے ہیں۔

اب وہ قسمیں کھا گیا، بار بار قسمیں کھاتا ہے کہ میں بڑا خیر خواہ ہوں، تمہیں مشورہ خیر خواہی کا دے رہا ہوں، اب ہمارا ابا بیچارہ بھولا بھالا نہ جھوٹ بولنا جانے، نہ جھوٹی قسمیں کھانا جانے، نیک آدمیمیں یہی تو بات ہوتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ جیسے ہمارا دل صاف ہے دوسروں کا بھی صاف ہے، وہ نہ تو جانتا تھا کہ کوئی شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے اور نہ یہ سمجھتا تھا کہ اللہ کا نام لے کر، اللہ کی قسم کھا کر بھی کوئی جھوٹ بول سکتا ہے، بھولا بھالا تھا بیچارہ چکر میں آ گیا، اب فرشتہ بننے کے لیے دائمی حیات حاصل کرنے کے لیے وہ درخت کھالیا جب کھالیا تو اب یہاں سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو منع کیا تھا منع کرنے کے باوجود اور پھر اس کے دشمن ہونے کا اظہار بھی کیا تھا کہ یہ تمہارا دشمن ہے اس سے ہوشیار رہنا پھر یہ چکر میں کیسے آ گئے تو اس کا جواب خود قرآن کریم میں ہے "نَسِیَ آدَمُ وَلَمْ نَجِدْلَهٗ عَزْماً" آدم بھول گیا اس کے لیے ہم نے پختگی نہیں پائی، جو بات ہم نے کہی تھی اس کے ذہن سے نکل گئی کہ دشمن ہونے کا تصور ہی نہ رہا، بھول گیا اس کی فطرت میں نسیان ہے اور اسی نسیان کی وجہ سے یہ چکر میں آ گیا اور اس درخت کا چکھنا تھا درخت کے چکھتے ہی وہ کرامت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل تھی وہ چھن گئی، وہ لباس جو عزت کا پہنا رکھا تھا وہ اتر گیا۔

انسان کی طبیعت ہمیشہ محرمات کی طرف زیادہ رغبت کرتی ہے:

یہاں درمیان میں ایک نکتہ یاد رکھیے کہ قرآن کریم کے واقعات جو پڑھے جاتے ہیں یہ تاریخی انداز میں نہیں پڑھے جایا کرتے سے انسان کو سبق حاصل کرنا چاہیے آج بھی اس دور میں آپ جو چل رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کھانے کی، پہننے کی، پینے کی ہر چیز کی وسعت حاصل ہے، گن نہیں سکتے وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو کھانے کے لیے دی ہیں اور اتنے قسم کے شربت اور مشروبات بازار میں جا کر دیکھو آپ کے پینے کے لیے، آپ کی لذت اور تلذذ کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کتنے قسم کے مشروبات بازار میں چھوڑے ہوئے ہیں،

حکیموں کی دوکانوں پر جا کر دیکھو کتنے قسم کے شربت پڑے ہیں، بوتلوں کی دوکانوں پر جا کر دیکھو کتنی قسم کی بوتلیں پڑی ہیں، آپ کے لیے دودھ ہے، شہد ہے، لسی ہے، چائے ہے، جو چاہو پیو اللہ نے ہر چیز کی وسعت کردی اور اسی طرح کھانے کے لیے آپ شمار کریں اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتنی چیزیں کھانے کو دیں ہیں کوئی کسی قسم کی تنگی نہیں ہے لیکن آج بھی چند چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے اللہ نے روکا ہے کہ ان کے قریب نہ جاؤ، مشروبات میں روک دیا ہے کہ نشہ آور چیز نہیں پینی، شراب نہ پیو باقی جو چاہو پیتے رہو، کھانے میں سے روک دیا کہ سور نہیں کھانا، درندہ نہیں کھانا، سو د نہیں کھانا، فلاں چیز نہیں کھانی باقی جو چیز چاہو کھاتے رہو، پہننے کے متعلق روک دیا کہ سونا نہیں پہننا، ریشم نہیں پہننا، فلاں چیز نہیں پہننی باقی جو چاہو پہنتے رہو۔

لیکن یہاں بھی یہ آدم کا بچہ اسی طرح سے شیطان کے چکر میں ہے کہ اس کو جتنی لذت ان چیزوں میں آتی ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے اتنی ان چیزوں میں لذت نہیں آتی ہے جن کے کھانے کی اللہ نے اجازت دی ہے اور آج بھی اس کے دل میں یہی ڈالا جاتا ہے کہ فائدہ اصل میں انہی چیزوں میں ہے، لسی مفید نہیں، دودھ مفید نہیں، شربت صندل مفید نہیں، فلاں چیز مفید نہیں، شراب کے ایک گھونٹ میں جو مزا ہے، جو اس میں قوت ہے دنیا کے کسی مشروب میں نہیں ہے اس لیے صحت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تھوڑی تھوڑی ضرور پی لینی چاہیے اس سے صحت اچھی ہو جاتی ہے، کہتے ہیں کہ کاروبار جتنا چاہو کرتے رہو تم فائدہ نہیں اٹھا سکتے جب تک سودی کاروبار نہیں کرو گے تمہاری ترقی کا راز سودی کاروبار میں ہے، اس لیے قوم بھاگی جارہی ہے کہتے ہیں کہ واقعی سودی کاروبار کریں گے تو ہم ترقی کر سکتے ہیں، سودی کاروبار نہیں کریں گے تو ہم ترقی نہیں کر سکتے یعنی جس طرح سے شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا تھا کہ فائدہ اسی درخت کے کھانے میں ہے ساری جنت کی نعمتیں جو تھیں وہ ایک طرف اور رغبت جو تھی وہ اس درخت کی طرف ہوگئی۔

اسی طرح اگر یہاں آپ اپنے معاشرے میں دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے کرنے کی ہمیں اجازت دے رکھی ہے ہم اس میں تو فائدہ سمجھتے نہیں اور جن کاموں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری زندگی کا مزا اسی میں ہے، مسجد جانے میں کوئی مزا نہیں ہے، قرآن کریم کے پڑھنے میں کوئی مزا نہیں ہے جو مزا سینما دیکھنے اور ناول پڑھنے میں ہے، مسجد میں بیٹھنے، مدرسے میں بیٹھنے، قرآن کریم کے پڑھنے میں

ہم وہ مزانہیں سمجھتے اور اس طرح سے انسانی آبادی کے اندر جتنی رغبت سونا پہننے کی طرف ہے جس جوان کو دیکھو ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی ہے اور اس طرح جو ممنوع لباس ہیں ایسی شلوار نہ پہنو جو ٹخنوں سے نیچے لٹک رہی ہو اور ریشم نہ پہنو اور اس طرح کی ہیئت نہ اختیار کرو جیسی غنڈوں اور بدمعاشوں کی ہوتی ہے اور ایسا کپڑا نہ پہنو جو عورتوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرتا ہے اور ہمارا نوجوان طبقہ جتنا بھی ہے وہ سب دوڑ دوڑ کر ادھر ہی جائے گا جدھر سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہوا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی عیش، دنیا کی راحت، دنیا کا آرام، دنیا کی زیب وزینت جو حاصل ہوگی اسی سے حاصل ہوگی۔

کاروبار میں سود سے منع کر دیا، سٹے سے منع کر دیا، دوسری چیزوں سے منع کر دیا حلال کاروبار جتنے کرو لیکن قوم کا، بنی آدم کا ذہن یہی ہے کہ اس وقت تک ترقی نہیں ہوگی جس وقت تک کہ ہم سودی کاروبار نہیں کریں گے، شراب سے منع کر دیا وہ کہتے ہیں دنیا میں ہزار شربت ہیں لیکن ان سے وہ فائدہ ہی نہیں جو شراب کے ایک گھونٹ میں ہے، شیطان کا بہکاوا بنی آدم کو آج بھی اسی طرح سے ہے جس طرح سے ہمارے ابا کو بہکایا تھا نسخہ اس کا وہی ہے اور وہی نسخہ آج ابا کی اولاد پر استعمال ہو رہا ہے اور جیسے ابا چکر کھا گیا اس طرح سے ابا کی اولاد بھی چکر کھا رہی ہے۔

جہنم میں شیطان کی تقریر:

اور آخر سب کو چکر دے کر جہنم میں لے جائے گا، اپنے ساتھ رونق لگالے گا وہاں جا کر، یہ آئے گا آپ کے سامنے سورۂ ابراہیم میں اس نے پھر تقریر کرنی ہے، جہنم میں ایک جلسہ ہوگا پھر سارے کے سارے آدم کے بچے اکٹھے ہو کر اس کے پاس جائیں گے کہ وہاں تو تو بڑی بڑی امیدیں دلاتا تھا یہ کرتا تھا وہ کرتا تھا آج ہم پھنس گئے اب کوئی تدبیر بتا ہم نکلیں، اس وقت تو بڑے بہکاوے دیتا تھا، بڑی امیدیں دلاتا تھا آج تو کوئی تدبیر بتا۔

تو جب سارے اکٹھے ہو کر جائیں گے تو پھر اس نے تقریر کرنی ہے سب بنی آدم کو اکٹھا کر کے "وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ" شیطان کہے گا جب معاملہ صاف ہو جائے گا، وہ سارے کا سارا معاملہ صاف ہو جائے گا تو پھر شیطان کہے گا کہ بھائی میں نے بھی تم سے وعدے کیے تھے لیکن وہ سارے کے سارے جھوٹے تھے، اللہ اور اللہ کے رسول نے وعدے کیے تھے وہ سارے کے سارے سچے تھے میں نے کوئی آپ کو زبردستی اپنے پیچھے نہیں لگالیا، میں نے تو صرف بلایا تھا تم اپنی خوشی کے ساتھ آئے تھے "فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" ایک طرف اللہ کی

بات تھی، اللہ کے رسولوں کی بات تھی اور ایک طرف میری بات تھی، میرے پاس کوئی قوت نہیں تھی، طاقت نہیں تھی کہ میں تمہیں زبردستی لے آیا تم ان کو چھوڑ کر میرے پیچھے لگ گئے تو اپنے آپ کو ملامت کرو مجھے کیا ملامت کر رہے ہو "وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" اپنے آپ کو ملامت کرو "فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ" مجھے ملامت نہ کرو "وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ" میرا کوئی زور نہیں چلتا تھا کہ تمہیں زبردستی لے آیا، میرے پر الزام کیا دھرتے ہو کیا تمہارے سامنے اللہ کی باتیں نہیں تھیں اس وقت ابلیس تقریر کرے گا "وَقَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ" کے بعد جو اس کا خطبہ نقل کیا ہے جو اس نے قیامت میں پہنچنے کے بعد اپنے متبعین کے سامنے اور آدم کے بچوں کے سامنے دینا ہے۔

مقام غور:

یہ ساری کی ساری بات آپ کے سامنے جو نقل کی جارہی ہے اس لیے نقل کی جارہی ہے کہ آدم کے بچو! سوچو اس بات کو تم اس میدان کے اندر جو اترے ہوئے ہو تو تم کن حالات میں اترے تھے اور یہ دشمن تمہارے پیچھے کس طرح سے لگا ہوا ہے اور کیسے اللہ تعالیٰ کے سامنے چیلنج دے کر لگا ہوا ہے، اب اگر آپ کے ہوش ٹھکانے ہیں، اگر تم عقل مند ہو تو جب تمہارے سامنے آجائے کہ اللہ کی یہ بات ہے، اللہ نے اس بات سے روکا ہے، پھر چاہے ہزار حکمتیں تمہارے دل کے اندر ڈالی جائیں کہ یہ غلط کام کرنے میں یہ مزا ہے، غلط کام کرنے میں یہ لطف ہے، اس میں یہ فائدہ ہے، یہ صحت کے لیے مفید ہے، یہ ذہن کے لیے مفید ہے، یہ عقل کے لیے مفید ہے ہزاروں حکمتیں لاکھوں حکمتوں کو ٹھوکر مارو وہ کام وہی کرو جو اللہ کا حکم ہے اور اللہ کے رسول کا حکم ہے تو پھر تم بچ جاؤ گے شیطان کے چکر سے اور اگر یہ مصلحتیں سوچنا شروع کردیں تو تمہاری طبیعت ہمیشہ انہیں کاموں کی طرف جائے گی جن سے اللہ نے روکا ہے اور یہ وہی نسخہ ہے جو شیطان نے ہمارے ابا پر استعمال کیا تھا۔

یہ بات بنیادی طور پر ذہن میں ڈالنے کے لیے آپ کو یہ قصہ سنایا جارہا ہے کہ جب شیطان فائدہ اٹھائے گا تمہیں یہی چکر دے کر فائدہ اٹھائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف چلنے میں تمہیں ہزاروں حکمتیں معلوم ہوں گی تم کہو گے کہ اس طرح سے زینت حاصل ہوتی ہے، زیبائش حاصل ہوتی ہے، دنیاوی عزت حاصل ہوتی ہے، مال حاصل ہوتا ہے، دولت حاصل ہوتی ہے، لذتیں حاصل ہوتی ہیں اس قسم کی حکمتیں تمہارے ذہن میں آئیں گی اور ان حکمتوں کے راستے سے تم پھسلو گے اور اللہ تعالیٰ کے محرمات میں مبتلاء ہو جاؤ گے، شیطان کا مقصد

پورا ہو جائے گا۔

نسیان کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام سے جنت کی نعمتیں چھن گئیں:

تو جب اس طرح سے ہوا تو ان کا لباس جو عزت کا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے اتار دیا، آدم نے تو اپنا ننگا وجود اس طرح سے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا نہ حواء نے دیکھا تھا، اب فطرت آدم جو ہے وہ حیا کا تقاضہ کرتی ہے کہ وجود ننگا نہیں رہنا چاہیے تو لباس تو چھن گیا جلدی جلدی درختوں کے پتے توڑ کر جوڑ جوڑ کے اپنے آپ کو چھپانا شروع کر دیا پہلے تو یہ آفت سامنے آ گئی اور ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جھڑکی پڑ گئی سورۃ طٰہٰ کے اندر تفصیل آئے گی کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو جنت کے اندر ٹھہرایا تھا تو یہ کہا تھا کہ یہ تمہارا دشمن ہے اس سے بچ کر رہنا دیکھو جنت میں تمہیں یہ راحت حاصل ہوگی "اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی" نہ تو تجھے یہاں بھوک پریشان کرے گی اور نہ تو ننگا ہوگا کہ تجھے کپڑے کی فکر پڑے "وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی" اور نہ کوئی تجھے یہاں پیاس ستائے گی اور نہ تجھے یہاں دھوپ لگے گی کہ اپنے لیے سایہ کا انتظام کرنا پڑے یہ خلاصہ ہے اس چیز کا جس کو آپ روٹی کپڑا مکان سے تعبیر کرتے ہیں کہ دیکھو جنت کے اندر تیری تینوں ضرورتیں پوری ہیں، بھوک نہیں ستائے گی تجھے کہ تو روٹی کے لیے پریشان ہو، ننگا نہیں ہوگا تو کہ تجھے کپڑے کی ضرورت پیش آئے اور دھوپ وغیرہ کی تکلیف نہیں پہنچے گی کہ اپنا سایہ کرنے کے لیے اور گرمی سے بچنے کے لیے مکان بنانے کا محتاج ہو، روٹی کپڑا مکان کا مسئلہ تیرا حل ہے اس لیے ہوشیار رہنا ورنہ شیطان نے جب چکر دیا تو یہی چکر تمہیں دے گا کہ تمہیں ان مصیبتوں میں مبتلاء کر دے گا، ہر وقت زندگی کا یہی چکر کہ روٹی کپڑا مکان چاہیے، اسی چکر کے اندر تمہاری زندگی گزر جائے گی، بنیادی ضرورتیں جو تھیں انسان کی وہ ساری کی ساری وہاں پوری کر دیں لیکن جس وقت اس نے چکر دیا تو ایسے ہوا کہ لباس بھی چھن گیا، مکان بھی گیا روٹی بھی گئی اور ادھر اللہ کی جھڑک علیحدہ پڑ گئی۔

جب جھڑک پڑ گئی تو یہاں آدم کی فطرت شیطان کی فطرت سے کتنی ممتاز نظر آئی کہ انہوں نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اقرار کیا کہ یا اللہ! ہم سے غلطی ہو گئی ہمیں معاف کر دے اگر تو ہم پر رحم نہیں کرے گا اور تو ہمیں معاف نہیں کرے گا تو ہم تو خسارے میں پڑ گئے، یہ اللہ تعالیٰ نے طریقہ بتا دیا آدم کے بچوں کو اور یہ بہت بڑا قیمتی نسخہ بتایا ہے کہ چونکہ ایک فطری کمزوری نسیان کی آدم کے بچے میں ہے یہ بھول جاتا ہے اس کو کتنی ہی تاکید کر دو

بسا اوقات اس کے ذہن میں بات نہیں رہتی جب متنبہ ہوگا فوراً معافی مانگ لے گا ور جب معافی مانگ لے گا تو ہم اس کی تلافی کر دیں گے تو آدم سے یہی بات ظاہر ہوئی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب تنبیہ کی تو فوراً اپنی غلطی کا اقرار کرلیا جب غلطی کا اقرار کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے معاف کردیا۔

زمین اولادِ آدم اور شیطان کے لیے میدانِ جنگ ہے:

معاف کرنے کے بعد اب ذرا دیکھو شیطان دھتکارا گیا تھا آدم کی وجہ سے اور آدم جنت سے نکلا شیطان کی وجہ سے، جب دو پہلوان ایک دوسرے سے مات کھالیں تو پھر غصہ انتہاء پر پہنچ جاتا ہے ایک دفعہ اس نے گرالیا ایک دفعہ اس نے گرالیا اب ایک دوسرے کے ساتھ چڑ اور غصہ انتہاء کو پہنچ گیا جب انتہاء کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ چلو زمین میں وہیں جا کر آباد ہو جاؤ "بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" وہیں اب تمہاری عداوت قائم ہوگی اور آپس میں لڑو گے ایک دوسرے کو بہکاؤ گے، سب کچھ کرو گے، نتیجہ اسی کے ہاتھ میں آئے گا جو ہمارے احکام کی پیروی کرے گا، بنیاد آپ کی دنیا میں کن حالات کے اندر رکھی گئی یہ آپ کو سمجھایا گیا کہ آپ یہاں آرام کے لیے، عیش کے لیے، عشرت کے لیے پیدا نہیں کیے گئے یہ تمہارے لیے میدان جنگ ہے جس میں تم کو اتارا گیا ہے، اپنے آپ کو ایسے سمجھو جس طرح سے کوئی فوجی میدان جنگ میں کھڑا ہوتا ہے، میدان جنگ میں جب کھڑا ہوتا ہے تو اس کو ہر وقت ہوشیار رہنا پڑتا ہے کہ میں دشمن کو نقصان کیسے پہنچا سکتا ہوں اور دشمن کے نقصان سے بچ کیسے سکتا ہوں، جب انسان میدان جنگ میں کھڑا ہوتا ہے تو اس کا یہی جذبہ ہوتا ہے کہ میں دشمن کی گھات سے بچوں کیسے، دشمن کے حملے سے اپنا بچاؤ کس طرح سے کروں، اور اپنا کام کس طرح سے کروں۔

یہ جو جذبہ ہے میدان جنگ والا اسی کو شریعت کی اصطلاح کے اندر تقویٰ کہتے ہیں کہ انسان کے دل میں ہر وقت یہ جذبہ ابھرا رہے، ہر وقت ہوشیار رہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کا وار میرے اوپر چل جائے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے اپنے مقصد کے سامنے دشمن کوئی رکاوٹ نہ پیدا کر دے، دشمن کے واروں سے بچتے ہوئے اپنے سفر کو شروع رکھو تاکہ اپنی منزل تک پہنچ جاؤ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے رکھی ہے یہی تقویٰ کی زندگی ہے۔

اور یہ سارے کا سارا واقعہ بیان کر کے اللہ تعالیٰ آپ کے سامنے آپ کی زندگی کی بنیاد واضح کر رہا ہے کہ تم اس دنیا کے اندر پیدا جو ہوئے ہو تو ایک میدان جنگ کے اندر تمہیں اتارا گیا ہے اور ایک طرف سے شیطانی قوتیں ہیں اور ایک طرف تم ہو اور وہ شیطانی قوتیں چاہیں گی کہ اپنا انتقام لیں آدم کی اولاد سے، تمہیں بہکانا چاہیں گی اور جہنم میں پہنچانا چاہیں گی تم نے اپنے آپ کو ہوشیار رکھنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننا ہے اس کے خلاف نہیں چلنا

اگر یہ طریقہ اپناؤ گے تو اس جنت کو حاصل کر لو گے جو تمہارے باپ کی میراث ہے اور اگر تم شیطان کے پیچھے لگ جاؤ گے تو بھائی ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا تم سارے کے سارے اکٹھے ہو جاؤ گے ہم سب کو اٹھا کر جہنم میں پھینک دیں گے۔

اس رکوع کے اندر گویا کہ آپ کے سامنے آپ کی زندگی کی یہ بنیاد بتادی گئی کہ آپ کی زندگی کی بنیاد اس پر ہے اور آپ نے ہر وقت اپنے آپ کو اس مقام میں سمجھتے ہوئے چلنا ہے کہ ہم ایک میدان جنگ میں کھڑے ہیں شیطان ہمیں بہکاتا ہے اور ہم نے اس کے بہکانے سے بہکنا نہیں، اپنی عقل کو ٹھکانے رکھتے ہوئے یہ دیکھو کہ اللہ کا حکم کیا ہے، اللہ کے رسول کا حکم کیا ہے، فائدہ اسی میں ہے اور جس چیز سے اللہ اور اللہ کے رسول نے روک دیا ہزار حکمتیں شیطان تمہیں سمجھائے گا لیکن ان حکمتوں سے متاثر نہیں ہونا اگر ان حکمتوں سے متاثر ہو کر اس راستے پر چل پڑو گے تو جیسے آدم کو چکر دے دیا تھا اس نے اسی طرح سے تمہیں چکر دے دے گا جیسے اس واقعہ کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ کہے گا "یَا بَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ" آخر میں جا کر آپ کر یہ متنبہ کریں گے یہ جو میں تقریر کر رہا ہوں آپ کے سامنے وہ اسی کا حاصل ہے یا بنی آدم! اے آدم کے بچو! تمہیں شیطان کہیں فتنے میں نہ ڈال دے "کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ" جس طرح سے اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا دیا بس اس بات سے ہوشیار رہو تو یہ رکوع جو آپ کے سامنے پڑھا گیا اس کے اندر آپ کی زندگی کی ابتداء ذکر کی گئی اور آپ کی حیثیت جو ہے وہ دنیا کے اندر متعین کر دی گئی کہ آپ نے وقت کس طرح سے گزارنا ہے یہ باتیں بنیادی طور پر ذہن میں پڑ جائیں تو انسان پھر شیطانی کام اور رحمانی کاموں کے درمیان فرق کرنے لگ جائے گا، شیطانی کاموں سے بچے گا چاہے اس میں ہزار فائدے معلوم ہوں اور رحمانی کام کرے گا چاہے اس میں بظاہر اس کو کوئی فائدہ معلوم نہ ہو کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو ایک اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا راستہ ہے وہی میرے لیے مفید ہے اور دوسرا جو شیطان کا راستہ ہے وہ میرے لیے دشمن ہے چاہے ہزار حکمتیں بتائے لیکن نتیجتاً وہ میرے لیے نقصان دہ ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے خلق اور تصویر کا مفہوم:

شروع میں آیا تھا "وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ" دو باتیں ذکر کی تھیں ایک خلق اور ایک تصویر ان دونوں باتوں کا مطلب یہ ہے کہ پہلے مادہ پیدا کیا جس سے آدم نے بننا تھا اور پھر اس کی صورت بنائی جیسا کہ سورۃ الحشر میں تین لفظ آئیں گے "الخالق البارئ المصور" ان سب لفظوں کا مفہوم قریب قریب ہی ہے مثلاً ایک تو لوہا ہے اور ایک لوہے کو پرزوں کی شکل میں ڈھال لیا اور پھر ایک ان پرزوں کو جوڑ کر انجن بنا دیا تو خلق کا مفہوم یہ ہوگا

کہ جیسے اصل مادہ پیدا کیا" البارئ" کا مفہوم ہوگا کہ جیسے اعضائے بنائے، تصویر کا مفہوم ہوگا کہ سب کو جوڑ کر ایک مکمل صورت بنادی تو یہاں "خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ" میں اس طرح سے دو درجے نکل آئیں گے پہلے تو وہ مواد پیدا کیا جس سے آدم کو بنانا تھا جیسے مٹی، پانی، ہوا، آگ جو کچھ بھی ہے پھر اس کو ایک خاص صورت میں ڈھال لیا۔

یوم البعث اور یوم الفناء میں کوئی فرق نہیں:

آگے آیا تھا ابلیس کی دعا میں "اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ""یوم یبعثون" سے تو قیامت مراد ہے جس دن کہ وہ اٹھائے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ نے جواب دیا "اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ" تو مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے یہاں وہ الفاظ نہیں قرآن کریم میں دوسری جگہ الفاظ آئیں گے "اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ" ان دونوں کا کیا مفہوم ہوا، بظاہر اگر دیکھا جائے تو "یوم یبعثون" سے مراد ہوگا "نفخہ ثانیہ" جب لوگوں کو اٹھایا جائے گا پھر اس سے بظاہر معلوم ہوگا کہ "نفخہ اولی" کے وقت شیطان کو مرنا نہیں چاہیے جب کہ باقی کائنات فنا ہوگی اس وقت شیطان نہیں مرے گا تو پھر اگر "یوم الوقت المعلوم" سے نفخہ اولی کا وقت مراد لیا جائے اور وقت معلوم سے تمام کا فنا ہونا مراد ہے تو پھر بظاہر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ابلیس نے جتنی دعا مانگی تھی وہ قبول نہ ہوئی بلکہ کوئی تھوڑا سا فرق پڑ گیا، اس نے تو یوم بعث تک اپنی زندگی مانگی تھی، مہلت مانگی تھی اور اس کو مہلت ملی یوم فناء تک جب کائنات نے فناء ہونا ہے تو گویا کہ جتنی اس نے دعا مانگی تھی اتنی نہ ملی کچھ تھوڑا سا فرق رہ گیا لیکن حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق بات بالکل صاف ہے کہ "یوم یبعثون" اور "یوم الوقت المعلوم" دونوں کا مصداق ایک ہی ہے یعنی قیامت کا دن جو "نفخہ اولی" سے شروع ہوگا یہ یقینی بات ہے کہ "نفخہ اولی" کے وقت جس طرح باقی چیزیں فناء ہوں گی شیطان بھی فناء ہو جائے گا اس کے بعد یہ زندہ نہیں رہے گا پھر جس دن دوبارہ اٹھایا جائے گا اس دن اس کو بھی دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو اس سے مراد قیامت کا دن ہے قیامت کا دن شروع ہو جائے گا "نفخہ اولی" سے اور آگے پھر وہ لمبا ہے، اسی دن کے ایک حصے میں گویا کہ فنائیت ہے اور اسی دن کے دوسرے حصے میں دوبارہ زندہ کرنا ہے اس لیے اس دن کو یوم البعث بھی کہہ سکتے ہیں اور اس دن کو یوم الفناء بھی کہہ سکتے ہیں گویا کہ دن وہ ایک ہی ہے جو "نفخہ اولی" سے شروع ہو گیا، "نفخہ اولی" سے قیامت شروع ہوگئی اب اس کے ابتدائی حصے کے اندر فنائیت ہے کہ سارے کے سارے لوگ فناء ہو جائیں گے اور پچھلے حصے کے اندر دوبارہ پھر بعث ہو جائے گا اس لیے جیسے اس نے دعا مانگی تھی ویسے ہی قبول ہوگئی کہ "یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ" سے مراد ہے قیامت کا دن اور قیامت کا دن شروع ہو جائے گا "نفخہ اولی" سے تو جس وقت پہلا صور پھونکا جائے گا کائنات فناء ہوگی

اور قیامت شروع ہوگی اب اس کے پہلے حصے میں سارے کے سارے فناء ہو جائیں گے اسی دن کے باقی حصے میں دوبارہ زندہ کیے جائیں گے لہٰذا یوم بعث کا مصداق بھی وہی ہے اور یوم فناء کا مصداق بھی وہی ہے اور وقت معلوم سے بھی وہی دن مراد ہے اس طرح سے مفہوم صاف ہو جاتا ہے کہ قیامت کا دن صرف یوم بعث ہی نہیں یوم فناء بھی قیامت کا دن ہے ایک ہی دن ہے جس کے مختلف حصوں کے اندر مختلف قسم کے واقعات پیش آئیں گے۔

صراط مستقیم کا مفہوم:

پھر آگے اس میں آیا تھا کہ "لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ" میں ان بنی آدم کے لیے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا تو اس سیدھے راستے سے کیا مراد ہے؟ سیدھے راستے سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا راستہ، صحیح عقیدہ، صحیح عمل یہی سیدھا راستہ ہے، عقائد میں بنیادی حیثیت توحید کی ہے تو توحید یہ سیدھا راستہ ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے جو دعا کرتے ہیں سورۃ فاتحہ میں وہ یہی کرتے ہیں "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے پر چلانا، ہم بھی صراط مستقیم کی ہدایت اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں ہمیں سیدھے راستے پر چلانا اور سیدھے راستے کا مصداق سورۂ یٰسین کے چوتھے رکوع میں ذکر کیا گیا ہے "وَاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ" میری عبادت کرو صراط مستقیم یہی ہے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت یہ ہے صراط مستقیم "اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان میں بھی آئے گا کہ اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے اسی کی عبادت کرو یہی صراط مستقیم ہے، تو صراط مستقیم سے مراد سیدھا راستہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کا راستہ جس راستے پر چلنے سے اللہ تعالیٰ ملتا ہے اور اللہ کی رضا نصیب ہوتی ہے وہ ہے سیدھا راستہ جس کی ہم صبح شام نماز کے اندر اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں اپنی عبادت کے راستے پر چلا جس عبادت کے راستے پر چلنے کے ساتھ تو ملتا ہے اور تیری رضا ملتی ہے جو سیدھا راستہ تیرے تک آتا ہے ہمیں اس راستے پر چلا اور یہ جو شیطان نے کہا کہ میں تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا یہ بیٹھنا ہے گھات لگا کر ڈاکہ زنی کی نیت سے جس طرح سے لوگ راستے روک لیا کرتے ہیں، راستوں پر بیٹھ جاتے ہیں، آنے جانے والوں کو پریشان کرتے ہیں یا غلط مشورے دے کر غلط راستوں پر چڑھا دیتے ہیں کہ ایک آدمی جا رہا ہے سیدھے راستے پر اور دوسرا آدمی اس سے دشمنی کرنا چاہتا ہے یا اس کو کسی خطرناک جگہ پر لے جا کر لوٹنا چاہتا ہے تو اس کو پوچھے گا کہ تو کدھر جا رہا ہے وہ کہے گا فلاں طرف جا رہا ہوں کہے گا

نہیں یہ راستہ تو دور ہے، اس راستے پر تو خطرات ہیں یہ راستہ سیدھا ہے ادھر سے ہو لے اور اس کو راستے سے کھسکا دیتا ہے آگے چلنے نہیں دیتا یا اس کا رخ موڑ دیتا ہے اور پھر آگے لے جا کر اس کو برباد کر دیتا ہے، لوٹ لیتا ہے، قتل کر دیتا ہے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

تو جس طرح سے یہ انسانی ظاہری آبادی کے اندر یہ واقعات ہیں کہ لوگ سیدھے راستے سے روکتے ہیں، غلط راستوں پر ڈال دیتے ہیں تو باطنی اور روحانی طور پر بھی ایسے ہی ہے کہ آپ نیک اخلاق کے سیدھے راستے پر ہیں کوئی بہکا کر آپ کو غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں، آپ ایک زندگی کی صحیح راہ پر چلے جا رہے ہیں کوئی بہکا کر غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں یہ شیاطین ہی ہوتے ہیں، شیاطین کے چیلے چانٹے جو ظاہری اور باطنی طور پر انسان کے لیے گمراہی کا باعث بنتے ہیں تو یہ بیٹھنا اس کا ڈاکہ زنی کے لیے ہے مطلب یہ ہے کہ جب سیدھا راستہ تیرا جس پر چلنے کے ساتھ تو خوش ہوتا ہے جو تیرے تک پہنچتا ہے اور تیری رضا نصیب ہوتی ہے میں اس کے اوپر ڈیرے ڈال لوں گا اور بنی آدم کو اس راستے پر چلنے نہیں دوں گا، پھر آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے، ہر طرح سے ان کے اوپر حملہ آور ہو کر یعنی وسوسوں کے ذریعے سے، ترغیبات کے ذریعے سے، ترہیبات کے ذریعے سے، ڈرا کر، دھمکا کر، لالچ دے کر کہ اگر ادھر جاؤ گے تو تمہارا یہ نقصان ہو جائے گا اور اگر ادھر جاؤ گے تو تمہیں یہ نفع ہو جائے گا اس طرح سے کر کرا کر میں ان کو اس راستے سے بہکا دوں گا اور میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گا کہ بہت کم لوگ ہوں گے جو تیرے سیدھے راستے پر چلیں گے اور زیادہ کو میں اغواء کر لوں گا تو "صراطك المستقیم" کا یہ مفہوم ہے۔

اکل شجرہ کی تکوینی حکمت:

سوال: اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا اور جنت میں ٹھہرایا اور شیطان نے بہکا کر درخت کھلا دیا جس سے منع کیا گیا تھا تو جنت سے نکلنے کا وہ باعث بن گیا اگر حضرت آدم علیہ السلام بہکاوے میں نہ آتے شیطان کی بات نہ مانتے اور درخت نہ کھاتے تو کیا پھر وہ جنت میں ہی رہتے؟

جواب: آنا تو ہمارے ابا نے اسی زمین پر ہی تھا کیونکہ جب بنیاد رکھی گئی تھی، جس وقت بنایا گیا تھا تو یہی کہا تھا "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو جس کا مطلب ہوگا کہ وہ تو پیدا ہی زمین میں آباد ہونے کے لیے کیا گیا تھا اور جنت میں ٹھہرایا تھا تھوڑی دیر کے لیے تاکہ زمین کو جو آگے آباد کرنا ہے تو جنت کے اندر

کچھ آبادی کا رنگ دیکھ لے۔

آج انسان کے ذہن سے جو مختلف قسم کے باغات باغیچے محلات اور اس قسم کی آرائش وغیرہ نہریں چلانا اور جو کچھ بن رہا ہے یہ انسان کی فطرت میں وہی جنت کے نقشے پڑے ہوئے ہیں اس لیے دنیا میں جس کو بھی اسباب مہیا ہوئے اس نے دنیا میں جنت بسانے میں کمی نہیں کی" جنت تجری من تحتھا الانھار" دیکھے ہوئے تھے وہیں فطرت میں وہی نقشے ذہن میں پڑے ہوئے ہیں تو جن کو اللہ نے توفیق دی، جن کے لیے اسباب مہیا تھے انہوں نے اپنے لیے باغات اور انہار میں کمی نہیں کی اور کہیں دور جا کر نہیں دیکھ سکتے تو مغلیہ خاندان کی سیر گاہوں میں جا کر دیکھ لو یہ شالہ مار وغیرہ کیسے باغ بنائے اور کیسے درمیان میں نہریں چلائیں، کس طرح سے ان کو خوشنما بنایا اور محلات کس طرح سے لوگ بناتے ہیں، لوگوں نے اپنی راحت وآرام کے لیے دنیا کو آباد کس طرح سے کیا، یہ وہی نقشے ہیں جو آدم نے جنت میں رہ کر دیکھے تھے اور وہ آدم کے ذہن میں پڑے ہوئے ہیں اور اولاد کے ذہن میں ظاہر ہے جیسے جیسے اسباب مہیا ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتوں کے ساتھ کچھ اس قوم کے ابا آدم کے ذہن میں نقشے ڈالنے کے لیے ان کو جنت میں آباد کیا ایک وقت آیا جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین میں بھیجنا تھا اور زمین میں آ کر خلافت اس کے سپرد کرنی تھی کہ اب اس زمین کی آبادی اور اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور اس کے مطابق حکومت قائم کرنا اب یہ تیرے ذمے ہے اب اس کو سنبھالو آنا تو تھا، تو ابلیس کے بہکاوے سے درخت کا کھانا سبب بن گیا، اکل شجرہ کے نتیجہ میں زمین پر اترنے کی حکمت کو ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک آدمی بہت ہی عمدہ خوبصورت شاہی محل میں رہتا ہے جس میں ہر سہولت میسر ہے، ہر قسم کا سامانِ آرائش وآسائش ماجود ہے، طرح طرح کے کھانے اور قسم وقسم کے پھل کھانے کو ملتے ہیں، اس میں کسی قسم کی ذرہ برابر تکلیف اور پریشانی نہیں، پھر اچانک اس کو اس محل سے نکال کر جیل میں تنگ وتاریک کوٹھڑی میں ڈال دیا جائے جس میں تکلیف ہی تکلیف، پریشانی ہی پریشانی ہو اور آسائش وراحت برائے نام بھی نہ ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ حاکم اپنی حکومتی طاقت اور اختیارات کی بناء پر بلاوجہ اس کو جیل میں ڈال دے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس آدمی کو کسی قصور اور جرم کے نتیجہ میں جیل جانا پڑے تو دونوں میں بڑا فرق ہے، پہلی صورت میں اس کے دل میں حاکم کے بارے میں شکوے شکایات ہوں گی جبکہ دوسری صورت میں وہ اپنے قصور اور اپنی غلطی پر پچھتائے گا اور

معافی کا طلب گار ہوگا پس اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اتارنا تھا لیکن جس درخت کے کھانے سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا تھا اس کے کھانے کی غلطی زمین پر اترنے کا سبب بن گئی تاکہ آدم اور بنی آدم دنیا کے جہنم کدہ میں اترنے کے بعد شکوہ کے بجائے اپنی غلطی پر توبہ واستغفار کریں جیسا کہ آدم علیہ السلام نے "رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ" کے ساتھ توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کی "فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَالتَّوَّابُ الرَّحِيْمُ" اور چونکہ اولادِ آدم نے زمین پر گناہ اور ظلم کرنا تھا اسی وجہ سے زمین میں نظام خلافت قائم کیا گیا، دنیوی فیصلے نظام خلافت کے ذریعے ہوں گے لیکن "عِنْدَاللّٰه" گناہوں کے تدارک وازالہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی توبہ واستغفار کو بنی آدم کے لیے نمونہ بھی بنادیا اور توبہ واستغفار کی ترغیب بھی دے دی۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ

آدم کی اولاد! تحقیق ہم نے اتارا تم پر ایسا لباس جو کہ چھپاتا ہے تمہاری شرم گاہوں کو اور اتارا تم پر لباس زینت کے لیے اور لباس

التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ

تقویٰ کا یہ بہتر ہے یہ بات اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ لوگ نصیحت حاصل کریں (۲۶) اے آدم کی اولاد!

لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا

فتنے میں نہ ڈال دے تمہیں شیطان جس طرح سے اس نے نکال دیا تمہارے والدین کو جنت سے اتارتا تھا وہ شیطان ان دونوں سے ان کا لباس

لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ

تاکہ دکھا دے ان کو ان کے اعضاء مستورہ بے شک دیکھتا ہے تمہیں وہ بھی اور اس کی جماعت بھی ایسی جگہ سے کہ تم انہیں نہیں دیکھتے

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاِذَا فَعَلُوْا

بے شک ہم نے بنا دیا شیاطین کو دوست ان لوگوں کے لیے جو کہ ایمان نہیں لاتے (۲۷) اور جس وقت یہ کام کرتے ہیں

فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ

بے حیائی کا تو کہتے ہیں پایا ہم نے اس طریقے پر اپنے آباء کو اور اسی طریقے کا حکم دیا ہمیں اللہ تعالیٰ نے، آپ کہہ دیجیے بے شک

اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں کرتے، کیا تم بولتے ہو اللہ پر ایسی بات جس کا تمہیں کوئی علم نہیں (۲۸)

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ

آپ کہہ دیجیے کہ حکم دیا میرے رب نے انصاف کا، اور سیدھا رکھو تم اپنے چہروں کو ہر نماز کے وقت

وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڛ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ۭ

اور اس کی عبادت کرو اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہو اسی کے لیے عبادت کو جیسے اس نے ابتداءً تم کو پیدا کیا اسی طرح تم لوٹو گے (۲۹)

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۭ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا

ایک فریق کو اللہ تعالیٰ نے سیدھے راستے پر چلایا اور ایک فریق پر گمراہی ثابت ہوگئی بے شک انہیں لوگوں نے جن کے اوپر گمراہی ثابت ہوگئی بنا لیا

الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

شیاطین کو دوست اللہ کو چھوڑ کر اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ بے شک وہ سیدھے راستے پر چلنے والے ہیں ﴿۳۰﴾

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا

آدم کی اولاد! اختیار کرو زینت ہر عبادت کے وقت اور کھاؤ اور پیو

وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۳۱﴾

اور حد سے تجاوز نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا حد سے تجاوز کرنے والوں کو ﴿۳۱﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

پچھلے رکوع میں جو آپ کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا گیا اس میں حقیقت نمایاں ہوگئی کہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام اور حواء کو بہکایا اور ان کے بہکانے کا سب سے پہلا نقصان یہ پہنچا کہ عزت کا لباس اتر گیا جو اللہ تعالیٰ نے پہنایا تھا وہ لباس چھن گیا اور اللہ تعالیٰ نے جو بدن ڈھانپا تھا وہ کھل گیا جو حضرت آدم علیہ السلام اور حواء کے لیے بڑا پریشانی کا باعث بنا پھر وہ اپنے بدن کو چھپانے کے لیے جنت کے پتوں کو جوڑنے لگ گئے، پتوں کے ساتھ اپنے بدن کو ڈھانپنے لگ گئے یہ واقعہ آپ کے سامنے گزرا، اور اسی طرح جنت کی نعمتیں جو کھانے کے لیے ملی ہوئی تھیں شیطان کے اس بہکاوے میں آکر وہ بھی چھن گئیں تو گویا کہ بلا مشقت جو رزق حاصل ہوتا تھا اس سے بھی محرومی ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزت اور کرامت کا جو لباس حاصل تھا وہ لباس بھی چھن گیا تو پھر اس کی عداوت حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ علی الاعلان نمایاں کردی گئی اس کو بنایا گیا ہے بنیاد، بنیاد بنانے کے بعد ان خامیوں کی نشاندھی کی گئی ہے جن میں بنی آدم مبتلاء ہوگئے شیطان کے بہکاوے کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ اسی قسم کا فتنہ ہے جس میں تمہیں شیطان نے ڈال دیا جیسے کہ تمہارے ابا حضرت آدم علیہ السلام کو ڈال دیا تھا اس سے خصوصیت کے ساتھ باقی رسموں کی تردید کرنا مقصود ہے جو مشرکین نے اختیار کر رکھی تھیں۔

لباس کے متعلق مشرکین کا طرزِ عمل:

سب سے زیادہ بے حیائی کا کام ان مشرکین نے اختیار کر رکھا تھا وہ یہ تھا کہ بیت اللہ کا طواف وہ ننگے ہو کر

کرتے تھے آگے پیچھے تو کچھ نہ کچھ بدن ڈھکا ہوا ہوتا لیکن جس وقت طواف کرنے کے لیے آتے تھے تو قریش کے علاوہ اپنے آپ کو اس قانون سے مستثنیٰ سمجھتے تھے باقی دنیا کے جس حصے کے لوگ بھی آتے طواف کرنے کے لیے وہ یا تو قریش سے لباس مانگ لیتے کوئی ان کو اپنے کپڑے دے دے پہننے کے لیے اگر کوئی قریشی ان کو کپڑے پہننے کے لیے نہ دے تو پھر جو پہنا ہوا لباس ہوتا تھا وہ اتار کر حرم سے باہر رکھ دیتے اور پھر وہ ننگے ہو کر طواف کیا کرتے تھے چاہے مرد ہوں چاہے عورتیں اب یہ بے حیائی کا کام انہوں نے شروع کر لیا تو پھر عرب کے پرانے شعراء کے قصائد اگر پڑھو گے تو ایسے موقع پر وہ فساق فجار عیاش قسم کے لوگ نظر بازی کرتے اور اس میں اپنے عشق کو اپنے اس قسم کے جذبات کو آگے بڑھاتے پھر ان کا شعروں کے اندر ذکر کرتے فخر کرتے گویا کہ اللہ کے حرم کو اور اللہ کے گھر کو انہوں نے ایک بے حیائی کا اڈا بنا لیا تھا اور فساق فجار کے لیے نظر بازی کا ایک بہت بڑا بازار کھل گیا تھا، اپنی عشق بازی کے جذبات کو یہاں آکر تسکین دیتے تھے اور جب انہیں کہا جاتا کہ تم اس قسم کے کام نہ کرو، یہ تو بے حیائی کے کام ہیں تو وہ کہتے تھے لو جی ہمارے باپ دادا اسی طرح سے کرتے آئے ہیں یہ تو اللہ کا حکم ہے الٹا اس بے حیائی کے کام کو اللہ پر تھوپ دیتے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ سنا کر ان کو یہ کہا کہ بدبختو! یہ تو وہی شیطانی حرکت ہے جس طرح سے اس نے تمہارے آباء کا لباس اتروا دیا تھا اس نے وہاں اتروا دیا تھا بہکا کر اور یہاں تمہارے دلوں میں وسوسے ڈال کر، تمہیں گمراہی کی طرف لے جا کر مصلحتیں سمجھا کر یہاں بھی تمہارا لباس اتروا دیا لیکن وہ تو پھر فطرت سلیم پر تھے کہ جس وقت ان کا لباس اترا تو انہوں نے پھر اپنے آپ کو پتوں کے ساتھ ڈھانپنے کی کوشش کی اور تم ایسے شیطان کے چکمے میں آگئے ہو کہ تم اپنے اختیار کے ساتھ لباس اتارتے ہو اور پھر اپنے آپ کو چھپانے کی ہی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو پچھلی تاریخ کو دہرا کر گویا کہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ بھی شیطان کا چکمہ ہے۔

جدید تہذیب کے دلدادوں کا لباس کے متعلق طرزِ عمل:

لیکن اب اس کو مشرکین مکہ تک نہ بند رکھو اس زمانے میں لوگ کوئی پڑھے لکھے نہیں تھے اس لیے وہ بدے طریقے کے ساتھ لباس اتروا دیا شلوار کھولی، چادر کھولی اور چلو طواف کرنے کے لیے ایک بدھا سا طریقہ تھا اور آج اسی شیطان نے لباس فیشن کے ساتھ اتروا دیا اگر دیکھا نہیں تو یہ اخباروں میں ننگی تصویریں نہیں دیکھتے ادھر ادھر، اور شہروں میں جا کر دیکھو جو لوگ اپنے آپ کو مہذب قرار دیتے ہیں، اپنے آپ کو ترقی یافتہ قرار دیتے ہیں عورتیں تو بالکل عریاں ہیں، بالکل عریاں کا مطلب یہ ہے کہ عام طور پر بڑے شہروں میں جو طبقہ اپنے آپ کو مہذب کہلاتا ہے،

ترقی یافتہ کہلاتا ہے ان کی عورتیں جب تفریح کے لیے نکلتی ہیں تو صرف ایک سینہ بند معمولی سا اور چڈی کچھا اور باقی سارا جسم ننگا ہوگا جس وقت وہ تفریح کے لیے نکلتی ہیں، یورپ کا تو کہنا ہی کیا لاہور اور کراچی میں بھی یہ نقشے موجود ہیں، عورت کو ننگا کر دیا اور عورت کو ننگا کرنے کے ساتھ آپ کو پتہ ہے کہ سارے کے سارے بے حیائی کے دروازے کھلتے ہیں اور اگر لباس پہنوایا بھی تو وہ لباس بھی ایسا پہنوایا کہ اس کے ساتھ بے حیائی میں ترقی ہوئی کہ خوشمائی ہوگئی، بدن اندر سے جھلک رہا ہے، اصل رنگ براہ راست نظر آئے اس میں اور شان ہوتی ہے اور جو کپڑے میں سے جھلکتا ہوا نظر آتا ہے اس میں اور شان ہوتی ہے، اتنا باریک لباس کہ سارا بدن نظر آرہا ہے جس کا پہننا نہ پہننا برابر ہے لیکن اس کا پہننا ایک بڑے ہونے کی نشانی بن گئی، فیشن بن گیا، سر ننگا کر دیا، سینہ ننگا کر دیا، بازو ننگے کر دیئے، ٹانگیں ننگی کر دیں اور یہ یقین کر لیجیے کہ اس قسم کے خطے بھی ہیں جہاں وہ سمجھتے ہیں کہ بالکل مادرزات ننگے ہو کر پھرنا ہی تہذیب ہے اور وہ کہتے ہیں کہ بدن کا ننگا ہونا یہ صحت کے لیے مفید ہے، دیکھو! جانور ننگے رہتے ہیں تو بالکل صحت مند رہتے ہیں اور لباس فطرت کے خلاف ہے، اکٹھے ہو کر نہائیں گے تو ننگے ہو کر نہائیں گے، سیر و تفریح کریں گے تو ننگے ہو کر کریں گے۔

یہ وہی بنیاد ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اس نے جس طرح سے عزت کے لباس سے اور شرم کے لباس سے محروم کر دیا تھا لیکن حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی طبعی شرم کے ساتھ اپنے آپ کو پھر بھی پتوں سے ڈھانپنے کی کوشش کی لیکن آدم کی اولاد کو شیطان بہکا کر کہاں لے گیا کہ ننگا ہونا فیشن بن گیا ہے اور فیشن بنا کر آج دنیا جو ہے وہ شیطان کی اسی خواہش کو اور اس کی اسی آرزو کو پورا کر رہی ہے تو شرعی مقدار کے علاوہ جو بھی لباس پہنا جائے جس میں اس بدن کے حصے کو ننگا کیا جائے جس کو ننگا کرنے کی اجازت نہیں عورت کے لیے مرد کے لیے یہ احکام آپ کے سامنے واضح ہیں کہ عورت اگر باہر نکلے تو اس کا بدن مستور ہونا چاہیے تو پھر بالکل ننگا ہو تو وہی بات ہے اور اتنا باریک کپڑا پہنا ہوا ہو کہ اس میں سے بدن جھلکتا ہے تو وہی بات ہے اور ایسے ہی اتنا تنگ لباس پہنا ہوا ہو کہ اعضاء علیحدہ علیحدہ نظر آئیں تو بالکل ننگے ہونے کے حکم میں ہے جس میں اعضاء کی موٹائی اور چوڑائی بالکل واضح نظر آئے اتنا ٹائٹ لباس ہو تو یہ ناجائز ہے عورت کے لیے پورے بدن پر ناجائز اور مرد کے لیے اعضاء مخصوصہ پر ناجائز اس لیے اتنی تنگ پینٹ کہ جس کے ساتھ وہ سب کچھ ہی نظر آئے آگے سے بھی اور پیچھے سے یہ بالکل ممنوع لباس میں شامل ہے۔

حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ تو فرمایا کرتے تھے کہ یہ ایسی پینٹ پہنتے ہیں کہ جس سے فصل بین الخصیتین نمایاں ہوتا ہے لیکن پچھلے دنوں میں تو اتنی تنگ شروع ہوگئی تھی کہ اگلا حصہ بھی سارے کا سارا نمایاں ہوتا تھا یہ ممنوع لباس ہے اور عورت کا بدن چونکہ سارا ہی مستور ہے باہر نکلتے وقت، گھر میں تو آپ سمجھتے ہیں کہ وہ سر ننگا رکھ

سکتی ہیں، بازو ننگے ہوسکتے ہیں، گھٹنے سے نیچے کا حصہ ننگا ہوسکتا ہے، یہ بھائیوں کے سامنے ماں باپ کے سامنے چونکہ گھر میں کام دام کرنے کی عادت ہوتی ہے وہاں تو گنجائش ہے گھر میں رہتے ہوئے لیکن جب عورت باہر نکلے تو اگر اس قسم کا لباس پہن کر نکلتی ہے جو بالکل تنگ ہے یا بالکل باریک ہے تو یہ بالکل ننگی کے حکم میں ہے تو جو بھی ہے فیشن میں لا کر کس طرح بنی آدم کو شیطان نے ننگا کر دیا، اس کا لباس وہاں بھی اتر وادیا تھا اور یہاں بھی اتر وادیا اور جب اس قسم کی باتوں پر متنبہ کیا جاتا ہے تو پھر وہ اس کو اپنی تہذیب بتاتے ہیں، اپنا تمدن بتاتے ہیں، اپنے بڑوں کا طریقہ بتاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا حکم بھی اسی طرح سے ہے کہ یوں کرو، اللہ کے اوپر بہتان علیحدہ باندھنا شروع کر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا کہ یہ بے حیائی کے کام ہیں اور اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں دیا کرتا، اس نے تو تمہارے لیے لباس اتارا ہے۔

لباس کیسا ہونا چاہیے؟

لباس اتارنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیزیں پیدا کر دیں جس سے تم لباس تیار کر سکتے ہو، جس سے دو مقصد ہیں ایک بدن کا ڈھانپنا اور دوسرا اپنے آپ کو زیب و زینت دینا اس لیے لباس میں دونوں چیزیں ملحوظ ہوتی ہیں ورنہ بدن تو آپ ٹاٹ کے ساتھ بھی ڈھانپ سکتے ہیں لیکن یہ کوئی مطلوب نہیں ہے اس میں خوبصورتی کی رعایت رکھو ایسا لباس پہنو جس سے تمہاری شخصیت اجاگر ہو، ایسا لباس پہنو جس کے ساتھ تمہارے نظریات اور تمہارے مسلک کی ترجمانی ہو اس میں یہ بھی مقصود ہے کیونکہ زیب و زینت وہی ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق ہے۔

اب ایک مرد ہے وہ قیمتی سے قیمتی، خوبصورت سے خوبصورت کپڑے پہنے اور لیکن عورتوں جیسا لباس پہن لے، عورتوں کا لباس مردوں کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہوتا ہے، اب ایک مرد زنانہ کپڑے پہن کر آجائے تو آپ کیا کہیں گے کہ اس نے اچھا کیا ہے؟ اس زیب و زینت کا کوئی اعتبار نہیں، یہ حرام ہے جس میں انسان کی اپنی نوع ہی خلط ہو جائے کہ دیکھنے والے کو پتہ ہی نہ چلے کہ مرد ہے یا عورت، ایسا لباس مرد کے لیے حرام ہے چاہے کتنی ہی زیب و زینت کا باعث کیوں نہ ہو، چاہے بدن ڈھکا ہوا ہے لیکن اس میں اس کی نوعیت خراب ہوگئی مرد ہونا نمایاں نہیں بلکہ عورت ہونا نمایاں ہے اور اسی طرح سے عورت لباس پہنے اور بالکل مردانہ پہن لے چاہے اس کا بدن ڈھکا ہوا ہے اور چاہے وہ لباس خوبصورت ہے لیکن اس کی نوع جو تھی وہ خلط ہوگئی، دیکھنے والا پہچان نہیں سکتا ہے کہ یہ

عورت ہے یا مرد تو براہ راست حدیث شریف کے اندر اسی عنوان کے تحت ایسی عورتوں کے اوپر لعنت کی گئی ہے جو بتکلف مرد بننے کی کوشش کرتی ہیں ایسا لباس اور ایسی ہیئت اختیار کرتی ہیں جو مردوں کی ہے " مُتَشَابِهَاتْ بِالرِّجَالِ" پر حضور ﷺ نے لعنت فرمائی ہے اسی طرح " مُتَشَابِهِيْنَ بِالنِّسَاءِ " پر لعنت کی ہے تو بدن کی ہیئت ایسی بنانا لباس کے ساتھ دوسرے پہناوے کے ساتھ کہ مرد عورت لگنے لگ جائے جس طرح سے آپ نے جوانوں میں دیکھا ہوگا عام فیشن ہے زنانے لباس مرد پہنے پھرتے ہیں اور مردانے عورتیں پہنے پھرتی ہیں سب اللہ تعالیٰ کی لعنت کا باعث ہیں اس میں انسان کی نوعیت خلط ہوتی ہے۔

ایسا لباس نہ پہنو جو فساق فجار یا کفار کا شعار ہو:

اور ایسے ہی لباس کے اندر ایک یہ قید بھی ہے کہ اگر کوئی لباس فساق فجار یا کافر قوم کا شعار ہے اور تم ویسا پہننے لگ جاؤ کہ دیکھنے والے کو پتہ نہ چلے کہ تم مسلمان ہو یا انگریز، تم مسلمان ہو یا عیسائی اور دیکھنے والے کو پتہ نہ چلے کہ تم کس جماعت سے تعلق رکھتے ہو تو جس جماعت کے ساتھ ملتا جلتا لباس پہنا ہوگا اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کا شمار اسی جماعت میں ہے، اور ایک مسلمان ہوتا ہوا عیسائیوں جیسا لباس پہن لے تو "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" جو کسی قوم کے ساتھ تشبیہ اختیار کرے گا انہیں میں سے ہو جائے گا اور اسی طرح آپ ذاتی طور پر نیک ہیں، نماز کے پابند ہیں، سب کچھ کرتے ہیں لیکن اگر آپ فاسقوں فاجروں جیسا لباس پہنیں گے، یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ فاسقوں فاجروں جیسا لباس اگر پہنو گے تو تم اپنے لباس کے ساتھ اپنے آپ کو اس جماعت میں شامل کرتے ہو، بازاری لوگوں میں شامل کرتے ہو تو آپ کی باطنی نیکی اپنی جگہ رہی لیکن ظاہری طور پر اللہ کے حساب میں آپ فاسق ہو جائیں گے کہ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" جو کسی قوم کے ساتھ تشبیہ اختیار کرتا ہے انہیں میں سے ہو جاتا ہے، اس لیے جس جماعت سے تعلق رکھتے ہو لباس بھی ویسا ہی پہنو کہ دیکھتے ہی انسان کو نظر آجائے کہ یہ فلاں جماعت کا آدمی ہے، یہ کالج کا لڑکا ہے، یہ طالب علم مدرسے کا ہے، یہ نیک لوگوں میں سے ہے، یہ فاسقوں اور بدمعاشوں میں سے ہے۔

یہ حد بندیاں ہیں جو کردی گئیں ان حد بندیوں کی رعایت رکھتے ہوئے آپ خوبصورت لباس پہنیے، صاف ستھرا لباس پہنیے یہ عین مقصود ہے میلا کچیلا رہنا کوئی مقصود نہیں، ننگے رہنا کوئی مقصود نہیں ہے، سب باتیں اللہ

کے احکام کے خلاف ہیں، لباس پہنو صاف ستھرا پہنو ایسا پہنو جو پہنا ہوا تمہارے بدن پر اچھا لگے لیکن ان چیزوں کی رعایت رکھو کہ مرد عورتوں جیسا لباس نہ پہنے، عورت مردوں جیسا نہ پہنے اور فساق فجار اور کفار کے ساتھ تمہاری تشبیہ لازم نہ آئے اگر دیکھنے میں تم یوں معلوم ہو کہ یہ تو کوئی بازاری لڑکا چلا جا رہا ہے تو یوں سمجھیے کہ آپ نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا کہ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" اس کا فائدہ کوئی نہیں، یہ گناہ باللذت کہلاتا ہے۔

ایسا لباس جس میں نہ دین کا فائدہ نہ دنیا کا:

اب بتایئے کہ ایک شخص کا ٹخنہ جو ہے وہ ننگا رہتا ہے شلوار سے اللہ کے حکم کے مطابق کہ سرور کائنات ﷺ نے صراحتاً فرمایا کہ "مَا أَسْفَلَ مِنَ الْإِزَارِ مِنَ الْكَعْبَيْنِ فَهُوَ فِي النَّارِ او كما قال عليه الصلوة والسلام" کہ چادر جو ٹخنوں سے نیچے لٹک رہی ہو وہ یوں سمجھیے کہ چادر والا جہنمی ہے اس لیے بالاتفاق ٹخنوں سے نیچے پاجامے کا ہونا، شلوار کا ہونا، چادر کا ہونا حرام ہے اور نماز کی حالت میں تو خاص طور پر فرمایا کہ جس کی چادر ٹخنوں سے نیچے لٹک رہی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھتا ہی نہیں ہے ایسے شخص کو متکبر قرار دیا گیا ہے، تکبر ہے اس کے دل میں جو اس طرح سے کپڑا لٹکا کر چلتا ہے حضور ﷺ نے عمل سے قول سے بہت شدت کے ساتھ ممانعت کی ہے۔

اب ایک آدمی کا تو ٹخنہ ننگا ہے اور ایک آدمی شلوار اتنی نیچے چھوڑ کر چلتا ہے کہ اس کی ایڑی بھی چھپی ہوئی ہے تو یہ ایڑی چھپانے والا، یہ چادر کو نیچے لٹکانے والا دل میں سمجھ رہا ہے کہ میں بڑا باعزت نظر آ رہا ہوں، بڑا خان صاحب نظر آ رہا ہوں، بڑا یوں معلوم ہو رہا ہوں تو مجھے بتایئے کہ اس میں دین اور دنیا کا کوئی فائدہ ہے؟ چادر نیچے لٹکانے میں کوئی دین اور دنیا کا فائدہ ہے اور اس کو ذرا سا اونچا رکھنے میں کوئی نقصان ہے صرف ایک دماغی جنون ہے جس میں انسان نے اپنے ذہن کے طور پر اپنا ایک فوٹو بنا لیا کہ میں ایسا ہوں گا تو بہت خوبصورت لگوں گا، ایسا ہوں گا تو خوبصورت نہیں لگوں گا، بس اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے ایک فرضی معیار ہے جس کی بناء پر انسان اس طرح سے کرتا ہے، اب اچھے سے اچھے کپڑے مردانہ موجود ہیں لیکن ایک آدمی خالص ریشم پہنتا ہے اور حرام کا ارتکاب کرتا ہے یہ صرف ایک ذہنی جنون ہے جس سے اس نے اپنے آپ کو سکون دیا ہے ورنہ نہ دین کا فائدہ ہوتا نہ دنیا کا، ایک آدمی مرد ہو کر سونا پہنتا ہے ایک حرام کا ارتکاب کرتا ہے ویسے نہ کوئی دین کا فائدہ ہے نہ دنیا کا، یہ ہیں وہ ذہنی جنون جس کی بناء پر بنی آدم دھوکہ کھاتے ہیں ورنہ اگر آپ دیکھیں گے تو جتنا لباس تمہیں شریعت نے پہننے کے

لیے دیا ہے اس میں زیب وزینت کی بھی پوری رعایت ہے اور راحت وآرام کی بھی رعایت ہے تو پھر کیوں خواہ مخواہ انسان دوڑ دوڑ کر دوسری طرف جائے۔

ایک طرف آپ کے اساتذہ کا نمونہ ہے، سرور کائنات ﷺ کی نسبت ہے اور ایک طرف بازاری لوگوں کا طریقہ ہے اور بازاری لوگوں کا رسم ورواج ہے اور تم درمیان میں کھڑے ہو اور تم سے پوچھا جائے کہ ایسا بننا چاہتے ہو یا ایسا بننا چاہتے ہو تو تمہاری طبیعت فساق فجار کی طرف کیوں جاتی ہے؟ بالوں کی ساخت ہو، کپڑوں کی ساخت ہو اگر آپ بازاری لوگوں جیسی بنائیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے دل میں ان کی قدر وقیمت ہے اور اپنے اساتذہ کی اور اپنی جماعت کی کوئی قدر وقیمت نہیں ورنہ اگر ان کی قدر وقیمت ہے اور آپ اسی کو حسن وجمال سمجھتے ہیں تو کیا بات ہے کہ آپ ایسی شکل اختیار کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے، یہی بنیادیں ہیں انسان کو چکمہ دینے کی کہ آہستہ آہستہ بہکاتا ہے کہ فلاں ماحول میں جاؤ گے تو عزت ہے، ایسی شکل بناؤ گے تو عزت ہے، ایسا کرو گے تو عزت ہے اور دوسری طرف بتاتا ہے کہ یوں کرو گے کیا ہے دیکھنے میں لگو گے جیسے مسکین ہوتے ہیں اور اس قسم کی باتیں ذہن میں ڈال کر پھسلا دیتا ہے تو یہ لمبا واقعہ سنا کر آگے لباس کا مسئلہ شروع کرنے کی وجہ یہ ہو گی کہ مشرکین نے یہ لباس اتار دیا تھا اور ننگے ہو کر اللہ کے گھر کا طواف کرتے تھے، انہوں نے یہ بے حیائی کا کام اختیار کر رکھا تھا اور پھر اس کو کہتے تھے کہ چونکہ ہمارے آباء کا طریقہ ہے ہم تو ایسے ہیں کریں گے پھر یوں بھی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا ہے جس کی بناء پر خصوصیت سے یہاں تردید کر دی گئی یہ وجہ ہے حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد لباس کے احکام کے ذکر کرنے کی۔

لباس ایسا ہو جس سے دو فائدے حاصل ہوں:

"يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا" ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا جس میں دو فائدے ہیں، دو مقصد ہیں، ایک ہے تمہارے بدن کو چھپانا تو چھپانے میں حیاء کی رعایت بھی ہے اور گرمی سردی کی رعایت بھی ہے "وریشا" اور زینت کے لیے اتارا ہے تاکہ تمہاری شخصیت اس سے اجاگر ہو، تمہیں زیب وزینت حاصل ہو، لباس میں دونوں باتوں کی رعایت ہوتی ہے کہ وہ پردے کا کام بھی دے اور وہ زینت کا باعث بھی ہو، پہنا ہوا اچھا بھی لگے "وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ" تقویٰ کا لباس یہ بہت بہتر ہے، یہ ہے باطنی لباس جس طرح

سے ظاہری لباس ہمارے ظاہری عیوب کو چھپاتا ہے تقویٰ کا لباس ہماری باطنی خامیوں کو چھپاتا ہے، اور اگر کسی آدمی کو یہ تقویٰ کا لباس حاصل نہ ہوتو اس کی عیاشی بدمعاشی اور باطنی کمزوریاں نمایاں ہو کر انسان کو ذلیل کر دیتی ہیں اور اگر تقویٰ کا لباس حاصل ہو جائے تو باطنی کمزوریاں چھپی رہ جاتی ہیں بلکہ یوں سمجھیے کہ ظاہری لباس بھی تقویٰ کے لباس کا ہی ایک فرد ہے تو جیسے ظاہری لباس کو پہننے کی کوشش کرتے ہو اسی طرح باطنی لباس بھی اختیار کرنے کی کوشش کرو، اللہ کا خوف اور خشیت یہ باطنی لباس ہے اس کے ساتھ انسان کی باطنی کمزوریاں چھپتی ہیں۔

اور یوں بھی معنی کیا گیا ہے کہ لباس جو تقویٰ کے مطابق ہو وہی بہتر ہے یعنی لباس تو ہم نے اتار دیا جو تمہارے لیے ستر کا باعث بھی ہے اور زینت کا باعث بھی لیکن لباس پہنتے وقت تقویٰ کی رعایت رکھنی ہے جس قسم کے ہمارے احکام ہیں اس کے مطابق پہننا اس کے خلاف نہ پہننا بہتر تمہارے لیے یہی ہے، یہ وہی بات ہے جس کی تشریح میں نے آپ کے سامنے کر دی کہ غیر کے ساتھ تشبیہ نہ ہو، مرد ریشم نہ پہنے، سونا نہ پہنے، عورتیں ایسا لباس نہ پہنیں جو مرد سے مشابہت رکھتا ہو ان قاعدوں کی رعایت رکھو گے تو تمہارا لباس تقویٰ کا لباس ہے اور اگر ان قاعدوں کی رعایت نہیں رکھو گے تو تمہارا لباس تقویٰ کا لباس نہیں ہے" ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ" یہ اللہ کا لباس پیدا کرنا، اس کے اسباب اتارنا، تمہیں بنانے کا سلیقہ سکھا دینا یہ سب اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے "لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ" تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

اپنے خطرناک دشمن کی طرف سے ہوشیار رہو:

اے آدم کی اولاد! تمہیں فتنے میں نہ ڈال دے شیطان، تمہیں بہکا پھسلا نہ دے، خرابی میں نہ ڈال دے جیسے کہ تمہارے والدین کو جنت سے نکال دیا، اتارتا تھا ان دونوں سے ان کا لباس تاکہ دکھا دے ان کو ان کے اعضاء مستورہ، یہی تو اس کا مقصد تھا لغزش میں ڈالنے کا، یہی تو اس کا مقصد تھا کہ عزت و شرافت سب کچھ چھن جائے اور پھر یہ دشمن تمہارا اتنا خطرناک ہے کہ ہم تمہیں ہوشیار کر رہے ہیں کہ تمہیں یہ فتنے میں نہ ڈال دے اتنا خطرناک دشمن ہے وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے، اس کی پارٹی بھی تمہیں دیکھ رہی ہے لیکن تم انہیں نہیں دیکھ رہے اور ایسا خفیہ دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے، جو دشمن سامنے سے حملہ کرے اس کی مدافعت آسان ہوتی ہے اور جو دشمن نظر ہی نہیں آتا بسا اوقات تو نظر اس لیے نہیں آتا کہ اس کا وجود اتنا لطیف ہے کہ پھر رہا ہے اور ہم نہیں دیکھ رہے اور

بسا اوقات وہ اپنی شخصیت کو اپنی عداوت کو کسی دوستی کے پردے میں چھپالیتا ہے اور وہاں تک ہماری نظر نہیں پہنچتی کہ ہمارا دشمن ہے جب یہ مفہوم ہوگا تو اس میں شیاطین جن اور شیاطین انس دونوں آجائیں گے جیسے ہم کہتے ہیں کہ تجھے نظر نہیں آتا کہ یہ تیرا دشمن ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے دوستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اس لیے چادر اوپر اوڑھ لی ہے خیر خواہی کی اور دوستی اور تمہیں پتہ نہیں کہ یہ درپردہ دشمن ہے چھپ کر حملہ کر رہا ہے، دوستی کے پردے میں حملہ کر رہا ہے، خیر خواہی کے پردے میں حملہ کر رہا ہے تو یہ شیطان ایسے بھی ہوتے ہیں جیسے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ شیطان جب بھی آئے گا خیر خواہی کے عنوان سے آئے گا اور اس خیر خواہی کے پردے میں وہ چھپا ہوتا ہے اور باقی جو جنات وغیرہ ہیں وہ ویسے ہی نظر نہیں آتے لیکن یہ نظر نہ آنا یہ عام طور پر ہے ورنہ گاہے گاہے اگر نظر آجائیں تو یہ اس آیت کے خلاف نہیں عام ضابطہ ہے کہ عام طور پر تم انہیں دیکھتے نہیں ہو اس لیے کبھی کوئی شیطان نظر آجائے اور کسی ولی کو نظر آجائے، کسی نبی کو نظر آجائے جس طرح سے واقعات احادیث میں آتے ہیں تو وہ اس آیت کے خلاف نہیں ہے عام قاعدہ یہی ہے کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے تم اسے نہیں دیکھتے اس لیے اس دشمن سے ہوشیار رہو۔

پھر اس سے بچنے کا کیا طریقہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کی پابندی کرو گے تو گویا کہ تم ایسی ذات کی پناہ میں آگئے کہ جو شیطان کو دیکھتا ہے اور شیطان اسے نہیں دیکھتا تو اللہ تعالیٰ کے تحفظ میں آجانے کے بعد پھر شیطان کے حملوں سے حفاظت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ جو شیطان کو دیکھتے ہیں شیطان انہیں نہیں دیکھتا ہے تو اس کی مدافعت کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ اللہ کے احکام کی رعایت رکھو، جب ان کے قاعدے اور ضابطوں کی پابندی کرو گے تو شیطان کے حملوں سے محفوظ رہ جاؤ گے، یہ تمہیں ہوشیار کیا گیا ہے کہ یہ خطرناک دشمن ہے کہ جو تمہیں دیکھ رہا ہے تم اسے نہیں دیکھ رہے، بے شک دیکھتا ہے وہ اور اس کی جماعت ایسی جگہ سے کہ تم انہیں نہیں دیکھتے یعنی عام طور پر، اس لیے اگر گاہے گاہے نمایاں ہو بھی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اپنے خطرناک دشمن کی طرف سے ہوشیار رہو:

"اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ" بے شک ہم نے بنایا شیطانوں کو دوست ان لوگوں کا جو ایمان نہیں لاتے، ایمان سے محروم لوگوں کو شیطان دوست ملتے ہیں اور جتنا آپ اپنے ایمان کے اندر کمال حاصل کرتے چلے جاؤ گے شیاطین دور بھاگتے ہیں اور دوستی تمہاری اللہ اور نیک بندوں کے ساتھ لگتی چلی جاتی ہے، ایمان سے محرومی کے نتیجے

میں اردگرد شیطان ہی شیطان جمع ہو جاتے ہیں، یہ واقعہ ہے تم نیکی کا راستہ چھوڑ کر برائی کی طرف لگ جاؤ آج ہی تمہارے اردگرد سارے شہر کے غنڈے جمع ہو جائیں گے اور جتنا تم نیکی کی طرف آتے چلے جاؤ گے اتنا ہی شیطان تم سے بھاگیں گے اور صالحین کی رفاقت تمہیں نصیب ہوتی چلی جائے گی تو ایمان میں کمال شیطانوں سے دور ہٹاتا ہے، فرشتوں کا قرب نصیب کرتا ہے اور ایمان سے محرومی انسان کو فرشتوں سے دور ہٹا کر شیطانوں کا قرب نصیب کرتی ہے تو یہ دوست ان کے ہیں جو ایمان نہیں لاتے اور ایمان لانے والے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے والے وہ ان کے حملوں سے بچے ہوئے ہوتے ہیں۔

جاہلوں کی جہالت کی بات اور اس کی تردید:

"وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً" پھر ان کی یہ بات کہ جب یہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں، خصوصیت سے یہاں بے حیائی وہی ہے جو لباس کے متعلق انہوں نے اختیار کر رکھی ہے تو ان سے جب یہ پوچھا جائے کہ تم اس قسم کا کام کیوں کرتے ہو تو پھر یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء کو اسی طریقے پر پایا ہے گویا کہ باپ دادا کے طریقے کو اپنے لیے یہ حجت بنائے بیٹھے ہیں اور ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ "وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا" اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے، یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، اللہ کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ بے شک اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔

باقی آباء کا طریقہ جو ان کا تھا اس کی تردید دوسری جگہ آئے گی کہ اگر آباء گمراہ ہوں تو ضروری نہیں کہ اولاد بھی اسی گمراہی کے راستے پر دوڑتی رہے "قُلْ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآءُكُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ" کہ تم اپنے آباء کے طریقے پر چلتے رہو گے اگرچہ وہ نہ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہدایت، بے عقلوں بے ہدایتوں کے راستے پر اگر چلتے رہو گے تو تم بھی وہی بن جاؤ گے، دیکھنا تو یہ چاہیے کہ تمہارے خاندان میں جو رسم چلی آرہی ہے، تمہارے آباؤ اجداد کا جو طریقہ چلا آرہا ہے یہ عقل اور ہدایت کے مطابق ہے یا نہیں؟ اگر عقل اور ہدایت کے مطابق ہے تو ضرور اختیار کرو اور اگر وہ عقل اور ہدایت کے مطابق نہیں تو تمہارے باپ دادا بھی گمراہ تم ان کے پیچھے لگو گے تو تم بھی گمراہ یہ وضاحت اور آیت میں آئے گی یہاں صرف اس کے اوپر یہ تردید کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بہتان نہ باندھو، اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں دیتا "قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" کیا تم اللہ کے اوپر ایسی باتیں بولتے ہو کہ جن کو تم جانتے نہیں ہو یعنی اللہ کے متعلق وہی بات کہنی چاہیے کہ اللہ کا حکم ہے، جس کو

انسان علم اور دلیل کے ساتھ ثابت کر سکے کہ واقعی دیکھو وہاں سے ثابت ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

جیسے ہم کہتے ہیں کہ اللہ کا حکم ہے نماز پڑھو وہاں کوئی پوچھے تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اللہ کا حکم ہے ہم کہیں گے اللہ کی کتاب میں لکھا ہوا ہے "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" تو یہ بات ہماری علم کے ساتھ ہے، اور تمہیں علم تو ہے نہیں، اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھتے نہیں، دیکھا نہیں، جانا نہیں، بوجھا نہیں، اور اپنی طرف سے اللہ کی طرف باتیں منسوب کرنا یہ بے علمی کے ساتھ اللہ کے اوپر بہتان باندھنا ہے تو یہی تنبیہ ان کو کی گئی ہے کہ " اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ" کیا تم بولتے ہو اللہ پر ایسی باتیں جو تم جانتے نہیں، جن کی علمی دلیل تمہارے پاس نہیں تم ایسی بات اللہ کے ذمے لگاتے ہو۔

ہر چیز کا اختیار اللہ نے انسان کو دیا ہے:

"قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْھَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ" آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے انصاف کا، انصاف سے مراد ہے ہر چیز کے اندر اعتدال کی رعایت رکھنا، افراط اور تفریط سے بچنا، جیسے حکم ہے ویسے ہی کرنا اس میں سب حقوق العباد آگئے کسی پر ظلم نہ کرو، کسی کی حق تلفی نہ کرو ہر کسی کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو" وَاَقِیْمُوْا وُجُوْھَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ" اور ہر عبادت کے وقت اپنے رخ سیدھے رکھو اللہ کی طرف، اللہ کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرو اور مخلص ہو کر خالص عقیدے کے ساتھ اسے ہی پکارو، اسے ہی اپنی فریادیں اور ضرورتیں پوری کرنے والا سمجھو، یاد رکھو تم نے اس کے سامنے پیش ہونا ہے جیسے اس نے پہلے پیدا کیا ویسے ہی تم لوٹو گے یہ قیامت کے یاد دلانے کے ساتھ ساتھ ترہیب آگئی۔

ایک گروہ ایسا ہے کہ جس کو توفیق دے دی سیدھے راستے پر چلنے کی اور ایک گروہ ایسا ہے کہ جن پر ان کی بد کرداریوں کی وجہ سے گمراہی ثابت ہوگئی، انہوں نے اپنے اختیار کے ساتھ گمراہی کا راستہ اختیار کر لیا، اللہ نے اس پر ان کو جما دیا، تم جدھر کو جانے کا ارادہ کرو گے اللہ اسی پر چلا دیں گے، دیکھو یہ دو دروازے ہیں تم ارادہ کر لو ادھر سے نکلنے کا اللہ تمہیں ادھر چلنے کی توفیق دے دے گا، ارادہ کو لو ادھر سے نکلنے کا اللہ تعالیٰ تمہیں ادھر چلنے کی توفیق دے دے گا لیکن ہوتا تو سب کچھ اللہ کی توفیق کے ساتھ ہی ہے اس لیے نسبت اللہ کی طرف ہی ہے، اس فعل کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے کیونکہ خالق ہر چیز کا وہ ہے اور آپ کی رفتار اور آپ کی چال یہ بھی اللہ کی مخلوق ہے لیکن آپ کے

ارادے کے ساتھ جیسے جیسے اسباب بنتے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ چیزیں پیدا ہوتی جاتی ہیں، یہاں کھڑے ہو جاؤ مشرق کو جانا ہے مشرق کو چلتے جاؤ، مغرب کی طرف جانا ہے اللہ تمہیں مغرب کی طرف چلا دے گا، بات انسان کے ارادے سے چلتی ہے کہ تم نے ارادہ نیکی کا کیا ہے تو تمہارے لیے نیکی کا راستہ آسان ہوتا چلا جائے گا اور اگر تم نے ارادہ برائی کا کیا ہے تو برائی کا راستہ آسان ہو جائے گا۔

کمرے میں بیٹھے ہوئے ارادہ کرلو کہ آج ہم نے بارہ بجے مسجد میں بیٹھ کر مطالعہ کرنا ہے یقیناً آپ کے لیے اس کے اسباب مہیا ہو جائیں گے کوئی بھی آپ کو کان پکڑ کر نہیں اٹھا سکتا، نیکی کرنے والوں کے لیے نیکی کا راستہ آسان ہے اور برائی کرنے والوں کے لیے برائی کا راستہ آسان ہے جو بھی کام آپ کرنے لگیں اس وقت آپ اپنے دل میں غور کرلیں اس کی دلیل آپ کے اندر موجود ہے "وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" اگر کسی وقت آپ کوئی معصیت کا کام کرنے لگے ہیں، گناہ کا کام کرنے لگے ہیں تو اس وقت بھی اپنے دل میں غور کیجئے کہ کیا اس سے بچنا ہمارے اختیار میں ہے یا نہیں؟ تو آپ کا دل یہ جواب دے گا کہ اختیار میں ہے کہ مرضی ہے کرو مرضی ہے نہ کرو تو پھر باہر کی دلیلیں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ جو بھی قدم آپ اٹھاتے ہیں اس وقت آپ اپنے دل میں سوچ لیجئے کہ کیا ادھر کو اٹھانے کا یا ادھر کو اٹھانے کا، مجھے اختیار ہے یا نہیں؟ دل کہے گا کہ دونوں طرف کا اختیار ہے تو پھر تم اپنے اختیار کے ساتھ اپنے ارادے کے ساتھ برائی کی طرف جاتے ہو تو پھر ملزم تم ہو باقی اللہ تعالیٰ نے تو جدھر آپ نے رخ کرلیا وہ راستہ آپ کے لیے آسان کر دینا ہے۔

اور سمجھا دیا ہے، ہر چیز واضح کر دی، برائی بھی واضح کر دی اور اچھائی بھی واضح کر دی، تمہیں درمیان میں کھڑا کر دیا اب آپ اپنے دل کا جائزہ لیں کہ آپ چاہتے کیا ہیں اگر یہ راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو یہ کھلا ہے، یہ راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو تو یہ کھلا ہے، ہر قدم پر آپ اپنا جائزہ لے سکتے ہیں باطن کے اندر آپ اس وقت محسوس کریں گے نماز پڑھنے کے لیے اگر آپ تکبیر تحریمہ کہنے لگے ہیں تو اس وقت بھی سوچ لو تو آپ کا دل کہے گا کہ اختیار ہے چاہے کہو چاہے نہ کہو اور کوئی برائی کرنے لگے ہو تو عین موقع پر سوچ لو کہ اس کو چھوڑنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ تو آپ کا دل کہے گا کہ بالکل اختیار ہے ارادہ کرلو چھوٹ جائے گی یہ تو انسان کی باطن کی کیفیت ہے کہ جب غور کرے تو خود بخود واضح ہو جاتی ہے تو پھر الزام جو ہے انسان پر کیوں نہ آئے جب کہ سارے عمل کی بنیاد اسی ارادے سے اٹھتی ہے باقی ہاں آگے ہر چیز کا پیدا کرنے والا چونکہ اللہ ہے بغیر اس کے پیدا کرنے کے کوئی چیز وجود میں نہیں آتی

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت یہ فیصلہ فرمالیا کہ انسان جدھر کا ارادہ کرے گا ویسے ہی اللہ تعالیٰ اس کے لیے کیفیات، اسباب اور حالات پیدا فرماتے جاتے ہیں۔

اللہ والے کون ہیں اور شیطان کے ایجنڈ کون ہیں؟

"اِنَّھُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ" یہ جن کے اوپر گمراہی ثابت ہوئی ہے یہ کون لوگ ہیں یہ وہ ہیں جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں سے دوستی لگالی، دیکھو! بنیاد کہاں سے چلتی ہے؟ غور فرمائیں بنیاد یہاں سے چلتی ہے کہ ہمارا دلی تعلق کس کے ساتھ ہے، اگر تو تمہارا دلی تعلق بروں کے ساتھ ہے تو سمجھو گمراہی کا نشانہ تم ہو، گمراہی تم پر ثابت ہے اور اگر تمہارا تعلق اللہ کے ساتھ ہے اور اللہ کے ساتھ تعلق کی علامت یہ ہے کہ اللہ والوں سے تعلق ہے، اللہ کے نبی سے تعلق ہے، اللہ کے ولیوں سے تعلق ہے، دین کے ترجمانوں سے تعلق ہے تو یقیناً آپ "فَرِیْقًا ھَدٰی" کا مصداق بنتے چلے جائیں گے اس لیے تو ایک عربی کہتا ہے کہ کسی انسان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ تو اچھا ہے یا برا، یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ تم اچھے ہو یا برے ہو اس کے دوست کو دیکھ لیا کرو جس قسم کے دوست ہوا کرتے ہیں وہی کیفیات انسان کے باطن کی ہوتی ہیں یہ نکتہ اپنے ذہن میں بٹھا لو وہ جاہل عربی شاعر کہتا ہے کہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ تو اچھا ہے یا برا، اس کے دوستوں کو دیکھ لو اگر اس کے اردگرد اچھے دوست ہیں تو یہ سمجھو کہ یہ بھی باطن میں اچھا ہے کیونکہ اچھا آدمی اچھی چیز کو پسند کرتا ہے اور اگر اس کے دوست خراب ہیں، بدمعاش عیاش ہیں چاہے آپ کو اس کے اوپر کوئی اعتراض نظر نہیں آرہا؟ لیکن حقیقت میں یہ بھی خراب ہے اگر یہ خراب نہ ہوتا تو اس کا خراب لوگوں کی طرف رجحان کیوں ہوتا اور مناسبت کیوں ہوتی؟

ایک واضح بات ہے دوستی کی بنیاد مناسبت پر ہوتی ہے جب تک دو آدمیوں میں مناسبت نہ ہو دوستی نہیں ہوتی باطن کے جذبات ہمیشہ انسان کے دوستوں کے ملنے سے سمجھ میں آتے ہیں کہ اس کے اردگرد اس کے دوست کیسے ہیں؟ اس کا رجحان کس قسم کے لوگوں کی طرف ہے؟ جس قسم کے لوگوں کی طرف اس کا رجحان ہوتا ہے ویسے ہی اس کے قلبی جذبات ہوتے ہیں تو گمراہی ان پر ثابت ہے جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیاطین سے دوستی لگالی، شیاطین کا لفظ عام ہے دیکھو جمع کے صیغے کے طور پر آیا ہے چاہے وہ شیاطین جن ہوں چاہے وہ شیاطین انس ہوں اور انسانوں میں شیاطین کون ہیں؟ یہ وہ جو آپ کے لیے غلط راستے کی راہنمائی کا باعث بنتے ہیں، جو آپ کو غلط عادات کی تلقین کرتے ہیں وہ انسانوں میں سے شیاطین ہیں ان سے دوستی لگا کر دیکھو "فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْھِمُ الضَّلٰلَةُ" کے

اندر فوراً داخل ہو جاؤ گے اور اگر اللہ کے ساتھ دوستی لگاؤ گے، اللہ والوں کے ساتھ دوستی لگاؤ گے تو "فَرِيقًا هَدَىٰ"
کے اندر شامل ہوتے چلے جاؤ گے یہ تو آپ نے اپنی قسمت کا فیصلہ خود ہی کرنا ہے۔

بدعتی کو توبہ کی توفیق نہیں ملتی:

"وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ" یہ بھی ایک نفسیاتی بات ہے کہ لگے ہوئے ہیں شیطانوں کے پیچھے، دوستی شیطانوں سے ہے، گمراہی کے اندر ڈوبے ہوئے ہیں لیکن دل و دماغ ان کا یہ کہتا ہے کہ ہم ہی ٹھیک ہیں "وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ" وہ اپنے طور پر سمجھتے یہی ہیں کہ ٹھیک ہم ہی ہیں، سیدھے راستے پر ہم ہی چل رہے ہیں اس لیے دوسرے شخص جو انہیں سمجھاتے ہیں ان کی بات پر وہ کان ہی نہیں دھرتے، ان کا دماغ یہی ہے کہ ہم ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں یہ گمراہی کی زینت ہوتی ہے کہ جب ایک انسان غلط راستے پر چلتا ہوا یہ سمجھنے لگ جائے کہ صحیح راستے پر چل رہا ہوں ایسے شخص کے سمجھنے کی توقع پھر بہت کم ہوتی ہے اس کو جہل مرکب کہتے ہیں، ارے بھائی ایک آدمی برائی کرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں برائی کر رہا ہوں تو توقع رکھو کہ کسی وقت یہ باز آجائے گا ایک آدمی کسی گناہ کے اندر مبتلاء ہے لیکن اسے یہ احساس ہے کہ واقعی میں برا کام کر رہا ہوں یہ کام اچھا نہیں ہے مجھے نہیں کرنا چاہیے لیکن عادت کی مجبوری سے، کسی کے بہکانے سے، ماحول کی مجبوری سے وہ کر رہا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ میں غلط ہوں جو اپنے آپ کو غلط سمجھ رہا ہے وہ کسی وقت بھی سنبھل جائے گا اس کو سنبھلنے کی توفیق ہو جائے گی۔

لیکن جو کر رہا ہو برائی اور دلیلیں دے رہا ہو کہ یہی ٹھیک ہے ایسے شخص کے سنبھلنے کی توقع نہیں ہوتی یہ جہل مرکب میں مبتلاء ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکابر کہا کرتے ہیں کہ بدعتی کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، زانی کو ہو سکتی ہے، چور کو ہو سکتی ہے، قاتل کو ہو سکتی ہے، ہر بدمعاش کو ہو سکتی ہے، بدعتی کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اس کی کیا وجہ کہ چور چوری کرتا ہے تو اس کو جائز نہیں سمجھتا، وہ سمجھتا ہے کہ میں برا کام کر رہا ہوں اس پر توقع ہے کہ کسی وقت چھوڑ دے گا اور ایک زانی زنا کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں غلط کام کر رہا ہوں تو کسی وقت بھی اس کو تنبیہ ہو جائے گی وہ چھوڑ دے گا لیکن بدعتی تو اس بدعت کو، اللہ کی معصیت کو عبادت سمجھ کر کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ نیکی کا کام ہے اس سے اللہ خوش ہوگا، اللہ کے پیغمبر خوش ہوں گے، اللہ کے ولی خوش ہوں گے وہ تو ان کے نام پر جو کچھ کرتا ہے نیکی سمجھ کر کرتا ہے جب وہ نیکی سمجھ کر کرتا ہے تو پھر وہ باز کیسے آئے گا اس لیے بدعتی کے لیے ایک قسم کا توبہ کا دروازہ بند ہے کہ بہت کم اللہ تعالیٰ کسی کی دستگیری فرمادے اور اللہ کا کوئی خاص فضل ہو جائے اور وہ سمجھ جائے تو سمجھ جائے ورنہ بدعتی جو ہے وہ

آخر وقت تک سنبھلتا نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خلاف شریعت کام کرتا ہے اور اس کا دل و دماغ یہ کہتا ہے کہ یہ ثواب کا کام ہے، نیکی کا کام ہے، جب نیکی کا کام ہے تو توبہ کیوں کرے تو یہ گمراہی کی مہر ہے جو کسی کے اوپر لگ جائے کہ انسان ہو تو غلط کار لیکن سمجھے یہ کہ میں سیدھے راستے پر چل رہا ہوں۔

نماز اور عبادت کے وقت زیب وزینت اختیار کرنا:

"یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ" اب مطلب کی بات آگئی کہ یہ لوگ عبادت کرتے وقت جو کپڑے اتار دیتے تھے، بیت اللہ کے قریب ننگے ہو کر جاتے تھے، ننگے ہو کر طواف کرتے تھے تو حکم دیا جا رہا ہے کہ اے آدم کے بچو! اپنی زینت اختیار کرو ہر نماز کے وقت یا مسجد کی ہر حاضری کے وقت یا ہر عبادت کے وقت، زیب وزینت کے ساتھ عبادت کیا کرو جس سے فقہاء نے استدلال کیا کہ نماز پڑھنے کے لیے کپڑوں کا پہننا فرض ہے اور تمام حالات میں بھی فرض اور نماز کے لیے خاص طور پر فرض کہ اگر ننگا بدن ہوگا تو نماز نہیں ہوگی باقی یہ ہے کہ کتنے پہننے چاہئیں وہ تفصیل فقہ میں آپ کے سامنے موجود ہے کہ ناف سے لیکر گھٹنوں تک کا چھپانا فرض ہے عام حالات میں بھی اور نماز میں بھی، فرض مقدار تو اسی سے پوری ہو جاتی ہے اگر کوئی شخص اتنے بدن کو ڈھانپ کے نماز پڑھ لیتا ہے چاہے باقی بدن اس کا ننگا ہو تو فرض ادا ہو گیا لیکن آگے حکم جو ہے صرف فرض کی ادائیگی کا نہیں بلکہ زینت اختیار کرنے کا ہے تو جیسے جیسے اسباب مہیا ہوتے جائیں اتنی زینت اختیار کرنا ضروری ہے۔

زینت کا معیار کیا ہے؟ خوبصورت کپڑے پہن کر اچھے کپڑے پہن کر نماز پڑھنے کے لیے جاؤ اس کا معیار کیا ہے؟ فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کا معیار یہ ہے کہ دنیا کے اندر معزز سے معزز مجلس میں جانے کے لیے آپ اپنے لیے کون سی ہیئت پسند کرتے ہیں جس قسم کی ہیئت آپ دنیا کی معزز مجلسوں میں جانے کے لیے پسند کرتے ہیں مسجد میں اس ہیئت کے ساتھ جاؤ ورنہ مکروہ ہے یعنی آپ کے کپڑے اتنے میلے ہیں کہ اگر آپ کو بلا لیا جائے کہ وہاں اجلاس ہے، وہاں میٹنگ ہے، وہاں کچھ معزز آدمی جمع ہیں آپ بھی تشریف لائیں، آپ ان حالات میں جانے کے لیے تیار نہیں اب اگر آپ اس حالت میں مسجد میں جائیں گے تو یہ آپ کا جانا مکروہ ہے اور اس لباس کے ساتھ آپ کی نماز مکروہ ہے۔

بس یہ معیار ہے کہ معزز مجلس میں، کسی بڑے آدمی کی مجلس میں جانے کے لیے انسان جس قسم کی ہیئت اپنے لیے پسند کرتا ہے اس قسم کی ہیئت اختیار کرنا یہ "خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ" کا مصداق ہے اگر کسی کے پاس گھٹیا کپڑے

ہیں وہی پہن کروہ ہر جگہ جاتا ہے حتیٰ کہ تھانیدار بلا لیتا ہے، تحصیلدار بلائے، کوئی معزز آدمی بلائے اسی کیفیت سے جاتا ہے تو اس کے لیے ان کپڑوں میں نماز مکروہ نہیں ہے جس طرح سے عام مزدور طبقہ کام کرنے والے لوگ ہوتے ہیں تو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق جو لباس آپ معزز مجلسوں کے اندر پہن کر جاتے ہیں وہی اس کا معیار ہے اس لیے مسجد میں جو تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں رکھی ہوئی ہوتی ہیں لوگ انہیں سر پر رکھ کر نماز پڑھنے لگ جاتے ہیں اگر انہیں کہا جائے کہ یہی ٹوپی لے کر ذرا بازار میں چکر لگا آؤ تو شاید وہ آمادہ نہ ہوں تو ایسی ٹوپیوں سے ان کی نماز مکروہ ہو جائے گی اور اگر ایک آدمی کے سر پر ٹوپی ہے وہی پہن کر پھر رہا ہے ہر جگہ چاہے وہ میلی ہے چاہے وہ پھٹی ہوئی ہے اس لیے اس ٹوپی کے اندر نماز مکروہ نہیں ہے تو "خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ" کے تحت مفسرین نے فقہاء یہ مسئلہ بیان کیا ہے نے کہ اچھی حالت کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیے اور اچھی حالت وہ ہے کہ جو انسان اچھی سے اچھی مجلس میں جاتے وقت اختیار کرتا ہے اور اگر اس کے خلاف اختیار کرو گے تو ایسی صورت میں مکروہ ہو گی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں کپڑے کم ہوتے تھے صرف ایک چادر باندھ کر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آپ کی مجلس میں بھی ویسے ہی آتے تھے ان کے لیے مکروہ نہیں تھا اب یہ ہماری حالت ایسی ہو گئی کہ ہم کسی استاذ کے سامنے صرف اتنی سی چادر باندھ کر جانے کے لیے تیار نہیں، باہر جانے کے لیے تیار نہیں تو اگر ہم صرف چادر باندھ کر نماز پڑھیں گے تو ہمارے لیے مکروہ ہے، گرمی میں لوگوں کی عادت ہوتی ہے قمیض اتار دیتے ہیں صرف بنیان پہنی ہے یا ایک ایسی چادر ڈال لی اور نماز پڑھ لی اور ابھی پیغام آجائے کہ تمہیں تحصیلدار صاحب بلا رہے ہیں تو دیکھو ابھی پوشاک پہنی جائے گی نہ گرمی کا عذر ہو گا نہ کوئی اور عذر ان کی نماز اس طرح بالکل مکروہ ہے چاہے وہ کہیں ہم نے فرض ڈھانپا ہوا ہے ان کی نماز مکروہ ہے، قابل اعادہ ہے جو اس قسم کے لباس میں نماز پڑھتے ہیں جس لباس کے ساتھ وہ کسی معزز مجلس میں جانے کے لیے تیار نہیں ہیں "خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" کا مفہوم یہ ہے۔

"كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا" کھاؤ پیو اور حد سے نہ بڑھو، اسراف نہ کرو، حد سے بڑھنا ایک تو یہ بھی ہوتا ہے کہ حلال سے حرام کی طرف انسان چلا جائے، حلال پر بند نہیں رہتا حرام کی طرف جاتا ہے اور ضرورت سے زیادہ کھاتا پیتا ہے جو انسان کے لیے بدہضمی کا باعث بن کر ہلاکت کا باعث بن جائے وہ بھی اسراف میں داخل ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ" اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے، اس کا تعلق بھی مشرکین کے اس

معاشرے کے ساتھ ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر بعض چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا، کھاتے پیتے نہیں تھے کہ ان دنوں میں یہ نہیں کھانا، ان دنوں میں یہ نہیں کھانا اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورہ انعام میں کچھ گزر چکی ہے تو اس پر بھی پابندی لگانا مقصود ہے کہ حرام کرنا حلال ٹھہرانا اللہ کا کام ہے جو چیز اس نے حلال ٹھہرائی ہوئی ہے اس کو کھاؤ پیو، اپنے طور پر ان کو حرام نہ ٹھہراؤ یہ بھی اسراف ہے، یہ بھی حد سے بڑھنا ہے اور اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ

آپ کہہ دیجئے کس نے حرام ٹھہرایا اللہ کی اس زینت کو جو اللہ نے ظاہر کی ہے اپنے بندوں کے لیے اور کس نے حرام ٹھہرایا پاکیزہ چیزوں کو

الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً

رزق میں سے آپ فرمادیں یہ سب نعمتیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لائے دنیاوی زندگی میں اس حال میں کہ خالص ہیں

يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ

قیامت کے دن ایسے ہی ہم کھول کر بیان کرتے ہیں آیات کو علم والے لوگوں کے لیے (۳۲) آپ فرمادیجئے سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حرام ٹھہرایا

رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ

میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو جو ظاہر ہیں اور جو چھپے ہوئے ہیں اور حرام ٹھہرایا میرے رب نے گناہ کو اور ناحق ظلم کرنے کو

وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا

اور یہ کہ تم شریک ٹھہراؤ اللہ کے ساتھ ایسی چیز جس کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور حرام ٹھہرایا میرے رب نے اس بات کو کہ تم بولو اللہ پر ایسی باتیں جو

لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ

تم جانتے نہیں ہو (۳۳) اور ہر جماعت کے لیے ایک وقت متعین ہے پس جس وقت ان کی اجل آجائے گی نہ وہ پیچھے ہٹ سکیں گے

سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ

ایک گھڑی نہ آگے بڑھ سکیں گے (۳۴) اے آدم کی اولاد! اگر آئیں تمہارے پاس رسول تمہیں میں سے

يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

جو پڑھتے ہوں گے تم پر میری آیات پس جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا اور اپنے اعمال کو درست کرے گا پس ان پر نہ کوئی خوف ہوگا

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ

اور نہ غمزدہ ہوں گے (۳۵) اور وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں اور ان سے تکبر کرتے ہیں

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى

یہی لوگ جہنم والے ہیں اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (۳۶) پھر کون ظالم ہے اس شخص سے جو گھڑے

عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ

اللہ پر جھوٹ یا اس کی آیات کو جھٹلائے یہی لوگ ہیں کہ ان کو ان کا حصہ پہنچے گا

الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ

لکھی ہوئی تقدیر سے جب آجائیں گے ان کے پاس رسول (موت کے فرشتے) جو ان کو وفات دیں گے تو یہ کہیں گے کہاں چلی گئی ہیں وہ چیزیں جن کو تم

تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى

پکارا کرتے تھے اللہ کے علاوہ ، وہ جواب دیں گے وہ سب ہم سے گم ہوگئے اور وہ لوگ اقرار کریں گے

اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ

اپنے نفسوں پر کہ بے شک وہ کافر تھے (۳۷) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے داخل ہو جاؤ تم ان جماعتوں کے ساتھ جو گزر گئیں

مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ

تم سے پہلے انسانوں سے اور جنوں سے ان کے ساتھ شامل ہو کر داخل ہو جاؤ جہنم میں جب کبھی داخل ہوگی کوئی جماعت لعنت کرے گی وہ

اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا

اپنی جیسی جماعت پر حتی کہ سارے کے سارے اس جہنم میں اکٹھے ہو جائیں گے تو کہے گی ان میں سے آخری جماعت پہلی جماعت کے متعلق اے ہمارے پروردگار!

هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ

یہی ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا پس دے تو ان کو آگ سے دگنا عذاب اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ہر کسی کے لیے

ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ

دگنا ہے لیکن تم جانتے نہیں (۳۸) اور کہے گی وہ پہلی جماعت پچھلی جماعت کو پس نہیں ہے

لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

تمہارے لیے ہم پر کسی قسم کی فضیلت پس چکھو تم عذاب ان کاموں کی وجہ سے جو تم کرتے تھے (۳۹)

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

جو مضمون آپ کے سامنے چلا آرہا ہے وہ مشرکین کی ان رسوم کی تردید ہے جو انہوں نے اپنے طور پر تجویز کر رکھی تھیں اور نسبت ان کی اللہ کی طرف کرتے تھے، جن میں خاص طور پر یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ وہ طواف کرتے ہوئے کپڑے نہیں پہنتے تھے اور حج کے ایام میں خواہ مخواہ چیزوں کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا لیتے تھے اس کی تردید پیچھے کی گئی کہ یہ شیطانی کام ہے اور جس طرح شیطان نے تمہارے ابوین کو بہکایا تھا اور ان کو لباس سے بھی محروم کر دیا اور جنت کی نعمتوں سے بھی محروم کر دیا آج بھی شیطان تمہارے پیچھے لگ کر تمہیں بہکا کر لباس سے بھی محروم کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بھی محروم کر رہا ہے، چوکنے ہو جاؤ یہ وہی دشمن ہے جو وہاں سے پیچھا لگا اور آج بھی تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔

پہلی آیت میں تو یہی انکار کیا گیا ہے آپ ان سے پوچھیے "قُلْ" کا یہ بھی معنی ہوتا ہے کہہ دو اعلان کر دو یعنی ان سے دریافت کرو، ان کے سامنے واضح طور پر کہو، کون ہے جس نے حرام ٹھہرایا اللہ کی زینت کو جو اللہ نے بندوں کے لیے ظاہر کی ہے، زینت سے مراد لباس کیونکہ آپ کے سامنے عرض کیا تھا کہ لباس میں صرف یہی فائدہ نہیں کہ اس سے ستر پوشی ہوتی ہے، اس میں ستر پوشی کا فائدہ بھی ہے اور انسان کے لیے زینت بھی ہے تو اللہ نے جو زینت پیدا کی ہے لباس جو انسان کے لیے باعث زینت ہے اس کو کس نے حرام ٹھہرایا ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے یعنی کسی کو حق نہیں حرام ٹھہرانے کا، اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے حرام ٹھہرائے تو اللہ ٹھہرائے جس چیز کو اللہ حرام نہ ٹھہرائے اس کو کون حرام ٹھہرا سکتا ہے۔

اسی طرح رزق میں سے پاکیزہ اور صاف ستھری چیزیں ان کو کس نے حرام ٹھہرایا یعنی کسی کو حق نہیں حرام ٹھہرانے کا، حرام ٹھہرانا حلال ٹھہرانا یہ منصب خالق کا ہے جس نے چیز کو پیدا کیا جو اس کا مالک ہے وہی کہہ سکتا ہے کہ یہ چیز تم استعمال کرو یہ چیز استعمال نہ کرو کسی دوسرے کو حق نہیں ہے۔

دنیا کی نعمتیں مؤمن کے لیے نعمت ہیں اور کافر کے لیے وبال جان:

"قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" آپ یہ بھی کہہ دیجیے ھی ضمیر کا مرجع یہی نعمتیں ہیں جو زینت

اور طیبات میں مذکور ہیں کھانے پہننے کے انعامات، کھانے پہننے کی نعمتیں، اللہ نے زینت کے طور پر لباس پیدا کیا، کیسی پاکیزہ اور صاف ستھری چیزیں اللہ نے کھانے کے لیے پیدا فرمائیں آپ یہ کہہ دیجیے کہ یہ نعمتیں جو دنیا میں استعمال ہوتی ہیں یہاں اس دنیا میں رہتے ہوئے ان نعمتوں سے مومن بھی فائدہ اٹھاتا ہے اور باغی بھی فائدہ اٹھاتا ہے لیکن دونوں کے کھانے میں اور دونوں کے فائدہ اٹھانے میں فرق ہے، فرق کیا ہے کہ مومن ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے یہ نعمتیں آخرت میں جاکر اس کے لیے وبال نہیں بنیں گی جب یہ نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس پر اللہ کا شکر بھی ادا کرتا ہے اور ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کا ذریعہ بناتا ہے تو یہ نعمتیں حقیقت میں ان کے لیے نعمتیں ہیں اور آخرت میں جاکر وبال نہیں بنیں گی۔

اور ایک کافر فائدہ اٹھاتا ہے لیکن وہ نعمتوں کو لیتا ہے لے کر ان کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذریعہ بناتا ہے، انہی نعمتوں کے زور سے وہ فسق و فجور میں مبتلاء ہوتا ہے، ٹھیک ہے وہ آج ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے لیکن یہ نعمتیں اس کے حق میں حقیقتاً نعمتیں نہیں ہیں بلکہ یہی نعمتیں قیامت کے دن اس شخص کے لیے وبال بن جائیں گی اور یہ کھایا پیا ہوا سارا ناک کے راستے نکلے گا اس لیے خالص طور پر اگر یہ نعمتیں ہیں تو یہ مؤمنین کے لیے ہیں، دیکھو! ایک شخص کو اللہ تعالیٰ پیسے دیتا ہے، روپیہ دیتا ہے، اب اس روپیہ پیسے کی اس نے زکوٰۃ میں لگایا، خیرات کی، حلال ذریعے سے کما کر اس کو کھایا، پہنا، اپنے بچوں کو کھلایا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اس کو استعمال کیا، غریبوں کی ہمدردی کی، یہ ساری کی ساری چیزیں کی تو یہ مال اس کے حق میں دنیا میں بھی باعث راحت ہوا اور یہی مال اس کے لیے آخرت میں بھی ترقیات کا باعث بنے گا، ترقی درجات ہوگی تو یہ مال حقیقت میں اس شخص کے لیے نعمت ہے جس نے دنیا کے اندر بھی اس کو آسائش پہنچائی اور آخرت میں بھی وہ ترقی درجات کا ذریعہ بنا تو یہ مال نعمت ہوا۔

اور ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ مال دیتے ہیں اور جس وقت تک اس کے پاس مال نہیں تھا وہ برائی کے اڈہ پر نہیں جا سکتا تھا، سینما میں نہیں جا سکتا تھا، رنڈی بازی نہیں کر سکتا تھا، شراب نہیں پی سکتا تھا، جوا نہیں کھیل سکتا تھا، اور اسی طرح دوسری خرافات اس مال کے ذریعے سے جو ہوا کرتی ہیں یہ ناچ گانے وغیرہ یہ سب کچھ وہ نہیں کر سکتا تھا، اب اس کو مال مل گیا جب مال مل گیا تو یہ سینما میں خرچ کرنے لگ گیا، چکلے میں اڑانے لگ گیا، جوا کھیلنے لگ گیا، شراب پینے لگ گیا اور عیاشی بدمعاشی جتنی بھی مال کے ذریعے سے ہوتی ہے وہ ساری کرنے لگ گیا تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ مال اس کے لیے نعمت ہے؟ یہ مال اس کے لیے نعمت نہیں یہ تو وبال ہے کہ اس نے دنیا میں چند روز کھا پی لیا لیکن

جس وقت مرجائے گا، قیامت میں جائے گا اس کا حساب کتاب دینا پڑے گا تو پھر اس کو پتہ چلے گا کہ یہ کیا ہے؟

کافروں کے لیے دنیا کی نعمتیں زہریلے کھانے کی طرح ہیں:

یا ایسے سمجھ لیجئے جس طرح سے ایک تو آپ صاف ستھرا کھانا کھائیں مٹھائی ہو، حلوہ ہو، کوئی دوسری چیز جو صحیح اجزاء کے ساتھ بنی ہوئی ہے تو آپ اس کو کھاتے ہیں تو اس میں لذت بھی پاتے ہیں اور وہ آپ کے بدن میں قوت کا ذریعہ بھی بنے گا جس سے آگے آپ اپنے بدن سے کام لیں گے۔

اور ایک آدمی یہ مٹھائیاں کھاتا ہے لیکن اس کے اندر زہر ملی ہوئی ہے، کھاتے وقت تو ٹھیک ہے اس کو مزا آئے گا لیکن تھوڑی دیر کے بعد انتڑیاں کٹنی شروع ہو جائیں گی اس سے معلوم ہوگا کہ اس نے جو کھایا تھا یہ نعمت نہیں تھی یہ تو عذاب تھا تھوڑی دیر بعد معلوم ہو جائے گا کہ یہ جو مزے لے لے کر کھا رہا تھا یہ نعمت نہیں تھی یہ تو عذاب تھا، چند منٹوں کے بعد انتڑیاں کٹنی شروع ہو جائیں گی اور جان باہر آ جائے گی تو پھر معلوم ہوگا کہ یہ حلوہ، یہ مٹھائی، یہ روٹی، یہ گوشت جس میں زہر ملی ہوئی تھی یہ نعمت نہیں تھی یہ عذاب تھا تو کافروں کے لیے دنیا کی نعمتیں ایسی ہی ہیں گویا کہ وہ زہریلی ہیں آج اگر ان کو مزے کے ساتھ کھا رہے ہیں تو یہ کل کو ان کے لیے وبال بنیں گی اور آج یہ نعمتوں کو فسق و فجور کا ذریعہ بنا رہے ہیں کل ان کے لیے باعث عذاب ہوں گی اور ان دنیا کی نعمتوں کو اگر تم خالص استعمال کرنا چاہتے ہو تو خالص تو بھائی یہ مؤمنین کے لیے ہیں کہ آخرت میں بھی ان کے اوپر کوئی کسی قسم کا وبال نہیں آئے گا، اس آیت کا مطلب یہی ہے۔

آپ کہہ دیجئے کہ ساری نعمتیں چاہے لباس کی ہیں چاہے طیبات کی ہیں زینت اور طیبات یہ ایسے طور پر کہ قیامت کے دن خالص ہوں اور کسی وبال کا باعث نہ بنیں یہ صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لاتے ہیں، صرف ان لوگوں کے لیے ہیں دنیاوی زندگی میں جو کہ ایمان لاتے ہیں یعنی دنیا میں یہ نعمتیں اصل کے اعتبار سے مفید ان کے لیے ہیں جو ایمان لاتے ہیں ایسے طور پر کہ خالص ہوں گی قیامت کے دن، قیامت کے دن یہ نعمتیں کسی قسم کے وبال کا باعث نہیں بنیں گی تو اس میں تنبیہ کر دی کہ ٹھیک ہے کہ زینت سے فائدہ اٹھاؤ اور خوب اچھی طرح سے مزے کی چیزیں کھاؤ لیکن اگر یہ چاہتے ہو کہ نتیجتاً وبال نہ بنیں تو پھر ایمان لاؤ اور ایمان کے تقاضے کے مطابق ان چیزوں کو استعمال کرو اور اگر ایمان نہیں لاؤ گے اور دنیا کی ان چیزوں سے فائدہ اٹھاؤ گے تو پھر قیامت کے دن جب ان کا حساب کتاب دینا پڑے گا تو پھنس جاؤ گے تو ایسے طور پر کہ آخرت میں وبال نہ بنیں بلکہ خالص رہیں یہ

نعمتیں دنیاوی زندگی میں صرف مؤمنین کے لیے ہیں اور کافر جو فائدہ اٹھاتے ہیں تو "خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ" نہیں ہیں بلکہ آج وہ کھاتے ہیں کل کو یہی کھایا ہوا ان کے لیے وبال بن جائے گا، ایسے ہی ہم کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اپنی آیات، اپنی قدرت کی نشانیاں علم والے لوگوں کے لیے، جو جانتے بوجھتے ہیں وہ ہماری ان باتوں سے متاثر ہو کر فائدہ اٹھائیں گے۔

زمانہ الٹی چال چل گیا:

جن چیزوں کو مشرکوں نے اپنے طور پر حرام ٹھہرا رکھا تھا اس کی تو تردید ہو گئی اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو حقیقتاً حرام ہیں، جو اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی ہیں اس میں بدبختو تم سب مبتلاء ہو، کیا الٹا حساب کر رکھا ہے یعنی جو چیز حرام نہیں ان کو تم حرام کیے بیٹھے ہو ادھر سے بھی محروم ہوئے اور جو حرام ہیں ان کو حلال بنائے بیٹھے ہو اور ان پر عمل کرتے ہو تو اور وبال کا مصداق بنے، ہر برائی میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ برائی میں مبتلاء ہونے کے بعد آدمی نیکی سے بھی محروم ہوتا ہے دوہرا نقصان ہے جس طرح سے نیکی کرنے کے دو فائدے ہیں کہ ایک تو نیکی ہو گئی اور ایک برائی سے بچ گیا اور جس وقت انسان کسی برائی میں مبتلاء ہوتا ہے تو دوہرا نقصان ہوتا ہے کہ ایک تو برائی میں مبتلاء ہو گیا دوسرا نیکی سے محروم ہو گیا، یہاں بھی ایسے ہی ہے کہ جو اللہ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیزیں تھیں ان کو تو کر لیا حرام اور جو حرام کی ہوئی تھیں ان کو سمجھ لیا حلال، صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستے پر چلے تو یہ نہیں کہ اپنی منزل پر ٹھہرے ہوئے ہیں صحیح راستے پر چلتے تو اپنے اصل ٹھکانے پر پہنچتے اب غلط راستے کی طرف چلنے کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنا چلتے ہیں اتنا دور ہوتے جاتے ہیں۔

بدعت کی بھی یہی خاصیت ہے کہ جو شخص بدعت کے مطابق عمل کرے وہ سنت سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے، جانا تھا مشرق کو منہ کر لیا مغرب کی طرف تو جتنا کوشش اور ہمت کے ساتھ وہ چلے گا اپنی منزل کو طے کرنے کے لیے حقیقت کے اعتبار سے وہ اتنا ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے تو اس سے بہتر تھا کہ کچھ نہ کرتا کم از کم کھڑا رہتا تو منزل سے اتنی دوری نہ ہوتی لیکن جب وہ غلط راستے پر چل پڑا جتنا چلتا جائے گا اتنا منزل سے دور چلا جائے گا۔

اس لیے ہمارا شیخ رحمۃ اللہ علیہ کہتا ہے کہ اے بدو! مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تو کعبے نہیں پہنچ سکے گا جس راستے پر تو چل پڑا ہے تو کعبہ تک کیسے پہنچے گا اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بدعت کے اختیار کرنے کے بعد اللہ کی رضا والی منزل انسان حاصل نہیں کر سکتا جتنی محنت اور کوشش کے ساتھ وہ عمل کرے گا وہ اتنا اپنی منزل سے دور ہوتا چلا جائے

گا اب یہاں بتایا جارہا ہے کہ حلال کو حرام ٹھہرالیا اور جو حرام ٹھہرائے ہوئے تھے ان کے اندر مبتلاء ہوگئے۔

اللہ کی حرام کی ہوئی چیزیں:

آپ کہہ دیجئے کہ سوائے اس کے نہیں یعنی یہ بات پکی ہے، اس کے خلاف کوئی شبہ نہیں کہ میرے رب نے حرام ٹھہرایا ہے بے حیائی کے کاموں کو، بے حیائی کے کاموں میں وہ ننگا طواف کرنا بھی ہے چاہے وہ کھلم کھلا بے حیائی ہو چاہے چھپی ہوئی ہو، کھلم کھلا جس طرح وہ سب کے سامنے ننگے ہو کر طواف کرتے تھے یہ ایک مثال ہے ورنہ بازار میں، مجلسوں میں جتنی بھی بے حیائیاں ہوتی ہیں یہ سب "مَاظَهَرَ" کا مصداق ہیں جو میٹنگ کر کے، مجلس لگا کے، دوست یار اکٹھے ہو کر محفلیں لگا کر جس قسم کے گناہ کرتے ہیں وہ سب "مَاظَهَرَ" میں داخل ہیں اور "مَابَطَنَ" وہ ہیں جو چھپ کے کیے جاتے ہیں جیسے زنا ہو گیا یا اور کوئی بدمعاشی بدکاری ہوگئی باطن میں وہ داخل ہیں یا "مَاظَهَرَ" سے وہ گناہ مراد ہوں گے کہ جو بدن کے ظاہر سے کیے جاتے ہیں اور "مَابَطَنَ" ہو گیا دل کے جذبات، دل کے جذبات میں بے حیائی شامل ہو وہ "مَابَطَنَ" ہے اور ظاہری طور پر اس قسم کے کام کیے جائیں جو بے حیائی کے ہیں تو مَاظَهَرَ ہے، کوئی بے حیائی کا کام ہو چاہے چھپا ہوا چاہے ظاہر ہے میرے رب نے اس کو حرام ٹھہرایا ہے اور گناہ کو حرام ٹھہرایا ہے، نیکی کے مقابلے میں گناہ آیا کرتا ہے اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو بھی حرام ٹھہرایا ہے۔

اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤ ایسی چیز کو جس کے متعلق کوئی دلیل نہیں اتاری، بے دلیل اللہ کے ساتھ شریک بنالیے یہ بھی حرام ہے جو تم کر رہے ہو "سُلْطٰنًا" یہ نکرہ اور "مَالَمْ يُنَزِّلْ" یہ نفی اور آپ نحو کے اندر پڑھیں گے کہ نکرہ تحت النفی عموم کا فائدہ دیتا ہے تو جس کا مطلب یہ ہوگا اللہ تعالیٰ نے شرک کے جواز کے لیے کسی قسم کی دلیل نہیں اتاری نہ نقلی، نہ عقلی، نہ فطری کوئی کسی قسم کی دلیل نہیں ہے، آپ نہ کوئی عقلی وجہ بیان کر سکتے ہیں کہ شرک جائز ہے اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا شریک ہے، نہ کوئی نقلی بات بیان کر سکتے ہو کہ تورات میں، زبور میں، انجیل میں، قرآن میں کوئی آیت ایسی آئی ہوئی ہے کہ جو جواز پیدا کرتی ہے کہ فلاں اللہ کے ساتھ شریک ہے، اور نہ انسان کی فطرت کا یہ تقاضہ ہے تو بالکل سراسر بے دلیل اللہ کو دوسروں کے ساتھ شریک ٹھہرا رہے ہو یہ کام بھی حرام ہے اور اللہ نے اس بات کو حرام ٹھہرایا کہ تم اللہ پر ایسی باتیں بولو جن کا تمہیں علم نہیں، اس کا مطلب پہلے آپ کے سامنے آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق وہی بات کہنی چاہیئے کہ جس کی علمی دلیل موجود ہو اور جس بات کی انسان کے پاس علمی دلیل نہیں ہے تو اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنا کہ یہ اللہ کا حکم ہے یہ بھی زیادتی ہے اور اس

میں وہ سارے مشرک مبتلاء تھے۔

کوئی بھی شخص اپنے وقت سے نہ آگے بڑھے گا نہ پیچھے ہٹے گا:

"وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ" یہاں سے ترہیب کا سلسلہ شروع ہو ترہیب کے معنیٰ کہ اب جو تم دندناتے پھرتے ہو یہ نہ سمجھو کہ تمہیں پکڑنے والا کوئی نہیں ہے اور تمہیں کھلی چھٹی ہے جو چاہو کرتے پھرو، ایسی بات نہیں اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے کہ ہر جماعت کو وہ کچھ وقت کے لیے مہلت دیا کرتا ہے اور جس وقت اس کا وقت آجاتا ہے پھر نہ آگے کو چل سکے نہ پیچھے کو ہٹ سکے مطلب کیا کہ پھر موقع پر دھر لی جاتی ہے، پیچھے نہیں ہٹ سکتی کہ ہم نے مثال کے طور پر پیر کا دن متعین کیا ہے کہ ان کے اوپر عذاب آنا ہے، وہ منگل تک پہنچ جائے ایسا نہیں ہوگا، آگے نہیں بڑھ سکتی کہ دن متعین ہوا پیر کا تو اتوار کے دن وہ نہیں مرسکتی اب آپ جانتے ہیں کہ وہ جب پیر کا دن آجائے گا تو اتوار کے دن مرنے کا کیا سوال وہ تو یقینی طور پر گذر چکا یعنی کہ جب پیر کا دن آگیا تو اتوار کو نہیں مرسکتی یہ دو باتیں جو کہی جارہی ہیں وہ اس لیے کہی جارہی ہیں کہ جیسے پیر کا دن آجانے کے بعد اتوار کا دن آنا ممکن نہیں اسی طرح اگر پیر کا دن ان کی موت کا متعین کر دیا گیا تو منگل کا دن آنا بھی ممکن نہیں جس طرح استقدام ممکن نہیں اسی طرح استخار بھی ممکن نہیں، نہ آگے بڑھ سکو گے نہ پیچھے ہٹ سکو گے، یہ محاورہ ہے اصل میں ایک شق کی تعیین کرنی ہوتی ہے اور تاکید کے طور پر انسان دوسری شق کی بھی نفی کر دیتا ہے جیسے عام طور پر مثال دی جاتی ہے کہ آپ کسی دوکان پر جاتے ہیں جا کر ایک چیز اٹھاتے ہیں کہ ایک کتاب آپ نے لی کہ یہ کتاب کتنے کی ہے؟ وہ کہتا ہے دس روپے کی، آپ کہتے ہیں کہ کچھ اوپر نیچے ہے تو بتادو، اب اس نے پوچھنا تو کم کا ہے زیادہ تو نہیں پوچھنی یعنی آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ نے بتائے تو دس روپے ہیں اگر اس کی گیارہ روپے قیمت ہے تو بھی بتادو آپ نے پوچھنا ہے کہ اگر دس روپے سے کم ہے تو بتادو، یہ کم زیادہ کا لفظ جو آپ بولتے ہیں یہ بطور محاورے کے ہے اصل میں پوچھنا مقصود ہے کہ اس کی قیمت میں کچھ کمی ہے تو بتادو، اب دوکان دار آگے سے کہتا ہے کہ نہ کم نہ زیادہ اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی اب نفی تو کمی کی کرنی ہے کہ دس روپے سے کم کی نہیں دوں گا، بیشی کی نفی بطور تاکید کے کر دی جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے میں نے اس کی قیمت دس روپے بتادی تو گیارہ نہیں مانگوں گا اسی طرح جب اس کی قیمت دس روپے بتادی تو نو نہیں لوں گا، گیارہ نہ مانگوں گا تو آپ کے علم میں ہے کہ جب اس نے اپنی زبان سے دس روپے قیمت بتائی ہے تو گیارہ کیا مانگے گا، اب اگر لینے کا امکان ہے تو نو ہی لینے کا امکان ہے وہ کہتا ہے نہ کم نہ زیادہ کیا مطلب کہ جس طرح اس کے گیارہ نہیں لوں گا اسی طرح دس کے نو بھی نہیں لوں گا تو اصل میں نفی

کرنا مقصود ہے نو کی اور گیارہ کی نفی بطور تاکید کے ہے اسی طرح بتانا تو یہ ہے کہ اپنے وقت سے پیچھے نہیں ہٹ سکیں گے کیا مطلب کہ سوموار سے منگل تک پہنچ جائے ایسا نہیں ہوگا وقت پیچھے نہیں ہٹے گا اور یہ ہے کہ اس اجل سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ اجل سے پہلے مرجائیں ایسا بھی نہیں ہوسکتا تو جب اجل آجائے گی تو جیسے اس سے پہلے نہیں مرسکتے اسی طرح اس اجل کے آنے کے بعد پیچھے نہیں ہٹ سکتے یعنی اس میں دیر نہیں ہوسکتی تو نفی اصل میں "لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ" کی کرنی ہے اور "لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ" کی نفی بطور تاکید کے ہے ورنہ جس وقت معین وقت آگیا تو اس سے آگے بڑھنے کا کیا سوال ہے پیچھے ہٹنے کا تو ہے اس کی نفی کرنی مقصود ہے، تو ان کو یہ تنبیہ کردی کہ تم یہ نہ سمجھو کہ تم دندناتے پھر رہے ہو اور تمہیں کھلی چھٹی مل گئی، تمہیں پکڑنے والا کوئی نہیں، ایسی بات نہیں اللہ کی یہ عادت ہے کہ ہر جماعت کے لیے ایک وقت متعین کیا کرتا ہے جب وہ وقت آجائے گا تو دھر لیے جاؤ گے پھر نہیں ہل سکو گے، ذرا بھی اپنی جگہ سے نہ آگے بڑھ سکو گے نہ پیچھے ہٹ سکو گے۔

مؤمنین کا انجام:

"یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ" یہ وہ ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کو نکالنے کے بعد دنیا پر بھیجتے ہوئے حضرت آدم علیہ السلام کی وساطت سے شیاطین کے چکر سے بچنے کے لیے آدم کی اولاد کو دی کہ آدم کے بچو! تمہارے پاس رسول آئیں گے تمہیں میں سے جو بیان کریں گے تم پر میری آیات پھر جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا، تقویٰ کے اختیار کرنے کا مطلب یہی ہے کہ مجھ سے ڈرے گا، میری نافرمانی نہیں کرے گا "وَاَصْلَحَ" کا معنی اپنے حالات کو ٹھیک کرے گا "فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ" وہ حقیقی کامیابی حاصل کرے گا دوبارہ جنت میں آجائے گا کیونکہ جنت کی شان یہی ہے "فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ" اور دنیا میں رہتے ہوئے خوف اور حزن انسان کے آگے پیچھے لگا ہوا ہے، کبھی آپ مستقبل کے متعلق سوچیں گے تو دل دھڑکے گا کہ کہیں ایسا نہ ہوجائے، کبھی ماضی کے اندر خلاف مرضی واقعہ پیش آگیا تو یاد آجائے تو دل دکھتا ہے دنیا کی زندگی جو ہے یہ تو خوف اور حزن میں گھری ہوئی ہے البتہ جنت کی زندگی ایک ایسی ہوگی کہ جس میں خوف اور حزن نہیں ہے تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس جنت سے تمہارا ابا نکلا ہے اگر تم ہماری ہدایات پر عمل کروگے تو دوبارہ وہ تمہیں تمہاری میراث مل جائے گی اور تم جنت میں چلے جاؤ گے وہاں پر کوئی خوف اور کوئی حزن نہیں ہوگا تو اب اس چھوٹی ہوئی میراث کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ ہم جو رسول بھیجیں گے ان کی ہدایات پر عمل کرنا، تقویٰ اختیار کرلینا اور اپنے حالات کو صحیح کرلینا۔

کافروں کا انجام:

اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان سے تکبر کریں گے تکبر کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ حق بات کو قبول نہ کرنا، اعراض کرنا یہی لوگ جہنم والے ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، وہ ہمیشہ کے لیے جنت سے محروم ہوں گے، وہ جہنم میں جائیں گے، پھر کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ پر جھوٹ گڑھے جس طرح مشرکین گھڑتے تھے، باتیں کرتے تھے اور نسبت اللہ کی طرف کر دیتے تھے کہ یہ اللہ کا حکم ہے یا اللہ کی آیات کو جھٹلاتے کہ اللہ کا رسول اللہ کی باتیں لے کر آتا ہے ان کو مانتے نہیں ان کو جھٹلاتے ہیں، وہی دونوں باتیں کہ غلط باتیں منسوب کرتے ہیں اور صحیح باتوں کی تردید کرتے ہیں یہ بہت بڑے ظالم ہیں ان کو ان کا حصہ پہنچے گا کتاب سے، کتاب کا کیا معنیٰ کہ تقدیر میں ان کے لیے عمر، راحت، رزق جو کچھ لکھ دیا گیا ہے وہ انہیں پہنچے گا وہ یہ کھائیں گے، پئیں گے جو ان کا مقدر ہے وہ ان کو پہنچ کر رہے گا، دنیا کے اندر جو کچھ ان کے لیے لکھ دیا گیا وہ انہیں ملے گا۔

حتیٰ کہ جب ان کے پاس بھیجے ہوئے ہمارے رسول آجائیں گے اس سے مراد ملک الموت اور ان کے ساتھی جب وہ آجائیں گے وفات دیتے ہوں گے انہیں پھر وہ تنبیہ کرتے ہوئے ان سے پوچھیں گے، ڈانٹ ڈپٹ شروع ہو جائے گی جیسے ایک استاذ طالب علم کو سزا دیتا ہے تو ساتھ ساتھ وہ بات بھی کیا کرتا ہے ذہنی طور پر تنبیہ کرنے کے لیے اسی طرح وہ ماریں گے بھی "یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ" جیسے دوسری جگہ آئے گا منہ پر بھی ماریں گے اور چوتڑوں پر بھی ماریں گے، ادبار دبر کی جمع ہے اور دبر پشت کو کہتے ہیں چوتڑ بھی کوٹیں گے اور منہ پر بھی ماریں گے اور پھر ساتھ ساتھ زبان سے کہیں گے کہ "اَیْنَ مَا کُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پکار رہے تھے کہاں چلے گئے؟ ان کو بلا لو آج تمہیں چھڑا لیں اب تم عذاب میں گرفتار ہو رہے ہو انہیں کہو کہ تمہیں چھڑا لیں کہاں چلے گئے وہ جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارا کرتے تھے وہ کہیں گے "ضَلُّوْا عَنَّا" وہ تو کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں وہ تو سارے گم ہو گئے، کوئی اس موقع پر موجود نہیں جن کے سہارے تلاش کر رکھے تھے اور وہ لوگ اقرار کریں گے اپنے نفسوں پر کہ وہ کافر تھے اس وقت ان کو پتہ چلے گا کہ واقعی ہم نے کفر اختیار کیا، ہم ایمان نہیں لائے اور اس کفر کے وبال میں آج ہم گرفتار ہو رہے ہیں۔

یہ تو مر گئے یہ تو برزخ کا عذاب ہوا کہ جان کنی کے وقت فرشتے مارتے بھی ہیں اور زبان سے تنبیہ بھی

کرتے ہیں اور پھر قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائیں گے تو کافروں کی ساری جماعتوں کو اکٹھا کر کے جہنم میں بھیج دیں گے۔

جہنم میں جانے کے بعد کافروں کی ایک دوسرے پر لعنت:

جہنم میں جانے کے بعد پھر یہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، پھٹکار کریں گے یہ جو اللہ تعالیٰ بات بتا رہے ہیں یہ اس لیے بتا رہے ہیں کہ آج ان باتوں کو سوچو تمہاری دوستیاں، تمہاری ملاقاتیں، تمہاری محبتیں جن لوگوں کے ساتھ ہیں اگر ان تعلقات کی بناء پر، محبتوں کی بناء پر تم معصیت کی طرف جا رہے ہو تو یہ محبت دائمی نہیں ایک وقت آئے گا جب تم ایک دوسرے پر لعنت کرو گے پھٹکار کرو گے وہ کہے گا یا اللہ! مجھے اس نے گمراہ کیا، وہ کہے گا اس نے گمراہ کیا، وہ کہے گا کہ اس کی پٹائی زیادہ کر اس نے مجھے بری عادت سکھائی تھی، وہ کہے گا اس کی پٹائی زیادہ کر، اس طرح ایک دوسرے کے اوپر لعنت کرو گے اور ایک دوسرے سے بیزار ہو جاؤ گے۔

البتہ اگر دوستی اور محبت ان لوگوں سے ہے جو اللہ کے فرمانبردار ہیں اور فرمانبرداری کے راستے پر چلاتے ہیں وہ جنت میں جائیں گے، ان کی دوستیاں اسی طرح سے بحال ہوں گی، ان کی اسی طرح سے محبتیں قائم رہیں گی "عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ" سب جنت کے اندر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھیں گے، بھائیوں کی طرح ہوں گے تو جنت کا ماحول ایسا خوشی کا ماحول ہے، جہنم کا ماحول ایک دوسرے پر لعنت کرنے کا ماحول ہے تو ان دوستیوں کا انجام جو ہے وہ آج دکھایا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ داخل ہو جاؤ ان جماعتوں میں "فِیْٓ اُمَمٍ" داخل ہو جاؤ ان جماعتوں میں وہ جماعتیں جو تم سے پہلے گزر گئیں جنوں اور انسانوں کی داخل ہو جاؤ جہنم میں، جاؤ جہنم میں ان جماعتوں میں شامل ہو کر جب کبھی کوئی جماعت داخل ہو گی اپنی جیسی جماعت تو پر لعنت کرے گی حتیٰ کہ جب سارے اکٹھے ہو جائیں گے "حَتّٰیٓ اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا" حتیٰ کہ سارے کے سارے اس جہنم میں اکٹھے ہو جائیں گے "قالت اخراھم" تو پچھلی جماعت کہے گی جو بعد میں داخل ہوئی کیونکہ بعد میں داخل ہونے والی جماعت جو ہے یہ تابعین کی جماعت ہے اور پیچھے لگنے والوں کی ہے یہ اس جماعت کے متعلق کہیں گے جو پہلی ہے وہ جو مبتلاء ہونے کے اعتبار سے پہلے چلے گئے ان کے متعلق کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں نے ہمیں بھٹکایا تھا ان کو دگنا عذاب دے یعنی ہمارے مقابلے میں ان کو سزا زیادہ ہونی چاہیے کیونکہ انہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا

انہوں نے ایک دوسرے کی سفارش تو کیا کرنی ہے ایک دوسرے کو پھنسائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کہے گا ہر کسی کے لیے دگنا ہے، کیا مطلب کہ ہر کسی کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا ابھی تو تمہیں علم نہیں جس کی بناء پر ایسی باتیں کرتے ہو کمی تم نے بھی نہیں کی اگر تمہارے بڑوں نے کوئی رسم بد جاری کی تھی اور وہ تمہارے لیڈر تھے تو تم نے کونسی کمی کی ہے تم بھی تو اپنے پچھلے آنے والوں کے لیے یہی راستہ چھوڑ کر آئے ہو تو جیسے ان کی وجہ سے دوسرے لوگ گمراہ ہوئے تمہاری وجہ سے تمہارے پچھلے گمراہ ہوئے اس طرح سب کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا، ہر کسی کے لیے دگنا عذاب ہے دگنے سے یہاں زیادہ عذاب مراد ہے کہ ایک وبال کا عمل ہوتا ہے اور ایک سبب بننے کا ہوتا ہے، میں ایک نیکی کا کام کر رہا ہوں ایک تو مجھے اس نیکی کا ثواب ملے گا ور ایک میری طرف دیکھ کر جو دوسرے لوگ نیکی کریں گے تو یہ سبب بنے گا اس پر بھی ثواب ملے گا یہ اضافہ ہے اور اگر میں کوئی برا کام کر رہا ہوں تو ایک تو مجھے اس برائی کا عذاب ہوگا اور ایک میری اس برائی کی وجہ سے دوسرے دیکھا دیکھی جو اس برائی میں مبتلاء ہو جائیں گے تو سبب کا عذاب ہوگا یہ اضافہ ہے تو بد عملی کی وجہ سے انسان پر دو طرح سے عذاب آتا ہے، بد عملی کا بھی آئے گا اور اس بد عملی کا سبب بننے کی وجہ سے جو دوسری مخلوق اس کی طرف دیکھ کر اس برے کام کو کرے گی اس کا وبال بھی اس کے اوپر آئے گا۔

جیسے حدیث شریف میں آتا ہے سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کے اندر جب بھی کوئی قتل ناحق ہوتا ہے تو آدم کا وہ بچہ جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا قابیل جس نے ہابیل کو قتل کیا تھا فرمایا کہ قتل ناحق کے وبال کا ایک حصہ قابیل کی طرف بھی جاتا ہے، قیامت تک جتنے ناحق قتل ہوں گے ان کے عذاب کے اندر قابیل برابر کا شریک ہے جس نے یہ قتل ناحق کی رسم ڈالی، جس نے یہ طریقہ جاری کیا اسی طرح نیکوں کی نیکی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا دیکھو! ہمارے بڑوں نے جو نیکی کے طریقے بتائے، اچھے اچھے کام کر کے دکھائے ہم جتنے ان کے پیچھے لگیں گے، نقل اتارتے چلے جائیں گے ان کو ان کے کاموں کا ثواب بھی ملے گا اور ہم جو ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں تو ہمارے عمل کا وہ جو سبب بنے تو سبب کی وجہ سے ان کے درجات بلند ہوں گے ہر کسی کے لیے دگنا ہے "وَلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ" لیکن تم جانتے نہیں۔

" وَقَالَتْ اُوْلٰهُمْ لِاُخْرٰهُمْ " جب یہ جواب ملے گا کہ تم سارے ہی ایسے ہو اور سب کے لیے دگنا عذاب ہے تو پھر وہ جو پہلے ہیں پچھلوں کو کہیں گے کہ بتاؤ ہماری شکایت کر کے تم نے کیا لے لیا جیسے تم ویسے ہی ہم، تم بھی

اپنے کردار کا مزہ چکھو ہم بھی مزا چکھتے ہیں، کہے گی پہلی جماعت پچھلوں کو نہیں ہے تمہارے لیے ہم پر کسی قسم کی کوئی فضیلت جیسے ہم عذاب میں ویسے تم عذاب میں جیسے ہمارا عذاب دن بدن بڑھے گا تمہارا بھی بڑھے گا بس اب تم چکھو عذاب ان کاموں کی وجہ سے جو تم کرتے تھے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ

بے شک وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں اور ان آیات سے تکبر کرتے ہیں نہیں کھولے جائیں گے ان کے لیے دروازے

السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ

آسمان کے اور نہیں داخل ہوں گے یہ لوگ جنت میں جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے (سوراخ) میں داخل نہ ہو جائے

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٠﴾ لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ

اور ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں ہم جرم کرنے والوں کو ﴿۴۰﴾ ان کے لیے جہنم سے بچھونا ہوگا اور

فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا

ان کے اوپر سے اوڑھنے کا سامان ہوگا ہم ظلم کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ﴿۴۱﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ

اور نیک عمل کرتے ہیں ہم نہیں تکلیف دیتے کسی نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق یہی لوگ

الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٤٢﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ

جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۴۲﴾ ہم نکال لیں گے جو کچھ ان کے دلوں میں ہوگی

غِلٍّ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ۖ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي

خفگی جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں اور یہ لوگ کہیں گے اللہ کا شکر ہے جس نے

هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ

ہمیں یہاں تک پہنچا دیا اور ہم تو پہنچنے والے نہیں تھے اگر اللہ ہمیں نہ پہنچاتا البتہ تحقیق آگئے

رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ وَنُودُوا أَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا

ہمارے رب کے رسول ہمارے پاس حق بات لے کر اور وہ جنتی آواز دیے جائیں گے کہ یہی جنت ہے تم اس کے وارث بنا دیے گئے بسبب ان کاموں کے

كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَنْ قَدْ

جو تم کیا کرتے تھے ﴿۴۳﴾ آواز دیں گے جنت والے جہنم والوں کو کہ تحقیق

وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ

پالیا ہم نے اس چیز کو جس کا وعدہ کیا تھا ہم سے ہمارے رب نے سچا، کیا تم نے بھی پایا اس وعدے کو جو تم سے تمہارے رب نے کیا تھا

حَقًّا ۭ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي

حق تو وہ جہنم والے کہیں گے ہاں جی بالکل سچا ہے پھر اعلان کرے گا ایک اعلان کرنے والا ان لوگوں کے درمیان کہ اللہ کی لعنت ہے

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ

ظالموں پر ﴿۴۴﴾ ایسے لوگ جو روکا کرتے تھے اللہ کے راستے سے اور طلب کرتے ہیں اس راستے میں کجی

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَي الْاَعْرَافِ

اور وہ لوگ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں ﴿۴۵﴾ ان جنت والوں اور دوزخ والوں کے درمیان ایک پردہ ہوگا اور اعراف پر

رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ

کچھ آدمی ہوں گے پہچانیں گے ہر کسی کو چہرے کی علامت کے ساتھ اور اعراف والے آواز دیں گے جنت والوں کو

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتْ

سلام علیکم، وہ اعراف والے جنت میں داخل نہیں ہوئے اور وہ امید رکھتے ہیں جنت میں جانے کی ﴿۴۶﴾ جب پھیر دی جائیں گی

اَبْصَارُهُمْ تِلْقَاۗءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ

ان کی آنکھیں جہنم والوں کی طرف تو یہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں ساتھ نہ کرنا

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَنَادٰٓي اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا

ظالم لوگوں کے ﴿۴۷﴾ اور آواز دیں گے اعراف والے کچھ لوگوں کو جن کو وہ پہچانتے ہیں ان کی نشانی کے ساتھ، اور یہ اصحاب اعراف کہیں گے

مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ

کیا کام آئی تمہارے تمہاری پارٹی اور تمہارا تکبر کرنا تمہارے کیا کام آیا ﴿۴۸﴾ کیا یہی لوگ ہیں جن کے متعلق

اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾

تم قسمیں کھایا کرتے تھے کہ اللہ ان کو اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا انہیں کہہ دیا گیا کہ داخل ہو جاؤ جنت میں کہ نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تم غمزدہ ہوگے ﴿۴۹﴾

تفسیر:

کافروں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے:

آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا اور ہماری ہدایات اور آیات کے مقابلہ میں تکبر کے ساتھ پیش آئے ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی انصاری صحابی کے جنازہ میں تشریف لے گئے ابھی قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی تو ایک جگہ بیٹھ گئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد خاموش بیٹھ گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر مبارک اٹھا کر فرمایا کہ مؤمن بندہ کے لیے جب موت کا وقت آتا ہے تو آسمان سے سفید چمکتے ہوئے چہروں والے فرشتے آتے ہیں، جن کے ساتھ جنت کا کفن اور خوشبو ہوتی ہے اور وہ مرنے والے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں، پھر فرشتۂ موت عزرائیل علیہ السلام آتے ہیں، اور اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں کہ اے نفس مطمئنہ! رب کی مغفرت اور خوشنودی کے لیے نکلو، اس وقت اس کی روح اس طرح بدن سے باآسانی نکل جاتی ہے جیسے کسی مشکیزہ کا دہانہ کھول دیا جائے تو اس کا پانی نکل جاتا ہے، اس کی روح کو فرشتۂ موت اپنے ہاتھ میں لے کر ان فرشتوں کے حوالہ کر دیتا ہے، یہ فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں جہاں ان کو کوئی فرشتوں کا گروہ ملتا ہے وہ پوچھتے ہیں یہ پاک روح کس کی ہے؟ یہ حضرات اس کا وہ نام ولقب لیتے ہیں جو عزت واحترام کے لیے اس کے واسطے دنیا میں استعمال کیا جاتا تھا، اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے، یہاں تک کہ یہ فرشتے روح کو لے کر پہلے آسمان پر پہنچتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں، دروازہ کھولا جاتا ہے یہاں سے اور فرشتے بھی ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں، اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کا اعمال نامہ علیین میں لکھو، اور اس کو واپس کر دو، یہ روح پھر لوٹ کو قبر میں آتی ہے اور قبر میں حساب لینے والے فرشتے آکر اس کو بٹھاتے اور سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے اور دین اسلام ہے، پھر سوال ہوتا ہے کہ یہ بزرگ جو تمہارے لیے بھیجے گئے ہیں کون ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس وقت ایک آسمانی ندا آتی ہے کہ میرا بندہ سچا ہے اس کے لیے جنت کا فرش بچھا دو اور جنت کا لباس پہنا دو اور جنت کی طرف اس کا دروازہ کھول دو، اس دروازہ سے اس کو جنت کی خوشبوئیں اور ہوائیں آنے لگتی ہیں اور اس کا نیک عمل ایک حسین صورت میں اس کے پاس اس کو مانوس کرنے کے لیے آجاتا ہے۔

اس کے بالمقابل کافر و منکر کا جب وقتِ موت آتا ہے تو آسمان سے سیاہ رنگ مہیب صورت فرشتے خراب قسم کا ٹاٹ لے کر آتے ہیں اور بالمقابل بیٹھ جاتے ہیں، پھر فرشتۂ موت اس کی روح اس طرح نکالتا ہے جیسے کوئی خاردار شاخ گیلی اون میں لپٹی ہوئی ہو اس میں سے کھینچی جائے یہ روح نکلتی ہے تو اس کی بدبو مردار جانور کی بدبو سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے، فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں، راہ میں جو دوسرے فرشتے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ کس کی خبیث روح ہے؟ یہ حضرات اس وقت اس کا وہ بُرے سے بُرا نام ولقب ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا کہ یہ فلاں بن فلاں ہے، یہاں تک کہ سب سے پہلے آسمان پر پہنچ کر دروازہ کھولنے کے لیے کہتے ہیں تو اس کے لیے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا، بلکہ حکم یہ ہوتا ہے کہ اس بندہ کا اعمال نامہ سجین میں رکھو، جہاں نافرمان بندوں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں اور اس روح کو پھینک دیا جاتا ہے وہ بدن میں دوبارہ آتی ہے فرشتے اس کو بٹھا کر اسے بھی وہی سوال کرتے ہیں جو مؤمن بندہ سے کیے تھے، یہ سب کا جواب یہ دیتا ہے "هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِیْ" یعنی میں کچھ نہیں جانتا، اس کے لیے جہنم کا فرش بچھا دیا جاتا ہے اور اس کو جہنم کا لباس دے دیا جاتا ہے، اور جہنم کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کو جہنم کی آنچ اور گرمی پہنچتی رہتی ہے اور اس کی قبر اس پر تنگ کر دی جاتی ہے "نعوذ باللہ منہ"۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ منکرین وکفار کی ارواح آسمان تک لے جائی جاتی ہیں تو آسمان کا دروازہ ان کے لیے نہیں کھلتا تو وہیں سے پھینک دی جاتی ہیں، آیت مذکورہ "لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ" کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ بوقت موت ان کی ارواح کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔

آخر آیت میں ان لوگوں کے متعلق فرمایا "وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ" اس میں لفظ "یلج" ولوج سے بنا ہے جس کے معنی ہیں تنگ جگہ میں گھسنا اور "جمل" اونٹ کو کہا جاتا ہے اور "سم" سوئی کے ناکے (سوراخ) کو کہتے ہیں، معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک اونٹ جیسا عظیم الجثہ جانور سوئی کے ناکے (سوراخ) میں داخل نہ ہو جائے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح سوئی کے ناکے (سوراخ) میں اونٹ کا داخل ہونا عادۃً محال ہے اسی طرح ان کا جنت میں جانا محال ہے، اس سے ان لوگوں کا دائمی عذاب جہنم بیان کرنا مقصود ہے، اس کے بعد ان لوگوں کے عذاب جہنم کی مزید شدت کا بیان ان الفاظ سے کیا گیا ہے "لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ" "مهاد" کے معنی فرش اور "غواش" غاشیہ کی جمع ہے، جس

کے معنی ہیں ڈھانپ لینے والی چیز، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اوڑھنا بچھونا سب جہنم کا ہوگا اور پہلی آیت جس میں جنت سے محرومی کا ذکر تھا اس کے ختم پر "کَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ" ارشاد فرمایا کیونکہ یہ اس سے زیادہ اشد ہے۔

تیسری آیت میں احکام خداوندی کی پیروی اور پابندی کرنے والوں کا ذکر ہے کہ یہ لوگ جنت والے ہیں اور جنت ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔

اہل جنت کے دلوں سے رنجشیں نکال دی جائیں گی:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں یہ لوگ جنت میں جائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے، آگے اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کے دو خاص حال بیان کیے۔

ایک یہ ہے کہ "وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ" یعنی جنتی لوگوں کے دلوں میں اگر ایک دوسرے کی طرف سے کوئی رنجش یا کدورت ہوگی تو ہم اس کو ان کے دلوں سے نکال دیں گے، یہ لوگ ایک دوسرے سے بالکل خوش بھائی بھائی ہو کر جنت میں جائیں گے اور بسیں گے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ مؤمنین جب پل صراط سے گزر کر جہنم سے نجات حاصل کر لیں گے تو ان کو جنت دوزخ کے درمیان ایک پل کے اوپر روک لیا جائے گا اور ان کی آپس میں اگر کسی سے کسی کو رنجش تھی یا کسی پر کسی کا حق تھا تو یہاں پہنچ کر ایک دوسرے سے انتقام لے کر معاملات صاف کر لیں گے، اور اس طرح حسد، بغض، کینہ وغیرہ سے پاک صاف ہو کر جنت میں داخل ہوں گے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ پل بظاہر پل صراط کا آخری حصہ ہوگا، جنت سے متصل ہے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔

اور اس مقام پر جو حقوق کے مطالبات ہوں گے ان کی ادائیگی ظاہر ہے کہ روپیہ پیسہ سے نہ ہو سکے گی کیونکہ وہاں کسی کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہوگا، بلکہ بخاری و مسلم کی ایک حدیث کے مطابق یہ ادائیگی اعمال سے ہوگی، حقوق کے بدلہ میں اس کے عمل صاحب حق کو دے دیے جائیں گے، اور اگر اس کے اعمال اس طرح سب ختم ہو گئے اور لوگوں کے حقوق ابھی باقی رہے تو پھر صاحب حق کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو سب سے بڑا مفلس قرار دیا ہے جس نے دنیا میں اعمال صالحہ کیے لیکن لوگوں کے حقوق کی پرواہ نہیں کی، اس کے نتیجہ میں تمام اعمال سے خالی مفلس ہو کر رہ گیا۔

اس روایت حدیث میں ادائے حقوق اور انتقام کا عام ضابطہ بیان کیا گیا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ سب کو یہی صورت پیش آئے، بلکہ ابن کثیر اور تفسیر مظہری کی روایت کے مطابق وہاں یہ صورت بھی ممکن ہوگی کہ بدون انتقام لیے آپس کے کینے کدورتیں دور ہو جائیں۔

جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ یہ لوگ جب پل صراط سے گزر لیں گے تو پانی کے ایک چشمہ پر پہنچیں گے اور اس کا پانی پئیں گے، اس پانی کا خاصہ یہ ہوگا کہ سب کے دلوں سے باہمی کینہ وکدورت دھل جائے گی، امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کریمہ "وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا" کی تفسیر بھی یہی نقل کی ہے کہ جنت کے اس پانی سے سب کے دلوں کی رنجشیں اور کدورتیں دھل جائیں گی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ ہم اور عثمان اور طلحہ اور زبیر انہی لوگوں میں سے ہوں گے جن کے سینے دخول جنت سے پہلے کدورتوں سے صاف کر دیئے جائیں گے (ابن کثیر) یہ وہ حضرات ہیں جن کے آپس میں دنیا میں اختلاف پیش آئے اور نوبت جنت تک پہنچ گئی تھی۔

دوسرا حال اہل جنت کا اس آیت میں یہ بیان کیا گیا کہ جنت میں پہنچ کر یہ لوگ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے کہ اس نے ان کے لیے جنت کی طرف ہدایت کی اور اس کا راستہ آسان کر دیا، اور کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو ہماری مجال نہ تھی کہ ہم یہاں پہنچ سکتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی انسان محض اپنی کوشش سے جنت میں نہیں جا سکتا، جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل اس پر نہ ہو کیونکہ کوشش خود اس کے قبضہ میں نہیں وہ بھی محض اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

اہل جنت کا اہل دوزخ کو پکارنا اور دوزخیوں پر لعنت ہونے کا اعلان ہونا:

اہل جنت دوزخیوں کو آوازیں دیں گے اور ان کو خطاب کرتے ہوئے یوں پکاریں گے کہ ہمارے رب نے ہم سے ایمان اور اعمال صالحہ پر جو عنایت اور مہربانی اور بخششوں کا وعدہ فرمایا تھا دنیا میں ہم نے بغیر دیکھے اس سب کی تصدیق کر دی تھی، آج ہم نے یہاں ان سب وعدوں کے مطابق انعامات پا لیے جو وعدے ہم سے فرمائے گئے تھے ان سب کو آنکھوں سے دیکھ لیا، اب تم بتاؤ کہ کفر پر جو تمہارے رب نے تم کو اپنی کتابوں اور رسولوں کے ذریعے وعیدوں سے آگاہ فرمایا تھا کیا وہ وعیدیں سچی نکلیں اور اللہ تعالیٰ نے جو کفر کی سزا سے دنیا ہی میں باخبر فرما دیا تھا ان خبروں کو تم نے صحیح پایا؟

اس پر وہ لوگ جواب دیں گے "نَعَمْ" کہ ہاں! ہم نے ان سب باتوں کو صحیح پایا، واقعی کتابوں اور رسولوں کے واسطہ سے جو اللہ تعالیٰ نے عذاب کی خبریں دی تھیں وہ سب ٹھیک نکلیں، جب وہ لوگ اس کا اقرار کرلیں گے کہ ہمیں جو کچھ بتایا گیا تھا وہ سب سچ تھا ہم نے نہ مانا اور اپنی جانوں پر ظلم کیا، اس پر ایک پکارنے والا دونوں فریق کے درمیان کھڑے ہوکر یوں پکارے گا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے یعنی دین حق سے روکتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بھیجا تھا نہ خود قبول کرتے تھے نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے تھے اور اسی پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ بزعم خود اس میں کجی تلاش کرتے تھے یعنی ایسی باتیں ڈھونڈتے تھے جن کے ذریعہ دین حق میں عیب نکالیں اور اعتراض کریں۔

یہ لوگ نہ دین حق کو مانتے تھے نہ یوم آخرت پر ایمان رکھتے تھے ان کی ان حرکتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے ملعون ہو گئے ان پر اللہ کی لعنت اور پھٹکار پڑ گئی اور دوزخ کے دائمی عذاب میں گرفتار ہو گئے۔

یہ جو فرمایا "وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجاً" کہ اللہ کے دین میں کجی تلاش کرتے ہیں یہ ان کی انتہائی ضد اور عناد کی ایک صورت بیان فرمائی، مشرکین مکہ ایسا ہی کرتے تھے دین اسلام پر طرح طرح کے اعتراض اٹھاتے تھے، مدینہ منورہ میں یہودیوں سے واسطہ پڑا وہ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں آپ کی نبوت و رسالت کا اقرار نہیں کرتے تھے اور ایسی ایسی باتیں نکالتے تھے جو حقیقت میں قابل اعتراض نہ تھیں لیکن انہیں بطور اعتراض عوام کے سامنے لاتے تھے تاکہ وہ اسلام قبول نہ کریں۔

آج تک یہود و نصاریٰ اور دیگر کفار اس کام میں لگے ہوئے ہیں کہ اسلام میں عیب نکالیں حتیٰ کہ وہ مشرک جو گائے کا پیشاب پیتے ہیں وہ بھی اپنے آپ کو پاک صاف اور مسلمانوں کو ناپاک سمجھتے ہیں، انہیں مسلمانوں کی پاکیزہ شریعت اور پاکیزہ زندگی پر اعتراض ہے اور اپنے پیشاب پینے سے ذرا بھی نفرت نہیں، جن قوموں میں غسل جنابت نہیں وہ بھی اپنے آپ کو مسلمان سے اچھا سمجھتی ہیں اور جن قوموں میں زنا کاری عام ہے اور نکاح کرنا عیب ہے انہیں اسلام پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں تعدد ازدواج کی اجازت ہے یہ کیسی الٹی سمجھ ہے کہ دوستیاں تو جتنی چاہے رکھ لے لیکن ایک سے زیادہ بیویاں جو اللہ کی شریعت میں حلال ہے اس پر اعتراض ہے۔

یہود و نصاریٰ نے آج کل مستشرقین تیار کر رکھے ہیں یہ لوگ بظاہر اسلامی علوم میں اپنا اشتغال رکھتے ہیں اور نادان مسلمان خوش ہیں کہ کافر ہمارا دین پڑھ رہے ہیں وہ لوگ قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہ صرف یہ

کہ خود کافر ہیں بلکہ اہل اسلام جوان کے یہاں اسلامیات کی ڈگری لینے جاتے ہیں ان کو اسلامی عقائد میں مذبذب کر کے مرتد بنا دیتے ہیں ان سادہ لوح طلباء کو یہ پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ہم دین اسلام سے خارج ہو گئے، مستشرقین ان کو اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم پر اعتراضات سمجھاتے ہیں، ان لوگوں کے پاس چونکہ علم نہیں ہوتا، علماء اسلام کی کتابوں اور صحبتوں سے محروم ہوتے ہیں اس لیے جواب دینے سے قاصر ہوتے ہیں اور خود بھی اسلام کے بارے میں بدعقیدہ ہو جاتے ہیں، مستشرقین ایسے ایسے اعتراضات سمجھاتے ہیں جن کے منہ توڑ جوابات دیئے جا چکے ہیں اور علماء اسلام ان کو مناظروں میں شکست دے کر بارہا ذلیل کر چکے ہیں یہ لوگ اپنے دین کو باطل جانتے ہوئے اسی پر جمع ہوتے ہیں۔

اصحاب اعراف کا اہل جنت کو سلام پیش کرنا اور اہل دوزخ کی سرزنش کرنا:

اہل جنت اور اہل دوزخ دو جماعتیں ہوں گی اور ہر جماعت اپنے اپنے مقام اور مستقر پر ہوگی، ان دونوں کے درمیان پردہ حائل ہوگا، یہ پردہ ایک دیوار کی صورت میں ہوگا جس کو "وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ" سے تعبیر فرمایا، اس پردہ کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کو خطاب کرنے کا موقع دیا جائے گا جس کا ذکر اوپر "وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ" میں ہوا، اور عنقریب ہی دوسری آیت میں دوزخیوں کا جنتیوں سے خطاب کرنے کا اور ان سے پانی طلب کرنے کا ذکر آ رہا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان کچھ جھروکے ہوں گے جن سے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے اور بات کر سکیں گے، صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہ پردہ ایسا ہوگا جو جنت کا اثر اہل دوزخ کی طرف اور دوزخ کا اثر اہل جنت کی طرف نہیں پہنچنے دے گا، البتہ آپس میں ایک دوسرے کی آواز پہنچے گی۔

پھر اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہ دیوار درمیان میں حائل ہوتے ہوئے آواز کیسے پہنچے گی تحریر فرماتے ہیں کہ "اُمُوْرُ الْاٰخِرَةِ لَا تُقَاسُ بِاُمُوْرِ الدُّنْيَا" (یعنی آخرت کی چیزیں دنیاوی چیزوں پر قیاس نہیں کی جاتیں) یہ تو صاحب روح المعانی نے درست فرمایا لیکن اب تو دنیا میں بھی سائنسی نظام نے یہ ثابت کر دیا کہ آواز پہنچانے اور باتیں کرنے کے لیے درمیان میں کسی چیز کا حائل ہونا اور ایک دوسرے سے بعید ہونا مانع نہیں۔

ایک شخص ایشیا میں بیٹھے ہوئے بے تکلف امریکہ کے کسی بھی فرد سے بات کر سکتا ہے، پھر فرمایا کہ اعراف پر بہت سے لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو یعنی اہل جنت واہل نار کو ان کی نشانیوں سے پہچانتے ہوں گے، لفظ "اعراف"

عرف کی جمع ہے ہر چیز کے بلند حصے کو عرف کہا جاتا ہے۔

آیت بالا میں جس اعراف کا ذکر ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اس کے بار میں مفسرین نے لکھا ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان جو دیوار ہوگی جسے حجاب سے تعبیر فرمایا ہے وہ اعراف ہلوگی، آیت بالا میں اس کی تصریح ہے کہ اعراف میں بہت سے لوگ ہوں گے جو اہل جنت کو پہچانتے ہوں گے اور اہل دوزخ کو بھی پہچانتے ہوں گے، اور یہ پہچاننا ہر ایک کی علامتوں سے ہوگا، میدان حشر میں بھی اہل جنت، اہل دوزخ سے ممتاز ہوں گے۔

اہل جنت کے چہرے سفید اور روشن ہوں گے اور اہل دوزخ کے چہرے سیاہ ہوں گے اور ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی اور جنت و دوزخ کے داخلہ کے بعد ہر فریق کی صورتوں کا ممتاز ہونا تو ظاہر ہی ہے اعراف والے اہل جنت اور اہل دوزخ کو ان کی نشانیوں سے پہچان لیں گے خود تو ابھی جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے البتہ اس کے امیدوار ہو رہے ہوں گے کہ انہیں بھی جنت میں داخلہ نصیب ہو جائے گا۔

اسی طمع اور آرزو کے حال میں وہ جنت والوں سے خطاب کریں گے کہ "سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ" (تم پر سلام ہو) ان کا یہ کہنا بطور تحیہ یا بطور اخبار کے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تکلیفوں سے بچا دیا اور آئندہ بھی تکلیفوں سے محفوظ رہو گے۔

یہ اصحاب اعراف کون ہوں گے؟ اس کے بارے میں حضرات مفسرین نے حضرات سلف سے متعدد اقوال نقل کئے ہیں مشہور ترین قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو نیکیوں کی وجہ سے پل صراط سے گزر کر دوزخ سے تو بچ گئے لیکن ان کی نیکیاں اس قدر نہ تھیں کہ جنت میں داخلہ کا ذریعہ بن جائیں ان کو اعراف پر لوگوں کے درمیان فیصلہ ہونے تک چھوڑ دیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ شانہٗ اپنی رحمت و فضل سے ان کو جنت میں داخل فرما دیں گے۔

اعراف والے حضرات اہل جنت سے بھی خطاب کریں گے (جس کا ذکر ابھی ہوا) اور اہل دوزخ سے بھی خطاب کریں گے، جب اہل دوزخ پر نظریں پڑیں گی تو ان کی بدحالی دیکھ کر اللہ پاک سے عرض کریں گے کہ اے اللہ! ہمیں ظالموں سے شمار نہ فرمانا یعنی دوزخ میں داخل نہ فرما، نیز یہ حضرات دوزخیوں میں ان لوگوں کو بھی دیکھیں گے جنہیں ان کی نشانیوں سے پہچانتے ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو اہل کفر کے سردار تھے جنہیں اپنی جماعت پر گھمنڈ تھا اور تکبر کرتے تھے نہ دین حق کو قبول کرتے تھے اور نہ اپنے ماننے والوں کو قبول کرنے دیتے تھے، اور اہل ایمان کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے اور نہ صرف یہ کہ ان کو اپنے طور پر حقیر جانتے تھے بلکہ یوں کہتے تھے کہ ان لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل ہو ہی نہیں سکتی۔

اصحاب اعراف ان متکبروں سے کہیں گے کہ تمہاری جماعت نے تمہیں کچھ فائدہ نہیں دیا جن کے تم چوھدری بنے ہوئے تھے اور جو کچھ تم تکبر کرتے تھے اس نے بھی تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچایا، یہ لوگ (یعنی اہل ایمان) کیا وہی نہیں ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ اللہ ان کو اپنی رحمت میں شامل نہ فرمائے گا، دیکھو! وہ کیسے کامیاب ہوئے ان کو جنت میں داخلہ دے دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت فرمائی اور فرمایا "اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ" (جنت میں داخل ہو جاؤ) "لَاخَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ" (نہ تم پر اب کچھ خوف ہے نہ آئندہ تم کبھی رنجیدہ رہو گے) وہ تو اپنے ایمان کی وجہ سے کامیاب ہو گئے اور تمہارا تکبر تمہیں کھا گیا تم کفر پر اڑے رہے لہٰذا تمہیں دوزخ میں داخل ہونا پڑا۔

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا

اور دوزخ والے جنت والوں کو آوازیں دیں گے کہ بہادو

عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا

ہمارے اوپر کچھ پانی یا ان نعمتوں میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہیں، وہ جواب میں کہیں گے کہ بلاشبہ اللہ نے ان دونوں کو حرام کردیا

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ

کافروں پر ﴿۵۰﴾ جنہوں نے اپنے دین کو لہو و لعب بنایا اور انہیں دھوکہ دیا

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ

دنیا والی زندگی نے، سو آج ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں گے جیسا کہ وہ آج کے دن کی ملاقات کو بھول گئے

وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ

اور جیسا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے ﴿۵۱﴾ اور اس میں شک نہیں کہ ہم نے انہیں ایسی کتاب دی ہے

فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

جسے علم کے مطابق کھول کر بیان کردیا جو ہدایت ہے اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ﴿۵۲﴾

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ

یہ لوگ بس اس انتظار میں ہیں کہ اس کا انجام ان کے سامنے آجائے، جس دن اس کا انجام سامنے آئے گا تو وہ لوگ کہیں گے

نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ

جو اس کو پہلے بھول گئے تھے کہ ہمارے رب کے پیغمبر حق لے کر آئے، سو کیا ہمارے لیے

شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ

سفارش کرنے والے ہیں جو ہمارے لیے سفارش کریں یا ہم واپس لوٹا دیے جائیں سو ہم اس عمل کے علاوہ کریں جو کیا کرتے تھے،

قَدْ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع

ان لوگوں نے اپنی جانوں کو تباہی میں ڈالا اور جو کچھ افتراء پردازی کیا کرتے تھے وہ سب بیکار چلی گئی ﴿۵۳﴾

تفسیر:

اہل جہنم کی فریاد اور اہل جنت کا جواب:

"وَنَادٰى اَصْحٰبُ النَّارِ" اب تک تو ساری کی ساری گفتگو اصحاب جنت اور اصحاب اعراف کی طرف سے تھی اب یہ جہنمی چیخیں گے، ان کا یہ آواز دینا بطور چیخنے کے ہے جس طرح سے بے اختیاری کے ساتھ انسان بولتا ہے "وَنَادٰى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ" جہنم والے آواز دیں گے جنت والوں کو، کیا کہیں گے؟" اَنْ "جو ہے یہ "نَادٰى" کی تفسیر ہے" اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْمِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ "جاری کر دو ہم پر کچھ پانی" اَوْمِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ" یا کچھ اس میں سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے، اب وہ آگ میں جل رہے ہوں گے، پیاس میں مر رہے ہوں گے، بھوک سے تڑپ رہے ہوں گے تو تڑپتے ہوئے آواز دیں گے، یہ بھی انہیں کو آواز دیں گے جن کو جانتے پہچانتے ہوں گے، ایک بھائی مومن ہے تو دوسرا کافر، یہ کافر بھائی مومن کو آواز دے گا، ایک دوست مومن ہے دوسرا کافر تو کافر دوست اپنے مومن دوست کو آواز دے گا، یہ آواز بے قراری کی ہے، یہ مزے کی گفتگو نہیں، کہیں گے بھائی ہم پر کچھ تھوڑا سا پانی ڈال دو یا جو کچھ اللہ نے تمہیں نعمتیں دی ہیں ان میں سے کچھ ہماری طرف پھینک دو یعنی اس وقت ہاتھ پھیلائیں گے اور چیخیں گے کہ ایک قطرہ پانی کا ہی دے دو، ادھر ہم پر پانی ڈال دو کہ ہمیں کچھ سہولت حاصل ہو جائے یا جو کچھ تمہیں نعمتیں ملی ہیں ہمیں ان میں سے کچھ دے دو۔

جنتی جواب دیں گے کہ "اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کو خواہ وہ پانی ہو خواہ دوسرا رزق ہو کافروں پر ممنوع ٹھہرا دیا ہے، یہ نہیں دیا جا سکتا، یہ نہیں مل سکتا، اس کی قیمت تو ایمان ہے اور ایمان تمہارے پاس ہے نہیں، حرام ٹھہرا دیا ان دونوں کو، حرام سے یہاں تحریم شرعی مراد نہیں ہے کیونکہ وہاں شرعی تکلیف تو رہے گی نہیں، اس کا معنی ممنوع ٹھہرا دیا کہ اب یہ چیزیں جنت سے جہنم کی طرف نہیں آسکتیں اور تم ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، ہم تم کو ان میں سے کچھ نہیں دے سکتے یہ ممنوع ہے، ممنوع ٹھہرا دیا ان دونوں چیزوں کو یعنی پانی کو اور رزق کو "عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" کافروں پر۔

جہنم میں کون جائیں گے؟

"الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا" اب یہ کافر جن کے اوپر جنت کی نعمتیں حرام ہو گئیں، ممنوع ہو گئیں،

نہ ان کو پانی کا قطرہ ملے، نہ ان کو کھانے کے لیے کچھ ملے یہ کون لوگ ہیں؟ ان کا آج دنیا میں تعارف کروایا جارہا ہے یہی لوگ ہیں جو آج اس حال میں ہیں یہی ہوگا کہ جس وقت وہ چیخ چیخ کر پانی کا قطرہ مانگیں گے انہیں مساکین سے جن کی آج یہ تحقیر کرتے ہیں کہتے ہیں کہ یہ ہماری روٹیوں پر پلتے ہیں اور ہمارے چندوں پر پلتے ہیں جن کے متعلق یہ کہتے ہیں کل کو انہیں کی طرف سے جواب ملے گا یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنادیا یعنی جو دین ان کے پاس آیا تھا ان کو قبول کرنا چاہیے تھا، اس کے اوپر عمل کرنا چاہیے تھا لیکن انہوں نے اس دین کی باتوں کو ہنسی مذاق ہی بنالیا یہ آج جو دین کو ہنسی مذاق بنا رہے ہیں اور دنیاوی زندگی ان کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے پیٹ بھر کر کھالیتے ہیں اور مست ہو کر سوجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں بس یہی کچھ ہے اور آگے کچھ نہیں اپنی اس اچھی حالت کے اوپر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، انجام سے غافل ہیں، جنہوں نے دین کو کھیل تماشا بنالیا۔

"لھو و لعب" یہ دو لفظ ہیں معنیٰ دونوں کا قریب قریب ہی ہے جس طرح ہم اپنی زبان میں کھیل کود کا لفظ بولتے ہیں، کھیل کود یہ دو لفظ جو ہم بولا کرتے ہیں تو اسی طرح "لھو و لعب" یہ بھی دو لفظ ہی ہیں کھیل تماشا، کھیل کود لیکن اگر درمیان میں فرق کرنا ہو تو آپ ان الفاظ کے درمیان یوں فرق ادا کر سکتے ہیں کہ "لعبا" کہتے کھیلنے کو، غیر مفید چیز میں مشغول ہونا یہ لعب ہے ایسے کام میں مشغول ہوگئے جس میں کوئی نفع نہیں ہے اور جس وقت کوئی شخص غیر مفید چیز میں مشغول ہوا کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفید چیز سے غفلت ہو جاتی ہے اب ایک وقت میں آپ دو کام تو کر نہیں سکتے یا تو آپ تاش کھیلیں گے یا آپ مطالعہ کریں گے، جو شخص تاش کھیلنے لگ گیا وہ مطالعہ کیسے کرے گا تو ایک تو یہ ہے کہ بیکار کام کی طرف متوجہ ہوگئے اور ایک ہے کہ مفید کام سے غافل ہوگئے تو بیکار کام کی طرف متوجہ ہونا یہ لعب ہے اور مفید کام سے غافل ہو جانا یہ لھو ہے۔

یہ دونوں باتیں آگئیں کہ جس وقت ایک آدمی نکمے کام میں، بے کار کام میں یا گناہ کے کام میں مشغول ہوتا ہے تو اس وقت میں نیکی کے کام سے محروم ہو جاتا ہے تو بے کار کام کی طرف متوجہ ہونا یہ لعب اور نیکی کے کام سے غافل ہو جانا یہ لھو، ہے حاصل مفہوم اس کا یہی ہے کہ تم دین کی باتوں کو ایسے ٹرخا دیتے تھے جس طرح سے کوئی کھیل تماشا ہوتا ہے، تمہارے دل میں کوئی پرواہ ہی نہیں تھی یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنالیا اور دنیاوی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال دیا، دھوکے میں دنیاوی زندگی کس طرح سے ڈالتی ہے کہ جوانی کا جوش ہے

تو سمجھتا ہے کہ شاید ہمیشہ جوان ہی رہنا ہے اس کو خیال ہی نہیں آتا کہ بڑھاپا بھی آئے گا، اس وقت زندہ ہے تو سمجھتا ہے کہ میں نے زندہ ہی رہنا ہے اس کو موت کا تصور ہی نہیں آتا کہ میں نے مرنا بھی ہے، اس وقت اگر خوشحال ہے اور اس کی جیب میں پیسے ہیں تو سمجھتا ہے کہ شاید میں نے خوشحال ہی رہنا ہے وہ وقت یاد ہی نہیں کہ میں کسی وقت محتاج ہو جاؤں گا، اس وقت اگر صحت مند ہے تو صحت پر اعتماد کر کے اچھلتا کودتا ہے اس کو یہ اندیشہ ہی نہیں ہے کہ میں بیمار بھی ہو جاؤں گا یہی ہے دھوکہ جو انسان کو لگتا ہے۔

موجودہ حالات پر وہ اس طرح سے مست ہو جاتا ہے کہ اپنے انجام سے غافل ہے ورنہ اگر جوانی کے زمانے میں بڑھاپے کی کمزوری مستحضر ہو تو آج غرور نہیں آسکتا اور مال داری کے زمانے میں فقر کا اندیشہ ہے تو انسان اپنے مال پر اکڑتا نہیں اور اگر صحت کے اندر مرض کا تصور ہے کہ صحت بھی جا سکتی ہے اور اس کے اندر مرض بھی آسکتی ہے تو انسان کو اس نعمت کی قدر ہو گی انسان غافل نہیں ہو گا تو یہی چیزیں ہیں جو انسان کو دھوکے میں ڈالتی ہیں کہ نقد انعام اگر اس کو کوئی حاصل ہو جائے، بہت اچھی حالت اگر اس کو حاصل ہے تو پھر دوسری بات کوئی سوچتا ہی نہیں وہ سمجھتا ہے کہ شاید ہمیشہ ایسے ہی رہنا ہے۔

اب یہ روز آپ کے سامنے ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں اور وہ بسوں والے، ویگنوں والے ایسی بدتمیزی کے ساتھ چلاتے ہیں یہی غفلت ہے ان کو وہ سمجھتے ہیں کہ مرنے والا مر گیا ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہو گا ہم بڑے ہوشیار ہیں لیکن پتہ اسی وقت لگتا ہے جب وہاں بھی پٹاخا ہو جاتا ہے یہی غفلت اور یہی دھوکہ ہے جو انسان کو لگا ہوا ہے، ورنہ ایک کا حال دیکھ کر عبرت حاصل کی جائے تو انسان اپنے عمل کا جائزہ لے کر اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش کرتا ہے کہ دیکھو فلاں نے ایسا کیا تھا نتیجہ غلط نکلا ہمیں اس سے احتیاط کرنی چاہیے، یہی غرور ہے کہ وہ تو بے وقوف تھا، بے عقل تھا اسے تو یہ کام نہیں کرنا آتا تھا تو ایسا ہو گیا ہم تو بڑے سمجھدار ہیں ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہو گا اس قسم کے دھوکے انسان کو زندگی میں لگتے ہیں دنیاوی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

"فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ" پس آج ہم ان کو بھول جائیں گے "كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا" جس طرح وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھولے ہوئے تھے، جس طرح انہیں یہ نہیں یاد تھا کہ قیامت بھی آئے گی اور ہم نے اس میں اٹھنا ہے اس طرح سے آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے، بھلانا اس کی ایک تو حقیقت ہے کہ حافظے سے بات نکل گئی، بھول گیا، مجھے یاد ہی نہیں رہا بھول گیا یہ نسیان اللہ پر نہیں آسکتا کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی بات یاد نہ رہے اور ایک بھلانا ہوتا

ہے کہ اس کی پرواہ نہ کرنا جیسے آپ اپنے دوستوں سے شکوہ کیا کرتے ہیں کہ فلاں وقت میں ہمیں آپ نے یاد ہی نہیں کیا، وہ کہیں گے نہیں جی یاد کیا میں نے تو تسبیح لے کر سو مرتبہ آپ کو یاد کیا، اب اس یاد کا کیا اعتبار جب وقت پہ بلایا نہیں، وقت پہ اس کو یاد نہیں کیا، اس کو اپنی خوشی میں شریک نہیں کیا تو صرف اس کا نام لینا تو یاد کرنا نہیں ہے تو بھلا دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی پرواہ نہیں کی، فلاں نے فلاں شخص کو بھلا ہی دیا، پس پشت ہی ڈال دیا تو یہاں بھی اسی طرح ہم ان کی پرواہ نہیں کریں گے، ہم ان کا خیال نہیں کریں گے جس طرح انہوں نے اپنی اس دن کی ملاقات کا خیال نہیں کیا "وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ" یہ بھی "كَمَا" کے کاف کے نیچے داخل ہے "كَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ" جیسے کہ یہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے۔

قرآن کریم کی صفات:

"وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ" البتہ تحقیق ہم ان لوگوں کے پاس لے آئے ہیں ایسی کتاب جس کو ہم نے کھول کھول کر بیان کیا ہے اپنے علم پر یا اپنے علم صحیح کی بناء پر ہم نے اس کتاب کے اندر ہر بات کو کھول کھول کر بیان کیا ہے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں آج اس کتاب کی قدر کرنی چاہیے جس کو ہم نے ہدایت اور رحمت بنا کر اتارا ہے، اس کتاب کے ساتھ راستہ معلوم کرو اور جب اس راستے کو معلوم کر کے اس راستے پر چلو گے تو تمہیں اللہ کی رحمت حاصل ہو گی جو ایمان لانا چاہتے ہیں ان کے لیے ہم نے اس کتاب کو ہدایت اور رحمت بنا کر اتار دیا "علی علم" کا معنی ہے کہ ہم نے اپنے علم پر اس کی تفصیل کی ہے جیسے ہمارا علم صحیح واقعہ کے مطابق ہے تو اس کتاب میں جو کچھ آیا سارے کا سارا واقعہ کے مطابق ہے۔

قیام قیامت کے وقت کافروں کی خواہش:

"هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ" "ھل" کے بعد "الا" آئے تو ترجمہ نفی کے ساتھ کیا جاتا ہے، نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر اس کتاب کے آخری انجام کا، آخری انجام کا مطلب یہ ہے کہ جو خبریں اس میں دی گئی ہیں وہ واقعہ بن کر سامنے آجائیں یہ جو مانتے نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس خبر کے واقع ہونے کا انتظار کر رہے ہیں جب یہ خبر واقع ہو جائے گی "يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ" جس دن اس کتاب کا آخری انجام سامنے آجائے گا "يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ" پھر کہیں گے وہ لوگ جو اس کو بھولے بیٹھے تھے "مِنْ قَبْلُ" اس سے قبل "قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ"

تحقیق آ گئے ہمارے پاس ہمارے رب کے رسول سچی بات لے کر " فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا " کیا ہمارے لیے کوئی سفارشی ہیں جو ہماری سفارش کر دیں یا ہم لوٹا دیے جائیں پھر ہم کریں گے اس کام کے علاوہ دوسرا کام جو ہم کیا کرتے تھے " غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ " جو ہم کام کیا کرتے تھے اس کے علاوہ اور عمل کریں گے اگر ہم لوٹا دیے جائیں یعنی آج جو اس کتاب کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے اور منتظر ہیں کہ اس کا انجام سامنے آجائے جب اس کا انجام سامنے آئے گا تو پھر یہ لوگ کہیں گے کہ واقعی یہ رسول سچ کہتے تھے اور پھر اس کی تلافی نہیں کر سکیں گے، تلاش کرتے پھریں گے کیا کہ آج کوئی ہماری سفارش کرنے والا ہے جو سفارش کر کے ہمیں بچا دے، کیا کوئی ایسی صورت بن سکتی کہ ہم دوبارہ لوٹ کر چلے جائیں پھر ہم ایسے کام کریں گے جو ان کاموں کے علاوہ ہوں گے جو ہم پہلے کرتے تھے یعنی پہلے غلط کام کرتے تھے اب ہم وہ نہیں کریں گے اس کے علاوہ دوسرے کام کریں گے پھر اس وقت یوں حسرت اور افسوس ہوگا۔

" قَدْ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ " ان لوگوں نے اپنے نفسوں کو خسارے میں ڈال دیا، اپنی جانوں کو خسارے میں ڈال دیا، یہ خسارہ وہی جس کی تفصیل بارہا آپ کے سامنے آئی کہ زندگی جو خرچ کر رہے ہو اس کا نفع یہ ہے کہ اپنے انجام کو سنوار لو اگر عمر خرچ کر کے آپ نے اللہ کی رضا اور جنت حاصل کر لی تو تم نے نفع کمایا اور اگر عمر جیسی قیمتی چیز ہم نے خرچ کر دی اور مقابلے میں لیا اللہ کا عذاب یا اللہ کی ناراضگی تو یہ بہت بڑا خسارہ ہے، قیمتی سرمایہ دے کر آپ نے اپنی ہلاکت خرید لی تو یہی لوگ ہیں جنہوں نے نتیجتاً جہنم خرید لی اور اللہ کی کتاب کی باتوں سے متاثر نہیں ہوئے یہ اپنی عمر برباد کر بیٹھے، قیمتی سرمایہ ضائع کر بیٹھے اور مقابلے میں کمایا اللہ کا عذاب، یہی ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو خسارے میں ڈال دیا۔

" وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ " جو باتیں گھڑا کرتے تھے، جو باتیں بنایا کرتے تھے خواہ مخواہ کی باتیں بنا کر اپنے آپ کو تسلیاں دیا کرتے تھے، جو باتیں یہ گھڑا کرتے تھے وہ سب ان سے گم ہو گئیں اور ان کے شرکاء بھی " مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ " میں شامل ہیں جن کے اوپر یہ سہارے لیے بیٹھے ہیں ورنہ واقعہ کے اعتبار سے ان کا کوئی وجود نہیں کہ اللہ کا فلاں شریک بھی ہے اس کا کوئی وجود نہیں ہے اپنے ذہن سے تراش کر انہوں نے ان کو سہارا بنا لیا ہے وقت آئے گا تو ان سے یہ سب چیزیں گم ہو جائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ

بے شک تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے پیدا کیا آسمان کو اور زمین کو چھ

أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا

دن میں پھر اس نے قرار پکڑا عرش پر، اوڑھتا ہے رات کو دن سے، طلب کرتا ہے وہ دن اس رات کو اس حال میں کہ اس کو برانگیختہ کیا ہوا ہوتا ہے

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ

پیدا کیا اس نے سورج کو اور چاند کو اور ستاروں کو اس حال میں کہ یہ سارے کے سارے تابع کیے ہوئے ہیں اس کے حکم کے خبردار اسی اللہ کے لیے ہے پیدا کرنا

وَالْأَمْرُ ۗ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِينَ ﴿۵۴﴾ اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ

اور حکم دینا، برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۵۴﴾ پکارو اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور

خُفْيَةً ۗ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۵۵﴾ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ

چپکے چپکے، بے شک وہ تمہارا رب پسند نہیں کرتا حد سے بڑھنے والوں کو ﴿۵۵﴾ اور فساد نہ کرو زمین میں

بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۗ إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ

اس زمین کی درستگی کے بعد اور پکارو اس رب کو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے بے شک اللہ کی رحمت

قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۶﴾ وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا

قریب ہے نیکوکاروں کے ﴿۵۶﴾ اور اللہ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو اس حال میں کہ وہ بشارت دینے والی ہوتی ہیں

بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۗ حَتّٰى إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ

اللہ کی رحمت کے سامنے حتیٰ کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بوجھل بادلوں کو تو چلا دیتے ہیں ہم اس بادل کو

لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۗ

بنجر علاقے کی طرف پھر ہم اتارتے ہیں اس بادل کے ذریعے سے پانی پھر نکالتے ہیں ہم اس پانی کی وجہ سے ہر قسم کے میوے،

كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۵۷﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ

ایسے ہی ہم نکالیں گے مردوں کو تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿۵۷﴾ عمدہ زمین نکلتی ہے

نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ

اس کی نباتات اس کے رب کی توفیق سے اور جو علاقہ خبیث ہے نہیں نکلتی اس کی پیداوار مگر ردی قسم کی، اسی طرح سے

نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾ ع

ہم پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں آیات کو شکر گزار لوگوں کے لیے ﴿۵۸﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

پچھلے رکوع جو آپ کے سامنے ذکر کیے گئے ان میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد زیادہ تر معاد کا ذکر ہے یعنی آخرت کے حالات جیسے کہ جنت اور دوزخ میں جانے والے لوگوں کی آپس میں گفتگو نقل کی ہے، اصحاب اعراف کی گفتگو نقل کی ہے اور پچھلے رکوع میں متصل ہی آیا تھا کہ جب یہ آخرت میں اللہ کے سامنے جائیں گے، اللہ کے سامنے پیشی ہوگی تو اس وقت یہ کہیں گے کہ واقعی رب کے رسول ہمارے پاس سچی بات لے آئے تھے، پھر یہ سفارشی ڈھونڈتے پھریں گے، پھر یہ تمنائیں کریں گے کہ ان کو واپس بھیج دیا جائے لیکن وقت گزر چکا ہوگا پھر ان کی تمنائیں پوری نہیں ہوں گی۔

قرآن کریم میں اکثر و بیشتر اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ یہی ہے کہ جس وقت بھی معاد کا مسئلہ ذکر کرتے ہیں تو اس کے بعد خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدت کا ثبوت:

اور قدرت کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین مکہ کے سامنے جب بھی یہ ذکر کیا جاتا تھا کہ مردوں کو زندہ کیا جائے گا تو وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیسے ہوگا؟ جب ایک دفعہ انسان مر گیا، مرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو گیا، ہڈیاں بوسیدہ ہو گئیں تو پھر دوبارہ ان میں کیسے جان ڈالی جا سکتی ہے؟ فوراً ان کی زبان پر یہی بات آتی تھی "مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ" ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے بعد پھر ان کو کون زندہ کرے گا یعنی یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی مر جائے، ذرات اس کے بکھر جائیں، کیڑے اس کو کھا جائیں، جانور اس کو نوچ نوچ کر لے جائیں، دریا میں بہہ جائے تو ہزاروں لاکھوں مچھلیاں اس کو کھا جائیں، ذرات اس کے

بکھر جائیں گے تو پھر دوبارہ ان کو زندہ کس طرح سے کیا جائے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ شبہ جوان کے دل میں آتا ہے تو اس کا براہ راست تعلق قدرت خداوندی کے ساتھ ہے تو اللہ تعالیٰ جب بھی اس مسئلے کو ذکر فرماتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا ہے اور آخرت آنے والی ہے تو اس کے متصل آیات قدرت کو ذکر فرماتے ہیں تا کہ انسان ان کے اندر غور وفکر کرے اور سمجھے کہ جو اللہ اتنی قدرتوں والا ہے اس کے لیے ایک دفعہ انسان کو مار کر دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟ کہیں اللہ تعالیٰ اس انداز سے بیان فرمائیں گے "قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ" کہ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ دوبارہ وہی زندہ کریں گے جس نے پہلی دفعہ بنایا تھا یہ بہت بڑی دلیل ہے اس احیاءِ موتی کے لیے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ہمیشہ پہلی دفعہ کسی چیز کا بنانا مشکل ہوتا ہے انسانوں کے عرف میں اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں، اور اگر وہ دوبارہ بنانی پڑ جائے تو اس میں کوئی مشکل نہیں تو جب تم یہ مانتے ہو کہ تمہیں پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تو پھر تمہیں یہ کیوں سمجھ میں نہیں آتا کہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے، بہر حال اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے مختلف انداز کے ساتھ، اپنی قدرت کو واضح کر کے بیان کیا ہے اور اکثر و بیشتر مثال احیاء ارض کے ساتھ دی ہے کہ تم اپنے ارد گرد دیکھو! یہ زمین خشک ہو جاتی ہے، بنجر ہو جاتی ہے، اس میں کوئی نباتات نہیں ہوتی یہ علامت ہے کہ یہ زمین مرگئی، اس میں حیات نہیں ہے، یہ خشک مٹی ہوگئی، گرد اڑ رہی ہے، غبار اڑ رہا ہے اس میں کوئی کسی قسم کی زندگی کے آثار نہیں ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بارش ہوتی ہے، پانی برستا ہے تو تھوڑی دیر کے بعد دیکھتے ہو کہ زمین لہلہانے لگ جاتی ہے گویا کہ وہ زمین زندہ ہوگئی، بنجر ہونے کے بعد زندہ ہوگئی تو یہ صبح شام تمہارے سامنے نقشے آتے ہیں۔

اسی طرح سے سمجھو کہ انسان کو اللہ ایک دفعہ ماریں گے، مارنے کے بعد اس کو زندہ کر دیں گے، یہ تمہارے سامنے مثالیں دائیں بائیں آگے پیچھے پھیلی ہوئی ہیں اس میں غور کر کے تم اس حقیقت کو کیوں نہیں سمجھتے؟ اس مسئلے کو ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ آیات قدرت ذکر فرمایا کرتے ہیں اور پھر جو یہ آیات قدرت ہوتی ہیں جہاں یہ اثبات معاد کا فائدہ دیتی ہیں کہ اس کے ساتھ آخرت کا انجام سامنے آتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت واضح ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ہی یہ آیات توحید بھی ہوتی ہیں کہ ان کے ساتھ یہ ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق، مالک اور حاکم ہے اور ہر قسم کی قدرت اسی کے لیے ہے، اس کی پیدا کی ہوئی کائنات میں کسی دوسرے کا حکم نہیں چلتا اس لیے یہاں رہتے ہوئے تم اسی کے ہی محتاج ہو، اپنی ضرورتیں اسی کے ساتھ ہی متعلق رکھو، اپنی حاجات کے لیے

اسی کو ہی پکارو، اسی سے ڈرو اور اسی سے امید رکھو، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو کائنات کے اندر متصرف سمجھ لینا کہ اس کا حکم بھی چلتا ہے یا وہ ہماری موت وحیات کا یا رزق کا مالک ہے کہ اگر وہ چاہے تو ہمیں فقیر کر دے، اگر چاہے تو ہمیں غنی کر دے، ہماری صحت اور بیماری کا اسے اختیار ہے اس قسم کے خیالات اپنے دل کے اندر لانا یہ اللہ تعالیٰ کے مالک اور حاکم ہونے کے خلاف ہے تو توحید اس طرح سے ثابت ہوتی ہے کہ جب تم اس زمین پر بستے ہو، آسمان کے نیچے رہتے ہو کہ یہ کائنات اللہ کی بنائی ہوئی ہے تو اللہ ہی اس کائنات کا بادشاہ ہے اور اسی کا ہی تصرف سارے کا سارا اس کائنات کے اوپر چلتا ہے، اس کے حکم کے خلاف یہاں کوئی کام نہیں ہوسکتا پھر تم اپنے آپ کو محتاج قرار دو تو اسی کا، ہاتھ پھیلاؤ تو اسی کے سامنے پھیلاؤ، ہر قسم کے اختیارات اسے ہیں، کسی دوسرے کا اس کائنات کے اندر حکم نہیں چلتا اس طرح سے اللہ تعالیٰ توحید کو بیان فرماتے ہیں تو ان آیات سے دونوں باتیں ثابت ہوں گی توحید بھی اور معاد بھی۔

عقیدہ ربوبیت کی اہمیت:

پہلے اپنے خالق ہونے کا ذکر کیا کہ تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، رب کہتے ہی اس کو ہیں جو ضرورتیں پوری کرنے والا ہوتا ہے اس کا ترجمہ آپ کر لیتے ہیں پالنے والا، اصل معنیٰ ہوتا ہے کہ جو ابتداء سے لیکر انتہاء تک نشو ونما کرے تو گویا کہ یہی تمہارا رب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف سب سے پہلے آپ کو ربوبیت کے ساتھ ہی کروایا ہے (توجہ فرمایئے) آپ کی جو ابتدائی تاریخ نقل کی گئی ہے قرآن اور حدیث میں، اس میں یہ بات آئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں وجود دینے کے بعد عالم ارواح میں حاضر کیا، حاضر کرنے کے بعد سب سے پہلے جو تمہارے کان میں آواز ڈالی تھی وہ کیا تھی "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں اور آپ سب نے کہا تھا "بلیٰ" کیوں نہیں گویا کہ اقرار کر لیا تھا کہ تو ہمارا رب ہے تو ربوبیت کا اقرار پہلے کروایا تھا کیونکہ انسان کسی سے جڑتا ہے تو پہلے یہی اپنے کھانے پینے کی ضرورتوں کی بناء پر جڑتا ہے اور رب وہی ہوتا ہے جو کھلائے پلائے، ضرورتیں پوری کرے یہیں سے تعارف کروایا۔

اور کتاب اللہ میں جو پہلی سورت آپ کے سامنے رکھی گئی اس میں اللہ نے اپنی ذات کا تعارف کس لفظ سے کروایا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" رب العالمین کے ساتھ ہی وہاں تعارف کروایا، سب سے پہلی سورت میں اللہ کا ذکر آنے کے بعد اس کی پہلی صفت جو ذکر کی گئی ہے وہ رب العالمین کی ہے اور جو مطالبہ آپ سے کیا گیا ہے

قرآن کریم میں جس کا ذکر آیا ہے وہ مطالبہ بھی آپ سے یہی ہے " اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا"
استقامت جس بات پر مطلوب ہے وہ اسی عقیدے پر استقامت ہے کہ رب صرف اللہ ہے جنہوں نے کہہ دیا کہ
ہمارا رب اللہ ہے پھر اسی کے اوپر ڈٹ گئے اور اس عقیدے میں فرق نہیں آنے دیا، پالنے والا، اپنی ضرورتوں کو پورا
کرنے والا رب کو قرار دیتے ہیں پھر اسی پر ڈٹ جاتے ہیں کسی اور کا اپنے آپ کو محتاج نہیں سمجھتے یہی ہیں جن کے
اوپر فرشتے اترتے ہیں بشارتیں لے کر۔

اور جس وقت آپ مر جائیں گے تو مرنے کے بعد پرچے کا پہلا سوال کون سا ہے "مَنْ رَّبُّكَ" وہ یہی
سوال ہے کہ جس کے متعلق اقرار کیا تھا اس کو پھر کہاں تک نبھایا، اپنی زندگی کے اندر تم رب کس کو سمجھتے رہے؟ وہاں
جا کر جھوٹ تو بول نہیں سکیں گے، آپ نے اگر واقعی اللہ کو رب سمجھا تھا اور اللہ کے ساتھ رب ہونے کا تعلق رکھا تھا تو
وہاں جواب صحیح دے دو گے "رَبُّنَا اللّٰهُ" اور اگر پالنے والا کسی اور کو سمجھتے رہے اور ضرورتیں کسی اور سے متعلق کرتے
رہے تو وہاں جھوٹ نہیں بول سکو گے وہاں پھر یہ نہیں کہہ سکو گے "ربنا اللہ" دیکھو سوال بھی بتایا ہوا ہے اور جواب بھی
بتایا ہوا ہے کہ اس کا صحیح جواب یہ ہے لیکن اگر عملی زندگی نے ساتھ نہیں دیا ہوگا تو برزخ میں آپ اس سوال کا یہ جواب
نہیں دے سکیں گے، وہاں سچ بولیں گے، زندگی کے اندر جس کو رب سمجھتے رہے اسی کا اقرار آپ وہاں جا کر کریں
گے تو اللہ تعالیٰ کا تعارف بھی اسی سے ہوا اور مطالبہ بھی اسی کے اوپر جمنے کا ہے۔

زمین وآسمان کی پیدائش اور وقت کا اندازہ:

تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا تو خالق تو یہی ہوا، اب ساری کائنات اس
میں آ گئی، کائنات کا کچھ حصہ زمین کی طرف ہے، کچھ آسمان کی طرف ہے گویا کہ جتنی بھی آپ کے علم میں کائنات
ہے سب کا خالق وہی ہے، نہ زمین کی طرف میں کوئی چیز ہے جو کسی اور کی پیدا کی ہوئی ہو اور نہ آسمان کی جانب میں
کوئی چیز ہے جو کسی اور کی پیدا کی ہوئی ہو تو ابتداء اسی نے کی، پیدا اسی نے کیا "فی ستة ایام" چھ دن میں، چھ دن
سے کیا مراد ہے؟ اگر یہی دن رات مراد ہیں جو آپ کے سامنے چلتے ہیں تو پھر چھ دن کا اندازہ مراد ہے کیونکہ یہ دنیا
کے دن رات کا تعلق سورج اور چاند کی حرکت کے ساتھ ہے، زمین وآسمان کی حرکت کے ساتھ ہے، سورج کبھی
نمایاں ہوتا ہے اور کبھی چھپتا ہے تو دن بنتے ہیں اور رات بنتی ہے اور جس وقت اللہ تعالیٰ زمین اور آسمان کو پیدا کر
رہے تھے اس وقت نہ سورج تھا، نہ زمین کا چکر تھا کوئی چیز بھی نہیں تھی تو یہ پھر دن رات کیسے وجود میں آ سکتے ہیں پھر تو

یہ چھ دن کا وقت مراد ہے کہ اتنے اندازے میں کہ جتنا چھ دن کا وقت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا اگر یہی دن مراد لیے جائیں جو ہمارے ہیں تو پھر یہ مطلب ہوگا۔

اور اگر ان دنوں سے آخرت کے دن مراد لیے جائیں تو پھر اس کا اندازہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے آخرت کے دن علیحدہ ہیں ان کا اندازہ علیحدہ ہے جیسے کہ آپ کے سامنے سورۂ الم تنزیل السجدۃ کے اندر آئے گا کہ " كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ " بے شک ایک دن اللہ کے نزدیک تمہارے ہزار سال کے برابر ہے تمہارے شمار کے مطابق، تم جو شمار کرتے ہو تمہارا ایک ہزار سال اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک دن، اور سورۂ معارج کے اندر ذکر کیا گیا "فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ" کہ ایک دن ایسا بھی ہے کہ جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے، اب یہ ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر یا ایک دن ہزار سال کا ہو جائے یہ آخرت کے دن ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ طول و عرض کتنا ہے۔

یہاں دنیا کے اندر رہتے ہوئے بھی دنوں کی مقدار ایک جیسی نہیں ہے کہیں دن چھوٹا ہوتا ہے کہیں دن لمبا ہوتا ہے اور آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ قطب شمالی میں چھ مہینے کا دن ہوتا ہے چھ مہینے کی رات یہیں آپ کی دنیا میں یعنی سال میں صرف دو ہی آتے ہیں ایک دن ہے اور ایک رات، سورج نظر آنے لگ گیا تو چھ مہینے تک نظر ہی آ رہا ہوگا، چھپ گیا تو چھ مہینے تک نظر آئے گا نہیں کہ یہاں دنیا کے اندر رہتے ہوئے بھی ایسا ہے اور بعض بعض جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں بائیس گھنٹے کا دن ہے دو گھنٹے کی رات ہے اور ادھر سے سورج چھپا ہے اور ابھی ادھر سرخی غیب نہیں ہونے پاتی کہ طلوع فجر کے آثار شروع ہو جاتے ہیں اسی دنیا میں بھی اسی طرح کی کمی بیشی ہے تو آخرت کے ایام کا اندازہ اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔

بہر حال اتنے عرصے میں اللہ تعالیٰ نے اس زمین آسمان کو بنایا اور کس ترتیب کے ساتھ بنایا؟ اس کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی جس میں آئے گا کہ زمین اللہ تعالیٰ نے دو دن میں بنائی پھر دو دن میں اس میں باقی چیزیں قائم فرمائیں، پہاڑ، درخت، دریا، معدنیات جو کچھ بھی اس میں تھا اور اس کے بعد پھر دو دن میں آسمان کو بنایا اور یہ کام شروع کیا تھا اتوار کو جیسے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے اور جمعے کے دن یہ تخلیق ختم ہوئی اور ایک روایت میں آتا ہے کہ عصر کے بعد وقت جو تھوڑا سا بچ گیا تھا چھٹے دن میں اس میں اللہ تعالیٰ نے آدم کو بنایا گویا کہ اس کائنات کی تخلیق کے آخر میں آدم کو بنایا، بہر حال ان روایات سے کچھ اشارے نکلتے ہیں اندازہ یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اس کی تخلیق تدریجاً ہوئی ہے، یک دم اس کو کلمہ کن کے ساتھ نہیں بنادیا کہ ہو جاؤ اور یک دم زمین و آسمان کھڑے ہو گئے یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت ہے اور یہ سمجھنے میں آپ کو دقت پیش نہ آئے، آپ میں سے کوئی اٹھارہ سال کا ہے، کوئی بیس سال کا ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں ایک منٹ میں ہی اتنے بڑے بنادیتا لیکن اللہ کی حکمت کے ساتھ پہلے تم چھوٹے سے تھے پھر تم بڑھتے چلے گئے اب جو تمہارا وجود ہے یہ کسی کا اٹھارہ سال میں بنا ہے اور کسی کا بیس سال میں بنا ہے تو جیسے اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت ہے کہ تمہیں تدریج کے ساتھ ایک کمال تک لے جاتا ہے اسی طرح اس نے کائنات کو بھی تدریجاً وجود دیا ہے اور اگر وہ چاہتا تو آپ کی پکی پکائی روٹیاں اوپر سے آجایا کرتیں، پکی پکائی دال نازل ہو جاتی اور آپ کھالیا کرتے لیکن ایک گندم کا دانہ بننے میں چھ مہینے لگ جاتے ہیں، آپ اس کو بوتے ہو اور بونے کے بعد کیا کیا دھندے کرتے ہو، پہلے زمین بناتے ہو اور پھر دانہ بوتے ہو پھر کیا کیا کرتے ہو اور پھر کٹتا ہے، گاہا جاتا ہے اور پھر آپ کے ہاں آتا ہے پھر آٹا بنایا جاتا ہے پھر گوندھا جاتا ہے پھر کہیں جا کر روٹی بنتی ہے تو ایک روٹی تیار ہونے کے لیے آپ کا کتنا وقت لگتا ہے، چھ مہینے میں کہیں یہ روٹی تیار ہوتی ہے جس کا لقمہ آپ کے منہ میں جاتا ہے تو جس طرح یہ کام سارے کے سارے تدریجاً ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اسی طرح یہ زمین و آسمان کی تخلیق جو ہوئی ہے یہ بھی اللہ کے حکم کے تحت تدریجاً ہوئی ہے اور وہ وقت کا اندازہ جو بھی ہے وہ اللہ کے علم میں ہے ہم اس کی پیمائش نہیں کر سکتے بہر حال یہ تخلیق تدریجاً ہوئی ہے چھ دن میں اس کو کمال تک پہنچایا۔

صفات باری تعالیٰ کی مفصل اور دلنشین تشریح:

"ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" استویٰ علی العرش" کا لفظی معنی یہ ہے کہ پھر اس نے عرش پر قرار پکڑا، عرش کہتے ہیں تخت کو جس طرح بادشاہ کا تخت ہوا کرتا ہے، جس کے اوپر بادشاہ بیٹھا کرتا ہے یہ عرش ہے اور "استویٰ علی العرش" کا معنی ہو گیا کہ اس نے عرش پر قرار پکڑا، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر آئے یا اس کی صفات کا ذکر آئے جیسے ہاتھ کا ذکر آجائے، منہ کا ذکر آجائے وہاں یوں کہا جایا کرتا ہے جیسے اللہ کی شان کے لائق ہے، ہم اس کا کوئی نقشہ اپنے ذہن میں نہیں لاسکتے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ کیسا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا منہ کیسا ہے؟ ہم اس کا نقشہ ذہن میں نہیں لاسکتے پس "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" جو بھی صورت ہم بنائیں گے اس سے تشبیہ لازم آجائے گی، اللہ تعالیٰ ہے

جیسے اللہ کی شان کے لائق ہے، اسی طرح اس کی صفت اس کے لیے ثابت ہے، اس طرح سے عرش کے اوپر قرار پکڑنا اس کا یوں تصور نہ کیجئے جیسے کہ ایک تخت ہے تخت کے اوپر ایک انسان بیٹھ جاتا ہے اس طرح سے تصور نہ کیجئے یہ تصور غلط ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کو یوں نہیں سوچا جاسکتا ہم یہی کہیں گے کہ عرش کے اوپر قرار پکڑنا جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔

ذرا اور وضاحت کے ساتھ اس بات کو سمجھیے کسی چیز کی صفت کے صحیح تصور کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اس چیز کی حقیقت معلوم ہو، اس بات کو طالب علمانہ طریقہ سے آپ کے سامنے ذکر کروں کسی چیز کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کی حقیقت معلوم ہو تب جا کر آپ اس کی صفت کا صحیح تصور کر سکتے ہیں، چیز کی حقیقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کی صفت کا مفہوم بدل جاتا ہے مثلاً آپ کہتے ہیں کہ زید آیا اب یہاں آیا کا جو ذکر آیا ہے تو جب آپ زید کو جانتے ہیں کہ یہ انسان ہے تو آپ کے علم میں آ گیا، آپ کی سمجھ میں آ گیا کہ زید کس طرح سے آتا ہے جیسے انسان آیا کرتا ہے تو چونکہ زید کی حقیقت آپ سمجھتے ہیں تو اس کا آنا بھی آپ کی سمجھ میں آ گیا کہ زید اس طرح سے آتا ہے۔

اور جس وقت آپ کہتے ہیں کہ بخار آ گیا، اگر کہا جائے کہ بخار آ گیا تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ دو ٹانگوں پر چلتا ہوا آ رہا ہے یا تانگے پر چڑھا ہوا آ رہا ہے یا سائیکل پر چڑھا ہوا آ رہا ہے؟ کیا یہ مطلب ہوتا ہے بخار کے آنے کا؟ جب آپ بخار کی حقیقت کو سمجھتے ہیں تو جس وقت کہا جائے کہ بخار آ گیا تو فوراً اس کی صفت آپ سمجھ گئے کہ کس طرح سے آتا ہے۔

اور جس وقت آپ کسی نہر کے کنارے پر کھڑے ہوں تو آپ کہتے ہیں کہ پانی آ گیا تو چونکہ پانی کی حقیقت آپ سمجھتے ہیں تو اس کا آنا بھی آپ کی سمجھ میں آ گیا کہ پانی کس طرح سے آتا ہے، وہاں آپ یہ نہیں کہتے کہ پانی اس طرح سے آ رہا ہے جس طرح سے ریل گاڑی آتی ہے یا پانی اس طرح سے آ رہا ہے جس طرح سے بخار آتا ہے۔

اب اس آنے کے درمیان میں فرق سمجھ میں آ رہا ہے کہ نہیں؟ ہوائی جہاز آ گیا جب آپ ہوائی جہاز کی حقیقت کو جانتے ہیں تو اس کے آنے کا بھی مطلب سمجھیں گے اور اس کے آنے کی حقیقت کو بھی سمجھیں گے کہ ہوائی جہاز کس طرح سے آتا ہے، ریل گاڑی آ گئی اور یہاں سے آپ سفر شروع کرتے ہیں لودھراں کی طرف تو آپ کہتے

ہیں کہ دھنوٹ آ گیا اب دھنوٹ کے آنے کا کیا مطلب؟ کیا یہ اس طرح سے آتا ہے جس طرح سے دریا میں پانی آرہا ہے یا دھنوٹ یوں آتا ہے، جس طرح سے بخار آتا ہے؟ تو جب آپ دھنوٹ کی حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بستی ہے تو جب بھی کہا جائے گا کہ دھنوٹ آ گیا، کہروڑ پکا آ گیا، لودھراں آ گیا تو فوراً ایک تصور اس کا آپ کے ذہن میں آجاتا ہے کہ اس کے آنے کا یہ مطلب ہے۔

اور اگر کسی چیز کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں تو اس وقت تک آپ اس چیز کا صحیح تصور نہیں کر سکتے جس طرح حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح میں لکھا ہے کہ حضرت اپنی عمر کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے کہ پوری طرح سے تو یاد نہیں کہ عمر کتنی تھی لیکن اتنا یاد ہے کہ جس وقت یہ تیرویں صدی ختم ہو رہی تھی اور چودھویں صدی آنے والی تھی تو ہم اپنے بڑے لوگوں کو گھروں میں ذکر کرتے ہوئے سنا کرتے تھے کہ چودھویں صدی چڑھنے والی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم یوں دیکھا کرتے تھے آسمان کے کنارے کی طرف کہ شاید صدی ایسے چڑھے گی جیسے سورج چڑھتا ہے، کہتے ہیں کہ اتنی سی ہوش ہے کہ بڑے تذکرے کیا کرتے تھے کہ صدی چڑھنے والی ہے تو ہم یہ سمجھے تھے کہ شاید جس طرح سے سورج چڑھتا ہے یہ صدی بھی اسی طرح سے چڑھے گی، جیسے اگر آپ اپنے گھروں میں تذکرے کریں کہ پندرھویں صدی چڑھنے والی ہے، صرف دو مہینے رہ گئے چودھویں صدی کے پورا ہونے میں اس سے جاہلوں کی بھی تردید ہو جائے گی جو کہتے ہیں کہ صدیاں تو صرف چودہ ہی ہیں پندرھویں کوئی صدی ہی نہیں ہے تو میں ان کو یہ کہا کرتا ہوں کہ تھوڑی سی دیر ٹھہرو جب پندرھویں صدی آجائے تو پھر کہنا شروع کر دینا کہ یہی آخری صدی ہے اگلی ہے ہی نہیں، یہ سب جاہلانہ باتیں ہیں کسی کو پتہ نہیں کہ قیامت کا کتنا وقت باقی ہے کتنا باقی نہیں ہے، صدیوں پہ صدیاں آتی چلی جائیں گی کب ختم ہوں گی کوئی پتہ نہیں ہے، کسی کے علم میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس کا وقت کسی کو نہیں بتاتا تو بہر حال جب بچے کے ذہن میں صدی کا علم نہیں ہے کہ صدی کیا ہوتی ہے تو صدی کے چڑھنے کا صحیح مطلب وہ کیا سمجھے۔

یہ مثالیں دینے کا یہ مطلب ہے کہ جب کسی چیز کی حقیقت معلوم نہ ہو اس وقت تک اس کی صفت کا صحیح تصور نہیں آتا، سورج چڑھتا ہے آپ کے ذہن میں فوراً اس کا نقشہ آجائے گا کیونکہ آپ سورج کی حقیقت سمجھ گئے، بخار چڑھتا ہے فوراً آپ کے ذہن میں آجائے گا کہ بخار کس طرح سے چڑھا کرتا ہے اس میں کوئی کسی قسم کا اشکال نہیں ہوگا تو پہلے وہ چیز اچھی طرح سے سمجھی ہوئی ہو تو تب جا کے اس کی صحیح صفت سمجھی جاتی ہے۔

اب ایک پاؤں کی بات ہے انسان کا پاؤں اور طرح کا ہوتا ہے، گھوڑے کا پاؤں اور طرح کا ہوتا ہے،

ہاتھی کا پاؤں اور طرح کا ہوتا ہے، چڑیا کا پاؤں اور طرح کا ہوتا ہے تو جس چیز کا آپ پاؤں کہیں گے اگر اس کی حقیقت آپ کو معلوم ہے تو آپ اس کے پاؤں کا صحیح نقشہ سمجھ جائیں گے اور اگر اس کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں تو پاؤں کی حقیقت کو آپ نہیں سمجھ سکتے، اسی طرح آپ سمجھ سکتے ہیں کہ منہ ہر چیز کا ایک جیسا نہیں ہوتا انسان کا منہ اور طرح کا ہوتا ہے، دوسرے ہر جانور کا منہ اور طرح کا ہے جیسی چیز ہوگی ویسا اس کا منہ تو جب بھی آپ کسی چیز کے منہ کا ذکر کریں گے تو اگر آپ کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہے تو آپ اس کے منہ اور شکل کا تصور صحیح کر لیں گے اور اگر اس کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں تو آپ صحیح تصور نہیں کر سکتے۔

بس اس سے سمجھ جایئے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں تو ہم اس کی صفات کا تصور کس طرح کر لیں کہ وہ ایسا ہے، نہ اس کے آنے کے متعلق سوچ سکتے ہیں، نہ اس کے ہاتھ کے متعلق کچھ کہہ سکتے ہیں، جب تک حقیقت معلوم نہ ہو اس بات کا صحیح تصور نہیں کیا جا سکتا تو جب بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت آپ کے سامنے ذکر ہو تو فوراً ذہن میں یوں آ جانا چاہیے جیسے اس کی شان کے لائق ہے، ہم اس کا تصور ذہن میں نہیں لا سکتے۔

پھر ایک ہے اس صفت کا مبداء اور ایک ہوتا ہے منتھاء، مبداء کے بارے میں تو ہم یہی کہیں گے کہ جیسے اس کی شان کے لائق ہے، منتھاء کے بارے میں تذکرہ کیا جا سکتا ہے مثال کے طور پر دیکھنا ایک صفت ہے اب یہ دیکھنا ہوتا ہے آنکھ کے ذریعے سے، آنکھ اس کا مبداء ہے ہم یہ تو تصور نہیں کر سکتے کہ اللہ کی آنکھ ایسی ہے اور اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے حالانکہ آنکھ کا لفظ اللہ تبارک وتعالیٰ استعمال ہوا ہے "وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا" ہماری آنکھوں کے سامنے یہ کشتی بناؤ، اب آنکھ کا تصور ہم نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کی آنکھ کیسی ہے لیکن آنکھ کا منتھاء کیا ہے کہ جو چیز دیکھی جا سکتی ہے وہ علم میں آ جاتی ہے، مبصرات جتنے ہیں وہ علم میں آ جاتے ہیں تو مبصرات جتنے بھی ہیں وہ سب اللہ کے علم میں ہیں اور احاطے کے ساتھ ہیں کہ کوئی مبصر ایسا نہیں جو اللہ کی آنکھ سے چھپا ہوا ہو، یہ بات ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سننے والا ہے، سمع ایک تو یہ ہوا ہے کہ کان کے ذریعے سے سنا جاتا ہے اللہ تعالیٰ سمیع ہے بصیر ہے سنتا ہے دیکھتا ہے تو ہم کان کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ سماعت کا آلہ کس طرح سے ہے، کیسے سنتا ہے، اس کے کان کیسے ہیں، سننے کی کیا صورت ہے ہم یہ نہیں بیان کر سکتے جیسے اللہ کی شان ہے لیکن اس کا منتھاء کیا ہے کہ مسموعات جتنی ہیں وہ سب علم میں آ جائیں تو جتنی باتیں سننے کی ہیں سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں کوئی بات باہر نہیں ہے اس طرح سے ہم اس کے منتھاء کو ذکر کر سکتے ہیں۔

ایسے ہی یہ بات ہے جو آپ کے سامنے آ رہی ہے، عرش کہتے ہیں تخت کو اور استویٰ کہتے ہیں قرار پکڑنے کو "اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" کا معنی ہو گیا کہ اس نے تخت کے اوپر قرار پکڑا، اب یہاں یوں تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس طرح سے بیٹھ گیا جس طرح سے بادشاہ تخت پر بیٹھا کرتا ہے تو یہ ہم نہیں کہہ سکتے اللہ کی شان جیسی ہے ویسے ہی اس کا قرار پکڑنا ہے لیکن ایک ہے اس کا اثر اور منتھاء وہ کیا کہ جس ملک کے اندر کوئی بادشاہ تخت نشین ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت اسی کی ہے، ہندوستان میں بابر تخت نشین ہو گیا کیا مطلب کہ باغیوں کی حکومت ختم بابر کی حکومت آ گئی، اب اس ملک میں حکم اسی کا چلے گا، بابر کے بعد ہمایوں تخت نشین ہو گیا تو اب حکم اسی کا چلے گا، اور اس کے بعد اکبر تخت نشین ہو گیا، شاہ جہان تخت نشین ہو گیا، جہانگیر تخت نشین ہو گیا تو تخت نشین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس ملک کی باگ دوڑ اس نے سنبھال لی اور اس ملک کے اوپر حکومت اس کی آ گئی اب اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کا کوئی حکم نہیں چلے گا اس حدود مملکت کے اندر حاکم بادشاہ یہ ہے، تخت نشین ہونے کا اثر یہ ہوتا ہے۔

بڑے درجے کو اگر آپ نہ سمجھ سکو تو یہ جو آپ کے چیئر مین ہوتے ہیں، چیئر مین کا کیا مطلب کرسی نشین، "چیئر" کرسی کو کہتے ہیں "مین" آدمی کو کہتے ہیں تو "چیئر مین" کا معنی کرسی کا آدمی یعنی ایسا آدمی جو کرسی پر بیٹھ گیا ہے اور یہاں اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جتنی اس کی بلدیہ کی حدود ہے اس میں کرسی اس کو مل گئی اور یہ کرسی نشین ہو گیا اب یہاں ساری کی ساری حکومت اس کی ہے، اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کا حکم نہیں چلے گا اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی کرسی کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کے تخت کا ذکر ہے تو انسانی محاورے کے تحت یہ بات بتا دی گئی کہ اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد کائنات کا بادشاہ اور تخت نشین بھی اللہ ہی ہے، اب اس کی شکل تو ہم متعین نہیں کر سکتے کہ ایسے بیٹھا ہے یا اللہ تعالیٰ کرسی پر کس طرح سے بیٹھتا ہے؟ ہم یہ متعین نہیں کر سکتے لیکن اس کا جو اثر ہے کہ حدود مملکت کے اندر کسی دوسرے کا حکم نہیں چلے گا بادشاہی صرف اللہ کی ہے "اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" کے ساتھ یہ چیز ثابت ہو گئی کہ زمین و آسمان کو پیدا کرنے کے بعد کسی اور کو اس نے بادشاہ نہیں بنا دیا کہ پیدا میں نے کر دی حکم تم چلاؤ ایسی بات نہیں ہے پیدا کرنے کے بعد عرش کے اوپر مستوی خود ہوا جب مستوی خود ہوا تو اس کائنات کے اندر حکومت اسی کی چلتی ہے، حکم اسی کا چلتا ہے اس کے مقابلے میں کوئی بادشاہ نہیں اور کوئی اس زمین و آسمان کے اندر تصرف کرنے والا نہیں "استویٰ علی العرش" کا یہ معنیٰ ہے اس کائنات کا بادشاہ، تخت نشین اس کائنات میں صرف اللہ ہے جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے، ایک دفعہ صفات الٰہیہ کے بارے میں وضاحت کر دی پھر جب بھی "اِسْتَوٰی عَلٰی

الْعَرْشِ" کا ذکر آئے یا اللہ کی صفت کا ذکر آئے تو وہاں صرف اتنا لفظ بولو گے کہ جیسے اللہ کی شان کے لائق ہے۔

سورج، چاند، ستارے سب اللہ کے فرمانبردار ہیں:

اب آگے اس کے تصرفات کا ذکر شروع ہوا کہ پیدا کرنے کے بعد جب اس نے حکومت سنبھال لی، باگ دوڑ ساری کائنات کی اس کے ہاتھ میں ہے، اب زمین ہو، زمان ہو، آسمان ہو، آسمان وزمین کا درمیان ہو جو کچھ ہو سب میں احکام اسی کے چلتے ہیں یہ تو زمانے کی بات ہے کہ "يُغْشِي اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ" رات کو دن پر چڑھا دیتا ہے یا دن کو رات پر چڑھا دیتا ہے، کبھی رات آگئی کبھی دن آگیا، دن آگیا تو رات چھپ گئی، رات آگئی تو دن چھپ گیا اس طرح سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے آتے ہیں، درمیان میں کوئی فرق نہیں کہ دن تو چلا جائے اور ابھی رات نہ آئے یا رات چلی جائے اور ابھی دن نہ آئے یہ ایک دوسرے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور باری باری آجا رہے ہیں کبھی رات آجاتی ہے تو دن چھپ جاتا ہے اور کبھی دن آجاتا ہے اور رات غیب ہو جاتی ہے "يَطْلُبُهُ حَثِيثًا" بھاگتے دوڑتے ہوئے اس کو طلب کرتے ہیں "يَطْلُبُهُ" کی ضمیر لیل کی طرف لوٹ رہی ہے یا اس کے برعکس ہے "حثیثاً" کے معنیٰ اس حال میں کہ اس کو برانگیختہ کیا ہوا ہے، بھڑکایا ہوا ہے یعنی دوڑتا ہوا آتا ہے، چاہے رات دوڑتی ہوئی آتی ہے دن کے پیچھے، چاہے دن دوڑتا ہوا آتا ہے رات کے پیچھے اس زمانے کے اوپر تصرف اللہ ہی کا ہے۔

اور پھر اس کائنات کے اندر جو اثرات نمایاں ہیں، سورج کے ہیں، چاند کے ہیں، ستاروں کے ہیں وہ سب کے سب اللہ نے اپنے حکم کے تابع کیے ہوئے ہیں، اس کے حکم کے ساتھ ہی سورج چڑھتا ہے اور غروب ہوتا ہے اس طرح سے چاند اور ستارے اور ان کے اثرات جیسے سورج کے نکلنے سے روشنی آگئی، گرمی آگئی، فصلیں پکتی ہیں، پھل پکتے ہیں، چاند کے نکلنے کے ساتھ روشنی ہوتی ہے، ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے، پھولوں میں رنگت پیدا ہوتی ہے، پھل میں مزا آتا ہے اور اس طرح سے ستاروں کے طلوع کرنے کے ساتھ دنیا میں مختلف قسم کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں یہ سب اللہ کے حکم کے تحت ہے نہ سورج کچھ کر سکتا اور نہ چاند کچھ کر سکتا ہے، جو کچھ ہے سب "مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ" یہ سب کے سب اللہ کے حکم کے تابع ہیں سورج کو پوجنے والے جنہوں نے سمجھا کہ سورج سب کچھ کرتا ہے وہ بھی احمق اور اس طرح سے چاند کی پوجا کرنے والے بھی حقیقت سے جاہل یہ تو سب اللہ نے کام کے لیے لگا رکھے ہیں "أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ" خبردار پیدا کرنا بھی اسی کا کام ہے اور حکم دینا بھی اسی کا کام ہے، خالق بھی وہی

ہے اور حاکم بھی وہی ہے " تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ" برکت والا ہے اللہ عظیم الشان ہے، تعالیٰ کے معنی ہے کہ وہ بلند شان والا ہے، برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے۔

گذشتہ صفات کا مقتضیٰ:

"اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً" پچھلی آیت جو آپ کے سامنے گزری ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو آپ کے سامنے کھولا تھا کہ تمہارا رب وہی ہے اور رب کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کیا تھا پیدا کرنے والا اور ضرورتیں پوری کرنے والا آگے اپنی قدرت کے اظہار کے طور پر اس نے ذکر کیا تھا کہ خالق وہی ہے، حاکم وہی ہے، اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد تخت نشین کائنات میں وہی ہے، سورج چاند ستارے جو کچھ ہیں سارے اسی کے مسخر کیے ہوئے ہیں، اسی کے کام میں لگائے ہوئے ہیں، پیدا کرنا حکم دینا اسی کا کام ہے "تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ" عالمین کا رب برکت والا ہے، عالی صفتوں والا ہے پچھلی آیت میں یہ مضمون آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا۔

تو جب یہ حقیقت نمایاں ہوگئی کہ خالق وہی، مالک وہی، بادشاہ وہی، پیدا کرنے والا وہی اور ضرورتوں کو پورا کرنے والا وہی تو اسی کا پھر آگے یہ تقاضہ ہے "اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً" "ادعوا" کا معنی اگر لیا جائے پکارنا تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب بھی کوئی کسی قسم کی ضرورت پیش آجائے اپنے اسی رب کو پکارو جو تمہارا خالق ہے، جو اس کائنات کا بادشاہ ہے، جس کا حکم اس کائنات کے اندر چلتا ہے اسے پکارو اور اگر "ادعوا" کا معنی عبادت کرنا لے لیا جائے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ صرف اپنے رب کی ہی عبادت کرو جو تمہیں پالنے والا ہے اور تمہاری ضرورتیں پوری کرنے والا ہے، جو کائنات کا بادشاہ ہے، جس کا تصرف اس کائنات کے اندر چلتا ہے عبادت اسی کی کرو دونوں طرح سے اس کا مفہوم ذکر کیا جا سکتا ہے۔

دعا عبادت کے معنی میں بھی آتا ہے حدیث شریف میں ہے سرور کائنات ﷺ نے فرمایا "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ" مخ کہتے ہیں یہ ہڈیوں کے اندر جو مغز ہوا کرتا ہے جس کو عام طور پر اس علاقے میں مِخ سے تعبیر کرتے ہیں "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ" دعا عبادت کا مغز ہے، عبادت کا اصل ہے تو دعا کا لفظ بول کر عبادت کا معنی لیا جاتا ہے، عبادت کرو اپنے رب کی یا پکارو اپنے رب کو دونوں طرح سے اس کا مفہوم ذکر کر سکتے ہیں کیوں پکارو؟ "ربکم" کے اندر اس کا جواب موجود ہے کہ رب وہی ہے، ضرورتیں پوری کرنے والا وہی ہے اس لیے عبادت کا حق دار وہی

اور اپنی حاجات کے اندر پکارے جانے کا حق دار بھی وہی ہے۔

دعا کے آداب:

اور آگے یہ ادب ذکر کر دیا "تَضَرُّعاً وَّ خُفْيَةً" تضرع کا معنی زاری کرنا یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ زاری کو ظاہر کرتے ہوئے تاکہ " خفية "کے ساتھ اس کا مقابلہ ظاہر ہو جائے، عاجزی نمایاں ہو، تمہارے پکارنے میں گڑگڑاہٹ ہو اور یہ عاجزی کا نمایاں ہونا بدنی طور پر ظاہری طور پر بھی ہوتا ہے اور لسانی طور پر بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جس وقت آپ دعا کریں تو الفاظ بھی ایسے استعمال کرو جس سے عاجزی نمایاں ہو اور حقیقت بھی ایسی اختیار کرو جس سے آپ کا عجز، آپ کا فقر اور آپ کا احتیاج نمایاں ہو دونوں باتوں کی رعایت رکھی جائے تو تب جا کر دعا صحیح طور پر ہوا کرتی ہے، الفاظ ایسے استعمال کرو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ تم واقعی اس کے محتاج ہو اور اس کے بغیر کوئی کام آپ کا بن نہیں سکتا، کوئی شخص بھی تمہاری ضرورت پوری نہیں کر سکتا، جب انسان کسی کا اس طرح سے محتاج ہوتا ہے تو پھر ظاہری طور پر بھی اس کے سامنے لجاجت کرتا ہے، بدن پر بھی ایسے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور الفاظ بھی ایسے استعمال کرو جس سے اس کی قدرت کا اعتراف ہو اور اپنے عجز، اپنا ضعف، اپنی کمزوری اور اپنے احتیاج کا اقرار ہو تب جا کر دعا کے اندر حقیقت پیدا ہوتی ہے۔

اعلیٰ صورت تو اس کی نماز ہے کہ جس طرح سے آپ نماز پڑھتے ہیں، اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور نماز کے ضمن میں دعائیں بھی ہیں کہ دیکھو حقیقت بھی عاجزانہ ہے، ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہو، کبھی اس کے سامنے جھکتے ہو، کبھی ناک رگڑتے ہو یہ ساری کی ساری ہیئت ایسی ہے جو کہ آپ کے عجز اور بندگی کے اوپر دلالت کرتی ہے پھر اس کے اندر جو تسبیح کے کلمات پڑھے جاتے ہیں، دعائیہ کلمات پڑھے جاتے ہیں اس میں بھی اللہ کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اپنے فقر اور اپنے احتیاج کا اقرار ہوتا ہے یہ نماز اللہ کی عبادت کی بہت اعلیٰ صورت ہے جس میں دونوں باتیں پائی جاتی ہے۔

اور عام حالات میں اگر دعا کرنی ہو تو جو ہاتھ پھیلانا ہے یہ ہاتھ پھیلانا بھی اپنے عجز کو ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ جب کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا جائے تو گویا کہ انسان اپنے آپ کو اس کا محتاج ظاہر کر دیتا ہے اور اس کی عظمت کا اعتراف کر لیتا ہے اس لیے دعا کا ادب یہ ہے کہ جب گڑگڑا کر عاجزی کے ساتھ دعا کی جاتی ہے تو ہاتھ خوب پھیلائے جاتے ہیں حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ ہاتھ پھیلایا کرتے تھے تو آپ کی یہ

بغلیں جو ہیں بیٹھنے والوں کو نظر آجایا کرتی تھیں اور یہ نظر کس طرح سے آئیں گی جب یوں ہاتھ پھیلیں گے تو تبھی جا کر یہ نظر آتی ہیں یعنی آپ منبر پر بیٹھے ہوں، کسی اونچی جگہ بیٹھے ہوں یا مجلس میں ہی بیٹھے ہوں تو جب یوں ہاتھ پھیلیں گے تو یہ جگہ کھل جاتی ہے اور اگر اس طرح سے کی جائے گی بازوؤں کو اپنے پہلوں کے ساتھ جوڑ کر تو یہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم آپ کی بغلوں کی سفیدی دیکھتے تھے اتنے آپ نے ہاتھ پھیلائے تو پھر وہ صورت اس پر صادق نہیں آتی تو گڑ گڑانے کی صورت میں جتنا ہاتھ پھیلائیں گے جیسے کھانا مانگنے والا مسکین ہاتھ پھیلایا کرتا ہے دعا کرتے ہوئے اللہ کے سامنے اس طرح سے ہاتھ پھیلاؤ۔

آپ خود دیکھیں گے کہ جس وقت ہاتھ پھیلتے ہیں اتنا ہی انسان کے قلب کے اوپر اپنے ضعف اور عجز کا اثر زیادہ پڑتا ہے ہاتھ پھیلنے کا یہ اثر ہے اور الفاظ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کے بیان کرتے تھے اس سے زیادہ عاجزی اور تواضع کے اور کیا ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی دربار میں جیسے ایک دعا آپ کی احادیث میں نقل کی گئی ہے "اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِيْ وَتَرٰى مَكَانِيْ وَتَعْلَمُ سِرِّيْ وَعَلَانِيَتِيْ لَا يَخْفٰى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِنْ اَمْرِيْ" "اے اللہ! تو میری کلام کو سنتا ہے، تو میرے حال کو دیکھتا ہے، میرا ظاہر باطن تیرے سامنے ہے، کوئی چیز تجھ سے مخفی نہیں، میں تجھ سے ایسے مانگتا ہوں جس طرح سے مسکین مانگا کرتا ہے اور میں تجھے اس طرح سے پکارتا ہوں جس طرح سے کوئی اندھا ڈرا ہوا ہو کسی بات سے وہ کسی کو اپنی مدد کے لیے پکارتا ہے اے اللہ! میں اس طرح سے تجھے پکارتا ہوں جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہے، جس کے آنسو تیرے سامنے بہہ رہے ہیں، جس کا جسم بھی تیرے سامنے پست ہو گیا، جتنے یہ لفظ ہیں زاری کے ہیں، کتنے تواضع اور انکساری کے الفاظ ہیں جس کا ناک تیرے سامنے رگڑا ہوا ہے ایسے شخص کی طرح میں تجھے پکارتا ہوں تو الفاظ بھی اس قسم کے استعمال کیے جائیں اور پھر ساتھ ساتھ ہاتھ بھی پھیلے ہوئے ہوں اور چہرے کے اوپر بدن کے اوپر بھی عاجزی نمایاں ہو تو یہ ہے "تضرع"۔

جب اس طرح سے اپنے آپ کو محتاج قرار دے کر، اپنے آپ کو عاجز ظاہر کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ گے یہ سمجھتے ہوئے کہ ضرورتیں پوری کرنے والا وہی ہے اور اسی نے وعدہ کیا ہوا ہے ہماری ضرورتیں پوری کرنے کا یہ اس کیفیت کے تحت کی جاتی ہے یہ کیفیت طاری کر کے حقیقتاً صرف لفظوں کی بات نہیں کہ ناک تو رگڑتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ سے دعا ایسے کرو جیسے کسی کو جھڑکیاں دی جاتی ہیں وہ بات نہیں ہے، بدن پر بھی عجز اور انکسار نمایاں ہو اور الفاظ جو ہیں وہ بھی بالکل اس قسم کے ہوں جو کہ ضعف پر، عجز پر، مسکنت پر دلالت کرنے والے ہیں

جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر حدیث شریف میں آتا ہے "اِنَّ رَبَّكُمْ حَيٌّ كَرِيْمٌ" تمہارا رب باحیاء ہے بڑا کریم ہے اس کو حیاء آتی ہے کہ جس وقت اس کا بندہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو ان ہاتھوں کو خالی واپس کردے خالی واپس کرنے سے وہ شرماتا ہے تو جس میں یہ بتایا کہ جس وقت بندہ بندہ ہونے کی حیثیت سے رب کو رب سمجھ کر ہاتھ پھیلائے تو پھر اللہ خالی واپس نہیں کرتا پھر اس میں کچھ نہ کچھ رحمت آہی جاتی ہے "اِنَّ رَبَّكُمْ حَيٌّ كَرِيْمٌ" تمہارا رب بڑا باحیاء ہے، بڑا کرم والا ہے، اس کو اپنے بندے سے حیاء آتی ہے جس وقت بندہ اپنی ہتھیلیاں اس کے سامنے پھیلاتا ہے، حیاء کس بات سے آتی ہے کہ اپنے بندوں کو وہ خالی واپس کردے، اپنے بندے کے ہاتھ خالی واپس کردے اس سے اس کو حیاء آتی ہے تو پھر قبولیت بہت قریب ہو جاتی ہے جس وقت انسان دل کے اوپر یہ کیفیت طاری کر کے، اپنے بدن کے اوپر یہ کیفیت طاری کر کے یوں ہاتھ پھیلا کر اللہ سے مانگتا ہے۔

"وخفية" کے اندر ذکر کر دیا کہ چپکے چپکے پکارو، چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دعا جو چپکے چپکے ہوا کرتی ہے وہ ریا سے بھی دور ہوتی ہے اور اس میں بھی تواضع اور انکساری انسان کی زیادہ نمایاں ہے، ورنہ یہ جو چیخنا ہے، چیخ چیخ کر جو دعا کی جاتی ہے، پکارا جاتا ہے اس کی ممانعت حدیث شریف میں آتی ہے چیخنے سے مراد ہے ایسے زور لگا لگا کر بلاوجہ شور مچانا جیسے ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تکبیر بہت بلند آواز سے کہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ تم کسی بہرے کو نہیں پکار رہے، تم اس کو پکار رہے ہو جو تمہارے بالکل قریب ہے اور تمہاری ہر بات کو سنتا ہے اس لیے اعتدال کے ساتھ پکارو، یہ جہراً دعا کرنا کوئی ممنوع بھی نہیں لیکن ایسے جہر کے ساتھ کہ جس میں وہی تواضع اور انکسار ہو کچھ آواز اگر بلند ہو جائے اعتدال کے ساتھ تو اس میں کوئی حرج نہیں خاص طور پر جماعتی دعاؤں میں جہر کر لیا جائے تا کہ دوسروں کو پتہ چل جائے کہ ہم کیا دعا کر رہے ہیں اور دوسرے بھی اس کو سمجھ کر آمین کہیں تو جہر جائز ہے، تعامل امت ہے، اکابر کا معمول ہے لیکن چیخنا چلانا یہ کسی صورت میں درست نہیں ہے "خفية" کا معنیٰ یہ ہے کہ چپکے چپکے جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی دعا سورۃ مریم میں جہاں ذکر ہوئی ہے وہاں لفظ یہی آئے ہیں "اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا" جب اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا تو چپکے چپکے پکارنا یہ بھی دعا کا ایک ادب ہے کہ زیادہ چیخا اور چلایا نہ جائے۔

دعا میں حد سے تجاوز:

"اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ" بے شک وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا تو دعا کے اندر بھی حد سے بڑھنا نہیں چاہیے، ایسی چیز نہ مانگو جس کا دینا اللہ کی عادت نہیں یا وہ خلاف شریعت ہے، گناہ کی دعا نہ کرو، ایسی

دعا کرو کہ جس کا دینا اللہ کی عادت ہے اور ظاہر کے اسباب اس کی تائید کرتے ہیں اور جس کا دینا اللہ کی عادت نہیں ہے وہ نہ مانگو، خلاف شریعت چیز نہ مانگو، گناہ کی دعا نہ کرو اس قسم کی چیزیں جو ہیں وہ سب اعتدا میں داخل ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ یہ حضور ﷺ کے ایک صحابی ہیں ان کا بیٹا دعا کر رہا تھا ایک دفعہ کہنے لگا کہ اے اللہ! میں تجھ سے جنت کی دائیں جانب سفید محل کا مطالبہ کرتا ہوں تو حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اسی آیت کا حوالہ دیا "لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ" کا اور کہا کہ دیکھو ایسی دعا نہ کرو، اللہ تعالیٰ سے جنت مانگو، جنت الفردوس مانگو پھر وہ جہاں ٹھہرا دے اس کی مرضی، یہ تعیین کرنا کہ میں جنت مانگتا ہوں اور جو دائیں جانب سفید محل ہے وہ مانگتا ہوں اس قسم کی تعیین کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں بس اللہ تعالیٰ سے جنت مانگو، اللہ تعالیٰ سے جنت الفردوس کی دعا کرو پھر جہاں وہ ٹھہرا دے اس کی مرضی یا اب اگر کوئی شخص دعا کرنی شروع کر دے کہ اے اللہ! مجھے نبی بنا دے یہ خلاف شریعت ہے کیونکہ اب نبی بنانا اللہ کی عادت ختم ہوگئی یا اس قسم کے اسباب ظاہری کی بالکل موافقت نہ کریں اور شادی کریں نہ اور بیٹھے ساری رات اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہو کہ یا اللہ! مجھے اولاد دے، یہ باتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عادت کے خلاف ہیں پہلے اس کے مطابق کچھ اسباب حاصل کیجئے یا اسباب حاصل ہونے کی دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اسباب پیدا کر دے اور اس کے بعد پھر اپنا مطلوب مانگیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس دنیا کے اندر جو ظاہر ہوتی ہے تو کسی درجے میں اسباب کے پردے میں ظاہر ہوتی ہے اور اس کے خلاف کرنا یہ سب اعتدا میں داخل ہے۔

فساد فی الارض کی ممانعت اور ہر حال میں اللہ ہی کے دروازے پر جھکنے کا حکم:

"وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" زمین کی اصلاح کے بعد فساد نہ مچاؤ، اصلاح کے بعد فساد یعنی ڈاکہ زنی، گڑبڑ، زمین کو ویران اور اجاڑنے کی کوشش کرنا اسی طرح معصیت پھیلانا، نیکی کی مخالفت کرنا یہ سب فساد فی الارض ہے، انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ اصلاحی قانون نافذ کرتے ہیں اور انہی اصلاحی قانونوں کے نافذ ہونے کے بعد خلاف ورزی کرنا یا خلاف ورزی پر اکسانا یہ سب "لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ" کے تحت منع ہے، زمین میں فساد نہ مچاؤ اس کی اصلاح کے بعد۔

"وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا" یہ دوسری کیفیت آگئی پکارو اس کو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے، یہ بہت جامع لفظ ہیں ذرا ان پر توجہ فرما لیجئے! آپ اگر اپنے حالات پر غور کریں گے تو دو قسم کے حالات ہی آپ کی زندگی کو

گھیرے ہوئے ہیں، بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے آپ ڈرتے ہیں اور بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان چیزوں سے بچنے کے لیے آپ کو کسی سہارے کی ضرورت ہے اور بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کو آپ چاہتے ہیں اور ان کو حاصل کرنا آپ کی خواہش ہے کہ یہ ہمیں حاصل ہو جائیں، ابلیس جب انسان کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے پھیرتا ہے تو ان دو راستوں میں سے کسی ایک راستے کی طرف گھماتا ہے، اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے، آپ ایک بات سے ڈر رہے ہیں تو کوئی غلط کار آدمی یا شیطان آپ کے دل میں وسوسہ ڈالے گا کہ اس نقصان سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم یوں کرلو اور آپ اس خوف کی بناء پر اس طرح سے کرلیں گے جیسے ایک بچہ بیمار ہو گیا ماں باپ کو اندیشہ ہے کہ کہیں بچہ مر نہ جائے، کوئی شیطان آئے گا کہے گا فلاں قبر پر جا کر پیر کے نام پر چڑھاوا چڑھا آؤ بچہ بچ جائے گا، اب بچے کی موت سے ڈر کر ماں باپ چلے جاتے ہیں اور قبروں پر جا کر شرک کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک چیز کی آپ کو چاہت ہے مثلاً رزق کی چاہت، اولاد کی چاہت، صحت کی چاہت، تو ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے شیطان آپ کو طمع دلاتا ہے کہ تم یوں کرلو تمہیں اولاد مل جائے گی، یوں کرلو تمہیں عزت مل جائے گی، یوں کرلو یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا تو یہ انسان کی طبیعت کے اندر بعض چیزوں کے حاصل کرنے کا جو جذبہ ہے اور بعض چیزوں سے بچنے کا جذبہ ہے اور یہی انسان کی کمزوری ہے جب انسان متاثر ہوتا ہے تو ان دو راستوں سے ہوتا ہے یا خوف کے راستے سے یا امید کے راستے سے اور شیطان جب انسان کو بہکاتا ہے انہی دو راستوں میں سے ایک راستے پہ بہکائے گا، آپ سے کہے گا یہ کام جو کر رہے ہو بھائی اس کے نتیجے میں تمہیں خسارہ پڑ جائے گا یہ کام چھوڑ دو اور ایک غلط کام کی ترغیب دے گا اور کہے گا یوں کرلو دیکھو تمہیں یہ چیز حاصل ہو جائے گی بہکانے کا انداز یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر بار بار اس چیز کو دھرایا اور انسانوں کے ذہن کے اندر یہ بات ڈالی ہے کہ نفع ہو یا نقصان یہ اللہ کے قبضے میں ہے، یہ کسی دوسرے کے قبضے میں نہیں اس لیے اگر تم کسی چیز سے ڈر رہے ہو تو اسے پکارو اور اگر تم کسی چیز کی امید رکھ رہے ہو تو اسے پکارو، خوف کی حالت میں بھی تمہارا کارساز وہی ہے، وہی تمہیں اس خوف کی چیز سے بچا سکتا ہے اور امید کی حالت میں بھی تمہارا سہارا وہی ہے کہ جو تم چاہتے ہو اسی کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ، اسی کو پکارو، وہی دے سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں دے سکتا تو جو لوگ خوف اور طمع دونوں حالتوں میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں یہی محسنین ہیں اور یہی اللہ تعالیٰ کی رحمت کو حاصل کیا کرتے ہیں اور اگر ڈر کر کسی دوسرے کے دروازے پر چلے گئے تو تم توحید کے راستے سے ہٹ گئے اور اگر لالچ میں آکر کسی دوسرے دروازے

پر چلے گئے تو تم توحید سے ہٹ گئے، موحد وہی ہے کہ لالچ اور خوف کسی چیز سے متاثر ہو کر اپنے صحیح اصول کو نہ چھوڑے بلکہ دونوں صورتوں میں اس کا رجحان اللہ تعالیٰ کی طرف رہنا چاہیے۔

دیکھو گلستان پہلی کتاب ہے جو آپ کو پڑھائی جاتی ہے لیکن آپ اچھی طرح اس دور میں سمجھتے نہیں، اس میں بڑے حقائق ہیں، شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں موحد کے سامنے اس کے پاؤں میں سونے کے ڈھیر لگا دو یا اس کے سر کے اوپر تلوار لے کر کھڑے ہو جاؤ اس کو نہ کسی سے امید ہوتی ہے نہ کسی سے ڈر ہوتا ہے، توحید کی بنیاد اسی پر ہے کہ نہ کسی سے امید ہو اور نہ کسی سے خوف ہو اگر کوئی سر پر تلوار لیے کھڑا ہے تو بھی تمہارے دل کو یقین ہو کہ اللہ چاہے گا تو موت آئے گی ورنہ یہ ہمارا کچھ نہیں کر سکتا اور اگر تمہارے سامنے سونے کے ڈھیر لگا دو تو آپ اس کو ٹھوکر مار دیں کہ اللہ کے حکم کے خلاف یہ بھی کوئی چیز نہیں ہے، ہم اتنا سونے کا ڈھیر لینے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں، اس طرح سے پختگی اگر دل میں آ جائے کہ انسان نہ لالچ سے متاثر ہو اور نہ خوف سے متاثر ہو تو یہ ہوتا ہے صحیح طور پر موحد، اور قرآن کریم نے یہی بات ذہن میں ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ نفع و نقصان کا مختار اسے جانو وہی تمہیں بچا سکتا ہے اور وہی تمہیں نفع پہنچا سکتا ہے جب تک اپنے دل کو ان دو باتوں پر مضبوط نہیں کرو گے اس وقت تک اندیشہ ہے کہ شیطان تمہیں ڈرا کر بہکا لے گا یا طمع دے کر بہکا لے گا۔

ایسے ہی گلستان میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ حضرت شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اگر مخلوق کی طرف سے کوئی تجھے تکلیف پہنچ جائے تو رنجیدہ نہ ہوا کر نہ تو مخلوق کی طرف سے راحت پہنچا کرتی ہے اور نہ مخلوق کی طرف سے رنج پہنچا کرتا ہے چاہے تمہیں مخلوق کی وساطت سے راحت پہنچے، چاہے تمہیں مخلوق کی وساطت سے رنج پہنچے ان کو اللہ کی طرف سے جان، دوست اور دشمن کی طرف سے نہ سمجھ اگر نفع دوست کے ذریعے سے پہنچا ہے تو یہ نہ سمجھ کہ تجھے دوست نے نفع پہنچایا ہے، تکلیف دشمن کی طرف سے پہنچی ہے تو یہ نہ سمجھ کہ تکلیف دشمن نے پہنچائی ہے کہ دونوں کے دلوں کے اوپر قبضہ اسی کا ہے اس نے دوست کا دل تیرے اوپر مہربان کر دیا اور تجھے فائدہ پہنچ گیا، دشمن کا دل تیرے خلاف کر دیا تو اس نے تجھے نقصان پہنچا دیا اصل رسی ادھر سے ہلتی ہے اگر کسی کے دل میں تمہاری محبت ڈال دے تو دوستی لگ جائے گی اگر کسی دل میں تمہاری عداوت ڈال دے تو دشمنی ہو جائے گی دلوں کی جوری ہے، دلوں کی جو تار ہے یہ اسی کے ہاتھ میں ہے چاہے کسی کو آپ کا موافق کر دے چاہے کسی کو آپ کا مخالف کر دے۔

اس بات کو سمجھانے کے لیے آگے ایک مثال دیتے ہیں کہ ایک آدمی تیر مارتا ہے جس سے دوسرا آدمی زخمی

ہو گیا وہ کہتے ہیں کہ ظاہری طور پر تیر اگرچہ کمان سے نکل کر آیا ہے لیکن عقل مند آدمی کمان والے ہاتھ کو دیکھا کرتا ہے، کمان کو نہیں دیکھا کرتا، نکلا تو یہ کمان سے ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن جس نے چلایا ہے عقل مند آدمی اس کو دیکھا کرتا ہے، اسی طرح سے دوست دشمن انسان جتنے بھی ہیں آپ کے نفع نقصان کے لیے یہ تو اللہ کی کمانیں ہیں اور ان کو چلانے والا اللہ تعالیٰ ہے اس لیے کبھی اس بات سے متاثر ہو کر اپنے اصول کو نہ چھوڑیئے کہ فلاں شخص نے چونکہ ہم پر احسان کیا ہے لہٰذا ہم اس کی بات کو موڑ نہیں سکتے، جو غلط بات کہے گا مان لو ایسی بات نہیں ہے، کہو نفع اللہ نے پہنچایا اللہ کے حکم کے مطابق تو کسی کی بات مانی جاسکتی ہے، اللہ کے حکم کے خلاف نہیں مانی جاسکتی اور اسی طرح سے اگر کوئی نقصان پہنچا بیٹھا تو اس سے متاثر ہو کر آپ اس کو سجدہ کر دیں اور اس کے سامنے جھک جائیں بالکل نہیں کہو کہ نقصان ہمارے مقدر میں اللہ نے رکھا تھا بس اس کے ذریعے سے کروا دیا اگر اللہ نہ چاہتا تو یہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا تھا اس لیے نہ ڈر کر کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہ لالچ میں آکر کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت "وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا" خوف ہو تو اس کو پکارو امید ہو تو اس کو پکارو۔

جن کے دل میں یہ کیفیت آجایا کرتی ہے کہ خوف اور امید دونوں صورتوں میں ان کا رجحان اللہ کی طرف ہوتا ہے ان کو کہتے ہیں محسنین، یہ ہیں نیکوکار، احسان کی صفت ان کو حاصل ہے، اللہ کی رحمت انہی کے قریب ہے، اللہ کی رحمت کو یہی حاصل کر سکتے ہیں، قریب کا لفظ یہ فعیل کے وزن پر آگیا مذکر مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے "رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ" میں بظاہر جو فرق آپ کو نظر آتا ہے کہ رحمت اللہ یہ مؤنث ہے اور قریب یہ مذکر ہے تو یہ مؤنث کی خبر مذکر کیسے آگئی اس کا جواب عرض کر رہا ہوں کہ یہ فعیل کا وزن مذکر مؤنث دونوں کے لیے آجایا کرتا ہے اور ویسے بھی یہ رحمت مؤنث حقیقی نہیں ہے، محسنین کا مفہوم بھی آگیا ہے محسنین احسان کرنے والے، صفت احسان اختیار کرنے والے اور صفت احسان کا لفظی معنی ہوا کرتا ہے کہ ہر کام کو اچھی طرح سے کرنا اور احسان فی العبادت کی تفسیر حدیث شریف میں آتی ہے سرور کائنات ﷺ سے جبرائیل علیہ السلام نے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ "مَا الْاِحْسَانُ" احسان کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ" اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا کہ اللہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے، اتنے یقین کے ساتھ اور اتنے اعتماد کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو یہ ہے احسان فی العبادت۔

بارش برسنے میں اللہ کی قدرت اور احسان:

"وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ" اللہ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہوائیں جو اس کی رحمت

سے پہلے بشارت دینے والی ہیں، عام طور پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ بارش آنے سے قبل کچھ ہوائیں چلتی ہیں جس سے انسان اندازہ کر لیتا ہے کہ اب بارش آنے والی ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے مبشرات قرار دیا، وہ چلتی ہیں تو انسان خوش ہو جاتا ہے کہ اب بارش ہوگی اور بارش کے ساتھ اس زمین کو تر و تازگی ملے گی اور ہماری ضرورتیں پوری ہوں گی۔

اور ان کے آنے سے ایک تنبیہ ہو جاتی ہے کہ بارش ہونے والی ہے اپنے آپ کو سنبھال لو، سامان باہر پڑا ہے تو اٹھا لو، کوئی دوسری چیز سنبھالنی ہے تو اس کو سنبھال لینا چاہیے یہ بھی ایک اللہ کی رحمت ہے، اور اس کا تصرف جس طرح سے چلتا ہے اس کی یہ ایک تصویر ہے بارش سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے حتیٰ کہ جب وہ ہوائیں بوجھل بادلوں کو اٹھا لاتی ہیں یہ ظاہری طور پر بارش ہونے کا اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے یہ بادل جو آیا کرتے ہیں اصل کے اعتبار سے یہ بخارات ہیں جو سمندر اور دریاؤں سے اٹھتے ہیں، سمندر اور دریا سے بخارات اٹھتے ہیں جس طرح سے آپ چولہے کے اوپر دیگچی رکھ کر آگ جلاتے ہیں تو اس میں سے بھاپ اٹھتی ہے تو کچھ حرارت کا اثر پڑتا ہے سورج کی گرمی ہوتی ہے یا کوئی داخلی خارجی حرارت کے ساتھ وہ بخارات اٹھتے ہیں دریاؤں سے اور سمندروں سے ان کے اندر پانی ہوتا ہے، جس طرح سے بھاپ میں بھی پانی ہوتا ہے آپ ڈھکنا اوپر رکھے ہوتے ہیں تو دیکھو ڈھکنے کے ساتھ سارا پانی لگا ہوا ہوتا ہے وہ ہوائیں ان کو اللہ کا حکم جدھر ہوتا ہے ادھر کو وہ ان بادلوں کو لے جاتی ہیں، جتنا اللہ کا حکم ہوتا ہے اتنا وہ بادل جا کر برس پڑتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کے بھیجنے کے ساتھ، اللہ کی قدرت کے ساتھ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

اگر بخارات نہ اٹھیں، ہوائیں ان کو نہ لے کر آئیں تو بارش کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتی، آپ ہزار جتن کر لو ایک قطرہ نہیں برس سکتا حتیٰ کہ جب وہ اٹھا لاتی ہیں بوجھل بادلوں کو تو چلا دیتے ہیں ہم اس بادل کو میت بلد کی طرف، میت علاقے کی طرف، بنجر علاقے کی طرف، زمین کی موت یہی ہے کہ اس میں نباتات نہ ہو خشک پڑی ہوئی ہو، مردہ علاقے کی طرف ہم اس کو چلا دیتے ہیں "فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ" پھر ہم اس بادل کے ذریعے سے پانی اتارتے ہیں یہ نقشے آپ دیکھتے رہتے ہیں چونکہ روز پیش آتے ہیں اس لیے آپ کی توجہ نہیں ہوتی ورنہ اس میں اللہ کی بڑی قدرت نمایاں ہے پانی کس طرح سے قطرہ قطرہ کر کے برستا ہے؟ اگر پرنالے کی طرح پانی چھوٹ جایا کرتا تو بڑے بڑے محلات بھی آپ کے سامنے مسمار ہو جایا کرتے اور جس کے سر کے اوپر منوں پانی گرتا تو اس کی کھوپڑی ٹوٹ جایا کرتی، زمین کے اندر گڑھے پڑ جایا کرتے لیکن کیسے اللہ تعالیٰ قطرہ قطرہ کر کے اتارتے ہیں جس کو آدمی بھی

برداشت کر لیتا ہے، مکان بھی برداشت کر لیتے ہیں اور زمین بھی برداشت کر لیتی ہے، نہ زمین میں گڑھے پڑتے ہیں، نہ مکان گرتے ہیں، نہ کوئی دوسرا نقصان ہوتا ہے، قطرہ قطرہ کر کے اترتا ہے جس طرح سے چھلنی میں چھن چھن کر پانی آرہا ہے، اپھر اس کے ذریعے سے ہم ہر قسم کے میوے پیدا کرتے ہیں، یہی مٹی کرکری سی جس میں کوئی مزا نہیں تھا اور بالکل بے سود پڑی ہوئی تھی مردہ بنجر اور جس وقت آسمان سے پانی برسا تو کس قسم کی اس میں سے فصلیں ملتی ہیں، پھول اگتے ہیں، پھل اگتے ہیں اور ہر قسم کے غلہ جات اگتے ہیں گویا کہ پانی کے اترتے ہی اس خشک مردہ اور مٹی کے اندر جان پڑ گئی اور کھیت لہلہانے لگ گئے تو اس میں جہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے وہاں اللہ تعالیٰ کے احسانات بھی ہیں، آج کتنے قسم کے پھل ہیں جو آپ استعمال کرتے ہیں، کتنے قسم کے غلے ہیں جو آپ کھاتے ہیں اور کتنے قسم کے پھول ہیں جو آپ سونگھتے ہیں اور یہ سارے کے سارے آپ کو اگر ملتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین پر بارش ہونے کے بعد ملتے ہیں اور اگر اللہ کی طرف سے پانی نہ برسے تو یہ زمین سوائے خاک کے کچھ بھی نہیں دے سکتی، یہ پانی برستا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہوتی ہے کہ کچھ دنیا کے اندر رونق آجاتی ہے تو اس میں قدرت بھی ہے اور قدرت کے ساتھ ساتھ احسان بھی ہے۔

عقیدہ معاد پر استدلال:

لیکن اس کے ساتھ ہی دیکھو! قرآن کریم کی جس طرح سے عادت ہے میں نے آپ کے سامنے واضح کیا تھا کہ یہ اصول کو مختلف انداز کے ساتھ واضح کرتا چلا جاتا ہے، بنیادی طور پر اسلام کے تین اصول ہیں توحید، رسالت اور معاد، موقع بموقع ان کی وضاحت ہوتی جاتی ہے اب یہ زمین کی مثال جو سامنے آئی تو فوراً اس سے منتقل کر دیا گیا آپ کو آخرت کے عقیدے کی طرف "كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى" کہ دیکھو جس وقت ہم بنجر زمینوں کو آباد کر دیتے ہیں، خشک مٹی میں جان ڈال کر اس میں کیسے کیسے پودے، کیسے کیسے پھل اور پھول پیدا کر دیتے ہیں مرنے کے بعد اسی طرح سے ہم مردوں کو دوبارہ زندہ کر دیں گے یعنی جیسے آپ کے سامنے زمین مردہ بھی ہوتی ہے اور زندہ بھی ہوتی ہے اس طرح ہم مردوں کو نکال کھڑا کریں گے تمہیں یہی اشکال ہے کہ مرنے کے بعد ہم مٹی ہو جائیں گے تو پھر دوبارہ زندگی کس طرح سے آئے گی، جس طرح سے یہ مٹی مردہ ہو جانے کے بعد دوبارہ نباتات اگاتی ہے اسی طرح سے مٹی ہونے کے بعد تمہیں دوبارہ کھڑا کر لیں گے گویا کہ اس میں "احیاء الارض" کو احیاء موتی کے لیے بطور مثال کے ذکر کر دیا کہ اگر اس حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہو تو زمین کے حالات کو دیکھتے رہو، موت و حیات اس کے اوپر

یکے بعد دیگرے کیسے طاری ہوتی ہے اسی طرح سے تم مٹی تھے، تم پہلے بے جان تھے، مردہ تھے ہم نے تمہیں زندگی دی، زندگی دینے کے بعد ہم پھر اسی طرح سے تمہیں مٹی کر دیں گے، مٹی کرنے کے بعد پھر دوبارہ زندگی دے دیں گے، یہ روزمرہ کے واقعات آپ کے سامنے ہیں زمین مردہ ہوتی ہے پھر زندہ ہوتی ہے پھر مردہ ہوتی ہے پھر زندہ ہوجاتی ہے ''کَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ'' ''لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ'' کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے سامنے یہ مثالیں واضح کرتے ہیں تاکہ تمہیں یاددہانی ہوجائے تم ان باتوں کو یاد رکھو اور نصیحت پکڑو۔

بارش کے بعد زمین مختلف حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے:

پھر اس بارش کے اترنے کے بعد زمین کے حالات مختلف ہوگئے بعضے بعضے علاقے زرخیز ہوتے ہیں اسے بلد طیب کے ساتھ تعبیر کیا، طیب سے یہاں عمدہ زرخیز علاقہ مراد ہے اس پر بارش ہوئی نباتات اُگی اللہ کے اذن کے ساتھ بہت کثرت کے ساتھ اُگی، بہت مفید پھل پھول اس میں اُگے اور ایک علاقہ خبث کا مصداق ہے یعنی خبیث، ردی، شوریلہ، نمکین جس کی مٹی میں حیات قبول کرنے کی صلاحیت نہیں بارش وہاں بھی ہوئی لیکن '' لَا يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ'' ''يَخْرُجُ'' کا فاعل ''نَبَاتُهٗ'' ہے، ضمیر نبات کی طرف لوٹ رہی ہے اور نبات نہیں نکلتی مگر بہت ردی اور قلیل یعنی اول تو نکلتی نہیں اگر نکلے بھی تو کسی کام کی نہیں ہوتی، کانٹے دار جھاڑیاں اگ پڑیں گی، بیکار سے پودے کھڑے ہوں گے جس طرح سے شوریلی زمین میں ہوتا ہے تو جب اس زمین میں استعداد اللہ نے رکھی تھی تو اس وقت بارش ہونے کے بعد سوائے کانٹے دار جھاڑیوں کے اس میں کچھ بھی نہیں پیدا ہوتا ''كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ'' ہم اسی طرح سے تمہاری طرف پھیر پھیر کر آیات کو بیان کرتے ہیں تاکہ تم شکر کرو اور قدر کرو اس مثال میں بھی ایک حقیقت نمایاں کر دی کہ جیسے بارش تو ایک ہی ہے جو آسمان کی طرف سے اترتی ہے اور زمین کے اوپر برستی ہے لیکن اس کے باوجود زمین کی صلاحیتوں کی وجہ سے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔

آسمانی وحی بھی بارش کی طرح ہے:

بالکل اسی طرح سے اللہ کی طرف سے یہ ہدایت، یہ قرآن کریم، یہ قرآن کریم کی آیات، یہ اللہ کی رحمت بارش کی طرح برستی ہے آسمان کی طرف سے انسانوں کے قلوب پر جس طرح سے ظاہری بارش کو بادل لاتے ہیں اس باطنی بارش کو انبیاء علیہم السلام لاتے ہیں انبیاء علیہم السلام کی وساطت کے ساتھ یہ بارش قلوب پر اترتی ہے اور یہ بہت حیات بخش چیز ہے جیسے کہ آگے لفظ آئیں گے قرآن کریم میں ایک جگہ سورۃ الانفال میں ''اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ'' اللہ اور

اللہ کے رسول کی بات کو مانو جب وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی دیتی ہے، وہ تمہیں حیات بخشتی ہے، یہ قرآن کریم کی آیات، یہ اللہ کی رحمت کی بارش ہے اس کے ذریعے سے قلوب زندہ ہوتے ہیں، انبیاء علیہم کی وساطت سے یہ بارش آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی آیات اترتی ہیں انسانوں کے قلوب پر اترتی ہیں لیکن انسانوں کے قلوب میں پھر آگے کیا ہوتا ہے جو طیب ہوتے ہیں ان میں تو یہی بارش عجیب وغریب قسم کے اثرات دکھاتی ہے، کیا کیا دلوں کے اندر بہار آجاتی ہے اور ایسی ایسی مفید چیزیں اس دل میں پیدا ہوتی ہیں کہ خود دل والا بھی فائدہ اٹھاتا ہے دوسری مخلوق کو بھی راحت پہنچتی ہے اور جو اپنے باطن کے اندر خبث لیے ہوئے ہوتے ہیں وہ جتنا ان نصیحتوں کو سنتے ہیں، باتوں کو سنتے ہیں اتنے زیادہ ضد میں آکر اتنی نالائقی پر زیادہ اتر آتے ہیں یہ ایسے ہی ہیں جیسے کانٹے دار جھاڑیاں ان کے قلوب میں اُگ آئیں۔

نزولِ وحی کے بعد لوگ مختلف حصوں میں بٹ جاتے ہیں:

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم وہدایت کی مثال دی ہے فرماتے ہیں کہ جیسے زمین پر بارش ہو تو زمین کے مختلف ٹکڑے ہو جاتے ہیں بعضے تو اچھے ٹکڑے ہوتے ہیں جو بارش کو قبول کرتے ہیں پھر پھل پھول اگاتے ہیں بعضے ایسے ہوتے ہیں جو تالاب کی شکل میں پانی کو سنبھال لیتے ہیں پھر اس پانی سے مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے اور بعضے ایسے ردی قسم کے علاقے ہوتے ہیں کہ نہ پانی کو سنبھالتے ہیں نہ کوئی پھل پھول ہی اگاتے ہیں بلکہ وہ سارے کا سارا ضائع کر دیتے ہیں فرمایا کہ اسی طرح یہ علم وہدایت جو اللہ کی طرف سے اترتی ہے بعضے تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں، بعضے خود فائدہ نہیں اٹھاتے کم از کم دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور بعضے ایسے ہوتے ہیں جو سر اٹھا کر اس ہدایت کی طرف دیکھتے ہی نہیں، قبول ہی نہیں کرتے اور وہ اس کو ضائع کر دیتے ہیں یا یہ زمین کے ٹکڑے جس طرح سے ہیں اسی طرح سے انسان کے قلوب کی یہ کیفیت ہے اس مضمون کو بھی حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت اچھے انداز کے ساتھ اپنے دو شعروں میں ادا کیا ہے فرماتے ہیں،

شمشیر نیک ز آہن بد چون کند کسے

کہ اگر لوہا ردی ہو تو کاریگر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو وہ اس سے اچھی تلوار نہیں بنا سکتا اس لیے اگر کوئی ناقص ہے، اس کے اندر کوئی انسانیت نہیں تو عقل مند آدمی اس کی کتنی ہی تربیت کیوں نہ کرتا رہے وہ انسان نہیں بنا کرتا، آگے مثال دیتے ہیں کہ بارش کی طبیعت میں کوئی کسی قسم کا اختلاف نہیں وہ باغ میں بھی برستی ہے اور وہ کلر اور

شوروالی زمین پر بھی برستی ہے لیکن باغ میں برستی ہے تو کیسے پھول اور پھل اگتے ہیں اور کلروالی زمین پر برستی ہے تو سوائے کانٹے دار جھاڑیوں کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تو یہ مثال جو یہاں دی گئی ہے تو اس میں بھی یہی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کے ساتھ وہ قلوب جن کے اندر صلاحیت ہے، جو نیک ہیں، اچھے ہیں وہ تو ان سے متاثر ہوں گے اور ان پر اچھے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور جنہوں نے اپنے دلوں کو فاسد کرلیا ہے، وہ کھیتی کے قابل نہیں رہے اب ان کے اندر یہ بیج ڈالا بھی جائے، باتیں ان قلوب کے اندر ڈالی بھی جائیں تو ضد میں آ کر وہ اس کے خلاف حرکتیں کر کے اپنے آپ کو زیادہ تو برباد کرلیں گے اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ان آیات کو بار بار پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں لیکن ان سے فائدہ کون اٹھائیں گے جو قدردان ہیں، شکرگزار لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ

تحقیق ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا پھر نوح نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کا

اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۵۹) قَالَ الْمَلَاُ مِنْ

غیر کوئی الٰہ، بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب کا (۵۹) وزیروں نے کہا

قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۶۰) قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ

نوح کی قوم میں سے بے شک ہم تجھے دیکھتے ہیں صریح گمراہی میں (۶۰) نوح نے کہا اے میری قوم! مجھ میں کوئی قسم کی غلطی نہیں لیکن میں بھیجا ہوا ہوں

مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶۱) اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ

رب العلمین کی طرف سے (۶۱) میں پہنچاتا ہوں تمہیں اپنے رب کے پیغامات اور میں تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں

وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۶۲) اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ

اور اللہ کی طرف سے میں جانتا ہوں وہ بات جو تم نہیں جانتے (۶۲) کیا تمہیں تعجب ہے کہ آگئی تمہارے پاس نصیحت

رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ وَ لِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۶۳)

تمہارے رب کی طرف سے تم میں سے ہی ایک آدمی پر تاکہ وہ آدمی تمہیں ڈرائے اور تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے (۶۳)

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَیْنٰهُ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ

ان لوگوں نے نوح کو جھٹلایا پھر ہم نے اس نوح کو نجات دے دی اور ان لوگوں کو نجات دے دی جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں، اور غرق کردیا ہم نے ان لوگوں کو

كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِیْنَ ۠ (۶۴) وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ

جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیات کو بے شک وہ اندھے لوگ تھے (۶۴) اور ہم نے بھیجا عاد کی طرف ان کے بھائی

هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ

ہود کو، ہود نے کہا کہ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارے لیے کوئی معبود نہیں

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۶۵) قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ

کیا تم ڈرتے نہیں ہو (۶۵) کہا ان وزیروں نے جو کافر تھے ہود کی قوم میں بے شک ہم البتہ تجھے دیکھتے ہیں

فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦٦﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ

نادانی میں اور بے شک ہم تجھے سمجھتے ہیں جھوٹوں میں سے (۶۶) ہود نے کہا کہ اے میری قوم! میرے اندر

بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٧﴾ اُبَلِّغُكُمْ

کسی قسم کی نادانی نہیں ہے اور لیکن میں رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں (۶۷) میں تمہیں پہنچاتا ہوں

رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿٦٨﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ

اپنے رب کے پیغامات اور میں تمہارے لیے خیرخواہ ہوں امانت دار ہوں (۶۸) کیا تمہیں تعجب ہے اس بات پر کہ آگئی

ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْٓا

تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے تم میں سے ایک آدمی پر تاکہ وہ آدمی تمہیں ڈرائے ، یاد کیجیے

اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ

جب اللہ نے بنایا تمہیں نائب نوح کی قوم کے بعد زیادہ کیا تمہیں تمہاری پیدائش میں ازروئے کشادگی کے

بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوْٓا

جثہ میں ، پس یاد کرو تم اللہ کے احسانات کو تاکہ تم فلاح پا جاؤ (۶۹) وہ کہنے لگے

اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ

کیا تو آیا ہے ہمارے پاس تاکہ ہم اللہ کی پوجا کرنے لگ جائیں اور چھوڑ دیں ان معبودوں کو جن کو ہمارے آباء پوجا کرتے تھے

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ

لے آ وہ چیز ہمارے پاس جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر تو سچوں میں سے ہے (۷۰) ہود نے کہا تحقیق واقع ہو گئی

عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ

تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے پلیدی اور غصہ، کیا تم جھگڑتے ہو میرے ساتھ ایسے ناموں کے بارے میں

سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ

جو رکھ لیے تم نے اور تمہارے آباء نے نہیں اتاری اللہ نے ان کے متعلق کوئی دلیل

فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَیْنٰهُ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ

پس تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں (۷۱) پھر ہم نے نجات دی ہود کو اور ان لوگوں کو جو ہود کے ساتھ تھے

بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ مَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۲﴾

اپنی طرف سے رحمت کے سبب سے اور ہم نے کاٹ دی جڑ ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے (۷۲)

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

شروع سورۃ سے دین کے اصول ثلاثہ کا ذکر آپ کے سامنے مختلف طریقوں سے آرہا ہے یعنی اثبات توحید اور اس کے ساتھ ساتھ رد شرک اور اثبات رسالت اور اثبات معاد اور برائی سے نفرت دلانا اور نیکی کی ترغیب دینا، حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا جو واقعہ ذکر کیا گیا تھا وہ اسی کشاکشی کو بیان کرنے کے لیے تھا وہ باتیں جو پہلے اصولی رنگ میں ذکر کی گئیں تھیں یہاں ان کو واقعات کے رنگ میں دھرایا جارہا ہے۔

اصول ذکر کرنے کے بعد واقعات ذکر کرنے کی وجہ:

یہ ہمیشہ قاعدہ ہوتا ہے جیسے کسی کو یوں سمجھائیں کہ بھائی جوا نہ کھیلا کرو ورنہ کنگال ہوجاؤ گے، لٹ پٹ جاؤ گے، جوا کھیلنے والے کبھی خوشحال نہیں ہوتے یہ تو ایک اصولی رنگ میں بات ہوگئی پھر کہیں کہ دیکھو فلاں شخص جو تھا مثلاً زید صاحب جائیداد تھا اور اسی جوئے کی وجہ سے لٹ پٹ گیا اور آج وہ ایک ایک لقمے کو ترس گیا، کوئی اس کا پرسان حال نہیں تو جو ایک واقعہ بیان کیا ہے تو اس کے ساتھ اس اصول کا گویا کہ عملی نقشہ سامنے آگیا کہ جو اصول ہم آپ کے سامنے بیان کررہے ہیں اس کا اگر عملی نمونہ دیکھنا ہے تو فلاں شخص کو دیکھ لو، اس نے اس بات کی خلاف ورزی کی تھی نتیجہ یہ نکلا ہے اور یہ ہم جو آپ کے سامنے کامیابی کے اصول ذکر کررہے ہیں ان کا خیال کرو دیکھو فلاں شخص بالکل محتاج تھا اس کے پاس کچھ نہیں تھا لیکن اس نے ہمارے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کیا آج کتنا عزت کے ساتھ وقت گزار رہا ہے تو پہلے اصول بتائے جاتے ہیں کہ عزت حاصل کرنے کے یہ اصول ہیں، عزت کے ساتھ وقت گزارنے کا یہ طریقہ ہے پھر مثال اگر ساتھ دے دی جائے کہ فلاں شخص کو دیکھ لو وہ پہلے کیا تھا اس نے ہماری بتائی ہوئی باتوں پر عمل کیا، ہمارے بتائے ہوئے اصولوں پر چلا تو اس نے کس طرح سے عزت حاصل کرلی تو انسان کی فطرت ہے کہ واقعات سے یہ زیادہ متاثر ہوتا ہے اس لیے وعظ و نصیحت کے اندر واقعات متعدد بار انسان

لایا کرتا ہے کہ مثالوں کے ساتھ اور واقعات کے ساتھ وہ باتیں انسان کے ذہن میں اچھی طرح سے بیٹھ جاتی ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں گزشتہ امتوں کے واقعات بہت کثرت کے ساتھ بیان کیے ہیں، ان واقعات کے ساتھ ان اصولوں کی تائید ہوتی ہے جو قرآن کریم نے بنیادی مقاصد کے تحت بیان کیے ہیں۔

دنیا میں بت پرستی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے شروع ہوئی:

بعض تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کی آٹھویں پشت میں ہوئے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں سب لوگ ایک ہی دین پر تھے جو آدم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو سکھایا تھا، آہستہ آہستہ خواہشات کے اختلاف کے ساتھ فسادات بڑھتے چلے گئے حضرت نوح علیہ السلام تک پہنچتے پہنچتے قوم کچھ کفر میں کچھ شرک میں مبتلاء ہوگئی تھی اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے وہ پانچ بت سورۃ نوح کے اندر مذکور ہیں جن کی وہ قوم پوجا کرتی تھی "وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا" یہ پانچ ان کے بت ہیں، یہ پانچ بتوں کو پوجنے والے تھے جن کے نام یہاں ذکر کیے گئے ہیں۔

اور بخاری شریف کی ایک روایت میں آتا ہے کہ یہ سارے کے سارے اللہ کے مقبول بندے تھے جن کا نام یہاں قرآن میں ذکر کیا گیا ہے، یہ سارے کے سارے صالحین تھے اور قوم ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور جس وقت یہ مر گئے تو مرنے کے بعد شیطان نے پٹی پڑھائی کہ ان کی تصویریں بنا کر سامنے رکھ لو یہ یاد رہیں گے اور ان کے یاد رہنے کی وجہ سے تمہیں نیکی کی توفیق ہوتی رہے گی تمہارا پیر، تمہارا استاذ جس وقت تمہارے سامنے متشکل ہوگا تو تم اس کو دیکھ کر کچھ حیاء کرو گے اور تم نیکی کے کام کرتے رہو گے اس لیے ان کے بت بنوا لیے، پتھروں پر ان کی تصویریں بنالیں اور آہستہ آہستہ لوگوں نے ان کو سلام کرنا شروع کیا اور جھکنا شروع کیا، عقیدہ جو تھا بدلتے بدلتے سب کچھ ہی انہیں کے متعلق ہو گیا انہی کو الٰہ بنا لیا گیا، انہی کو معبود بنا لیا گیا گویا کہ یہ مقبول بندے تھے جن کے مرنے کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے ان کو اللہ کے نائبین قرار دے کر خدائی اختیارات ان کو دے دیے اور ان کی پوجا شروع کر دی۔

تو حضرت نوح علیہ السلام نے اس قوم کے سامنے اپنی تبلیغ کی جو ابتداء کی تو سب سے پہلے اللہ کی توحید کو بیان کیا تو ان واقعات میں رسالت کا مسئلہ بایں معنی آ گیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو! میں نے نوح کو بھیجا تھا معلوم ہو گیا کہ آج جو میں نے رسول بھیجا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے پہلے سے اللہ تبارک وتعالیٰ اسی طرح سے

رسولوں کو بھیجتے ہیں۔ مسئلہ رسالت اس طرح سے ثابت ہو گیا پھر وہ رسول جو آتا ہے تو سب سے پہلے توحید کو بیان کرتا ہے تو معلوم ہو گیا کہ اول سے لے کر اس وقت تک ہر رسول کا متفق علیہ مسئلہ اللہ کی توحید ہے اس لیے اگر تمہارے سامنے محمد رسول اللہ ﷺ توحید کی تقریر کر رہے ہیں، توحید کا مسئلہ بیان کر رہے ہیں تو یہ مسئلہ آج کا نہیں ہے، جو نبی بھی آیا اس نے یہی مسئلہ بیان کیا اور پھر ہر نبی نے اپنے بیان میں رد شرک بھی کیا اور ہر نبی نے اپنی تقریر کے اندر آخرت کا عذاب بھی یاد دلایا، دیکھو! تینوں باتیں آگئیں واقعہ کے تحت رسالت بھی آگئی، توحید بھی آگئی، معاد بھی آگیا اور توحید اور رسالت کے بارے میں جو ان لوگوں کے شبہات تھے ان کو بھی اس نبی نے رد کیا اور پھر ماننے والوں کا اچھا انجام بھی سامنے واقعہ کی صورت میں آگیا نہ ماننے والوں کا معذب اور برباد ہونا بھی ایک واقعہ کی صورت میں آگیا تو یہ ترغیب اور ترہیب کا پہلو بھی مکمل ہو گیا۔

گذشتہ امتوں کے واقعات میں امتِ محمدیہ کے لیے سبق ہے:

اور پھر سرورِ کائنات ﷺ کے لیے اور آپ کے ماننے والوں کے لیے بھی ان واقعات میں سبق ہے کہ پہلے انبیاء ﷩ نے اپنی قوموں کو کس طرح سے سمجھایا تھا اور اس کے اوپر کتنی محنت کی تھی اور قوموں نے کس طرح سے بداخلاقی کے ساتھ اور بے رخی کے ساتھ ان کے ساتھ معاملہ کیا تھا، نصیحت کرنے والوں کو جھٹلایا تھا، ان کو برا بھلا کہا تھا، ان کی بات وہ مانتے نہیں تھے حتیٰ کہ ان کو تکلیف تک پہنچاتے تھے، تحقیر ان کی کرتے تھے لیکن جو اللہ کے پیغمبر ہوتے ہیں وہ سب کچھ برداشت کرتے ہیں اور اپنی قوم اور برادری کی ہمدردی میں ان کو مسلسل سمجھاتے ہی رہتے ہیں تو اس میں حضور ﷺ کے لیے بھی نمونہ ہے کہ تبلیغ کے میدان میں محنت کس طرح سے کرنی پڑتی ہے اور آپ کے ماننے والوں کے لیے بھی نمونہ ہے کہ حق کو قبول کرنے کے بعد ان چوہدریوں کے ساتھ، ان وڈیروں کے ساتھ کس طرح سے ٹکر ہوا کرتی ہے اور یہ چوہدری اور وڈیرے یہ کس طرح سے تحقیر کیا کرتے ہیں اور کس طرح سے برا بھلا کہتے ہیں ان باتوں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

پچھلی تاریخ یہی ہے کہ آخر انجام جو ہوتا ہے وہ انہیں مسکینوں غریبوں کا، حق قبول کرنے والوں کا اچھا ہوتا ہے اور یہ وڈیرے اور یہ چوہدری سب اللہ کے عذاب میں دنیا میں بھی گرفتار ہو کر ذلیل ہوتے ہیں اور پھر آخرت کا عذاب ہے ہی ان کے لیے، ان واقعات کے دھرانے کے ساتھ ان تمام لوگوں کے لیے اس قسم کے سبق بھی موجود ہوتے ہیں، سرکشوں کے لیے تنبیہ ہے اور نیکوکاروں کے لیے جو قوم کے چوہدریوں کے سامنے دبے ہوئے ہوتے

ہیں اور قوم کے چوہدری ان کی تحقیر کر کے ان کو پریشان کرتے ہیں ان کے لیے تسلی ہے کہ پچھلی ساری تاریخ اسی طرح سے چلی آتی ہے کہ حق قبول کرنے والوں کے ساتھ دنیا میں جاہ وجلال رکھنے والوں نے ہمیشہ یہی معاملہ کیا ہے لیکن جب حق والے حق پر جمے رہتے ہیں اور دوسرے ضد میں آ کر تکذیب کرتے رہتے ہیں نتیجہ پھر سامنے ہے کہ پھر جو ماننے والے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بچا لیتا ہے اور جو تکذیب کرنے والے ہوتے ہیں اللہ ان کو برباد کر دیتے ہیں بار بار واقعات دھرا کے یہ اصول آپ کے ذہن کے اندر اتارے جائیں گے۔

تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی دین کے منادی تھے:

اسی سلسلے میں پہلا واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کا آ رہا ہے اور دوسرا واقعہ حضرت ہود علیہ السلام کا آ رہا ہے، انبیاء علیہم السلام چونکہ ایک ہی حق کے منادی ہیں، اعلان کرنے والے ہیں، دین اللہ کے نزدیک ایک ہی ہے، دین واحد ہے، سب انبیاء علیہم السلام اس دین کے مبلغ ہیں وقتی طور پر کچھ احکام بدل جائیں وہ ایک علیحدہ بات ہے وہ فروعی احکام ہوتے ہیں لیکن جہاں تک نظریات اور عقیدے کا تعلق ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام نبی ایک ہی عقیدے اور ایک ہی نظریے کے تھے اس لیے ان کی تبلیغ میں اور ان کی اس نشر واشاعت میں آپ کو بالکل یگانگت اور یک جہتی معلوم ہوگی کہ جیسا ہی تقریر کرنے کا طریقہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہے ویسا ہی تقریر کا طریقہ حضرت ہود علیہ السلام کا ہے اور پھر کفر کے اندر بھی اسی طرح سے جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے مدمقابل اگر شکوک شبہات پیدا کرتے تھے اور اکڑتے تھے اسی طرح سے حضرت ہود علیہ السلام کے مقابلے میں آنے والے بھی اسی قسم کے شکوک پیدا کرتے تھے، ہر قوم کو دیکھتے چلے جاؤ گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ حق کا سلسلہ کس طرح سے مسلسل ہے اور یہ نظریات جو آج واضح کیے جارہے ہیں تمام انبیاء علیہم السلام انہیں کے مبلغ تھے یہی مختلف امتوں کے واقعات آپ کے سامنے آ رہے ہیں پہلا واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہے اس کے اوپر نظر ڈالتے چلیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت:

البتہ تحقیق، بے شک ضرور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف "فقال یقوم" نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو کیسے محبت کے ساتھ اے میری قوم! کہہ کے خطاب کیا کہ میں تمہارے میں سے ہوں تم میں سے ہوں تم مجھے جانتے بوجھتے ہو، میرے حالات سارے کے سارے آپ کے سامنے ہیں، اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، کسی دوسرے کو معبود نہ سمجھو، عبدیت کا، بندگی کا، نیازمندی کا تعلق جتنا ہے صرف اللہ سے ہونا چاہیے اور اگر یہ میری بات نہیں مانو گے "اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ" میں بڑے دن کے

عذاب کے بارے میں تم سے اندیشہ کرتا ہوں کہ کسی بڑے دن کے عذاب میں نہ پھنس جاؤ، اس بڑے دن کے عذاب سے آخرت کا دن بھی مراد ہوسکتا ہے قیامت کے دن کا عذاب اور جو دنیا میں عذاب آیا کرتا ہے وہ بھی مراد ہوسکتا ہے یہ انہوں نے تبلیغ کی، اس اصول کو انہوں نے ذکر کیا۔

اب یہ دیکھو! چونکہ یہ تو آپ کے سامنے ایک نقل آرہی ہے اس کا صرف اتنا ہی مطلب نہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے یوں اعلان کیا تو قوم نے یوں کہہ دیا اور چند منٹوں میں فیصلہ ہوگیا طوفان آگیا اور سارے کے سارے غرق ہوگئے جیسے یہاں پانچ چھ سطروں میں واقعہ کو ذکر کردیا گیا یہ کوئی اتنا سا وقت نہیں لگا، قرآن کریم آپ کے سامنے واضح کرے گا "فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا" کہ حضرت نوح علیہ السلام پیغمبرانہ شان کے ساتھ اپنی قوم میں پچاس سال کم ایک ہزار سال ٹھہرے، کتنے ہوگئے ساڑھے نوسو سال، یہ حضرت نوح علیہ السلام کی پیغمبرانہ عمر ہے چالیس سال کی عمر میں اگر نبوت ملی ہو تو اگر وہ ڈال لی جائے تو نوسو نوے ہوگئے اور پھر طوفان کے بعد بھی حضرت نوح علیہ السلام زندہ رہے ہیں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سوڈیڑھ سو سال پھر بھی زندہ رہے ہیں تو پھر گیارہ ساڑھے گیارہ سو سال عمر ہوتی ہے۔

تو یہ ساڑھے نوسو سال قوم کے سامنے حضرت نوح علیہ السلام کا تبلیغ کا زمانہ ہے اور اسی اصول کو ذکر کرتے رہے کہ شرک سے باز آجاؤ، توحید اختیار کرلو، توحید کا راستہ نجات کا راستہ ہے، شرک کا راستہ ہلاکت کا راستہ ہے بار بار اس بات کو سمجھاتے ہیں جس طرح سے سورۂ نوح میں اس کی کچھ تفصیل آئے گی کہ نبی کتنے دردِ دل کے ساتھ اپنی قوم کے پیچھے پڑتا ہے اور قوم کو سمجھانے کے لیے دن رات، صبح شام کتنی محنت کرتا ہے لیکن اتنی محنت کے نتیجے میں جن کو دنیا کے اندر مال، دولت، عزت، جاہ حاصل تھی ان کے آگے کیا خیالات تھے وہ کہنے لگے، قوم میں سے جو وڈیرے تھے وہ کہنے لگے "إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ" ہم تو تجھے کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں تو تو بہت بھٹک گیا جس نے باپ دادے کا طریقہ چھوڑ دیا، خاندانی روایات کو چھوڑ دیا وہ بھی کوئی آدمی اچھا ہوسکتا ہے، وہ اپنی خاندانی روایات پر، باپ دادا کے طریقے پر اڑے ہوئے تھے ہم تجھے صریح غلطی میں دیکھتے ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کہتے کہ "یٰقوم" اور وہ "ضلٰل مبین" کا لفظ بولتے ہیں، کیسا گستاخانہ لفظ ہے حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے لب ولہجے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مبلغ کی شان:

مبلغ کی شان یہی ہوتی ہے کہ آگے کوئی جاہل اگر جہالت کرے تو اسی وقت غصے میں آکر ترکی بترکی

جواب نہ دینا شروع کردے جس طرح سے آپ لوگوں نے آج کل ایک فلسفہ بنالیا ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے ہونا چاہیے آج کل تو آپ لوگوں کا یہی فلسفہ ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو کہ اگر ذرا سی آگے سے بات کی ہے تو اسے دس گنی کر کے آگے کہو، یہ غلط فلسفہ ہے، مبلغین کے لیے یہ فلسفہ نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام کا یہ طریقہ نہیں ہے، قوم آگے سے جہالت کرتی ہے، پتھر مارتی ہے، برا بھلا کہتی ہے لیکن نبی کے لب و لہجے میں فرق نہیں آتا، حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں کہ اے میری قوم "لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ" میرے اندر کوئی گمراہی نہیں، کوئی غلطی نہیں میں تو رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں، تم ہو اپنے اباؤ اجداد کے طریقے کے پابند، تم ہو خاندانی روایات کو پوجنے والے، میں کسی بڑی ہستی کی طرف سے آیا ہوں وہ جو کہتا ہے میں تو وہ پہنچاتا ہوں اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام آتا ہے میں وہ پہنچا رہا ہوں، میں کوئی کسی کے باپ کی طرف سے استدلال نہیں کر رہا ہوں، دادے کی بات نہیں کر رہا ہوں، کوئی خاندانی روایات کا حوالہ نہیں دے رہا، میں تو رب العالمین کا رسول ہوں اور تمہیں اسی کے پیغامات پہنچاتا ہوں "اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ" میں اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچاتا ہوں "وانصح لکم" خیال کرلو میں تمہارا خیر خواہ ہوں اس میں میرا کوئی کسی قسم کا فائدہ نہیں "وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ" میں اللہ کی طرف سے ایسی باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، بات وہی آگئی کہ میرے پاس علم الٰہی ہے، اللہ کی طرف سے میرے پاس علم آگیا اور تم ہو "لا تعلمون" کا مصداق، تمہارے پاس علم نہیں ہے قاعدے کی بات ہے کہ جس کے پاس علم ہو اس کی بات ماننی چاہیے جاہلوں کا فرض ہے کہ علم والوں کے پیچھے لگیں اس لیے میری بات کو مانو کیونکہ میں علم کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔

نبی اور رسول کو انسانوں میں سے ہی بنانے کی حکمت:

"اَوَعَجِبْتُمْ" پھر یہ تمہیں تعجب ہے کیونکہ وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ "مَاهُوَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا" یہ تو ہم جیسا انسان ہے، یہ تو تمہارے مقابلے میں بڑا بننا چاہتا ہے تاکہ سارے اس کو مان لو اور سارے اس کے پیچھے لگ جاؤ چوہدری یہ بن جائے، ہماری چودراہٹوں کو نقصان پہنچا کر خود چوہدری بننا چاہتا ہے "يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ" ان کو اپنی کرسی اور اپنے اقتدار کی فکر پڑی ہوئی تھی کہ اگر نوح علیہ السلام کا کلمہ پڑھ لیا تو ہم سارے چھوٹے ہو جائیں گے اور نوح علیہ السلام بڑا ہو جائے گا اور ہماری بڑائی ختم ہو جائے گی اس قسم کی باتیں کرتے تھے کہ ایک انسان

ہے، ہماری طرح کھاتا ہے، پیتا ہے یہ کہاں سے اللہ کا پیغمبر بن کے آ گیا، کیا اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو نہ کھانے کو ملے، نہ پہننے کو ملے، نہ رہنے کے لیے کوئی مکان شان دار ہو، اللہ تعالیٰ نے نعمتیں ہمیں دے رکھی ہیں، خوش پوشاک ہم ہیں، خوش خوراک ہم ہیں، بڑے بڑے ڈیرے ہمارے ہیں، چوہدراہٹ ہمیں حاصل ہے، مال ہے، دولت ہے، جاہ ہے تو اللہ نے اگر کسی کو پیغمبر بنانا ہوتا یا اپنی باتیں پہنچانے والا بنانا ہوتا تو ہمیں نہ بناتا؟ یہ مسکین ملا تھا اللہ کو پیغمبر بنانے کے لیے، اس قسم کی باتیں وہ کرتے تھے یہی تکبر اور یہی بڑائی تھی ان کی۔

جیسے قرآن کریم میں سرور کائنات ﷺ کے مقابل جو لوگ تھے ان کا قول بھی نقل کیا گیا ہے "لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ" مشرکین کہتے تھے کہ یہ اگر اللہ کی کتاب ہے قریتین سے مکہ اور طائف مراد ہیں، مکہ اور طائف میں کتنے بڑے بڑے رئیس اور کتنے بڑے بڑے آدمی موجود ہیں تو دونوں شہروں میں کسی بڑے آدمی پر یہ قرآن کیوں نہیں اترا؟ ایسے مسکین پر اترنا تھا جو یتیم ہے، جس کے پاس کوئی کسی قسم کی جائیداد نہیں، اللہ کا قرآن اترنا تھا تو اسی پر اترنا تھا یعنی وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح سے دنیا کا مال و دولت ہمیں حاصل ہے اگر دین کوئی چیز ہوتی تو یہ جاہ و جلال بھی ہمیں حاصل ہوتا یہ ان کے حصے میں کیسے آ گیا، یہ بڑا بننے کے لیے اور اس راستے سے اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں کیا تمہیں تعجب ہے کہ تمہارے پاس نصیحت آ گئی تمہارے رب کی طرف سے تم میں سے ہی ایک آدمی پر، اس میں کونسی تعجب کی بات ہے کہ تم میں سے ایک آدمی نصیحت لے کر آ گیا تمہیں تو شکر ادا کرنا چاہیے، تمہاری زبان بولتا ہے، تمہارے جیسے جذبات رکھتا ہے، تم اس کے آگے پیچھے کو جانتے ہو، کوئی اور مخلوق آ جاتی اور آ کر تمہیں سمجھاتی تم یہ کہتے کہ یہ تو اور مخلوق ہے ہم اور ہیں اس کو کیا پتہ ہماری کیا ضرورتیں ہیں، اگر سمجھانے کے لیے فرشتہ آ جاتا تو لوگ یہ کہتے کہ اس کو نہ کھانے کی ضرورت، نہ پینے کی ضرورت، نہ پہننے کی ضرورت، نہ رہنے کے لیے مکان کی ضرورت، نہ اس کی بیوی، نہ اس کے بچے اور ہم ان سب کاموں میں پھنسے ہوئے ہیں، یہ کہتا ہے نماز پڑھو یہ تو فارغ ہے اس کے ذمے تو کوئی کام ہی نہیں ہے اور ہم نے ہزاروں کام کرنے ہیں ہم نماز کس طرح سے پڑھیں؟ وہ کتنا موٹا عذر کر دیتے، اس کی نہ بیوی، نہ بچے، نہ کاروبار، نہ جائیداد، نہ کھانے کی ضرورت، نہ پینے کی ضرورت، نہ پہننے کی ضرورت، اسے کیا پتہ کہ دنیا میں کیسے رہنا ہے جیسے اب آپ بھی کسی کو نصیحت کریں تو کہتے ہیں مولوی صاحب تمہیں کیا پتہ کہ دنیا کا کاروبار کس طرح سے چلتا ہے، کاروباری تو ہم ہیں، ہمیں پتہ ہے ہماری کیا مجبوریاں ہیں لیکن اگر کاروباری ہی کاروباری آدمی کو سمجھائے تو پھر کیا عذر؟

دنیا کی حالت پر نظر ڈالو کوئی محکمہ ایسا نہیں کہ جس محکمے کے اندر دیانت دار آدمی موجود نہ ہوں، ٹھیک ہے کم ہوں گے لیکن ہوں گے ضرور، پولیس آپ کے نزدیک سب سے زیادہ گندا محکمہ ہے لیکن پولیس کے اندر بھی ایسے ایسے نیک آدمی موجود ہیں جو کسی سے ایک پیسہ رشوت کا نہیں لیتے اور وہ اسی تنخواہ پر گزارا کریں گے اب اگر یہ سپاہی دوسرے کو کہے گا کہ بھائی رشوت نہ لے تو پولیس والا آگے کیا عذر کر سکتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت ہے، کوئی سپاہی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم اپنے حالات کے اعتبار سے مجبور تھے، اللہ تعالیٰ کہے گا یہ بھی تو تمہارے ساتھ تھا یہ کیوں نہیں مجبور ہوا۔

جس کا گھوڑا رشوت کا گھاس نہیں کھاتا وہ خود کیا رشوت کھائے گا؟

ہمارے مولانا عبدالصمد صاحب قصہ سنایا کرتے ہیں، ان کا جو پیر تھا سنا ہے کہ وہ پولیس میں کوئی افسر تھا، تھانیدار تھا یا کوئی دوسرا افسر تھا، کسی نے ان کے خلاف درخواست دے دی کہ اس نے فلاں واقعہ میں رشوت لی ہے، اوپر سے تحقیقات کرنے والے افسر آگئے، انگریزوں کے زمانے کی بات ہے، اوپر والے رشوت کی تحقیق کرنے آگئے اس سے آکر پوچھا کہ آپ نے رشوت لی ہے تو یہ کہنے لگا کہ اس کا جواب میں یوں دیتا ہوں کہ یہ میرا گھوڑا کھڑا ہے اس کو تین دن تک بھوکا رکھو اس کو چارہ نہ ڈالو، اور پھر رشوت کے پیسوں کا گھاس لا کر اسے ڈالو، اگر یہ رشوت کا گھاس کھا گیا تو آپ سچے اور میں جھوٹا اور اگر میرا گھوڑا بھی رشوت کا گھاس نہ کھائے تو پھر میرے اوپر کیا توقع ہے کہ میں رشوت کھاتا ہوں، چنانچہ ایسے انہوں نے تجربہ کیا کہ رشوت کا گھاس لا کر ڈالا اور گھوڑے نے منہ نہیں لگایا تو مقدمہ خارج ہو گیا کہ جس کا گھوڑا رشوت کا گھاس نہیں کھاتا وہ خود کسی سے رشوت کس طرح کھائے گا۔

اب اس قسم کے لوگ جو موجود ہیں تو کوئی پولیس والا اللہ کے دربار میں عذر کرے کہ جی ہم اپنے حالات کی وجہ سے مجبور تھے، دس تھانیدار اللہ تعالیٰ سامنے کھڑے کر دے گا کہ یہ بھی تو تمہارے محکمے میں تھے، یہ کیوں نہیں مجبور تھے، پٹواریوں میں دیکھو تو ان میں بھی دیانت دار موجود ہیں، چھوٹے سے لیکر بڑے افسروں تک جو بھی محکمہ ہے ٹھیک ہے کہ زیادہ اس میں خراب ہوں گے لیکن کچھ نہ کچھ اچھے ضرور ہیں اور انہی کے ذریعے سے اتمام حجت ہوتا ہے اس محکمے والوں پر، وہ کہیں کہ ہم مجبور تھے ہم ایسے نہیں کر سکتے تھے تو دوسرے سامنے کھڑے ہوں گے کہ یہ بھی تو تمہارے پیشے کے لوگ ہیں یہ کیوں نہیں کرتے تھے، اس لیے کوتاہی تمہاری ہے کہ تم نے فکر نہیں کیا ورنہ فکر کرتے تو تم

بھی ان کی طرح زندگی گزار سکتے تھے تو ہم پیشہ، ہم قوم، ہم علاقہ آدمی جس وقت دوسرے کو سمجھایا کرتا ہے تو کسی کے پاس عذر نہیں ہوتا۔

اب حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی بھی تھی، اولاد بھی تھی، اور باقی درجے جو ہوتے ہیں سارے تھے اور وہ جس وقت کہتے تھے کہ زندگی یوں گزارو، یوں نہ گزارو تو اب کسی کے پاس کیا عذر ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو سمجھانے کے لیے ہمیشہ انسان ہی بھیجے ہیں کہ وہی انسانوں کے جذبات سے آگاہ ہو سکتے ہیں، وہی انسانی ضرورتوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں اس لیے دوسرا آدمی کوئی آگے سے عذر نہیں کر سکتا، انسان کے لیے اگر نمونہ بن سکتا ہے تو انسان ہی بن سکتا ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام ہمیشہ سے انسانوں میں سے آئے، آدمیوں میں سے آئے، بشروں میں سے آئے، اور ان کا یہ جو اعتراض ہوتا تھا کہ اللہ کا نبی بشر نہیں ہونا چاہیے اس کو غلط قرار دیا، کیا تمہیں تعجب ہے کہ آ گئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے تمہیں میں سے ایک آدمی پر تا کہ وہ تمہیں ڈرائے اور تا کہ تم تقویٰ اختیار کرو اور تا کہ تم رحم کیے جاؤ۔

"فَكَذَّبُوْهُ" وہ حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلاتے ہی رہے یہ ان کے اسی فعل کا دوام ہے یعنی پہلے سے جو انہوں نے شغل اختیار کر لیا تھا وہی اختیار کیے رہے "فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ" پھر واقعہ مفصل آپ کے سامنے سورۂ ہود میں آئے گا کہ پھر کس طرح سے حضرت نوح علیہ السلام سے اللہ نے کشتی بنوائی پھر کیسے طوفان آیا اور حضرت نوح علیہ السلام کو اور ان کے ساتھیوں کو اللہ نے کشتی میں نجات دے دی "وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا" ہم نے غرق کر دیا ان لوگوں کو جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا بے شک وہ اندھے لوگ تھے، کتنا ہی ان کو حق دکھایا گیا لیکن انہوں نے دل کی آنکھیں نہیں کھولیں تو جب وہ ایسے اندھے تھے تو ان کو باقی کیا رکھنا تھا، سارے کے سارے غرق کر دیے، ڈبو دیے، ختم کر دیے، واقعہ کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ ہود میں آ رہی ہے آگے اس میں زیادہ مفصل واقعہ آئے گا۔

قوم عاد کا تعارف:

"وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا" اور پھر حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد یہ عاد کا قصہ آ گیا، یہ نوح علیہ السلام کی کوئی چھٹی نسل میں تھے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد جتنے لوگ پھیلے تھے نوح علیہ السلام کے طوفان میں سارے غرق

ہو گئے تھے سوائے ان کے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے تھے، کشتی میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی تعداد جو روایات میں ہے کہ وہ کتنے تھے، وہ اسی ہیں چالیس مرد اور چالیس عورتیں لیکن اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ اولاد صرف حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں کی چلی ہے حام، سام، یافث اور اب انسانی آبادی جتنی ہے وہ ساری کے ساری حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں کی ہے گویا کہ حضرت نوح علیہ السلام آدم ثانی ہیں جس طرح سے سارے انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد اس طرح سے موجودہ آبادی جتنی ہے وہ ساری کی ساری نوح علیہ السلام کی اولاد ہے تو ان کی چھٹی ساتویں پشت کے اندر یہ قوم تھی جن کا یہ ذکر کیا جا رہا ہے۔

عاد ایک شخص کا نام ہے پھر اس کی اولاد جو پھیلی تو پھر قبیلے کو بھی عاد کہنے لگ گئے اور یہ بڑے قد آور اور بڑے تن آور تھے جس طرح سے آپ دیکھتے ہیں کہ سارے انسان ہی ہیں، سارے پاکستان میں رہنے والے ہیں لیکن کسی علاقے کے لوگ چھوٹے چھوٹے قد والے ہوتے ہیں، کسی علاقے کے لوگ بڑے بڑے قد والے ہوتے ہیں، میانوالی کے جو اصل باشندے ہیں ان کو دیکھو گے تو بڑے لمبے لمبے قد آور اور دوسرے علاقوں کے بسا اوقات چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور اگر بنگال کی طرف چلے جاؤ گے تو بالکل ہی چھوٹے چھوٹے سے تو یہ جو لوگ تھے یہ بہت ہی قد آور تھے، بڑے ڈیل ڈول والے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بدن بڑا قوی دیا تھا قوت والے تھے تو آس پاس کے جتنے لوگ تھے ان سب کے اوپر ان کو غلبہ حاصل تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جس وقت حضرت ہود علیہ السلام نے ان کو عذاب سے ڈرایا تو یہ کہتے کہ "من اشد منا قوۃ" ہم سے زیادہ زور بھی کسی میں ہے جو ہمارے اوپر چڑھ آئے گا، کون ہمیں دبا سکتا ہے یہ "من اشد منا قوۃ" انہیں کا نعرہ تھا، ہم سے زیادہ کون ہے از روئے قوت کے، سب سے زیادہ قوت ہم میں ہے تو اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو ہوا کے ذریعے سے ہلاک کر دیا تھا؛ جس طرح سے تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کا حال:

"وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا" عاد کی طرف ان کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا، دیکھو! الفاظ بالکل ملتے جلتے ہیں جب ان کا ترجمہ اور تفسیر ہو گی پھر بار بار کہنے کی ضرورت نہیں انبیاء علیہم السلام کا وعظ ایک ہی جیسا ہے کہا ہود علیہ السلام نے کہ اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، کیا تم ڈرتے نہیں ہو، کہا ان چوہدریوں نے، ان وڈیروں نے جنہوں نے کفر کیا تھا اسی کی قوم میں سے، مگر جب لیتے ہیں حق کے ساتھ تو عموماً

اسی قسم کے لوگ ہی لیا کرتے ہیں جن کو دنیا کے اندر جاہ وجلال حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ تقسیم ہی ایسی ہے کہ جس کو دنیا میں مال و دولت، جاہ وعزت مل گئی حق سے وہ محروم ہوگیا اکثر و بیشتر یہ لوگ اپنی خواہشات کے بندے ہوتے ہیں، حق چونکہ ان کی خواہشات کے ساتھ ٹکراتا ہے اور یہ اپنی خواہش کو چھوڑ نہیں سکتے اس لیے خواہشات کے پیچھے لگ کر حق کی مخالفت کرتے ہیں اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوا ہے اور غرباء کی، مساکین کی کوئی خواہش ہی نہیں ہوتی اس لیے جس وقت حق ان کے سامنے آتا ہے تو صاف دل ہوتے ہیں، بات جلدی سے ان کی سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ مان لیتے ہیں انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے والے اکثریت اسی طرح سے مساکین کی ہوتی ہے۔ ان میں تکبر نہیں ہوتا، خواہشات کا غلبہ نہیں ہوتا اس طرح سچی بات ماننا ان کے لیے آسان ہوتا ہے اور ان وڈیروں کی خواہشات ڈھیروں ہوتی ہیں تو جب دیکھتے ہیں کہ اگر ہم نے مان لیا تو ہم سے یہ لذت چھوٹ جائے گی، یہ مزا چھوٹ جائے گا تو عیش اور مزے کے پیچھے مرتے ہیں پھر وہ حق کو قبول نہیں کرتے۔

تاریخ یہی بتاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں جب بھی آئے ہیں تو اسی قسم کے وڈیرے ہی آئے ہیں کہاان لوگوں نے جو آبرودار تھے، جنہوں نے کفر کیا تھا ان کی قوم میں سے بے شک ہم تجھے دیکھتے ہیں بے عقلی میں، تو تو بے عقل ہے، تجھے تو عقل ہی نہیں ہے اس طرح سے آج بھی دین دار طبقے کو لوگ کہتے ہیں کہ یہ احمق ہیں ان کو کیا عقل ہے، کمانا یہ نہ جانیں، جائیداد بنانی یہ نہ جانیں اور کوئی ان کے پاس کسی قسم کی چیز نہیں ہے تو آج بھی اسی طرح سے نادان بے وقوف اور گمراہ اس قسم کے لفظ ان کے لیے بولے جاتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں حق کی آواز کو بلند کرنے والے بے شک البتہ ہم تجھے دیکھتے ہیں نادانی میں "وَاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ" اور بے شک ہم تجھے سمجھتے ہیں چھوٹوں میں سے، تو جو کہتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ کے فرشتے میرے پاس آتے ہیں ہمیں تو یقین نہیں آتا کہ ایسا ہوگا، بے عقلی کی باتیں ہیں، تیری اب عقل ماری گئی ہے، ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں جو تو کرتا ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! مجھے کسی قسم کی نادانی نہیں، میرے اندر کوئی بے عقلی نہیں لیکن میں رسول ہوں رب العالمین کا جیسے نوح علیہ السلام کا اعلان تھا ویسے ہی ان کا ہے، پہنچاتا ہوں تمہیں اپنے رب کے پیغامات اور میں تمہارے لیے خیر خواہ ہوں اور دیانت دار ہوں میں تمہارے ساتھ کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا اللہ کی طرف سے جو حق آرہا ہے میں بغیر کمی بیشی کے تم تک پہنچا رہا ہوں، اپنی طرف سے میں اس میں کچھ آمیزش نہیں

کرتا جو دیانت کے خلاف ہو، امانت کے خلاف ہو، میں بہت امانت دار ہوں، دیانت دار ہوں، میں تمہارا خیر خواہ ہوں میری باتوں کو توجہ سے سنو۔

ان کو بھی وہی اعتراض تھا کہ ہم میں سے ایک آدمی کو یہ کیسی چیز حاصل ہو گئی، کیا تمہیں تعجب ہے اس بات پر کہ آ گئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے تم میں سے ایک آدمی پر تا کہ وہ تمہیں ڈرائے، یاد کرو جب بنایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلفاء قوم نوح کے بعد جس سے معلوم ہوا کہ ان کو قوم نوح کا واقعہ یاد تھا کہ پہلے یہ قوم بڑی ترقی یافتہ تھی اور یہ غرق ہو گئی اور اس کے بعد یہ اقتدار ہمیں حاصل ہو گیا اتنی سی باتیں تو چلتی پھرتی معلوم ہوتی ہیں جیسے یہاں ایک حکومت آتی ہے تو اس کو پتہ ہوتا ہے کہ ہم سے پہلے فلاں حکومت تھی اور اپنی غلطیوں کے نتیجے میں وہ کس طرح سے اپنے انجام کو پہنچی اور اب یہ حکومت کر رہے ہیں تو جب ان کے بعد دوسرا آئے گا تو اس کو ان کے حالات سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ وہ بھی اسی طرح سے حوالہ دیتے تھے کہ پہلے نوح علیہ السلام آئے تھے اور انہوں نے قوم کو سمجھایا تھا یہی باتیں کہیں تھیں جو میں کہہ رہا ہوں لیکن وہ نہیں مانے تو دیکھو! ترقی یافتہ قوم کس طرح سے صفحہ ہستی سے مٹا دی گئی کہ آج ان کا نام و نشان بھی موجود نہیں، آج دنیا میں اقتدار تمہیں مل گیا اور اگر تم وہی اصول اپناؤ گے تو اللہ کی عدالت تو ایک ہی ہے وہاں تو فیصلہ پھر ایک نہج سے ہوگا، جو غلط اصول استعمال کریں گے وہ ویسے ہی برباد ہوں گے جس طرح سے پہلے برباد ہو گئے یہ نہیں کہ وہاں کسی کے لیے اور ترازو ہے اور کسی کے لیے اور ترازو ہے ایسی بات نہیں ہے وہاں ایک ہی ترازو ہے جو قوم شرک میں مبتلاء ہو گئی اور غلط اصولوں کی حامل ہو گئی اسی طرح سے صفحہ ہستی سے مٹا دی جائے گی جس طرح سے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو مٹا دیا گیا، تم ان باتوں کو یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے ان کو مٹانے کے بعد تمہیں اقتدار بخشا ہے، ان جیسے غلط اصول نہ اپناؤ اس طرح سے حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم کو سمجھاتے ہیں، یاد کیجئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں بنایا خلفاء قوم نوح کے بعد اور زیادہ کیا تمہیں ساخت میں، بناوٹ میں از روئے کشادگی کے کیسے سوہنے بدن اللہ نے تمہیں دیے، کیسے اونچے اونچے قد اور کیسے چوڑے چوڑے بدن تمہارے ہیں اور اس طرح سے عقل کی وسعت تمہیں کس طرح سے دی، کیسی کیسی صنعت اور کاریگریاں تم اختیار کر رہے ہو، یہ ساری کی ساری چیزیں اللہ کا عطیہ ہیں ان کو یاد کرو، اللہ کے انعامات کو یاد کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ، اللہ کی نعمتوں کو یاد کر کے اسی کا شکر ادا کرو۔

آگے سے ان کی وہی بڑ ہے جو عام طور پر مشرک مارتے ہیں "قَالُوٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ" تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم پوجنے لگ جائیں ایک اللہ کو اور چھوڑ دیں ہم ان کو جن کو پوجتے تھے ہمارے اباؤ اجداد، ہم

اپنے اباؤاجداد کا طریقہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، بس سب سے بڑی گمراہی یہی ہوتی ہے کہ جب انسان خاندانی روایات کا پابند ہو جاتا ہے، خاندانی روایات کے خلاف چلنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو جب ڈگمگاتا ہے تو یہی ڈگمگاتا ہے، رسم ورواج کے خلاف چلنا مشکل ہو گیا، جو آباؤاجداد کا طریقہ تھا ہم اسی پر چلیں گے، کیا تو آیا ہے ہمارے پاس اس لیے تاکہ پوجنے لگ جائیں ہم ایک اللہ کو اور چھوڑ دیں ہم ان کو جن کو پوجا کرتے تھے ہمارے آباء "فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا" کتنی ڈھٹائی کی بات ہے یعنی کسی کی بات پر توجہ کرنے کی بجائے یوں کہہ دیں کہ یار کر جو تجھ سے ہوسکتا ہے میں تیرا کہنا نہیں مانتا، کیا تو آئے دن ڈراتا رہتا ہے عذاب آجائے گا، عذاب آجائے گا، جا لے آ عذاب جس سے تو ڈراتا ہے یہ آخری بے حیائی کی انتہاء ہوتی ہے کہ جس کے بعد پھر سوائے تباہی کے اور بات باقی نہیں رہ جاتی یعنی خوف اور ڈر کی بجائے آدمی ڈھیٹھ ہو جائے کہ اچھا کر لو جو کچھ کرنا ہے تو پھر اس کے بعد بربادی کے علاوہ کیا رہ گیا "فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا" یہ ایسی ہی بات ہے کہ جس وقت وہ بار بار سمجھاتے تھے تو کہتے تھے کہ کیا تم پیچھے لگے رہتے ہو جاؤ لے آؤ عذاب جس سے تم ڈراتے ہو، اگر تم سچے ہو تو عذاب لا کر دکھاؤ۔

وہ سمجھتے تھے کہ ہم پر عذاب کدھر سے آسکتا ہے اتنے ہم ترقی یافتہ ہیں اور اتنے ہم نے مضبوط محل بنا رکھے ہیں، اتنی ہمیں آسائش حاصل ہے تو عذاب کہاں سے آجائے گا، ایسے ہی باتیں بناتا ہے، لے آ ہمارے پاس وہ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر تو سچوں میں سے ہے۔

"قَالَ" حضرت ہود علیہ السلام کی کلام پھر دیکھو کتنی حقیقت پر مبنی ہے کہ تمہاری باتوں سے معلوم ایسے ہوتا ہے کہ اللہ کا غصہ اور اللہ کا عذاب تم پر واقع ہو چکا، فیصلہ ہو گیا تم پر عذاب کا تمہاری باتوں سے یوں معلوم ہوتا ہے لیکن اس عذاب کا لے آنا میری بس کی بات نہیں ہے، اب تو اس عذاب کا انتظار ہے، تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں لیکن میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یوں سمجھو کہ تمہارا فیصلہ ہو چکا ہے، اس بات پر یقین ہے کہ اللہ کا غضب اور اللہ کا غصہ تم پر واقع ہو چکا ہے لیکن وہ آگے آئے گا کب اور اس کا ظہور کب ہوگا تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں یہ میرے بس میں نہیں کہ لا کر دکھا دوں "قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ" ہود علیہ السلام نے کہا کہ تحقیق واقع ہو چکا تم پر تمہارے رب کی طرف عذاب اور غصہ۔

"اَتُجَادِلُوْنَنِيْ" کیا تم جھگڑا کرتے ہو میرے ساتھ ان ناموں کے بارے میں جو تم نے رکھ لیے اور تمہارے آباء نے رکھ لیے وہ جو کہتے تھے "مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا" کیا چیز ہے؟ کسی کو مشکل کشا بنالیا، کسی کو بچہ دینے

والا کہتے ہو، کسی کو بارش دینے والا کہتے ہو، یہ تمہارے رکھے ہوئے نام ہیں ان میں تو حقیقت کچھ بھی نہیں یہ تو نام ہی نام ہیں باقی ان کے اندر کچھ بھی نہیں ان ناموں کے بارے میں تم میرے ساتھ جھگڑ رہے ہو، کوئی کسی قسم کی دلیل اللہ نے نہیں اتاری، نہ کوئی عقلی دلیل ان کے پاس موجود، نہ کوئی فطری دلیل موجود، نہ کوئی نقلی دلیل موجود اور بلا وجہ ہی تمہارے باپ دادا نے کسی چیز کا کوئی نام رکھ دیا اور کسی کا کوئی نام رکھ دیا اور تم سارے کے سارے انہیں کے پیچھے لگے ہوئے ہو اور بلا وجہ بغیر دلیل کے تم میرے ساتھ جھگڑ رہے ہو "اَتُجَادِلُوْنَنِیْ" کیا تم میری ساتھ جھگڑا کرتے ہو "فِیْ اَسْمَآءٍ" ناموں کے بارے میں، یہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم رکھے ہوئے ہو، کسی کا نام رکھ لیا کہ بارش دینے والا ہے، کسی کا نام رکھ لیا کہ بچے دینے والا ہے، کسی کا نام رکھ لیا کہ یہ عزت دینے والا ہے، کسی کا نام رکھ لیا کہ یہ روزی دینے والا ہے یہ سارے تمہارے رکھے ہوئے نام ہیں، تم نے رکھ لیے تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے "مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ" اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کسی قسم کی دلیل نہیں اتاری "فَانْتَظِرُوْٓا" پس تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں، عذاب لے آنا میرے اختیار میں نہیں، اتنا میں کہتا ہوں یقین کے ساتھ کہ تم نے اپنا فیصلہ خود کر لیا جب اس ڈھٹائی پر آ گئے تو اللہ کی طرف سے غضب کا نشانہ تم بن گئے باقی اس کا ظہور کب ہوگا تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا انجام:

"فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ" پھر وہ عذاب آیا کس طرح سے عذاب آیا وہ تفصیل آئے گی کہ "سَبْعَ لَیَالٍ وَّ ثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ" سات راتیں اور آٹھ دن ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے آندھی مسلط کی، اس ہوا کو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر مسلط کر دیا، مسخر کر دیا سات راتیں اور آٹھ دن، پورا ایک ہفتہ آندھی چلی ان کے اوپر اور اس طرح سے پٹخ پٹخ کر مارے تو وہ یوں گرے پڑے تھے جس طرح سے کھجور کے تنے پڑے ہوئے ہوتے ہیں، یوں اٹھا اٹھا کر مارے جو کہتے تھے "مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً" اللہ کی طرف سے عذاب آیا اور وہ ہوا کا مقابلہ نہیں کر سکے اور تو کسی چیز کا کیا مقابلہ کرنا تھا، سارے اٹھا اٹھا کر پٹخ دیے، یہ تفصیل آگے آئے گی، ہم نے اس کو نجات دی یعنی ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے اپنی طرف سے رحمت کے سبب سے اور جڑ کاٹ دی ہم نے ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم

اور بھیجا ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو، صالح نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے

مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ نَاقَةُ

اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ تحقیق آگئی تمہارے پاس واضح دلیل تمہارے رب کی طرف سے، یہ اونٹنی ہے

اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا

اللہ کی تمہارے لیے بطور نشانی کے پس چھوڑو اس اونٹنی کو کہ کھاتی پھرے اللہ کی زمین سے اور نہ چھونا اس کو

بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٣﴾ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ

بری کے ساتھ ورنہ پھر پکڑ لے گا تمہیں دردناک عذاب (۷۳) یاد کرو جب بنایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلیفہ

مِن بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا

عاد کے بعد اور ٹھکانہ دیا تمہیں زمین میں بناتے ہو تم زمین کے نرم حصوں میں

قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا ۖ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا

محلات اور تراشتے ہو تم پہاڑوں کو ازروئے گھروں کے پس یاد کرو تم اللہ کے احسانات کو اور نہ پھرو

فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٧٤﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن

زمین میں فساد مچاتے ہوئے (۷۴) کہا ان بڑے لوگوں نے جنہوں نے تکبر کیا تھا اس کی

قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ

قوم میں سے ان لوگوں کو جو کمزور قرار دیے گئے تھے ایمان لائے تھے ان میں سے کیا تم جانتے ہو کہ

أَنَّ صَالِحًا مُّرْسَلٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿٧٥﴾

صالح بھیجا ہوا ہے اس کے رب کی طرف سے، ان مومنین نے کہا اس چیز کے ساتھ جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں ہم ایمان لانے والے ہیں (۷۵)

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿٧٦﴾

کہا ان بڑے لوگوں نے بے شک ہم اس چیز کے ساتھ جس پر تم ایمان لائے ہو کفر کرنے والے ہیں (۷۶)

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا

پس انہوں نے کونچیں کاٹ دیں اس اونٹنی کی اور انہوں نے سرکشی کی اپنے رب کے حکم سے اور کہنے لگے اے صالح لے آ تو

بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

وہ چیز جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر تو بھیجے ہوؤں میں سے ہے ﴿۷۷﴾ پس ان کو زلزلے نے پکڑ لیا

فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ

پس ہوگئے وہ اپنے گھر میں منہ کے بل گرنے والے ﴿۷۸﴾ صالح نے ان سے منہ پھیرا اور کہا اے میری قوم!

لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ

البتہ ضرور پہنچایا میں نے اپنے رب کا پیغام اور میں نے تم سے خیرخواہی کی لیکن تم پسند ہی نہیں کرتے

النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ

خیرخواہی کرنے والے کو ﴿۷۹﴾ اور بھیجا ہم نے لوط کو جس وقت کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم بے حیائی کی طرف آتے ہو نہیں سبقت لے گیا

بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً

تم سے اس بے حیائی کے ساتھ جہانوں میں سے کوئی بھی ﴿۸۰﴾ بے شک تم آتے ہو مردوں کے پاس از روئے شہوت کے

مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ

عورتوں کو چھوڑ کر بلکہ تم حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو ﴿۸۱﴾ اور نہیں تھا جواب

قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ

لوط کی قوم کا مگر یہ کہ انہوں نے کہا نکال دو اس کو اپنی بستی سے یہ لوگ بنتے ہیں

يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾

صاف ستھرا ﴿۸۲﴾ پس ہم نے لوط کو نجات دی اور اس کے گھر کے افراد کو نجات دی سوائے اس کی بیوی کے وہ پیچھے رہنے والوں میں سے تھی ﴿۸۳﴾

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور ہم نے ان کے اوپر ایک خاص قسم کی بارش برسائی پس دیکھ تو کہ جرم کرنے والوں کا انجام کیا ہوا ﴿۸۴﴾

تفسیر:

نبی کو بھائی کہنے کا مسئلہ:

واقعات کے سلسلے میں یہ تیسرا واقعہ آیا ہے قوم ثمود کا اور یہ عاد کی ہی شاخ ہے، اسی قبیلے کے ہی بچے ہوئے لوگ یا دوسری شاخ جس طرح سے قبیلے میں سے ہوتی ہے یہ ویسے ہی ہیں اس لیے پہلے جس قبیلے کا ذکر آیا تھا اس کو عاد اولیٰ کہتے ہیں اور یہ عاد اخریٰ کہلاتے ہیں، یہ عاد اخریٰ ہے اسی قبیلے کی شاخ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا، بھائی کا مطلب یہ ہے کہ انہی کے نسب اور نسل سے تھے، حضرت صالح علیہ السلام اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، یہ اخوت نسبی ہے یعنی ثمود کے قبیلے میں سے تھے، ان کی نسل میں سے تھے یہ تو یہاں ایک نبی کو ان مشرکوں کا بھائی کہا جا رہا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام ان کا بھائی تھا تو یہ بھائی ہونا کوئی عیب کی بات نہیں اور اس کی کسی مشرک کی طرف نسبت کرنے سے کوئی نقص لازم نہیں آتا۔

یہ جو دیوبندیوں پر الزام عام طور پر لگاتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا بھائی کہتے ہیں، آپ کے سامنے اس کی حقیقت ہونی چاہیے کہ حدیث شریف میں ایک روایت موجود ہے حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور جاہل اسی کو ہی لے اڑے، بسا اوقات جاہل اپنی جہالت کی بناء پر اور بعضے لوگ پھر ضد کی بناء پر ایسا کرتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ جاہل آدمی کا دماغ اس بات کو قبول کر کے مشتعل ہوتا ہے تو انہوں نے مخالفت میں فائدہ اٹھانا شروع کر دیا کہ لو جی بھائی کہہ دیا، اصل میں حدیث شریف میں ایک روایت موجود ہے، حدیث شریف میں ہے کہ بعض صحابہ نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی تھی کہ ہم آپ کو سجدہ کیا کریں جس طرح سے عجمیوں کی عادت ہے کہ جب وہ دربار میں آتے ہیں تو اپنے بڑوں کو سجدہ کرتے ہیں، وہ کسی عجمیوں کے دربار میں گیا تھا وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ وہ ملاقات کے وقت اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں تو اس نے دل میں خیال کیا کہ اس کے تو سب سے زیادہ حق دار حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یہ تو بڑی اچھی بات ہے تعظیم کرنی چاہیے تو اس نے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ درخواست پیش کی تھی کہ ملاقات کے وقت ہم آپ کو سجدہ کیا کریں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَاَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ" کہ سجدہ تو ایک عبادت ہے، عبادت اپنے رب کی کرو، سجدہ ہمیشہ رب کو کرو "اَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ" میں تمہارا بھائی ہوں اور تم اپنے بھائی کی عزت کرو جو عزت کرنے کا دوسرا طریقہ ہے یہاں

بھائی ہونا بطور انسان کے اور بطور بشر کے ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نسب تھے، ہم قبیلہ تھے، ہم قوم تھے، ہم وطن تھے جس طرح سے یہ حضرت صالح علیہ السلام ثمود کے بھائی ہیں اس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے بھائی تھے اپنے بھائی کی عزت کرو، میں تمہاری برادری سے ہوں، انسانی برادری سے ہوں تو میرے ساتھ اکرام کا معاملہ کرو باقی ایسا کوئی معاملہ جو عبادت کا ہو وہ میرے ساتھ نہیں کرنا۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد حضرت سید اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ انسان سارے ہی آپس میں بھائی بھائی ہیں، کوئی چھوٹا کوئی بڑا، اب اسی کو وہ جاہل لے اڑے کہ دیکھو جی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا بھائی کہہ دیا، ارے بھائی، بھائی کہا جاسکتا ہے، بڑا تو اپنی جگہ رہ گیا یہاں دیکھو! صالح علیہ السلام کو ثمود کا بھائی کہا جارہا ہے حالانکہ ثمود سارے کے سارے مشرک تھے، سارا قبیلہ مشرک تھا۔

اور پھر وہ روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے، جا کے ذکر کیا کہ میں عمرہ کرنے کے لیے جارہا ہوں اجازت لینے کے لیے گئے، اطلاع دینے کے لیے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یَا اُخَیَّ لَا تَنْسَنَا فِیْ دُعَوَاتِكَ اَوْ كَمَا قَالَ علیہ السلام" اے بھائی! ہمیں بھی اپنی دعا میں یاد رکھنا، بھول نہ جانا تو بھائی کہہ کے خطاب کیا اس طرح سے اور بہت ساری روایتیں ہیں، بھائی ہونے میں کونسی بات ہے، انسانی برادری سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، کسی کو اللہ کتنی عظمت دے دے باقی عظمت کی کوئی حد نہیں

بعد از خدا بزرگ تو ہی قصہ مختصر

اب اگر حضرت عبداللہ کا کوئی دوسرا بیٹا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حقیقی بھائی ہوتے یا نہ ہوتے؟ اگر آمنہ کا کوئی دوسرا بچہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حقیقی بھائی ہوتے یا نہ ہوتے؟ اب وہ چھوٹے بھی ہو سکتے تھے کہ بڑا کوئی اور ہوتا اور یہ چھوٹے ہوتے، اب اگر ایمان لے آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی بھی ہوتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا چھوٹا بھائی بھی کہتا، تو چھوٹا بھائی کہنے کی وجہ سے کیا لازم آتا، اور اگر آمنہ کا کوئی دوسرا بچہ آپ سے چھوٹا ہوتا تو وہ آپ کو اللہ کا رسول بھی مانتا، آپ پر ایمان بھی لاتا اور آپ کو اپنا بڑا بھائی بھی کہتا، ابو طالب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا کرتے تھے تو اے بھتیجے! کہہ کر کرتے تھے بھتیجا کہہ کر ذکر کرتے تھے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے اور آپ کے امتی بھی تھے اب اگر کوئی ان سے پوچھتا کہ یہ آپ کے کیا لگتے ہیں تو عباس رضی اللہ عنہ کیا کہتے کہ میرا بھتیجا ہے، بھائی تو پھر بڑا ہوتا ہے بھتیجا تو دوسرے درجے میں آگیا تو اگر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے کوئی پوچھتا کہ یہ آپ

کے کیا لگتے ہیں تو کیا جواب دیتے کہ ہمارے بھتیجے ہیں تو بھتیجا کہنا کون سا کفر کا کلمہ آگیا، امتی بھی ہیں، کلمہ بھی پڑھتے ہیں، اللہ کا رسول بھی مانتے ہیں لیکن رشتے کے لحاظ سے، نسب اور نسل کے لحاظ سے بھائی بھی ہو سکتے ہیں، بھتیجے بھی ہو سکتے ہیں اس میں کونسی بات ہے۔

ایسے ہی حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ہیں، کسی نے پوچھا کہ آپ بڑے ہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہیں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کتنے سلیقے سے جواب دیا فرمانے لگے کہ "هُوَ اَكْبَرُ وَاَنَا اَسَنُّ" بڑے تو وہ ہیں اور عمر میری زیادہ ہے، عمر میری زیادہ ہے لیکن بڑے وہ ہیں کہ عمر میری زیادہ ہے لیکن فضیلت کے اعتبار سے بڑائی ان کو حاصل ہے، بہر حال یہ جو نسبی نسلی رشتے ہوا کرتے ہیں ان کے اندر نہ کوئی توہین کا پہلو ہے نہ کوئی اور اس قسم کی بات ہوتی ہے یہ صاف بات آگئی کہ صالح علیہ السلام جو اللہ کے پیغمبر ہیں ان کو ثمود کا بھائی قرار دیا اور یہ نسلی نسبی بھائی ہیں اور وطنی بھائی بھی ہو سکتے ہیں کہ ایک ہی علاقے کے رہنے والے، ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے، ایک ہی قبیلے کے تھے اس قوم کے بھائی تھے ہم نے انہی کو ان کی طرف بھیجا تا کہ وہ ان کے حالات کو اچھی طرح سے جانتے ہوئے انہیں سمجھائیں۔

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت:

"وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا" آگلے الفاظ آپ کے سامنے گزر گئے، حضرت صالح علیہ السلام نے سب سے پہلے آکر توحید بیان کی "يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ" اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں "قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ صالح علیہ السلام ان کو تبلیغ کرتے رہے، سمجھاتے رہے، قوم کے ساتھ الجھاؤ رہا، یہ کوئی ایک دن کی بات نہیں ہوتی کہ یوں بات ہوئی انہوں نے یہ کہا اور یہ جواب آیا اور عذاب آگیا اور ہلاک ہو گئے صبح سے لیکر شام تک قصہ ختم ہو گیا ایسی بات نہیں، برسوں کا جھگڑا ہوتا ہے واقعہ جب نقل کیا جائے گا وہ تو ایسے ہی ہوگا لیکن آپ واقعہ کے لحاظ سے تفصیل میں جس وقت آئیں گے تو اس میں وہ برسوں کی بات ہے، مختلف قسم کے ان کی طرف سے اعتراضات، اشکالات ہوئے، صالح علیہ السلام پوری خیر خواہی کے ساتھ، دل سوزی کے ساتھ، جگر سوزی کے ساتھ ان کو سمجھاتے رہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ:

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر قوم نے حضرت صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ ہماری مرضی کے مطابق

اگر آپ ایک نشانی اور معجزہ دکھادیں تو پھر ہم مان جائیں گے اور وہ یہ ہے کہ یہ پہاڑی جو سامنے ہے اس میں سے ایک گابن اونٹنی نکل آئے، پتھر میں سے ایک اونٹنی پیدا ہو جائے ہماری آنکھوں کے سامنے اگر اس طرح سے ہو جائے تو پھر ہم مان جائیں گے، حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ ظاہر کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ چٹان پھٹی یا وہ پہاڑ پھٹا اور اس میں سے اونٹنی باہر آ گئی تو یہ اونٹنی جو کہ عام عادت کے خلاف پیدا ہوئی تھی اللہ تعالیٰ کی عام عادت تو یہی ہے کہ اونٹنی اونٹنی سے پیدا ہوتی ہے اور نسل یونہی چلتی ہے لیکن پتھر میں سے اونٹنی نکل آئے یہ اللہ کی عام عادت کے خلاف ہے اس لیے اس کو حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ قرار دیا گیا اور اسی وجہ سے اس ناقہ کو "ناقۃ اللہ" کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت عام حالات کے خلاف ہوئی، جس طرح سے انسان عام طور پر پیدا ہوتے ہیں ویسے عیسیٰ علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے بغیر باپ کے پیدا ہوئے اس میں باپ کی وساطت نہیں ہے اس لیے ان کو "کلمۃ اللہ" کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے کلمہ کن سے پیدا ہوئے ہیں اور اسباب کا سلسلہ یہاں آ کر ختم ہو گیا تو ان کو "کلمۃ اللہ" کہا گیا اسی طرح سے یہاں بھی ناقہ کی نسبت "ناقۃ اللہ" کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی گئی اور اس کو حضرت صالح علیہ السلام کی نشانی اور معجزہ قرار دیا گیا، جو نشانی انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی صداقت پر مانگی تھی تو وہ نشانی آ گئی۔

اور اس اونٹنی کے حالات بھی کچھ عجیب وغریب تھے عام اونٹنی اور اونٹ کے مقابلے میں وہ عظیم الجثہ تھی، بڑے قد کی تھی کھانا پینا اس کا زیادہ تھا بمقابلہ دوسرے اونٹوں کے اور جدھر وہ جاتی تھی جانور ڈر کر بھاگ جاتے تھے اس لیے وہ کسی کنویں پر پانی پینے کے لیے جاتی ان کے تالاب میں تو جتنا پانی ہوتا سارا پی جاتی اب مانگ تو لی اپنے منہ سے اور اللہ تعالیٰ نے وہ عجیب الخلقت اونٹنی ظاہر کر دی اب قوم جو تھی وہ اس معاملے میں پریشان ہونے لگ گئی جب پریشان ہونے لگی تو حضرت صالح علیہ السلام نے باریاں باندھ دیں کہ ایک دن باری اس کی ہے یہ پانی پیا کرے گی اس دن تمہارے جانور وہاں نہ جایا کریں، دوسرے دن تمہارے جانور پانی پی لیا کریں اور یہ کہیں بھی پھرتی رہے اس کو روکا نہ کرو، یہ اللہ کی زمین میں سے اللہ کی اونٹنی جہاں بھی چاہے چرتی پھرے اس کو چھیڑنا نہیں اس کو اگر چھیڑو گے تو دیکھو اللہ کا عذاب آ جائے گا۔

جب یہ معجزہ ظاہر ہوا تو بعض لوگ مانے اور بعض جو ضدی تھے وہ اسی طرح اڑے رہے تو جب یہ اڑے رہے تو ان کی ضد اور بڑھ گئی جب اس اونٹنی کی وجہ سے ان کے جانوروں میں کچھ پریشانی بڑھنے لگی یا اس قسم کی کوئی

بات ہوئی تو ضد میں آ کے وہ آمادہ ہوئے کہ اس اونٹنی کو مار دیا جائے جان سے مار دو اور اب جان سے مارنے کے لیے تیار کوئی نہ ہو تو پھر جو عام طور پر لوگوں کے پھسلنے کی بات ہے وہ یہاں پیش آئی کہ روایات میں جس طرح سے آتا ہے کہ کوئی خوبصورت عورت تھی اور کوئی دوسرا آدمی اس کے ساتھ محبت کرنے والا تھا اور اس نے اپنے ساتھ ملاقات کے لیے یہ شرط لگادی کہ صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کردے اب اس عورت کو حاصل کرنے کے شوق میں وہ اندھا بہرا ہو کر تلوار اٹھا کر اونٹنی کے پیچھے لگ گیا اور اس کی کھونچیں کاٹ کر اس کو مار دیا۔

چونکہ یہ کام ساری قوم کی منشاء کے مطابق تھا، قوم بھی اس اونٹنی سے جان چھڑانا چاہتی تھی اس لیے اس کی ہلاکت کی نسبت جو ہے وہ ساری قوم کی طرف کردی" فَعَقَرُوا النَّاقَةَ "قوم کے لوگوں نے ہی اونٹنی کو ہلاک کر دیا نسبت سب کی طرف کردی کیونکہ یہ کام جو تھا ان کی منشاء اور مرضی کے مطابق ہوا تھا، ورنہ یہ کرنے والا قدار یا قذار بن سالف تھا جس نے یہ کھونچیں کاٹی تھیں لیکن باقی قوم چونکہ اس کے ساتھ متفق تھی دل سے چاہتی تھی کہ ایسا ہو جائے اس لیے نسبت سب کی طرف کردی۔

اب یہ آخری حد ہے جہاں تک کوئی قوم پہنچ سکتی ہے کہ اپنے منہ سے ایک معجزہ مانگا، نشانی مانگی اور اس کے ظاہر ہونے کے بعد بھی اس کی قدر نہ کی بلکہ الٹا سرکش ہو گئے اور اس اللہ کی نشانی کو مٹانے کی کوشش کی، باوجود حضرت صالح علیہ السلام کی طرف سے بار بار تنبیہ کے، اور ساتھ پھر زبان سے بھی کہہ دیا کہ لو ہم نے تو یہ کام کردیا اب جس عذاب سے تو ہمیں ڈراتا ہے وہ لے آ یہ پہلے بھی آپ کے سامنے عاد کے قصے میں آیا تھا کہ جب کوئی قوم یہاں تک پہنچ جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ان کے ماننے کی تو گنجائش نہیں ہے تو پھر ان کو باقی رکھنے کی کیا ضرورت؟ پھر اللہ تعالیٰ اپنی زمین کو اس قوم کے نجس لوگوں سے پاک کر دیتے ہیں تو پھر ان کے اوپر عذاب آیا زلزلہ کی صورت میں اور اس زلزلے کے اندر کچھ اس قسم کا شور اور چیخ و پکار تھی کہ اپنے گھروں میں یہ لوگ اپنے منہ کے بل گر گئے اور سارے کے سارے وہیں فناء ہو گئے۔

قوم ثمود بہت ترقی یافتہ قوم تھی:

اور یہ قوم بہت ترقی یافتہ تھی خاص طور پر فن تعمیر کے اوپر ان کو مہارت حاصل تھی، پہاڑوں کو تراش تراش کر بڑے خوبصورت محلات بناتے اور میدانی علاقوں کے اندر بھی اونچی اونچی عمارتیں بناتے اور ان کے باغات اور نہروں کا ذکر بھی آپ کے سامنے سورۃ الشوریٰ کے اندر آئے گا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت ترقی یافتہ اور بڑی

متمدن قوم تھی لیکن جب وہ حق کے مقابلے میں آ گئی اور اپنے نبی کا انہوں نے کہنا نہیں مانا تو ایسی صورت میں پھر یہ سارے کے سارے فناء کر دیے گئے یہ تاریخ بھی دھرائی جا رہی ہے۔

اور مکہ معظمہ سے شام کو جاتے ہوئے راستے کے اندر یہ علاقہ آتا ہے وادی حجر، اصحاب الحجر کے لفظ کے ساتھ قرآن کریم میں آیا ہے اور آج کل اس علاقے کو مدائن صالح کہتے ہیں، اور اس وقت تک باوجود اس بات کے کہ ہزاروں سال گزر گئے اس وقت تک اس وادی میں پہاڑوں کے اندر ان کے بنے بنائے محلات اصل حالت میں موجود ہیں یعنی آج بھی ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس فن تعمیر کے اندر یہ لوگ کتنا آگے نکل گئے تھے، چنانچہ اور کسی جگہ تو دیکھنے میں نہیں آیا تفسیر تفہیم القرآن جو مولانا مودودی صاحب کی تصنیف ہے جس وقت یہ مودودی صاحب نے لکھی ہے تو اس وقت یہ اس علاقے میں گئے تھے اور جا کر پورے علاقے کو دیکھ کر آئے تھے، ہر جگہ کا انہوں نے فوٹو لیا اور تفہیم القران کے اندر وادی حجر کا بھی انہوں نے فوٹو دیا ہے اور مختلف قسم کے پہاڑوں کے نقشے دے کر دہ دروازے وغیرہ بنے ہوئے اور محلات کے فوٹو وغیرہ ابھی تک نمایاں ہیں اور اس وقت تک جو لوگ جاتے ہیں اور جا کر دیکھتے ہیں تو ان کو وہاں کا تمدن سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کیسے لوگ تھے، پہاڑوں کو تراش کر جیسے پہاڑ ہے تو اس کو تراش کر کمرہ بنا لیا اور ہمارے ہاں بھی آپ قبائلی علاقے میں چلے جائیں تو راستے میں جو پہاڑ آتے ہیں وہاں بھی رہنے والوں نے پہاڑ کو تراش تراش کر اندر رہنے کی جگہ بنائی ہوئی ہے اور کبھی آپ نمک کی کان کے اندر چلے جائیں تو وہاں دیکھیں گے کہ کھود کھود کر نمک اندر سے لاتے ہیں اور اندر ہی انہوں نے اپنے دفتر بنائے ہوئے ہیں تو اس طرح سے تراش تراش کر پہاڑوں کو وہ مکان بناتے تھے یہ ان کے گویا کہ تمدن کا نشان ہے، وہ اتنے متمدن تھے کہ میدانی علاقے میں بھی اونچے اونچے محلات بناتے تھے اور پہاڑی علاقے میں بھی پہاڑ کو تراش کر گھر بنانے کی ان کو عادت تھی لیکن جب وہ حق کے ساتھ ٹکرائے اور تکبر میں آ گئے تو نتیجتاً سارے کے سارے ہلاک کر دیے گئے۔

قوم ثمود کو احسانات کی یاد دہانی:

”هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً“ یہ اللہ کی اونٹنی بطور تمہارے لیے نشانی کے ہے اور چھوڑ دو اسے کہ کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں سے اور نہ چھوؤ اس کو برائی کے ساتھ کہ پکڑ لے گا تمہیں دردناک عذاب ”وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ

"خُلَفَآءَ" یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نائب بنایا قوم عاد کے بعد اور عاد کی ہلاکت کے قصے ان کے ہاں مشہور ہوں گے کہ دیکھو تم سے پہلے جو لوگ آباد تھے وہ کیسے تباہ ہوئے اور اس کے بعد تمہارا عروج ہو گیا دنیا میں جس طرح سے ہوتا ہے ایک خاندان آتا ہے عروج سے ہٹتا ہے تو دوسرا خاندان آجاتا ہے، وہ ہٹتا ہے تیسرا خاندان آجاتا ہے تو موجودہ خاندان کو پچھلے خاندان کا حوالہ دے کر سمجھایا جاتا ہے۔

جس طرح سے آج کل جو لوگ برسر اقتدار ہیں آپ کے ہاں حکومت میں انہیں کہاں جائے کہ بھائی اس کرسی پر ناز نہ کرنا تم سے پہلے جو تمہارا پیشوا گزرا ہے اس کی کرسی بڑی مضبوط تھی اور وہ اعلان کرتا تھا کہ میری کرسی مضبوط ہے، اٹھارہ مارچ کو کرسی کے مضبوط ہونے کا اعلان کیا اگلے سال اٹھارہ مارچ کو پھانسی کا حکم ہو گیا، جس تاریخ کو کرسی کے مضبوط ہونے کا اعلان کیا تھا اسی تاریخ کو اگلے سال پھانسی کا اعلان ہو گیا تو یہ مضبوط کرسیاں جب ٹوٹنے لگتی ہیں تو دیر نہیں لگتی اس لیے کرسیوں پر ناز نہ کرو تو جس طرح سے پچھلی قوم کا حوالہ دے کر سمجھایا جاتا ہے اسی طرح سے یہاں بھی عاد کی ہلاکت کا حوالہ دے کر کہ تم سے پہلے وہ بڑے عروج پر تھے، بڑے طاقت ور تھے کہتے تھے "مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً" ہم سے زیادہ زور آور کون ہے لیکن ان کا نام و نشان مٹ گیا اس لیے تم بھی اپنی قوت پر ناز نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرو یہ طرز تبلیغ ایسے ہی ہے۔

یاد کرو جب بنایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلفاء عاد کے بعد یعنی زمین کے اندر نائب متصرف عاد کے ہلاک ہونے کے بعد تم ہو گئے" وَبَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ" اور اللہ نے زمین میں تمہیں ٹھکانہ دیا "تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا" بناتے ہو تم زمین کے اندر نرم حصے سے محلات یعنی میدانی علاقے میں بھی تم محلات بناتے ہو "وَتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا" اور پہاڑوں کو بھی از روئے گھروں کے تراشتے ہو، تراش تراش کر گھر بناتے ہو، یاد کرو اللہ کے احسانات کو اور زمین کے اندر فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو، کفر و شرک پھیلانا، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پھیلانا یہ زمین کے اندر فساد ہے، فساد نہ پھیلاؤ۔

متکبرین و مستضعفین کا مکالمہ:

آگے وہی جواب ہے کہ جس طرح سے ہود کے مخاطبین نے جواب دیا تھا کہا ان لوگوں نے جو متکبر ہو گئے ان کی قوم میں سے، چوہدری کہنے لگے وہ چوہدری جو متکبر تھے ان کی قوم میں سے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے

یہ کمزور تھے مال کے اندر، جاہ کے اندر جن کو بڑائی حاصل نہیں تھی جن کو آج کل کے دور میں کمی لوگ کہتے ہیں، یہ محنت مزدوری کرنے والے چھوٹے موٹے اور اکثر و بیشتر حق کو قبول کرنے کی توفیق انہی کو ہوتی ہے کیونکہ ان کے لیے کوئی شہوات پرستی کے اسباب مہیا نہیں ہوتے، تکبر ان میں نہیں ہوتا جب حق کی آواز آتی ہے تو ان کی سمجھ میں آجاتی ہے تو فوراً قبول کر لیتے ہیں بخلاف اس کے کہ مالدار طبقہ اور صاحب اقتدار لوگ وہ چونکہ بہت لذات اور خواہشات کے اندر مشغول ہوتے ہیں ان کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے اس بات کو قبول کر لیا تو ہماری یہ خواہش مٹ جائے گی، یہ لذت جاتی رہے گی، ہمارا مزہ کرکرا ہو جائے گا وہ اکثر و بیشتر حق سے ٹکرا جاتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ ایسی ہی ہے اس لیے آج اگر مذہبی طبقہ آپ کو غریب نظر آتا ہے یا غریب لوگ آپ کو مذہبی نظر آتے ہیں یہ پرانی تاریخ اسی طرح سے ہے کہ خواہشات کا قربان کرنا انہیں لوگوں کا کام ہوتا ہے جن کے پاس خواہشات کو پورا کرنے کے زیادہ تر اسباب ہی نہیں ہوتے اور جن کو اسباب مہیا ہو جاتے ہیں اکثر و بیشتر وہ باغی اور سرکش ہو جاتے ہیں خود قرآن کریم نے کہا" اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی " جس وقت آدمی اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے، مال والا ہے، دولت والا سمجھتا ہے کہ مجھے کسی کی ضرورت نہیں " لیطغٰی " تو سرکش ہو جاتا ہے، انسان البتہ سرکش ہو جاتا ہے جس وقت اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے یہ انسان کا مزاج ہے، ان لوگوں سے کہا جو کمزور سمجھے جاتے ہیں یعنی ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے یہ بدل ہے اس سے کیا تم جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام مرسل ہے اپنے رب کی طرف سے، تمہیں پتہ ہے کہ یہ بھیجا ہوا ہے؟ وہ کہنے لگے ہم تو ان باتوں پر ایمان لے آئے جس کے ساتھ اس کو بھیجا گیا یعنی بھیجا جانا تو یقینی ہے باقی جتنی باتیں وہ لایا ہے اپنے رب کی طرف سے ہم نے سب تسلیم کر لیں اور ان سب پر ایمان لے آئے، یہ ان کے سوال کا ایک زوردار جواب ہے، ڈرنے کی بات نہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس کو رسول مانتے ہیں اور جتنی باتیں یہ کہتا ہے ہم نے سب تسلیم کر لیں وہ کہنے لگے جنہوں نے تکبر کیا کہ بیشک ہم اس چیز کا انکار کرنے والے ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو۔

قوم ثمود کا انجام:

" فَعَقَرُوا النَّاقَةَ "اس کشاکشی کا آخر نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، اسے ہلاک کر دیا اور اپنے رب کے حکم سے سرکش ہو گئے، کہنے لگے کہ اے صالح! لے آ ہمارے پاس وہ چیز جس سے تو ہمیں ڈراتا

ہے یعنی جس عذاب کی تو ہمیں دھمکیاں دیتا ہے لے آ، یہ انتہاء ہوتی ہے ڈھٹائی کی کہ اگر تو مرسلین میں سے ہے تو وہ عذاب لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے "فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ" پھران کو زلزلے نے پکڑ لیا" رجفۃ" کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کر دیا زلزلہ، کپکپی' فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ" ہو گئے وہ اپنے گھروں کے اندر ڈھیر ہونے والے یعنی ایسے گرے کہ ہلنے کی طاقت نہ رہی، منہ کے بل گر گئے یہ بھی ان کے عجز کو بیان کرنے کی بات ہے ورنہ "جثم" کا معنی ہوتا ہے کہ زمین سے یوں چمٹ جانا کہ پھر وہاں سے ہلنے کی طاقت نہ رہی، ہو گئے وہ اپنے گھروں کے اندر دار سے مراد سارا علاقہ ہے دار دیار کے معنی میں ہے اپنے گھروں میں ہو گئے وہ منہ کے بل گرنے والے، گھٹنوں کے بل گرنے والے، ڈھیر ہو جانے والے جس لفظ سے بھی چاہیں آپ اس مفہوم کو ادا کر سکتے ہیں۔

حضرت صالح علیہ السلام کا اپنی قوم پر افسوس کا اظہار:

جب یہ واقعہ پیش آ گیا تو حضرت صالح علیہ السلام نے کہا، اس میں مفسرین کے دونوں قول ہیں کہ یہ صالح علیہ السلام نے عذاب آنے سے پہلے کہا تھا یا عذاب میں ہلاک ہونے کے بعد کہا تھا، یہ اگلی کلام جو حضرت صالح علیہ السلام کی آ رہی ہے اگر پہلے کہی تھی تو بات واضح ہے کہ اپنی قوم کو کہتے ہیں کہ اے میری قوم! میں نے جتنا سمجھانا تھا تمہیں سمجھا لیا، جتنی خیر خواہی کر سکتا تھا میں نے تمہارے ساتھ خیر خواہی کر لی لیکن میں کیا کروں تم خیر خواہی کو اچھا نہیں سمجھتے، تمہیں اپنے خیر خواہ سے نفرت ہے اور جو تمہیں تباہی کے راستے کی طرف لے جاتے ہیں وہ تمہارے لیڈر ہیں ان کے لیے تم زندہ آباد کے نعرے لگاتے ہو، تم ان کے قصیدے پڑھتے ہو جو تمہیں بربادی کی طرف لے جا رہے ہیں لیکن جو تمہیں صحیح بات بتاتا ہے، تمہارا خیر خواہ ہے وہ تمہیں اپنا دشمن، قوم کا دشمن اور غدار نظر آتا ہے تم نصیحت کرنے والے کو، خیر خواہی کرنے والے کو اچھا نہیں سمجھتے یہ اظہار افسوس ہے۔

اور اگر وہ ہلاک ہو گئے تھے بعد میں ان کی لاشوں کے ڈھیر دیکھ کر حضرت صالح علیہ السلام کہتے ہیں تو یہ بھی ایک حسرت کا اظہار ہے جیسے ایک آدمی کو آپ نے سمجھایا کہ بھائی ادھر نہ جانا ادھر سانپ ہے ڈس لے گا لیکن آپ کے روکنے کے باوجود چلا گیا اور سانپ نے ڈس لیا اور مر گیا اور جب آپ وہاں جاتے ہیں اور اس کو پڑا ہوا دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں نے تو تجھے بہت سمجھایا تھا لیکن تو نے ایک نہ مانی اس وقت یہ ایک اظہار افسوس ہوتا ہے اور اس میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کے ذہن میں یہ بات آ جائے کہ دیکھو! خیر خواہوں کی بات ماننے میں بہتری ہوتی ہے اور اگر کوئی خیر خواہوں کی بات نہیں مانتا تو یہ نتیجہ نکلتا ہے اس بات کے اظہار میں دوسرے سننے

والوں کو تنبیہ ہوتی ہے اے میری قوم "لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ" میں نے تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا "وَنَصَحْتُ لَكُمْ" اور تم سے خیر خواہی کر لی "وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ" لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو، خیر خواہوں کو اچھا ہی نہیں سمجھتے۔

حضرت لوط علیہ السلام کا علاقہ:

"وَلُوْطًا" اور بھیجا ہم نے لوط علیہ السلام کو، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں، اصل میں یہ عراق کے علاقے کے رہنے والے ہیں، بصرہ کے آس پاس بابل کا علاقہ وہاں کے تھے جہاں نمرود کی حکومت تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حکومت کے ساتھ ٹکرانے کے بعد وہاں سے ہجرت کی تھی اور ابراہیم علیہ السلام کے اوپر ایمان لانے والے یہی تھے "اٰمن له لوط" قرآن کریم میں جس طرح آئے گا ایمان لائے ان کے اوپر لوط علیہ السلام، یہ بھتیجے ہیں تو آپ کی بیوی حضرت سارہ اور یہ بھتیجا لوط یہ بھی آپ کے ساتھ ہی ہجرت کرنے والے ہیں، ہجرت کر کے جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام شام کے علاقے میں پہنچے تو اردن کے کنارے پر جو کنعان کا علاقہ کہلاتا ہے وہاں آ کر آپ نے قیام کیا اور اردن کا مغربی کنارہ جو اب اسرائیل کے قبضہ میں ہے وہاں "قرية خليل" نامی ایک بستی اب بھی موجود ہے اور وہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر ہے تو یہ تاریخی طور پر ایک ثبوت ہے کہ یہ علاقہ ہے جہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام ٹھہرے تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا مرکز وہاں بنایا۔

اور دوسری آبادی جو اس کنعان سے کچھ فاصلے پر تھی وہ بھی آج کل اسرائیل کے قبضے میں ہے نقشے کے اندر لکھا ہوا کبھی آپ دیکھیں گے بحر میت یا کسی جگہ لکھا ہوتا ہے بحر لوط، انگریزی میں اس کو کہتے ہیں مردہ سمندر یا اس کو بحر لوط لکھتے ہیں نقشوں میں وہ جھیل ہے اس کا پانی بہت زہریلا ہے، کوئی جاندار چیز اس میں زندہ نہیں رہتی، پانیوں کے اندر جو جانور رہا کرتے ہیں مینڈک، مچھلی، کچھوا وغیرہ جو عام طور پر پانیوں میں ہوتے ہیں اس پانی میں کوئی چیز زندہ نہیں رہتی اس کو بحر میت کہتے ہیں یا بحر لوط کہتے ہیں یہ علاقہ تھا جس میں ایک مرکزی شہر سدوم تھا اور اس کے اردگرد بستیاں تھیں حضرت لوط علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سدوم کے اندر ٹھہرایا تھا کہ آپ اس علاقے کے اندر تبلیغ کریں تو وہ علاقہ جو برباد ہوا اللہ تعالیٰ کے عذاب آنے کے ساتھ تو ایسا الٹا پلٹا گیا کہ اب وہ ایک جھیل کی شکل میں موجود ہے زہریلا اس میں پانی ہے، کسی جگہ کوئی نام ونشان باقی نہیں رہا یہ علاقہ اس وقت بھی ممتاز ہے اس کو بحر لوط کہتے ہیں یا بحر میت کہتے ہیں گویا کہ عذاب کے اثرات اس میں اس وقت تک نمایاں ہیں وہ علاقہ

ہے جس میں مرکزی بستی سدوم تھی اور اس کے ارد گرد کچھ اور بستیاں تھیں ان کو "مؤتفکات" کے ساتھ قرآن کریم نے تعبیر کیا الٹ جانے والی بستیاں، معلوم ہوتا ہے کہ کئی بستیاں تھیں اور مرکزی شہر سدوم تھا، یہاں حضرت لوط علیہ السلام کو بھیجا گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام یہاں نسب اور نسل کے اعتبار سے شریک نہیں ہیں ہاں البتہ وہاں چونکہ رہن سہن ہو گیا اور انہیں میں شادی کر لی جیسے میں نے عرض کیا کہ یہ کوئی چند دنوں کا واقعہ نہیں ہوتا کہ چند لفظوں میں ذکر ہو گیا تو آپ سمجھیں کہ شاید اتنی سی بات ہے، وہاں جا کر مبلغ ہونے کی حیثیت میں ٹھہر گئے، انہی میں شامل ہو گئے، انہی میں شادی کر لی، انہی میں رہنا سہنا ہو گیا تو ایسے ہو گیا جیسے کہ ایک ہی قوم کے ہوتے ہیں یہاں قومیت ان کی ان کے ساتھ علاقہ اور وطن کے اعتبار سے ہے ورنہ نسل نسب کے اعتبار سے حضرت لوط علیہ السلام ان کے ساتھ شریک نہیں ہیں یہ تو عراق کے علاقے سے آئے تھے لیکن وہاں رہائش اختیار کر لی تو ایسے ہو گئے جیسے اسی قوم کے فرد ہوتے ہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کی وعظ ونصیحت میں کثرت سے فواحش سے بچنے کا ذکر کیوں؟

تو اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو جو بھیجا تھا کہ وہ قوم کفر و شرک کے اندر بھی مبتلا تھی اس میں کوئی شک نہیں ہے اس لیے حضرت لوط علیہ السلام کے وعظ میں توحید کا ذکر بھی آئے گا لیکن ایک بات ان میں اس قسم کی پائی جاتی ہے وہ اتنی گندی اور اتنی خراب قسم کی کہ حضرت لوط علیہ السلام کی نظر جب اٹھتی تو قوم کے اسی عیب پر اٹھتی کہ جب تک لوگ اتنی فحش اور اتنی بے حیائی کی حرکت سے باز نہیں آتے ان کو باقی نیکی کی تلقین کیا کرنی ہے (ذرا توجہ فرمایئے) ایک آدمی کافر ہے، مشرک ہے، بت پرست ہے، قبریں پوجتا ہے، ہر قسم کا عیب اس کے اندر موجود ہے آپ اس کو سمجھانے کے لیے گئے اس کے گندے عقیدے جو ہیں وہ تو ایک باطنی گندگی ہے آپ نے اس کو سمجھانا ہے لیکن جس وقت آپ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیٹھا وہ گوبر چاٹ رہا ہے یا پاخانہ کھا رہا ہے تو آپ جاتے ہی اس کو اس نجاست سے نکالنے کی کوشش کریں گے کہ جس کو اتنی تمیز نہیں کہ یہ کھانے کی چیز نہیں، یہ چاٹنے کی چیز نہیں ہے اتنا گندا آدمی اس کو دوسری باتیں کیا سمجھانی ہیں پہلے اس سے اس کی یہ عادت تو چھڑاؤ، جب تک یہ اس ظاہری نجاست سے نہیں بچتا اور صاف ستھرا نہیں ہوتا تو اس کو اور کیا سمجھائیں، اب اس کا یہ معنی نہیں کہ کفر کے مقابلے میں گوبر کھانا زیادہ برا ہے، گوبر کھانا ایک عمل ہے اور کفر ایک اعتقاد ہے لیکن ظاہری طور پر بعض عادتیں اس قسم کی بری ہوتی ہیں کہ جب تک وہ نہ چھڑائی جاسکیں اگلی بات سمجھانے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی، اس لیے حضرت لوط علیہ السلام کے وعظوں میں توحید کا اتنا تذکرہ نہیں ہے، رد شرک کا اتنا تذکرہ نہیں ہے جتنا کہ اس بری عادت کے اوپر تنقید حضرت لوط علیہ السلام کی قرآن نے نقل کی ہے

اور یہ بد عادت ان میں کیا تھی جس کے اندر وہ پوری قوم کی قوم ہی مبتلاء تھی، بے حیائی اور بے غیرتی کے اندر وہ سارے مبتلاء تھے یہ تھی ان کے اندر بری عادت جس کو آج کل لونڈا بازی سے تعبیر کرتے ہیں، مرد کا مرد کے ساتھ قضائے شہوت کرنا۔

قوم لوط کے عمل کے لیے لفظ لواطت غیر مستحسن ہے:

اور اس کے لیے آپ کی کتابوں میں لواطت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یہ لفظ ٹھیک ہے کہ فقہ کی کتابوں میں بھی آتا ہے، شراح حدیث نے بھی لکھا ہے، ادب کی کتابوں میں بھی آتا ہے لیکن یہ لفظ محدث ہے، بعد کا بنا ہوا ہے، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نزول قرآن کریم کے وقت آپ کی احادیث مرتب ہونے کے وقت یہ لفظ نہیں تھا اس لیے کسی روایت حدیث میں کسی کے بد فعل کو لواطت کے لفظ سے ذکر نہیں کیا گیا اور نہ قرآن کریم نے یہ لفظ ذکر کیا ہے اور یہ لفظ ہے بھی قبیح، کوئی اچھا لفظ نہیں ہے، کیوں اچھا لفظ نہیں ہے کہ بد کردار تو قوم تھی اور ان کے عمل کی تعبیر کے لیے لفظ جو اختیار کیا گیا وہ حضرت لوط علیہ السلام کے نام سے لے لیا گیا، لوط کے نام سے یہ لفظ لواطت بنایا گیا، لوط کا اس کام سے کیا تعلق تھا کہ آپ کے نام کو اس کا ماخذ بنالیا گیا اس لیے اب اس عمل کے لیے جو صیغہ آتا ہے "لاط یلوط لواطت" مرد کا مرد کے ساتھ قضائے شہوت کرنا اب یہ لفظ یوں استعمال ہوتا ہے۔

اور اس کا اتنا برا اثر پڑا کہ دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عقیدت کی بناء پر ایک شخص موسوی کہلا سکتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عقیدت کی بناء پر ایک شخص عیسوی کہلا سکتا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت کی بناء پر ایک آدمی محمدی کہلا سکتا ہے، ابراہیمی کہلا سکتا ہے، کسی نبی کے نام کے ساتھ یا نسبت کی لگا کر آپ اپنے ساتھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن لوط کا نام اس درجے میں آگیا کہ کوئی شخص اس کے ساتھ یا نسبت کی لگا کر اپنے لیے استعمال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اپنے آپ کو کوئی لوطی کہنا شروع کر دے کیونکہ جس وقت یہ لفظ آپ یوں بولیں گے لوطی کا تو جلدی سے ذہن ادھر جاتا ہے کہ اس کو وہ عادت ہے مرد کے ساتھ قضائے شہوت کرنے کی، لونڈا بازی کی، لوطی اسے کہتے ہیں تو گویا کہ ایک نبی کا نام جو تھا وہ کتنے برے کام کے لیے استعمال ہو گیا اس لیے یہ لفظ اچھا نہیں، جس نے اس لفظ کو پہلے پہلے بنایا ہے اس نے اس نام پر ظلم کیا ہے لیکن بعد میں جب ایک چیز عام ہو جاتی ہے تو پھر سارے استعمال کرنے لگ جاتے ہیں۔

حدیث شریف میں جہاں اس لفظ کا ذکر آیا ہے، اس عمل کا ذکر آیا ہے تو اتنی لمبی ترکیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال

کرتے ہیں "مَنْ عَمِلَ عَمَلاً قَوْمَ لُوْطٍ فَاقْتُلْ الفَاعِلَ وَ الْمَفْعُوْلَ بِہٖ" یہ روایت مشکوٰۃ میں موجود ہے جو قوم لوط جیسا عمل کرے "من عمل عملا قوم لوط" تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دیا کرو اتنی لمبی ترکیب کی ہے "مَنْ عَمِلَ عَمَلاً قَوْمَ لُوْطٍ" یوں نہیں کہا "لا طا" اگر یہ لفظ اس وقت مستعمل ہوتا تو "لاطا" ایک ہی لفظ سارے مفہوم کو ادا کرتا ہے لیکن یہ لفظ استعمال نہیں کیا گیا "مَنْ عَمِلَ عَمَلاً قَوْمَ لُوْطٍ" قوم لوط والا عمل جو شخص بھی کرے تو فاعل کو بھی اور مفعول کو بھی قتل کر دو اس حرکت کے اندر وہ مبتلاء تھے۔

لواطت فطرت، عقل اور نقل سب کے خلاف ہے:

یہ حرکت خلاف فطرت، خلاف عقل، خلاف نقل ہے کوئی اس کے اندر جواز کا شبہ نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت اس قسم کی بنائی ہے بلکہ انسان کی نہیں حیوان کی بھی اور حیوان کی یہ فطرت ہے کہ نر کا مادہ کی طرف رجحان ہے اور اسی تدبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نسل چلاتا ہے نر کا رجحان مادہ کی طرف ہوتا ہے تو انسان بھی حیوانوں میں سے ترقی یافتہ حیوان ہے جیسے کہتے رہتے ہیں "کُلُّ اِنْسَانٍ حَیْوَانٌ" تو اس کی فطرت بھی ایسی ہے کہ اس میں نر کا رجحان مادہ کی طرف ہے۔

فطری طور پر نر کا رجحان نر کی طرف یہ حیوان کی تاریخ میں سے نہیں ہے، انسان کو چھوڑ و باقی جنس حیوان کو دیکھیں تو آپ کو کوئی حیوان نظر نہیں آئے گا جو کہ قضائے شہوت کے لیے نر نر کی طرف متوجہ ہو، کسی کتے کو آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ کسی کتے کے ساتھ قضائے شہوت کر رہا ہو، کسی مرغے کو آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ کسی مرغے کے ساتھ قضائے شہوت کر رہا ہو، قومی سطح پر یہ بیماری سب سے پہلے قوم لوط میں ہی آئی ہے اور اس سے پہلے کسی قوم کے اندر یہ بیماری موجود نہیں تھی، فعل یہ خلاف فطرت ہے کتاب کے اندر ایک فقرہ نظر سے گزرا ہے عربی کی کتاب ہے "سیرت حلبیہ" "لسان العیون" اس کا اصل نام ہے لیکن سیرت حلبیہ کے نام سے مشہور ہے، عربی میں ہے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک فقرہ نظر سے گزرا ہے کہ "لَا یَلُوْطُ مِنَ الْحَیْوَانَاتِ اِلَّا الْحِمَارُ وَالْخِنْزِیْرُ" کہ یہ فعل جس کو آج کل لواطت کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے یہ پوری حیوانیت کی تاریخ میں نہیں پایا جاتا ہاں البتہ گدھوں میں اور خنزیروں میں یہ عادت موجود ہے اس کے علاوہ حیوانات کے اندر یہ بات موجود نہیں ہے۔

لیکن اس کے بعد میں نے اپنے طور پر خنزیروں کے ریوڑ تو ہم نے دیکھے نہیں، ان کے ساتھ تو کوئی زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا کہ انسان یہ دیکھتا کہ ان کی عادت کیا ہے اگرچہ ان کی شکلیں دیکھی ہیں پھرتے ہوئے

بھی دیکھے ہیں لیکن گدھے تو ہمارے آس پاس موجود ہیں اور کئی گدھوں والوں سے میں نے پوچھا اور تحقیق بھی کی کہ کسی شخص نے اپنی زندگی کے اندر کبھی ایسا دیکھا ہو کہ کوئی گدھا گدھے کے ساتھ قضائے شہوت کر رہا ہو، کسی کے سامنے کوئی واقعہ ہے؟ مجھے تو اپنی زندگی میں یاد نہیں کہ میں نے یہ دیکھا ہو اور جتنوں سے میں نے پوچھا ہے کسی نے نہیں کہا کہ ہم نے دیکھا ہے اس لیے وہ کتاب میں لکھنے والے کے ممکن ہے کہ کوئی شاذ و نادر واقعہ اس قسم کا علم میں آ گیا ہو ورنہ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ گدھا گدھے کی طرف رجحان کر کے "اِدْخَالُ الْفَرْجِ فِی الْفَرْجِ" کے ساتھ قضائے شہوت کر رہا ہو، ہم نے آج تک یہ نقشہ نہیں دیکھا حالانکہ ہمارے اردگرد گدھوں کی بہتات ہے اور خنازیر کے بارے میں ہم کہہ نہیں سکتے کہ خنزیروں کے اندر بھی اس قسم کی عادت ہو چونکہ ایسی جگہ ہمیں کوئی وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا کہ اس جانور کے کوائف ہم دیکھتے۔

بہر حال اس کتاب کے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی حیوانوں کے اندر یہ بات نہیں کہ نر قضائے شہوت کے لیے نر کی طرف رجحان کرے لہٰذا اس حرکت کو ہم حیوانی فطرت کا تقاضہ بھی نہیں کہہ سکتے، حیوان تو یہ کام کرتے نہیں یہ تو خالص شیطانی حرکت ہے، اس کو شیطان کے بغیر کسی دوسرے کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا ہے، یہ حیوانیت کا تقاضہ نہیں ہے، یہ خالص شیطنت ہے۔

لواطت کی اشاعت براہ راست شیطان نے کی ہے:

چنانچہ اس بری عادت کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بعض جگہ یہ بات نظر سے گزری ہے کہ قوم لوط کے اندر یہ جو عادت پھیلی تھی اس کی ابتداء کیسے ہوئی؟ جب یہ بالکل خلاف فطرت ہے تو انسان کے دل و دماغ میں فطرت کے خلاف ایسا خیال ہی نہیں آنا چاہیے مثلاً گندگی کھانا خلاف فطرت ہے تو کبھی کسی شخص کا رجحان گندگی کھانے کی طرف نہیں ہوتا، اینٹ پتھر کھانا خلاف فطرت ہے تو آپ میں سے کبھی کسی شخص کے دل میں وسوسہ نہیں آتا کہ ہم اینٹ پتھر کھا لیں، جو چیز فطرت کے خلاف ہے اس کا دل میں خیال ہی نہیں آنا چاہیے اور جو فطرت کا تقاضہ ہے وہ خواہشات دل میں ابھرتی ہیں تو جب اس فعل کو فطرت کے خلاف قرار دیتے ہیں تو بری عادت انسانوں میں آئی کہاں سے؟

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ایک جگہ ذکر کیا ہے، اسرائیلی روایات کے اندر موجود ہے کہ یہ بری عادت براہ راست شیطان کی اشاعت ہے، ایک وعظ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ ابلیس نے جس وقت

انسان کو بگاڑنا چاہا جیسا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ بات بطور چیلنج کے کہی تھی تو وہ ایک خوبصورت لونڈے کی شکل میں ایک آدمی کے باغ میں چلا گیا اور جا کر اس کے باغ کو خراب کرنا شروع کر دیا، پھل توڑنے شروع کر دیے اور شاخیں توڑنی شروع کر دیں، جس طرح سے گڑبڑ ہوتی ہے باغ والے نے اس کو پکڑ کر مارا اور مار مار کر اس کو باغ سے باہر نکال دیا، تو وہ اگلے دن پھر آ گیا پھر اس نے اسی طرح سے حرکتیں شروع کر دیں، باغ کو اجاڑنے لگ گیا تو اس نے پھر پکڑ لیا پھر اس کی زبردست طریقے سے پٹائی کی پھر اس کو باغ سے نکال دیا، اگلے دن وہ پھر آ گیا یعنی وہ باغ والا مارتا مارتا اس کو تنگ آ گیا وہ باغ میں آ کر گڑبڑ سے باز نہیں آیا آخر باغ والا اس کو پوچھتا ہے کہ بدبخت تو کسی طریقے سے باز آ بھی سکتا ہے، میں تو تجھے مار مار کر تھک گیا وہ کہنے لگا کہ ہاں ایک تدبیر ہے اس طرح سے کرو تو میں باز آ جاؤں گا، وہ کہنے لگا وہ کیا تو اس نے پھر اس فعل کی نشاندہی کی کہ میرے ساتھ یوں کرو، جب میرے ساتھ یوں کرو گے تو میں یہ نقصان کرنا چھوڑ دوں گا یہ راہنمائی اس نے کر دی تو جب وہ شخص اس کے ساتھ مبتلاء ہوا تو اس کو طبعی طور پر تلذذ حاصل ہوا تو پھر اس کو اس کی طرف رغبت ہوگئی اور اس طرح سے اس فعل کی بنیاد اٹھی، ایک سے دوسرے تک پھیلتے پھیلتے ساری قوم جو تھی وہ اس کی لپیٹ میں آ گئی۔

لواطت کا نقصان:

پھر تو حال یہ ہو گیا کہ عورتوں کی طرف سے رغبت ختم ہوگئی اور مرد مردوں کی طرف ہی مشغول ہو گئے اور ویسے بھی اس بدفعل کی خصلت ہے کہ جس کو بھی یہ عادت پڑ جائے اس کا عورت کی طرف رجحان نہیں ہوتا، وہ اپنی زندگی پھر اسی راستے میں برباد کرتا ہے، عورت کی طرف رجحان اس طرح سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے عورت کو کھیت قرار دیا اور یہ فعل اس طرح سے ہے کہ جیسے کھیتی بوئی جاتی ہے اور اس کو پانی دیا جاتا ہے اور اس سے ہی نسل پیدا ہوتی ہے جو آپ کے سامنے موجود ہے اور اس مقام میں جو یہ قضائے شہوت کی جاتی ہے یہ تو ایسے ہی ہے جیسے بالکل بنجر ویران ردی زمین کے اندر بیج بھی ضائع کر دیا اور پانی بھی ضائع کر دیا تو اس فطرت کا نتیجہ یہ ہے کہ نسل بھی منقطع اور اس طرح سے انسان کو غیر مصرف کے اندر استعمال کرنے کے ساتھ انسانیت کی بھی بڑے درجے کی توہین ہے، اس عادت میں مبتلاء ہو جانے کے بعد دنیا اجڑتی ہے، نسل منقطع ہوتی ہے یوں سمجھو کہ بنجر سیراب ہونا شروع ہو گئے اور کھیتیاں اجڑ گئیں، ویران ہو گئیں اور اس کا نتیجہ اس دنیا کے اندر سوائے تباہی بربادی کے اور کیا ہوتا ہے۔

لواطت زنا سے بھی سخت ہے:

اس لیے اس فعل کو زنا کے مقابلے میں زیادہ برا قرار دیا گیا ہے یعنی مرد کا عورت کی طرف رجحان تو ایک فطری بات ہے فرق یہ ہے کہ اگر اس رجحان کو آپ شرعی قاعدے کے تحت رکھیں گے تو آپ کامل انسان ہیں مرد کا عورت کی طرف رجحان ہے اور عورت کا مرد کی طرف ہے اگر تو یہ کسی قاعدے قانون کا پابند رہا جو اللہ نے بتایا ہوا ہے تو پھر تو انسان ہے اچھا مومن ہے، اچھا آدمی ہے اور اگر یہ قاعدہ قانون سے آزاد ہو گیا تو پھر آپ اس کو زیادہ سے زیادہ حیوان کہہ لیں گے، انسانیت سے نکل گئے آپ مسلمان نہیں مومن نہیں ایمان کا تقاضہ نہیں البتہ حیوانیت سے باہر نہیں ہے، اسلام اور ایمان کا تقاضہ ہے کہ اس رجحان کو باقی رکھو لیکن کسی قاعدے قانون کے تحت یہاں قضائے شہوت کرو یہاں نہ کرو، یہاں نکاح کرو یہاں نہ کرو، ایسے وقت جماع کرو ایسے وقت میں نہ کرو یہ حالات ہیں جو پابندیاں لگادی گئیں ان پابندیوں کی رعایت رکھتے ہوئے اگر آپ چلیں گے تو یہ اسلام اور ایمان کا تقاضہ ہے اور اگر ان پابندیوں کی رعایت نہیں رکھو گے تو زیادہ سے زیادہ حیوانیت ہے، اس فعل کی طرح یہ شیطنت نہیں تو شریعت نے اس کو اس لیے زنا کے مقابلے میں زیادہ برا قرار دیا چونکہ یہ واقعہ پہلی دفعہ آیا ہے اس لیے میں اس کی تفصیل آپ کے سامنے کر رہا ہوں پھر یہ بار بار آئے گا پھر اس کی اتنی تفصیل نہیں ہوگی۔

لواطت کی سزا حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور فقہاء رحمہم اللہ کی زبانی:

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مَنْ وَجَدْ تُمُوْهُ فَعَمِلَ عَمَلاً قَوْمَ لُوْطٍ فَاقْتُلْ الفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ" جس شخص کو تم پاؤ کہ وہ قوم لوط والا عمل کرتا ہے تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دو، یہ خطاب حکام کو ہے کیونکہ یہ سزا دینا حاکموں کا کام ہے، حکومت کا کام ہے، حد اور قصاص کے طور پر عام آدمی عام آدمی کو قتل نہیں کر سکتا یہ مسئلہ یاد رکھیے، یہ حکومت کے فرائض میں شامل ہے کہ زنا کا انسداد کرے، لواطت کا انسداد کرے اور یہ تعزیری احکام حکومت کو دیے گئے ہیں ایک روایت میں تو یہ ہے اور بعض روایت میں ہے کہ ان کو پتھر پتھر مار مار کر مار دو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کلام کے اندر اس قسم کی شدت موجود ہے۔

اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ تو فرمایا کرتے تھے کہ فاعل مفعول دونوں کو قتل کرنے کے بعد ان کی لاشوں کو جلا دینا چاہیے، ان کو عام انسانوں کی طرح دفن بھی نہیں کرنا

چاہیے، اور بعضے صحابہ کا قول یہ ہے کہ کسی بوسیدہ عمارت کے نیچے کھڑا کر کے ان کے اوپر اس مکان کو گرا دیا جائے تا کہ جس طرح سے قوم لوط برباد ہوئی تھی ان کی بربادی بھی اسی طرح سے ہو اور غالباً ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول آتا ہے کہ اس آبادی کے اندر اونچی سے اونچی عمارت پر لے جا کر ان کو سر کے بل گرا دیا جائے اس طرح سے ان کی گردن ٹوٹے اور اس طرح سے ان کو الٹا کر کے مارا جائے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کے اندر بھی اس قسم کی شدت نمایاں ہے، کوئی زندہ جلانے کو کہتا ہے اور کوئی قتل کرنے کو کہتا ہے، کوئی عمارت کے نیچے دے کر مارنے کو کہتا ہے، کوئی پہاڑ کی چوٹی یا اونچی عمارت سے گرا کر مارنے کو کہتا ہے تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان سب باتوں کے اندر شدت ہے۔

اور آگے ائمہ فقہاء کے ہاں بھی اسی طرح سے ہے، حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ فعل زنا کے حکم میں نہیں یعنی اس پر زنا والی سزا نہیں آتی، تعزیر ہے حاکم کو اختیار ہے کہ سخت سے سخت سزا دے کر اس فعل کو روکے اور اگر اس کے بار بار تنبیہ کرنے کے باوجود وہ نہیں رکتا تو قتل کرنے کی بھی اجازت ہے تعزیر کی حدود یہاں تک وسیع ہیں اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس فعل کی سزا ثبوت مہیا ہو جانے کے بعد قتل ہے فاعل اور مفعول یہ دونوں کو قتل کر دو اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ بالکل زنا کے حکم میں ہے کہ اگر فاعل شادی شدہ ہو تو اس کو سنگسار کر دو اور اسی طرح مفعول کے بارے میں ہے اور اسی طرح سو سو درے لگاؤ اور سال سال کے لیے ان کو جیل میں ڈال دو، بہر حال یہ فقہ کے اندر جو مختلف اقوال موجود ہیں تو ان مختلف اقوال کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کی نظر میں بھی اس فعل میں شدت زنا کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے عذاب:

تو یہ قوم لوط جو اس کے اندر مبتلاء تھی ادھر حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو روکا سمجھایا یہ نہیں باز آئے تو آخر ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا ہوئی تھی اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۃ ہود میں آئے گی، حضرت لوط علیہ السلام سمجھاتے تھے اور وہ لوگ سمجھتے نہیں تھے، الٹا یہ ڈھٹائی کی انتہاء ہے "اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ" کہ حضرت لوط علیہ السلام ان کے سامنے جب اس طرح کی تقریر کرتے تو وہ لوگ مذاق کرتے، بڑے پاک صاف لوگ ہیں، بڑے صوفی ہیں، ہم گندے ہیں، ہم گناہ گار ہیں انہیں کہو کہ تم کو ان گناہ گاروں میں رہنے کی کیا ضرورت ہے ان کو نکالو، یہ جائیں کسی اور جگہ ہمارے اندر ان کے رہنے کا کیا کام، یہ الٹا ان کا اس طرح سے استہزاء کرتے اور مذاق کرتے "اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ" یہ گویا کہ ایک قسم کا استہزاء ہے کہ یہ بڑے پاک صاف لوگ

ہیں، ان کو ہم گندوں سے کیا تعلق، ہم تو ایسے ہیں ان کو کہو کہ نکلو یہاں سے وہاں چلے جاؤ جہاں تمہارے جیسے کوئی پاک صاف لوگ موجود ہوں اس قسم کی دھمکیاں دیتے تھے۔

تو آخر میں نتیجہ وہی ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے، عذاب کا وقت آیا تفصیل آئے گی سورۃ ہود میں کہ فرشتے جو تھے وہ نوجوان لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں مہمان ہو گئے، جس وقت وہ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر میں آ گئے تو ایک نبی مہمان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے مہمان کا اکرام اور اس کا احترام اس کو کھلانا پلانا عزت سے رکھنا یہ تو ایمان کا تقاضہ ہے لیکن سورۃ ہود میں یہ لفظ آئیں گے کہ جس وقت وہ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر میں آئے تو ان کی وجہ سے لوط علیہ السلام غم میں مبتلاء ہو گئے کہ یہ میرے گھر میں کیوں آ گئے، ان کی وجہ سے دل تنگ ہو گیا، جب لوط علیہ السلام ان کو دیکھ کر غم زدہ ہو گئے کہ یہ میرے گھر میں کیوں آ گئے، وجہ کیا کہ قوم کو پتہ چلے گا کہ یہ خوبصورت لڑکے یہاں آئے ہیں، وہ قوم آ جائے گی حملہ کر کے مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گی تو میں ان مہمانوں کو کس طرح سے بچاؤں گا اور ان کی عزت کا تحفظ کیسے کروں گا، اس وجہ سے غم طاری ہو گیا۔

چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ قوم کو جب پتہ چلا تو سارے کے سارے حملہ کر کے آ گئے اس طرح سے آ گئے جس طرح سے پیچھے سے کوئی دھکا کر بھگا رہا ہے یعنی بے حیائی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ کوئی شرم و حیا تو رہی نہیں تھی آ کے مکان کا گھیراؤ ال لیا اور کہنے لگے کہ یہ لڑکے ہمارے سپرد کرو، ہم نے تمہیں پہلے جو کہا ہے کہ آنے جانے والوں کو ہمارے حال پر رہنے دیا کرو، آپ نہ سنبھالا کریں یہ آپ نے کیوں رکھے ہیں یہ ہمارے سپرد کرو، اب مہمان گھر میں بیٹھے ہیں، حضرت لوط علیہ السلام کے نزدیک ان کی عزت کا مسئلہ ہے ہر طرح سے ان کو سمجھایا کہ دیکھو! مجھے رسواء نہ کرو یہ میرے مہمان ہیں، ایسا نہ کرو مجھے ان کی نظر میں رسوا نہ کرو کہ یہ کیا کہیں گے کہ اچھے شریف آدمی کے گھر ہم گئے تھے کہ وہ ہمارا تحفظ ہی نہیں کر سکا، ہماری عزت کا خیال ہی نہیں کر سکا، ان کی نظر میں مجھے ذلیل نہ کرو یہ میرے مہمان ہیں ان کو رہنے دو، لیکن وہ باز نہیں آئے حتیٰ کہ تنگ آ کر حضرت لوط علیہ السلام کے یہ لفظ بھی سورۃ ہود کے اندر آئے ہیں "هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ" یہ انتہائی درجے کی پریشانی کے حالات ہیں جیسے کسی کو غیرت دلانے کے لیے انسان کہتا ہے کہ بدبختو! اگر تم کسی طرح سے باز نہیں آ سکتے تو یہ تو میرے مہمان ہیں ان کو چھوڑو میری بیٹیاں بیٹھی ہیں ان کو لے لو، یہ انتہائی درجے کے ایک انسان کے عجز کے لفظ ہوتے ہیں۔

جس طرح سے آپ کا استاذ ہے آپ دو آدمی لڑ رہے ہیں جھگڑ رہے ہیں اور ایک آدمی کو بڑا غصہ چڑھا ہوا

ہے وہ کہتا ہے کہ میں تو ماروں گا میں تو نہیں چھوڑتا وہ ہر طرح سے سمجھاتے ہیں تو وہ آگے سے کہے آپ کا بزرگ، آپ کا بڑا بھائی، باپ استاذ ہر قسم کے واقعات معاشرے میں پیش آجاتے ہیں کہ بھائی اگر کسی طرح سے بھی تیرا غصہ نہیں اترتا ہے تو میرا سر حاضر ہے تو مجھے جوتا لگالے، اب اگر کسی کے دل میں ذرا برابر بھی غیرت ہوتی ہے تو ایسے وقت میں پانی پانی ہو جاتا ہے اس قسم کے لفظ سننے کے بعد تو حضرت لوط علیہ السلام نے یہاں تک کہا لیکن وہ کہنے لگے کہ تجھے پتہ ہے کہ عورتوں کی طرف ہمیں رغبت ہی نہیں ہے۔

تو جب حضرت لوط علیہ السلام انتہائی عاجز آگئے اور ان کے منہ سے یہ لفظ نکلے کہ "لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ" اے کاش! میرے پاس اگر قوت ہوتی اور طاقت ہوتی جس کے ساتھ میں تمہارا مقابلہ کرتا یا میرا کوئی اور سہارا ہی ہوتا جو اس وقت مجھے مدد دیتا تو آج میں اس مصیبت سے اپنے مہمانوں کو بچا لیتا تو جب حضرت لوط علیہ السلام نے اس قسم کی اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو فرشتوں نے اشارہ کیا کہ آپ کیا سمجھ رہے ہیں، یہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے، فکر نہ کیجیے ہم تو اللہ کی طرف سے ان کے لیے عذاب لے کر آئے ہیں، ہم تو فرشتے ہیں، پھر انہوں نے اشارہ کیا جب اشارہ کیا تو حضرت لوط علیہ السلام بات کو سمجھ گئے، کہنے لگے ان کو اس حال پر رہنے دیجیے، یہ رات گزرنے دو تم راتو رات اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ، فرشتوں نے پھر حضرت لوط علیہ السلام سے یہ کہا کہ صبح ان کا خاتمہ ہو جائے گا، رہنے دیجیے یہ رات گزرنے دو جس طرح سے کر رہے ہیں، آپ یہاں سے راتو رات اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جائیں اپنی بیوی کو نہ ساتھ لے کر جانا کیونکہ یہ اسی قوم کی تھی اور کافرہ تھی اس کی ہمدردیاں قوم کے ساتھ تھیں۔

چنانچہ رات ہوئی تو حضرت لوط علیہ السلام خود اور اپنی بچیوں کو اور ان مومنوں کو لے کر نکل گئے اور بعد میں اس قوم کے اوپر ان بستیوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پتھروں کی بارش ہوئی اور بستیاں جو ہیں جس طرح بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے ان کو اٹھا کر اس طرح سے پلٹا کہ اوپر کا حصہ نیچے کو اور نیچے کا حصہ اوپر کو ہو گیا ان لفظوں سے اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ ان کا نچلا حصہ اوپر ہو گیا تھا تو لفظی ترجمہ کے تحت اگر دیکھا جائے تو ایسے ہی ہے جیسے تفسیری روایات میں موجود ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے وہ ٹکڑا اٹھایا اور اٹھانے کے بعد اس کو یوں کر کے پلٹا دیا پتھروں کی بارش ہوئی اس طرح سے ان کو سنگسار کیا اور پھر اس طرح سے ان کی بستیاں جو تھیں وہ الٹ دیں گئیں ورنہ اگر ان لفظوں کو محاورے پر محمول کیا جائے تو جس طرح سے کہتے ہیں کہ فلاں شہر کو تہہ د

بالا کردیا اس کا مطلب یہ ہے کہ عمارتیں گر گئیں اجڑ گیا اور سارے کا سارا ستیاناس ہو گیا اسی طرح سے وہ شہر گر گیا تہہ و بالا ہو گیا اور ان کے اوپر پتھروں کی بارش برسی اور یہ جتنے پلید تھے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سارے کے سارے معاشرے کو یوں ختم کر دیا تو اس فعل کی سزا اس قوم کے اوپر مجموعی حیثیت میں جو آئی اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورہ ہود میں آئے گی۔

آخر نتیجہ یہ نکلا " وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا "اس مطر سے وہی سجیل کا لفظ آئے گا، سجیل کہتے ہیں سنگ گل کو یہ سنگ گل سے معرب ہے کھنگروں والے پتھر برسے ان پر اللہ کی طرف سے اور یہ ساری کی ساری قوم جو تھی وہ تباہ ہو گئی تو "مطرا" کا مصداق یہاں وہی پتھروں کا برسنا ہے "فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ" یہ خطاب ہے ہر سننے والے پڑھنے والے کو کہ اے مخاطب! اے مخاطب کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ ہر مخاطب کو یہ خطاب ہے کوئی ایک متعین نہیں، دیکھو! مجرموں کا انجام کیسے ہوا۔

اب اگر انفرادی طور پر کوئی شخص اس فعل کے اندر مبتلاء ہو تو ٹھیک ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مہلت ملتی ہے اس کے اوپر پتھر نہیں برستے اور وہ زمین میں دھنستا نہیں ہے لیکن اس سے گناہ کی شناعت کا آپ اندازہ کر لیجئے کہ آخرت کے اعتبار سے وہ ایسے ہی ہے کہ اس کو بدترین قسم کی سزا ملے گی جو زانی کے مقابلے میں بھی زیادہ ہو گی، وہ تو آخرت میں ہو گی ویسے دنیا کے اندر بھی اس قسم کے لوگوں کی تباہی اور ذلت قابل عبرت ہو گی مختلف حالات کے اعتبار سے ذلیل ہو جائیں گے، صحت برباد ہو جائے گی حوصلہ نہیں رہتا اور احساس کمتری میں مبتلاء ہوتا ہے اس قسم کی مصیبتوں میں مبتلاء ہونے کے بعد ایک قسم کی دنیا کے اندر بھی ذلت کی زندگی گزرتی ہے اور اگر یہ فعل ظاہر ہو جائے، پکڑا جائے، کھل جائے تو پھر تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کیسی ذلت ہوتی ہے اس کا تو پھر کہنا ہی کیا، تو یہ "عاقبة المجرمين" کو پیش کر کے متنبہ کیا جا رہا ہے کہ نیک بخت وہ ہوا کرتے ہیں جو دوسروں کا حال دیکھ کر عبرت حاصل کر لیں تو ان مجرموں کا انجام دیکھو تو تمہیں پتہ چلے کہ اس جرم کے ارتکاب کرنے والوں کا آخر کیا نتیجہ نکلا ہے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

اور بھیجا ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو ۔ شعیب نے کہا کہ اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارے لیے

مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ

کوئی معبود اس کے علاوہ ، تحقیق آگئی تمہارے پاس واضح دلیل تمہارے رب کی طرف سے ، پورا کرو کیل کو

وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ

اور میزان کو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کرکے نہ دیا کرو اور فساد نہ مچاؤ زمین میں

بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۗ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ ﴿۸۵﴾

اس زمین کی اصلاح کے بعد ، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم یقین کرنے والے ہو ﴿۸۵﴾

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ

اور نہ بیٹھا کرو ہر راستے پر کہ تم ڈراتے ہو اور تم راستے سے روکتے ہو

اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا

اللہ کے اس شخص کو جو اللہ کے ساتھ ایمان لائے اور طلب کرتے ہو تم اس راستے میں کجی یاد کرو جب کہ تم تھوڑے تھے

فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِنْ كَانَ

پھر اللہ نے تمہیں زیادہ کردیا اور غور کرو کہ کیسے انجام ہوا فساد کرنے والوں کا ﴿۸۶﴾ اور اگر

طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا

تم میں سے ایک گروہ ایمان لایا اس چیز کے ساتھ جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا

فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

تو تم صبر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کردے اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۸۷﴾

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ

کہا ان وڈیروں نے جنہوں نے تکبر کیا تھا اس کی قوم میں سے البتہ ضرور نکال دیں گے اے شعیب تجھے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ

اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنے شہر سے یا البتہ ضرور لوٹ آؤ گے تم ہمارے طریقے میں، شعیب نے کہا

اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ

کہ کیا تم ہمیں نکال دو گے اگرچہ ہم کراہت کرنے والے ہوں ﴿۸۸﴾ تحقیق ہم نے جھوٹ گھڑا اللہ پر اگر ہم لوٹ کر آگئے

مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ

تمہارے طریقے میں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں نجات دے دی اور نہیں ہے ہمارے لیے کہ ہم لوٹ کے آئیں گے

فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ

تمہارے طریقے میں مگر چاہنا ہمارے اللہ کا جو ہمارا رب ہے، وسیع ہے ہمارا رب ہر چیز سے (ازروئے علم کے)،

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ

ہم نے اللہ پر ہی بھروسہ کیا، اے ہمارے پروردگار! فیصلہ کر دے ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک

وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ

اور تو بہت اچھا فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۸۹﴾ کہا ان سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا تھا اس کی قوم میں سے البتہ اگر

اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

اتباع کی تم نے شعیب کی تو بے شک تم البتہ خسارہ پانے والے ہو جاؤ گے ﴿۹۰﴾ پس پکڑ لیا ان کو زلزلے نے

فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ

پھر ہو گئے وہ اپنے گھروں کے اندر منہ کے بل گرنے والے ﴿۹۱﴾ وہ لوگ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا گویا کہ

لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾

وہ اس بستی میں رہے ہی نہیں، وہ لوگ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی خسارہ پانے والے تھے ﴿۹۲﴾

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ

پھر منہ پھیر لیا شعیب نے ان سے اور فرمایا کہ اے میری قوم! تحقیق پہنچا دیے ہیں میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغامات اور میں نے خیر خواہی کی

لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

تمہارے لیے، کیسے افسوس کروں میں کفر کرنے والے لوگوں پر ﴿۹۳﴾

تفسیر:

حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کے حال کا خلاصہ:

گزشتہ امتوں کے واقعات کا سلسلہ آپ کے سامنے شروع ہے اور یہ اس سلسلے میں غالباً پانچواں واقعہ ہے حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا، چار واقعے پہلے گزر چکے ہیں اور آپ نے ترجمے سے ہی خیال فرمالیا ہوگا کہ اکثر و بیشتر الفاظ آپس میں ملتے جلتے ہیں، انبیاء علیہم کا طرز تقریر ایک ہی ہے اور بد بخت قوم جو مانتی نہیں ان کے آگے سے جو اشکالات یا جو باتیں ہیں وہ بھی ایک ہی انداز کی ہیں، چند الفاظ کا فرق ہے، وہ جو قومی خصوصیات ہیں کہ پیچھے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا ذکر آیا تھا ان میں اخلاقی بدکرداری تھی حضرت لوط علیہ السلام کی کلام کے اندر اس کے اوپر زور دیا گیا تھا اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم جہاں شرک کے اندر مبتلاء تھی وہاں بد معاملگی کے اندر بھی مبتلاء تھی، ان کا معاملہ خراب تھا جیسے ان کے اخلاق برباد تھے ویسے ان کا معاملہ خراب تھا، لین دین کے بہت گندے تھے یعنی یہ تاجر قوم تھی شاہراہ پر واقع تھی جہاں سے قافلے گزرتے تھے اور تاجر ہونے کی وجہ سے ان کے اندر کم تولنے اور کم ماپنے کی بیماری تھی جب یہ کسی سے لیتے تھے تو پورا لیتے تھے اور جس وقت دیتے تو وہ اپنی چابک دستی کے ساتھ وزن کا تول ٹھیک نہ دیتے گویا کہ دوسرے کا حق دبا جاتے یہ لین دین کی خرابی اور حقوق العباد کے اندر کوتاہی اس قوم کا شعار تھا۔

اور اکثر تاجر طبقے میں ایسی بیماریاں ہوتی ہیں، تاجر طبقے میں جو بیماری ہوتی ہے وہ زیادہ تر بد معاملگی کی ہوتی ہے، چابک دستی کے ساتھ ڈنڈی ماری اور سیر کی بجائے تین پاؤ دے دیا، اور پیمانے کے ساتھ ماپتے ہوئے جس طرح سے دودھ والے کرتے ہیں کہ دودھ کا پوا بھر تو ٹھیک لیا لیکن ڈالتے ہوئے گڑ بڑ کر جاتے ہیں اور یہ بری عادت اور یہ چسکا پورا ہو جاتا ہے اور لوگوں کے حقوق تلف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم اس طرح سے کمائی زیادہ کر لیتے ہیں حالانکہ یہ ایسی چیز ہے جو دنیا کے اندر بے اعتباری پیدا کر کے کاروبار کو نقصان پہنچاتی ہے، اگر کسی تاجر کے متعلق پتہ چل جائے کہ یہ صحیح نہیں تولتا تو لوگ اس کے پاس خرید و فروخت کے لیے جاتے ہی نہیں ہیں، کاروبار

خراب ہو جاتا ہے اور اگر کوئی تاجر دیانت دار ہو جو دوسرے سے لیتے وقت صحیح پیمائش کر کے اور صحیح اندازے کے ساتھ چیز لیتا ہے اور دیتے وقت بھی اسی طرح سے صحیح دیتا ہے تو اس کا اعتبار بڑھ جاتا ہے اور اس کی تجارت کو فروغ ملتا ہے اور نفع بھی زیادہ ہوتا ہے تو دنیا کے اندر بھی پورا تولنا اور پورا ماپنا یہ مفید ہے اپنے کاروبار کے نظریے سے بھی، آخرت کے اندر تو ہے ہی کہ جو شخص یہ کوتاہی کرتا ہے کہ لوگوں کے حقوق دبا لیتا ہے آخرت میں جب حساب دینا پڑے گا تب پتہ چلے گا جہاں پیسے تو ہوں گے نہیں پھر اپنی نیکیاں اہل حقوق کو دینی پڑیں گی جن کے حقوق دبائے ہیں اور اس طرح سے زندگی بھر کی نیکیوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے جن کو دنیا کے اندر ڈنڈی مارنے کی یا اس طرح سے پیمائش کرتے وقت کوئی گڑبڑ کرنے کی عادت ہوتی ہے تو آخرت کی تباہی بھی ہے۔

اور دنیا کی تباہی بھی ہے تو حضرت شعیب علیہ السلام کی تقریر میں دونوں باتوں کا ہی ذکر ہے، شرک کی تردید بھی ہے اور معاملے کی اصلاح بھی ہے تو پھر یہ لوگ چونکہ تاجر تھے اور بیٹھے تھے شاہراہ پر قافلے گزرتے رہتے تھے تو ان کو ڈاکے ڈالنے کی بھی عادت تھی، اکیلا آدمی ملا تو اس کو لوٹ لیا یا کوئی باہر سے آنے والے ہوتے اور یہ راستے میں چھپ کر بیٹھے ہوئے ہوتے ان کو ڈراتے دھمکاتے ان سے کوئی فیس وصول کرتے جیسے پاکستان میں آج کل غنڈا ٹیکس چل رہا ہے کہ غنڈے مل کر کسی اڈے پر یا کسی منڈی پر قبضہ کر لیتے ہیں اور پھر جو ان کو ٹیکس ادا کرتا ہے اس کو تو گزرنے دیتے ہیں اور جو ٹیکس ادا نہیں کرتا اس کو پھر تکلیف پہنچاتے ہیں اس طرح سے آنے جانے والوں پر یوں بھی اپنی دھونس جماتے تھے، چونکہ بیٹھے تھے شاہراہ پر اور طاقت ور قبیلہ تھا تو یہ بات بھی ان کے اندر تھی دھونس جمانے کی اور دوسرے کو ڈرانے کی اور دھمکانے کی اور اس سے اس طرح مختلف فائدے اٹھانے کی کوشش کرتے، یا جو شخص شعیب علیہ السلام کو ملنے کے لیے آتا اس کو راستے میں ڈراتے دھمکاتے کہ دیکھو تم اس کے پاس نہ جانا اگر تم ایمان لے آئے اور اس کے پاس گئے تو ہم یوں کر دیں گے اس طرح سے بھی وہ کرتے تھے تو یہ ایک نئی چیز ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام کی تقریر میں آئی ہوئی ہے ورنہ وہی باتیں ہیں جو پہلے انبیاء علیہم السلام کی تقریر میں گزری ہیں اور آگے سے قوم ماننے والی نہیں تھی وہ کہتے تھے کہ دیکھو! مال ہمارا ہے اور ہم اپنی مرضی کے ساتھ تجارت کرتے ہیں تو جس صورت میں ہمیں نفع زیادہ ہو ہمیں ایسا کرنا چاہیے ہم آپ کے پیچھے لگ کر اپنا کاروبار کیسے تباہ کر لیں۔

جیسے آج عام طور پر آپ نے دیکھا ہوگا گزشتہ امتوں کی بیماریاں آج بھی اگر آپ کاروباری طبقے کے اندر بیٹھیں گے اور باتیں سنیں گے تو اکثر و بیشتر ان کی زبان پر ایک ہی بات آتی ہے کہ بھائی آج کل اگر دیانت داری کریں تو کاروبار ہی ٹھپ ہوتا ہے، جب ہر طرف بددیانتی ہے تو دیانت دار آدمی منڈی میں بیٹھ کر کیسے کاروبار

کر لے، اگر دیانت داری برتیں تو کام کیسے چلے اس لیے جب یہ ملاوٹ کا دور چل رہا ہے تو ہر کوئی ضرورت سمجھتا ہے کہ ملاوٹ کریں اور جس طرح سے دھوکہ دہی چل رہی ہے تو سارے کے سارے جس وقت ایک رو آتی ہے سیلاب آتا ہے تو سارے کے سارے ہی اس میں خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں تو اب بھی ذہن وہی ہے کہ اب اگر ان کی بات مان لی جائے گی کہ یوں نہ بیچو یہ غلط ہے، یوں نہ تولو یہ غلط ہے تو پھر تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنا کاروبار ہی برباد کر لیں، آج کل دیانت داری سے کام نہیں چلتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ علی الاعلان ڈھٹائی کے ساتھ بددیانتی کرتے ہیں اور خیانت کرتے ہیں کم تولنا کم ماپنا، ملاوٹ کرنا تاجروں کے اندر آج بھی یہ بیماریاں اسی طرح سے عروج پر ہیں جس طرح سے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانے میں تھیں، ان کو بھی یہی اشکال تھا کہ ہم اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے ساتھ تصرف کرتے ہیں جیسے چاہیں کریں تمہارا اس میں کیا دخل؟ سورہ ہود کے اندر قوم کی تقریر اسی انداز کی آئے گی شعیب علیہ السلام کے مقابلے میں کہ کیا تیری نماز تجھے یہی سکھاتی ہے کہ ہم اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے ساتھ تصرف نہ کریں اور اپنے باپ دادا کا طریقہ چھوڑ دیں جس کی پوجا ہمارے باپ دادا کرتے ہیں ان کو ترک کر دیں یہ کیسے ہو سکتا ہے تو قوم آگے سے یہی جواب دیتی ہے جب حضرت شعیب علیہ السلام بار بار سمجھاتے۔

چونکہ حضرت شعیب علیہ السلام اور آپ کی جماعت بظاہر دیکھنے میں غریب اور کمزور تھی نہ ان کے پاس مال اور نہ ان کے پاس دولت اور نہ ان کے پاس ظاہری طور پر وہ قوت تو پھر وہ سرمایہ دار طبقہ جس وقت اس طبقے کو اپنی خواہشات کے درمیان رکاوٹیں پیدا کرنے والا سمجھتا ہے کہ یہ ہمیں پوری طرح سے کمانے نہیں دیتے، ہماری مرضی کے مطابق ہمیں رہنے نہیں دیتے ہماری چوہدراہٹ ختم کرتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ آنے والوں پر دھونس نہ جمایا کرو تو پھر قوموں پر ہمارا رعب کیسے رہے گا؟ اب کم از کم لوگ جو چلتے ہیں تو ہم سے ڈرتے ہیں اور کم از کم ہمیں سلام کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اس طرح سے وہ ہمیں فیسیں دے دے کر گزرتے ہیں تو کس طرح سے ہماری بالادستی ہے اور اگر ان کی باتیں مان لی جائیں تو ہمارا قوموں کے درمیان کیا مقام رہ جائے گا اور ہم کمائیں گے کس طرح سے، ہماری آمدنی میں فرق پڑ جائے گا تو جب اس قسم کی باتیں محسوس کرتے ہیں تو آخر پھر وہی جاہلوں والا حربہ ہے کہ یا تو یہ طریقہ چھوڑ دو یا ہمیں روکنا چھوڑ دو اور ہمارے طریقے پر آ جاؤ ورنہ ہم پھر تمہیں شہر میں نہیں رہنے دیں گے، شہر سے نکال دیں گے، آخر کار یہی دھمکی ہوتی ہے پہلے بھی آپ کے سامنے اس قسم کی دھمکی آئی۔

جب وہ نکالنے کی دھمکی دیتے ہیں تو پھر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب یہ قوم سنبھلنے سدھرنے کے قابل نہیں رہی

تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا ایک ہی جھاڑو آتا ہے سب کچھ سمیٹ دیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہوتے ہیں ان کے لیے زمین خالی ہو جاتی ہے اور اس قسم کا پلید گروہ جتنا ہوتا ہے سب کو صاف کر دیا جاتا ہے تو پھر نتیجہ نکال کر بتا دیا کہ وہ تو کہتے تھے کہ شعیب علیہ السلام کے پیچھے لگنے میں خسارہ ہے وہ خسارہ یہی کہ مال کم ہو جائے گا اور ہماری چوہدراہٹ ختم ہو جائے گی، وہ کہتے تھے کہ جو شعیب علیہ السلام کے پیچھے لگ رہے ہیں وہ خسارہ پانے والے ہیں لیکن آنے والے وقت نے ظاہر کر دیا کہ خسارے میں وہی رہے جنہوں نے شعیب علیہ السلام کی بات نہیں مانی اور جنہوں نے شعیب علیہ السلام کی بات مان لی حقیقت کے اعتبار سے دنیا اور آخرت میں نفع والے وہی رہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام قوم کی بربادی دیکھتے ہیں تو بطور افسوس کے کہتے ہیں یعنی اس عذاب کے آنے کے بعد انہوں نے اپنی قوم کو اس طرح سے پڑے ہوئے دیکھا تب خطاب کیا تو یہ محض اظہار افسوس ہے اور اگر سمجھانے کے بعد ہی جب دیکھا کہ اب یہ سمجھتے نہیں ہیں تو اس وقت ان سے منہ موڑ لیا جب عذاب کے آثار نظر آ گئے تو اس وقت ان کو کہنا تو یہ ایک قسم کی آخری تنبیہ ہے کہ بھائی میں نے تو تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے اور جتنی خیر خواہی میں تمہارے ساتھ کر سکتا تھا میں نے کر لی لیکن تم نے اللہ کے حکم کو نہیں مانا اور نہ میری خیر خواہی کی قدر کی اور تم کافر لوگ ہو، بھاڑ میں جاؤ مجھے کیا جو چاہو کرو تمہارا جو چاہے انجام ہو "كَيْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ" جس طرح سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے محاورے کے طور پر مطلب ظاہر کرنے کے لیے کہا کہ ایسی تیسی بھاڑ میں جائیں ہمیں کیا مطلب ان کا جو بھی نتیجہ نکلے ہمیں کیا، ہم جو بھی خیر خواہی کرتے ہیں اور یہ ہمیں خیر خواہ سمجھ کر ہماری بات کی قدر نہیں کرتے ہم ان کو ان کے پروردگار اور ان کے اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں تو یہ کان نہیں دھرتے تو یہ بھاڑ میں جائیں، جہنم میں جائیں ہمیں کیا پھر یہ آخری گویا کہ مایوس کن بات ہوتی ہے جو پیغمبر کی زبان سے نکلتی ہے یہی ہے سارے واقعہ کا حاصل جو آپ کے سامنے پڑھا گیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کا حال قرآن کی زبان میں:

"وَاِلٰی مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا" مدین سے یا تو شہر مراد ہے تو اہل مدین مراد ہیں، ذکر یونہی کیا جاتا ہے کہ فلاں شہر کی طرف فلاں پیغمبر آیا مراد ہوتے ہیں شہر والے یا مدین سے قبیلہ مراد ہے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے تو مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا "قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ

اِلٰہٍ غَیْرُہٗ" یہ تو وہی نعرہ توحید ہے، جس طرح سے ہر پیغمبر اپنی قوم کے لیے لگاتا ہے کہ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، تمہارے پاس واضح دلیل آگئی تمہارے رب کی طرف سے جس سے معلوم ہو گیا کہ میں حق پر ہوں، اللہ کا فرستادہ ہوں یہ حضرت شعیب علیہ السلام کے کسی معجزے کی طرف اشارہ ہے۔

"فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ" توحید اختیار کرو اور شرک سے باز آجاؤ اور اپنے معاملات درست کر لو، پورا کرو کیل کو اور میزان کو یعنی برتن کے ساتھ غلے کا اندازہ کرنا ہو تو بھی پورا کر کے دیا کرو اور ترازو کے ساتھ تولنا ہو تو بھی پورا کر کے دیا کرو، تیسویں پارے میں ایک سورۃ آئے گی "سورۃ المطففین" وہ اسی مسئلے سے متعلق ہے، "مطففین" گھٹا کر دینے والے لفظی ترجمہ اس کا یہی ہے "وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ" مطففین کے لیے ہلاکت ہے جب لوگوں سے کیل کر کے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو کیل کر کے دیتے ہیں یا ان کو وزن کر کے دیتے ہیں تو پھر گھٹا دیتے ہیں تو وہاں بھی انہیں کا ذکر ہے تو "اَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ" تو کیل اور میزان کو پورا کیا کرو یعنی تولو تو بھی پورا تول کرو اور اگر کسی برتن وغیرہ کے ساتھ اندازہ کرو تو ٹھیک کر کے دیا کرو، لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دیا کرو "لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ" لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دیا کرو اور علاقے میں فساد نہ مچاؤ "بَعْدَ اِصْلَاحِھَا" اس کی درستگی کے بعد، جب اس علاقے میں درستگی کے قوانین جاری کر دیے گئے اور اصلاحی سکیم شروع کر دی گئی تو اب اس کی مخالفت ایک فساد ہے ایسا نہ کرو، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

"وَلَا تَقْعُدُوْا بِکُلِّ صِرَاطٍ" ہر راستے پر نہ بیٹھا کرو، راستے نہ روکا کرو لوگوں کے، بیٹھنا ان کا دونوں طرح سے ہوتا تھا یا تو لوٹ مار کرنے کے لیے جیسے قافلے گزرتے تو کوئی اکا دکا آدمی ملا تو اس کے کپڑے اتار لیے جیسے عام طور پر ہوتا ہے اور یہ دھونس جما کر ان سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے جس کو آج کل کی اصلاح میں غنڈہ ٹیکس کہتے ہیں کہ گزرنے والے کچھ نہ کچھ نذرانہ پیش کر کے جائیں تا کہ ہماری بالا دستی قائم رہے یا وہ راستوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور جو باہر سے آتا ہے اس سے پوچھتے ہیں کہ تو نے کہیں شعیب علیہ السلام کے پاس تو نہیں جانا اگر وہ کہتا کہ ہاں میں نے وہیں جانا ہے تو پھر اسے ڈراتے دھمکاتے یا اس کو دھمکیاں دیتے کہ دیکھو شہر میں جا رہے ہو وہاں فلاں شخص اس قسم کی باتیں کرتا ہے وہاں نہ جانا ورنہ جس وقت دوبارہ گزرو گے تو ہم تیری پٹائی کریں گے یوں ڈراتے دھمکاتے تھے دونوں باتیں تھیں، نہ بیٹھا کرو ہر راستے پر ڈراتے ہوئے اور اللہ کے راستے سے روکتے ہوئے اس

شخص کو جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اور طلب کرتے ہو تم اس راستے میں کجی یعنی مختلف قسم کے اعتراضات پیدا کر کے اس میں کجیاں تلاش کرتے ہو۔

آگے احسانات کو یاد دلاتا ہے کیونکہ انسان احسان سے متاثر ہوتا ہے یاد کرو جب تم تھوڑے سے تھے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں کثیر کر دیا، آج تمہاری قوم ہے، جتھا ہے، کتنی بڑی قوم بن گئی، کتنا بڑا قبیلہ بن گیا یہ اللہ کا کتنا احسان ہے تو گویا کہ کسی قوم کا قلت سے کثرت کی طرف آنا یہ بھی اللہ کا احسان ہے اس لیے تو کہتے ہیں کہ یہ خاندانی منصوبہ بندی فطرت کے خلاف ہے ورنہ کثرت تو ہمیشہ مطلوب رہی ہے اور اب یہ لوگ کثرت سے ڈرنے لگ گئے اور قلت کے طالب ہو گئے یہ بات فطرت کے خلاف ہے، نقصان دہ ہے اس لیے اس کی مخالفت کی جاتی ہے کہ یہ خاندانی منصوبہ بندی ٹھیک نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے انسان پیدا ہو جائیں قوم کے اندر کثرت ہو، اللہ تعالیٰ رزق بھی اسی حساب سے دیتا ہے، جو پیدا کرتا ہے وہ رزق بھی دیتا ہے تو یہاں دیکھو! یہ احسان جتلایا کہ تم تھوڑے سے تھے پھر اللہ نے تمہیں زیادہ کر دیا معلوم ہو گیا کہ قلت سے کثرت کی طرف آنا یہ اللہ کا احسان ہے جس کو نبی یاد دلا رہا ہے۔

”وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ“ اور دیکھو مفسدوں کا انجام کیسے ہوا ہے، یہ آپ کے سامنے تو دو لفظ نقل کیے جا رہے ہیں حضرت شعیب علیہ السلام کی اس میں مفصل تقریر یوں ہوگی کہ فلاں قوم تھی اس نے یوں فساد کیا پھر دیکھو ان کے ساتھ یہ ہوا، فلاں قوم تھی اس نے یوں فساد کیا اس کے ساتھ یہ ہوا ہے، حضرت شعیب علیہ السلام کی جو لمبی لمبی تقریریں نقل کی گئی ہیں اور بڑے اچھے انداز کے ساتھ اسی لیے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں لکھا ہے کہ ان کو کمال فصاحت کی وجہ سے ”خطیب الانبیاء“ کہا جاتا ہے یعنی حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کے کمال فصاحت کی وجہ سے ”خطیب الانبیاء“ کہا جاتا ہے یعنی خطبے کے لحاظ سے، تقریر کے لحاظ سے ان کا بہت اعلیٰ نمبر ہے ”خطیب الانبیاء“ تو یہ صرف اتنی سی بات نہیں کہ کہہ دیا گیا کہ دیکھو مفسدوں کا انجام کیسے ہوا ہے، مفسدین کی تفصیل بتائی جاتی ہے، ان کا انجام دکھایا جاتا ہے جس نے یہ عادت اختیار کی تھی دیکھ پھر اس کا جنازہ کیسے نکلا، فلاں شخص نے بھی یہ عادت اختیار کی تھی دیکھو تو صحیح کیسے وہ علم سے محروم ہو گیا، کیسے اس کی عزت گئی، کس طرح سے گھر بار برباد کر کے بیٹھ گیا یہ مثالیں دی جاتی ہیں کیونکہ ان مثالوں کے ساتھ پھر اس نصیحت میں تاثیر پیدا ہوتی ہے ایسے ہی حضرت شعیب علیہ السلام مفسدین کے واقعات سناتے ہوں گے اور ان کو ان کا انجام دکھاتے ہوں گے۔

”وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا“ یہ دو گروہ ہو گئے قوم کے اگر تم میں سے ایک گروہ ایمان لایا اس چیز

کے ساتھ جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک نہیں لایا تو ہو گیا تم میں اختلاف، اب تم دلیل کے ساتھ تو مانتے نہیں تو پھر صبر کرو، تھوڑی دیر ان حالات کو برداشت کرو حتیٰ کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے مطلب یہ ہے کہ اپنے اپنے حال پر جمے رہو پھر دیکھو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فیصلہ سامنے آ جائے گا، یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی جگر سوزی ہے، دل سوزی ہے جس کے ساتھ وہ قوم کو سمجھاتے ہیں۔

حق پھیلنے میں رکاوٹ ہمیشہ سرمایہ دار و جاگیر دار بنتے ہیں:

"قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا" دیکھو بار بار آپ کو متوجہ کر رہا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کی تحریک کا مقابلہ کرنے والے اکثر و بیشتر وہی لوگ ہیں جو معاشرے میں بڑے کہلاتے ہیں جن کو بڑائی حاصل ہوتی ہے وڈیرے، چوہدری، یہ مخالفت کیوں کرتے ہیں اس کی وجہ بھی آپ کے سامنے بارہا ذکر کی کہ ان کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم ایمان لے آئے تو یہ بن گیا بڑا اہم بن گئے چھوٹے تو ہماری یہ بڑائی اور ہمارا یہ جاہ ختم ہو جائے گا، ہمارا حلقہ ختم ہو کے ہم سارے کے سارے اس کے تابع ہو جائیں گے ایک تو یہ بڑائی نہیں ان کو جھکنے دیتی، دوسرا یہ ہے کہ مالیات کے اندر بھی چونکہ یہ لوگ اعلیٰ ہوتے ہیں تو مرضی کے ساتھ کمانا اور مرضی کے ساتھ کھانا اس لیے لذت پرستی ان میں بہت آئی ہوئی تھی، ایک غریب آدمی جو دو روپے کی مزدوری کرتا ہے کافر ہو تو دو روپے کی مزدوری مومن ہو تو اس کی دو روپے کی مزدوری، اسے کیا فرق پڑتا ہے وہ پہلے بھی تابع تھا اور ایمان لانے کے بعد بھی تابع رہا تو اس کو کیا فرق پڑا۔

اس لیے اگر اس کی عقل اس بات کو تسلیم کر لیتی ہے کہ یہ صحیح ہے پھر اس کو ماننے میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی لیکن یہ جو بڑے لوگ ہوتے ہیں یہ دیکھتے ہیں کہ اب تو ہم چوہدری ہیں، لوگ ہماری قدر کرتے ہیں اور ہمارے ہاں لوگ آ کر بیٹھتے ہیں، اپنی ضروریات ہمارے پاس لاتے ہیں، ہمارا ان کے اوپر رعب چلتا ہے اور اگر ہم نے مان لیا تو یہ بڑے بن جائیں گے اور ہم چھوٹے تو ہمارا جاہ گیا، دوسرا یہ کہ اب تو ہم نے غنڈے رکھے ہوئے ہیں ادھر ادھر سے لوٹ مار کر کے لاتے ہیں اور بیچنے والے جو ہیں وہ کم بیچ کر اور اس طرح سے کم تول کر ہمیں تجارت میں نفع زیادہ ہوتا ہے، بے ایمانی کر کے ہم جو شام کو پچاس روپے کماتے ہیں صحیح اصول پر چلیں تو ہماری آمدنی بیس روپے رہ جائے گی اور وہ تیس روپے کے جو ہم نے لذت پرستی کے اخراجات اٹھا رکھے ہیں کہ اچھا کھانا، اچھا پہننا، اور اس قسم کی آرام طلبی پھر وہ خرچ کہاں سے پورا کریں گے، پھر ہم بھی ایسے ہی مسکین ہو جائیں گے نہ اس

طرح سے خوش پوشاک رہ سکیں گے، نہ خوش خوراک رہ سکیں گے، اس قسم کے اشکالات ان کے ذہن میں آتے ہیں، نفسانی لذت ان کے سامنے رکاوٹ ڈالتی ہے، حب جاہ ان کے سامنے رکاوٹ ڈالتی ہے اس لیے اکثر و بیشتر یہی طبقہ ہے جو اہل حق کے ساتھ ٹکرایا کرتا ہے۔

اور آج بھی آپ دیکھ لیں غریب طبقہ جتنا ہے وہ سب علماء کی قدر کرنے والا ہوگا، علماء کی بات پر کان دھرنے والا ہوگا، عزت کی نگاہ سے دیکھنے والا ہوگا اور یہ سرمایہ دار جنہوں نے اپنا غلط طور طریقہ اختیار کر رکھا ہے، جن کے کاروبار غلط ہیں، جن کی آمدنی غلط ہے، جن کے اخراجات غلط ہیں سب سے زیادہ مولوی کی اور نیک آدمی کی مخالفت کرنے والے اور ان کا مذاق اڑانے والے یہی لوگ ہیں گویا کہ اپنے طبعی جذبے کے تحت ان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں کہ اگر ان کی بات مان لی تو نہ ہماری یہ مالی حیثیت رہے گی اور نہ یہ چوہدراہٹ رہے گی تو اپنی چوہدراہٹ کی حفاظت وہ اسی میں سمجھتے ہیں کہ اہل علم کی بات نہ مانی جائے، لوگوں کو بھی متنفر کرتے ہیں کہ ان کے قریب نہ جاؤ کیونکہ اگر ان کے قریب لوگ چلے گئے تو وہاں جا کر ہمارے خلاف ذہن بنے گا پھر یہ ہماری چوہدراہٹ کہاں قبول کرتے ہیں۔

اور یہ قدرتی بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے جو شخص بھی متاثر ہوگا وہ جلدی سے کسی کی بڑائی کا معتقد نہیں ہوگا اس کے دل و دماغ کے اندر اتنی قوت آجاتی ہے اور وہ اپنے دل و دماغ کے اندر اتنا اپنے آپ کو سمجھنے لگ جاتا ہے ساری مخلوق کو اللہ کے مقابلے میں حقیر اور ذلیل سمجھتے ہوئے کہ کسی کی بڑائی کا جلدی سے قائل نہیں ہوتا اور اگر وہ کسی کی بڑائی مانے گا تو اسی کی مانے گا جس کے پاس علم ہوگا اور عمل صالح ہوگا اس لیے ان دنیا داروں کے مقابلے میں اکثر و بیشتر اہل علم طبقہ جن کو اللہ نے صحیح علم دیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے متاثر ہیں وہ مرعوب نہیں ہوتے اور یہی چیز ان کو چبھتی ہے کہ دوسرے لوگ تو ہمارے سامنے جلدی سے ڈر جاتے ہیں، جلدی سے دب جاتے ہیں، ہم ان پر رعب ڈال لیتے ہیں، یہ غریب مسکین چٹائیوں پر بیٹھنے والے، ٹوٹی جوتیوں والے، پھٹے کپڑوں والے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں یہ چیز برداشت نہیں ہوتی ان لوگوں سے جس کی بناء پر یہ مخالفت کرتے ہیں کہ ان کے طریقے پر کوئی نہ لگے اور ان کی بات کوئی نہ مانے یعنی اس تعلیم کا اثر ہے کہ غریب سے غریب آدمی، مسکین سے مسکین آدمی، بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے ڈٹ جاتا ہے یہ انبیاء علیہم السلام کی اس تعلیم کا اثر ہے۔

اس لیے وڈیرے اور چوہدری اس کو اپنے لیے خطرناک سمجھتے ہیں، حکومتوں کے ساتھ ہمیشہ معاملہ ایسے ہی

رہا ہے کہ جتنے کاروباری لوگ ہوں گے، جتنے صاحب جائیداد ہوں گے، جتنے صنعت کار ہوں گے سب حکومت کو سلام کرنے والے ہوتے ہیں، ان کو تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے حکومت کی مخالفت کی تو ہمارے کاروبار کو نقصان پہنچے گا اور حکومت کے پاس چونکہ ڈنڈا ہوتا ہے اس لیے سارے اس کے بوٹ چاٹنے والے ہوتے ہیں، اس حاکم کے سب سے زیادہ چاپلوس یہی سرمایہ دار لوگ ہوتے ہیں اور یہ مولوی ملاں بچارہ اس کو کسی چیز کا ڈر نہیں ہوتا لہٰذا اس کو ڈٹنا پڑ جائے تو بادشاہ وقت کے سامنے بھی ڈٹ جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ کیا ہوگا پہلے بھی چٹائی پر بیٹھتے ہیں، یہ چھین لیں گے تو زمین پر بیٹھنا شروع کردیں گے ہماری کیا بات ہے اور جیسی روٹی ہم گھر کھاتے ہیں ایسی جیل میں مل جاتی ہے اگر جیل میں چلے جائیں گے تو کیا ہوگا اور جیسے مکان ہمارے یہاں رہنے کے ہیں جیل کے کمرے اس سے اچھے ہوں گے برے نہیں ہیں اس لیے وہ بازی لگاتے ہوئے اور ٹکراتے ہوئے ڈرتے نہیں ہیں۔

اب مولوی جتنا آرام طلب ہوتا جارہا ہے اتنا ہی حق کی آواز دبتی جارہی ہے اور مولوی جتنا مسکین تھا اتنا ہی حق گو زیادہ تھا یعنی جو مولوی بھی سرمایہ دار قسم کا ہے اچھا کھانا، اچھا آرام و راحت کا جو عادی ہوتا جارہا ہے جو ائیر کنڈیشن کمروں میں رہنے لگ گئے وہ حق نہیں کہہ سکتے ان کے لیے مشکل ہے کیونکہ آگے جو مشکلات آنے والی ہیں ان کا اندازہ کر کے وہ دبتے ہیں کہ کیا کریں گے، اگر یہ آرام نہ رہا تو پھر کیا ہوگا، اگر یہ نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا، سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ جیسے مسکین لوگ نہ انہوں نے اپنا مکان بنایا، نہ کوئی آرام کی زندگی سوچی، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جرنیل وہ جیل میں ہوئے تو کیا، وہ گھر میں ہوئے تو کیا، ان کی تو پوزیشن ایک ہی جیسی ہے جتنا سا آرام و راحت کا سامان ان کو گھر میں حاصل تھا اتنا ان کو جیل میں مل جاتا تھا پھر وہ جیل سے کیوں ڈریں، جائیداد اور کارخانے ان کے نہیں تھے جن کی بناء پر وہ ڈرتے کہ حکومت قبضہ کرے گی، وہی ایک کپڑا ہے جو کندھے پر رکھا ہوا ہے اور چلے جارہے ہیں یہی ساری کائنات ہے لے جاؤ جہاں لے جاتے ہو۔

باقی جہاں تک جان کا معاملہ ہے اس میں یقین ہے کہ اللہ کا حکم آئے گا تو موت آئے گی کسی اور کے بس میں نہیں ہے، ساری زندگی انگریزوں کی مخالفت کی اور ان کے سامنے ڈٹ کر حق کہا لیکن مرے اپنی طبعی موت میں یہ بھی تو ایک عبرت کی بات ہے یعنی ساری زندگی مخالفت کی اور ان کی مخالفت کی جو توپوں والے تھے، ہوائی جہازوں والے تھے، ٹینکوں والے تھے، فوجوں والے تھے، ہر قسم کی قوت ان کو حاصل تھی ان سے ٹکرائے اور بہت کھل کر ٹکرائے علی الاعلان دشمنی کی لیکن وفات اپنی طبعی موت سے ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس زبردست دشمن کو قدرت نہیں

دی کہ ان کا قاتل بن جائے تو کیا یہ اللہ کی طرف سے نمونہ نہیں؟ اس سے معلوم ہو گیا کہ موت و حیات پر تو کسی کا بس چلتا نہیں باقی ظاہری طور پر اگر پکڑ دھکڑ کرے گا تو ہمارا کیا لے لے گا، ہمارے پاس ہے کیا جو لے لے گا اس لیے یہ لوگ پھر حق کہنے سے چوکتے نہیں ہیں۔

تو جس طرح سے سب انبیاء علیہم السلام فرعون وقت کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں اور ان کے سامنے کوئی کسی قسم کی بات نہیں ہوتی، اس طرح سے ان کے ورثاء کا بھی یہی حال ہے تو جتنا مولوی مسکین زیادہ ہوگا اتنا حق گو زیادہ ہوگا اور جتنا سرمایہ دار ہوتا چلا جائے گا اتنا حق کہنے کی جرأت ختم ہوتی چلی جائے گی کیونکہ وہ اپنی لذت اور اپنی دوسری چیزیں چھوڑنے کے لیے پھر جلدی سے آمادہ نہیں ہوتا، تو پھر وہی بات ہو جاتی ہے کہ حق کے سامنے اپنے آرام کو دیکھتا ہے، اپنے جاہ کو دیکھتا ہے، اپنی عزت کو دیکھتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اگر میں نے یہ بات کہی تو یہ ساری کی ساری چیزیں مجھ سے چھوٹ جائیں گی، اس لیے گدی نشین قسم کے لوگ یہ جیسے بڑے بڑے مزاروں کے اوپر قبضے کیے بیٹھے ہیں جب یہ دیکھتے ہیں کہ اگر اہل علم کی بات مانی تو ہماری آمدنیاں بند ہوتی ہیں چاہے وہ سمجھتے ہوں گے کہ سجدہ کروانا غلط ہے، چڑھاوے چڑھانا غلط ہے لیکن چونکہ آمدنیاں بند ہوتی ہیں اس لیے کسی صورت میں ماننے کے لیے تیار نہیں تو لذت اور شہوات کی جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر حق قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے وڈیرے لوگ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں آئے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے سرمایہ داروں کا حال:

”قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ“ کہا وڈیروں نے جو متکبر تھے ان کی قوم میں سے البتہ ضرور نکال دیں گے اے شعیب یعنی تجھے بھی نکال دیں گے اور ان لوگوں کو بھی نکال دیں گے جو تیرے ساتھ ہیں اپنی بستی سے، اپنے شہر سے، ”مِنْ قَرْیَتِنَا“ گویا کہ وہ کہتے ہیں کہ شہر تو ہمارا ہے تم اس کے کیا لگتے ہو تو سیدھے ہو کر رہو ہمارے طریقے پر، ورنہ یہاں سے بوریا بستر گول کرو ہم اپنے شہر سے تمہیں نکال دیں گے یا ضرور لوٹ آؤ گے تم ہمارے طریقے میں، عود کہتے ہیں سابقہ حالت پر لوٹ آنا، پہلی حالت کی طرف لوٹ آنا یہ حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھیوں کے اعتبار سے تو حقیقت ہے کہ پہلے وہ بھی اس قسم کے بدکردار ہوتے ہیں، اسی قسم کا رد یہ ہوتا ہے پھر ایمان لے آئے تو چھوڑ دیا، ان کا واپس لوٹ آنا تو حقیقی ہے، شعیب علیہ السلام پر یہ لفظ صادق نہیں آتا کیونکہ انبیاء علیہم السلام کسی دور میں بھی کردار کے گفتار کے کمزور نہیں ہوتے وہ ہمیشہ ایسے ہی رہتے ہیں، ان کے لیے لوٹنا یا تو مجازی ہے کہ یا تو

ہمارا دین اختیار کرلو یا یہ اکثر ساتھیوں کے اعتبار سے ہے یا یہ ہے کہ جس وقت تک کوئی نبی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے منصب نبوت پر فائز نہیں ہوتا اس وقت چونکہ وہ روک ٹوک نہیں کرتا تو لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ہمارے ہی طریقے پر ہے اور جب وہ نبوت کے منصب پر فائز ہوگا تو روک ٹوک شروع کردی تو وہ سمجھتے نہیں اب انہوں نے مخالفت شروع کردی اس لیے کہتے ہیں کہ پہلے طریقے پر آجاؤ جس طرح سے پہلے رہتے تھے ویسے ہی رہو، روک ٹوک نہ کرنے کو وہ سمجھ سکتے ہیں کہ شاید یہ ہمارے طریقے پر ہیں، شعیب علیہ السلام نے کہا کہ کیا ہم لوٹ آئیں گے تمہارے طریقے کی طرف اگرچہ ہم کراہت ہی کرنے والے ہوں، اگرچہ وہ ہمیں پسند نہ ہو۔

اگر ایسا ہوگیا کہ ہم تمہاری طرف لوٹ کر آجائیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک ہم اللہ پر جھوٹ ہی بولتے رہے ہیں، ہم جو کہتے تھے کہ اللہ کہتا ہے شرک نہ کرو، اللہ کہتا ہے پورا پورا تولو، اب پھر ہم آجائیں تمہارے طریقے پر تو اس کا مطلب ہے کہ ہم نے پہلے اللہ تعالیٰ پر استہزاء ہی کیا تھا، یہ کیسے ہوسکتا ہے جب ہم کہتے ہیں کہ یہ باتیں صحیح اور سچی ہیں جو ہم کہہ رہے ہیں تو کل کو اس کے خلاف ہم کس طرح سے کہہ دیں یا سمجھ آنے کے باوجود پھر وہی طریقہ تمہارا اپنائیں گے تو گویا کہ اپنے عمل کے ساتھ پھر اللہ پر جھوٹ بولیں گے دونوں مطلب ہی ہیں یا تو یہ ہے جو اس وقت ہم اللہ تعالیٰ کے متعلق کہہ رہے ہیں اگر کل ہم تمہارا طریقہ اختیار کرلیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے پہلے جھوٹ بولا تھا یا یہ ہے کہ جب ہم تمہارا طریقہ اختیار کرلیں گے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اللہ پر جھوٹی باتیں گھڑنے لگ جائیں گے ایسا نہیں ہوسکتا ہم اللہ کے اوپر جھوٹ نہیں باندھ سکتے ہم جو کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں اور آئندہ سچی بات ہی اختیار کریں گے، تحقیق ہم نے گھڑا اللہ پر جھوٹ اگر لوٹ آئیں ہم تمہارے طریقے میں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں نجات دے دی، دیکھو یہ بھی ایک احساس عبدیت ہے کہ ہر چیز کی نسبت اللہ کی طرف ہے کہ اللہ نے ہمیں نجات دے دی تمہارے طریقے سے، اللہ نے ہمیں اس طریقے سے بچالیا جو تمہارا شرک والا گندا طریقہ ہے تو اللہ کے اس نجات دلانے کے بعد کیا ہم پھر لوٹ آئیں گے ایسا نہیں ہوسکتا۔

"وَمَا يَكُوْنُ لَنَا" ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم لوٹ آئیں اس طریقے میں ہاں مگر اللہ کا چاہنا ہو کر رہتا ہے "اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا" یہ بھی عبدیت ہے کہ بالکل نہیں میں تمہارا طریقہ اختیار کروں گا ہر بات میں عبدیت اور تواضع نمایاں ہے کہ بھائی اگر اللہ کے متعلق ہی کسی کی مشیت ہوجائے کوئی دھوکا کھا جائے تمہارے طریقے کی طرف آجائے اس کا تو کوئی علاج نہیں، باقی جہاں تک ظاہری حالات کا تعلق ہے ہم کبھی تمہارا طریقہ

نہیں قبول کر سکتے مگر چاہنا اللہ کا جو ہمارا رب ہے وہ ہو کر رہتا ہے، وسیع ہے ہمارا پروردگار ہر چیز سے از روئے علم کے " عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا " ہم نے اللہ پر ہی بھروسہ کیا ہے، اے ہمارے پروردگار! فیصلہ کر دے ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک " وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ " اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے یعنی ہم بحث مباحثہ کر کے تھک گئے، دلیلوں کے ساتھ تو یہ مانتے نہیں اب یہ فیصلہ جو طلب کیا جا رہا ہے تو یہ عملی فیصلہ ہے اور عملی فیصلہ یہ ہے کہ اہل حق نجات پا جائیں اور اہل باطل کا رگڑا نکل جائے پھر ان کو پتہ چل جائے گا کہ واقعی یہ ٹھیک تھے یا غلط تھے۔

" وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ " کہا ان وڈیروں نے جو کافر تھے شعیب علیہ السلام کی قوم میں یعنی آپس میں ایک دوسرے کو کہا کہ اگر تم نے اتباع کی شعیب علیہ السلام کی تو تب تم خسارہ پانے والے ہو جاؤ گے یعنی آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے کہ اس کی بات نہ مانو، اس کی بات کو ماننا تو نقصان ہی نقصان ہے اپنی تجارت تباہ کر دو، اپنی چوہدراہٹ ختم کر لو اس کی باتوں کا تو یہ نتیجہ ہے اس لیے اس کی بات نہیں ماننی آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے اگر تم نے اتباع کی شعیب علیہ السلام کی تو تم بے شک تم البتہ خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

" فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ " پھر ان کو زلزلے نے پکڑ لیا پھر ہو گئے وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرنے والے، ڈھیر ہو جانے والے، وہیں اپنے گھروں میں ڈھیر ہو گئے، ہلنے کی طاقت نہ رہی۔

" اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا " یہ تو نکالتے تھے اپنے شہر سے شعیب علیہ السلام کو اور اس کے ساتھیوں کو، جنہوں نے شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی تھی وہ ایسے ہو گئے گویا کہ شہر میں کبھی آباد ہی نہیں رہے " كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا " گویا کہ انہوں نے یہاں کبھی اقامت ہی اختیار نہیں کی یعنی یوں بے نام ونشان ہو گئے، وہ لوگ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا وہی خسارہ پانے والے تھے وہ تو کہتے تھے کہ شعیب علیہ السلام کی بات ماننے میں خسارہ ہے لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ خسارے میں وہی رہے جنہوں نے شعیب علیہ السلام کی بات نہیں مانی۔

" فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ " شعیب علیہ السلام نے ان سے منہ پھیرا " وَقَالَ " اور کہا یہ اظہار افسوس ہے اگر عذاب آنے کے بعد مرے ہوئے دیکھ کر کہہ رہے ہیں تو یہ محض اظہار افسوس ہے اور اگر عذاب آنے سے قبل کہہ رہے ہیں تو یہ آخری تنبیہ ہے اے میری قوم! البتہ تحقیق پہنچا دیے میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغامات " وَنَصَحْتُ لَكُمْ " اور میں نے تمہارے ساتھ خیر خواہی کی، تمہیں نصیحت کی " فَكَيْفَ اٰسٰى " جب میں نے تو اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں

کی تو پھر میں کیسے افسوس کروں یعنی میرے لیے کیا افسوس کا موقع ہے، جاؤ جدھر جاتے ہو، برباد ہوتے ہو تو برباد ہو جاؤ، میں تمہاری اس بربادی کے اوپر آنسو کیوں بہاؤں میں نے کونسی کمی کی ہے تمہیں سمجھانے میں، جب تم نہیں سمجھتے اور کسی طریقے سے سدھرتے نہیں تو تمہاری ہلاکت کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہے ہمیں کیا جاؤ جہنم میں، یہی ہوتی ہے آخری آخری بات ”فَكَيْفَ اٰسٰی“ کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری بربادی پر آنسوں کیوں بہاؤں؟ جاؤ بھاڑ میں، جاؤ جدھر جاتے ہو، ہم نے تو اپنا فرض ادا کر دیا ہے آگے تمہاری مرضی، کیسے افسوس کروں میں ان لوگوں پر جو کفر کرنے والے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ

اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی مگر ہم نے پکڑ لیا

اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾

اس بستی کے رہنے والوں کو سختی اور تکلیف کے ساتھ تاکہ وہ عاجزی کریں ﴿۹۴﴾

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا

پھر ہم نے بدحالی کی جگہ خوش حالی بدل دی یہاں تک کہ وہ بڑھتے چلے گئے، اور کہنے لگے

قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ

پہنچ چکی ہے ہمارے باپ، دادوں کو تکلیف اور خوشی، سو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اس حال میں کہ انہیں

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ

خبر بھی نہ تھی ﴿۹۵﴾ اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم کھول دیتے ان پر

بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا

برکتیں آسمان کی اور زمین کی لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے پکڑ لیا ان کو ان کاموں کی وجہ سے

يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ

جو وہ کرتے تھے ﴿۹۶﴾ کیا بستیوں کے رہنے والے اس سے بےخوف ہیں کہ ہمارا عذاب ان کے پاس رات کے وقت اس حال میں آجائے کہ وہ

نَآئِمُوْنَ ﴿۹۷﴾ؕ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ

سو رہے ہوں ﴿۹۷﴾ یا بستیوں والے اس سے بےخوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آجائے جبکہ وہ

يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ

کھیل رہے ہوں ﴿۹۸﴾ کیا لوگ اللہ کی تدبیر سے بےخوف ہوگئے، سو اللہ کی تدبیر سے بےخوف نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جن کا طے پا چکا ہو

الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ

برباد ہونا ﴿۹۹﴾ جو لوگ زمین کے وارث ہوتے ہیں کیا انہیں مذکورہ اقوام کے واقعات نے یہ نہیں بتایا

أَهْلِهَآ أَن لَّوْ نَشَآءُ أَصَبْنٰهُم بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ

کہ ہم چاہیں تو ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کو ہلاک کردیں، ان کے دلوں پر ہم مہر لگائے ہوئے ہیں

فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۰۰﴾ تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآئِهَا ۚ

سو وہ نہیں سنتے (۱۰۰) یہ بستیاں ہیں ان کی بعض خبریں ہم آپ کو سناتے ہیں

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا

اور بے شک ان کے پاس ان کے پیغمبر معجزات لے کر آئے تو جس چیز کو جھٹلا چکے تھے اس پر ایمان لانے والے نہ تھے

مِن قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِ الْكٰفِرِينَ ﴿۱۰۱﴾ وَمَا وَجَدْنَا

وہ پہلے اللہ ایسے ہی مہر لگا دیتا ہے کافروں کے دلوں پر (۱۰۱) اور ہم نے نہ پایا

لِأَكْثَرِهِم مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَإِن وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِينَ ﴿۱۰۲﴾

ان میں سے اکثر لوگوں میں عہد کا پورا کرنا اور ہم نے ان میں سے اکثر کو نافرمان ہی پایا (۱۰۲)

لغوی، صرفی ونحوی تحقیق:

"وَمَآ أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّبِيٍّ" "مِن نَّبِيٍّ" یہ نکرہ آگیا اور "مَآ أَرْسَلْنَا" کلام منفی ہے اور یہ ضابطہ آپ سنتے رہتے ہیں کہ نکرہ تحت النفی عموم کا فائدہ دیتا ہے اس لیے ہم اس کا ترجمہ یوں کریں گے نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی، قریہ کے اندر بھی عموم آگیا اور نبی کے اندر بھی عموم آگیا، نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی "إِلَّآ أَخَذْنَآ أَهْلَهَا بِالْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ" باساء کا لفظ مالی تنگی کیلئے بولا جاتا ہے اور "ضراء" کا لفظ بدنی تکلیف کیلئے بولا جاتا ہے، مالی تنگی کے اندر قحط فقر وفاقہ اور بدنی تکلیف کے اندر بیماری اور اس قسم کے وہ حادثات جو انسان کے بدن سے تعلق رکھتے ہیں وہ سب ضراء میں آجائیں گے، مگر پکڑا ہم نے اسی بستی والوں کو مالی تنگی کے ساتھ اور بدنی تکلیف کے ساتھ "لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ" "يَضَّرَّعُونَ" اصل میں "يَتَضَرَّعُونَ" تھا تاء کو ضاد کر کے ضاد کا ضاد میں ادغام کیا، باب تفعل کی تاء کو فاء کلمہ کے ساتھ تبدیل کر کے اس میں ادغام کیا گیا ہے "يَتَضَرَّعُونَ" تاکہ وہ عاجزی کرنے لگ جائیں۔

"ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ" پھر بدل دیا ہم نے برائی کی جگہ اچھائی کو، "سیئۃ" کا مصداق یہاں

وہی باساء اور ضراء ہے، بری حالت پیش آئی ہوئی تھی مالی طور پر یا بدنی طور پر پھر اس کو ہم نے حسنہ سے بدل دیا، اچھی حالت کے ساتھ بدل دیا، پھر بدل دیا ہم نے برائی کے ساتھ اچھائی کو "حتی عفوا" عفا یعفوا بڑھنے کے معنی میں " عفا النبات "نباتات بڑھ گئیں"حتیٰ عفوا" کا معنی ہے حتی کہ وہ ترقی کر گئے بہت پھل پھول گئے۔

"وَقَالُوْا" اور کہنے لگے " قَدْ مَسَّ آبَاءَ نَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ" سراء خوشحالی کو کہتے ہیں اور خوشحالی کے مقابلہ میں ضراء بدحالی ہوگئی، پچھلی آیت میں تو آپ کے سامنے یہ ذکر کیا تھا کہ ضراء بدنی تکلیف کو کہتے ہیں، جس وقت ضراء اور باساء اکٹھے آجائیں اس وقت تو فرق کرلیا جاتا ہے مالی تکلیف کا اور بدنی تکلیف کا، باساء مالی تکلیف اور ضراء کا مصداق بدنی تکلیف لیکن جس وقت ضراء کا مقابلہ سراء کے ساتھ آجائے تو پھر خوشحالی کے مقابلے میں اس کا مفہوم بدحالی ہے چاہے وہ مصیبتوں بیماریوں کی شکل میں ہو، چاہے وہ مالی شکل میں ہو یہ لفظ دونوں حالتوں کو عام ہے، پہلے چونکہ باساء کا لفظ ساتھ آیا تھا اس لیے ہم نے اس سے بدنی تکلیف مراد لے لی یہاں سراء کے مقابلہ میں یہ لفظ آیا ہوا ہے تو یہاں مطلق بدحالی مراد ہے چاہے وہ مالی تنگی کے ساتھ ہو، چاہے بدنی تکلیف کے ساتھ ہو اس کا مفہوم عام ہے اور کہا انہوں نے "قَدْ مَسَّ آبَاءَ نَا" تحقیق پہنچی ہمارے آباء کو بھی بدحالی اور خوشحالی، آباء اب کی جمع ہے، پہنچی ہمارے آباؤ اجداد کو بھی بدحالی اور خوشحالی "فَاَخَذْنٰهُمْ" پھر ہم نے ان کو پکڑ لیا "بَغْتَةً" اچانک " وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ" اس حال میں کہ ان کو شعور نہیں تھا، ان کو سمجھ بھی نہیں تھی، پتہ بھی نہیں چلا کہ ہم پر کوئی عذاب آرہا ہے اس طرح سے ہم نے ان کو پکڑ لیا اس حال میں کہ ان کو خبر نہیں تھی، وہ سمجھتے نہیں تھے۔

"وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى آمَنُوْا" اگر بستیوں والے ایمان لے آتے "وَاتَّقَوْا" اور تقویٰ اختیار کرتے "لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاءِ" تو کھول دیتے ہم ان کے اوپر آسمان اور زمین کی برکتیں " برکات "برکت کی جمع ہے، برکت کے اندر بھی بڑھنے اور ترقی کا مفہوم ہوتا ہے، ہم ان کے اوپر زمین و آسمان سے ترقیات کے دروازے کھول دیتے، برکتوں کے دروازے کھول دیتے، فوائد اور منافع کے دروازے کھول دیتے، برکت کا مفہوم یہی ہے خیر و برکت جس طرح سے آپ کہتے ہیں "وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا" لیکن ان بستی والوں نے تکذیب کی "فَاَخَذْنٰهُمْ" پھر ہم نے ان کو پکڑ لیا "بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" ان کے کسب کے سبب سے، جو کام وہ کیا کرتے تھے اس کے سبب سے ہم نے انہیں پکڑ لیا۔

"اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰى" امن کا معنی بے خوف ہو جانا، کیا پھر بے خوف ہو گئے بستیوں والے "اَنْ يَّاْتِيَهُمْ

بَاْسُنَا " کہ آجائے ان کے پاس ہمارا عذاب "بأس" عذاب "بأسنا" یہ لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے گزرا "بَیَاتًا" بات یبیت رات گزارنا، تو وقت بیات آجائے ان کے پاس ہمارا عذاب، رات گزارنے کے وقت یا بائتین کے معنی میں کر لیجیے اس حال میں کہ وہ رات گزار رہے ہوں، رات گزارتے وقت "بَیَاتًا" کو حال واقع کر لیجیے، کیا بے خوف ہو گئے بستیوں والے کہ آجائے ان کے پاس ہمارا عذاب رات کے وقت اس حال میں کہ وہ سوئے ہوئے ہوں۔

"اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰى" کیا بے خوف ہو گئے بستیوں والے "اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى" کہ آجائے ان کے پاس ہمارا عذاب چاشت کے وقت، ضحیٰ کہلاتا ہے استواء سے پہلے، دوپہر سے پہلے سورج کے اونچا ہو جانے کے بعد جو وقت ہوتا ہے وہ ضحیٰ کہلاتا ہے، جو انتہائی مشغولیت کا وقت ہے، ہر کوئی اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ دن چڑھے کر رہے ہیں، جس وقت دن اچھی طرح سے روشن ہو جاتا ہے تو استواء سے پہلے کا جو وقت ہوتا ہے وہ ضحیٰ کہلاتا ہے جس کو چاشت کا وقت بھی کہتے ہیں، کیا بے خوف ہو گئے بستیوں والے کہ آجائے ان کے پاس ہمارا عذاب چاشت کے وقت "وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ" اس حال میں کہ وہ اپنے کھیل کود میں لگے ہوئے ہوں، لعب کا معنی چونکہ بے کار کاموں میں مشغول ہونا ہوتا ہے اس لیے اس سے سارے کاروبار مراد ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے غفلت کے تحت کیے جائیں، اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ کھیل رہے ہوں بلکہ دنیا کے جتنے کام جن میں آخرت مقصود نہیں ہوتی، اللہ کی رضا مقصود نہیں ہے وہ دنیا کے سارے کے سارے کام لہو ولعب کا مصداق ہیں جیسا کہ قرآن کریم نے اس بات کی صراحت کی "اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ" کہ دنیا کی زندگی کے جتنے کام ہیں جن میں آخرت مقصود نہیں ہے، اللہ کی رضا مقصود نہیں ہے وہ اس کا مصداق ہیں اس لیے "یلعبون" کا مفہوم یہ بھی ہوگا کہ جس وقت وہ اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہوں وہ بھی لعب کا مصداق ہی ہے، کھیل کود میں لگے ہوئے ہوں، کاروبار میں لگے ہوئے ہوں ایسے وقت میں ان کے پاس ہمارا عذاب آجائے گا۔

"اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ" کیا یہ لوگ بے خوف ہو گئے اللہ کی تدبیر سے "فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ" نہیں بے خوف ہوتے اللہ کی تدبیر سے مگر خسارہ پانے والے "قوم خاسرون" قوم کا لفظ چونکہ افراد کثیرہ پر دلالت کرتا ہے اس لیے "خاسرون" صفت جمع کے طور پر آ گئی خسارہ پانے والے لوگ۔

"اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَا" "هدی یهدی" راہنمائی کرنا، پتہ نشان دینا جیسے کہ آپ اراءۃ الطریق اور ایصال الی المطلوب یہ معنی کیا کرتے ہیں " لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَا" "اهلها" کی ضمیر " ارض " کی طرف لوٹ رہی ہے "اولم یهد" اس کا فاعل ہے پہلے گزرے ہوئے واقعات

اور "اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ" اس "ھدیٰ یھدی" کا مفعول ہے، ترجمہ اچھی طرح سے سمجھ لیجئے، کیا ان واقعات نے راہنمائی نہیں کی، کیا ان واقعات نے دکھلا نہیں دیا کہ جو وارث بنے ہیں اس زمین کے اہل کے بعد، جو لوگ اس زمین کے وارث بنے ہیں اس زمین کے اہل کے بعد یعنی پہلے لوگوں کے تباہ ہونے کے بعد جو زمین کے وارث بنے ہیں ان لوگوں کے لیے نمایاں نہیں کردیا ان واقعات نے جو پہلے گزرے ہیں، کیا ان کی راہنمائی نہیں کردی ان واقعات نے، "اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ" اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی ان کے گناہوں کی وجہ سے مصیبت پہنچادیں، کیا ان واقعات کو دیکھ کر یہ لوگ سمجھے نہیں؟ کیا یہ واقعات ان کے لیے سمجھنے کا ذریعہ نہیں بنے؟ ان کے لیے باعث ہدایت نہیں ہوئے؟ ان واقعات سے ان کے سامنے یہ بات واضح نہیں ہوگئی؟ ان واقعات نے ان کے سامنے اسی مفہوم کو روشن نہیں کردیا کہ اگر ہم چاہیں تو انہیں بھی مصیبت پہنچادیں ان کے گناہوں کی وجہ سے "وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ" اور ہم مہر کردیتے ہیں ان کے دلوں پر "فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ" پس وہ سنتے نہیں، یہاں سننا ماننے کے معنی میں ہے کیونکہ جو شخص کان سے سنتا ہے اور دل سے مانتا نہیں ہے تو اس کا سننا نہ سننا برابر ہے، یہ اسی محاورے کے مطابق بات ہے، جس طرح سے ہم کہا کرتے ہیں کہ میں نے آپ کو ہزار مرتبہ سمجھایا ہے لیکن آپ نے میری ایک نہیں سنی، نہیں سننے کا کیا معنی ہوتا ہے کہ مانتے نہیں ہیں، ورنہ کان میں آواز تو جاتی ہے یہ محاورے کے طور پر نہ سننا جو ہے اس سے نہ ماننا مراد ہوتا ہے کیونکہ جب ایک بات سنی جائے لیکن دل سے اس کو قبول نہ کیا جائے تو سننا نہ سننا برابر ہے گویا کہ وہ سنتے ہی نہیں۔

"تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا" انباء نباء کی جمع ہے نباء بڑی خبر کو کہتے ہیں یہی بستیاں ہم ان کے کچھ حالات آپ پر بیان کرتے ہیں قص یقص بیان کرنا یہ لفظ پہلے بھی گزرا ہے، بیان کرتے ہیں ہم تجھ پر ان بستیوں کے کچھ حالات "وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ" البتہ تحقیق ان کے پاس ان کے رسول آئے تھے واضح دلائل لے کر "فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا" پس نہیں تھے یہ لوگ کہ ایمان لے آئیں، وہ ایمان لانے والے نہیں تھے، "بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ" نہیں ایمان لانے والے تھے اس چیز کے ساتھ جس کو انہوں نے پہلے جھٹلایا، ایک دفعہ جھٹلادیا پھر اس کو وہ ماننے والے نہیں تھے "كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ" اسی طرح سے مہر کردیتا ہے اللہ کافروں کے دلوں پر۔

"وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ" من عھد سے ایفائے عہد مراد ہے، نہیں پایا ہم نے ان میں سے اکثر

کے لیے عہد پورا کرنا، ہم نے ان میں سے اکثر کے لیے عہد نہیں پایا، یہ لوگ اپنے عہد کے پابند نہیں "وَإِنْ وَّجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ" یہ "اِن" مخففہ من المثقلہ ہے، بے شک ہم نے پایا ان میں سے اکثر کو فاسق اور نافرمان۔

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

واقعات کے سلسلے میں پانچ واقعات آپ کے سامنے ذکر کیے گئے ہیں، پہلے قوم نوح کا قصہ ذکر کیا گیا تھا، اور پھر اس کے بعد قوم عاد کا قصہ ذکر کیا گیا تھا، پھر قوم ثمود کا قصہ ذکر کیا گیا تھا، پھر قوم لوط کا قصہ ذکر کیا گیا تھا اور اس کے بعد اہل مدین یعنی قوم شعیب کا ذکر آیا تھا، جہاں تک آیات کا ترجمہ کیا گیا ہے ان آیات کے بعد فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ آرہا ہے اور وہ مفصل قصہ ہے جو کئی رکوع تک چلے گا تو واقعات کے درمیان میں یہ چند ایک آیات گویا کہ ان واقعات پر تبصرہ ہے اور قرآن کریم کے مخاطبین کو متنبہ کرنا ہے کہ ان واقعات سے عبرت حاصل کرو، ان قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ تھا تمہارے ساتھ بھی وہی ہوگا، جس ترازو کے ساتھ ان کو تولا گیا تھا انہی باتوں کے ساتھ تمہارا وزن بھی کیا جائے گا، یہ نہیں کہ ان کے ساتھ کسی اور طرح کا معاملہ تھا اور تم جو چاہے کرتے رہو تمہاری رسی ڈھیلی رہے گی، سمجھ جاؤ یہ واقعات آگے پیچھے ذکر کیے جا رہے ہیں، متنبہ ہو جاؤ، ان واقعات سے متنبہ کرنے کے لیے، خبردار کرنے کے لیے قرآن کریم کے مخاطبین کو بیدار کرنے کے لیے ان واقعات کے درمیان میں یہ آیات آگئیں، ان آیات کے بعد پھر اسی طرح سے واقعات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

آزمائش کبھی عذاب کی صورت میں ہوتی ہے اور کبھی عیش وعشرت کی شکل میں:

پہلے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک عام ضابطے کے طور پر عادت ذکر فرمائی کہ ہماری عادت یہی ہے کہ جب ہم کسی بستی کے اندر نبی کو بھیجتے ہیں اور نبی آ کے اس بستی والوں کو ان کی غلطی کے اوپر متنبہ کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس بستی کے اوپر کچھ مصائب بھی بھیجے جاتے ہیں، کچھ پریشانیوں کے اندر ان کو مبتلاء کر دیا جاتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرت کا سامان ہوتا ہے کہ نبی جو تمہیں ڈراتا ہے یہ واقعات اس کا نمونہ ہیں، انسان بسا اوقات تکلیف اور مصیبت میں آکر نرم دل ہو جاتا ہے اور جب وہ نبی کی نصیحت سنے گا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے نتیجے میں دنیا میں بھی عذاب آسکتا ہے اور اس کے تھوڑے تھوڑے واقعات اور نمونے بھی سامنے آنے شروع ہو گئے بیماریاں آگئیں، قحط پڑ گیا، سیلاب آگیا، زلزلہ آگیا، معمولی معمولی جھٹکے اس قسم کے مصائب اس قوم کے اوپر

بھیجے جاتے ہیں، اس بستی پر بھیجے جاتے ہیں تاکہ ان میں تواضع پیدا ہو، ان میں عاجزی آجائے، وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور نبی کی نصیحت کی قبول کرلیں ایک قسم کی عبرت کے لیے، تنبیہ کے لیے اس قسم کے چھوٹے چھوٹے واقعات بھیجے جاتے ہیں۔

اور یہ واقعات جو بطور تنبیہ کے ہوا کرتے ہیں یہ عام ہوتے ہیں جس میں نیک و بد سارے ہی لپیٹ میں آجاتے ہیں، جو تکلیف بطور آزمائش کے ہوتی ہے اس میں نیک اور بد کا امتیاز نہیں ہوتا، جو تکلیف بطور آزمائش کے ہوتی ہے کہ یہ استغفار کرنے لگ جائیں، اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں، اس مصیبت میں صبر کرتے ہیں کہ نہیں کرتے، اس مصیبت کو اللہ کی طرف سے جانتے ہوئے اللہ کی طرف جھکتے ہیں یا نہیں جھکتے جو مصیبتیں اس انداز کی ہوا کرتی ہیں جس کو آزمائش کی مصیبتیں کہہ سکتے ہیں اس میں نیک و بد کا امتیاز نہیں ہوتا مثلاً سیلاب جس وقت آتا ہے تو وہ نیکوں کو بھی بہا کرلے جاتا ہے، بروں کو بھی بہاتا ہے، زلزلہ جب آتا ہے تو جہاں مندر گرتے ہیں مسجد بھی گرجاتی ہے، اور مکانوں کے نیچے دب کر جہاں کافر مرتے ہیں مسلمان بھی مرجاتے ہیں، کسی علاقے کے اندر وبا پھوٹتی ہے تو بخار بروں کو بھی چڑھتا ہے، اچھوں کو بھی چڑھتا ہے ظاہری صورت اس کی ایک عام ہوتی ہے نیک و بد سب کو لپیٹ میں لے لیتے ہیں، ظاہری صورت عام ہوتی ہے۔

لیکن حقیقت کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے کہ جو لوگ ان مصیبتوں سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، توبہ استغفار کی طرف لگ جاتے ہیں ان کے لیے یہ مصیبتیں رحمت ہوتی ہیں، ان کے لیے یہ عذاب نہیں رحمت ہے، جس طرح سے ایک بچے کو تھپڑ مارا اور تھپڑ مار کر بیدار کردیا بیدار کرکے اس کو نماز پڑھوادی اور اس کو سبق یاد کروادیا تو یہ تھپڑ اس کے لیے رحمت ہے، جس کے ساتھ وہ بیدار ہو گیا وقت پر اس نے نماز پڑھ لی، اپنا سبق یاد کرلیا اسی طرح وہ مصیبت جس کے نتیجے میں انسان کی اللہ کی طرف توجہ ہو جائے، اپنی کوتاہیوں پر متنبہ ہو جائے تو یہ مصیبت اس کے لیے رحمت ہے۔

اور اگر اس قسم کی مصیبت میں وہ اور اکڑ جائے اس تنبیہ کے بعد بسا اوقات اکڑ پیدا ہو جاتی ہے کہ اچھا کرلے جو کچھ کرنا ہے میں نہیں مانتا ایک تو ہے کہ لفظی طور پر تنبیہ ہوئی اور آگے سے اکڑ گیا، ان واقعات کے تحت بھی انسان اکڑ جاتا ہے کہ جیسے جیسے مصیبتیں اس کے اندر آتی ہیں وہ الٹا اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے لگ جاتا ہے، برا بھلا کہنے لگ جاتا ہے ایسے واقعات ہیں آپ دیکھیں گے جیسے جیسے پریشانیاں پیش آتی ہیں اسی طرح سے لوگ اور زیادہ

سرکش ہوتے چلے جاتے ہیں، فاسق وفاجر ہوتے چلے جاتے ہیں کہ چلو اللہ تعالیٰ نے اگر ہمارے ساتھ یوں کر دیا تو ہم نماز ہی نہیں پڑھتے، پڑھوالے ہم سے نماز یا ہم کیوں اللہ کے لیے روزے رکھیں اس نے ہمارا کیا کیا ہے، اس قسم کے کفریہ کلمے اور اس قسم کی سرکشیاں ان کے اندر اور آجاتی ہیں تو اصل کے اعتبار سے یہ مصیبتیں ان کے لیے عذاب ہوتی ہیں، ان مصیبتوں سے متاثر ہو کر نیکی کی طرف آنے کی بجائے ان مصیبتوں سے دھکا کھا کر وہ اور جہنم میں چلے گئے تو ظاہری صورت اگرچہ تکلیفوں کی ایک جیسی ہوتی ہے لیکن معنوی طور پر فرق ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کبھی تو ہم یوں کرتے ہیں کہ تنبیہات کے لیے چھوٹے چھوٹے واقعات بھیجتے ہیں تاکہ ان کے اندر عاجزی پیدا ہو جائے۔

لیکن اگر کوئی قوم ان واقعات کو برداشت کر جائے اور ان سے متنبہ نہ ہو تو پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے اوپر نعمتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں، وہ قوم خوشحال ہو جاتی ہے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والی قوم خوشحال ہو جاتی ہے، مال و دولت کے دروازے ان کے اوپر کھول دیے، نعمتوں سے نوازا، خوشحالی عطا فرمائی، تندرستی دی، مال دیا، یہاں تک کہ جان و مال میں کثرت ہوگئی، پہلے تو تنگدستی و بدحالی کے ذریعہ آزمائے گئے تھے اب انہیں نعمتیں دے کر آزمایا گیا، پہلے امتحان میں تو فیل ہوئے ہی تھے دوسرے امتحان میں بھی فیل ہو گئے، نہ بدحالی میں مبتلاء ہو کر راہ راست پر آئے نہ خوشحالی سے عبرت حاصل کی بلکہ الٹا یہ نتیجہ نکالا کہ یہ خوشحالی کچھ ایمان اور کفر اور اچھے کاموں اور برے کاموں سے متعلق نہیں ہے، یہ دنیا کا الٹ پھیر ہے کبھی خوشحالی، کبھی بدحالی، ہمارے باپ دادوں پر بھی یہ دونوں حالتیں گزری ہیں، لہٰذا ہم اپنا دین کیوں چھوڑ دیں؟ ہمارے باپ دادے بھی اپنے دین پر جمے رہے ہم بھی مضبوط ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ تنگ دستی اور سختی سے عبرت لی اور نہ خوشحالی اور نعمتوں سے نوازے جانے پر شکر گزار ہوئے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اچانک ان کی گرفت فرمائی، نزول عذاب کا پتہ بھی نہ چلا، اور مبتلائے عذاب ہو کر ہلاک ہو گئے۔

اگر لوگ ایمان لاتے تو ان کے لیے آسمان وزمین کی برکات کھول دی جاتیں:

"وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ" اور اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیز کرتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے "وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" اور لیکن انہوں نے جھٹلایا لہٰذا ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کی

گرفت کرلی، اس آیت میں ایک عمومی تکوینی قانون بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب لوگوں میں ایمان ہوگا، اعمال صالحہ ہوں گے، کفر و شرک اور گناہوں سے پرہیز کرتے ہوں گے تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکتیں کھول دی جائیں گی، آسمان سے بھی برکتیں نازل ہوں گی اور زمین سے بھی نکلیں گی بہت ہی زیادہ خوشحال زندگی گزاریں گے اور اگر ایمان نہ ہوگا اور اعمال صالحہ نہ ہوں گے تو گرفت ہوگی، نعمتیں چھن جائیں گی اور عذاب آئیں گے، شاید کسی کو یہ وسوسہ آئے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ کافر خوشحال رہتے ہیں، نعمت و دولت ان کے پاس وافر مقدار میں ہوتی ہے، نزول عذاب کے ذریعہ ان کی گرفت نہیں ہوتی، یہ وسوسہ غلط ہے کیونکہ آیت میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ سارے عالم کے کافروں اور نافرمانوں پر ایک ہی وقت میں عذاب آئے گا، اللہ تعالیٰ کی حکمت کے موافق دنیا کے مختلف علاقوں میں عذاب آتے رہتے ہیں جنہیں جاننے والے جانتے ہیں، پھر عذابوں کی بھی کئی قسمیں ہیں، زلزلے آنا، آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا، سیلابوں سے برباد ہونا، ٹڈی کا آجانا اور کھیتیاں صاف کر دینا، نئے نئے امراض پیدا ہونا، یہ سب عذاب کی صورتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ایک قانون استدراج کا بھی ہے اور وہ یہ کہ کافروں کو ڈھیل دے دی جاتی ہے وہ نعمتوں میں پڑ کر اور زیادہ بغاوت پر اتر آتے ہیں، پھر اچانک پکڑ لیے جاتے ہیں، اور موت کے بعد مواخذہ اور عذاب وہ اس کے علاوہ ہے جو کافروں کے لیے دائمی ہے۔

برکت کا معنی اور مفہوم:

برکت کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں، آسمان اور زمین کی برکتوں سے مراد یہ ہے کہ ہر طرح کی بھلائی ہر طرف سے ان کے لیے کھول دیتے ہیں، آسمان سے پانی ضرورت کے مطابق وقت پر برستا ہے، زمین سے ہر چیز خواہش کے مطابق پیدا ہوتی ہے، پھر ان چیزوں سے نفع اٹھانے اور راحت حاصل کرنے کے سامان جمع کر دیے جاتے ہیں تاکہ کوئی پریشانی اور فکر لاحق نہ ہو جس کی وجہ سے بڑی بڑی نعمت مکدر ہو جاتی ہے ہر چیز میں برکت یعنی زیادتی ہوتی ہے۔

پھر برکت کا ظہور دنیا میں دو طرح سے ہوتا ہے کبھی تو اصل چیز واقع میں بڑھ جاتی ہے جیسے رسول کریم ﷺ کے معجزات میں ایک معمولی برتن کے پانی سے پورے قافلہ کا سیراب ہونا، یا تھوڑے سے کھانے سے ایک مجمع کا شکم سیر ہو جانا روایات صحیحہ میں مذکور ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ ظاہری طور پر اس چیز میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی مقدار اتنی ہی رہی جتنی تھی لیکن اس سے کام اتنے نکلے جتنے اس سے دوگنی چوگنی چیز سے نکلتے ہیں، اور اس کا مشاہدہ عام طور سے کیا جاتا ہے کہ کوئی برتن، کپڑا، گھر یا گھر کا سامان ایسا مبارک ہوتا ہے کہ اس سے عمر بھر

آدمی راحت اٹھاتا ہے اور وہ پھر بھی قائم رہتا ہے اور بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ بناتے ہی ٹوٹ گئیں یا سالم بھی رہیں مگر ان سے نفع اٹھانے کا موقع ہاتھ نہ آیا یا نفع بھی اٹھایا لیکن پورا نفع نہ اٹھا سکے۔

اور یہ برکت انسان کے مال میں بھی ہوتی ہے جان میں بھی، کام میں بھی اور وقت میں بھی، بعض مرتبہ ایک لقمہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی قوت وصحت کا سبب بن جاتا ہے اور بعض اوقات بڑی سے بڑی طاقتور غذا اور دوا کام نہیں دیتی، اسی طرح بعض وقت میں برکت ہوتی ہے تو ایک گھنٹہ میں اتنا کام ہوجاتا ہے کہ دوسرے اوقات میں چار گھنٹوں میں بھی نہیں ہوتا، ان سب صورتوں میں اگرچہ مقدار کے اعتبار سے نہ مال بڑھا ہے نہ وقت مگر برکت کا ظہور اس طرح ہوا کہ اس سے کام بہت نکلے۔

اس آیت نے یہ بات واضح کردی کہ آسمان اور زمین کی کل مخلوقات وموجودات کی برکات ایمان اور تقویٰ پر موقوف ہیں ان کو اختیار کیا جائے تو آخرت کی فلاح کے ساتھ دنیا کی فلاح وبرکات بھی حاصل ہوتے ہیں اور ایمان وتقویٰ کو چھوڑنے کے بعد ان برکات سے محرومی ہوجاتی ہے، آج کی دنیا کے حالات پر غور کیا جائے تو یہ بات ایک محسوس حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ آج کل ظاہری طور پر زمین کی پیداوار بہ نسبت پہلے کے بہت زائد ہے اور استعمالی اشیاء کی بہتات اور نئی نئی ایجادات تو اس قدر ہیں کہ پچھلی نسلوں کو ان کا تصور بھی نہ ہوسکتا تھا، مگر اس تمام ساز وسامان کی بہتات اور فراوانی کے باوجود آج کا انسان سخت پریشان، بیمار، تنگ دست نظر آتا ہے، آرام وراحت اور امن واطمینان کا کہیں وجود نہیں، اس کا سبب اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ سامان سارے موجود اور بکثرت موجود ہیں مگر ان کی برکت ختم ہوگئی ہے۔

اللہ کے عذاب سے ڈرو:

اس کے بعد آنحضرت سرور عالم ﷺ کے زمانے کے کافروں کو تنبیہ فرمائی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے پرانی قوموں پر عذاب بھیجا ان پر بھی عذاب آسکتا ہے، کیا یہ لوگ اس بات سے نڈر ہیں کہ ان کے پاس ہمارا عذاب رات کے وقت آجائے جب کہ یہ سوتے ہوں یا اس بات سے بے خوف ہیں کہ ہمارا عذاب دن کے شروع حصہ میں آجائے جبکہ یہ لوگ کھیل رہے ہوں، مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کے عذاب سے نڈر نہ ہوں، پہلی امتوں سے عبرت حاصل کریں اور نبی اکرم ﷺ کی تکذیب سے باز آجائیں، پھر فرمایا ''اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ'' کیا یہ لوگ اللہ کی تدبیر سے نڈر بنے ہوئے ہیں؟ یہ استفہام انکاری ہے، مطلب یہ ہے کہ نڈر نہ بنیں اللہ کا عذاب آنے سے ڈریں اور ایمان

قبول کریں "فَلَا یَاْمَنُ مَکْرَ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ" کیونکہ اللہ کی تدبیر سے وہی لوگ بے خوف ہو جاتے ہیں جن کو تباہ ہی ہونا ہے، عذاب کی تاخیر سے یہ نہ سمجھیں کہ عذاب نہیں آئے گا، جب عذاب آئے گا تو دیکھتے ہی رہ جائیں گے اور عذاب سے بچ نہ سکیں گے۔

زمین کے وارث ہونے والے سابقہ امتوں سے عبرت حاصل کریں:

ہلاک ہونے والی چند امتوں کے جو واقعات گزشتہ چند رکوع میں بیان کیے گئے ان سے عبرت دلانے کے لیے ارشاد فرمایا کہ جو امتیں ہلاک کی گئیں ان کی جگہ جو لوگ زمین پر آباد ہوئے کیا ان بعد میں آنے والوں کو ان واقعات سے عبرت حاصل نہ ہوئی اور کیا انہیں اس بات کا علم نہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دیں، بات یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے، لہٰذا وہ سنتے ہی نہیں، کانوں سے سن لیتے ہیں لیکن قبول کرنے کی نیت سے نہیں سنتے، لہٰذا سنا بے سنا برابر ہو جاتا ہے اور یہ مہر لگانا ایسا ہی ہے جیسا کہ سورۃ النساء میں فرمایا "بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ" بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر ان کے کفر کی وجہ سے مہر لگادی ہے، اور اسی کو سورۃ الصف میں فرمایا "فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ" سو جب وہ ٹیڑھے رہے تو اللہ نے ان کے دلوں کو اور ٹیڑھا کر دیا، جب انسان کفر کو اختیار کر لیتا ہے اور اسی پر جما رہتا ہے اور دلائل واضحہ کے ہوتے ہوئے حق قبول نہیں کرتا تو اللہ کی طرف سے یہ سزا بھی دی جاتی ہے کہ دل پر مہر لگادی جاتی ہے جس کی وجہ سے حق قبول کرنے کا موقع ختم ہو جاتا ہے "تِلْکَ الْقُرٰی نَقُصُّ عَلَیْکَ مِنْ اَنْۢبَآئِھَا" یہ بستیاں ہیں جن کے قصے ہم آپ کو سناتے ہیں "وَلَقَدْ جَآءَتْھُمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ" اور ان کے پاس ان کے پیغمبر واضح معجزات لے کر آئے "فَمَا کَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا کَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ" اور وہ ایسے نہ تھے کہ جس چیز کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا اس پر ایمان لے آتے، ان کے پاس حق آیا اس کی تکذیب جو پہلے کر دی تھی اسی تکذیب پر جمے رہے لہٰذا ایمان نہ لائے "کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الْکٰفِرِیْنَ" ایسے ہی اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے، اس مہر لگانے کا سبب اوپر بیان ہوا ہے اس مہر کے سبب اپنے کفر پر اڑے رہتے ہیں۔

کافر اقوام کا یہی طریقہ ہے کہ جب پہلی بار منکر ہو گئے تو ضد، عناد اور ہٹ دھرمی کے باعث حق کو ہرگز قبول نہیں کرتے، اگرچہ دلائل عقلیہ سمعیہ آیات تکوینیہ کھل کر سامنے آجائیں۔

پھر فرمایا "وَمَا وَجَدْنَا لِاَکْثَرِھِمْ مِّنْ عَھْدٍ" اور ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں عہد کا پورا کرنا نہ پایا،

انسان کا یہ عجیب مزاج ہے کہ جب مصیبت میں مبتلاء ہوتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے اور بہت پکا مشرک بھی اپنے باطل معبودوں کو بھول جاتا ہے اور یہ وعدے کرنے لگتا ہے کہ یہ مصیبت دور ہوگئی تو ایمان قبول کرلوں گا اور شرک سے پرہیز کروں گا لیکن مصیبت دور کرنے کے بعد وہ اپنے عہد کو بھول جاتا ہے اور پھر شرک اور کفر پر ہی جما رہتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد کی پاسداری نہیں پائی۔

پھر فرمایا "وَاِنْ وَّجَدْنَا اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ" اور بے شک ہم نے ان میں سے اکثر کو فاسق پایا، جو اطاعت وفرمانبرداری سے دور ہی رہے، لفظ "اکثر" سے معلوم ہوا کہ بعض ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے ایمان قبول کیا اور اپنے عہد کو پورا کیا، عہد کو پورا نہ کرنا اور بار بار توڑ دینا، اس کا کچھ بیان فرعون اور اس کی قوم کی بدعہدیوں کے ذیل میں دو رکوع کے بعد مذکور ہے۔

جو لوگ مصیبتوں کو اللہ کی طرف سے سمجھتے ہی نہیں بلکہ یوں کہتے ہیں کہ دنیا میں ایسا ہی ہوتا رہتا ہے ہمارے باپ، دادا بھی تکلیفوں میں مبتلاء رہے ہیں ان کا بیان اس رکوع سے پہلے رکوع میں تھا، یہ لوگ اللہ کی طرف سے مصائب کو سمجھتے تو وعدے کرتے، اس رکوع میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مصائب کے وقت وعدے کرتے ہیں، پھر مصیبت ٹل جانے کے بعد وعدہ فراموش ہو جاتے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا

پھر ہم نے ان کے بعد اپنی آیات کے ساتھ موسیٰ کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا سو انہوں نے ان آیات کے ساتھ ظلم والا معاملہ کیا

بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى یٰفِرْعَوْنُ

سو تو دیکھ لے فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا ﴿۱۰۳﴾ اور کہا موسیٰ نے کہ اے فرعون

اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِیْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى

بے شک میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں ﴿۱۰۴﴾ میرے لیے یہی شایان شان ہے کہ کسی بات کو منسوب نہ کروں

اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِیَ

اللہ کی طرف سچ کے علاوہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل لایا ہوں، سو تو میرے ساتھ بھیج دے

بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰیَةٍ فَاْتِ بِهَاۤ اِنْ

بنی اسرائیل کو ﴿۱۰۵﴾ فرعون کہنے لگا کہ اگر تو کوئی نشانی لایا ہے تو اسے پیش کر دے

كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۰۷﴾

اگر تو سچا ہے ﴿۱۰۶﴾ موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈالی تو اچانک وہ بالکل واضح طور پر ایک اژدھا بن گئی ﴿۱۰۷﴾

وَّنَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ

اور اپنا ہاتھ نکالا تو یکایک وہ دیکھنے والوں کو سفید نظر آرہا ہے ﴿۱۰۸﴾ سرداروں نے کہا جو قوم میں سے تھے

فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۰۹﴾ یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ

فرعون کی کہ بلاشبہ یہ ایک جادوگر ہے جو بڑا ماہر ہے ﴿۱۰۹﴾ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں نکال دے

اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِی

تمہاری سرزمین سے سو تم کیا مشورہ دیتے ہو؟ ﴿۱۱۰﴾ کہنے لگے کہ اس کو اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے دے اور بھیج دے

الْمَدَآىِٕنِ حٰشِرِیْنَ ﴿۱۱۱﴾ یَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِیْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ السَّحَرَةُ

شہروں میں جمع کرنے والوں کو ﴿۱۱۱﴾ جو تیرے پاس ہر ماہر جادوگر لے کر آئیں ﴿۱۱۲﴾ اور آئے جادوگر

فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ

فرعون کے پاس کہنے لگے کہ ہم غالب ہوئے تو کیا ہم کو کوئی بڑا صلہ ملے گا؟ ﴿۱۱۳﴾ فرعون نے کہا ہاں

وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ

اور بے شک تم لوگ مقربین میں شامل ہوجاؤ گے ﴿۱۱۴﴾ ان جادوگروں نے کہا کہ اے موسیٰ! یا تو آپ ڈالیں

اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ

یا ہم ڈالنے والے ہوجائیں ﴿۱۱۵﴾ موسیٰ نے کہا تمہی ڈالو، پس جب انہوں نے ڈالا تو جادو کردیا آنکھوں پر

النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى

لوگوں کی اور ان پر ہیبت غالب کردی اور بڑا جادو لے کر آئے ﴿۱۱۶﴾ اور ہم نے وحی بھیجی

مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ

موسیٰ کی طرف کہ تم اپنی لاٹھی ڈال دو، پس وہ اچانک ان کی بنائی ہوئی جھوٹی چیزوں کو نگلنے لگی ﴿۱۱۷﴾ پس ظاہر ہوگیا

الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا

حق اور وہ باطل ہوگیا جو انہوں نے کیا تھا ﴿۱۱۸﴾ پس وہ اس جگہ مغلوب ہوگئے اور وہ لوٹے

صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾

ذلیل ہوکر ﴿۱۱۹﴾ اور جادوگر سجدہ میں ڈال دیے گئے ﴿۱۲۰﴾ کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے رب العالمین پر ﴿۱۲۱﴾

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ

جو موسیٰ کا اور ہارون کا رب ہے ﴿۱۲۲﴾ فرعون نے کہا کیا تم اس سے پہلے اس پر ایمان لے آئے کہ میں

اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ

تمہیں اجازت دوں، بلاشبہ یہ ایک بڑا مکر ہے جو تم سب نے مل کر اس شہر میں کیا ہے تاکہ تم اس کے ذریعہ نکال دو

اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ

شہر والوں کو پس عنقریب تم جان لوگے ﴿۱۲۳﴾ ضرور بالضرور میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دوں گا۔

مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٢٤﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا

خلاف سے پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا ﴿۱۲۴﴾ انہوں نے کہا کہ بلاشبہ ہم اپنے رب کی طرف

مُنْقَلِبُوْنَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ

لوٹنے والے ہیں اور تو ہم سے انتقام نہیں لیتا مگر اس لیے کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان لے آئے جب وہ ہمارے پاس پہنچ گئیں،

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿١٢٦﴾

اے ہمارے رب ہم پر صبر ڈال دے اور ہمیں اس حال میں موت دے کہ ہم اسلام پر ہوں ﴿۱۲۶﴾

تفسیر:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ نقل کرنے کی غرض:

اس سورۃ میں جتنے قصے اور واقعات انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے ذکر کیے گئے ہیں یہ ان میں سے چھٹا قصہ ہے، اس کو زیادہ تشریح وتفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا سبب یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بہ نسبت دوسرے انبیاءِ سابقین کے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور قوت ظہور میں بھی، اسی طرح اس کے بالمقابل ان کی قوم بنی اسرائیل کی جہالت اور ہٹ دھرمی بھی پچھلی امتوں کے مقابلہ میں زیادہ اشد ہے اور یہ بھی ہے کہ اس قصہ کے ضمن میں بہت معارف ومسائل اور احکام بھی آئے ہیں۔

اور اس واقعہ کو دہرانے سے مقصد یہ ہے کہ فرعون جو اپنے آپ کو مصر کا بادشاہ قرار دیتا ہوا موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اکڑا تھا، جب موسیٰ علیہ السلام کی نصیحتیں اس نے نہیں مانیں، برس ہا برس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہیں مانا تو نہ اس کی فوجیں کام آئیں، نہ وہ ملک مصر اس کے کام آیا، نہ وہ اقتدار اسے بچا سکا، پانی کے اندر اللہ نے غوطہ دے کر ناک میں پانی ڈال کر مار دیا، یہ تاریخیں لوگوں کو سنانی مقصود ہیں کہ وہی نیل اور وہی دریا جس کے اوپر وہ فخر کرتا تھا "هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ" دیکھو! میں ملک مصر کا مالک ہوں، میرے باغات ہیں، میرے نیچے نہریں بہتی ہیں یہ میرے مقابلے میں کیسے آسکتا ہے تو وہی دریا یا سمندر کا پانی اس کی موت کا باعث بنا اور اس کا اقتدار، اس کا اختیار، اس کے خزانے، اس کی بڑی بڑی فوجیں اس کے کام نہ آسکیں تو یہ تاریخ

دہرا کے اس وقت کے فرعونوں کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ تم بھی اپنی فرعونیت سے باز آجاؤ ورنہ اگر اللہ کی گرفت ہوئی تو یہ تمہارا جتھا، تمہاری یہ قوت کسی کام نہیں آئے گی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ بہت سے اجزاء پر مشتمل ہے اس لیے قرآن کریم میں جتنا اس واقعہ کو دوہرایا گیا ہے کوئی دوسرا واقعہ اتنے تکرار کے ساتھ نہیں آیا، اکثر و بیشتر سورتوں میں اس کے مختلف اجزاء ذکر کیے گئے ہیں، خاص طور پر سورۃ طٰہٰ، سورۂ قصص اور سورۂ اعراف میں اس کی تفصیل ذکر کی گئی ہے، ورنہ اور سورتوں میں بھی اس کا ذکر آتا ہے، یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت جو فرعون کے سامنے ہوئی اور گفتگو جو ہوئی صرف وہ واقعہ نقل کیا جارہا ہے، ابتدائی حالات یہاں مذکور نہیں ہیں وہ انشاء اللہ سورۃ طٰہٰ میں آئیں گے۔

"ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوسٰى بِاٰيٰتِنَا" حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے بھیجا اپنی آیات دے کر، آیات سے مراد معجزات دے کر، اپنی باتیں دے کر، اپنی نشانیاں دے کر بھیجا فرعون اور اس کے رؤساء کی طرف، فرعون کی طرف جو ملاء کی نسبت ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ اس کی فوج کے جرنیل اور اس کے دربار کے چوہدری اور اس کے وڈیرے متعین کیے ہوئے اس کے نائبین جو اس کے نائب سمجھے جاتے تھے یہاں ملاء کا مصداق وہ ہیں انہوں نے ان آیات کا حق ادا نہیں کیا، حق ان آیات کا یہ تھا کہ ان سے متاثر ہوتے اور متاثر ہو کر ایمان لاتے لیکن انہوں نے ان کی حق تلفی کی اور کفر کیا تو پھر یہ نتیجہ فوراً ظاہر کر دیا گیا "فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ" جنہوں نے ہماری آیات کی حق تلفی کی تھی اور ہماری آیات کا حق ادا نہیں کیا تھا اور ان سے متاثر ہو کر ایمان نہیں لائے تھے تو اے مخاطب! تو دیکھ لے پھر ان کا انجام کیا ہوا؟ یہ نتیجہ کی طرف متوجہ نقد بنقد کر دیا گیا تا کہ یہ بات ذہن میں آجائے کہ اللہ کی آیات تمہارے پاس بھی آرہی ہیں اگر ان آیات سے تم متاثر نہ ہوئے تو پھر تم بھی مفسدین بن جاؤ گے۔

جو نبی کی اصلاحی سکیم کی مخالفت کرتے ہیں وہ سب مفسد ہوتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کی طرف دنیا کی اصلاح کے لیے جو قواعد نافذ کیے جاتے ہیں جو ان میں رکاوٹ ڈالتے ہیں وہ سب مفسدین کا مصداق ہیں، پھر دیکھ لو مفسدین کا انجام کیا ہوا، فوراً ہی نتیجے کی طرف متوجہ کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون سے گفتگو:

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں پہنچ گئے اور جا کر پہلی بات یہ کہی کہ میں رب العالمین کی طرف

سے بھیجا ہوا آیا ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے مختلف اجزاء مختلف سورتوں میں آئے ہوئے ہیں، فرعون کو حق قبول کرنے کی دعوت دی، توحید کی دعوت دی اور اس کا ذکر بھی دوسری آیات میں ہے صرف یہ نہیں کہ جاتے ہی اپنی قوم کا مسئلہ سامنے رکھ دیا، اپنی قوم کو آزادی دلانے کا مسئلہ جاتے ہی سامنے رکھ دیا، ایسی بات نہیں ہے اپنی رسالت کا ذکر کیا ہے پھر اس کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف متوجہ کیا ہے، یہ گفتگو سورۃ الشعراء کے اندر اور دوسری سورتوں میں آئے گی "اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" میں رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں۔

"حَقِیْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ" کہ میں اس موقف پر قائم ہوں کہ اللہ پر سوائے سچی بات کے اور کچھ نہیں کہوں گا، جیسا کہ سورۃ الدخان میں آئے گا کہ میں "رسول امین" ہوں، امانت دار، امانت دار وہی ہوتا ہے کہ جو میرے پاس آئے میں صحیح صحیح آگے پہنچاؤں، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہوں گا جس کے جواب میں فرعون نے کہا تھا "وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" رب العالمین کیا ہوتا ہے جس کی طرف سے تو آگیا ہے، رب العالمین کیا ہے، وہ رب العالمین کیا ہوتا ہے جس کی طرف سے تو آگیا، اس قسم کی گفتگو کے مختلف اجزاء مختلف سورتوں میں بکھرے ہوئے ہیں اور میں اپنے لیے صرف دعویٰ ہی لے کر نہیں آیا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں بلکہ اپنے اس دعوے کے اوپر صریح دلیل بھی لے کر آیا ہوں تو جب یہ میرا دعویٰ مدلل ہے، میں اس منصب کے اوپر قائم ہوں اور میرے پاس اس کی رسید ہے اور میرے پاس ثبوت ہے کہ میں اس منصب پر ہوں تو پھر میری بات تو مان لے۔

یہ جو میری قوم، میرا قبیلہ ہے جس کو تو نے غلام بنا رکھا ہے اور ان کے اوپر تیرا انتہائی درجے کا ظلم وستم ہے ان کو اجازت دے دے میں ان کو کسی طرف لے کر چلا جاؤں "اَرْسِلْ مَعِیَ" میرے ساتھ ان کو چھوڑ دے، میں ان کو لے کر جاؤں گا، اپنی قوم کو سنبھال لوں گا، کہیں لے جا کر ان کو آباد کرلوں جو چاہوں کروں تو ان کو اپنی غلامی سے نجات دے دے "اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ" یہ غلام کس طرح سے بن گئے تھے؟ یہ داستان بھی آپ کے سامنے مختلف سورتوں میں آئے گی، چھوڑ دے میرے ساتھ، بھیج دے میرے ساتھ بنی اسرائیل کو یہ گفتگو ہوگئی۔

یہ ایک دن کی بات نہیں:

اب یہ نہیں کہ پہلی مجلس کے اندر اتنی بات ہوگئی، میں نے پہلے بھی کہا کہ واقعات جب نقل کیے جاتے ہیں

تو اتنا ہی ہوتا ہے جیسے کسی نے مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا تھا مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب لکھی ہے ''زلیخاں'' جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا مکمل واقعہ لکھا ہوا ہے، لطیفہ مشہور ہے کہ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کہیں سفر میں جا رہے تھے کہ ایک اور بھی چالاک سا آدمی مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہو گیا اور ایک جگہ کوئی تھوڑا سا کھانا ملا تو دوسرے آدمی کا خیال یہ ہوا کہ اگر دونوں کھائیں گے تو یہ گزارے کے لیے کافی نہیں، میں ہی کھا جاؤں تو اچھا ہے اور تدبیر اس کی یہ سوچی کہ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کو باتوں میں لگا دو، بے چارہ درویش سا آدمی ہے میرے چکر میں آجائے گا یہ باتیں کرتے رہیں گے میں کھاتا رہوں گا، ہوں ہوں کرتا رہوں گا، کھانے کے درمیان میں ہوں ہوں کرنے کی کیا بات ہوتی ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو شخص بات شروع کردے اس کا لقمہ رک جاتا ہے، وہ باتیں کرتا ہوا کھا نہیں سکتا اور دوسرا کھاتا جائے گا اور ساتھ ساتھ ہاں جی ہاں جی کرتا رہے گا اور رفتار جاری رہتی ہے تو اس نے یہ سکیم بنائی کہ اس طرح سے کر کے میں سارا کھانا کھا جاؤں گا۔

جب وہ شروع ہوئے تو وہ شخص مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ سے کہتا ہے مولانا میں نے سنا ہے کہ آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات پر کوئی کتاب لکھی ہے، فرمانے لگے ہاں لکھی ہے کہنے لگا ذرا واقعہ تو سناؤ وہ کیا واقعہ ہے یوسف علیہ السلام کا، اب مقصد اس کا یہ تھا کہ اس کی تقریر شروع ہو جائے گی میں کھاتا رہوں گا اتنے میں فارغ ہو جاؤں گا، مولانا بھی تو آخر مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ تھے رئیس العاشقین بڑے چست قسم کے، وہ لقمہ بھی توڑ رہے ہیں ساتھ ساتھ کہتے ہیں۔

''پیر ضعیف پسر داشت گم کردہ باز یافت''

کہ ایک بوڑھا تھا اس کا بیٹا گم ہو گیا تھا بعد میں مل گیا اتنا سا قصہ ہے سارا، اتنے بڑے قصے کو دو لفظوں میں سمیٹ دیا، تو بات اتنی سی تو نہیں ہوتی۔

اب یہاں بھی یہ نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی حدود میں داخل ہوئے اور اپنا ڈنڈا کھڑکاتے ہوئے سیدھے دربار میں پہنچے اور جا کر کہتے ہیں کہ میری قوم کو چھوڑ دے یہ صرف اتنا سا قصہ نہیں ہے، گئے ہیں جا کر گفتگو ہوئی ہے، بار بار جس طرح سے ہوتا ہے انسان مذاکرات کرتا ہے، گفتگو کرتا ہے، ہر طریقے سے سمجھاتا ہے، بحث ہوتی ہے، مباحثے ہوتے ہیں، قوم کے اندر اس بات کا چرچا ہوتا ہے، اپنی قوم کو بھی متاثر کرنا ہوتا ہے، یہ نہ ہو کہ فرعون سے تو پروانہ لے لے کہ اچھا جاؤ اور قوم ڈٹی بیٹھی رہ جائے کہ نہیں ہم فرعون کے درباری رہیں گے اور ہم اسی کی

خدمت کریں گے ہم نہیں جاتے ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ جو قوم کا راہنماء اور مقتداء ہے وہ ایک مطالبہ منوالے پہلے قوم کو اعتماد میں نہ لے اور جس وقت مطالبہ منوالے تو پھر قوم کہے کہ ہم تو ایسے نہیں کریں گے تو پھر مقتدائیت کیا رہی اور راہنماء کا کیا ہوگا؟ اس لیے ہمیشہ وہ مقتداء اور راہنماء سمجھدار ہوتے ہیں، عقلمند ہوتے ہیں جو پہلے اپنی قوم کو ہاتھ میں لیا کرتے ہیں، اس کا اعتماد لیتے ہیں اعتماد لینے کے بعد پھر مطالبہ کرتے ہیں اگر مطالبہ مان لیا جائے تو کم از کم اپنی قوم اور اپنی جماعت تو باغی نہ ہو جائے۔

اب یہاں بھی بنی اسرائیل کو اگر اعتماد میں نہ لیتے اور جا کر سیدھے فرعون کو کہتے کہ میں تیرے پاس یہ مطالبہ لے کر آیا ہوں کہ میری قوم کو آزادی دے دے اور اس کو چھوڑ دے میں اس کو تیرے علاقے سے نکال کر دوسرے علاقے میں لے جاتا ہوں، ہم تیرے ملک میں نہیں رہتے، میں ان کو دوسرے ملک میں لے جاؤں گا تو جوان کو ذلیل کر رہا ہے تو فرعون کہہ دیتا کہ اچھا تو لے جا پھر قوم کہہ دیتی کہ ہم کہاں جائیں گے ہم تو یہاں مزے سے رہتے ہیں، بادشاہ کے درباری ہیں اور اس کی خدمت کرتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، باغات ہیں، نہریں ہیں تو ہمیں کہاں لے جائے گا، قوم آگے سے جواب دے کر بیٹھ جائے یہ بات نہیں ہوتی، یہ مطالبہ تب ہوتا ہے جس وقت قوم بھی یہ چاہتی ہو، قوم نے اعتماد کر کے اپنا نمائندہ بنا دیا کہ اگر اس طرح سے ہو جائے، فرعون ہماری جان چھوڑ دے تو ہم اس سے چھوٹ کر نکل جائیں گے، ہم اس سے بڑے تنگ ہیں۔

اس پر برسوں لگتے ہیں، برسہا برس خرچ ہوتے ہیں، یہ کوئی دنوں کی بات نہیں ہوتی ہے، قرآن کریم جب نقل کرتا ہے وہ تو خلاصے کی بات نقل کرتا ہے کہ یوں ہوا کہ جا کے فرعون سے اس طرح سے بات کی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے معجزات:

جب یہ بات کی تو فرعون نے پہلے یہی پوچھا کہ تیرے پاس دلیل کیا ہے کہ تو رب العالمین کی طرف سے آیا ہے؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ میرے پاس ثبوت ہے میں ثبوت پیش کر سکتا ہوں کہ میں اللہ کی طرف سے آیا ہوں، فرعون نے کہا پہلے وہ ثبوت پیش کرو کہ تو کیا ثبوت لے کر آیا ہے۔

جیسے کسی دوسرے ملک کا سفیر ہمارے صدر صاحب کے پاس آئے اور کہے کہ میں فلاں قوم کی طرف سے اور فلاں ملک کی طرف سے آیا ہوں اور میں یہ بات کرنے کے لیے آیا ہوں تو پہلے وہ اپنا اتھارٹی کارڈ، اپنے وہ کاغذات جس سے معلوم ہو کہ واقعی یہ فلاں ملک کا نمائندہ ہے، گفتگو کرنے کے لیے آیا ہے وہ دکھاتا ہے یا اخباروں

میں فوٹو آتے ہیں کہ فلاں ملک کا سفیر اپنی اسناد پیش کر رہا ہے، یہ اخبار میں کبھی کبھی آپ نے فوٹو دیکھا ہوگا یہ اسناد پیش کرنے کا یہ معنی ہوتا ہے کہ وہ ثبوت مہیا کرتا ہے کہ واقعی فلاں حکومت نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے تو فرعون کہتا ہے کہ وہ کیا نشانی ہے لے آ ثبوت لے آ اگر تو سچوں میں سے ہے۔

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نشانی واضح کر دی، وہی ڈنڈا اٹھا کر مارا کہ یہ میری نشانی ہے کہ میں رب العالمین کی طرف سے آیا ہوں اور وہ پھینکتے ہی ایک بہت بڑا سانپ بن گیا تو ان کا مقصد یہ تھا کہ میں ایک بہت بڑی طاقت کی طرف سے آیا ہوں، دیکھو! یہ ایک بے جان سی لاٹھی ہے اور میں یہ تیرے سامنے رکھ رہا ہوں اور یہ دیکھتے دیکھتے سانپ بن گیا تو معلوم ہوگیا کہ میں کسی بڑی قوت کی طرف سے نمائندہ بن کر آیا ہوں، یہ رب العالمین کی طرف سے میرے آنے کی نشانی ہے کہ دیکھو! میں نے یہ لاٹھی پھینکی اور یہ اژدھا بن گیا یہ معجزہ ہے اور معجزہ دلیل ہوتا ہے "فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ" انہوں نے لاٹھی ڈال دی جو ہاتھ میں تھی جس کو ساتھ لے کر گئے تھے یہ وہی لاٹھی تھی کہ جب بکریاں چرانے جایا کرتے تھے تو وہ ساتھ ہوتی تھی سورۂ طٰہٰ کے اندر واقعہ آئے گا "وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَٰمُوسَىٰ" اے موسیٰ! تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے "قَالَ هِيَ عَصَايَ" کہا کہ یہ میری لاٹھی ہے "أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا" اس کے اوپر میں ٹیک لگاتا ہوں، سہارا لے کر کھڑا ہو جاتا ہوں، آپ نے چرواہوں کو دیکھا ہوگا کہ جب بکریاں چر رہی ہوتی ہیں اور وہ کھڑے نگرانی کر رہے ہوتے ہیں تو اپنی لاٹھی یوں کندھے میں لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں سہارا لگا کر تو ایک قسم کا وزن لاٹھی کے اوپر ہو گیا تو ٹانگیں تھکتی نہیں ہیں، اوپر والے دھڑ کا وزن ہلکا ہو گیا اور کہیں نالہ کودنا پڑ گیا، کوئی گھاٹی عبور کرنی پڑ گئی تو بھی انسان لاٹھی کا سہارا لیتا ہے "وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي" اسی لاٹھی کے ساتھ میں اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں، درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں، پتے گرتے ہیں بکریاں کھاتی ہیں "وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ" اور بھی اس سے کئی کام لیتا ہوں یہ سارا اپنی لاٹھی کا تعارف کروا دیا تھا یہ وہی لاٹھی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اس کو ذرا پھینک جب وہ سانپ بنا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے تھے بھاگنے لگے تو پھر اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ پکڑ لے اس کو یہ ویسے ہی ہو جائے گا جیسے پہلے تھی "خُذْهَا سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ" ہم اس کو پہلی حالت کی طرف لوٹا دیں گے تو وہاں مفسرین نے لکھا ہے سورۂ طٰہٰ میں آئے گا کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس کو پکڑ لے تو کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پکڑنے کے لیے اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹا، سانپ جو بنا ہوا تھا تو کہتے ہیں کہ فرشتے نے کہا اے موسیٰ! اگر تجھے اللہ نہیں بچانا چاہے گا تو کیا یہ کپڑا تجھے بچا لے گا؟ تو

حضرت موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے کہ نہیں کپڑا بچا نہیں سکتا لیکن میں ایک عاجز مخلوق ہوں کمزور مخلوق ہوں، کیا مطلب کہ میں ایک ایسی مخلوق ہوں جس کو ظاہری طور پر اسباب سے تسلی ہوتی ہے اور اسباب کا سہارا لیا جاتا ہے لیکن بچانا تو اللہ نے ہے یعنی اسی عادت کے مطابق کہ جب کسی چیز کو پکڑنا ہو تو کپڑا لپیٹا جاتا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر اس کو پکڑنے لگے تو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا کہ اس کو پکڑو یہ پہلی حالت کی طرف آجائے گا اور آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا تو پھر کہتے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے ہاتھ ڈالا۔

اور عصا کی جو بناوٹ تھی وہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کھونٹی نہیں تھی جیسے ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ کی کھونٹی کا ذکر ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے کہ یوں اوپر سے مڑی ہوئی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا ذکر جو آتا ہے کہ لاٹھی اور اس کے اوپر یہ کیفیت تھی کہ اوپر سے وہ گول تھی۔

کیونکہ وہ کندھے کے نیچے اس کو لے کر اس پر سہارا لگا کر کھڑے ہو جاتے تھے یہ بعضے بعضے ملنگوں کے پاس آپ نے دیکھے ہوں گے، سریے کا بنا ہوا ہوتا ہے، لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے وہ اوپر سے جا کر اس طرح ہوتا ہے وہ یہاں ہاتھ ڈال کر پکڑتے ہیں اور اسی کو کندھے کے نیچے لے کر سہارا لے لیا جاتا ہے، کبیر والا اگر آپ گئے ہوں تو وہاں جمعہ کے لیے جو لاٹھی نکال کر رکھی ہوتی ہے وہ مولانا عبدالخالق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بنوائی تھی وہ اسی نمونے کی ہے وہاں خطبہ دیتے وقت جو ہاتھ میں لیا کرتے ہیں اس کی بناوٹ بالکل اسی طرح سے ہے اور حضرت نے اسی وقت ہی فرمایا تھا کہ یہ عصاء موسوی کی شکل ہے، ویسے ہی یہاں اوپر ہاتھ ڈال لیتے ہیں، ڈال کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو وہی جو اوپر والا حصہ تھا وہی اس کا منہ بن گیا تھا، اوپر والا حصہ وہی اس کے منہ کی شکل تھی تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہیں اس کے منہ میں ہاتھ ڈالا تو جب اس کے منہ میں ہاتھ ڈالا تو لاٹھی بن گئی تو یہ معجزہ دکھایا "فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ" مبین کا مطلب یہ ہے کہ بالکل کھلم کھلا جس کے اندر کوئی شک اور اشتباہ کی بات نہیں تھی اس طرح سے وہ سانپ بن گیا یہ ایک معجزہ ہو گیا۔

"وَنَزَعَ يَدَهُ" اسی طرح سے یوں کر کے ہاتھ بغل میں ڈال کر کھینچا "فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ" تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ بالکل سفید اور روشن کہ پہلے یوں ہاتھ تھا جس طرح سے عام ہوا کرتا ہے لیکن جب وہ یوں کر کے نکالا تو دیکھنے والوں کے لیے وہ ایک چمک دار اور سفید چیز بن گئی تھی۔

معجزات دیکھ کر فرعون نے اس کو سیاسی رنگ دے دیا:

فرعون کے دربار میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دونوں معجزوں کا اظہار کیا کہ لاٹھی ڈالی اور وہ بہت بڑا سانپ بن گیا اور ہاتھ اپنے گریبان میں دے کر یا بغل کے نیچے دبا کر کھینچا تو وہ روشن ہو گیا تو فرعون کہنے لگا اپنے اس ماحول کے مطابق چونکہ اس زمانے میں مصر کے اندر جادوگروں کا بہت زور تھا اور وہ اپنے جادو کے ساتھ مختلف قسم کے کرشمے دکھاتے رہتے تھے تو فرعون کہنے لگا کہ یہ تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے جادو کے ذریعے سے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے تو پہلے تو یہ اظہار فرعون نے کیا ہے جس طرح سے دوسری آیات میں آئے گا تو جس وقت فرعون کی طرف سے اظہار ہوا تو پھر جو وظیفہ خور ہوتے ہیں، دربار میں بیٹھنے والے جن کو آج کل ہماری اصطلاح میں چمچے کہتے ہیں، کڑچھے کہتے ہیں یا پنجابی کے اندر جس کو جھولی چک کہتے ہیں جو دوسرے کے آگے پیچھے جھولی اٹھا کر پھرتے رہتے ہیں، دوسرے کے پیالے چاٹتے رہتے ہیں، دوسرے کی جوتیاں چاٹنے والے اس قسم کے الفاظ اس طبقے کے لیے ہر زبان کے اندر استعمال کیے جاتے ہیں، یہ چاپلوس قسم کا طبقہ ہوتا ہے، ہاں میں ہاں ملانے کے لیے ہر وقت یہ تیار ہوتے ہیں اور انہیں یہ پتہ ہوتا ہے کہ اگر ہم اپنے بڑے کی ہاں میں ہاں ملائیں گے تو ہی جا کر ہماری عزت ہوگی اور جاہ بچ جائے گی، اس قسم کے درباری جو ہوا کرتے ہیں وہ ہمیشہ حکام کے لیے گمراہی کا باعث بنتے ہیں۔

فرعون نے اس قسم کا اظہار کیا تو یہ بھی ساتھ بول پڑے کہ ہاں جی یہ تو بہت بڑا جادوگر معلوم ہوتا ہے اور بہت بڑا علم والا جادوگر ہے اور پھر فوراً ہی اس کو سیاسی رنگ دے دیا، دیکھو! سیاست کا مزاج ابتداء سے ایک ہی جیسا ہوتا ہے، یہ لیڈروں کا مزاج ایک ہی جیسا ہوتا ہے، کوئی کسی قسم کی اصلاح کی بات کرے فوراً کہہ دیں گے کہ بھوکا ہے یہ اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور اس موجودہ حکومت کے خلاف انقلاب لانا چاہتا ہے، یہ باغی ہے اور باغی بنا کر، حکومت کے آئین کی خلاف ورزی کرنے والا بنا کر اس کے اوپر مقدمہ چلا کر اس کو سزا دے دو تو یہاں انہوں نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اقدام کو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا جس کی دعوت دی تھی اور اس کے بعد یہ معجزہ دکھایا تھا انہوں نے فوراً اس کو سیاسی رنگ دے دیا، سیاسی رنگ دے کر کہتے ہیں کہ ان کا تو مقصد ہی اس حکومت پر قبضہ کرنا ہے اور جو یہاں کے رہنے والے اصل حکومت کے مستحق ہیں یہ قبطی فرعون کی ہی قوم ان کو یہاں

سے نکالنا چاہتے ہیں۔

اب چونکہ مصر کی آبادی دو طبقوں میں تقسیم تو تھی ایک تھے قبطی فرعون کی قوم اور دوسرے سبطی یہ حضرت یعقوب کے اسباط کی اولاد جن کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے تو یہ بنی اسرائیل جتنے تھے وہ سب غلامی کی زندگی گزار رہے تھے، بالکل پسے ہوئے تھے ان کو کوئی کسی قسم کے حقوق اس مصر میں حاصل نہیں تھے اور قبطی فرعون جو تھے وہ حکومت پر فائز تھے اب دل تو ڈر رہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متاثر ہو کر جس طرح بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے ہیں کہیں قبطیوں میں سے بھی لوگ متاثر نہ ہو جائیں اگر وہ متاثر ہو جائیں گے تو حکومت کا تختہ الٹنا آسان ہے، فرعون کے خاندان کی حکومت ختم ہو جائے گی، انہوں نے فوراً اس کو یہی رنگ دیا کہ یہ تو تمہیں اس علاقے سے نکالنا چاہتے ہیں جو اصل حکومت کے مستحق ہیں اس لیے اس کا مقابلہ جادوگروں کے ذریعے سے کرنا چاہیے اور لوگوں کو چوکنا کر دینا چاہیے تو انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے فرعون کو یہی کہا کہ ابھی اس کو کچھ نہ کہو چند دن کی مہلت دے دو، اور اس کو کہو کہ تو کوئی اللہ کا فرستادہ نہیں، نہ تو اللہ کا بھیجا ہوا ہے تو جادوگر ہے ہم تیرا مقابلہ جادوگروں سے کروائیں گے، انہوں نے اس کو یہ رنگ دے دیا اور مشورہ دے دیا فرعون کو کہ ملک میں بڑے بڑے جادوگر پڑے ہوئے ہیں اس کو ڈھیل دے دو، مہلت دے دو، اور شہروں کے اندر اپنے فرستادے بھیج دو، چپڑاسی جائیں اور جا کر سارے ملک سے بڑے بڑے جادوگروں کو اکٹھا کر کے لے آئیں اور اس کے ساتھ مقابلہ کا ایک وقت متعین کر لو۔

جانبین سے مقابلے کی تیاریاں:

جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں آئے گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہمارے ساتھ ایک وقت متعین کر جس میں ہم تمہارے ساتھ مقابلہ کریں گے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت استغناء کے ساتھ کہہ دیا کہ وہی "یَوْمُ الزِّیْنَةِ" تمہارے جشن کا دن، معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی سالانہ جشن منایا کرتے تھے جس میں سارے کے سارے لوگ اکٹھے ہوتے جیسے میلوں میں اجتماع ہوتا ہے "یَوْمُ الزِّیْنَةِ" جشن کا دن جو تمہارے میلے کا دن ہے وہی مقابلہ کا دن ٹھہرا جب کہ ساری مخلوق آئی ہوئی ہوگی اور وقت بھی متعین کر دیا "ضُحًى" چاشت کا وقت یعنی سورج چڑھنے کے بعد دوپہر سے پہلے پہلے یہ جو وقت ہوا کرتا ہے یہ وقت متعین، دن متعین اور جگہ متعین کر لی گئی "مَكَانًا سُوًى" کے ساتھ جس کا ذکر ہے کہ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سب کا پہنچنا آسان ہو، برابر کی جگہ یہ سارے الفاظ آپ کے سامنے سورۃ طٰہٰ

میں آئیں گے تو یہ جگہ کی تعیین ہوگئی، دن کی تعیین ہوگئی، وقت کی تعیین ہوگئی، مقابلے کا اعلان ہوگیا۔

اب فرعونیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جادوگروں کو اکٹھا کرنے کے لیے اپنے آدمی دوڑا دیے، اور جادوگروں کو اکٹھا کرلیا گیا، ذرا خیال فرمایئے، واقعات کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہوتی ہے اب یہ تو ممکن نہیں کہ فرعون کے ساتھ اپنا وقت طے کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام چپ ہو کر بیٹھ گئے ہوں، جس طرح تشہیر فرعون نے کرنی تھی اس خیال سے کہ اتنے بڑے بڑے جادوگر میری سلطنت میں ہیں جب یہ ان کے مقابلہ میں آ کر شکست کھا جائے گا، عوام کی نظروں میں گر جائے گا، لوگ اس کے پیچھے نہیں لگیں گے تو میرا مقصد حل ہو جائے گا اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی کامیابی کا یقین تھا تو یقیناً ان دنوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جگہ جگہ تقریریں کر کے لوگوں کو کہا ہوگا کہ ہمارا مقابلہ دیکھنے کے لیے آنا، مقابلہ ہوگا اور تمہیں پتہ چلے گا کہ جادوگر کون ہے اور اللہ کا رسول کون ہے؟ صبح وشام، رات دن تقریریں ہوتی ہیں اور ان کا تو مشن ہی تقریریں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی توحید سمجھانی تھی، لوگوں کے حقوق بتلانے تھے، ظالموں کو ظلم سے روکنا تھا، مظلوموں کو حوصلہ دلانا تھا یہ وعظ تقریر جس طرح سے ہوتی تھی اس طرح سے ہوتی رہی ہوگی کیونکہ مقابلہ کا دن متعین ہوگیا۔

سب کو ذہنی طور پر تیار کیا جا رہا ہے کہ مقابلہ دیکھنے کے لیے آئیں جو غلبہ پا گیا وہ سچا ہوگا جیسے فرعونیوں کی طرف سے سارے ملک میں مقابلہ کی یہ تحریک چل رہی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسی طرح سے تقریریں کرتے ہوں گے چنانچہ حکومت کے لیے کیا مشکل تھا، سارے ملک میں لوگ بھیج دیے، بڑے بڑے جادوگر سارے کے سارے اکٹھے ہوگئے اب جس وقت وہ سارے کے سارے مصر میں اکٹھے ہوگئے، ذرا خیال فرمایئے، عقلی طور پر واقعات کی ترتیب اس طرح سے ہوگی کہ جب ایک آدمی کے مقابلہ کے لیے کسی دوسرے کو بلایا جاتا ہے تو مقابلہ میں آنے والا اپنے مدمقابل کے حالات کا مطالعہ کرتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے، کیا دکھاتا ہے، کس طرح سے کرتا ہے، جس طرح سے پہلوان جس وقت کشتی کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے داؤ دیکھتے ہیں کہ پچھلی کشتی میں اس نے کیا داؤ استعمال کیا تھا تاکہ ہم اس کا توڑ مہیا کریں، مقابلہ میں ہمیشہ ایک دوسرے کے حالات کا جائزہ شدت سے لیا جاتا ہے تو یہ بالکل صحیح بات ہے کہ جب یہ جادوگر اکٹھے ہوگئے ہوں گے تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریریں سننے جاتے تھے کہ یہ ہے کیا چیز اور کہتا کیا ہے اور یہ کس رنگ میں لوگوں کو بھڑکاتا ہے یا کس طرح سے لوگوں کے سامنے تقریر کرتا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وعظ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر چاہے وہ سامنے جا کر سنتے ہوں چاہے وہ چھپ کر

سنتے ہوں، بہر حال انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وعظ کا جائزہ لیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیالات پرکھے، ان کے حالات کو دیکھا اور یہ معلوم کیا کہ یہ کیا ڈھنگ استعمال کرتے ہیں اور کس طرح سے ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات سارے کے سارے ان کے سامنے آگئے یہ ایک قاعدے کی بات ہے تو سارے حالات کا جائزہ لینے کے بعد مقابلہ کیا جاتا ہے، یہ نہیں کہ اندھا دھند آئے اور نہیں دیکھا کہ میرا مد مقابل کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا اور آتے ہی میدان میں بھڑ جائے ایسا نہیں ہوا کرتا، دنیا میں طریقہ یہی چلا آرہا ہے جب وہ جادوگر اکٹھے ہوئے۔

اہل حق کی نظر آخرت پر ہوتی ہے اور اہل باطن کی نظر دنیا پر ہوتی ہے:

اب ذرا خیال کریں! حق اور باطل کا فرق معلوم کرنے کے لیے کوئی زیادہ غور وخوض کی ضرورت نہیں ہوتی بالکل ان میں اس طرح سے فرق ہوا کرتا ہے جس طرح سے رات اور دن میں ہے، جس طرح سے روشنی اور تاریکی، ظلمت اور نور آپس میں مشتبہ نہیں ہوتے اسی طرح سے حق اور باطل بھی آپس میں مشتبہ نہیں ہیں بشرطیکہ اپنی آنکھ کے اندر روشنی صحیح ہو اور دیکھنے کا ارادہ ہو، انبیاء علیہم السلام کی تاریخ آپ کے سامنے ہے اور آپ پڑھیں گے کچھ آپ نے پڑھ لی کہ جس وقت انبیاء علیہم السلام قوم کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو ان کا پہلا نعرہ یہ ہوتا ہے "لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا" بھائی دیکھو! میں اس کو روٹی کمانے کا ذریعہ نہیں بنا رہا، میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا کہ مجھے پیسے دو، میں کوئی بھوکا نہیں ہوں کہ میں نے یہ کوشش اس لیے شروع کی ہے تاکہ میں اس کو اپنے لیے آمدنی کا ذریعہ بنالوں، میں تم سے اجر نہیں مانگتا ہوں، میری اجرت تو اللہ کے ذمے ہے، وہی مجھے اجر وثواب دے گا، میں تو تمہارا خیر خواہ بن کر آیا ہوں، تم خیر خواہی چاہتے نہیں تو بھی میں کر رہا ہوں، تم آگے سے گالیاں دو تو بھی میں کروں گا، تم آگے سے مارو تو بھی میں تمہیں بھلائی کی بات کہوں گا یعنی معاشرے کے اندر ان کو عزت ومرتبہ جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ حق کی خاطر اس کی قربانی دیتے ہیں اور حق کا معاوضہ قوم سے نہیں مانگتے کہ تم ہمیں یہ معاوضہ دو۔

یہی علامت ہوتی ہے سب سے زیادہ حق پرستی کی کہ ایک آدمی کھاتا اپنی جیب سے ہے، تم سے کچھ مانگتا نہیں اور صبح وشام سمجھانے کے لیے تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے تو یہاں انسان اگر تھوڑا سا بھی سوچے تو اس کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ واقعی یہ کوئی حق پرست آدمی ہے جو قوم کی ہمدردی میں ساری کی ساری محنت اٹھا رہا ہے ورنہ نہ کسی سے کپڑا مانگے، نہ روٹی مانگے، نہ مکان مانگے، نہ کرایہ مانگے کچھ بھی نہیں۔

اور دوسری طرف جو باطل پرست ہوا کرتے ہیں ان کے سامنے چونکہ آخرت کا تصور تو ہوتا نہیں، انہوں نے جو کچھ کرنا ہوتا ہے سب پیٹ کا دھندا ہوتا ہے، پیٹ کے دھندے کے لیے کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں اس لیے جب فرعون کے سامنے آئے ہوں گے اور ان کی میٹنگ ہوئی ہوگی اور فرعون بھی اس میں بیٹھا ہوگا تو فرعون نے کہا ہوگا کہ اس سے میری جان چھڑاؤ، یہ کیا آ گیا یہ تو خطرہ ہے کہ یہ تختہ الٹ دے گا، یہ تو ہماری حکومت چھین لے گا پورے خطرات سے جس طرح سے آگاہ کیا جاتا ہے جب وہ سارے کے سارے خطرات فرعون نے پیش کیے ہوں گے تو آگے سے انہوں نے اجرت کا مطالبہ کیا یہ نہیں کہ آتے ہی کہہ دیا کہ ہم تو اتنے پیسے لیں گے بلکہ اس طرح سے ترتیب ہوا کرتی ہے کہ آپس میں میٹنگ ہوئی، خطرات کا اظہار ہوا وہ سمجھ گئے کہ اب یہ فرعون دباؤ میں آیا ہوا ہے تو کہتے ہیں دیکھو جی مقابلہ ہم کریں گے اور جیتنے کی صورت میں پھر بہت بڑی اجرت لیں گے "اجراً" کی تنوین تعظیم کی ہے اگر ہم جیت گئے تو جیتنے کی صورت میں ہمارے لیے اجرت ہوگی، ہم بہت بڑی اجرت لیں گے اب فرعون تو مرعوب ہو چکا تھا وہ کہتا ہے ہاں ہاں اجرت بھی ملے گی اور پھر میں تمہیں اپنا مقرب بھی بنالوں گا، تم میرے درباری ہو جاؤ گے یعنی جن کی وجہ سے مجھے فتح حاصل ہوگی اور میرا مدمقابل شکست کھا جائے گا ان کی کتنی عزت ہوگی میری نگاہ میں، اس طرح سے ان کو جاہ کی بھی طمع دلاتا ہے اور اجر کا وعدہ کر کے ان کو مال کی بھی طمع دلاتا ہے۔

تو جو آتے ہی پہلے تنخواہ مانگتا ہے اور آتے ہی پہلے اجرت مانگتا ہے اس میں کتنا فرق ہے دیکھنے والا تو یہیں سے سمجھ سکتا ہے کہ ایک پیشہ ور ہے اور دوسرا کوئی پیشہ ور نہیں وہ تو معلوم ایسے ہوتا ہے کہ جیسے اللہ کی طرف سے اس کے ذمے ایک منصب لگا ہے اور قوم چاہے نہ چاہے وہ سمجھانے پر تلا ہوا ہے اگر آنکھوں میں نور ہو اور دل میں کوئی تھوڑی سی بصیرت ہو تو یہ بات ہی حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے کے لیے کافی ہو جاتی ہے کہ کون دنیا دار ہے اور کون دنیا کمانے کے لیے اس قسم کی چیزیں لاتا ہے اور کون مخلص ہے جس کو دنیا کی کوئی پرواہ نہیں چاہے اس کی عزت کرو نہ کرو، چاہے اس کو اچھے لفظ سے یاد کرو یا نہ کرو، چاہے اس کو گالیاں دو، چاہے پتھر مارو وہ تمہیں سمجھا رہا ہے اور تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے ان دونوں باتوں میں فرق اس طرح سے ہے جس طرح دن اور رات میں فرق ہوتا ہے جیسے ظلمت اور نور میں فرق ہوتا ہے جیسے تاریکی اور روشنی میں فرق ہوتا ہے حق اور باطل میں اسی طرح سے فرق ہوتا ہے اور اہل حق اور اہل باطل میں اسی طرح سے فرق ہوتا ہے کہ ایک کے سامنے سوائے دنیا کے کچھ نہیں ہوتا اور ایک کے سامنے سوائے آخرت کے کچھ نہیں ہوتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ:

بات ہوگئی اجرت کا وعدہ بھی ہوگیا اب جتنے دن تک وہ "یوم الزینۃ" نہیں آیا تھا تو وہ اسی طرح سے مصر میں رہے ہوں گے، اپنے کرتب تیار کرتے رہے ہوں گے، مقابلہ کرنے کے لیے پر تولتے رہے ہوں گے اب وہ سارے کے سارے حالات کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام ایک لاٹھی کو سانپ بناتا ہے تو ہم جس وقت مقابلہ میں جائیں گے تو ہمیں اس کے اوپر قوم کو کچھ اضافہ دکھانا چاہیے تاکہ لوگ یہ کہیں کہ دیکھو! جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی کا سانپ بنا دیا مقابلہ میں جو آئے تھے انہوں نے لاٹھیوں کے بھی سانپ بنا دیے اور رسیوں کے بھی سانپ بنا دیے اس لیے جب وہ مقابلہ میں آئے تھے تو لاٹھیوں کے ساتھ ساتھ رسے بھی لے کر آئے تھے یہ اضافہ کی بات ہے تاکہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جب ہم لوگوں کے سامنے آئیں گے تو جو کچھ موسیٰ علیہ السلام دکھاتے ہیں ہماری طرف سے اس کے اوپر اضافہ ہونا چاہیے۔

تفسیری روایات میں آتا ہے جو اکثر اسرائیلیات ہوتی ہیں لیکن چونکہ ان کا تعلق تاریخ سے ہے اس لیے ان کے لینے میں اور بیان کرنے میں حرج بھی کوئی نہیں کہتے ہیں کہ جب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں آئے تھے تو انہوں نے شکل وصورت سب حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی بنائی ہوئی تھی تاکہ دیکھنے والے لوگ یہ سمجھیں جیسے یہ ہے ویسے یہ ہیں، ویسا لباس بنالیا، ویسی شکل بنالی، ویسی صورت بنالی خلط ملط کرنے کے لیے تاکہ لوگ سمجھیں کہ ظاہری صورت کے اعتبار سے بھی ایک جیسے ہی ہیں، کرتب بھی دونوں نے ایک ہی جیسا دکھایا ہے، ایک نے ایک چیز کا دکھایا دوسرے نے دو کا دکھایا یہ ڈھنگ ہوتے ہیں اہل فن کے آپس میں مقابلہ کرنے کے، وہ اسی طرح سے ویسے ہی ہاتھ میں ڈنڈا پکڑ کر جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے اسی آن بان کے ساتھ وہ میدان میں آگئے اب وہ آئے شاہی اعزاز کے ساتھ، ان کے ساتھ تھیں شاہی فوجیں، ان کو بٹھایا گیا ہوگا اچھی اچھی کرسیوں پر، اچھے اچھے میز رکھے ہوئے ہوں گے، صوفہ سیٹ رکھے ہوئے ہوں گے اس زمانے کے اعتبار سے جو بھی زیب و زینت کا سامان تھا بڑی ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ آئے ہوں گے اور ساری قوم ان کے ساتھ ہوگی۔

اور ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام درویش اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام اور جو غلامی کے پٹے ہوئے لوگ ڈرتے ہوئے جو فرعون کے سامنے جانے کی کچھ تھوڑی بہت جرأت کرتے ہوں گے وہ ساتھ ہوں گے، نہیں تو یہ اکیلا مرد خدا

ہوگا اور اس کے ساتھ اس کا بھائی کیونکہ جب سامنے فرعون نے بیٹھنا تھا اور سارے ہی حکام نے بیٹھنا تھا تو کون نمایاں ہو کہ ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پارٹی کے ہیں ان کو پتہ ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام شکست کھا گئے تو کل کو ہمارا کیا حال ہوگا؟ تو غلام قوم جو ہوا کرتی ہے وہ حاکم کے سامنے جلدی نمایاں نہیں ہوا کرتی، پتہ نہیں چلنے دیتے کہ یہ اس پارٹی کا ہے کہیں حکومت ہمیں مخالف سمجھ کر ہمارا رگڑا نہ نکال دے، پھر فرعون وقت کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس تو خدائی طاقت تھی انہوں نے تو کسی سے کیا ڈرنا تھا لیکن باقی قوم نہیں جرأت کر سکتی تھی اس لیے صورتحال ایسی ہوگی کہ ان کے پیچھے دو چار نوجوان جو ڈرتے ہوئے ایمان لائے تھے جس طرح سے سورۂ یونس میں آپ کے سامنے آئے گا "ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهِمْ" فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتے ڈراتے کچھ نوجوان جو ایمان لائے ہوں گے ممکن ہے وہ ساتھ ہوں ورنہ اکیلا مرد خدا اور اس کا ساتھی اور اس کا وزیر ہارون علیہ السلام۔

چلے گئے، میدان قائم ہو گیا اور سارے ملک میں چونکہ تشہیر ہو چکی تھی کہ حق اور باطل کا فیصلہ ہونا ہے، سچا کون ہے جھوٹا کون ہے؟ تو اس لیے اجتماع جو ہوگا وہ آپ کے سامنے ہی ہے کہ کس طرح سے ہوگا، مقابلہ دیکھنے کے لیے مخلوق کتنی آئی ہوگی، آگے جادوگروں کی طرف سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ جس وقت وہ میدان مقابلہ قائم ہو گیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں جادوگر سامنے بیٹھے ہیں اور ادھر یہ اکیلا مرد خدا درویش پتہ نہیں کہ بیٹھنے کے لیے چٹائی بھی ہوگی یا نہیں ہوگی، مسکنت کی شکل میں نظر آتا ہوگا، اکیلا نظر آتا ہوگا، بظاہر اس کے پاس کوئی ساز و سامان نہیں ہوں گے اس طرح سے ہوگا تو یہ فرق جو ہے یہ بالکل نمایاں ہو گیا مادی زندگی کا اور غیر مادی زندگی کا یہی صورت ہوگی تو سورۃ طٰہٰ میں آپ کے سامنے آئے گا کہ وہاں اس میدان میں کھڑے ہو کر مقابلہ شروع ہونے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تقریر کی ہے لیکن اس تقریر کا رخ سراسر جادوگروں کی طرف تھا، جادوگروں کو خطاب کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ بدبختو! دیکھو اگر تمہاری وجہ سے قوم گمراہ ہو گئی تو وبال تم پر آئے گا، تم جانتے ہو کہ جادو کے کیا اصول ہیں اگر حق تمہارے سامنے نمایاں ہو گیا اور تم یہ سمجھ گئے تو حق کا اقرار کرنا ہوگا ورنہ یاد رکھو تم آخرت کے عذاب میں مبتلاء ہو جاؤ گے اس طرح سے تقریر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جادوگروں کو خطاب کر کے اس میدان مقابلہ میں یہ سورۃ طٰہٰ کے اندر آئے گی ان کو خطاب کر کے سمجھایا دیکھو تم آ گئے ہو اور تم قوم کے نمائندے ہو اگر حق کا اقرار تم نے نہ کیا اور حق بات تمہارے سامنے واضح ہو گئی اور تم نے قبول نہ کیا، تم نے اللہ کے اوپر استہزاء باندھا تو یاد رکھو کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے اور تمہارا استیصال کر دے گا اور تم عذاب کے اندر مبتلاء ہو جاؤ گے یہ جو فرض تھا تبلیغ کا براہ راست

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو خطاب کر کے ایمان کی دعوت دی، آخرت کیا ہے آخرت کے متعلق کیا کہتے ہیں یہ ساری کی ساری تقریریں انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنی ہوئی تھیں۔

مقابلہ کا اعلان ہو گیا، وقت ہو گیا مقابلہ کا، آئے میدان میں اب یہ بھی ایک قاعدہ ہوتا ہے بسا اوقات جو پہلے وار کر دے اس کا وار کامیاب ہوتا ہے اور دوسرا اگر اس وار میں سنبھل نہ سکے تو اس کی شکست یقینی ہو جاتی ہے اس لیے اکثر و بیشتر مناظروں کے اندر بھی لوگ کوشش یہی کیا کرتے ہیں کہ پہلی تقریر کا موقع ہمیں ملے تاکہ ہم الزامات لگائیں اور دوسرا دفاع کرنے پر مجبور ہو، بسا اوقات الزام سمجھ میں جلد آ جایا کرتے ہیں دفاع جلدی نہیں ہوا کرتا اب جادوگروں نے سوال اٹھایا کہ پہلے کون اپنا کرتب دکھائے، سوال یہ اٹھا کہ ابتداء کون کرے گا؟ موسیٰ علیہ السلام تو ڈالے گا اپنا جادو یا ہم ڈالیں، موسیٰ علیہ السلام کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوت حاصل تھی انہوں نے خیال کیا ہو گا کہ اگر میں نے پہلے ڈال دیا اور یہ آگے سے کچھ دکھا نہ سکے پھر ان کو بہانہ مل جائے گا کیونکہ پہلے اس نے کر دیا تھا اس لیے ہمارا جادو کامیاب نہیں ہوا تو کیوں ان کو خواہ مخواہ ایک اعتراض کا موقع دیا جائے، پوری لا پرواہی کے ساتھ کہہ دیا کہ بھائی مجھے کوئی اعتراض نہیں پہلے تم دکھا لو یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام پہلے وار کر دیتے اور ان کا جادو چلتا ہی نا تو اس طریقہ سے باطل کی شکست نمایاں نہ ہوتی دوسرا کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ شاید انہوں نے وار پہلے کیا ہے اس لیے وہ غلبہ پا گئے اور اگر ان کو وار کرنے کا پہلے موقع مل جاتا تو وہ غالب آ جاتے پھر ایک اشتباہ کی بات ہو سکتی تھی اور ان کا جادو جو تھا پوری طرح سے مقابلہ میں نمایاں نہ ہوتا تو اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پورے استغناء کے ساتھ کہہ دیا بھائی تم ہی دکھاؤ کیا دکھاتے ہو، ڈالو کیا ڈالتے ہو۔

جس وقت یہ کہا تو انہوں نے اس طرح سے جس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام معجزہ دکھایا کرتے تھے جتنے جادوگر آئے ہوئے تھے "سحرۃ" جمع کا صیغہ ہے بہت جادوگر آئے ہوں گے مقابلہ میں انہوں نے اپنی لاٹھیاں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں اور جو رسے ساتھ لائے تھے اٹھا کر یوں میدان میں پھینک دیے جس وقت میدان میں پھینک دیے تو قرآن کہتا ہے "سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ" انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا تھا وہ جادو کا کیا اثر ہوا "يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى" کہ لوگوں کے خیال میں یہ بات آنے لگی کہ یہ بھاگے پھر رہے ہیں ایسی چشم بندی کر دی کہ لاٹھیاں بھی اس طریقے سے بھاگتی ہوئی نظر آئیں جس طرح سے سانپ بھاگتا ہے اور رسے بھی اس طرح سے بھاگتے ہوئے نظر آ رہے ہیں جس طرح سے کہ سانپ بھاگتا ہے یہ "سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ" سے معلوم

ہوتا ہے کہ ان کے جادو کا اثر لوگوں کی آنکھوں پر تھا کہ ایسا تصرف کیا تصرف کرنے کے ساتھ ان کو لاٹھیاں سانپ کی شکل میں نظر آنے لگ گئیں اور رسیاں جو تھیں وہ بھی سانپ نظر آنے لگ گئیں ایسا جادو کیا "بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ" بڑا جادو لائے لوگوں کی آنکھیں بدل کر رکھ دیں اب وہ ساری کی ساری قوم جو ہے وہ چیخ اٹھی ہوگی واہ واہ کہا ہوگا کہ دیکھو وہ تو ایک لاٹھی کو سانپ بناتے تھے ہمارے جادوگروں نے کتنے سانپ بنا دیے اور اس میں اضافہ کر دیا کیونکہ مقابلہ میں پہلوان کے ساتھ جو پیچھے ہوا کرتے ہیں وہ شور زیادہ مچایا کرتے ہیں، نعرے پچھلے لگایا کرتے ہیں یہ میں ایسے نہیں کہہ رہا یہ قرآن کریم کے اشاروں کی تفصیل ہے، لاٹھیاں ڈالیں، رسیاں ڈالیں دیکھنے والوں کو وہ سانپ نظر آنے لگ گئے اور ساتھ انہوں نے نعرہ لگایا "بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ" فرعون کی عزت کی قسم بے شک ہم غلبہ پا گئے جس وقت یہ جادو ان کا سامنے کامیاب سا نظر آیا کہ یہ جادو کے زور سے لاٹھیاں اور رسیاں سانپ نظر آئیں تو پھر وہ "بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ" یہ فرعون کی عزت کی قسم اور فرعون کی جائے پکار دی اور اس کی فتح کا اعلان کر دیا کہ فرعون کی عزت کی قسم ہم غلبہ پا گئے اس طرح سے کر کے پھر شور مچا دیا۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی طرح سے معلوم ہو رہا تھا یہ دیکھو! میں آپ کی خدمت میں عرض کروں آگے لفظ آئیں گے قرآن کریم میں "فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى" حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اپنے دل کے اندر خوف محسوس کرنے لگ گئے، وہ خوف محسوس کس طرح سے کرنے لگ گئے وہ اس طرح سے ڈر گئے کہ یہ کیا معاملہ ہو گیا ان کو تو پتہ نہیں انہوں نے کیا کرنا تھا، جادوگروں کو تو پتہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کیا کرنا ہے، جب یکدم وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ کی شکل میں نظر آئیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام دھڑک گئے اندر سے وہ دھڑک گئے کس طرح سے؟ کیا ہوا؟ کہ یا اللہ یہ کیا قصہ ہوا میں بھی لاٹھی پھینکوں گا وہ بھی سانپ بنے گی تو قوم فرق کس طرح سے کرے گی کہ جادو کیا ہے اور معجزہ کیا ہے؟ لوگوں کو تو دونوں چیزیں ایک ہی نظر آئیں گی، میں لاٹھی ڈالوں گا تو وہ بھی سانپ نظر آئے گا اور انہوں نے جو رسیاں ڈالی ہیں، لاٹھیاں ڈالی ہیں یہ بھی سانپ نظر آنے لگ گئے تو یہ حق اور باطل کا فرق کس طرح سے ہوگا اس بات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں دھڑکا پیدا ہو گیا چونکہ پہلے معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے کرنا کیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تو انہوں نے سنا ہوا تھا، دیکھا ہوا تھا یہ کیا کرتے ہیں باقی یہ جادوگر کیا کریں گے یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے نہیں تھا اس لیے جب یہ صورت سامنے آئی تو قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دل میں ڈر گئے، ڈرنے کی وجہ یہ ہے جو میں عرض کر رہا ہوں کہ جو کچھ انہوں نے دکھایا ہے قوم کو نظر ہی آ رہا ہے کہ وہ

سانپ بن گئے، میں لاٹھی ڈالوں گا وہ بھی تو سانپ ہی بنے گا تو یہ جاہل عوام کس طرح سے فرق کریں گے کہ یہ جادو ہے اور یہ حقیقتاً معجزہ ہے، یہ لوگ فرق کس طرح سے کریں گے اس طرح سے حق اور باطل میں اشتباہ ہو جائے گا۔

اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل کے اندر یہ خوف سا پیدا ہوا تو فوراً اللہ کی طرف سے بات آئی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے تو ڈال دے ابھی نگل جائیں گے سب کو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو اپنی لاٹھی پھینکی تو لاٹھی پھینکنے کا اثر یہ ہوا کہ اس نے جو منہ کھولا تو جتنے میدان میں پھر رہے تھے سب کو نگل گیا، دیکھتے ہی دیکھتے سارا میدان صاف کر دیا جب سارا میدان صاف کر دیا اور اس کو ہاتھ میں پکڑا تو اپنی لاٹھی ہاتھ میں ہے باقی سب کچھ غائب۔

اب یہ قصہ جو ہوا تو قرآن کریم کہتا ہے "غُلِبُوْا هُنَالِكَ" وہیں سارے ہار گئے لیکن آپ ذرا ذلت کا اندازہ کیجئے کہ [illegible] فرعون کو فرعون کی ساری قوم کو اور سارے کے سارے قبطی باشندوں کو کتنی ذلت اٹھانی پڑی ہوگی اس میدان میں کہ ساری قوم دیکھ رہی ہے کہ یہ تو غلبہ پا گئے اور وہ سارے کے سارے ہار گئے، ان کے پلے تو رہا ہی کچھ نہیں۔

اس میں مفسرین کی دونوں رائیں ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سانپ سب کو نگل گیا تھا تو نگلنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسیاں سانپ جو کچھ تھا وہ سب کو نگل گیا کوئی چیز باقی نہیں رہی اور مفسرین کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ نگلنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا میدان میں جانا ہی تھا کہ ان کے جادو کا اثر ختم ہو گیا، لوگوں کو نظر آنے لگ گیا کہ یہ رسیاں ہیں، یہ ڈنڈے ہیں اور یہ حقیقت میں سانپ ہے جو اس طرح سے پھر رہا ہے، اس کے جانے کے ساتھ ہی ان کا سارا جادو ختم ہو گیا گویا کہ جو شکل انہوں نے بنائی تھی، جو شکل انہوں نے اختیار کی تھی اس کو نگل گیا یعنی اس کے جانے کے بعد سب ختم ہو گیا، پہلا معنی زیادہ واضح ہے کہ جس طرح سے وہ سانپ جو پھرتے ہوئے نظر آ رہے تھے جس طرح سے ایک بڑا سانپ چھوٹے سانپ کو کھا جاتا ہے اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اژدھا منہ کھول کر سب کو نگل گیا۔

جادوگروں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا:

اب جاہل کے سامنے فرق کرنا تو مشکل ہوتا، وہ سمجھتا کہ یہ بڑا جادوگر ہے، اس کا جادو چھوٹے جادوگروں پر غالب آ گیا وہ تو زیادہ سے زیادہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ بڑا جادوگر ہے اور یہ چھوٹے جادوگروں پر غالب آ گیا لوگوں

کے ذہن میں تو یہی آتا لیکن آپ جانتے ہیں کہ صاحب فن حقیقت کو سمجھتا ہے، وہ جادوگر جو تھے جب انہوں نے یہ نقشہ دیکھا تو نقشہ دیکھتے ہی وہ دیانت داری کے ساتھ سمجھ گئے کہ یہ جادو نہیں ہے کیونکہ جادوگر کے سامنے تو جادو کے اصول ہوتے ہیں، غیر جادوگر تو فرق نہیں کرسکتا، آپ علم والے ہیں آپ کے سامنے کوئی بات کرے گا تو آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ نحو کا مسئلہ بیان کررہا ہے، یہ صرف کا مسئلہ بیان کررہا ہے، یہ معانی کا مسئلہ بیان کررہا ہے یا یہ حدیث کے مسئلے کی بحث ہے لیکن جو جاہل ہوتے ہیں جن کے سامنے علم تو ہوتا نہیں آپ صرفی صیغہ بیان کریں گے وہ کہیں گے قرآن کریم کی تفسیر کررہا ہے اور آپ کوئی قرآن کریم کی آیت پڑھیں گے وہ کہیں گے کہ پتہ نہیں کیا کررہا ہے، حدیث پڑھیں گے تو قرآن کریم اور حدیث میں ان کو فرق نہیں ہوتا یعنی اگر آپ کی منطق کی کتاب کا کوئی ورق پھٹا ہوا کہیں پڑا ہوا ہو اور وہ دیہاتی کے ہاتھ میں آجائے تو وہ چوم چوم کر چاٹ کر پتہ نہیں اس کو کہاں لے جائے گا اور آپ جس وقت اس کو دیکھیں گے کہ اس میں لکھا ہوا کیا ہے تو کہیں اس میں جنس کی تعریف لکھی ہوئی ہے، کہیں نوع کی تعریف لکھی ہوئی ہے، کہیں فصل کی تعریف لکھی ہوئی ہے تو جس طرح سے ایک اخبار کا کاغذ ہوتا ہے آپ اس کو اس طرح سے پھینک دیں گے۔ اہل علم فرق جانا کرتے ہیں عام آدمی نہیں جانتا تو جس وقت ایک آدمی آپ کے سامنے جملہ کی ترکیب کررہا ہے آپ سمجھتے ہیں کہ یہ نحو کا مسئلہ ہے منطق کا نہیں اور جہاں وہ مقدمے جوڑ کر نتیجے نکال رہا ہے تو آپ سمجھ جائیں گے کہ یہ منطق کا مسئلہ ہے نحو کا نہیں، جہاں وہ لفظوں کی نسبت بیان کررہا ہے کہ یہ جملہ ایسے بولا ہے ایسے نہیں بولا تو آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ فصاحت وبلاغت کا مسئلہ ہے صرف ونحو کا نہیں اور جہاں آپ اسماء الرجال پر بحث کررہے ہوں گے اور روایت بیان کررہے ہوں گے تو سمجھ جائیں گے کہ یہ حدیث کا مسئلہ ہے، یہ قرآن کریم کی آیت نہیں آپ فرق کرتے ہیں۔

اسی طرح سے جب ان جادوگروں نے دیکھا تو جادوگر اپنے فن کے لحاظ سے سمجھ گئے کہ بھائی یہ مسئلہ اس فن کا نہیں ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کر کے دکھایا یہ اس فن کا مسئلہ نہیں، جادوگر فرق کر گئے جب جادوگر فرق کر گئے تقریریں انہوں نے پہلے سنی ہوئی تھیں، حالات سارے کے سارے سامنے تھے چونکہ ان کے سامنے وہ بات فرعون جیسی تو تھی نہیں کہ اپنا تخت بچانا ہے اس لیے کہ یہ مزدور قسم کے پیٹ پرست قسم کے لوگ تھے لیکن جب ان کے سامنے حقیقت کھلی تو جو رکاوٹیں بڑے لوگوں کے سامنے ہوتی ہیں ایسے لوگوں کے سامنے نہیں ہوتیں یہ تو فوراً

پکار اٹھے کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ کہتا ہے صحیح کہتا ہے یہ رب العالمین کا رسول ہے، ہم نے رب العالمین کو مان لیا فوراً انہوں نے اپنی ہار مان کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اوپر ایمان کا اعلان کر دیا گویا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریروں کی وجہ سے بات تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے پہلے آئی ہوئی تھی لیکن ابھی قبول نہیں کی تھی اور جس وقت معجزہ دیکھا اور سمجھ گئے کہ یہ جادو نہیں تو ان کے دل میں آگیا کہ یہ جو کچھ کہتا ہے یہ صحیح ہے، یہ کسی غیبی طاقت کا کرتب ہے، یہ جادو کا مسئلہ نہیں ہے تو فوراً انہوں نے ایمان کا اعلان کر دیا تو گویا کہ نیک نیت ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ان کو اپنی ہار ماننے میں اور حق کے قبول کرنے میں کوئی عار نہیں آئی تو جس وقت جادوگروں نے ایمان کا اعلان کیا رب العالمین کے ساتھ، اب ساتھ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا لفظ بڑھا دیا کہ کہیں یہ نہ سمجھے کہ رب العالمین سے میں ہی مراد ہوں کیونکہ وہ بھی اپنے آپ کے متعلق رب ہونے کا اعلان کر رہا تھا اس لیے موسیٰ و ہارون کہہ دیا اور پھر فوراً سجدے کے اندر گر گئے، سجدے میں گر کر فوراً اللہ کے سامنے اپنی توبہ کا اعلان کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کا اعتراف کیا۔

اور قرآن کہتا ہے کہ "القوا" ڈال دیے گئے، ڈال دیے گئے مطلب یہ ہے کہ حق کے سامنے وہ اس طرح سے مجبور ہو گئے کہ ان کو اختیار ہی نہیں رہا، اس کے بغیر ان کے سامنے کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ مان جائیں کہ موسیٰ ٹھیک کہتا ہے باطن کی کیفیت سے وہ اس طرح سے مجبور ہو گئے سجدے میں گر گئے جب سارے کے سارے جادوگر ایمان بھی لے آئے، سجدے میں گر گئے تو اب بتاؤ کہ جب پہلوان خود کہہ دے کہ مد مقابل مجھ سے طاقت میں زیادہ ہے میں ہار گیا وہ اپنی ہار کا اعلان کر دے تو پیچھے کوئی تاویل کر سکتے ہیں ورنہ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جس نے الیکشن میں شکست کھائی ہے وہ کبھی کھل کر نہیں کہا کرتا کہ میں نے شکست کھائی ہے، وہ کہتا ہے کہ دھاندلی ہوئی ہے اگر انصاف کے ساتھ الیکشن ہوتا تو میں کامیاب ہوتا، فلاں نے گڑبڑ کی ہے، افسر نے گڑبڑ کی ہے، در پردہ پولیس نے اس کی حمایت کی اور لوگوں کو دبایا الیکشن میں شکست کھانے کے بعد شکست خوردہ فریق ہزار بہانے بناتا ہے، لیکن اگر لیڈر مان جائے کہ انصاف کے ساتھ الیکشن ہوا ہے اور میں ہار گیا تو پھر پیچھے قوم کے لیے کچھ کہنے کا جواز نہیں ہوتا، پہلے تو لیڈر بیان دیا کرتا ہے کہ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے، میرے ساتھ دھاندلی ہوئی ہے، افسروں نے اس کی حمایت کی ہے، پولیس نے در پردہ اس کی حمایت کی ہے پہلے لیڈر بیان دیا کرتا ہے اور پیچھے قوم اچھلا کرتی ہے اس لیے ذہنی طور پر وہ شکست ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اپنی خفگی کو ان تاویلوں کے ساتھ مٹا لیتے ہیں لیکن جب

لیڈر کھل کر بیان دے دے کہ الیکشن انصاف سے ہوا ہے اور وہ واقعی جیت گیا میں ہار گیا تو لیڈر کے بیان کے بعد پھر قوم کے پلے کیا رہ گیا تو یہاں صورت حال وہی پیش آئی کہ جو مقابلے میں گئے تھے وہی مان گئے کہ ہم ہار گئے اور سجدہ ریز ہو گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کا اقرار کر گئے اور وہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتوں پر ایمان کا اعلان کر گئے، اب فرعون یا فرعونیوں کے پاس تاویل کی کیا گنجائش رہ گئی تھی اب وہ اپنے پہلوانوں کے لیے کوئی تاویل تو نہ کر سکے۔

جادوگروں کے ایمان لانے پر فرعون کی سیاسی چال:

لیکن اب نقشہ ان کے سامنے آ گیا کہ اب تو تختہ الٹا ہی الٹا کہ ہم تو سمجھے تھے کہ موسیٰ شکست کھا جائے گا تو چلو یہ بات یہیں دب جائے گی۔

اب ساری دنیا کو اکٹھا کر کے اس کے مقابلہ میں ہم ذلیل ہو گئے یہ تو سارا ملک اس کے پیچھے لگ جائے گا اور جو انقلاب کئی سالوں میں آنا تھا وہ ہماری اسی تدبیر کے ساتھ ایک دن میں آ گیا اب ان کے سامنے وہ بات آ گئی لیکن یہ سیاسی لیڈر اپنے اغراض میں بڑے شیطان ہوتے ہیں آخر وہ بھی تو وقت کا فرعون تھا اس نے فوراً دوسرا پینترا بدلا، اب اس کا غصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نہیں ہے، اب وہ اپنے ان وظیفہ خوروں کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ اچھا میری اجازت سے پہلے ہی مان لیا، مجھ سے پوچھا ہی نہیں، معلوم ہو گیا کہ یہ تمہاری آپس میں سازش ہے، اب اس نے رنگ یہ دیا کہ یہ تم نے سازش کی ہے "اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ" یہاں تو یہ الفاظ ہیں اور دوسری جگہ قرآن کریم میں آئے گا "كَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ" یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، یہ موسیٰ علیہ السلام استاد ہے اور تم اس کے شاگرد ہو اور تمہاری آپس میں سازش ہے اور تم نے انڈر گراؤنڈ حکومت کے خلاف سازش کی ہے اور اس کا پلان تم نے یوں بنا دیا، تمہارا منصوبہ یہ ہے کہ پہلے تمہارا استاد جا کر چیلنج کر دے اور پھر تم مقابلے میں آ جاؤ اور پھر تم میدان میں شکست کا اعتراف کر لینا تا کہ لوگ ذہنی طور پر متاثر ہو کر فوراً فرعون کے خلاف ہو جائیں یہ تو تمہاری سازش ہے جو تم نے مل جل کر کی ہے اور یہ تمہارا بڑا ہے جس کو تم نے پہلے بھیجا ہے اور تم سارے اس کے شاگرد ہو، دیکھو! پورا اس کو سیاسی رنگ دے دیا "كَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ" یہ تمہارا بڑا ہے، یہ تمہارا استاد ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے اور تم نے مل جل کر سازش کی ہے کہ خفیہ خفیہ سارا معاملہ طے کر لیا اس کو پہلے بھیج دیا اور پلان بنا لیا کہ مقابلہ ہو گا، مقابلہ میں ہم فوراً شکست کھا جائیں گے تو لوگ سمجھ جائیں گے کہ موسیٰ علیہ السلام صحیح ہیں سارے ہی اس کو پیر مان لیں گے اور سارے ہی اس کے پیچھے لگ جائیں گے اور اس طرح

اسرائیلیوں کے لیے فرعونیوں کا تختہ الٹنا آسان ہو جائے گا، یہ سازش ہے جو تم کر کے آئے ہو، فوراً اس طرح لوگوں کے ذہن میں بات ڈال دی کہ یہ تو تمہارا تختہ الٹنا چاہتے ہیں، تمہاری قوم کی حکومت ختم کرنا چاہتے ہیں، یہ تو تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔

جب یہ نقشہ کھینچ دیا جائے گا تو کم از کم قبطی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متاثر نہیں ہو سکتے بلکہ وہ سیاسی طور پر مدمقابل آ گئے کہ جیسے ہم نے ان کو غلام بنا رکھا ہے آئندہ یہ ہمیں غلام بنائیں گے یوں اپنی قوم کو مشتعل کر کے اسرائیلیوں کے خلاف کھڑا کر دیا اس نے فوراً یہ سیاسی پوائنٹ اختیار کیا اور اپنی قوم کے ذہن کے اوپر اثر انداز ہو گیا قرآن کریم میں ہے " فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ "اس نے اپنی قوم کو خفیف العقل بنا لیا اور وہ سارے کے سارے اس کے پیچھے لگ گئے کسی نے نہیں سوچا کہ اتنا کھلا مقابلہ اور اتنی کھلی حق کی فتح ہے یہ سازش کس طرح ہو سکتی ہے یہ بات کسی نے سوچی نہیں، ساری کی ساری قوم اس کے پیچھے لگ گئی۔

یہ تو پہلے قوم پر اثر ڈالا اور قوم پر اثر ڈالنے کے ساتھ ساتھ پھر ان جادوگروں کو کہتا ہے، اچھا کوئی بات نہیں پتہ چل جائے گا، یہ ہوتا ہے دھمکانے کا انداز، یہ جو سازش کر کے آئے ہو، یہ جو تمہاری ملی بھگت ہے اور تم ہمارا تختہ الٹنا چاہتے ہو تم حکومت کے باغی ہو جب تم حکومت کے باغی ہو تو ابھی میں تم پر بغاوت کا مقدمہ چلاتا ہوں اور ملک کے قانون میں جو بغاوت کی سزا ہے وہی تمہارے اوپر لگے گی وہ سزا کیا ہے؟ کہ جو بھی باغی پکڑا جائے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے جاتے ہیں، کاٹنے کے بعد اس کو سولی چڑھایا جاتا ہے اور لٹکا کے مارا جاتا ہے اس طرح میں بھی تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹوں گا اور تمہیں سولیوں پر لٹکاؤں گا یہ گویا کہ باغیوں والی سزا کی دھمکی فرعون نے ان کو دے دی کہ تم بھی باغی ہو اور اندر اندر تم نے حکومت کے خلاف سازش کی ہے۔

ایمان ہو تو ایسا.........:

اب ذرا ایک بات کی طرف توجہ فرمایئے! یہ وہی جادوگر ہیں جو کل وظیفے کا مطالبہ کر رہے تھے، جن کے سامنے اپنے پیٹ کے علاوہ کچھ نہیں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریروں سے جس وقت ان کو آخرت کا یقین آیا اور ان کے دل کے اندر واقعتاً حق اتر گیا اب دنیا کی بڑی سے بڑی دھمکی ان کے قدم نہیں ہلا سکی یہ ہے ایمان کی شان کہ جب قلب کے اندر ایمان اتر آتا ہے تو پھر نہ انسان لالچ سے متاثر ہوا اور نہ کسی کے ڈرانے سے متاثر ہو، جب حقیقت سامنے آ گئی اور دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کی بقاء جو حضرت

موسیٰ علیہ السلام کی تقریروں سے انہوں نے سمجھی ہوئی تھی جب ان کے قلب کے اندر آ گئی اور وہ سمجھ گئے کہ یہ ایک دو دن کی بات ہے، فرعون مار بھی دے گا تو کیا ہے کم از کم آخرت تو سدھرے گی اس لیے بڑی سے بڑی دھمکی بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگا سکی۔

نبی کی صحبت میں ایمان لانے والوں اور دوسروں کے درمیان میں یہی فرق ہوتا ہے، ہم برسوں سے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھتے ہیں، برسوں سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں لیکن اگر کسی کی طرف سے معمولی سی بھی دھمکی آتی ہے تو ہمارے پیچ ڈھیلے ہو جاتے ہیں لیکن نبی کی صحبت میں ایمان لانے والے جو ہوتے ہیں وہ ایسے پختہ ہوتے ہیں کہ وقت کا فرعون جس کے متعلق پتہ تھا کہ کل تک ہم اسے رب کہتے رہے ہیں اور معلوم تھا کہ اس کے فیصلہ کو سپریم کورٹ میں چیلنج بھی نہیں کیا جا سکتا، اگر اس نے سزا کا فیصلہ کر دیا تو وہاں کوئی ہائی کورٹ نہیں جہاں ہم اپیل دائر کر سکیں اور نظر ثانی کے لیے کہہ سکیں یا کسی دوسری طاقت کا ہم سہارا لے لیں گے کوئی بات نہیں ہے اور یہ جو کچھ منہ سے کہے کر سکتا ہے اس قسم کا مطلق العنان ظالم قسم کا وہ حکمران ہے، دھمکی بھی اس نے دی ہے اور دی بھی انتہائی اشتعال کی حالت میں ہے، بغاوت کا ان کے اوپر کیس کیا ہے اور یہ سزا سنا دی۔

لیکن وہ آگے سے اتنے پختہ ثابت ہوئے کہنے لگے " فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ "اب تو تجھ سے جو ہوتا ہے تو کر لے، جو تجھ سے ہوتا ہے کر لے اب تو ہم نے حقیقت مان لی، حقیقت ہمارے سامنے کھل کر آ گئی، اب تو ہم اللہ کے سامنے توبہ و استغفار کرتے ہیں کہ اس حق کے مقابلہ میں تو ہمیں جو اٹھا لایا تھا اللہ ہمارا یہ جرم معاف کر دے، تیرے کہنے کی وجہ سے جو ہم نے اس حق کا مقابلہ کیا ہے اللہ تعالیٰ ہمارے اس جرم کو معاف کر دے باقی تو کیا کر سکتا ہے اب فرعون کو یہ جادوگر کہہ رہے ہیں کہ تو کیا کر سکتا ہے جو تیرا فیصلہ ہوگا وہ اسی دنیوی زندگی پر ہی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مر جائیں گے باقی آگے جانا ہم نے اپنے رب کے پاس ہے اور وہاں جا کے حق پرستوں کے لیے جو کچھ ہے وہ ہمیں مل جائے گا، اتنا پختہ ان کا ایمان ہو گیا کہ فرعون کی دھمکی بھی ان کے قدم نہ ہلا سکی لیکن اس میں پھر نیک بندوں کی طرح اللہ کی طرف رجوع بھی ہے کہ یا اللہ! ثابت قدم رکھنا اس کے خوف سے، اس کے لالچ سے، اس کے ڈر سے کہیں ہمارے قدم ڈگمگا نہ جائیں، اہل حق کی شان یہی ہوتی ہے کہ اپنے اوپر اعتماد کرنے کی بجائے ان کی نظر اللہ پر ہوتی ہے "رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا" اے اللہ! ہم پر صبر کے دہانے کھول دے اور ہمیں ثابت قدم رکھنا یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے انہوں نے دعا کی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆
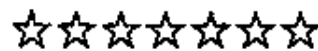
وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي

قوم فرعون میں سے بڑے لوگوں نے کہا کیا چھوڑتا ہے تو موسیٰ کو اور اس کی قوم کو تاکہ فساد مچاتے رہیں

الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ

زمین میں اور چھوڑتے رہیں وہ تجھ کو اور تیرے معبود کو فرعون نے کہا عنقریب قتل کریں گے ہم ان کے بیٹوں کو اور زندہ رکھیں گے ہم ان کی عورتوں کو

وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ

اور بے شک ہم ان کے اوپر زور آور ہیں (۱۲۷) موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا مدد طلب کرو اللہ سے

وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ

اور ثابت قدم رہو بے شک زمین اللہ کے لیے ہے وہ اس کا وارث بناتا ہے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ

اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے (۱۲۸) وہ کہنے لگے ہم تکلیف پہنچائے گئے قبل اس کے کہ تو ہمارے پاس آتا اور تیرے

بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ

آنے کے بعد بھی موسیٰ نے کہا قریب ہے کہ تمہارا رب ہلاک کردے تمہارے دشمن کو

وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع وَلَقَدْ

اور نائب بنا دے تمہیں ملک میں پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسا عمل کرتے ہو (۱۲۹) اور البتہ تحقیق

اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ

ہم نے پکڑ لیا فرعون کے لوگوں کو قحط سالیوں میں اور پھلوں کے گھٹانے میں تاکہ وہ حاصل کریں

يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ

نصیحت (۱۳۰) پس جب ان کے پاس اچھی حالت آجاتی تو کہتے ہمارے لیے یہی ہے اور اگر

تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ

ان کے پاس کوئی بری حالت پہنچ جاتی تو نحوست بتلاتے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی، خبردار! بے شک ان کا حصہ

عِنۡدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۱﴾ وَقَالُوۡا مَهۡمَا تَاۡتِنَا

اللہ کے پاس ہے لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں ﴿۱۳۱﴾ فرعونی کہنے لگے تو ہمارے پاس لے آئے

بِهٖ مِنۡ اٰيَةٍ لِّـتَسۡحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳۲﴾

جو نشانی بھی تاکہ تو جادو کرے ہم پر اس کے ذریعہ سے پھر بھی ہم ماننے والے نہیں ہیں ﴿۱۳۲﴾

فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمُ الطُّوۡفَانَ وَالۡجَرَادَ وَالۡقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ

پھر بھیج دیا ہم نے ان کے اوپر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک

وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۟ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَكَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۳۳﴾

اور خون اس حال میں کہ یہ نشانیاں تھیں علیحدہ علیحدہ، پھر بھی وہ اکڑے رہے اور وہ جرم کرنے والے لوگ تھے ﴿۱۳۳﴾

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيۡهِمُ الرِّجۡزُ قَالُوۡا يٰمُوۡسَى ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا

اور جس وقت واقع ہوتا ان پر کوئی عذاب تو کہتے اے موسیٰ! دعا کرو ہمارے لیے اپنے رب سے بسبب اس

عَهِدَ عِنۡدَكَ ۚ لَئِنۡ كَشَفۡتَ عَنَّا الرِّجۡزَ لَنُؤۡمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرۡسِلَنَّ

عہد کے جو تیرے پاس ہے اگر دور ہٹا دیا تو نے ہم سے عذاب کو ہم ایمان لے آئیں گے اور ہم بھیج دیں گے

مَعَكَ بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۱۳۴﴾ ۚ فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُمُ الرِّجۡزَ اِلٰۤى

تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو ﴿۱۳۴﴾ اور جب ہم نے دور کیا ان سے عذاب کو ایک مدت تک جس تک وہ پہنچنے والے تھے

اَجَلٍ هُمۡ بٰلِغُوۡهُ اِذَا هُمۡ يَنۡكُثُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ

اچانک وہ عہد کو توڑتے تھے ﴿۱۳۵﴾ پھر ہم نے ان سے انتقام لے لیا پھر ہم نے انہیں ڈبو دیا

فِى الۡيَمِّ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ ﴿۱۳۶﴾

دریا میں اس سبب سے کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے اور ہماری آیات کی طرف سے غفلت برتتے تھے ﴿۱۳۶﴾

تفسیر:

فرعون کا مرعوب ہونا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے:

کل کے سبق میں آپ کے سامنے فرعونیوں کی مغلوبیت اوران کی ذلت کا ذکر آیا تھا کہ مقابلہ میں وہ ہار گئے اور جادوگر جو فرعون کی حمایت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں آئے تھے وہ ایمان لے آئے اور فرعون نے سارے کا سارا غصہ جادوگروں پر ہی جھاڑا تھا جیسا کہ پچھلی آیات میں آیا کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے خلاف تو وہ بولا تک نہیں جتنا غصہ وہ دکھا رہا ہے وہ سارے کا سارا اپنے جادوگروں پر دکھا رہا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا، میں تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا لیکن موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے متعلق کچھ نہیں بولا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ایک مستقل معجزہ ہے کہ نہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس کوئی فوج تھی اور نہ وہ کسی ایسے اسلحہ کے ساتھ مسلح تھے کہ جس سے فرعون ڈر گیا ہو، ایک درویش آدمی ہے، ڈنڈا ہاتھ میں ہے اور دربار میں دندنا رہا ہے، فرعون اس سے بات نہیں کرتا، اس سے آنکھیں نہیں لڑاتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت فرعون پر اتنا رعب پڑ گیا تھا کہ اس میں جرأت نہیں تھی کہ موسیٰ علیہ السلام سے آنکھ لڑا سکے اس لیے اس کو جو غصہ چڑھتا تھا تو وہ اپنے آدمیوں پر ہی چڑھتا تھا اسی کو کہتے ہیں کہ یہ اس کا رعب نہیں بلکہ حق کا رعب ہے، حق کی طاقت اس کے ساتھ جو تھی اس سے فرعون مرعوب تھا اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی طرف آنکھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔

اور اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کر کے بھیجا تھا "لَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا" کہ وہ تم تک نہیں پہنچ سکے گا، تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکے گا، تو اس کا سارے کا سارا زور جادوگروں پر ہی چلا ہے، باقی تفصیل آگے کتابوں میں مذکور نہیں کہ اس نے پھر جادوگروں کے ساتھ کیا کیا تھا؟ کیا ان کو قتل کر دیا تھا اور اپنے اس منصوبہ کے مطابق سولی چڑھا دیا تھا یا وہ ان پر بھی قدرت نہیں پا سکا، یہ تفصیل مذکور نہیں ہے ظاہر یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رعب اور دبدبے کی وجہ سے ان کے ساتھ بھی وہ ایسا نہیں کر سکا ہوگا، اب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین اس کے بس سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔

اراکینِ سلطنت کا فرعون کو بہکانا:

تو جب یہ واقعہ پیش آیا ہوگا، آپ سوچ سکتے ہیں اسباب طبعیہ کے تحت یقیناً لوگوں کے ذہن متاثر ہوئے ہوں گے جادوگر جن کو اس وقت نچلے طبقہ میں قیادت حاصل تھی جب وہ مسلمان ہو گئے تو آخر قوم پر بھی اثر پڑتا تھا تو فرعون اور فرعون کے اراکین سلطنت بہت زیادہ ڈرنے لگ گئے کہ اب تو یہ انقلاب آیا ہی آیا، یہ تو دن بدن زور

پکڑتے جارہے ہیں اور کسی دن اسی زور میں آ کر ہمارا تختہ الٹ دیں گے تو فرعون کو وہ برانگیختہ کرتے ہیں کہ کیا بات ہے آپ ان پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے ؟ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ یہ علاقے میں فساد مچاتے پھریں ،فساد سے یہی بغاوت والا فساد مراد ہے ،اور فساد انہوں نے کیا کرنا تھا نہ ڈاکے ڈالتے تھے ، نہ اغواء کرتے تھے ، نہ کوئی اور اس قسم کا شر و فساد پھیلاتے تھے یہاں فساد فی الارض فرعونیوں کی نظر میں بغاوت والا فساد ہے ، یہ جو سارے ملک کے اندر بغاوت پھیلاتے پھر رہے ہیں تو نے ان کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے ، یہ انہوں نے فرعون کو بہکایا تاکہ وہ ہاتھ ڈالے ،ان کی گرفتاریاں شروع کرے ،ان کو جیل میں ٹھونسے اور ان کو سزا دے تاکہ یہ پابندی لگے ورنہ یہ انقلاب تو بڑی تیزی کے ساتھ آ رہا ہے اور لوگ اس سے متاثر ہوتے چلے جارہے ہیں۔

اس میں لفظ آئے گا "وَيَذَرَكَ وَ آلِهَتَكَ" تو نے ان کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ تجھے بھی چھوڑے ہوئے ہیں کہ تیری بھی پرواہ نہیں کرتے اور تیرے معبودوں کو بھی چھوڑے ہوئے ہیں ، ان معبودوں سے کیا مراد ہے؟ "آلھتك" یہ" اله" کی جمع ہے ،فرعون "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" کہلاتا تھا کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں ،اور پھر اس نے اپنی شکل کے بت بنائے ہوئے تھے اور جگہ جگہ شہروں میں چوکوں کے اندر گاڑھے ہوئے تھے ، جو لوگ براہ راست فرعون تک نہیں پہنچ سکتے تھے وہ انہی کو فرعون کا مجسمہ سمجھ کے انہی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے ، یہاں "آلھة" کا مصداق یہی بت ہیں جو فرعون نے قائم کرائے ہوئے تھے اور لوگ ان کے سامنے جھکتے تھے اور ان کو سلامی دیتے تھے ، نہ تو یہ تیری پرواہ کرتے ہیں اور جس جس جگہ ان کے اثرات پھیلتے جارہے ہیں وہ تیرے بتوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے یہ تو سارے کا سارا نظام ہی بدل دیں گے ان کو تو نے کھلی چھٹی دے رکھی ہے اس طرح انہوں نے فرعون کو بہکایا تاکہ وہ ان پر گرفت کر کے حالات کو کنٹرول کرے۔

فرعون کا اپنے درباریوں کو جواب:

فرعون آگے سے کہتا ہے (قوم کی قیادت کرنے والے جن کو آج کی اصطلاح میں لیڈر کہتے ہیں ، لیڈر کا لفظی معنی ہوتا ہے راہنمائی کرنے والا ، لیڈ راہنمائی کرنے کو کہتے ہیں اور لیڈر راہنمائی کرنے والا ، قائد کا مفہوم بھی یہی ہوتا ہے کہ جو قوم کے آگے آگے چل کے قوم کو اپنے پیچھے چلاتا ہے ، قائد کہتے ہیں آگے سے پکڑ کر چلانے والے کو تو جو قوم کی قیادت کرنے والا ہوتا ہے اس کو قائد یا لیڈر کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے) فرعون سمجھ رہا ہے کہ اب یہ ساری کی ساری عوام جو بیدار ہوتی چلی جارہی ہے یہ تو سارا نتیجہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت کا کہ اس قوم کو

ہونہار، قوی اور مضبوط لیڈر مل گیا، اس لیے یہ قوم کھڑی ہوتی چلی جارہی ہے اب قاعدے کے مطابق ہونا تو یہ چاہیے کہ اس لیڈر پر ہاتھ ڈالے تا کہ قوم قیادت سے محروم ہو جائے لیکن یہاں کچھ اس قسم کی باطن کی طرف سے پابندی لگی ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق تو وہ سوچتا ہی نہیں ہے، اپنے ان درباریوں کو کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں آپ فکر نہ کریں یہ جماعت اگر زور پکڑتی جارہی ہے تو ہمارے پاس اس کا علاج ہے، یہ ہمارے بس سے باہر نہیں، وہ یہ کہ ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کی سکیم ایک تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے اس نے چلائی تھی تا کہ ان میں کوئی ایسا بچہ پیدا ہی نہ ہو جو ان کو سنبھال سکے اور اب یہ دوبارہ تجویز ہوگئی کہ یہ قوم زور نہ پکڑے اس کا علاج یہی ہے کہ نوجوان لڑکے یا جو پیدا ہوں ان کو پکڑ پکڑ کے مارتے جاؤ تو جب ان کی نفری اور تعداد بڑھے گی نہیں تو پھر یہ ہمارے مقابلہ میں انقلاب نہیں لا سکتے، ہم ان کے اوپر پوری طرح سے قابو پائے ہوئے ہیں، یہ ہمارے بس میں ہیں، یہ ہمارے بس سے نکلے ہوئے نہیں اس لیے ان سے خطرہ محسوس نہ کرو اس تجویز کے ساتھ ہم ان کی قومی طاقت کو توڑ دیں گے۔

کالج کی تعلیم پر اکبر الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی چوٹ:

اکبر الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں ایک شخص گزرے ہیں، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر تھے، اور علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ہی قومی قسم کے شاعر تھے، ویسے خود وہ بے چارہ انگریزی خواں تھا، انگریزوں کی عدالت میں جج تھا لیکن دل و دماغ اس کا مسلمان تھا تو اس نے انگریزی تہذیب کے اوپر بہت اچھی اچھی چوٹیں کی ہیں اور قوم کو بہت اچھے اچھے سبق پڑھائے ہیں، کالج کی زندگی پر ہمیشہ وہ تنقید کرتا تھا کہ یہ کالج کی زندگی اچھی نہیں ہے کہ جو بچے کالج میں پڑھتے ہیں وہ سارے کے سارے اگرچہ شکل و صورت کے اعتبار سے ہندوستانی ہوتے ہیں لیکن دل و دماغ کے اعتبار سے وہ انگریز بن جاتے ہیں اور وہ انگریز کے وفادار ہوتے ہیں، انگریز کی حکومت کو مضبوط کرتے ہیں، اپنی قوم کے ہمدرد نہیں ہوتے، یہ تھا ان کا تاثر کالج کی تعلیم کے متعلق، وہ کہتا تھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بد نام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

کہ اس نے جو نسل کو ختم کرنے کے لیے بچوں کو قتل کرنے کی سکیم بنالی اس سے خواہ مخواہ بدنام ہوا یہ آجکل کے فرعونوں کی طرح کالج بنا دیتا، کالج میں بچوں کو پڑھاتا، کالج میں بچوں کو پڑھانے کے بعد اگرچہ نسلاً اسرائیلی ہوتے لیکن حامی فرعونیوں کے ہوتے، تو انہی بچوں کو اپنی فوج بنالیتا، مطلب یہ تھا کہ انگریزوں کی سیاست فرعون

سے بھی آگے ہے کہ انہوں نے بچوں کو قتل تو نہیں کیا لیکن کالج میں پڑھا کے ان کو اپنا حامی بنالیا، اسی طرح فرعون کو اگر یہ سکیم سوجھ جاتی اور وہ تعلیم اس قسم کی جاری کر دیتا جس قسم کی انگریزوں نے جاری کر دی ہے تو بچے ہوتے اسرائیلیوں کے، پڑھتے ان کے کالجوں میں، اور کالجوں سے نکلنے کے بعد وہ اسرائیلیوں کے حامی نہ ہوتے بلکہ اس صاحب اقتدار طبقے کے حامی ہوتے تو وہ فوج ان کی بن جاتی، افسوس! کہ اس کو یہ سکیم نہ سوجھی اور وہ کالج جاری نہ کرسکا، یہ کتنی زبردست تنقید ہے کالج کی زندگی پر۔

تو اس وقت چونکہ کالج تو بنائے نہیں جاسکتے تھے، تعلیم تو ان کو دی نہیں جاسکتی تھی کیونکہ اس وقت اس کا رواج نہیں تھا تو اس نے اپنی پھر وہی جاہلانہ حرکت کہ جاہل کے پاس جب کوئی دلیل نہ رہے تو آخر وہ مار کٹائی پر اتر آتا ہے تو کہتا ہے کوئی بات نہیں ہم ان کے بچوں کو قتل کروائیں گے اور اس طرح ان کی قومی طاقت توڑ دیں گے یہ ہمارے مقابلہ میں انقلاب نہیں لاسکتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کو تسلی دینا:

اور پھر جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو یہ پتہ چلا کہ فرعون دوبارہ ہمارے قتل ابناء کی سکیم سوچ رہا ہے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رونا دھونا شروع کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی کہ کوئی بات نہیں آزادی ایسے ہی مفت میں حاصل نہیں ہو جاتی، غلبہ ایسے ہی حاصل نہیں ہوتا، اس کی بہت بڑی بڑی قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں، تم اللہ سے مدد طلب کرو اور ثابت قدم رہو، ان شاء اللہ العزیز آخر فتح تمہاری ہے، یہ زمین، یہ علاقہ، یہ ملک اصل میں اللہ کی ملکیت ہے وہ جس کو چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے آج اگر فرعونی اس کے وارث ہیں تو تم اگر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے رہو گے اور اسی طرح صبر کے ساتھ ان مشکلات کو برداشت کرتے رہو گے تو یہی ملک اللہ تعالیٰ تمہیں دے دے گا اور پھر دیکھے گا کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے قوم کو تسلی دی۔

وہ قوم آگے سے دوبارہ شکوہ کے طور پر کہتی ہے کہ ہم تو ہمیشہ مصیبت میں رہے، تیرے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبت میں تھے، فرعون کے غلام تھے اور وہ ہمارے بچوں کو قتل کرتا تھا اور تیرے بعد بھی یہی حال ہے، یہ ایک قسم کا شکوے کا اظہار ہے کہ ہماری مصیبتیں ختم ہوتی نظر نہیں آتیں، تیرے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبتوں میں تھے اور تیرے آنے کے بعد بھی ہم مصیبتوں میں ہی ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو اسی طرح سے تسلی دیتے ہیں کہ فکر نہ کرو،

تم اللہ کے وعدوں پر اعتماد کرو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو ہلاک کردے گا اور پھر تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا اور دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو، (پہلے رکوع کا مضمون یہی ہے جو آپ کے سامنے پڑھا گیا ترجمہ کی طرف دیکھنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے)۔

زمین کی انفرادی ملکیت کا قائل نہ ہونا باطل نظریہ ہے:

یہ سوشلسٹ قسم کے لوگ جو زمین کی انفرادی ملکیت کے قائل نہیں ہیں وہ اکثر و بیشتر قرآن کریم کے ان الفاظ سے استدلال کرتے ہیں "اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ" کہ زمین تو اللہ ہی کی ہے کسی کی ملکیت نہیں، "اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ" سے استدلال کرتے ہیں کہ زمین پر ملکیت صرف اللہ کی ہے کوئی دوسرا اس کا مالک نہیں ہے، ایک دفعہ اسلام آباد میں اجلاس تھا جس میں مختلف لوگوں نے مقالے پڑھے تھے ان میں ایک مسعود نامی شخص بھی تھا جو محکمہ اوقاف کا سربراہ تھا، اس نے ایک مقالہ پڑھا تھا وہ بھی چونکہ اسی ذہن کا تھا تو اس نے بھی استدلال کے اندر یہی آیت پیش کی تھی کہ دیکھو! قرآن کریم میں آتا ہے "اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ" کہ زمین تو ساری اللہ کی ہے، اس کے علاوہ کوئی اس کا مالک نہیں ہے، تو اس کا جواب ہمارے علماء کی طرف سے یہی دیا گیا تھا کہ یہ تو ایسے ہے جیسے کوئی کہے کہ قرآن کریم میں آتا ہے "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ" نماز کے قریب نہ جانا، آخر "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ" یہ بھی تو قرآن کریم کے ہی الفاظ ہیں اور ان کا معنی ہے کہ نماز کے قریب نہ جانا، تو جیسے کوئی استدلال کرے کہ نماز نہیں پڑھنی چاہیے کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ" اسی قسم کا استدلال یہاں ہے، نہ آگا دیکھا نہ پیچھے دیکھا وہاں ہے "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى" نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جایا کرو، وہاں نشے سے روکنا مقصود ہے، نماز تو وقت پر پڑھنی ہے اسی طرح "اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ" اتنا تو یاد رہ گیا "يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ" یاد نہیں ہے یہ "يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ" کا مطلب یہ ہے کہ زمین ہے تو اللہ کی لیکن اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وہ اس زمین کا وارث بنا دیتا ہے تو جس کو اللہ تعالیٰ زمین کا وارث بنا دے تو جس طرح ہر چیز کے اوپر عارضی ملکیت ہے اسی قسم کی ملکیت اس شخص کو مل جائے گی جس کو وراثت میں زمین مل گئی، تو صرف "اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ" کے اوپر نظر رکھنا اور "يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ" کے اوپر نظر نہ رکھنا یہی وہ تحریفات ہیں جو باطل پرست لوگ قرآن کریم میں کیا کرتے ہیں، وہ چونکہ شخصی ملکیت کے قائل نہیں اس لیے وہ اس قسم کے الفاظ سے سہارا لیتے ہیں یہ باطل نظریہ ہے۔

قوموں پر چھوٹے چھوٹے عذاب بھیجنے کی حکمت:

اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت کے مطابق جس طرح آپ کے سامنے ان واقعات کے ختم ہونے کے

بعد ایک رکوع آیا تھا اس میں ذکر کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو جب بھیجتے ہیں تو پھر چھوٹی چھوٹی آفات اور مصیبتیں بھی اس قوم پر اتارتے ہیں تا کہ ان کا تکبر ٹوٹے اور ان مصیبتوں کی وجہ سے اللہ کی طرف جھکیں اور ایمان لے آئیں۔

اسی عادت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو رد کرنے کے بعد فرعونیوں پر بھی اللہ تعالیٰ نے متعدد چھوٹے چھوٹے عذاب بھیجے تا کہ ان کا تکبر ٹوٹے۔

فرعونیوں پر قحط اور نقصِ ثمرات کا عذاب:

پہلے پہلے جس کو ذکر کیا وہ ہے قحط سالی کا عذاب، ان کو قحط سالی میں مبتلاء کر دیا، زمین کی پیداوار کم ہو گئی، فصل نہ اگی اس کا تعلق ہے کھیتوں کے ساتھ اور باغات جو درخت پہلے سے کھڑے ہوتے ہیں ان پر اثر یہ پڑا کہ ان کا پھل کم ہو گیا تو غلے کے اندر بھی کمی آ گئی کہ زمین سے غلہ پیدا نہ ہوا اور پھلوں کے اندر بھی کمی آ گئی کہ درختوں کو پھل نہ لگے اس طرح اس قوم کو معاشی تنگی کے اندر مبتلاء کر دیا گیا تا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھک جائیں "لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ" تا کہ یہ نصیحت حاصل کریں، یہ دو باتیں آ گئیں قحط سالی اور پھلوں کی کمی، قحط سالی کا تعلق ہو گیا کھیتوں کے غلہ کے ساتھ جیسے گندم، مکئی، کپاس ہے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں لیکن قحط سالی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئیں اور "نقص من الثمرات" کا تعلق ہو گیا باغات کے ساتھ کہ جو درخت پہلے کھڑے تھے ان کے اوپر پھل نہ لگے، اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تنبیہی سلسلہ شروع ہوا۔

خوشحالی اور تنگی کے متعلق فرعونیوں کا نظریہ:

لیکن ان فرعونیوں کا ذہن ایسا تھا کہ جب ان کو کوئی کسی قسم کی خوشحالی پہنچتی مثال کے طور پر ان کی مرضی کے مطابق غلہ حاصل ہو گیا یا مرضی کے مطابق پھل حاصل ہو گیا تو کہتے "لَنَا ھٰذِہٖ" یعنی یہ ہماری کوشش کا نتیجہ ہے، ہماری محنت کا نتیجہ ہے، ہم نے جو آب پاشی کا نظام قائم کر رکھا ہے، جیسے ہم نے عمدہ بیج ڈالے ہیں، جیسے ہم زمین کو پیداوار کے لیے ہموار کرتے ہیں تو یہ غلہ ایسے ہی ہونا چاہیے تھا "لَنَا ھٰذِہٖ" کا یہ مطلب ہے، اس کو وہ اپنی کوشش کی طرف منسوب کرتے، اللہ کا احسان سمجھ کر شکر ادا نہیں کرتے تھے، اپنی ہمت اور کوشش کا نتیجہ سمجھتے تھے کہ ہم اسی لائق ہیں اور اگر کبھی ان کی مرضی کے خلاف کوئی حال پیش آ جاتا جیسے قحط سالی آ گئی یا درختوں کو پھل نہ لگا یا پھلوں

میں کیڑا پڑ گیا تو کہتے کہ یہ سب ان کی نحوست ہے یہ چونکہ ہمارے بتوں کی مخالفت کرتے ہیں اور سب سے بڑا ان کا دیوتا سورج تھا اور سورج کے قائم مقام وہ اپنے بادشاہ کو سمجھتے تھے، کہتے تھے کہ اس کی مخالفت کرنے کی بناء پر وہ دیوتا ناراض ہو گیا جس کی وجہ سے پیداوار کم ہو گئی اور پھلوں میں نقص آ گیا یہ نحوست بتاتے موسیٰ علیہ السلام کی اور ان کے ساتھیوں کی، کہتے کہ ان کی اس قسم کی حرکتوں کی وجہ سے ہمارے جو دیوتا ہیں، ہمارے جو معبود ہیں وہ ناراض ہو رہے ہیں ان کی ناراضگی کی وجہ سے اس قسم کی مصیبتیں آ رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ تنبیہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست نہیں، ان کی نحوست کا سبب اللہ کے علم میں ہے لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں۔

اور پھر اس قسم کی تنبیہات پر جیسے پہلے واقعات میں آپ کے سامنے آیا تھا کہ متنبہ ہونے کی بجائے وہ اور اکڑے اور صاف حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ تو جس قسم کی جو بھی نشانی لے آتا کہ تو اس کے ذریعہ سے ہم پر جادو کرے ہم ماننے والے نہیں ہیں، یہ ان کے تکبر کی انتہاء ہے گویا کہ اپنی طرف سے وہ فیصلہ سنا رہے ہیں "فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ" ہم تجھے ماننے والے نہیں ہیں چاہے تو کیسی ہی نشانی لے آ۔

فرعونیوں پر آنے والے مختلف عذابات کا ذکر:

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے اوپر اور تنبیہی عذاب بھیجے، "فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ" ہم نے ان کے اوپر طوفان بھیج دیا، طوفان دریا میں بھی آتا ہے اور طوفان سے بادوباراں کا طوفان بھی مراد ہوتا ہے آندھیاں آئیں اور بارشیں اتنی کثرت کے ساتھ آئیں کہ وہ بھی فصلوں اور مکانوں کی تباہی کا ذریعہ بن گئیں اور ان میں تنبیہی عذاب ہونے والی بات اس طرح تھی کہ جب بھی کوئی اس قسم کی مصیبت آتی تو اس کے اثرات فرعونیوں پر پڑتے اور اسرائیلی محفوظ رہتے یہ کھلی علامت تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عذاب ہے، طوفان ہم نے ان کے اوپر بھیج دیا، طوفان کے سبب فصلیں تباہ ہونے لگیں جیسے آگے جا کے کلیہ ذکر کیا ہوا ہے کہ جب بھی ان پر کوئی عذاب آتا تو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگ جاتے کہ موسیٰ! اپنے عہدے کے وسیلے سے دعا کر دے، اپنے عہدے کی برکت سے یا جو طریقہ تجھے معلوم ہے تو دعا کر دے اگر یہ عذاب تیری وجہ سے ٹل گیا تو ہم تجھے مان لیں گے بس یہ مصیبت ٹال دے، جب وہ یوں کرتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے اور عذاب ٹل جاتا اور جب عذاب ٹل جاتا تو کہتے جا جا تو کون اور ہم کون؟ یہ تو ایسی ہی بات تھی جو ہم نے مصلحت کے طور پر کی تھی جیسے سیاسی لوگوں کی عادت

ہوتی ہے کہ جب ووٹ لینا ہوتا ہے تو بڑے بڑے وعدے کر لیتے ہیں اور جب ووٹ لے کر کرسی تک پہنچ جاتے ہیں تو جب ان کو ان کے وعدے یاد کراؤ تو کہتے ہیں کہ جی یہ ویسے ہی وقتی طور پر باتیں ہوتی ہیں جب گنجائش ہوگی دیکھی جائے گی، یہ لوگوں کی عادت ہے کہ جب کسی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں تو وعدے کسی اور قسم کے کرتے ہیں اور جب مصیبت سے چھوٹ جاتے ہیں تو پھر اپنے عہد یاد نہیں رہا کرتے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاتے، حضرت موسیٰ علیہ السلام تو مجسمۂ رحمت تھے وہ ان کی لجاجت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کر دیتے کہ یا اللہ! یہ عذاب ان سے ٹال دے اب یہ سیدھے ہونے لگے ہیں، تو دعا کروا کے طوفان ختم کروالیا۔

جب طوفان ہٹ گیا تو سمجھے کہ بارشوں کی وجہ سے زمین زیادہ سیراب ہوگئی اب فصلیں پہلے سے بھی زیادہ ہوں گی تو پھر اکڑ گئے، جب اکڑے تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ عذاب بھیج دیا کہ ٹڈی دل بھیج دیا، شاید آپ کے ہوش کے زمانہ میں یہ ٹڈی کبھی نہیں آئی ہوگی اگر کبھی آئے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ کس طرح فصلوں کو چاٹ جاتی ہے، درختوں کے سبز پتے نہیں رہنے دیتی، بہت کثرت کے ساتھ آیا کرتی ہے میں نے تو دو تین دفعہ اس کا نمونہ دیکھا ہے تو یہ ٹڈی جب آتی ہے تو فصلوں کو کھا جاتی ہے، کوئی سبزہ نہیں چھوڑتی تو ٹڈی دل آگیا اور کھڑی فصلیں کھانے لگی، اب فرعونیوں کے ہوش اڑے کہ یہ سب تو ٹڈی کھا جائے گی پھر بھوکے مریں گے پھر دوڑے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ اے موسیٰ! بس صرف یہ مصیبت ٹال دے اگر یہ ٹل گئی تو پھر ہم تجھے مان لیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور وہ عذاب ٹل گیا، اب فصل محفوظ ہوگئی اور غلہ آگیا۔

وہ سمجھے کہ جب ہم نے غلہ نکال لیا، گھروں میں محفوظ کر لیا تو اب یہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے تو قمل سے یہ گھن کا کیڑا مراد ہے اور اس سے جوئیں اور چیچڑیاں بھی مراد لی گئیں ہیں، واقعات کی ترتیب سے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ اس سے گھن کا کیڑا مراد ہے کہ کھڑی فصلیں ٹڈی کھانے لگ گئی تو یہ جھک گئے اور پھر اکڑے تو کیڑا لگ گیا اور پھر دعائیں کرا کے یہ مصیبت ٹالی پھر اللہ کی طرف سے مینڈکوں کا عذاب آگیا کہ مینڈکیں اتنی کثرت کے ساتھ ہو گئیں کہ ان کا رہنا، کھانا پینا سب کچھ مکدر ہوگیا، کھانے کے برتنوں میں اچھل اچھل کر آگرتیں، اور چلنے پھرنے میں بھی تکلیف ہوگئی، جہاں بیٹھتے تو مینڈکیں ہی مینڈکیں ہوتیں، لیٹتے تو بستر پر مینڈکیں ہی مینڈکیں ہوتیں یہ بھی پریشان کرنے کے لیے کافی بات تھی۔

پھر یہ مصیبت ٹلی تو خون کا عذاب آگیا، ان کا پانی جو تھا وہ خون کی صورت اختیار کر گیا جو چیز پینے لگتے وہ

ایسے ہوتی جیسے خون ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ساری کی ساری آیات مفصلٰت تھیں کہ یہ سب اللہ کی طرف سے جدا جدا نشانیاں اور اللہ کی طرف سے مستقل تنبیہات تھیں۔

حضرت موسیٰ کے نو (۹) معجزات:

اب یہاں دیکھو! سات چیزوں کا ذکر آیا

① سنین (قحط سالی)

② نقص من الثمرات (پھلوں کا کم ہونا)

③ طوفان

④ جراد (ٹڈی)

⑤ قمل (کیڑا)

⑥ ضفادع (مینڈک)

⑦ دم (خون)

اور دو کا ذکر پہلے آیا تھا عصاءِ موسیٰ اور ید بیضاء، اس طرح سے یہ نو نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واضح طور پر دی گئیں تھیں، قرآن کریم میں دوسری جگہ لفظ آئے گا "وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسٰى تِسْعَ آيَاتٍ" تو "تسع آیات" سے یہی نو (۹) نشانیاں مراد ہیں، ان میں سے بڑے عصا اور ید بیضاء تھے اور ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے مستقل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں شمار کرایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کی یہ واضح واضح نشانیاں تھیں کہ یہ تکذیب کرتے عذاب آتا اور وہ دعا کرتے تو عذاب ٹل جاتا تو اگر یہ اتفاقی واقعات ہوتے تو باربار یوں تو نہ ہوتا کہ وہ اکڑتے ہیں تو آتا ہے اور جب وہ جھک جاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کردیتے ہیں تو ٹل جاتا ہے اگر وہ چاہتے تو انہی واقعات کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے نشانات بناسکتے تھے اور ایمان لاسکتے تھے لیکن وہ نہیں لائے "فَاسْتَكْبَرُوْا" جیسے تکبر میں تھے اور جو عادی مجرم ہوتے ہیں وہ گرفت میں آنے کے بعد چاہے توبہ توبہ کرنے لگ جاتے ہیں لیکن جب گرفت ڈھیلی ہوتی ہے تو دوبارہ اسی ڈگر پہ چلتے ہیں ان کا حال یہی تھا۔

تفسیر باللفظ:

"وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ" جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو کہتے اے موسیٰ! اپنے رب سے دعا کر

"بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ" اس چیز کی جو تیرے نزدیک معلوم ہے، وہ کیا؟ کہ ہمارے توبہ کرنے سے عذاب ٹل جائے گا، ہم توبہ کرتے ہیں تو عذاب ٹال دے یا یہ ہے کہ اپنے عہدہ نبوت کی وجہ سے اس عہدہ نبوت کے توسل سے تو دعا کردے، اگر تو نے یہ عذاب ہٹا دیا یعنی تو اس کے ہٹنے کا ذریعہ بن گیا "لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ" تو ہم ضرور تیرے ساتھ ایمان لے آئیں گے "وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ" اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے، "فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ" اور جس وقت ہم ان سے عذاب کو دور کرتے ایک وقت تک جس تک وہ پہنچنے والے ہوتے، اس وقت سے مراد ہے دوسرے عذاب آنے کا وقت، ایک مہلت دیتے اور اس مہلت تک جب ہم عذاب دور ہٹا دیتے "اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ" اچانک پھر وہ عہد کو توڑ دیتے۔

"فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ" پھر ہم نے ان سے انتقام لیا، پہلے انتقام نہیں تھا، پہلے تنبیہ تھی کہ باز آ جاؤ اس لیے ان کو ذرا جھجھوڑا جا رہا تھا، انتقام کی نوبت اب آئی ہے پھر ہم نے ان سے انتقام لیا اور انتقام کیا لیا؟ "فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ" کہ پھر ہم نے ان کو پانی میں ڈبو دیا، دریا میں غرق کر دیا، جس کی تفصیل آپ کے سامنے دوسری سورتوں میں آئے گی کہ پھر یہ غرق کس طرح ہوئے تھے؟ "بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا" اس سبب سے کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے اور ان آیات کی پرواہ نہیں کرتے تھے، ان سے غفلت برتتے تھے، ان آیات سے نصیحت حاصل نہیں کرتے تھے اس وجہ سے ہم نے ان سے انتقام لیا اور اس انتقام کے نتیجہ میں ہم نے ان کو دریا کے اندر ڈبو دیا۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ

ہم نے وارث بنا دیا ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے زمین کی مشرقوں کا

وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى

اور مغربوں کا وہ زمین کہ جس میں ہم نے برکت دی تھی تیرے رب کا اچھا وعدہ پورا ہوگیا

عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ

بنی اسرائیل پر ان کے صبر کرنے کی وجہ سے اور برباد کردیں ہم نے وہ چیزیں جس کو

فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ

فرعون اور اس کی قوم بناتی تھی اور ان کے باغات جن کو وہ اونچا کرتے تھے (۱۳۷) اور گزار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو

الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا

سمندر سے پھر وہ آئے کچھ لوگوں پر جو اپنے بتوں پر جمے بیٹھے تھے، تو بنی اسرائیل نے کہا

يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ

اے موسیٰ! بنادے ہمارے لیے معبود جیسے ان کے لیے مختلف معبود ہیں، موسیٰ نے کہا بے شک تم لوگ

تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

جاہل ہو (۱۳۸) بے شک یہ لوگ جس کام میں لگے ہوئے ہیں یہ برباد کیا ہوا ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں یہ سب باطل ہے (۱۳۹)

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

موسیٰ نے کہا کیا اللہ کا غیر میں تمہیں الٰہ تلاش کردوں حالانکہ اس نے فضیلت دی تمہیں تمام جہانوں پر (۱۴۰)

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ

یاد کیجیے! جب ہم نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے جو تمہیں سخت عذاب پہنچاتے تھے تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے

وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ع

اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑتے تھے اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بڑی (۱۴۱)

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے چلا آ رہا ہے "فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ" یہاں تک بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ ہے جو فرعون کے ساتھ معاملات پر مشتمل تھا اور فرعون کے غرق ہونے کے بعد دوسرے معاملات جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل پر پیش آئے تھے اگلی آیات کے اندر وہ مذکور ہیں، فرعون کے غرق ہونے کے ساتھ بنی اسرائیل کے حالات کا ایک حصہ ختم ہو گیا، اب اور معاملات جو اسرائیلیوں کے ساتھ پیش آئے ہیں اگلی آیات میں ان کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل پر احسان:

پہلے تو یہ انعام جتلایا کہ یہ اسرائیلی جو کہ مصر کے اندر کمزور سمجھے جاتے تھے، حقیقت میں کمزور نہیں تھے صرف سمجھے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ کی نصرت اور طاقت ان کے ساتھ تھی، حقیقت کے اعتبار سے یہ بہت قوت کے مالک تھے لیکن ظاہری طور پر چونکہ قبطیوں نے ان کو غلام بنا رکھا تھا اور ان کو سیاسی طور پر بے بس کر دیا تھا اس لیے سمجھے جاتے تھے کہ یہ ضعیف لوگ ہیں، کمزور ہیں یہاں سیاسی ضعف مراد ہے، یہ نہیں کہ بدن کے لحاظ سے کمزور تھے، بدن کے لحاظ سے تو بہت قوی تھے کیونکہ ان کا درجہ تھا مزدوروں والا جیسا کہ روایات میں آتا ہے گھروں سے گوبر اٹھانے سے لے کر چھتنے بھی سخت سے سخت کام تھے، اینٹیں تھاپنے کے، مکانات بنانے کے، تعمیرات کرنے کے وہ سارے کے سارے قبطی انہی اسرائیلیوں سے لیا کرتے تھے اور ان کو خوب اچھی طرح سے محنت مزدوری کے اندر پیستے تھے اور ضروریات ان کی پوری نہیں کرتے تھے، عورتیں گھروں میں کام کرتی تھیں اور مرد باہر کے کام کرتے تھے تو جو اس قسم کے کام کرنے والے ہوتے ہیں، بدنی طور پر وہ مضبوط ہوتے ہیں، معاشی لحاظ سے کمزور تھے، سیاسی لحاظ سے کمزور تھے، کسی قسم کی قوت اور اقتدار ان کو حاصل نہیں تھا، اس لیے غلامی کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے یہ اس علاقہ کے اندر کمزور سمجھے جاتے تھے کہ یہ دبے ہوئے لوگ ہیں، بدنی قوت یہاں مراد نہیں ہے بلکہ یہ معاشی قوت کے لحاظ سے کمزور اور سیاسی قوت کے لحاظ سے کمزور تھے اور اقتدار اور عہدہ کے لحاظ سے کمزور تھے، ان کو اس طرح سے دبایا ہوا تھا اور ان کو اس ملک کے اندر کمزور سمجھا جاتا تھا ان کو ہم نے وارث بنا دیا یعنی فرعونیوں کو غرق کر دیا اور ان کے غرق کے بعد زمین کے مالک یہ لوگ ہو گئے، مشرق ومغرب کا مالک بنا دیا یعنی اس علاقہ کا مشرق ومغرب مراد ہے کہ سارے علاقے کے یہ مالک ہو گئے۔

"ارض" کا مصداق:

اب یہاں ارض کے ساتھ چونکہ "الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا" کی صفت لگی ہوئی ہے اس لیے یہاں سے اصل اشارہ تو نکلتا ہے شام کے علاقہ کی طرف کیونکہ قرآن کریم میں زیادہ تر شام کی زمین کو ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے "سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ" یہ پندرھویں پارہ کی ابتداء میں آئے گا مسجد اقصیٰ جس کے اردگرد علاقہ میں ہم نے برکتیں دی ہیں تو مسجد اقصیٰ پرانے جغرافیہ کے لحاظ سے شام میں تھی اور اس کے اردگرد کا جو علاقہ ہے وہ برکت والا ہے، انبیاء ﷺ وہاں کثرت سے آئے، اللہ کی رحمت وہاں نازل ہوئی اور ظاہری طور پر بھی شادابی ہے، پرانے جغرافیہ کے لحاظ سے مسجد اقصیٰ کی نسبت شام کی طرف ہے، بعد میں یہ مختلف تقسیمات ہوتی رہیں تو 1967ء سے قبل مسجد اقصیٰ جس کو بیت المقدس کہتے ہیں یہ اردن میں تھا، اور 1967ء کی جنگ میں اسرائیل نے اس کو فتح کرلیا تو اب وہ اسرائیل میں ہے۔

اب اگر آپ کہیں کسی تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر وعظ کہتے ہوئے یہ بات کریں گے کہ بیت المقدس شام میں ہے تو لوگ ہنسیں گے کہ ان مولویوں کو جغرافیہ نہیں آتا کہ یہ ہے تو اسرائیل میں اور یہ کہتا ہے کہ شام میں ہے کیونکہ شام اب ایک علیحدہ ملک ہے اور اسرائیل علیحدہ ملک ہے اور اردن علیحدہ ملک ہے، یہ نئی تقسیم ہے جیسے کوئی باہر کے ملکوں کا رہنے والا ہندوستان کی تاریخ پڑھے ہوئے ہو اور ہندوستان کا جغرافیہ پڑھے ہوئے ہو آج وہ تقریر کرتا ہوا کہہ دے کہ لاہور ہندوستان کا ایک بہت بڑا شہر ہے یا پشاور ہندوستان میں ہے تو لوگ کہیں گے اس پاگل کو پتہ نہیں کہ پشاور تو پاکستان کا شہر ہے، ہندوستان کا کہاں ہے؟ یا لاہور تو پاکستان کا شہر ہے یہ ہندوستان کا کہاں ہے؟ حالانکہ وہ پچاس کتابوں کے حوالے دے دے گا کہ لاہور ہندوستان کا شہر ہے تو بات اس کی بھی اپنی جگہ صحیح ہوگی کہ آج سے کچھ سال پہلے یہ سارے کے سارے ہندوستان کے شہر کہلاتے تھے تو یہ صوبہ سرحد بھی ہندوستان میں تھا، بلوچستان بھی ہندوستان میں تھا، پنجاب بھی ہندوستان میں تھا، اب کچھ عرصہ پہلے یہ دوسرا ملک وجود میں آیا تو جغرافیائی نام جو تھا وہ بدل گیا اب ایک ہندوستان ہے جو امرتسر پر ختم ہوگیا اور آگے پاکستان شروع ہوگیا، اسی طرح اب نئی تقسیم کے تحت بیت المقدس اسرائیل میں ہے، اور اسرائیل کے فتح کرنے سے قبل اردن میں تھا ورنہ اصل مسجد کی نسبت شام کی طرف ہے۔

تو شام کا علاقہ مراد ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے اسرائیلیوں کے یہاں سے نکلنے کے بعد شام کا علاقہ فتح کروادیا تھا یا مصر اور شام دونوں مراد ہیں۔

اللہ کے وعدہ کا پورا ہونا:

"وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى" اللہ تبارک وتعالیٰ کا اچھا وعدہ ان پر پورا ہوگیا ان کی مشکلات برداشت کرنے کی وجہ سے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انہوں نے ساتھ دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں آپس میں اتفاق پیدا کیا، آزادی کی تحریک میں حصہ لیا، فرعون کا ظلم برداشت کیا آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں نجات دے دی اور جو کچھ فرعون کرتا تھا، اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے، باغات سنوارتے تھے، وہ سب ہم نے تباہ کردیا تو یہ فرعون کو جو قوت اور طاقت حاصل تھی چونکہ یہ اللہ کے مقابلہ میں آگئی اس لیے اللہ نے نیست ونابود کر کے رکھ دیا اور ان کمزوروں کے ساتھ اللہ کی مدد ہوگئی تو اللہ نے انہیں قوت اور طاقت دے دی۔

مغلوب قومیں غالب قوموں کی پیروی کرتی ہیں:

"وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ" اس واقعہ کی تفصیل بھی دوسری آیات میں آپ کے سامنے آئے گی کہ کس طرح فرعون کی فوجیں پیچھا کرتی ہوئی آئیں تھیں اور کیسے اللہ تعالیٰ نے سمندر میں راستے بنادیے اور اسرائیلی آگے گذر گئے اور فرعونی جس وقت اس میں گھسے تو پانی آپس میں مل گیا اور فرعون کی ساری کی ساری فوج بمع فرعون کے وہیں پانی میں غرق ہوگئی، ہم نے گزاردیا بنی اسرائیل کو سمندر سے، اب ان کے سامنے فرعون غرق ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کے برسہا برس گزرے لیکن چونکہ یہ فرعونیوں کے ساتھ رہتے تھے، انہی کے گھروں میں کام کرتے تھے اور یہ انسانی کمزوری ہے کہ جو شخص ماتحت ہوتا ہے وہ اپنے حاکم کے اثرات قبول کرتا ہے چاہے اس کی تہذیب کتنی ہی گندی کیوں نہ ہو اور اپنی تہذیب کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو لیکن حاکم کی تہذیب کے اثرات ماتحتوں پر پڑا کرتے ہیں، دیکھو! جس وقت انگریز یہاں نہیں آیا تھا تو سارے مسلمان داڑھی بھی رکھتے تھے، لباس بھی اسلامی پہنتے تھے، سب کچھ مسلمانوں جیسا تھا لیکن انگریز نے آکر داڑھی رکھنے کی ممانعت نہیں کی کہ داڑھی نہ رکھا کرو اور نہ اس نے یہ کہا کہ نماز نہ پڑھا کرو، اس کی اپنی تہذیب جو تھی جس وقت اس نے اپنی وہ تہذیب خوشنما رنگ کے اندر پیش کردی تو بغیر ان کے مجبور کرنے کے قوم انہی کے رنگ میں رنگی گئی، پینٹ چاہے کتنا ہی برا لباس سمجھا جاتا تھا لیکن جب ان کو پہنتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے بھی عزت اسی میں سمجھنی شروع کردی، اور اسی طرح جب ان کو دیکھا کہ صبح صبح اٹھ کے اپنی گالیں صاف کرتے ہیں تو انہوں نے بھی صاف کرنا شروع کردیں تو ماتحت جو ہوتا ہے وہ اپنے حاکم

کے اثرات قبول کرتا ہے۔

مجسم خدا کا مطالبہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ڈانٹ:

فرعونی چونکہ بت پرست تھے اور خاص طور پر گائے ان کا معبود تھا تو اسرائیلی بھی کچھ نہ کچھ بت پرستی کے ساتھ مانوس تھے تو جب وہ آگے آئے تو انہوں نے ایک ایسی قوم دیکھی جو اپنے بتوں کے سامنے سجدہ ریز تھی تو اسرائیلیوں کی وہی رگ پھر پھڑکی، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ اے موسیٰ! جیسے ان لوگوں نے بت بنا رکھے ہیں ہمیں بھی کوئی ایسا ہی بت بنا دے جس کی ہم پوجا کیا کریں، مطلب یہ تھا کہ جیسے یہ لوگ ان کو سامنے رکھ کر عبادت کرتے ہیں تو ہمیں بھی کوئی مجسم خدا بنا دے تا کہ ہم بھی اس کو سامنے رکھ کر اسی کی عبادت کیا کریں، اب یہ بات مشرکانہ تھی اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تنبیہ کی کہ بڑے جاہل لوگ ہو، برسہا برس بیت گئے تمہیں توحید سمجھاتے ہوئے اور بت پرستی کی تردید کرتے ہوئے لیکن جب موقع آتا ہے تو پھر تم اسی طرف متوجہ ہو جاتے ہو تو "تَجْهَلُوْنَ" کے لفظ کے ساتھ بتا دیا کہ یہ تمہاری جہالت کی بات ہے، نادانی کی بات ہے، یہ تمہارے غلط قسم کے جذبات کا نتیجہ ہے، یہ تو جو کچھ کر رہے ہیں، جو ان کا کردار ہے، جو ان کا نظریہ ہے، جو ان کا عمل ہے، جو مذہب ہے اللہ بھی اسے تباہ و برباد کرے گا اور فی الواقع بھی یہ باطل ہے، یہ کسی دلیل کے اوپر مبنی نہیں، کیا حق کو چھوڑ کر ایسی باطل چیز کی طرف تم راغب ہو؟ اور ایسی چیز کو اپنانے والے ہو جس کو اللہ تعالیٰ آئندہ تباہ و برباد کرنے والے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تنبیہ کی، اور یہ اسی تنبیہ کا حصہ ہے کہ کیا میں تمہیں کوئی اللہ کا غیر اللہ تلاش کر دوں حالانکہ اس نے تمہیں فضیلت دی ہے عالمین پر۔

"فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ" کی توجیہ:

عالمین پر اس نے تمہیں فضیلت دی ہے، یہ لفظ پہلے بھی کئی دفعہ گذر چکا ہے یعنی بعض معاملات میں یا اس وقت میں، اگر تو عالمین سے عام مراد لیا جائے یعنی تمام جہانوں کے مقابلہ میں اسرائیلیوں کو فضیلت حاصل تھی پھر مراد ہوگا اس وقت کے لوگ، اس وقت ان جیسا کوئی دوسرا نہیں تھا، جتنے انعامات ان پر اللہ تعالیٰ کے ہو رہے تھے، اہل حق یہ تھے، نبی ان کے ساتھ تھے، اہل علم یہ تھے اس لیے اس وقت باقی لوگوں کے مقابلہ میں ان کو فضیلت حاصل تھی اور پھر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آیا اور یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو یہ مغضوب ہو گئے اور ان پر اللہ کا غضب نازل

ہوا پھر انہوں نے افضل العالمین کیا ہونا تھا پھر تو یہ اشر الناس ہو گئے۔

اور اگر اس سے مراد سارے انسان لیے جائیں پھر بعض معاملات مراد ہیں کہ بعض معاملات اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ایسے کیے ہیں جو کسی کے ساتھ نہیں کیے، دھوپ کے وقت میں بادل بھیج کے سائے کیے، بھوک کے وقت "من و سلویٰ" عطا کیا، دشمن کو اجتماعی حیثیت سے دریا میں ڈبو کر ماردیا یہ معاملات ایسے ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسرائیلیوں کے ساتھ کیے ہیں دوسروں کے ساتھ نہیں کیے، اس لیے اگر جزوی فضیلت مراد لی جائے تو پھر سارے جہانوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے اور اگر کلی فضیلت مراد لی جائے تو اس زمانہ کے لوگ مراد ہیں۔

بنی اسرائیل پر فرعون کا ظلم اور اللہ کا احسان:

آگے اللہ تعالیٰ نے ایک اور احسان جتلایا ہے، سورۃ البقرۃ میں بھی یہ آیت آپ کے سامنے انہی الفاظ کے ساتھ گذری ہے، یاد کیجئے! جب ہم نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے، آلِ فرعون سے فرعون کی اولاد مراد نہیں ہے جیسے میں نے پہلے عرض کیا کہ فرعون تو ویسے ہی بے اولاد تھا، آل فرعون سے فرعون کے متبعین مراد ہیں، فرعون کی فوجیں، فرعون کے دوست، اہل وعیال جتنے بھی متعلقین ہوتے ہیں وہ سارے کے سارے مراد ہیں، اس لیے اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے کہ ہم نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے جو تمہیں سخت عذاب پہنچاتے تھے قتل کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری لڑکیوں کو، تو لڑکیوں کا زندہ چھوڑنا یہ کوئی انعام نہیں تھا بلکہ ان کو اس لیے زندہ چھوڑتے تھے کہ ان کی طرف سے خطرہ تو کوئی نہیں تھا کہ انقلاب لے آئیں گی اور گھروں میں کام کرنے کی ضرورت تھی، ان کو گھروں میں باندیوں کے طور پر رکھتے تھے اور ان سے گھروں کا کام کرواتے تھے کیونکہ ان کی طرف سے انقلاب کا ڈر نہیں تھا اس لیے ان کو مارنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے تو کسی قوم کی لڑکیوں کو زندہ رکھ کے ان کو اپنے کام میں لگایا جائے یہ بھی اس قوم کے لیے عذاب ہے، لڑکوں کا قتل کرنا جس طرح عذاب ہے اسی طرح لڑکیوں کو زندہ رکھ کے کام میں لانا یہ بھی عذاب ہے اس لیے دونوں کو برابر سرابر ذکر کیا جارہا ہے کہ تمہارے لیے یہ بات بھی تکلیف دہ تھی کہ وہ تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے اور یہ بات بھی تکلیف دہ تھی کہ لڑکوں کو قتل کر کے لڑکیوں کو زندہ رکھ کے پھر اپنے کام میں لاتے تھے اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی، یہ انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے جتلایا ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار رہیں اور اللہ کی توحید کو پہچانیں اور نافرمانی کی طرف نہ جائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ

اور ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے تیس راتوں کا اور ان کا تتمہ بنا دیا ہم نے دس کو پھر پورا ہوگیا

مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ

اس کے رب کا متعین کیا ہوا وقت چالیس راتیں، اور موسیٰ نے کہا اپنے بھائی ہارون کو

اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٤٢﴾

تو میرا خلیفہ بن جا میری قوم میں اور حالات کو ٹھیک رکھنا اور فساد مچانے والوں کے راستہ کی اتباع نہ کرنا ﴿١٤٢﴾

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ

اور جب آگئے موسیٰ ہمارے متعین وقت پر اور کلام کی اس سے اس کے رب نے، موسیٰ نے کہا دکھلا مجھ کو کہ میں دیکھ لوں،

اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ

تیری طرف اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو ہرگز مجھ کو نہیں دیکھے گا لیکن دیکھ تو پہاڑ کی طرف اگر وہ پہاڑ ٹھہرا رہا

مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا

اپنی جگہ پھر عنقریب تو بھی مجھے دیکھ لے گا، پھر جس وقت ظاہر ہوا موسیٰ کا رب پہاڑ کے لیے تو کر دیا اس پہاڑ کو ریزہ ریزہ

وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ

اور موسیٰ گر گئے بے ہوش ہوکر جب موسیٰ کو افاقہ ہوا تو کہا اے اللہ! میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں، میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں

وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٤٣﴾ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى

اور میں ایمان لانے والوں میں سے پہلا ہوں ﴿١٤٣﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! بے شک میں نے تجھے چن لیا ہے

النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ

لوگوں پر اپنے احکام کے ساتھ اور اپنی کلام کے ساتھ پس پکڑ تو اس چیز کو جو میں نے تجھے دی اور ہوجا تو

الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً

شکر گزاروں میں سے ﴿١٤٤﴾ اور لکھا ہم نے موسیٰ کے لیے تختیوں میں ہر چیز سے نصیحت

وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا

اور ہر چیز کی تفصیل، (ہم نے کہا) پکڑ لے ان تختیوں کو مضبوطی کے ساتھ اور حکم دو اپنی قوم کو کہ وہ اختیار کریں ان تختیوں میں سے

بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ

احسن کو، عنقریب میں دکھادوں گا تمہیں نافرمانوں کا گھر (۱۴۵) عنقریب میں پھیر دوں گا اپنی آیات سے

الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ

ان لوگوں کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق، اگر وہ دیکھ لیں ساری

اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ

نشانیاں تو ان پر ایمان نہ لائیں اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو نہ سمجھیں اپنا

سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ

طریقہ اور اگر گمراہی کا طریقہ دیکھیں تو اسے اپنا طریقہ بنا لیں یہ

بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيْنَ

اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ان سے غافل تھے (۱۴۶) اور جن لوگوں نے

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ

جھٹلایا ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کو ان کے اعمال ضائع ہوگئے ان کو انہی اعمال کی سزا دی جائے گی

اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع

جو وہ کیا کرتے تھے (۱۴۷)

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

پہلے رکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے واقعہ میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ

نے بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار دیا اور فرعون کو غرق کر دیا، فرعونیوں کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل کسی درجہ میں مطمئن ہوئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اب اگر ہمارے لیے کوئی شریعت آجائے تو ہم اس کے اوپر عمل کریں گے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کوئی قانون اترنا چاہیے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایات آنی چاہئیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے سامنے درخواست کی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ طور کے اوپر آجاؤ اور آکے ایک چلہ گزارو اس کے بعد تمہیں کتاب دے دی جائے گی۔

تطبیق بین الآیات:

سورۃ البقرۃ میں جہاں واقعات کا سلسلہ آیا تھا وہاں "اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً" اکٹھا ذکر کیا گیا تھا "وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً" کہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چالیس رات کا وعدہ کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اشارہ ہوا تھا وہ چالیس رات کے متعلق ہی تھا اور یہاں اس کو دو حصوں میں کر کے ذکر کر دیا گیا، "ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً" کو علیحدہ ذکر کر دیا گیا "وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ" کو علیحدہ ذکر کر دیا گیا اس طرح وقت متعین چالیس راتیں پورا ہو گیا، معلوم یہاں سے بھی یہی ہوا کہ وقت متعین چالیس راتیں ہی تھیں لیکن ان کو دو ٹکڑوں میں کر کے ذکر کیا گیا ہے، ممکن ہے کہ یہ چالیس کے لیے ایک انداز بیان ہی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تیس دن بطور عزیمت کے ہوں اور دس کا اضافہ بطور رخصت کے ہو کہ کم از کم تیس دن اور زیادہ سے زیادہ چالیس دن، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زیادہ والی مدت کو پورا کیا جیسا کہ سورۂ قصص میں آپ کے سامنے آئے گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس گئے ہیں اور حضرت شعیب علیہ السلام نے مطالبہ کیا تھا کہ تو میری بکریاں چرا تو میں ایک بیٹی کا نکاح تیرے ساتھ کر دوں گا وہاں ذکر یہ ہے کہ "اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ" کہ میں تیرے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرتا ہوں اس شرط پر کہ تو آٹھ سال تک بکریاں چرا اور اگر تو دس سال پورے کر دے تو یہ تیری مرضی ہے گویا کہ آٹھ سال ضروری اور دس سال جو ہیں اگر کر دو گے تو یہ تمہاری طرف سے ایک اچھا معاملہ ہے اور اگر نہ پورا کرو تو میری طرف سے کوئی زور نہیں ہوگا، کم از کم آٹھ سال اور زیادہ سے زیادہ دس سال تو وہاں بھی تفاسیر میں آتا ہے کہ وہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس سال ہی اجیرانہ کام کیا تو زائد مدت جو ہے یہ ایک استحبابی مدت ہے۔

اسی طرح یہاں ہو کہ کم از کم تیس دن اور زیادہ سے زیادہ چالیس دن تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس دن زائد گزارے جس سے چلہ پورا ہو گیا اور اللہ کے علم میں بھی تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اعلیٰ معیار کو اختیار کریں گے تو

اس طرح چالیس رات کا جو وقت تھا وہ تمام ہو گیا۔

اور یہ احتمال بھی ممکن ہے کہ تیس راتیں گزرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کتاب کا نزول شروع ہو گیا ہو اور دس راتوں میں اس کو مکمل کر دیا گیا، اس طرح چالیس راتیں پوری ہونے کے بعد وہ الواح اور تختیاں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی تھیں ان کو لے کر واپس آگئے تو دس دن گویا کہ نزول کتاب کے لیے ہو گئے اور تیس دن کے بعد اس کا نزول شروع ہو گیا تھا اور دس دن اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت کے تحت صرف ہوئے اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چلہ پورا ہو گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلہ کی جگہ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ جو چلہ گزارا ہے تاریخی روایات میں مذکور ہے جس کو مفسرین نے نقل کیا کہ یہ کوہِ طور پر ایک غار ہے اور اس غار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا وقت گزارا ہے، اور اسی غار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ الواح اتری ہیں اور آج تک وہ غار لوگوں کے لیے زیارت گاہ ہے چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں نے بھی مانا تو وہاں اس غار کے پاس یہودیوں کا معبد بھی ہے اور عیسائی بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والوں میں سے تھے تو ان کا وہاں گرجا بھی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے مسلمان بھی تھے تو جس وقت وہ علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تھا تو انہوں نے وہاں اس کے پاس ایک مسجد بھی بنا دی تو گویا کہ اس علاقہ میں جہاں لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس غار کی زیارت کے لیے جاتے ہیں جو کہ طور پر ہے جس کو آج کل جبلِ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے تو وہاں یہودیوں کا معبد بھی ہے، عیسائیوں کا معبد بھی ہے اور مسلمانوں کا معبد بھی ہے۔

روحانی کمالات کے حصول کے لیے خلوت:

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ فیضان الٰہی اخذ کرنے کے لیے کسی درجہ میں خلوت بہت ضروری ہے، جس وقت تک انسان تنہائی اور خلوت میں بیٹھ کر اللہ کو یاد نہیں کرتا، تفکر وتدبر کے ساتھ وقت نہیں گزارتا اس وقت تک قلب کے اندر وہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلیات اور اس کے فیوضات کو اخذ کر سکے۔

انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں کچھ اس قسم کے واقعات ہیں، اوروں کو رہنے دیجئے خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی

زندگی کی ابتداء بھی ایسے ہی ہے کہ جس وقت آپ اس عمر کو پہنچے جس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وحی آپ پر نازل ہونا تھی تو اس وقت "حُبِّبَ اِلَیْهِ الْخَلَاءُ" سرورِ کائنات ﷺ کی طرف خلوت کو محبوب بنا دیا گیا، خلوت میں آپ کا دل بہت لگتا تھا جہاں مخلوق میں سے کوئی نہ ہو، تو پھر خلوت اختیار کرنے کے لیے آپ نے بھی غارِ حرا کو اختیار کیا وہ حرا بھی پہاڑ ہے جس کی چوٹی کے اوپر یہ غار ہے اور اتنے دشوار گزار راستے میں ہے کہ اس زمانہ میں وہاں کسی کے آنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے تو وہیں آپ خلوت اختیار کرتے تھے اور وہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ پر بھی نزولِ وحی ہوا۔

اس طرح سے روحانی کمالات حاصل کرنے کے لیے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیوض اخذ کرنے کے لیے معلوم یہی ہوتا ہے کہ خلوت ضروری ہے، جب تک تنہائی اور علیحدگی میں بیٹھ کے انسان کچھ وقت اپنے اللہ کو یاد نہیں کر لیتا اس وقت تک دل کی صلاحیتیں اجاگر نہیں ہوتیں۔

ہندوستان میں ایک قومی شاعر گذرے ہیں اکبر الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ، بہت اچھے شاعر تھے، جیسے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ہیں ایسے ہی وہ بھی قومی شاعر تھے اور ان کی نظمیں بڑی اچھی اچھی ہیں ان کا ایک شعر ہے جو انہی الفاظ پر ہی مشتمل ہے،

خدا کی قدرت دیکھیے کیا پیچھے ہے کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غار حرا پہلے

کہ حضور ﷺ کی زندگی میں بدر جیسے معرکے بھی ہوئے، جہاں مخلوق کے ساتھ ٹکراؤ ہوا، لڑائی ہوئی، تلواریں چلیں لیکن یہ بدر کی صلاحیت پیدا ہونے سے قبل اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی غار میں ہی وقت گزارنے کا موقع دیا تو گویا کہ غاروں میں رہنا، تنہائی اختیار کرنا، خلوت میں بیٹھ کے اپنے قلب پر مشق کرنا اس سے میدان میں اترنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

محنت اور جدوجہد میں زیادتی کے باوجود گمراہی کی کثرت کی وجہ:

اور آج ہمارے ہاں جو بدنظمی ہے اور بے برکتی ہے کہ جدوجہد تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے بھی زیادہ ہے، درس پہلے سے زیادہ، تقریریں پہلے سے زیادہ، جلسے پہلے سے زیادہ اور صبح کے وقت شہروں میں جا کے دیکھو اس

وقت سارے شہر لاؤڈ سپیکر کے ساتھ گونج رہے ہوتے ہیں، علماء کرام اپنے جوہر دکھاتے ہیں، زور لگا لگا کے خوب بیان کرتے ہیں تو جلسے، جلوس، درس، مدرسے سب کچھ زیادہ ہو گیا لیکن دن بدن ظلمت بڑھتی جارہی ہے اور جو حق کی نورانیت تھی وہ ختم ہوتی جارہی ہے، ظاہر داری بہت ہے فیضان نہیں ہے اور اس کی وجہ اس کے بغیر کچھ نہیں کہ اس دین کی نشر و اشاعت کرنے والوں نے خلوت کی زندگی ترک کر دی، خلوت میں بیٹھ کے اللہ کو یاد کرنا، مراقبہ، ذکر اذکار یہ چیزیں جن سے قلب میں صلاحیت پیدا ہوتی تھی اور پھر وہ صلاحیت ایسی تھی کہ جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلب پر فیضان ہوتا ہے وہ فیضان پھر مخلوق کے اندر جس وقت جاتا ہے تو پھر ہدایت پھیلتی ہے اور اب ہمارے قلوب تو خالی ہیں، قلوب میں تو صلاحیت ہی نہیں ہے، زبان شور مچاتی چلی جائے تو اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا جس وقت بات دل سے اٹھتی ہے تو دل پہ گرتی ہے اور جس وقت شور صرف زبان سے مچایا جاتا ہے تو صرف کان تک آواز رہتی ہے پھر قلب تک نہیں جایا کرتی، فارسی کا محاورہ آپ نے سنا ہوگا

از دل خیزد بر دل ریزد

کہ جو بات دل کی گہرائیوں سے اٹھا کرتی ہے اور انسان پورے خلوص کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے کہتا ہے تو ان لفظوں میں اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ کان تک جا کے دل تک ضرور پہنچتے ہیں اور اپنا اثر دکھاتے ہیں اور جو صرف زبان سے بات ہوتی ہے وہ اتنی ہلکی پھلکی ہوتی ہے کہ صرف کانوں سے ٹکرا کے واپس آجاتی ہے، نہ وہ قلب میں انقلاب لائے اور نہ وہ دماغ میں انقلاب لائے۔

تو خلوت میں بیٹھ کے جس طرح اپنے قلب کو سنوارا جاتا ہے تو اس کی مثال بلا تشبیہ یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے آتشی شیشہ ہوتا ہے اس کو جس وقت آپ سورج کے بالمقابل کرتے ہیں تو وہ سورج کی اتنی حرارت اخذ کرتا ہے کہ پھر جہاں اس کی شعاع پڑتی ہے پھر وہ وہاں بھی آگ لگا دیتا ہے، وہ آگ کیوں لگ جاتی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آتشی شیشہ نے سورج کی حرارت کو اتنا اخذ کر لیا کہ اب جو چیز بھی اس کے بالمقابل آئے گی اس کو آگ لگ جائے گی تو بالکل اسی طرح ماحول کے اندر بعض قلوب اس قسم کے ہوتے ہیں کہ جن قلوب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیضان ہوتا ہے پھر جو قلوب اس کے بالمقابل آجاتے ہیں اور عقیدت و محبت کے ساتھ اس کے ساتھ جڑ جاتے ہیں وہ پھر ان فیوض سے محروم نہیں رہتے، اور اگر کوئی قلب بھی اس ماحول کے اندر ایسا نہیں کہ جس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط صحیح ہو تو وہاں نور ہدایت نہیں پھیلتا چاہے ظاہری طور پر آپ کتنا ہی شور مچاتے رہیں، نعرے لگاتے رہیں، تقریریں

کرتے رہیں، ہنگامے برپا کرتے رہیں لیکن قلوب ویران کے ویران ہوں گے، قلوب اگر روشن ہوتے ہیں تو قلوب سے ہی ہوتے ہیں اور قلوب روشن ہوتے ہیں خلوت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے اور علیحدگی میں اللہ تعالیٰ کے متعلق تفکر و تدبر کرنے سے۔

انبیاء علیہم السلام کی زندگی سے یہی سبق ملتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے بعد اس وقت تک جتنا اولیاء اللہ کا سلسلہ ہے ہر سلسلہ کے اندر خلوت کی اہمیت موجود ہے، آدھی رات کے بعد جب ساری مخلوق سوئی ہوئی ہو اس وقت اٹھو اور ایسے وقت میں بیٹھ کے اللہ کو یاد کرو اور دن میں بھی زیادہ ہنگامہ آرائی کی بجائے زیادہ وقت خلوت میں گزارو تو علیحدگی میں بیٹھ کے جب اللہ کو یاد کرو گے تو اس طریقہ کے ساتھ قلب آباد ہوتے ہیں، جب ایک قلب آباد ہوتا ہے تو پھر دوسرے جب اس کے ساتھ جڑتے ہیں تو ان کو بھی ایسی ہی روشنی مل جاتی ہے، جس طرح آتشی شیشہ سورج کے بالمقابل ہوتا ہے تو جو چیز اس کے بالمقابل آجائے تو اس کو آگ لگ جاتی ہے، انبیاء علیہم السلام کے قلوب ایسے ہوتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کے جانشینوں کے قلوب ایسے ہوتے ہیں تو جن کے قلوب روشن ہو جائیں پھر ان کے ساتھ جڑنے سے آگے فیضان ہوتا ہے اور ہمارے ہاں یہ قصہ ختم ہو گیا، ہم خلوت میں بیٹھ کے اللہ تعالیٰ کے انوارات کو اخذ ہی نہیں کرتے جب اخذ ہی نہیں کرتے تو مخلوق میں جا کے زبان کے ساتھ ہم جتنا چاہیں شور مچاتے رہیں، ڈھول کی طرح کھڑکتے رہیں تو وقتی طور پر تو شور برپا ہو جائے گا لیکن جب وہاں سے اٹھ کے جائیں گے تو جیسے پہلے خالی تھے ویسے ہی اب خالی ہوں گے، ہمارے جلسوں اور اجتماعات کا یہی حاصل ہوتا ہے باقی اس سے ہدایت نہیں پھیلتی، وجہ یہ ہے کہ جو پھیلانے والے ہیں، جو پھیلانے کے لیے سامنے آئے ہوئے ہیں ان کے قلوب کے اندر خود نورانیت ہی نہیں ہے۔

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک شعر عام طور پر دہرایا جاتا تھا اور اس کو حضرت بہت پسند فرماتے تھے، غالباً وہ جگر مراد آبادی کا شعر ہے۔

واعظ کا ہر ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ مگر
چہرے پہ سرورِ عشق نہیں دل میں یقین کا نور نہیں

اس کا مطلب یہی ہے کہ واعظ کا وعظ سنو تو ہر بات سولہ آنہ صحیح ہے اس میں کوئی شک نہیں اور تقریر میں مزہ بھی بہت ہے لیکن دل میں یقین کا نور نہیں اور آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، یہی فرق ہے کہ جس کی وجہ سے پھر آگے اثرات پیدا نہیں ہوتے، اور آگے اس کا فیضان نہیں ہوتا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چلہ کشی گویا کہ یہ اولیاء اللہ کی چلہ کشی کی بنیاد ہے۔

چالیس کے عدد کی اہمیت:

اور چالیس دن کو اہمیت اس لیے دی جاتی ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی خلقت کے اندر بھی چالیس دن کو تغیر کا ذریعہ بنایا ہے، مشکوٰۃ شریف میں باب القدر کے اندر روایات موجود ہیں کہ یہ تغیر جو نمایاں ہوتا ہے تو چالیس چالیس دن کے بعد ہوتا ہے، چالیس دن کے بعد ایک حالت بدلی، پھر دوسری بدلی پھر تیسری بدلی چار ماہ پورے ہونے کے بعد پھر اس میں روح کا فیضان ہوتا ہے تو یہ اثرات جو ہیں انسان کی طبیعت پر چالیس چالیس دن کے بعد پڑتے ہیں، اس طرح سے چالیس دن تک اگر کوئی چیز پابندی کے ساتھ کرلی جائے تو کچھ عادت پڑ جاتی ہے اور اس طرح انسان کی طبیعت کے اندر کچھ تغیر سا آجاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے خلوت میں بلوایا اور یہ ریاضت و مجاہدہ خلوت میں کرایا اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی غار حرا کی زندگی بھی بالکل اس کے مشابہ ہے تو وعدہ فرمالیا اور وعدہ فرمانے کے بعد وہ الواح دے دیں، اس رکوع کے اندر اس واقعہ کو ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت ہارون علیہ السلام کو وزیر بنانا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت گئے تھے تو جاتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب اور خلیفہ بنا گئے تھے آپ سورۃ طٰہٰ میں مفصل پڑھیں گے کہ جس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے موقع پر جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر آگ لینے گئے تھے اور وہاں اللہ سے مکالمہ ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے سامنے تبلیغ کرنے کا مکلف کر دیا گیا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی کہ میرے بھائی کو میرا وزیر بنا دیا جائے "وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ" میرے بھائی کو میرا وزیر بنادو اور اس کے ذریعے میری قوت کو مضبوط کردو، اس قسم کے الفاظ سورۃ طٰہٰ کے اندر آئیں گے تو اللہ تعالیٰ سے ہارون علیہ السلام کے متعلق مطالبہ کیا تھا کہ اس کو میرا وزیر بنادو، چنانچہ پھر حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبی بنا کر اس امر تبلیغ میں شریک کر دیا گیا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بطور وزیر کے مانگا تھا، ہیں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی، تو اصل تو تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی اور نائب تھے حضرت ہارون علیہ السلام، تو جیسے نائب اصل کے چلے جانے کے بعد اصل ہو جایا کرتا ہے اور اصل والے اختیارات اس کو حاصل ہو جاتے ہیں اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جب تشریف لے جا رہے تھے تو سارے کا سارا معاملہ حضرت ہارون علیہ السلام کے سپرد کر گئے کہ میں تو جا رہا ہوں اب بنی اسرائیل کے حالات کی نگرانی آپ نے کرنی ہے،

اور اس میں ہوشیار رہنا ان میں کچھ لوگ ہیں جو آئے دن شرارتیں برپا کرتے رہتے ہیں کہیں ان کے راستہ پر نہ چل پڑنا، ان کی بات مان کے کہیں فساد میں نہ پڑ جانا، یہ ہدایات دے کے چلے گئے۔

مفسدین کا مصداق:

"وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ" مفسدین کے راستہ کی اتباع نہ کرنا، ان مفسدین سے کون مراد ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ ہر جماعت اور قوم میں کچھ اس قسم کے افراد ہوتے ہیں جن کو یہ بیماری ہوتی ہے کہ اچھے کام کرنے میں ان کو اتنا لطف نہیں آتا جتنا گڑبڑ کرنے اور شرارت پھیلانے میں ان کو لطف آتا ہے اور یہ لوگ نمایاں ہوتے ہیں کہ جب شرارت ہوگی ان کی طرف سے ہوگی، جب فتنہ پھیلے گا فلاں شخص پھیلائے گا، گڑبڑ جب ہوگی تو فلاں شخص کی طرف سے ہی ہوگی، جس طرح شرفاء ممتاز ہوتے ہیں اسی طرح قوم کے اندر شرپسند بھی ممتاز ہوتے ہیں چاہے وہ رعب اور دبدبے میں آکے دبے رہیں لیکن جب بھی موقع ملے گا کریں گے وہ گڑبڑ ہی، ان کی طرف سے اصلاح کی توقع کم ہوتی ہے تو مفسدین کا لفظ بول کر کچھ اسی قسم کے اشخاص کی طرف ہی اشارہ ہے کہ ان لوگوں کا ذرا خیال رکھنا، وہ گڑبڑ کرنے نہ پائیں اور اگر وہ گڑبڑ کریں تو آپ محتاط رہنا کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو بھی کسی غلط راستے پر ڈال دیں، ان کی بات نہ ماننا، ان کی طرف سے ہوشیار رہنا، تو ہوسکتا ہے مفسدین سے اسی قسم کے افراد کی طرف اشارہ ہو جس قسم کے افراد جماعت اور قوم میں نمایاں ہوتے ہیں، جن کی فطرت ہوتی ہے ڈنگ مارنے والی یا گڑبڑ پھیلانے والی، ان کو اچھائی میں اتنا لطف نہیں آتا جتنا گڑبڑ کرنے برائی پھیلانے اور دوسروں کو پریشان کرنے میں آتا ہے تو اس قسم کے افراد کی نشاندہی کردی کہ ان کی طرف سے محتاط رہنا کہیں ایسا نہ ہو کہ سازش کرکے کوئی فتنہ اٹھا کے تجھے بھی پھسلا دیں ان کے راستہ کی اتباع نہ کرنا، یہ ہدایات دے کے حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے رؤیت باری تعالیٰ کا مطالبہ:

"وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا" جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ہمارے وقت متعین پہ آگئے "وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ" اور وقت گزرنے کے بعد وعدہ کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کلام ہوئی جیسے اس کی شان کے لائق ہے کسی خاص انداز کے ساتھ، براہ راست، بلاواسطہ فرشتہ کے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات کی، جب بات کی تو محبت تو پہلے ہی انبیاء علیہم السلام کے قلوب میں اللہ تعالیٰ کی بہت ہوتی ہے یعنی ایک چیز ان دیکھی ہے، اپنی آنکھ

سے نہیں دیکھی، مثال کے طور پر درمیان میں حجاب ہیں، پردے ہیں، آپ غائبانہ طور پر ایک شخصیت سے محبت لگائے بیٹھے ہیں، اور اگر کبھی ایسا موقع آجائے کہ بالکل درمیان میں ایک پردہ لٹکا ہوا ہے اور دوسری طرف سے بیٹھے ہوئے وہ آپ سے بات کر رہے ہیں تو اس وقت دیدار کی تمنا کا ابھر آنا ایک فطرت ہے، جب اتنا تعلق ہو گیا کہ براہ راست گفتگو ہو رہی ہے اور درمیان میں حجاب ہے اور واسطہ درمیان میں کوئی نہیں تو ایسے وقت میں تڑپ پیدا ہوتی ہے انسان کے دل میں کہ ہم اس کو دیکھ بھی لیں جیسا کہ غالباً مولانا جامی کا شعر ہے کہ

نہ عشق از دیدار خیزد بسا کیں از دولت گفتار خیزد

کہ عشق کا زور ہمیشہ زیارت کرنے اور دیکھنے سے نہیں چڑھا کرتا کبھی کبھی گفتگو کرنے سے بھی جوش مارتا ہے، باتیں سننے کے ساتھ بھی کبھی کبھی یہ آگ بھڑک اٹھتی ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جس وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ گفتگو ہوئی تو وہی عشق بھڑک اٹھا تو گویا کہ کان تو اللہ تعالیٰ کی کلام کے ساتھ لذت اٹھا ہی رہے تھے اور آنکھیں ترس رہی تھیں تو جوش جو چڑھا تو اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کر دیا کہ "اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ" یا اللہ اتنی ہی مہربانی اور کر دے باتیں تو ہو رہی ہیں اب اپنا دیدار بھی کرا دے، رؤیت کا مطالبہ کر دیا۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا عقلاً ممکن اور شرعاً ممتنع ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ مطالبہ کرنا کہ اے اللہ! تو مجھے اپنا آپ دکھادے تاکہ میں تجھے دیکھ لوں، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کا دیکھا جانا ممکن ہے، عقل اس بات کو گوارا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نظر آجائے کیونکہ اگر عقل ہی گوارا نہ کرتی اور یہ بات عقل کے ہی خلاف ہوتی، عقلاً ممتنع ہوتی تو نبی جو اپنے وقت میں اعقل الناس ہوتا ہے وہ اس قسم کی ممتنع چیز کا مطالبہ نہ کرتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ کرنا یہ علامت ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے، عقلاً یہ چیز ممکن ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے جواب دینے کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں ہے، عقلاً دیکھا جا سکتا ہے لیکن شرعاً ممتنع ہے، اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضہ نہیں کہ اس طرح کسی کے سامنے نمایاں ہو کیونکہ اس مادی زندگی میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو جس کمزور بنیاد پر قائم کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کو یہاں رہتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتے ہاں ایک وقت آئے گا جب روحانیت کا غلبہ ہو جائے گا اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی زیارت ہو گی اور تمام جنتیوں کو ہو گی جیسا کہ روایات صحیح کے اندر موجود ہے۔

نبی وقت کا اعقل الناس ہوتا ہے، سب سے زیادہ عقل مند ہوتا ہے، تو جو انبیاء علیہم السلام کے جانشین ہوا کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے ورثاء ہوا کرتے ہیں وہ بھی عقل مند قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور آج کل لوگ سمجھتے ہیں کہ بزرگی اور مقبولیت انہی میں زیادہ آگئی کہ جتنا بڑا پاگل ہوگا اتنا ہی کہتے ہیں کہ یہ اللہ والا ہے، اور جو آدمی عقل کے مطابق چلنے والا ہو، سمجھ بوجھ کے ساتھ کام کرنے والا ہو اس کو کوئی بزرگ ماننے کے لیے جلدی سے تیار نہیں ہوتا حالانکہ انبیاء علیہم السلام سب سے زیادہ سمجھدار اور عقل مند ہوتے ہیں اور ان کے جانشین بھی اسی طرح عقل مند اور سمجھدار ہونے چاہئیں جو سوچ سوچ کے قدم اٹھائیں، سمجھداری کے ساتھ چلیں، اور ہدایت خلق ہمیشہ انہی لوگوں سے ہوا کرتی ہے جو عقل اور سمجھ کے ساتھ چلنے والے ہوتے ہیں یہ ہدایت مجذوبوں سے، دیوانوں سے، پاگلوں سے چاہے وہ اللہ کے نبی کے مقبول ہی ہوں ہدایتِ خلق ان سے نہیں ہوتی۔

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ کرنا یہ دلیل ہے کہ عقلاً دیدارِ الٰہی ممکن ہے لیکن اللہ کے جواب سے معلوم ہو گیا کہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے شرعاً ممتنع ہے، اس لیے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے بیداری کی حالت میں، میں نے ان آنکھوں کے ساتھ اللہ کو دیکھا ہے، اگر کوئی دعویٰ کرے گا تو یہ قرآن کریم کی صراحت کے خلاف ہے ہاں البتہ مرنے کے بعد جس وقت ہم آخرت میں چلے جائیں گے وہاں چونکہ روحانیت زور پکڑ جائے گی یہ ضعیف بنیاد ختم ہو جائے گی تو اس وقت صلاحیت پیدا ہو جانے کی وجہ سے جنت کے اندر اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کا دیدار جنت کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہوگی کہ جنتی جتنا اس کے اندر لطف محسوس کریں گے جنت کی کسی نعمت کے اندر اتنا لطف نہیں آئے گا۔

لیلۃ المعراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا:

ہاں البتہ ایک تیسری صورت ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ المعراج میں زیارت ہوئی یا نہیں؟ یہ مسئلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مختلف فیہ تھا لیکن جو یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو دیکھا ہے ان پر بظاہر یہ اشکال ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ زندگی تو دنیوی زندگی تھی اس میں اللہ تعالیٰ کو کیسے دیکھ لیا، تو اس کا جواب علماء کرام یہ دیا کرتے ہیں کہ جس طرح ایک زمانِ آخرت ہے وہ ہے قیامت کے بعد، جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی تو آخرت کا زمانہ آجائے گا، اس وقت جا کے حالات و کیفیات بدل جائیں گی اور ایک ہے مکانِ آخرت وہ ہے کہ جہاں آسمان کے اوپر اللہ

تعالیٰ نے جنت بنائی ہوئی ہے تو کوئی شخص اس دنیا کے اندر رہتا ہوا مکان آخرت میں پہنچ جائے تو بھی اس میں وہی آثار پیدا ہو جائیں گے جو زمانِ آخرت کے بعد پیدا ہوں گے، زمین پر رہتے ہوئے آپ کی کیفیت اور ہے اور اگر آپ کو آسمان پر اٹھا لیا جائے اور جنت میں پہنچا دیا جائے تو بالکل وہی آثار آپ پر طاری ہو جائیں گے جو قیامت کے بعد جنت میں جانے کے بعد طاری ہوں گے دلیل اس کی کیا ہے؟ دلیل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے انسان ہی ہیں اگر وہ اس دنیا کے اندر رہتے تو کھانے کے محتاج تھے اور جس وقت انسان کھانا کھاتا ہے تو کھانا کھانے کے بعد جو عوارض طاری ہوتے ہیں پیشاب ہے، پاخانہ ہے، سونا ہے، جاگنا ہے، اس قسم کی چیزیں ساری کی ساری آتی ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان سب چیزوں کے محتاج ہوتے اور محتاج ہونے کے ساتھ انسان کے متعلق جیسے اللہ تعالیٰ کی عادت ہے جوان کی عمر تھی ساٹھ سال، ستر سال، اسی سال وہ پوری کرتے پوری کر کے لقمۂ اجل ہو جاتے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو جو اٹھا لیا اور جنت میں پہنچا دیا اب ان کی سب کیفیتیں جنت والی ہیں اس لیے جب وہ واپس آئیں گے تو بالکل اسی عمر میں ہوں گے جس عمر میں یہاں سے اٹھائے گئے تھے، اگر چالیس سال کی عمر میں اٹھائے گئے تھے تو جب واپس آئیں گے تو چالیس سال کے ہی ہوں گے، کوئی کسی قسم کا تغیر نہیں آئے گا، اور ان کی عمر وہی شمار ہوگی جو انہوں نے دنیا کے اندر گزاری ہے، ان کی عمر کے متعلق ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ان کی عمر تین ہزار سال ہو چکی ہوگی ایسا نہیں ہوگا، عمر ان کی وہی ہے جو انہوں نے دنیا کے اندر آ کے گزاری ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ہزار سال اگر اللہ نے لکھی تھی تو زمین پر آنے کے بعد انہوں نے شمار پورا کیا باقی جنت میں جتنے سال گزارے تھے وہ شمار میں نہیں آئے، تو دنیا کے آثار اور ہیں اور اگر اس کو اسی طرح عالم آخرت میں جنت کے اندر پہنچا دیا جائے تو وہاں آثار اور ہیں، اس کی مثال یوں سمجھ لیں کہ آپ گوشت لے کے اپنی الماری میں رکھیں گے تو صبح کو باسی ہو جائے گا لیکن اگر اس کو فریج میں رکھ دیا جائے تو وہ دس دن کے بعد بھی تازہ کا تازہ ہی ہوگا، یہ حالات بدل جاتے ہیں تو جنت میں پہنچ جانے کے بعد انسان میں تغیر نہیں ہے اس لیے اگر اللہ تعالیٰ آپ کو جوان کر کے جنت میں لے جائے گا تو تم لاکھ سال رہو، ارب سال رہو تم جوان ہی رہو گے بوڑھے نہیں ہوگے، تندرست بنا کے اگر تمہیں جنت میں پہنچا دیا تو تم ہزاروں نہیں لاکھوں سال رہو گے تمہاری تندرستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا جیسا کہ حدیث شریف میں صراحت ہے، صحت ہے تو وہ بھی برقرار رہے گی، جوانی ہے تو وہ بھی برقرار رہے گی، زندگی ہے تو وہ بھی برقرار رہے گی، جنت میں جا کے پھر تغیر نہیں ہے، تو اسی طرح سے زمان آخرت کے جیسے آثار ہیں مکان آخرت کے آثار بھی ویسے ہی ہیں۔

تو سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق اگر یہ قول کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے تو اس دنیا میں رہتے ہوئے نہیں بلکہ مکان آخرت میں جانے کے بعد دیکھا ہے، تو مکان آخرت میں جانے کے بعد دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جانا، زمان آخرت میں جا کے دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جانا یہ روایاتِ صحیح کے اندر موجود ہے، تو مکان آخرت کے اندر بھی ویسی ہی صلاحیت پیدا ہو گئی اس لیے براہ راست، بلا حجاب جس طرح اس کی شان کے لائق ہے اگر حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہو تو اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔

ہاں البتہ اس زمین پہ رہتے ہوئے، اسی زندگی میں انہی آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا جا سکتا اگر کوئی کہے گا تو جھوٹ کہتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب اور پہاڑ پر تجلی ڈالنے کی وجہ:

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیتے ہوئے کہا "لَنْ تَرَانِیْ" "لَنْ" استقبال کی نفی کے لیے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو ہرگز مجھے نہیں دیکھے گا "وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ" یہ زیادہ مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا کہ دیکھ! ہم تجھے نمونہ دکھا دیتے ہیں، اس مادی زندگی کے اندر انسان کا وجود پتھر کے مقابلہ میں سخت نہیں ہے بلکہ پتھر اس سے زیادہ سخت ہے یہی وجہ ہے کہ آپ اگر پتھر پر مکا ماریں تو اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اگر پتھر اٹھا کے آپ کے سر پر مار دیا جائے تو ماشاء اللہ اچھا خاصا انقلاب آ جاتا ہے، پتھر آپ کو مار دیا جائے تو آپ کی ہڈی چور چور ہو سکتی ہے لیکن اگر آپ پتھر کے اوپر ہاتھ ماریں تو پتھر کا کچھ نہیں بگڑتا تو پتھر آپ سے زیادہ مضبوط ہے اس مادی زندگی کے اعتبار سے، اس جسم کے اعتبار سے جو خاکی جسم ہے تو جو چیز پتھر نہیں اٹھا سکتا وہ آپ اپنے سر اور کندھے پر نہیں اٹھا سکتے، کسی چیز میں اتنا وزن ہو کہ جس کے سامنے پتھر چور چور ہو جائے وہ انسان کے اوپر اگر رکھ دی جائے تو وہ تو بطریق اولیٰ چور چور ہو جائے گا۔

ہاں البتہ انسان کے قلب میں جو روحانیت ہے پہاڑ اور پتھر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم اتارا حضور ﷺ کے قلب پر "نزلہ علیٰ قلبك" تو حضور ﷺ کے قلب میں صلاحیت اتنی تھی کہ یہی قرآن اگر کسی پہاڑ پر اتارا جاتا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا لیکن آپ ﷺ کے قلب نے اس کو برداشت کیا اور "لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا" اگر یہ قرآن ہم کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ پھٹ جاتا اور

دب جاتا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اس کو برداشت کر گیا، قلبی صلاحیت کے اعتبار سے، روحانی قوت کے اعتبار سے تو انسان کا مقابلہ کائنات میں سے کوئی چیز نہیں کر سکتی لیکن جہاں تک اس مادی زندگی کا تعلق ہے تو لوہا اس کو کاٹتا ہے، پتھر اس کو کوٹتا ہے، ہر چیز کے مقابلہ میں یہ کمزور ہے "خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفاً"۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھو! ہم پہاڑ کے اوپر تجلی ڈالتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قلب تو اللہ تعالیٰ کی تجلیات کو برداشت کیے ہوئے تھا لیکن وہ تو اس آنکھ سے دیکھنا چاہتے تھے اور یہ آنکھ پتھر کے مقابلہ میں بہت کمزور ہے اس لیے فرمایا کہ دیکھو! ہم تھوڑی سی تجلی پتھر پہ ڈالتے ہیں، پہاڑ پہ ڈالتے ہیں اگر تو یہ سنبھال گیا، برداشت کر گیا تو پھر ہمارا وعدہ ہے کہ تو بھی دیکھ لے گا یعنی اگر چہ تو کمزور ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ تو برداشت کر لے لیکن اگر پہاڑ ہی نہ برداشت کر سکا تو تو یقین کر لے کہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے یہ آنکھ ہماری تجلی کو برداشت نہیں کر سکتی، حجاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تجلیات ہمارے سامنے نمایاں ہیں لیکن بالکل واشگاف ہو کے سامنے آ جائے تو ساری مخلوق جل کے راکھ ہو جائے گی، جس طرح یہ سورج ہے، سورج کی روشنی زمین پر پڑتی ہے، اس کی شعاعیں زمین پر آتی ہیں یہ کتنا کروڑ ہا میل دور ہے اور کتنے راستے میں فضاء کے اندر اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر حجاب ڈالے ہیں اور ان حجاب کے تحت ہماری آنکھ اس کو برداشت کیے ہوئے ہے لیکن اگر یہی سورج بلا حجاب آپ کی آنکھ کے سامنے کر دیا جائے تو فوراً آپ اندھے ہو جائیں گے، اس کی روشنی کو آپ کی آنکھ برداشت نہیں کر سکے گی تو بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو انسان حجاب سے برداشت کر لیتا ہے اور بلا حجاب برداشت نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ کے نور کو بھی یہ آنکھ برداشت نہیں کر سکتی، اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ قرار پکڑے رہا "فَسَوْفَ تَرٰنِیْ" پھر تو بھی مجھے دیکھ لے گا "فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ" جس وقت اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کے لیے تجلی فرمائی یعنی پہاڑ کے لیے اللہ نمایاں ہوا "جَعَلَهٗ دَكًّا" کر دیا اس کو کوٹ کے برابر، "دك الارض" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کو اس طرح برابر کر دیا جائے کہ اس میں کوئی ٹیلہ یا گڑھا باقی نہ رہے، اس طرح پہاڑ کا وہ حصہ جو تھا وہ ٹوٹ کے اس طرح ہو گیا جیسے ریت ہوتی ہے، "وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا" اب یہ ہیبت ناک منظر جو سامنے آیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں قریب ہی تھے تو اس منظر کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی غشی پڑ گئی "خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا" گر گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رجوع الی اللہ:

"فَلَمَّآ اَفَاقَ" جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہوش آئی، افاقہ ہوا اور اپنی اصلی حالت کی طرف واپس آئے

"قَالَ" تو موسیٰ نے کہا "سُبْحَانَكَ" اے اللہ! تو پاک ہے، یہاں "سُبْحَانَكَ" کا مطلب یہ ہے کہ تو اس بات سے پاک ہے کہ یہ مادی آنکھ اس دنیا میں رہتے ہوئے تجھے دیکھ سکے، "تُبْتُ اِلَیْكَ" میں نے یہ جو مطالبہ کر لیا تھا میں اس سے توبہ کرتا ہوں، میں معافی چاہتا ہوں "وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ" اور میں پہلا ایمان لانے والا ہوں۔

پہلا ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے مشاہدۃً اور ایماناً اس بات کا یقین کرنے والا کہ تو اس دنیا میں رہتے ہوئے نہیں دیکھا جا سکتا پہلا میں ہی شخص ہوں کیونکہ یہ تجربہ مجھے ہی ہوا ہے۔

"قَالَ یٰمُوْسٰی" جس وقت یہ قصہ ہو گیا اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ٹھیک ہے کہ رویت تجھے نہیں ہوئی تو مجھے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکا لیکن ہم نے تجھے ممتاز کر لیا، اپنے پیغامات تجھے دے دیے، اپنی کلام تجھے دے دی اب ان کو لے جاؤ اور مضبوطی کے ساتھ تھامو، خود بھی اس پر عمل کرو اور اپنی قوم سے بھی عمل کرواؤ۔

کتاب کے متعلق مختلف ہدایات:

"وَكَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ" الواح جمع ہے لوح کی، معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تختیوں کی شکل میں توراۃ اتری تھی، توراۃ اس طرح نہیں اتری کہ جیسے قرآن کریم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر القاء ہوا پھر آپ نے زبان سے پڑھا اور پھر کتاب میں ضبط کیا گیا ایسے نہیں بلکہ لکھی لکھائی اوپر سے آئی تھی "وَكَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ" لکھ دیا ہم نے اس موسیٰ کے لیے تختیوں میں "مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً" ہر قسم کی نصیحت "وَّتَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ" اور ہر چیز کی تفصیل اور ہم نے کہہ دیا "فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ" کہ اس کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو "وَاْمُرْ قَوْمَكَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا" اور اپنی قوم کو حکم دیجیے کہ ان تختیوں کی بہترین باتوں پر عمل کریں یا تو وہ باتیں ساری کی ساری بہترین ہیں تو احسن تفضیل کے معنیٰ سے خالی ہے اور اگر تفضیل کے معنیٰ کی رعایت رکھنی ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگرچہ اس میں بعض احکام رخصت بھی ہیں اور بعض عزیمت ہیں تو آپ اپنی قوم کو یہ کہیے کہ وہ عزیمت پر عمل کرنے کی کوشش کریں، اگرچہ ایک چیز کی اجازت دے دی گئی کہ یوں کر لو اور دوسری صورت بہتر ہے تو بہتر کو اختیار کرنے کی کوشش کریں، جیسے بعض بعض احکام کے اندر آپ جانتے ہی ہیں جیسے مثال کے طور پر سفر میں روزہ چھوڑا بھی جا سکتا ہے لیکن رکھنا افضل ہے تو احسن رکھنا ہوا اگرچہ چھوڑنا بھی حسن ہے، اسی طرح ظالم کو معاف کر دینا احسن ہے اور اس سے بدلہ لے لینا یہ حسن ہے، اجازت ہے کہ بدلہ لے لیجیے لیکن بہتر ہے کہ معاف کر دو تو ترغیب یہ دو کہ ان الواح میں لکھی ہوئی باتوں میں سے جو احسن ہیں ان کو اختیار کرو۔

"سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ" عنقریب میں دکھا دوں گا تمہیں فاسقین کا گھر، اس کا مطلب دو طرح سے

ذکر کیا گیا ہے یا تو یہ وعید ہے بنی اسرائیل کے لیے کہ اگر وہ اس پر عمل نہیں کریں گے تو فاسق ٹھہریں گے اور میں انہیں عنقریب فاسقوں کا ٹھکانہ دکھا دوں گا یعنی انہیں اس ٹھکانہ پر پہنچا دوں گا جو فاسقوں کا ٹھکانہ ہے پھر تو یہ وعید ہے، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو چاہیئے کہ اس کتاب پر عمل کریں، شریعت پر عمل کریں یہ نافرمان لوگ جو کہ شام کے علاقہ پر مسلط ہیں میں عنقریب ان کو دکھا دوں گا کہ اس کی برکت سے وہ علاقہ فتح ہوگا اور وہ علاقہ ان کو مل جائے گا پھر گویا کہ یہ ایک وعدہ اور بشارت ہے، جس طرح فرعونی فاسقین تھے اور وہ غرق ہو گئے اور شام میں مشرک آباد تھے تو اگر یہ شریعت کے مطابق چلتے اور توراۃ کی تعلیم کے مطابق جہاد کرتے تو وہ فاسقین کا گھر بھی ان کو مل جاتا، اللہ تعالیٰ وہ علاقہ بھی ان کو دکھا دیتا، اور جب انہوں نے نافرمانی کی تو وہ علاقہ ان کو نہیں ملا اور چالیس سال کے بعد دوبارہ پھر جب حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جہاد کیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ علاقہ ان کو دے دیا تو "دَارَ الْفَاسِقِيْنَ" سے وہی شام اور مصر کا علاقہ مراد ہو سکتا ہے اور فاسقین سے وہی قوم عمالقہ اور فرعونی مراد ہو سکتے ہیں کہ ہم عنقریب ان کو ان کا گھر دکھائیں گے یعنی وہ علاقہ ان کے قبضے میں دے دیں گے۔

تکبر انسان کو ہدایت سے محروم کر دیتا ہے:

"سَاَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ" اور عنقریب پھیر دوں گا میں اپنی آیات سے یعنی ان کو عمل کی توفیق نہیں ہوگی جو لوگ تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق، معلوم ہو گیا کہ تکبر ایک ایسی چیز ہے جس کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہوتی اور وہ توفیق سلب ہو جاتی ہے، تکبر کا معنی بڑائی، اپنے آپ کو بڑا سمجھو، اکڑو کہ میں ہی سب کچھ ہوں جس کے دل میں اس قسم کے تکبر کے جذبات ہوا کرتے ہیں وہ نیک باتوں پر عمل نہیں کر سکتا، نیک باتوں پر عمل کرنے سے محروم ہو جاتا ہے اور اس تکبر اور بڑائی کی بناء پر ہمیشہ برا راستہ اختیار کرے گا، اچھائی کی طرف اس کی طبیعت کا میلان نہیں ہوتا، تواضع، خاکساری، انکساری یہ عادتیں ہیں جو انسان کے لیے سعادت کی کنجی ہیں کہ جب انسان متواضع ہوتا ہے تو پھر دوسرے کی بات کو سنے گا سمجھے گا اور اس کے اوپر عمل کرنے کی کوشش کرے گا اور جب انسان متکبر ہوتا ہے تو نہ کسی کی نصیحت سننا گوارہ کرتا ہے اور نہ اس کے اوپر عمل کرنا گوارہ کرتا ہے، تکبر انسان کو ہر قسم کی سعادت سے محروم کر دیتا ہے اور تواضع کے ساتھ ہر قسم کی اچھائی نصیب ہوتی ہے، جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں میں ان کو اپنی آیات سے پھیر دوں گا یعنی وہ ان آیات پر عمل نہیں

کر سکیں گے۔

اور پھر ان کا حال یہ ہو جائے گا متکبرین ہمیشہ شرارت کی طرف زیادہ جاتے ہیں اگر وہ دیکھیں گے ہدایت کا راستہ تو اس کو اختیار نہیں کریں گے اور اگر دیکھیں گے گمراہی کا راستہ تو اس کو اختیار کر لیں گے، ذوق اس طرح سے بگڑ جائے گا اور ذوق بگڑنے کے ساتھ پھر ہر وقت انسان کی طبیعت بگاڑ کی طرف ہی جاتی ہے، ایک آدمی کو اگر تلاوت کی عادت پڑی ہوئی ہو تو جس وقت تک وہ تلاوت نہ کرے اسے سکون نہیں آتا اور اگر ایک آدمی کو ناول پڑھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے تو جب تک وہ ناول نہ پڑھے اسے نیند نہیں آتی، عادت بن جانے کے بعد یوں معاملہ ہو جاتا ہے، سینما دیکھنے والوں کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک کہ تین گھنٹے سینما میں نہ بیٹھ آئیں اور جس کو مسجد میں جانے کی عادت ہے وہ جب تک مسجد میں نہ جائے اسے روحانی سکون نصیب نہیں ہوتا، پھر اگر طبیعت میں تواضع ہے، نیکی کی طرف رجحان ہے پھر اگر ہدایت کا راستہ نظر آئے گا تو انسان اس کو دوڑ کے اختیار کرے گا اور اگر گمراہی کا راستہ نظر آئے گا تو اس سے انسان بچے گا لیکن اس تکبر کے نتیجہ میں مزاج ایسا فاسد ہو جاتا ہے کہ اس فساد مزاج کے بعد اگر ہدایت کا راستہ ان کو دکھاؤ گے تو اس طرف قطعاً نہیں آئیں گے اور اگر شرارت اور گمراہی کا راستہ آئے گا تو فوراً اختیار کر لیں گے تو یہ طبیعت کا بگڑ جانا انسان کے لیے ہر برائی کو آسان کر دیتا ہے۔

اور اگر طبیعت سلیم ہو اور طبیعت کے اندر حق قبول کرنے کا جذبہ ہو، تکبر اور بڑائی نہ ہو تو ہر نیکی انسان کے لیے آسان ہو جاتی ہے، تکبر کرنے والوں کا آخر حال یہ ہوگا کہ اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں گے تو اس کو اختیار نہیں کریں گے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں گے تو اس کو اختیار کر لیں گے، اور یہ محرومی ان کی اس وجہ سے ہوئی کہ یہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے اور ان آیات سے غفلت برتتے تھے اور جو لوگ ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے ہیں ان کے اعمال بے کار ہو گئے، اعمال سے نیک اعمال مراد ہیں یعنی نہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی رضا مرتب ہوگی اور نہ آخرت میں وہ ان کے لیے نجات کا ذریعہ بنیں گے "هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ" نہیں بدلہ دیے جائیں گے وہ مگر اس چیز کا جو وہ کرتے تھے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا

بنا لیا موسیٰ کی قوم نے موسیٰ کے چلے جانے کے بعد اپنے زیورات سے بچھڑا یعنی ایک وجود

جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ

جس کے لیے گائے کی آواز تھی کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک وہ جسد ان کے ساتھ بات نہیں کرتا اور نہ انہیں کوئی بتلاتا ہے

سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْۤ

راستہ بنا لیا انہوں نے اس کو اور وہ لوگ ظالم تھے (۱۴۸) اور جب سقوط کیا گیا ان

اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ

کے ہاتھوں میں (پشیمان ہوئے) اور وہ سمجھ گئے کہ وہ غلطی کر چکے ہیں تو وہ کہنے لگ گئے اگر ہم پر نہ کیا

يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ

رحم ہمارے رب نے اور اگر ہمیں نہ بخشا تو البتہ ہو جائیں گے ہم خسارہ پانے والوں میں سے (۱۴۹) اور جب لوٹے

مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ

موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصہ سے بھرے ہوئے افسوس کرتے ہوئے تو کہا موسیٰ نے تم نے میری بہت بری نیابت کی

مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ

میرے بعد کیا تم نے جلدی کر لی اپنے رب کے حکم سے اور ڈال دیا تختیوں کو اور پکڑ لیا

بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ

اپنے بھائی کے سر کو کھینچتا تھا اس کو اپنی جانب، ہارون نے کہا اے میری ماں کے بیٹے! بے شک قوم نے مجھے کمزور سمجھا

وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۫ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ

اور وہ قریب تھے کہ مجھے قتل ہی کر دیتے پس تو خوش نہ کر میری وجہ سے دشمنوں کو اور مجھے ساتھ نہ قرار دے

الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ

ظالم لوگوں کے (۱۵۰) موسیٰ نے کہا اے میرے رب! میری بخشش کر دے اور میرے بھائی کو بخش دے اور داخل کر ہمیں

رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٥١﴾

اپنی رحمت میں اور تو تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (۱۵۱)

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

پچھلے رکوع میں آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے طور پر بلایا تا کہ ایک چلہ گزاریں، چلہ گزارنے کے بعد ان کو کتاب دی جائے گی چنانچہ واقعہ ایسے ہی ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر چلے گئے اور جانے کے بعد انہوں نے چلہ گزارا اور پھر ان کو کتاب مل گئی۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور پر چلے جانے کے بعد قوم میں ایک واقعہ رونما ہوا جس کا تذکرہ اس رکوع میں آرہا ہے۔

واقعہ ذکر کرنے کا مقصد:

اور اس کے ذکر کرنے سے مقصد ہے بنی اسرائیل کی کج روی کا ظاہر کرنا، ناقدری اور ناشکری کا ظاہر کرنا کہ ابھی کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا تاریخی روایات میں جیسے آتا ہے کہ یہ واقعہ فرعون کے غرق ہونے کے زیادہ سے زیادہ تین مہینے بعد کا ہے، ابھی ابھی انہوں نے غلامی سے نجات پائی، دشمن ان کا اللہ کے فضل کے ساتھ غیبی مدد کے ساتھ تباہ ہوا، اللہ تعالیٰ کی نصرت ان کے شامل حال تھی یہ ساری کی ساری کرامتیں اور شرافتیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو دی تھیں ان کو یہ دیکھتے چلے آرہے تھے لیکن اس کے باوجود جب ذرا موقع ملا تو یہ گمراہی کی طرف اس طرح سے دوڑے جیسے یہ ان کی کوئی مرغوب فیہ غذا ہو ان کی اس ناشکری، ناقدری اور کج روی کو ظاہر کرنے کے لیے یہ واقعہ بیان کیا جارہا ہے۔

مسلمانوں پر انگریزی تہذیب کے اثرات:

مصری لوگ جو فرعون کے ہم قوم لوگ تھے وہ گائے کا احترام کرتے تھے جس طرح ہمارے پڑوسی ہندوستان میں رہنے والے ہندو لوگ گائے کا احترام کرتے ہیں، گائے کو پوجتے ہیں تو مصریوں کے اندر بھی گائے

تقدس کا درجہ رکھتی تھی اور وہ اس کا احترام کرتے تھے اور کسی درجہ میں اس کی پوجا بھی کرتے ہوں گے اور اسرائیلی ان کے غلام ہونے کی حیثیت سے وہاں رہتے تھے اور آپ حضرات کو شاید اس کا تجربہ نہیں ہے جب آپ تاریخ پڑھیں گے تو آپ کے سامنے یہ بات نمایاں ہو جائے گی کہ حاکم قوم کے اخلاق اور حاکم قوم کی عادات محکوم کے اوپر بہت اثر انداز ہوتی ہیں چاہے وہ کتنی ہی خلاف عقل کیوں نہ ہوں، کتنی ہی خلاف دلیل کیوں نہ ہوں لیکن محکوم پر حاکم کو جو برتری حاصل ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے محکوم کو حاکم کی ہر چیز اچھی لگتی ہے، محکوم ہر معاملہ میں اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، محکوم کے دل میں ان باتوں سے نفرت نہیں رہا کرتی جو حاکم قوم اپنائے ہوئے ہوتی ہے۔

چاہے آپ نے تفصیل کے ساتھ نہیں دیکھا لیکن کچھ تو آپ کے سامنے نقشہ ہوگا کہ ہندوستان میں انگریز آیا اور ایک حاکم ہونے کی حیثیت سے ہندوستان پر مسلط ہوا تو وہ ایک بے غیرت قوم تھی، بے حیا قوم تھی، خدا سے بیزار قوم تھی، مادہ پرست قوم تھی، اس کی عادات خلاف شریعت، خلاف عقل، لباس کے بارے میں، عورتوں کے بارے میں، عورتوں کو بے پردہ کرنا اور ران کو نمایاں کرنا، اور ان کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا غرض ان کا ہر طریقہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابل برداشت نہیں تھا لیکن جب وہ حاکم ہونے کی حیثیت سے مسلط ہوئے تو قوم نے یہ نہیں دیکھا کہ ان کی عادات غلط ہیں، شرافت کے خلاف ہیں، حیا کے خلاف ہیں لیکن نقالی شروع کر دی اور نقالی کرتے کرتے یوں سمجھو کہ وہ کالے انگریز بن گئے رنگ تو اپنا نہ تبدیل کر سکے وہ تو ان کے بس میں نہیں تھا لیکن کالے ہونے کے باوجود ہر چیز میں بود و باش میں، تہذیب و تمدن میں، رہائش میں، اخلاق میں انہوں نے انگریز بننے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تو یوں سمجھ لیجئے کہ یہ کالے انگریز ہو گئے تو اس طرح حاکم قوم کی عادات و اطوار محکوموں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

بنی اسرائیل پر فرعونی تہذیب کے اثرات:

بنی اسرائیل بھی اسی طرح سے تھے، جب یہ مصریوں اور فرعونیوں میں رہتے تو انہیں دیکھتے تھے کہ یہ گائے کا احترام کرتے ہیں تو وہی بات ان کے قلوب میں بھی پڑ گئی "أُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ" ان کے دلوں میں بھی بچھڑے کی محبت پیوست کر دی گئی، سرایت کر گئی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت، یہی وجہ ہے کہ جس وقت وہ فرعون سے نجات پا کے آ گئے تھے تو پچھلے رکوع میں آیا تھا کہ انہوں نے مطالبہ کیا تھا "اِجْعَلْ لَنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ" کچھ لوگوں کو بت پوجتے ہوئے دیکھا تو فوراً مطالبہ کر دیا کہ موسیٰ! ہمارے لیے بھی کوئی ایسا اللہ بنا دے جیسا

لوگوں کے لیے الٰہ ہے یہ شرک کی طرف جوان کی طبیعت کا میلان تھا یہ سب اسی کا ظہور ہے۔

زیورات کس کے تھے؟

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت طور پر تشریف لے گئے تو گئے تو اس لیے تھے کہ اپنی قوم کے لیے کوئی شرعی احکام کا مجموعہ لائیں تا کہ قوم اب اطمینان کے ساتھ اللہ کے احکام پر عمل کرے اور جاتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کو ہدایات دے گئے تھے کہ میرے بعد تو میرا خلیفہ ہے، قوم کے حالات کو درست رکھنا اور فتنہ پردازوں کا خیال رکھنا اگر وہ کوئی فساد اٹھائیں تو تو نے ان کے ساتھ نہیں چلنا، سب ہدایات دے کے تشریف لے گئے لیکن وہ قوم تو تجدد پسند تھی ان میں ایک شخص تھا جس کا نام سامری تھا جس کا ذکر سورۃ طٰہٰ میں آئے گا یہ کوئی منافق تھا، نفاق کے طور پر ان میں شامل ہو گیا تھا اور شامل ہوا ہی اس لیے تھا تا کہ ان کو برباد کرے، ان کے اندر اس قسم کی چیزیں پھیلا دے جس کے ساتھ قوم کا شیرازہ بکھر جائے اور ان کا آپس میں اتحاد و اتفاق نہ رہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع نہ کر سکیں تو بعضے لوگ اس قسم کے فسادی ہوا کرتے ہیں تو وہ اسی طرح سے اس قوم میں شامل ہو گیا تھا اور جذبات اس کے اچھے نہیں تھے۔

قوم کے اندر ظاہر پرستی کی رغبت تو پہلے ہی تھی تو ممکن ہے کہ اس نے کوئی سکیم اس قسم کی چلا دی ہو کہ موسیٰ علیہ السلام تو طور پر چلے گئے، ہم اتنے دن تک صبر کیسے کریں، آؤ پوجا کرنے کے لیے کوئی چیز بنا لیں، مصر میں گائے کے بت تھے، بچھڑوں کے بت تھے تو اس نے بھی پیشکش کر دی کہ میں بھی تمہیں اس قسم کی کوئی چیز بنا دیتا ہوں، اس کے لیے چندہ کیا گیا، معلوم ایسے ہوتا ہے کہ قوم نے اپنے زیورات چندے میں دے دیے۔

"مِنْ حُلِيِّهِمْ" یہاں لفظ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زیورات سے بنایا، یہ ان کے زیورات کیا تھے؟ تفسیروں میں تو ایک روایت لکھی ہے کہ بنی اسرائیل نے مصریوں سے کچھ زیورات مستعار لیے ہوئے تھے کسی شادی کے بہانہ سے اور وہ حربیوں کا مال تھا، ان حربیوں کے ہلاک ہونے کے بعد وہ مال غنیمت قرار پایا اور مال غنیمت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی امت کے لیے حلال نہیں تھا تو یہ زیورات ان پہ بوجھ بن گئے کہ یہ غیر قوم کے ہیں اور ہم ان کو استعمال نہیں کر سکتے تو کیا کریں؟ تو جب وہ زیورات ان کے لیے بوجھ بنے تو سامری نے وہ سارے کے سارے اکٹھے کروا لیے اور جب اکٹھے کروا لیے تو دیکھو! جن زیورات کا استعمال ان کے لیے جائز نہیں

تھا اس کا بچھڑا بنا کے پوجنا انہوں نے اپنے لیے جائز بنالیا، تو یہ زیورات اصل میں مصریوں کے تھے، ایسا ہو تو یہ بھی کوئی بعید نہیں، ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

لیکن اتنا لمبا دھندا کرنے کی کیا ضرورت ہے، قرآن کریم میں کوئی ایسا اشارہ نہیں کہ جس سے یہ بات نکلتی ہو کہ وہ زیورات فرعونیوں سے چرا کے لائے تھے یا مال غنیمت کے طور پر لائے تھے یا عاریۃً لیے تھے اور پھر واپس نہیں لوٹائے اور اگر اس قسم کے زیورات ہوتے تو ظاہر یہی ہے کہ جس وقت فرعون غرق ہو گیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ قوم آئی تھی تو یہ مسئلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش ہوتا کہ چونکہ ہم چھپ کے نکلے ہیں اور ان کے زیورات ہمارے پاس تھے اب ہم ان کو کیا کریں؟ تو فرعونیوں کے غرق ہونے کے بعد یہ مسئلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ہی پیش ہو جانا چاہیے تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو ہدایات دے دیتے کہ ان کو سمندر میں پھینک دو یا کیا کرو، کیا نہ کرو، لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ انہوں نے یہ مسئلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش کیا ہو اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، تو اب اتنی مدت تک وہ زیورات ساتھ اٹھائے پھر رہے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد ان کا مصرف سوچنے لگے کہ اب ان زیورات کو کیا کریں اس لیے وہ روایت جو عام طور پر تاریخ میں نقل کی گئی ہے اسرائیلی روایت ہے، اس پر تفسیر کا مدار نہیں ہے، اگر ایسا ہو تو بھی اس میں انکار کی کوئی بات نہیں ہے، ایسا ہو گیا ہوگا کہ فرعونیوں کے زیورات ان کے پاس رہ گئے ہوں گے اور زیورات کو پھر انہوں نے کسی جگہ صرف کرنا چاہا تو یہ ایک شرارتی اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ان کی اسی بات سے فائدہ اٹھالیا کہ لاؤ میرے پاس جمع کرادو میں تمہیں ایک عجوبہ بنا دیتا ہوں۔

ورنہ سیدھی سی بات ہے کہ آپ لوگ جس وقت کوئی دینی کام کرنے لگتے ہیں تو آپ کے مقرر اسٹیج پر کھڑے ہو کر چندے کی اپیل کرتے ہیں اور بسا اوقات وہ اپیل کرنے والا اتنا موثر ہوتا ہے قوم کے جذبات کے ساتھ کھیلتا ہے، تو عورتیں جو تقریر سننے کے لیے آئی ہوئی ہوتی ہیں وہ زیورات بھی اتار کے پھینکنے لگ جاتی ہیں، زیورات تک کا لوگ چندہ دے دیتے ہیں، اب یہ تحریک تو ایک بہت بڑی تحریک تھی کہ اپنے لیے ایک معبود بنانا تھا جو دین کا ایک مرکز ہے تو جب اس کے لیے اپیل کی ہوگی تو لوگوں کے گھروں میں جو سونا چاندی موجود تھا وہ اٹھا کے انہوں نے سارے کا سارا سامری کے سپرد کر دیا کہ معبود کے لیے تو سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے اور جو کچھ سامری کے پاس تھا اس نے وہ بھی ڈال دیا یعنی وہ بھی ساتھ شریک ہوا، یہ نہیں کہ صرف لوگوں سے لیا بلکہ اس کے پاس جو تھا اس نے وہ بھی ڈال دیا۔

سامری کا زیورات سے بچھڑا بنانا:

جب ڈال دیا تو بت پرست قوموں کے اندر بت تراشنے کی صنعت بہت ترقی یافتہ ہوتی ہے تو اس نے سونا پگھلا کے ایک خول سا تیار کرلیا اور شکل بچھڑے کی بنائی لیکن آج کل آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ جاپانی کھلونے جس قسم کے آتے ہیں اب بنانے والے ان کے اندر ایسے ایسے کرتب دکھاتے ہیں کہ بس یہ ہے کہ اس میں ایک جان نہیں ڈال سکے اور وہ کمی بھی سیل رکھ کے تھوڑی دیر کے لیے وہ پوری کر دیتے ہیں اور اس سے وہ ساری ہی اس قسم کی حرکتیں کروا لیتے ہیں جس قسم کی حرکتیں ایک جاندار چیز کیا کرتی ہے اسی طرح پرانے زمانہ میں جو لوگ بت بناتے تھے تو وہ بھی عجیب عجیب کرتب دکھاتے تھے تو اس نے بچھڑے کا بت جو بنایا تو ایسی شکل کا بنا دیا کہ جہاں اس کو کھڑا کیا ہوگا، ہوا چلتی ہوگی تو ایک طرف سے ہوا داخل ہو کے دوسری طرف سے نکلتی ہوگی تو اس سے ایسی آواز پیدا ہوتی تھی جس قسم کی گائے کی آواز ہوتی ہے تو اس نے یہ کرشمہ دکھا دیا، تو جیسے آج کل کے کھلونوں سے انسان کی آواز پیدا کردی گئی، اس کے ہنسنے کی آواز پیدا کر دی گئی، اسی طرح کتے کے اندر اس کے بھونکنے کی آواز پیدا کر دی جاتی ہے تو اس نے اس بچھڑے کی بھی ساخت ایسی بنائی کہ ہوا کے داخل اور خارج ہونے کے ساتھ اس کی بھی آواز نکلتی تھی۔

لیکن تھا وہ ایک جسم ہی، باقی تو اس میں کچھ تھا نہیں لیکن اس میں آواز گائے کی پیدا ہوگئی، جس وقت اس نے یہ کرشمہ بنا دیا تو ساتھ ہی اس نے نعرہ لگا دیا "هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰی" لیجیے یہی ہے تمہارا الٰہ اور یہی ہے موسیٰ کا الٰہ "فَنَسِیَ مُوْسٰی" موسیٰ تو بھول گئے جو طور پر ملاقات کے لیے چلے گئے، ساتھ یہ نعرہ بلند کر دیا اور قوم تو تھی ہی شرارتی، اس کو تو کوئی نہ کوئی شرارت چاہیئے تھی جس کے ساتھ ہنگامہ آرائی کریں، ساری کی ساری قوم ٹوٹ پڑی۔

حضرت ہارون علیہ السلام کا رد عمل:

حضرت ہارون علیہ السلام جو تھے وہ بے چارے شور مچاتے ہیں کہ اے میری قوم! یہ تو تم بھٹک گئے، یہ تم نے کیا کرلیا، انہوں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن آپ جانتے ہیں کہ ایسے وقت میں جب غنڈوں کا ریلہ ایک طرف کو چلتا ہے تو شریف آدمی اگر آگے سے سمجھانے کی کوشش کرے تو اس کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں۔ خاموش ہو جاؤ ورنہ ہم تجھے مار دیں گے، حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ کچھ لوگ ہوں گے، ساری قوم تو نہیں بھٹکی لیکن وہ اتنے نہیں تھے کہ قوت اور طاقت کے ساتھ اس فتنہ کو دبا لیتے، اب حضرت ہارون علیہ السلام کے سامنے دو راستے تھے یا تو حضرت ہارون علیہ السلام اس قوم سے علیحدگی اختیار کر لیتے اور جو چند لوگ ان کے ساتھ تھے حق کو سمجھنے والے وہ بھی ان

کے ساتھ مل جاتے اور یہ ان کو لے کر اس برادری سے بالکل ہی جدا ہو جاتے تو حسا برادری دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔

اور ایک طریقہ یہ تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام انکار کرتے رہیں سمجھاتے رہیں لیکن رہیں اندر ہی شامل آپس میں پارٹی بازی نہ ہونے دیں، یہ دو راستے تھے تو یہی مقام ہوا کرتا ہے کہ جس وقت کسی کام کرنے کے دو طریقے ہوں ایک آدمی کی عقل اس کو ترجیح دیتی ہے دوسرے آدمی کی عقل اس کو ترجیح دیتی ہے تو حضرت ہارون علیہ السلام نے یہی بہتر سمجھا کہ میرا چھوڑ کے جانا مناسب نہیں، اس طرح تو قوم دو حصوں میں بٹ جائے گی اور بہت زیادہ کام خراب ہو جائے گا، وہ انہی میں شامل رہے اور اپنی حد تک ان کو سمجھاتے رہے، قوم نہ مانی اتنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واپس آنے کا وقت آ گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی اور قوم سے خطاب:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہیں طور پر ہی دے دی تھی کہ تیری قوم کو پیچھے سامری نے بھٹکا دیا ہے اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام جب واپس آئے تو غصہ سے بھرے ہوئے اور بہت غمزدہ تھے، اور آتے ہی پہلے تو لوگوں کو خطاب کیا لیکن معلوم یوں ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو کچھ سمجھدار قسم کے تھے کہ جو ایک دفعہ قوم کا ریلہ آیا اس میں بہہ تو نکلے لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان کو حقیقت سمجھ میں آ گئی اور پچھتائے کہ یہ ہم سے غلطی ہوگئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے ان سمجھدار قسم کے لوگوں کو کہا کہ میرے بعد تم لوگ جانشین تھے، تم نے یہ کیا کر لیا میں تو اللہ تعالیٰ کے احکام لینے گیا تھا تا کہ تمہیں طریقہ عبادت سکھاؤں تم نے اللہ کا حکم آنے سے پہلے ہی اپنے لیے ایک طریقہ ایجاد کر لیا، تم بہت برے جانشین ثابت ہوئے، پہلے تو ان کو ڈانٹا، ان پر غصہ کا اظہار کیا۔

حضرت ہارون علیہ السلام پر غصہ کا اظہار:

لیکن سب سے زیادہ غصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت ہارون علیہ السلام پر آیا کیونکہ ذمہ دار ان کو ٹھہرا کر گئے تھے اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب ہونے کے باوجود اللہ کے نبی بھی تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس وقت دیکھا کہ قوم ساری کی ساری شرک میں مبتلا ہوگئی تو پیچھے یہ کس مرض کی دوا تھے، انہوں نے حالات کو کیوں کنٹرول نہیں کیا؟ اس لیے حضرت ہارون علیہ السلام جس وقت سامنے آئے، اب وہ تختیاں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں

تھیں جو وہاں سے لے کر آئے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام کو دیکھتے ہی جو غصہ چڑھا تو ہمیشہ قاعدہ ہے کہ جس وقت کوئی چیز ہاتھ میں ہوتی ہے اور غصہ میں آکر انسان دوسرے ہاتھ پر ڈالنا چاہے تو وہ اس کو جلدی سے ایک طرف رکھتا ہے تو دیکھنے والا کہتا ہے کہ پھینک دی تو نبی کسی صورت میں شرک برداشت نہیں کرسکتا، جس وقت یہ بات سامنے آئی کہ قوم شرک میں مبتلاء ہوگئی اور یہ خیال آیا کہ میں ہارون علیہ السلام کو پیچھے اصلاح کے لیے کہہ کے گیا تھا تو ہارون علیہ السلام نے قوم کو کیوں نہیں سنبھالا، شاید اس میں ہارون نے کوئی سستی کی ہے تو غصہ جو چڑھا تو جلدی سے الواح جو رکھیں تو ایسے معلوم ہوا جیسے "اَلْقَى الْاَلْوَاحَ" گویا کہ اپنے ہاتھ سے پھینک دیں، یہ جلدی سے رکھنے سے کنایہ ہے، ہاتھ خالی کرنے کے لیے جلدی سے جو رکھیں تو ایسے تھا گویا کہ ڈال دیں اور ایک ہاتھ حضرت ہارون علیہ السلام کے سر کو ڈالا اور دوسرا داڑھی کو ڈالا، اور لگے پکڑ کے گھسیٹنے اور زبان سے بھی تنبیہ کی کہ یہ کیا کیا؟ میں تجھے کیا کہہ کے گیا تھا کہ حالات کو سنبھال کے رکھنا، یہ کیا ہوگیا؟ تو حضرت ہارون علیہ السلام پر غصہ کا اظہار کیا۔

حضرت ہارون علیہ السلام کا عذر:

لیکن حضرت ہارون علیہ السلام تو اپنی جگہ معذور تھے، انہوں نے تو اپنی وسعت کے مطابق کوشش کی تھی اس لیے وہ آگے سے ادب سے جواب دیتے ہیں، اگرچہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی تھے لیکن امورِ نبوت میں یہ تابع تھے تو یہ گرفت جوان پر ہورہی ہے یہ ایسی گرفت ہے جو تابع پر کی جاتی ہے تو وہ آگے سے ادب کے ساتھ جواب دیتے ہیں اور یہ نہیں کہا یا اخی! بلکہ کہا اے میرے ماں جائے، ماں کی طرف نسبت کی کیونکہ ماں مرکزِ محبت ہوتی ہے تو اس میں محبت و شفقت زیادہ نمایاں ہے، یہ نہیں کہ باپ ان کے مختلف تھے، ایسی بات نہیں، باپ بھی ایک ہی تھا لیکن نسبت ماں کی طرف کی، اے میری ماں کے بیٹے! میری داڑھی کو اور میرے سر کو نہ پکڑ، اس طرح اگر تو کرے گا تو دشمن دیکھ دیکھ کے خوش ہوں گے کہ دیکھو! شرارت ہم نے کی تھی رگڑا ہارون کو لگ گیا، تو مجھے اپنے برتاؤ کے ساتھ عملاً ظالموں میں شامل نہ کر۔

اصل بات یہ ہے کہ جس وقت قوم میں بگاڑ پیدا ہوا میں نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن میرے اندر اتنی قوت اور طاقت رہی نہیں کہ میں ان کا مقابلہ کرتا، انہوں نے مجھے کمزور سمجھا اور میں زیادہ رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا تو اندیشہ تھا کہ مجھے قتل ہی کردیتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت جو

تیرے ساتھ ملنے والے تھے تو ان کو ساتھ لے کر میرے پاس کیوں نہیں آ گیا تو ان کے اندر شامل کیوں رہا؟ تو حضرت ہارون علیہ السلام جواب دیتے ہیں کہ میں یہ سمجھا کہ اگر میں نے ایسا کر لیا تو تو کہے گا کہ قوم میں پھوٹ ڈال دی، تو یہیں ٹھہرا رہتا میں آ کے خود سنبھال لیتا، دیکھو: وہی ذوق کا اختلاف آ گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خیال تھا کہ تجھے چاہیے تھا کہ تو اپنے ساتھیوں کو لے کر میرے پیچھے آ جاتا وہ کہتے "اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ" میں اس بات سے ڈر گیا کہ تو کہے گا کہ بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی، حضرت ہارون علیہ السلام کا ذوق یہ تھا اور انہوں یہ عذر بیان کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا:

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے حضرت ہارون علیہ السلام کا عذر اچھی طرح سے واضح ہو گیا تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لیے بھی دعا کی اور اپنے بھائی کے لیے بھی دعا کی کہ اے اللہ! اگر مجھ سے کوئی کمی بیشی ہو گئی تو مجھے بھی بخش دے اور میرے بھائی سے اگر کسی قسم کی کوئی کم بیشی ہوئی ہے تو اس کو بھی بخش دے اور تو ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر، ہمیں اپنی رحمت سے محروم نہ کرنا، اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ

بے شک وہ لوگ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنایا انہیں غضب ضرور پہنچے گا

رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾

ان کے رب کی طرف سے اور ذلت دنیوی زندگی میں، اور ایسا ہی ہم بدلہ دیا کرتے ہیں جھوٹ گھڑنے والوں کو ﴿۱۵۲﴾

وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوا

اور وہ لوگ جو برا کام کر لیتے ہیں پھر اس کے بعد توبہ کر لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں

إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ

بے شک تیرا رب ان کی توبہ کے بعد البتہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۵۳﴾ اور جب زائل ہوا

مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى

موسیٰ سے غصہ تو انہوں نے تختیاں اٹھالیں اور ان کے مضامین میں ہدایت

وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿١٥٤﴾ وَاخْتَارَ مُوسَى

اور رحمت تھی ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ﴿۱۵۴﴾ اور موسیٰ نے منتخب کیے

قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا ۚ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ

اپنی قوم میں سے ستر آدمی ہمارے متعین وقت کے لیے پس جب ان کو زلزلہ نے پکڑلیا تو موسیٰ نے کہا اے میرے

رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَإِيَّايَ ۖ أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ

رب! اگر تو چاہتا تو ہلاک کر دیتا اس سے قبل انہیں بھی اور مجھے بھی کیا تو ہلاک کرتا ہے ہمیں بسبب اس کام کے جو کیا ہے

السُّفَهَاءُ مِنَّا ۖ إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ ۖ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ

ہم میں سے نادانوں نے، نہیں ہے یہ واقعہ مگر تیری آزمائش، گمراہ کرتا ہے تو اس کے ذریعہ سے جس کو چاہتا ہے

وَتَهْدِي مَنْ تَشَاءُ ۖ أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ

اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، تو ہمارا کارساز ہے پس تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو بہترین

الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ

بخشنے والا ہے ﴿۱۵۵﴾ اور لکھ دے تو ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی اور آخرت میں

اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ

بے شک ہم نے تیری طرف رجوع کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں عذاب پہنچاتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت

وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

ہر چیز سے وسیع ہے، پس میں ضرور لکھوں گا اس رحمت کو ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ

اور جو لوگ ہماری آیات کے ساتھ ایمان لاتے ہیں ﴿۱۵۶﴾ جو اتباع کریں گے رسول کی

النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ

جو نبی ہے امی ہے۔ جس کو پاتے ہیں وہ اپنے پاس لکھا ہوا توراۃ

وَالْاِنْجِيْلِ ؗ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ

اور انجیل میں حکم دیتا ہے وہ انہیں بھلائی کا اور روکتا ہے منکر سے،

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ

اور حلال کرتا ہے ان کے لیے پاکیزہ چیزیں اور حرام ٹھہراتا ہے ان کے اوپر گندی چیزوں کو اور گراتا ہے ان سے

اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ

ان کے بوجھ کو اور ان کے طوقوں کو جو ان کے اوپر پڑے ہوئے ہیں پس وہ لوگ جو اس نبی کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور اس کی تعظیم کرتے ہیں

وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ ع

اور اس کی مدد کرتے ہیں اور اتباع کرتے ہیں اس نور کی جو اتارا گیا اس کے ساتھ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿۱۵۷﴾

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ

آپ اعلان کردیں اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف ایسے اللہ کا جس کے لیے

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا

سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہی زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے پس تم ایمان لے آؤ

بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ

اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ جو نبی امی ہے جو خود بھی اللہ پر ایمان لاتا ہے اور اس کے احکام پر ایمان لاتا ہے

وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ

اے لوگو! تم اس نبی کی اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ ﴿۱۵۸﴾ موسیٰ کی قوم سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق کے ساتھ ہدایت کرتی ہے

بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۭ

اور حق کے ساتھ انصاف کرتی ہے ﴿۱۵۹﴾ ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا بارہ خاندان مختلف جماعتیں

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی جس وقت اس سے اس کی قوم نے پانی مانگا کہ اپنی لاٹھی کے ساتھ مار

الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ

پتھر کو پس پھوٹ پڑے اس پتھر سے بارہ چشمے، جان لیا سب لوگوں نے

مَّشْرَبَهُمْ ۭ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ

اپنی پانی پینے کی جگہ کو اور سائبان بنا دیا ہم نے ان کے اوپر بادل کو اور اتارا ہم نے ان کے اوپر من

وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا

و سلویٰ، کہا ہم نے کہ کھاؤ تم ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں ان لوگوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ کرتے تھے

اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا

اپنے نفسوں پر ہی ظلم ﴿۱۶۰﴾ اور جب انہیں کہا گیا کہ سکونت اختیار کرو اس بستی میں اور کھاؤ بیو

مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ

اس بستی سے جہاں بھی تم چاہو اور حطۃ کہتے جاؤ اور دروازے میں جھکتے ہوئے جاؤ تو معاف کر دیں گے

لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۚ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ

ہم تمہارے گناہ اور اچھے کام کرنے والوں کو زیادہ اجر وثواب دیں گے ﴿۱۶۱﴾ پھر بدل دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا

قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ

ان میں سے قول سوائے اس قول کے جو ان سے کہا گیا تھا پھر اتار دیا ہم نے ان کے اوپر عذاب آسمان سے

بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ ع

بسبب اس کے کہ وہ ظلم کرتے تھے ﴿۱۶۲﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

اس نویں رکوع کی ابتدائی آیات اسی واقعہ سے متعلق ہیں جس کا ذکر آپ کے سامنے پچھلے رکوع میں آیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تشریف لے جانے کے بعد قوم نے بچھڑا اپنا لیا تھا اور اس بچھڑے کی پوجا میں لگ گئے تو اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت کے اندر تو ان کی مذمت کی ہے۔

بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کا انجام:

"اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ" کہ جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ان کو ان کے رب کی طرف سے غضب پہنچے گا اور دنیوی زندگی میں ذلت پہنچے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بنے اور دنیا کے اندر وہ ذلیل ہوئے، جنہوں نے توبہ نہیں کی اور اڑے رہے وہ بھی مقتول ہو گئے ارتداد کی وجہ سے اور جنہوں نے توبہ کی تھی ان کی توبہ کی قبولیت کے لیے بھی شرط ہو گئی کہ انہیں قتل کیا جائے، یہ قتل جو تھا یہ قبولیت توبہ کے طور پر تھا، جس طرح ہمارے ہاں بھی بعض گناہ ایسے ہیں کہ جن میں صرف زبان سے توبہ کرنی کافی نہیں ہوتی بلکہ ساتھ جان کی بازی بھی لگانی پڑتی ہے، فقہ کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص زنا کرتا ہوا پکڑا جائے اور شہادت ہو جائے اور ہو بھی وہ شادی شدہ اب اس کے لیے صرف زبان سے توبہ نہیں ہے اس کو اپنی جان بھی پیش کرنی پڑتی ہے اور حد اس کے اوپر ایسی لگے گی کہ اس کو پتھر مار مار کے مار دیں گے یہ اس کی قبولیت توبہ ہے،

اور اسی طرح قاتل عمد کہ اگر ایک آدمی دوسرے کو جان بوجھ کر قتل کردے اور پکڑا جائے، شہادت قائم ہو جائے تو اب اس کا صرف توبہ کر لینا کافی نہیں بلکہ اس توبہ کی تکمیل کے طور پر اس کو قتل بھی کیا جاتا ہے، تو اسی طرح جن لوگوں نے یہ بچھڑا پوجا تھا ان کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے قبولیت توبہ کے لیے یہ شرط ہوئی کہ جنہوں نے نہیں پوجا وہ پوجا کرنے والوں کو قتل کریں اور جو مقتول ہوئے ان میں جو شرمسار ہو گئے تھے، جنہوں نے صحیح طور پر توبہ کی تھی ان کا گناہ معاف ہو جائے گا اور جو اس پر اڑے رہے وہ مرتد ہونے کی حیثیت سے قتل ہو گئے، اور ان کی برائی جو ہوئی، مذمت جو ہوئی یہ سب ذلت ہے جو دنیوی زندگی میں پہنچی، اللہ کے غضب کا نشانہ بنے۔

"وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ" یہاں لفظ آیا "مفترین" کا، تو "مفترین" افتراء سے لیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ واقعہ نہ ہو اور بات بنالی جائے جس کو جھوٹ گھڑنا کہتے ہیں، بہتان لگانا کہتے ہیں، بہتان لگانے والوں کو ہم بدلہ ایسے ہی دیا کرتے ہیں یہاں سے خاص طور پر افتراء علی اللہ مراد ہے کہ اللہ نے بات کہی نہ ہو اور اس کی طرف منسوب کردی جائے، یہ جو اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں، اس قسم کے جھوٹ بناتے ہیں ہم انہیں ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں کیا مطلب؟ یعنی غضب اور دنیوی زندگی میں ذلت اور آخرت میں عذاب یہاں افتراء کا اعلیٰ مصداق ہے جو انہوں نے ایک "عجل" کو الٰہ بنالیا ورنہ آگے مفترین کا لفظ جو بولا گیا ہے یہ عام ہے جو بھی افتراء کرے گا ہم اس کو ایسے ہی بدلہ دیں گے۔

بدعت کی ایجاد بھی افتراء علی اللہ میں شامل ہے:

اور اس افتراء کا ایک فرد بدعت کی ایجاد بھی ہے، بدعت کی ایجاد بھی افتراء علی اللہ ہے کیونکہ بدعت کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ یہ کام اللہ کو پسندیدہ ہے اور اللہ اس کے اوپر ثواب دے گا لیکن اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کا پتہ کہاں سے چلتا ہے؟ یا اس کی کتاب سے یا اس کے رسول سے، نہ کتاب میں کوئی ایسی عبارت آئی جس سے "عبارۃ النص" کے طور پر "اشارۃ النص" کے طور پر، "اقتضاء النص" کے طور پر "دلالۃ النص" کے طور پر استدلال کر کے اس کو ثابت کیا جا سکے کہ دیکھو! کتاب کا منشاء یہ ہے کہ یوں کام کیا جائے، جو بھی استدلال کے طریقے ہیں ان میں سے کسی طریقہ سے ثابت نہ ہو، اور نہ ہی اس کام کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے کیا کہ اللہ تعالیٰ کی منشاء یہ ہے، نہ رسول اللہ ﷺ کے قول سے ثابت، نہ رسول اللہ ﷺ کے فعل سے ثابت اور قول کے اندر یہ بات بھی

آجاتی ہے "عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ" اورقول کے اندر یہ بات بھی آجاتی ہے "اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ" نہ آپ ﷺ نے صراحتاً فرمایا نہ کیا اور نہ آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے سیکھ کر یہ بات کی اس لیے قول صحابی اور فعل صحابی یہ بھی کسی کام کے مسنون اور اچھے ہونے کی دلیل ہے، اور پھر سرور کائنات ﷺ کے اقوال وافعال سے بھی استدلال واستنباط جیسے فقہاء کرتے ہیں ان میں سے کسی استدلال کے ذریعہ سے بھی کسی کام کا اچھا ہونا ثابت نہیں ہوتا تو پھر پتہ کیسے چل گیا کہ یہ کام اللہ کو پسند ہے؟ شریعت کے کسی اصول سے نہیں نکلتا، کسی استدلال کے ساتھ یہ ثابت نہیں، نہ قرآن سے، نہ حدیث سے، نہ اقوال صحابہ سے کیونکہ اقوال صحابہ بھی حقیقت میں حضور ﷺ سے منظور شدہ ہیں جیسا کہ سنت خلفاء کا ذکر آگیا اور صحابہ کی اتباع کا ذکر آگیا "مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ" کے اندر صحابہ کے طریقہ کار کو بھی رجسٹرڈ کر دیا گیا کہ یہ بھی پسندیدہ چیز ہے، اب ان میں سے جو طریقہ آپ کے سامنے آئے گا اس کو تو ہم اللہ کا پسندیدہ کہہ سکتے ہیں اس کی گارنٹی ہے، سند اس کی موجود ہے۔

لیکن ایک چیز کو اللہ نے، اللہ کے رسول نے، صحابہ نے دین قرار نہیں دیا اور ایک آدمی کہتا ہے کہ یہ بھی دین ہے اور یہ بھی اللہ کا پسندیدہ ہے تو یہ بھی افتراء علی اللہ ہے اور اس افتراء علی اللہ کے نتیجہ میں ثواب حاصل نہیں ہوگا اس کے نتیجہ میں اللہ کا غضب اور ذلت تو آسکتی ہے اس لیے بدعت ظاہری طور پر کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو وہ ایسے ہی ہے جیسے بچھڑا پوج لیا چاہے وہ سونے کا ہی ہو، یہ نہیں کہ یہ گوشت اور خون والا بچھڑا پوجنا گناہ ہے ایسی بات نہیں، بلکہ اگر سونے کا بنا کے پوج لو تو بھی وہی بات ہے اسی طرح بدعت ظاہری طور پر کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ بنا لیں، وہ سونے کا بچھڑا ہے اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا غضب اور ذلت تو آسکتی ہے اس کے اوپر ثواب نہیں ملے گا اس لیے اس بات میں پھونک پھونک کے قدم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ انسان دین اسے ہی کہے جس کا دین ہونا کتاب وسنت سے ثابت ہو اور جس کا دین ہونا کتاب وسنت سے ثابت نہ ہو اسے انسان دین نہ کہے، جو چیز کتاب وسنت سے ثابت نہ ہو اسے دین کہنا افتراء علی اللہ ہے۔

تو "کَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ" کے اندر سب افتراء کرنے والے درجہ بدرجہ شامل ہیں، یہ بہت بڑا افتراء تھا کہ ایک بچھڑے کو الٰہ بنا لیا، اور اسی طرح درجہ بدرجہ جس قسم کے کام ہوں گے اسی قسم کا افتراء ہے اور اسی قسم کا غضب اور ذلت اللہ کی طرف سے آئے گی یعنی بات وہی کہو جو واقعہ کے مطابق ہے اور جو واقعہ کے مطابق نہیں ہے اس کو کیوں کہتے ہو؟ یہ افتراء ہے۔

اللہ تعالیٰ کا انعام:

لیکن آگے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا یہ اس کی مہربانی ہے کہہ دیا کہ جو لوگ برے کام کر لیتے ہیں چاہے کچھ ہی ہو کوئی کافر ہے، بت پرست ہے، آتش پرست ہے، تو بھی اس کے باز آنے کی گنجائش باقی ہے، ہماری یہ درگاہ ناامیدی کی جگہ نہیں ہے "وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ" جو لوگ برے کام کرتے ہیں "ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِهَا" پھر ان برے کاموں کے بعد توبہ کر لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں یعنی ایمان میں کمال پیدا کر لیتے ہیں کیونکہ برا عمل ایمان کو ناقص کر دیتا ہے اور توبہ کی جائے، نیک کام کیے جائیں تو ایمان کامل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس توبہ کے بعد غفور رحیم ہے، جس میں بتا دیا کہ چاہے عجل پرستی ہو لیکن توبہ کر لیجیے تو توبہ اللہ قبول فرما لیتے ہیں، رحم فرما دیتے ہیں، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد قوم توبہ تائب ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہوا، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ تختیاں جو لے کر آئے تھے وہ اٹھائیں اور ان کے مضمون کے اندر ہدایت و رحمت تھی ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، اللہ سے ڈرنے والوں کا ذکر اس لیے کر دیا کہ فائدہ یہی اٹھاتے ہیں۔

قوم موسیٰ کے ستر نمائندوں کا واقعہ:

اب آگے جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا اور اللہ تعالیٰ کے وقت معینہ پر ان کو لے گئے اس واقعہ کا حاصل دو طرح سے ذکر کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے تو یوں ذکر کیا کہ اگر چہ قوم نے توبہ کر لی تھی اور یہ معاملہ سمٹ گیا تھا لیکن پھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کے ستر نمائندے لیے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے ایک وقت طے کر لیا کہ یہ فلاں وقت میں آئیں گے اور ساری قوم کی طرف سے تیرے سامنے آ کر خصوصیت کے ساتھ پھر توبہ و استغفار کریں گے یعنی اس عجل پرستی کی قوم کی طرف سے معافی مانگیں گے یہ نمائندے تھے جو قوم کی طرف سے خصوصیت کے ساتھ معافی مانگنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی دربار میں جا رہے تھے، عمومی توبہ و استغفار تو ہو ہی گیا تھا، یہ ستر آدمیوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام منتخب کر کے کسی وقت متعین پر جو اللہ کی طرف سے طے ہوا تھا اس میں یہ گئے، جب وہاں گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر اپنے جلال کا اظہار فرمایا تا کہ یہ قوم کو بتا دیں کہ اللہ تعالیٰ کا جلال اس قسم کا ہے، جلال اس طرح ہوا کہ نیچے سے زلزلہ آیا، اوپر سے کڑک ہوئی تو یہ ستر کے ستر دہشت زدہ ہو کے ایسے ہو گئے جیسے نیم مردہ ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ منظر دیکھا، منظر دیکھنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے جیسے انبیاء علیہم السلام کی شان ہوتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ان کے لیے گڑگڑائے کہ یا اللہ! اگر تو نے ان کو ہلاک کرنا ہوتا تو یہاں آنے سے پہلے ہی اس جرم میں ہلاک کر دیتا جو جرم یہ کر بیٹھے تھے لیکن جب تو نے وہاں ہلاک نہیں کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو جو یہاں بلایا گیا اور رلایا گیا ہے تو ان کو ہلاک کرنا مقصود نہیں ہے، یہ تو تیری ایک آزمائش ہے کہ کون اس آزمائش سے سبق حاصل کرتا ہے، تیرے جلال کو دیکھ کے آئندہ تجھ سے ڈرتا رہتا ہے اور کون اس قسم کے واقعات میں شکوہ شکایت اختیار کر لیتا ہے، میں اپنے لیے بھی اور ان سب کے لیے بھی تجھ سے مغفرت مانگتا ہوں تو سب کو معاف کر دے اور ہم سب کے لیے دنیا و آخرت میں بھلائی لکھ دے، بعض مفسرین نے تو ان آیات کی ترتیب اس طرح ذکر کی ہے گویا کہ بچھڑے کو لوگوں نے پوج لیا تھا اور پھر عمومی تحریک کے طور پر توبہ بھی ہوگئی بعض لوگ قتل ہوگئے اور باقی جو بچے تھے ان کی طرف سے بطور نمائندگی کے اللہ کے سامنے یہ ستر آدمی گئے تھے تاکہ مزید اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کے رو دھولیں اور اپنی قوم کی طرف سے معافی مانگ لیں اور وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال کا اظہار فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو ان کے ساتھ شامل کر کے سب کے لیے مغفرت مانگی، رحمت مانگی، دنیا و آخرت میں "حسنۃ" مانگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیاں توراۃ و انجیل میں:

جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ٹھیک ہے میرا عذاب تو اسی کو پہنچتا ہے جس کو میں چاہتا ہوں، رحمت میری بہت عام ہے اور میں ایسے لوگوں کے لیے لکھتا ہوں اور یہاں سے پھر کلام منتقل ہوگئی کہ ایسے لوگوں کا مصداق نزول قرآن کے وقت میں وہ لوگ ہیں جو اس رسول نبی امی کو مانیں گے، یہ گویا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کلام سے کلام منتقل ہوگئی موجودہ زمانہ کی طرف کہ جب یہ آیت آئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعا کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ میں رحمت لکھوں گا اور ایسے لوگوں کے لیے لکھوں گا یہ تو واقعہ بیان ہوتا آرہا ہے، ساتھ ہی قرآن کریم نے وضاحت کر دی کہ اس دور میں یہ لوگ کون ہیں جن کے لیے رحمت لکھی جائے گی اور "هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ" کا مصداق کون لوگ ہیں؟ ساتھ ہی تفصیل بتا دی کہ آج اس گروہ کا مصداق وہ لوگ ہیں جو اس موجودہ نبی کو مانیں گے اور یہ موجودہ نبی بھی کوئی معمولی نہیں، توراۃ انجیل میں لکھا ہوا ان لوگوں کے پاس موجود ہے، کتنے بڑے چیلنج اور کتنی بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات کہہ دی گئی اور اس وقت یہود و نصاریٰ نے کوئی آواز بلند نہیں کی کہ یہ بات غلط ہے،

ہمارے پاس توراۃ وانجیل میں کچھ لکھا ہوا نہیں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ وانجیل کے اندراتنی واضح پیش گوئیاں تھیں کہ اگر دیانت کے ساتھ وہ لوگ اس پر نظر ڈالتے تو"یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ" کا مصداق تھے، اس نبی کو ایسے پہچانتے تھے جیسے اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں یہ علامت ہے اس بات کی کہ اس وقت بہت پیش گوئیاں موجود تھیں۔

اور اسی آیت پر ہمارے سب علماء نے لکھا ہے کہ تحریف در تحریف ہونے کے باوجود توراۃ وانجیل میں آج بھی اس قسم کی پیش گوئیاں موجود ہیں کہ جن کا مصداق سوائے سرور کائنات ﷺ کے کسی کو نہیں بنایا جاسکتا اس لیے جب کبھی مناظرہ ، مباحثہ ہوتا ہے تو علماء کرام یہ چیزیں سامنے لاتے ہیں اور پھر سرور کائنات ﷺ کا تذکرہ کر کے عمومی دعوت چلادی گئی کہ آپ اعلان فرمادیں کہ میں تم سب کی طرف رسول بن کر آیا ہوں اس اللہ کی طرف سے آیا ہوں جو زمین وآسمان کا بادشاہ ہے اس لیے اب اگر نجات چاہتے ہو تو میری اتباع کروگے تو ہدایت یافتہ کہلاؤ گے ورنہ تم ہدایت یافتہ نہیں ہو، تو مضمون کی روش اس طرح ہوگئی۔

قوم موسیٰ کے ستر نمائندوں کا دوسرا واقعہ:

اور بعض مفسرین نے اس ستر آدمیوں والے واقعہ کو اس طرح بیان کیا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توراۃ قوم کے سامنے پیش کی تو قوم نے اسی طرح اڑیاں کرنی شروع کردیں جیسے ان کی فطرت تھی کہنے لگے ہم تو اس وقت تک نہیں مانیں گے جس وقت تک کہ اللہ ہمیں خود نہ کہہ دے کہ یہ میرے احکام ہیں ان کو مانو، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ٹھیک ہے اپنی قوم میں سے ستر نمائندے لے آنا میں ان کے سامنے کہہ دوں گا، تو یہ ستر آدمی جس وقت وہاں گئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی ان لوگوں نے سنی تو یہ وہاں اور اڑی کرنے لگ گئے کہ ہمیں کیا پتہ کون بول رہا ہے؟"اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً" ہمیں تو کھلم کھلا دکھا تب ہم یقین کریں گے تو ایسے موقع پر پھر ان کے اوپر کڑک آئی اور اس گستاخی کے نتیجہ میں ان سب کو وہاں ڈھیر کردیا گیا۔

تب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے سامنے گڑگڑائے کہ یا اللہ! ان کو یہاں لا کے ماردینا تو ایسے ہے جیسے میں بھی مرگیا، مجھے قوم کہاں چھوڑے گی کہ ہمارے سرداروں کو لے گیا اور پتہ نہیں کہاں مار آیا ہے، یہ تو میری بھی ہلاکت ہے اور ان کی بھی ہلاکت ہے، اگر تو نے ان کو ہلاک کرنا تھا تو آج تک انہوں نے تھوڑی گستاخیاں کی ہیں تو ان کو

پہلے ہی ہلاک کر دیتا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک آزمائش ہے جس میں ان کو ڈالا گیا ہے، اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے جس کے نتیجہ میں ان کو پھر زندہ کر دیا گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کے واپس آ گئے اور آ کے انہوں نے قوم کے سامنے کہہ دیا تھا کہ واقعی یہ اللہ کی کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کو مانو لیکن پھر ساتھ تھوڑا سا شوشہ چھوڑ دیا کہ اللہ نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جو بات اس میں سے مشکل معلوم ہو اس پر عمل نہ کرنا، پھر جا کے اس قسم کی بات کہہ دی تھی۔

تو یہ دو واقعے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ بھی ہوا ہو اور یہ بھی ہوا ہو، اس میں کوئی بات نہیں کیونکہ آیات کی روش کی صحیح تفصیل تب ہی بنتی ہے کہ یہ واقعہ دو دفعہ پیش آیا ہو، پھر کوئی اشکال نہیں رہتا۔

"حسنۃ" کا مصداق:

"وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً" میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں "حسنۃ" مانگی ہے تو "حسنۃ" بھلائی کو کہتے ہیں، بھلائی کا مصداق سورۃ البقرۃ میں آپ کے سامنے "رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً" کے تحت ذکر کیا تھا کہ "حسنۃ" اصل میں اچھی حالت کو کہتے ہیں، اے اللہ! ہمیں دنیا میں اچھی حالت دے، اب اس اچھی حالت کا معیار کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی ہمیں ایسے حال میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے اور آخرت میں بھی ہمیں ایسے حال میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے، یہ مفہوم ہے اس آیت کا۔

تو اچھی حالت دنیا میں جو مانگی ہے تو اس میں دنیا نہیں مانگی، یہ بہت لوگوں کو مغالطہ ہے کہ دیکھو! قرآن کریم میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا بھی مانگو اور آخرت بھی مانگو، اور پھر اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ جیسے دین کے کام کیے جاتے ہیں تو ساتھ ساتھ دنیا کے گزارہ کے لیے بھی تو کچھ کرنا چاہیے دیکھو! اللہ تعالیٰ نے دنیا مانگنے کی بھی تلقین کی ہے یہ مفہوم بالکل غلط ہے، دنیا میں "حسنۃ" مانگی ہے "حسنۃ" کا معنی اچھی حالت، اچھی حالت میں کیا آ گیا، مفسرین نے جس طرح سے تعیین کی کہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ایسی حالت میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے، دنیا میں بھی ہمیں ایسے حال میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے، اور آخرت میں بھی ہمیں ایسے حال میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے تو اس کا مصداق ہے علم، عمل صالح، رزق حلال کا میسر آنا، صحت و عافیت کا

حاصل ہونا، فتنہ وفساد سے بچنا کہ ہم کسی فتنہ کے اندر نہ پڑیں، ایسے حالات ہم پر طاری نہ ہوں کہ جن حالات میں ہم تیری اطاعت اور فرمانبرداری نہ کریں، یہ ساری کی ساری باتیں اس "رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً" میں ہیں اور یہی حالت مطلوب ہے، مال کا ملنا اگر ہمارے لیے اچھا ہے تو ہمیں مال دے دے اور اگر مال کا نہ ملنا تیرے علم میں اچھا ہے تو ہمیں مال سے بچا، کسی بات کی تعیین کرنے کی ضرورت نہیں، اس میں یہ آ گیا کہ اے اللہ! ہمیں اس حال میں رکھ جو حال تیرے نزدیک پسندیدہ ہے، جس سے یہ مطلب بھی نکل آیا کہ ہمیں ایسی دنیا نہ دینا، ایسا مال نہ دینا، ایسا کاروبار نہ دینا، ایسی ملازمت نہ دینا جس کے نتیجہ میں ہم ایسی حالت میں مبتلاء ہو جائیں کہ جو تجھے پسند نہیں ہے ہم نماز سے محروم ہو جائیں، روزہ سے محروم ہو جائیں، زکوٰۃ سے محروم ہو جائیں اور دنیا کے دھندوں میں پھنس کے تجھے ناراض کر بیٹھیں اس سے گویا کہ پناہ مانگی گئی ہے اور ایسا حال مانگا گیا ہے جو تیرے نزدیک پسندیدہ اور اچھا ہے۔

جامع ترین دعا:

یہ بہت جامع دعا ہے اس لیے سرور کائنات ﷺ یہ دعا بہت پڑھا کرتے تھے اور طواف میں رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان جو جگہ ہے اس کے درمیان بھی اس دعا کو پڑھنے کی تلقین حدیث شریف میں آئی ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہاں فرشتے متعین ہیں جو شخص یہ دعا کرے، فرشتے اس کے اوپر آمین کہتے ہیں، اس دعا کی اتنی اہمیت بیان کی گئی ہے اور حج کے ایام میں ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو ذکر کیا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو یوں دعا کرتے ہیں "رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً" حج کے ضمن میں ہی اس کا ذکر آیا ہے، تو یہ بہت جامع دعا ہے اس کے اندر ہر وہ چیز آ جاتی ہے جو دنیا کے اندر انسان کے لیے مفید ہے اور ایسی مفید جس کا آخرت میں کوئی نقصان نہ ہو، اس دعا کے ضمن میں اللہ تعالیٰ سے ہر وہ چیز مانگی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں حسنۃ ہی حسنۃ ہو، بھلائی ہی بھلائی ہو، کوئی شر کا پہلو نہ ہو تو جس کے اندر علم نافع، عمل صالح، رزق حلال، صحت وعافیت، فرمانبردار نیک اور اچھی بیوی یہ بھی اس کا مصداق لکھا ہے اس لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ جو شخص یہ دعا کثرت کے ساتھ پڑھتا رہے تو اللہ تعالیٰ اسے بیوی نیک دیں گے کیونکہ نیک بیوی کا مل جانا گھر کے اندر بہت بڑی عافیت کا باعث ہے اور جہاں ہر وقت خاوند اور بیوی کی آپس میں لڑائی رہے وہاں کبھی امن اور سکون نہیں آ سکتا تو یہ مفہوم ہے اس کا کہ ہمیں اچھی حالت عطا فرما۔

تو اس سے یہ استدلال کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا مانگنے کی تلقین کی ہے یہ استدلال غلط ہے، دنیا میں "حسنۃ" مانگنے کی تلقین کی ہے کہ دنیا میں "حسنۃ" مانگو، "حسنۃ" سے مراد اچھی حالت ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں ایسے حال میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا پسندیدہ ہے کہ ہماری دنیا کی ضرورتیں پوری ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اطاعت اور عبادت سے محرومی نہ ہو، یہ حالت اچھی ہے ہر قسم کی خیر اس میں آ گئی، جس میں کوئی کسی قسم کا شر کا پہلو نہ ہو تو یہاں "حسنۃ" کا بھی یہی مصداق ہے۔

اصر واغلال کا مصداق:

"اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ" اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کلام ختم ہوگئی اور مضمون سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منتقل ہوگیا کہ اس دور میں جب یہ قرآن کریم اتر رہا ہے جب یہ واقعہ سنایا جا رہا ہے، یہ موجودہ یہودیوں سے کہا جا رہا ہے کہ آج یہ لوگ ہیں اس رحمت کے مستحق جو اتباع کرتے ہیں رسول نبی امی کی جس کو پاتے ہیں اپنے پاس لکھا ہوا تورات وانجیل میں اور اس کی یہ صفتیں ہیں کہ حکم دیتا ہے انہیں اچھی باتوں کا اور روکتا ہے بری باتوں سے، حلال کرتا ہے ان کے لیے پاکیزہ چیزیں اور حرام ٹھہراتا ہے ان کے اوپر خبیث چیزیں اور گراتا ہے ان سے ان کے اصر واغلال۔

اصر بوجھ اور اغلال طوق کو کہتے ہیں، اس کا کیا مصداق ہے؟ اصر واغلال کا مصداق یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر بہت مشکل مشکل احکام بھیجے تھے، جن احکام کے اندر یہ جکڑے ہوئے تھے ان کے مطابق عمل کرتے ہیں تو انتہائی مشقت ہے، نہیں عمل کرتے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں جوتے کھائیں گے تو یہ پابندیاں اور مشکل احکام کا جکڑاؤ جو تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آسان دین لے کر آئے اور آپ نے اس قسم کی سب پابندیاں ختم کر دیں یا تو اصر واغلال سے وہ مشکل احکام مراد ہیں کہ جو ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر نازل کیے تھے اور جن میں یہ جکڑے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوب ان کے اوپر تشدد تھا بعض طیبات ان کے اوپر حرام تھیں اور کچھ اور بھی مشکل مشکل احکام تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کے ان کو گرا دیا اور ختم کر دیا، یہ تو ایک نعمت ہے اس کی ان کو قدر کرنی چاہیے یہ اپنے اوپر اصر واغلال کیوں مسلط کیے بیٹھے ہیں، موجودہ نبی

کی شریعت کو مانیں اور اس اصر واغلال سے نجات حاصل کرلیں، یہ شان ہے اس نبی کی کہ یہ اس قوم کو اصر واغلال سے نجات دلاتا ہے۔

موجودہ دور کے رسم ورواج بھی اصر واغلال میں داخل ہیں:

لیکن اس کے ساتھ ہی اس اصر واغلال میں وسعت ہے، قوم جس وقت جہالت کی طرف جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ چھوڑ دیتی ہے تو اپنے اوپر خود اس قسم کی پابندیاں عائد کرلیتی ہے کہ جن پابندیوں سے جان چھڑانا اب ان کے بس کی بات نہیں ہوتی، خود عائد کردہ پابندیاں اس قسم کی ہوتی ہیں جو پہاڑ کی طرح بوجھ بن جاتی ہیں اور انسان ان پابندیوں میں اس طرح سے جکڑا جاتا ہے جیسے گلے میں طوق پڑا ہوا ہو اور ان سے نجات حاصل کرنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی، وہ پابندیاں ہیں اپنی قومی رسمیں اور اپنے بنائے ہوئے قاعدے اور طریقے، مثلاً جیسے آج ہماری قوم اور برادری بھی اس اصر واغلال میں مبتلاء ہے۔

ایک نکاح ہے، جو زندگی کی ضروریات میں شامل ہے، شریعت نے اس کی یہ حقیقت بتائی کہ لڑکا اور لڑکی دو آدمیوں کی موجودگی میں خود ایجاب وقبول کرلیں یا ان کے ورثاء ایجاب وقبول کرلیں نکاح ہوگیا، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ مہر ہو وہ بھی ادھار ہوسکتا ہے، نقد دینا ضروری نہیں، اور اس کی کم از کم مقدار یعنی جس پر گزارہ ہوسکتا ہے وہ دس درہم چاندی ہے جس کی مالیت ساڑھے تین تولہ چاندی بنتی ہے یہ ایک ضروری خرچہ ہے جو نقد دینا ضروری نہیں "نَكَحْتُ، قَبِلْتُ" کہو اور جاؤ گھر آباد کرلو، دس درہم چاندی ہے تو دے دو، نہیں ہے تو ذمہ لگ گیا، کتنی آسان شریعت ہے لیکن ہمارے رسم ورواج نے اس کو ہمارے لیے اصر واغلال بنادیا، ان شادیوں میں گھر اجڑ جاتے ہیں، منگنی سے جو سلسلہ شروع ہوتا ہے شادی تک پھر وہ جہیز کیا، برات کیا، برادری کی دعوتیں کیا، لینے دینے اتنے شروع ہوجاتے ہیں کہ اچھے بھلے لوگ ان شادیوں کے اندر آکے برباد ہوجاتے ہیں اور بعض اپنی لڑکیوں کو اس لیے نہیں بیاہ سکتے کہ ان کے پاس لڑکیوں کو جہیز دینے کی گنجائش نہیں ہوتی، تو یہ کتنا بڑا بوجھ اور اصر ہے جو قوم نے اپنے اوپر مسلط کرلیا ہے اب اس میں سے نکلنے کی کسی کے لیے کیا گنجائش ہے؟ تو اگر کوئی شخص اس قسم کی اصلاح کی تحریک اٹھاتا ہے تو وہ ایسے ہی ہوگا گویا کہ قوم کے سر سے اس اصر اور اغلال کو اتار رہا ہے اب اس کی بات مانو اور اس اصر واغلال سے نجات حاصل کرلو، تم تو ڈرتے ہو کہ اگر ہم نے اس کے خلاف کیا تو لوگ کیا کہیں گے اور ایک آدمی ذمہ داری لیتا

ہے کہ تم اس کو چھوڑ دو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

اور اسی طرح مرنے کے بعد ہے، بیاہ شادی بھی خاندان کے لیے ایک مصیبت ہے اور اگر کوئی بوڑھا مر گیا تو بھی وہ پیچھے گھر میں جھاڑو دے جاتا ہے، برادری کے ٹیکس، برادری کی روٹیاں اور ملاں ٹیکس مرنے کے بعد جو یہ ٹیکس عائد ہونے شروع ہوتے ہیں تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ آج کل غلہ مہنگا ہے یا گندم ملتی نہیں اللہ کرے گھر میں کوئی بوڑھا نہ مرے، مرنے کے ساتھ گھر سے ایک فرد کا بوجھ کم نہیں ہوتا بلکہ مرنے کے ساتھ پوری برادری کا بوجھ سر پر پڑ جاتا ہے یعنی برادری ٹیکس علیحدہ ہے، ملاں ٹیکس علیحدہ ہے، رسم ورواج علیحدہ ہیں کیا یہ اصر واغلال نہیں ہیں؟ تو اس نبی کی شریعت کو مانو تمام اصر واغلال سے جان چھوٹ جائے گی، سارے ٹیکس معاف ہو جائیں گے، گنجائش ہے تو ایصال ثواب کے لیے دو، اگر نہیں گنجائش تو چپ کر کے بیٹھ جاؤ کوئی تمہیں کہنے کے لیے نہیں آئے گا کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو، اور ایسے ہی گھروں میں دوسرے رسم ورواج ہیں، خاص طور پر بیاہ شادی اور موت کی رسموں نے قوم کی کمر ٹیڑھی کر رکھی ہے لیکن کسی عقلمند کو یہ ہوش نہیں آتی کہ ہم اس کو چھوڑنے کی کوئی تحریک چلائیں تو اب نبی کی تعلیمات کو اگر عام کیا جائے گا تو یوں سمجھو کہ اصر واغلال سے جان چھوٹ گئی ہے۔

اسی قسم کی رسوم، ان کے مشائخ اور پیروں نے یہود قوم پر مسلط کر رکھی تھیں کہ ان کی بھی کمر ٹوٹی پڑی تھی تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں اس نبی کو مانو سب بوجھ ہلکے ہو جائیں گے کسی رسم کی پابندی اور کوئی بوجھ نہیں ہے سب معاف ہے تو اصر واغلال کے اندر یہ سب باتیں شامل ہیں۔

پس جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائیں گے، اس کی تعظیم کریں گے اور اس کی مدد کریں گے اور اس نور کی اتباع کریں گے جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے اس نور سے مراد قرآن کریم ہے جو نبی کے ساتھ اتارا گیا ہے اس نور سے یہ کتاب اللہ مراد ہے، جو اس نور کی اتباع کریں گے یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، اس مضمون کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ سے پھر عمومی اعلان کرادیا گیا کہ آپ اعلان کر دیں کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، اس اللہ کا جس کے لیے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، حیات وموت اسی کے ہاتھ میں ہے، یہ خصوصی صفات میں سے ہے پس ایمان لے آؤ تم اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول نبی امی کے ساتھ جو ایمان لاتا ہے اللہ کے ساتھ اور اس کے احکام کے ساتھ اور اس کی اتباع کرو "لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ" تا کہ تم سیدھا راستہ پالو، جس سے معلوم ہو گیا کہ اے لوگو! اگر تم سیدھا راستہ پانا چاہتے ہو تو اب یہی ایک سیدھا راستہ ہے

کہ اس نبی کی اتباع کرو، اور اگر اس نبی کی اتباع نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اب آگے پھر وہی ماقبل سے متعلق مضمون آگیا جیسے قرآن کریم کی عادت ہے کہ اگر کسی قوم کی برائی کرتا ہے تو اس میں اگر کچھ افراد اچھے ہوتے ہیں تو ان کو ہمیشہ ممتاز کر لیا جاتا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کتنی ہی بگڑی ہوئی تھی لیکن ان میں سے ایک جماعت ایسی تھی جو حق کے ساتھ ہدایت کرتی رہی اور اسی کے مطابق انصاف کرتی رہی اور یہی لوگ تھے جب یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئے تو فوراً ایمان لے آئے۔

(اگلی آیات کا ترجمہ ہو چکا ہے اور واقعہ وہی ہے جو سورۃ البقرۃ میں گزر چکا ہے اس لیے تفصیل اس واقعہ کی وہاں دیکھ لی جائے)

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ

پوچھیے آپ ان سے اس بستی کے متعلق جو سمندر کے کنارے پر تھی

اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ

جبکہ تجاوز کرتے تھے وہ ہفتہ کے بارے میں جبکہ آتی تھیں ان کے پاس ان کی مچھلیاں ان کے ہفتہ کے دن

شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚۛ كَذٰلِكَ ۚۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا

تیرتی ہوئیں اور جس دن وہ ہفتہ کے دن میں نہیں ہوتے تھے تو وہ مچھلیاں نہیں آتی تھیں ایسے ہی ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے ہیں بسبب اس کے کہ

يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ

وہ نافرمان تھے ﴿۱۶۳﴾ اور جب کہا ان میں سے ایک جماعت نے کیوں تم نصیحت کرتے ہو ایسے لوگوں کو کہ اللہ

مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ

ان کو ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں عذاب دینے والا ہے سخت عذاب انہوں نے کہا تمہارے رب کی طرف معذرت کے طور پر اور تا کہ یہ لوگ

وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ

تقویٰ اختیار کر لیں ﴿۱۶۴﴾ جب وہ لوگ بھول گئے ان باتوں کو جن کے ساتھ ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو نجات دی ہم نے ان لوگوں کو جو روکتے تھے

عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَىِٕيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا

برائی سے اور پکڑ لیا ہم نے ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا سخت عذاب کے ساتھ بسبب اس کے کہ

يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً

وہ فسق کرتے تھے ﴿۱۶۵﴾ پھر جب وہ سرکش ہو گئے اس کام سے جس سے ان کو روکا جا رہا تھا تو ہم نے کہہ دیا انہیں کہ ہو جاؤ تم بندر

خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾

ذلیل ﴿۱۶۶﴾

تفسیر:

پرانی تاریخ دوہرانے کا مقصد:

پیچھے سے سلسلہ چلا آرہا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے واقعات کا اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو یہود موجود تھے ان کے سامنے ان کے بڑوں کی تاریخ دوہرائی جارہی ہے۔

یہ واقعہ جو ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے اس کا اجمالی ذکر پہلے آپ کے سامنے سورۃ البقرۃ میں ہو چکا ہے "وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ" کے ضمن میں "لقد علمتم" کتنی پختگی کے ساتھ کہا جارہا ہے، قرآن کریم کے مخاطب جو اس وقت کے یہودی تھے ان کو کتنی پختگی کے ساتھ کہا جارہا ہے کہ تم ان لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے ہفتہ کے دن کے بارے میں تجاوز کیا تھا اور ہم نے کہہ دیا تھا کہ ذلیل بندر بن جاؤ اتنی پختگی کے ساتھ قرآن کریم نے اس کو ذکر کیا اور اس وقت کے یہودیوں نے آگے سے کوئی اعتراض نہیں کیا کہ آپ غلط کہتے ہیں ہماری تاریخ میں تو ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک یہ واقعہ بالکل شہرت کے درجہ تک تھا اور یہود اپنے قومی واقعات کے طور پر اس واقعہ کو جانتے اور پہچانتے تھے۔

قرآن کریم نے انہیں تنبیہ کی ہے کہ پتہ ہے ان کا کیا حال ہوا تھا جنہوں نے حیلے بہانے کر کے اللہ کے حکم کو باطل کرنا چاہا تھا اس واقعہ کو یاد رکھو وہ تمہارے لیے عبرت ہے اگر آج بھی تم اللہ تعالیٰ کے احکام کو اسی طرح ٹھکراؤ گے یا اسی طرح باطل کرنے کی کوشش کرو گے تو جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اس وقت ان کو بندر بنا سکتی ہے وہی اللہ کی قدرت آج بھی موجود ہے اور تم بھی اسی طرح اللہ کی گرفت میں آسکتے ہو، واقعہ یاد کرانے کا مطلب یہ ہوتا ہے۔

جیسے آپ حضرات کو نصیحت کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ تمہیں پتہ ہے فلاں شخص نے ایسے کیا تھا اس کا کیا انجام ہوا؟ یہ یاد دلانا بطور تنبیہ کے ہوتا ہے تو وہاں یہ اجمالاً مذکور تھا اور یہاں اس واقعہ کی تفصیل ہے۔

"الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ" کا مصداق:

"وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ" یہ قریہ کونسی تھی؟ عام طور پر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس قریہ کا نام ایلہ ہے، اب آپ کے سامنے وہ جغرافیائی نقشہ نہیں ورنہ میں آپ کو دکھاتا کہ مشرق وسطیٰ کے درمیان میں ایک سمندر کی شاخ ہے جس کو خلیج عقبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ جدہ کی جو بندرگاہ ہے یہ اسی خلیج میں ہے، اور اس کے بعد ینبوع بندرگاہ ہے

وہ بھی اسی خلیج میں ہے، اور اس سے آگے اردن کا علاقہ آجاتا ہے تو اردن کی بندرگارہ بھی اسی خلیج میں ہے اور اس کے بعد اسرائیل کی حدود شروع ہوتی ہے تو آج بھی اس شاخ میں جو اسرائیل کی بندرگاہ ہے اس کا نام ایلات ہے، اسرائیل کی بندرگاہ ایلات اسی خلیج عقبہ میں ہے، عام طور پر مفسرین کا رجحان یہی ہے کہ یہی بستی ایلہ ہے اس وقت یہ ایلہ کہلاتی تھی اور آج اس کا نام ایلات ہے یہاں وہ یہودی سمندر کے کنارے پر آباد تھے جن کو یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

اور ان کا زمانہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کے قریب ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے یہ حامل تھے کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوئے ہیں اور ان کی شریعت وہی تھی جو توراۃ کی ہے اور توراۃ میں ہفتہ کے دن کو معظم قرار دیا ہوا تھا کہ ہفتہ کے دن نہ وہ کاروبار کرسکتے تھے اور نہ ہی شکار کرسکتے تھے، کوئی کام نہیں کرسکتے تھے وہ دن ان کی عبادت کا دن تھا سارا دن کوئی کام نہیں کرسکتے تھے۔

توراۃ وانجیل کے مقابلہ میں شریعتِ محمدیہ میں آسانی:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری شریعت میں جو آسانیاں فرمائی ہیں توراۃ کی شریعت کے مقابلہ میں ان میں سے ایک آسانی یہ بھی ہے کہ یہودیوں کے لیے ایک دن تھا ہفتہ، وہ ان کو سارے کا سارا فارغ رکھنا پڑتا تھا، اس دن سوائے عبادت کے کوئی کام نہیں کرسکتے تھے، عیسائیوں کے لیے دن متعین ہوا اتوار، وہ بھی ان کو سارے کا سارا فارغ رکھنا پڑتا تھا، وہ اس دن کوئی کاروبار نہیں کرسکتے تھے، وہ بھی عبادت کا دن تھا اور مسلمانوں کے لیے جمعہ کا دن متعین ہوا جس کی تعظیم باقی دنوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے لیکن ہماری شریعت میں یہ پابندی نہیں کہ جمعہ کے دن کو بالکل ہی فارغ رکھو کہ جمعرات کے غروب آفتاب سے لے کر جمعہ کے غروب آفتاب تک تمہیں کوئی کاروبار کرنے کی اجازت نہیں، تمہیں کوئی شکار کرنے کی اجازت نہیں، ایسی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے آسانی فرمادی "اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ" کہ جمعہ کی آذان ہوجائے تو پھر اللہ کے ذکر کی طرف بھاگ کے آیا کرو اور خرید وفروخت چھوڑ دیا کرو، خرید وفروخت کا ذکر اتفاقی ہے، ورنہ جس کام میں بھی انسان لگا ہوا ہو جمعہ کی آذان کے بعد اس کو چھوڑنا ضروری ہے، سوائے نماز کی تیاری کے جمعہ کی اذان سن لینے کے بعد ہر کام حرام ہے خاص طور پر طالب علموں کو یہ مسئلہ بھولا ہوا ہے۔

جمعہ کے بارے ایک عمومی گمراہی:

اور اس مجموعی گمراہی کے اندر قوم کو ڈالنے والے ہمارے خطباء ہیں کیونکہ اذان تو ہوجاتی ہے ساڑھے بارہ

بجے اور جمعہ ہونا ہوتا ہے ساڑھے تین بجے اور گرمیوں میں جو مصیبت کا مارا اذان سنتے ہی جا کے مسجد میں بیٹھ گیا اب وہ تین گھنٹے تک ہوا روک کے رکھے، تین گھنٹے تک پیشاب روک کے رکھے، اب اس کے علاوہ اس کا اور کیا کام ہے اور جمعہ نماز کا وقت آئے گا تو اس کا قیمہ نکل چکا ہوگا، اس لیے پھر لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ اذان ہوتی ہے تو بے فکر ہو کے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ابھی تو دو گھنٹے کے بعد مولوی صاحب نے آنا ہے اور خطابت کے جو ہر دکھانے ہیں، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ وہ لے گا، اور پھر چندہ کی اپیل ہوتی ہے اور جب دوسری اذان ہوگی خطبہ شروع ہوگا تو چلے جائیں گے، چنانچہ بیٹھے ہوئے گھڑی دیکھتے رہتے ہیں اور جب دوسری اذان کا وقت ہوتا ہے تو تب آتے ہیں اور مسجد تب بھرتی ہے۔

اور اگر طریقہ یہ ہو جیسے آج بھی حرمین شریفین میں ہے کہ زوال ہوا، اذان ہوئی، سنتیں پڑھیں دوسری اذان ہوئی اور خطبہ شروع ہو گیا، خطبہ ختم ہوا تو نماز شروع ہوگئی، پینتیس چالیس منٹ میں انسان اچھی طرح سے جمعہ سے فارغ ہو کے گھر آ جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اذان سے گھنٹہ گھنٹہ پہلے جا کے بیٹھتے ہیں اور وہ "سبقت الی الجمعہ" کی فضیلت حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف ہم نے مجموعی طور پر سنت کے خلاف ایک طریقہ اپنایا اور ساری کی ساری قوم اس فضیلت سے محروم ہوگئی، اذان سننے کے بعد وہ اپنے کاروبار میں ویسے ہی لگے رہتے ہیں اور یہ نمازی قسم کے لوگوں کا حال ہے، وہ نہیں جو نماز نہیں پڑھتے، نمازی قسم کے لوگ بھی متوجہ نہیں ہوتے، وہ بھی کوشش یہی کرتے ہیں کہ جب دوسری اذان کا وقت ہوگا پھر چلے جائیں گے۔

ورنہ یاد رکھیے! سرور کائنات ﷺ کے زمانہ میں اگرچہ ایک اذان تھی جو خطبہ سے پہلے ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دوسری اذان شروع ہوئی باجماع صحابہ عبارۃ النص کے طور پر تو یہ "اذا نودی للصلوۃ" کا مصداق تو دوسری اذان ہے لیکن "دلالۃ النص" کے طور پر چونکہ یہ بھی "لصلوۃ الجمعۃ" ہے اس لیے "دلالۃ النص" کے طور پر قرآن کریم کی اس آیت کا مصداق یہ اذان بھی ہے، تو جب یہ اذان کا مصداق ہے تو اسی وقت جمعہ کی طرف سعی فرض ہو جاتی ہے جس وقت جمعہ کی یہ پہلی اذان ہوتی ہے اور سارے کے سارے کام چھوڑنے ضروری ہوتے ہیں جس وقت تک نماز سے فارغ نہ ہو جائیں اور جب نماز پوری ہو جائے "فَانْتَشِرُوْا" پھر جاؤ "وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ" اور اللہ کا رزق تلاش کرو پھر کاروبار کی چھٹی ہے۔

تو یہ یوں گھنٹہ یا سوا گھنٹہ لے لو اتنا وقت ہے جس کے اوپر پابندی لگائی گئی اور باقی دن میں کاروبار کی بھی

اجازت ہے، شکار بھی کیا جا سکتا ہے اور کھایا پکایا بھی جا سکتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے ان پر یہ پابندی تھی کہ ہفتہ کے دن یہ شکار نہیں کر سکتے تھے۔

یہود کا ہفتہ کے دن مچھلیوں کے شکار کا واقعہ:

اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس قوم کے اوپر ایک آزمائش آگئی، یہ تھے سمندر کے کنارے پر رہنے والے اور سمندر و دریا کے کنارے پر رہنے والے لوگوں کو شکار کا خاص شغف ہوتا ہے خاص طور پر جبکہ معاش بھی اسی سے متعلق ہو تو یہ لوگ بھی ایسے ہی تھے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آزمائش آئی کہ ہفتہ کے دن تو مچھلیاں اتنی آتیں کہ پانی کے اوپر تیرتی ہوئی معلوم ہوتیں اور جس دن ہفتہ نہ ہوتا اس دن تلاش کی ہوئی نہ ملتیں، اب یہ لوگ کہاں صبر کرتے چونکہ دل میں خدا کا خوف تو تھا نہیں، احکام کے اندر حیلہ جوئی ان کی فطرت تھی اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمائش میں ڈالا اور اس آزمائش میں ناکام ہونے کی وجہ سے اللہ کی گرفت میں آگئے۔

اب وہ سوچتے ہیں کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ شریعت کا حکم بھی بچ جائے اور مچھلیاں بھی بچ کر نہ جائیں، دونوں کام ہی کر لیے جائیں یعنی تقویٰ بھی محفوظ رہ جائے اور مقصد بھی حل ہو جائے جیسے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک تحصیلدار بڑا وظیفوی تھا، وظیفے بہت پڑھا کرتا تھا اور فجر کے بعد اشراق تک وہ مصلیٰ پر بیٹھنے کا عادی تھا اور اس وقت میں بولتا بھی نہیں تھا کہ کہیں وظیفے میں فرق نہ آجائے تو جس وقت صاحب معاملہ لوگ آتے تو ان کے ساتھ رشوت اشاروں کے ساتھ طے ہوتی اور ہاتھ نہیں لگاتا تھا، مصلی اٹھا دیتا وہ نیچے رکھ دیا کرتے تھے تو جس وقت اشراق پڑھ کے فارغ ہوتا تو نیچے بڑا اللہ کا فضل جمع ہوتا تھا، بولتا نہیں تھا کہ کہیں وظیفے میں خلل نہ آجائے۔

تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح بعض لوگوں کا تقویٰ کلابی تقویٰ ہوتا ہے یعنی کتوں والا تقویٰ کہ کتے کی یہ خاصیت ہے کہ جب پیشاب کرنے لگے تو ٹانگ اٹھا لیتا ہے کہ کہیں چھینٹے نہ پڑ جائیں لیکن گند مل جائے تو سارا کھا لیتا ہے تو یہ کلابی تقویٰ ہوتا ہے کہ انسان اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ بھی چاہے کہ تقویٰ کو ٹھیس نہ پہنچے لیکن در پردہ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی بھی ہو جاتی ہے اس طرح بعض لوگوں کی یہ فطرت ہوتی ہے یہ یہودی فطرت ہے۔

اس یہودی فطرت نے وہاں بھی اپنا رنگ دکھایا اور انہوں نے سمندر کے کنارے بڑے بڑے تالاب

بنالیے، گڑھے کھود لیے، ہفتہ کا دن جب آنے والا ہوتا تو ان کا منہ کھول دیتے اور جب ادھر پانی آتا تو مچھلیاں بھی آجاتیں اور پھر وہاں اس کو بند کردیتے، تالابوں کے منہ بند کردیتے پھر ہفتہ گزرنے کے بعد اگلے دن مچھلیاں پکڑ لیتے، اب مچھلی کو گھیر کے تھوڑے سے پانی میں محبوس کرلینا یہ بھی تو مچھلی کا شکار ہے، یہ طریقہ انہوں نے اپنالیا۔

جب وہ اس طرح کرنے لگے تو اب قوم تین حصوں میں بٹ گئی، بعض تو ایسے تھے جنہوں نے اس جرم کو اپنایا اور بعض ایسے تھے جنہوں نے اپنایا بھی نہیں لیکن اتنی شدت کے ساتھ انہیں روکا بھی نہیں، ایک دودفعہ کہہ کے خاموش ہوگئے کہ چھوڑو ہمیں کیا جب نہیں باز آتے تو اپنے کیے کی سزا خود بھگتیں گے لیکن ساتھ مچھلیاں پکڑی بھی نہیں، اور تیسرے وہ تھے جو ہمارے تبلیغی بھائیوں کی طرح ہاتھ دھو کے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ کسی طرح یہ مان جائیں تو یہ جو گروہ تھا جو ایک دودفعہ کہہ کے خاموش ہوگیا انہوں نے ان لوگوں سے کہا کہ ان کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو، ان کا تو حال ایسا ہے کہ یا تو اللہ ان کو کسی سخت عذاب میں مبتلاء کرنے والا ہے اور یا ان کو بالکل ہی ہلاک کرنے والا ہے، یہ تو برباد ہونے والے لوگ ہیں، تم ان کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟ وہ کہتے کہ بھائی ہمارے مقصد دو ہیں، اول تو ہم مایوس نہیں ہوسکتے کہ یہ سمجھ ہی جائیں، آج نہیں تو کل سمجھ جائیں گے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ کم از کم اللہ کے سامنے تو ہم اپنا عذر بیان کردیں گے کہ یا اللہ! ہم نے ان کو پوری طرح سمجھایا تھا لیکن یہ نہیں سمجھتے تھے تو ہم کیا کریں لیکن اتنی کوشش کے باوجود جس وقت وہ لوگ نہیں سمجھے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب وہ سب نصیحتوں کو بھلا بیٹھے اور ہر قسم کے حکم کے مقابلہ میں سرکش ہوگئے تو پھر ہماری گرفت میں آگئے ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر ذلیل بن جاؤ تو وہ بندر ذلیل بن گئے، جانوروں میں سے ایک جانور بندر ہی ہے جو نہایت حیلہ جو ہے ان کی شکل بھی اسی طرح مسخ کردی گئی۔

اب ان موجودہ یہودیوں کو یہ واقعہ اس لیے یاد دلایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی چاہے کسی حیلہ کے ساتھ ہو انسان کو اللہ کے عذاب میں گرفتار کرادیتی ہے تم بھی اپنی اس موجودہ زندگی پر نظر ڈالو کہ تم کس طرح اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کررہے ہو کہیں تم بھی اللہ کے عذاب میں گرفتار نہ ہوجانا۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ

یاد کیجیے جب اطلاع دی تیرے رب نے کہ البتہ ضرور بھیجے گا وہ ان یہودیوں پر قیامت کے دن تک جو

يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ

ان کو بدترین تکلیف پہنچاتا رہے گا، بے شک تیرا رب البتہ جلدی سزا دینے والا ہے

وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ

اور بے شک البتہ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے ﴿۱۶۷﴾ ہم نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا زمین میں مختلف جماعتیں ان میں سے

الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ

بعض اچھے ہیں اور ان میں سے کچھ اور طرح کے ہیں اور ہم نے ان کو آزمایا اچھی حالتوں کے ساتھ اور بری حالتوں کے ساتھ

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ

تاکہ وہ لوٹ آئیں ﴿۱۶۸﴾ پس وہ ان کے بعد برے جانشین ثابت ہوئے جو وارث ہوگئے کتاب کے

يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ

وہ لیتے ہیں دنیا کے سامان کو اور کہتے ہیں ہمیں عنقریب بخش دیا جائے گا اور اگر

يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ

آ جائے ان کے پاس دنیا کا اور سامان تو اس کو بھی لے لیتے ہیں کیا ان پر نہیں لیا گیا عہد

الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ

کتاب کا کہ نہ بولیں گے اللہ پر مگر سچی بات اور انہوں نے پڑھ لیا اس چیز کو جو کتاب میں ہے،

وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ

اور آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں کیا تم سوچتے نہیں؟ ﴿۱۶۹﴾ جو لوگ

يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ

کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں تو بے شک ہم اجر کو ضائع نہیں کرتے

الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا

اصلاح کرنے والوں کے ﴿۱۷۰﴾ اور قابل ذکر ہے وہ وقت جب ہم نے اٹھایا ان کے اوپر گویا کہ وہ سائبان ہے اور ان لوگوں نے خیال کیا

اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ

کہ بے شک وہ پہاڑ ان کے اوپر گرنے والا ہے، ہم نے کہا تم پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے قوت کے ساتھ اور یاد رکھو ان باتوں کو جو اس میں ہیں تا کہ

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ع

تم متقی بن جاؤ ﴿۱۷۱﴾

تفسیر:

سب سے زیادہ مصیبت زدہ قوم یہود کی ہے:

پیچھے سے بنی اسرائیل کا ذکر چلا آ رہا ہے خصوصیت کے ساتھ یہود کا، اس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو ایک بات کی یاددہانی کروائی ہے کہ تمہیں اطلاع دے دی گئی تھی کہ اگر تم باز نہیں آ ؤ گے تو قیامت تک تمہارے اوپر ایسے لوگ مسلط ہوتے رہیں گے جو تمہیں بدترین قسم کے عذاب میں مبتلاء کریں گے اور یہود کی تاریخ اس بات کے اوپر شاہد ہے کہ یہ قوم بہت مصیبتوں کی آماجگاہ رہی ہے، زیادہ دور نہ جائیے یہی دوسری جنگ عظیم جو ہوئی تھی جو تقریباً 1938ء سے شروع ہوئی تھی اور 1945ء میں ختم ہوئی تھی، اس جنگ میں بھی جتنی مصیبتیں ان یہود پر آئی ہیں شاید کسی پر نہیں آئیں، ہٹلر وغیرہ نے سب سے زیادہ سختیاں ان پر کی ہیں، تو اس قوم کا شیرازہ ہمیشہ بکھرا رہا، ان کو اکٹھے ہو کے کسی ایک علاقہ کے اندر عزت کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا، اس بات پر ان کی تاریخ شاہد ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے دو ہزار سال سے یہ قوم دربدر دھکے کھا رہی ہے کبھی کسی کی محتاج، کبھی کسی کی محتاج، باوجود اس بات کہ یہ سودی کاروبار کرنے کی وجہ سے مالدار ہیں لیکن ان کو اجتماعی زندگی میں کہیں عزت نصیب نہیں ہوئی دو ہزار سال سے ان کا یہی مقدر چلا آ رہا ہے کہ کسی جگہ یہ مجتمع نہیں، کسی جگہ ان کی جماعت نہیں تھی اور دربدر یہ دھکے کھاتے پھرتے تھے یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے۔

اب یہ جو آپ کے سامنے ایک اسرائیلی ریاست بن گئی ہے جس میں یہود جمع ہو گئے اس ریاست کا وجود 1948ء میں ہوا یعنی 1947ء میں پاکستان بنا اور پاکستان بننے کے بعد 1948ء میں فلسطین کو تقسیم کر کے اس یہودی ریاست کی بنیاد رکھی گئی تھی، تو یہ جو ریاست کی بنیاد رکھی گئی یہاں پھر یہود کو اکٹھا کرنا شروع کیا، اب یہ

چند لاکھ یہودی اس علاقہ کے اندر اکٹھے ہیں لیکن جو لوگ حالات کو جانتے اور سمجھتے ہیں ان کے سامنے یہ حقیقت نمایاں ہے کہ یہ ریاست اپنی ذات میں کوئی مستقل نہیں ہے، اصل کے اعتبار سے یورپ نے (برطانیہ، فرانس، امریکہ اور در پردہ روس کی تائید بھی تھی) مشرق وسطی پر کنٹرول کرنے کے لیے اپنے ایجنٹوں کے لیے ایک اڈہ بنایا اور اب بھی حقیقت کے اعتبار سے یہ امریکہ کی فوجی چھاؤنی ہے باہر کی قومیں اگر اس کو سہارا اور تحفظ نہ دیں تو یہ ریاست اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ایک دن بھی اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتی، تو ان کی اپنی ذاتی کوئی مستقل حکومت نہیں، غنڈوں کا جیسے گروہ جمع ہو جاتا ہے اسی طرح دوسروں کی سرپرستی میں یہ گروہ جمع ہو گیا اور بڑی قوموں کا مقصد تھا مشرق وسطی پر، مسلمانوں پر کنٹرول کرنا تو انہوں نے یہ ایک چھاؤنی قائم کر دی جس کے اندر یہ یہودی جمع ہونا شروع ہو گئے۔

لیکن اس حقیقت کو کبھی نہ بھولیے کہ اسرائیل کے اندر بھی یہود کو امن نہیں ہے، ہر وقت سرحدوں کے اوپر جو جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں انہوں نے ان لوگوں کو ہر وقت حالت جنگ میں رکھا ہوا ہے تو یہ نہ سمجھئے کہ ان کو امن اور سکون کی زندگی نصیب ہو گئی ہے ان کو امن اور سکون ابھی بھی نصیب نہیں ہوا، یہ لوگ ہر وقت میدان جنگ میں ہیں اور وہ تھوڑا سا خطہ زمین کا ہے، کوئی بڑا ملک نہیں ہے، اس لیے جب لڑائی چھڑتی ہے تو یوں سمجھو کہ پوری ریاست ہی میدان جنگ بن جاتی ہے۔

مہدی کا معنی اور مصداق:

اور اس کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت اور بھی یاد رکھیے! حدیث شریف میں آتا ہے کہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور اس وقت امام مہدی جو ہیں یہ مسلمانوں کی قیادت کر رہے ہوں گے، یہ مہدی ان کا لقب ہے نام تو ان کا احمد ہوگا اور مہدی کے لقب کے ساتھ وہ ملقب ہوں گے، مہدی کا معنی ہدایت دیا ہوا چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق ہی سارا کام کریں گے اس لیے ان کو مہدی کہتے ہیں، ورنہ مہدی یہ اکیلے نہیں جن کا آپ انتظار کر رہے ہیں، مہدی تو بہت ہوئے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مہدی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ مہدی ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ مہدی ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ مہدی ہیں، خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مہدی ہونے کی دعا دی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق حدیث شریف میں دعا آتی ہے "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا" اور ان خلفاء اربعہ کے متعلق تو لفظ مشہور ہی ہے جو آپ استعمال کرتے رہتے

ہیں "الخلفاء الراشدین المهديين" تو "مھدیین" یہ مہدی کی جمع ہے تو یہ سارے خلفاء راشدین بھی تھے اور مہدی بھی تھے۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد مہدی یہ ساری دنیا سے افضل ہیں، اس لیے آنے والے مہدی کے مقابلہ میں بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے افضل ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس سے افضل ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے افضل ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس سے افضل ہیں، وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیش گوئی ہے کہ آخر وقت میں ایک خلیفہ عادل آئے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہوگا آپ کا ہم نام ہوگا اور وہ زمین کو عدل وانصاف کے ساتھ بھر دے گا جیسا کہ پہلے جور وظلم کے ساتھ زمین بھری ہوئی ہوگی، آخر وقت میں مسلمانوں کی لڑائیاں اسی امام مہدی کی قیادت میں ہیں اور لڑائیوں کا مرکز مشرق وسطیٰ ہے، احادیث میں یہ بات صراحت کے ساتھ ہے جس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور جس وقت یہ لڑائیاں انتہا کو پہنچی ہوئی ہوں گی اور دمشق جو آج شام کا دارالخلافہ ہے اسی علاقہ میں مسلمانوں کی صف بندی ہوگی یہود کے مقابلہ میں، یہ باتیں حدیث شریف میں نص کے درجہ میں ہیں، مسلمانوں کی صف بندی یہود کے مقابلہ میں امام مہدی کی قیادت میں اسی علاقہ میں ہوگی۔

یہودیوں کو نہ درخت پناہ دیں گے اور نہ پہاڑ:

جس وقت یہ صف بندی ہو رہی ہوگی اور یہود بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ اس علاقے میں جمع ہوں گے جو علاقہ ان کے لیے تجویز شدہ ہے، تکوینی طور پر یہ میدان بنتا چلا آرہا ہے عین ایسے وقت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا اور اس وقت جو یہودیوں کا قائد ہوگا وہ سب سے بڑا دجال ہوگا، سب سے بڑا فتنہ پرداز ہوگا یعنی اس جیسا شرارتی اور فتنہ پرداز پہلے کوئی نہیں آیا ہوگا دجال یہودی ہے اور اس کی قیادت میں سارے یہودیوں نے مسلمانوں کے مدمقابل آنا ہے اور لڑائی کا میدان یہی دمشق اور اس کے اردگرد کا علاقہ ہے جہاں آجکل یہ محاذ جنگ ہے اور جس وقت یہ لڑائی ہوگی تو اس لڑائی میں یہودیوں کے قائد دجال نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہونا ہے اور مرنا بھی مقام لد میں ہے اور یہ لد جگہ آج بھی اسرائیل میں ہے، اور اس کے قریب یہودیوں کا ہوائی اڈہ ہے، یہاں اس دجال نے قتل ہونا ہے اور جس وقت قائد قتل ہوگا تو اس کے بعد یہود کا اس طرح قتل عام ہو جائے گا کہ نہ یہ کسی پہاڑ کے پیچھے چھپ کے بچ سکیں گے اور نہ کسی درخت کے پیچھے چھپ کے بچ سکیں گے اور اس طرح ان کے

خلاف انقلاب آجائے گا حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر یہ کسی پتھر کے پیچھے چھپے ہوئے ہوں گے تو پتھر انہیں پناہ نہیں دے گا پتھر مسلمانوں کو آوازیں دے گا "یا مسلم! ھذا یھودی خلفی اقتلہ" میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے اس کو مارو یعنی یہ حقیقت بھی ہوسکتی ہے اس میں کوئی شک نہیں ورنہ یہ مثال ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ کسی جگہ ان کو پناہ نہیں ملے گی نہ انہیں پہاڑ پناہ دیں گے نہ انہیں درخت پناہ دیں گے ایک ایک یہودی چن کے اس وقت قتل کر دیا جائے گا اور اس وقت اس قوم کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اسرائیل کا وجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل ہے:

اور آپ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ہوتے تو ان کو ختم کرنا اتنا آسان نہ ہوتا، کہاں کہاں سے تلاش کر کے لاتے، یہ تو تکوینی طور پر میدان بنتا جا رہا ہے کہ سارے ایک جگہ اکٹھے ہو رہے ہیں اور احادیث کی روشنی میں محاذ جنگ یہی ہے، لڑائی یہیں ہونی ہے اس لیے ان کا یہ آشیانہ بنانا ان کے خلاف ہی کام آئے گا یہ تو موت کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں، یہ دنیا کے اوپر غالب آنے کے لیے اور عزت پانے کے لیے نہیں اکٹھے ہو رہے، ہمارا اس بات کے اوپر ایمان ہے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی روشنی میں ہم اس کے اوپر پورا یقین رکھتے ہیں اس لیے ان کی یہ عیش و عشرت اور برتری اس طرح سمجھو جیسے کسی بستی کے اوپر ڈاکوؤں کا گروہ غالب آجائے اور چار دن زندہ ہیں، کھا پی لیں اور سمجھیں کہ بس اب ہمیں برتری حاصل ہوگئی، حالانکہ ان کو یہ پتہ نہیں ہے کہ دوسرے وقت میں ان کے اوپر ایسی افتاد پڑے گی کہ تلاش کیے ہوئے بھی ان کا نام و نشان نہیں ملے گا تو یہ ان کا اجتماع ان کی برتری کی دلیل نہیں ہے، نہ ان کے لیے عافیت کی علامت ہے، نہ اس علاقہ میں اس وقت یہ پرامن ہیں اور نہ یہ اپنے قدموں پر قائم ہیں، امریکہ اور دوسرے ممالک آج ان کا ساتھ چھوڑ دیں تو یہ آج اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتے اس ریاست کا وجود تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی علامت ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید اس کے ساتھ قرآن کریم کے حقائق کی تردید ہوگئی کہ قرآن تو کہتا ہے کہ ان کی حکومت کبھی نہیں بنے گی، ذہنی طور پر لوگ مفروضے قائم کر لیتے ہیں اور پھر خود اشکالات کا شکار ہو جاتے ہیں تو آج بھی یہ عزت و آبرو کے ساتھ وقت نہیں گزار رہے، ان کو تنبیہ کر دی گئی تھی اور یہ ان کرتوتوں سے باز نہیں آئے جب باز نہیں آئے تو تاریخ شاہد ہے کہ جتنی یہ قوم روئے زمین پر ذلیل ہوئی ہے اتنی شاید روئے زمین پر کوئی قوم اجتماعی حیثیت سے ذلیل نہیں ہوئی، تو یہ گویا کہ آئندہ کے لیے پیش گوئی ہے، یاد کیجئے جب اطلاع دے دی تھی تیرے رب

نے کہ البتہ ضرور بھیجتا رہے گا ان پر قیامت کے دن تک ایسے شخص کو جو ان کو بدترین عذاب پہنچائے گا، بے شک تیرا رب البتہ جلدی سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ البتہ غفور رحیم ہے، یہ دو اللہ تعالیٰ کی شانیں ہیں وہ "غفور رحیم" بھی ہے اور سخت سزا دینے والا بھی ہے یعنی اگر کوئی اس کے احکام کی پابندی کرے تو وہ غفور رحیم ہے، پابندی کا جذبہ ہو پھر غلطیاں ہو جائیں تو بخشتا ہے، نیکی کرو تو قبول کر کے رحم کرتا ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی چلتا ہے تو پھر وہ "سریعُ العقاب" ہے جیسے غالباً سورۃ ابراہیم میں بھی یہ لفظ آئے گا "نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَاَنَّ عَذَابِیْ ھُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ" کہ میرے بندوں کو بتا دو دونوں باتیں ہیں کہ میں غفور رحیم بھی ہوں اور میرا عذاب بھی سخت ہے، دونوں شانیں نمایاں ہیں۔

یہودی قوم کا شیرازہ بکھرنا بھی اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے:

"وَقَطَّعْنٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا" پہلے جو آیا تھا کہ ہم نے ان کے بارہ قبیلے بنا دیے یہ بطور انعام کے تھا کہ اس کی قوم کی کثرت ہے وہ ایک قومی تقسیم کی طرف اشارہ تھا کہ اس قوم کے بارہ قبیلے ہیں، اور یہ ان کی سزا کے طور پر ہے کہ "وَقَطَّعْنٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا" ہم نے ان کو مختلف جماعتیں بنا دیا کوئی کدھر نکل گیا، کوئی کدھر نکل گیا، جہاں سر چھپانے کی جگہ ملی ادھر کو نکل گئے، اس اسرائیلی ریاست کے وجود میں آنے سے قبل کوئی علاقہ ایسا نہیں تھا جس کو یہود کا علاقہ کہا جا سکتا اور جہاں یہ قومی سطح کے اوپر جمع ہوں، یہ متفرق ہو کے ساری دنیا میں بکھر گئے، "مِنْھُمُ الصّٰلِحُوْنَ" ان میں سے بعض اچھے بھی تھے "وَمِنْھُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ" اور بعض اور ہی طرح کے ہیں، وہ آپ سمجھتے ہی ہیں کہ صالحین کے علاوہ اور طرح کے کیا ہوتے ہیں، "وَبَلَوْنٰھُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ" ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے رہے اچھی حالتوں کے ساتھ بھی اور بری حالتوں کے ساتھ بھی، تو معلوم ہو گیا کہ اگر یہ یہود قوم بھی حسنات کی حامل ہو جائے تو یہ بھی ایک ابتلاء ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کے اوپر حسنات بھی آئیں اور سیئات بھی آئیں اور یہ آزمائش کا دور چلتا رہتا ہے کبھی ان کو سختیوں میں ڈالا کہ ان کا تکبر ٹوٹے اور کبھی ان کو کھلایا پلایا کہ اس کو دیکھ کر ہی شکر گزار بن جائیں دونوں قسم کی باتیں ان کے اوپر بطور آزمائش کے آئیں "لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ" تا کہ یہ اللہ کی طرف لوٹ آئیں، بسا اوقات انسان ترغیب کے ساتھ متاثر ہوتا ہے اور بسا اوقات انسان ترہیب سے متاثر ہوتا ہے۔

یہود کا حب مال میں مبتلاء ہونا:

"فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ" اس میں جو لفظ خلف آیا ہے (لام کے سکون کے ساتھ) یہ اکثر و بیشتر

برے جانشین کے لیے بولا جاتا ہے اور خلف (لام کے فتح کے ساتھ) اچھے جانشین کے لیے بولا جاتا ہے اس لفظ میں لام کے فتح اور سکون کے ساتھ معنی میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ پہلے تو یہود میں دونوں قسم کے لوگ تھے کچھ اچھے اور کچھ برے جیسا کہ پیچھے ذکر آیا ہے لیکن ان کے بعد جوان کے جانشین بنے تو وہ ناخلف تھے یعنی برے جانشین تھے اگر چہ وہ کتاب اللہ کے وارث تو بن گئے، بڑوں سے انہوں نے کتاب تو پڑھ لی لیکن اس کتاب کے مطابق عمل نہیں کیا، جب بھی کوئی آدمی مسئلہ پوچھنے آتا تو اس کو مرضی کا مسئلہ بتا کر اس سے مال حاصل کرتے گویا کہ انہوں نے کتاب اللہ کو دنیا اکٹھی کرنے کا ذریعہ بنالیا اور پھر ان کی یہ عادت بھی تھی کہ جب بھی ان کو اپنے اس کام پر شرمندگی ہوتی تو کہتے "سَيُغْفَرُ لَنَا" عنقریب ہماری بخشش کردی جائے گی، ہمارا رب ہمیں بخش دے گا یا جیسے پہلے آیا تھا کہ ہمارے بڑے سفارش کر کے ہمیں چھڑا لیں گے، زبان سے یہ بھی کہتے تھے اور حال یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی ان کے پاس مال لے کر آتا تو اس سے مال لے کر ساتھ ساتھ اس کی مرضی کے مطابق اللہ کی کتاب میں تحریف کر کے اس کو مسئلہ بھی ویسا ہی بتا دیتے، یہ ان کے حب مال کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس طرح دنیا کی محبت میں مبتلاء ہو کر اللہ کی کتاب میں تحریف کرتے تھے اور اپنے پہلے لوگوں کے وہ برے جانشین ثابت ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ:

اللہ تعالیٰ انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا ان سے کتاب کے متعلق یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ اللہ کے متعلق صرف حق بات ہی کی نسبت کریں گے، جو بات اللہ کی طرف سے نہیں ہے اس کی نسبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کریں گے اور یہ باتیں وہ ہیں جو انہوں نے کتاب میں پڑھ لی ہیں لیکن اس کے مطابق عمل نہیں کرتے یاد رکھو! آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، دنیا کے اندر تم نے جو عیاشی کرنی ہے کرلو، آخرت کا گھر تو متقین کے لیے ہے اگر تقویٰ اختیار کرو گے تو آخرت کی نعمتیں ملیں گی اور بخشش ہوگی اگر اسی طرح اللہ کی کتاب میں تحریف کرتے رہے اور اس کتاب کو دنیا کمانے کا ذریعہ بناتے رہے تو تم متقی نہ ہوئے جب متقی نہ ہوئے تو آخرت کا گھر بھی تمہیں نہیں ملے گا "اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ" کیا تم سمجھ نہیں رکھتے؟ یعنی اگر سمجھ ہے تو آخرت جو باقی رہنے والی ہے اس کو اس فانی دنیا پر ترجیح دو، عقل اور فہم کا تقاضہ یہ ہے کہ باقی رہنے والی چیز کو اختیار کیا جائے اور فانی کو باقی پر ترجیح نہ دی جائے۔

پھر فرمایا "وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ" جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں یعنی اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی تحریف کے مرتکب نہیں ہوتے "وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ" اور نماز کو قائم کرتے ہیں کیونکہ نماز کی یہ شان ہے "اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ" اور نماز کی پابندی ہوگی تو بے حیائی اور برے کاموں سے بچے رہو گے اس لیے نماز کا ذکر خاص طور پر کر دیا "اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ" تو بے شک ہم مصلحین کے اجر کو ضائع نہیں کرتے، جو مصلح ہوگا، نیکی کو اختیار کرنے والا ہوگا، اس کا اجر اس کو ضرور ملے گا، اس کا اجر کبھی بھی ضائع نہیں ہوگا۔

بنی اسرائیل کی بدعہدی اور ان کے اوپر پہاڑ کا ٹھہرنا:

"وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ" اس آیت میں بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کا ذکر فرمایا ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کی خواہش کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے شریعت مانگی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے تورات لے کر قوم کے پاس تشریف لائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے کہا کہ تم نے ایک شریعت کا مطالبہ کیا تھا اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اتاری ہے اب تم اس کے مطابق عمل کرو، انہوں نے جب اس کتاب کو دیکھا تو دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ تو بہت مشکل احکام ہیں ہم سے تو اس پر عمل نہیں ہو سکے گا، کوئی آسان سی شریعت ہوتی تو ہم مان لیتے اب ہم اس پر عمل نہیں کر سکتے اس وقت اللہ تعالیٰ نے طور پہاڑ کو اس کی جگہ سے اٹھا کر اس بستی کے اوپر معلق کر دیا جس بستی میں بنی اسرائیل آباد تھے اور فرمایا کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو، جب اسرائیلیوں نے موت کو اپنے سر پر دیکھا تو فوراً سارے سجدہ میں گر گئے اور یہ عہد کرنے لگے کہ ہم اس کے احکام کی پابندی کریں گے لیکن بعد میں پھر روگردانی کی اور اپنے عہد سے منحرف ہو گئے اور وہی حرکتیں کرنے لگے جو ان کی پہلے تھیں یہ واقعہ سورۃ البقرۃ میں بھی گزر چکا ہے۔

"وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ" قابل ذکر ہے وہ وقت جب ہم نے ان پر کھڑا کر دیا پہاڑ کو، اس پہاڑ سے طور پہاڑ مراد ہے گویا کہ وہ سائبان ہے "وَظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ" اور انہوں نے یقین کر لیا کہ وہ ان کے اوپر گرنے والا ہے اور ہم نے کہا "خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ" جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو "وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ" اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

آیت بالا "لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ" کے خلاف نہیں:

اس آیت پر بظاہر ایک چھوٹا سا اشکال ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں ہے "لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ" کہ کسی کو زبردستی دین حق کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو دین حق کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، تو دونوں آیتوں میں بظاہر تھوڑا سا تعارض معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ سورۃ البقرۃ میں جہاں یہ آیت "لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ" آئی تھی اس میں آپ کے سامنے گزر چکا کہ یہ آیت غیر مسلموں سے متعلق ہے کہ کسی غیر مسلم کو زبردستی دین حق قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اور اس واقعہ میں بنی اسرائیل کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ یہ تو وہ لوگ تھے جنہوں نے دین حق کو قبول کرنے کے بعد توراۃ کے احکام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور جو شخص ایک مرتبہ قبول کرنے کے بعد انکار کرتا ہے تو اس کو بغاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے اس پر جبر و اکراہ کر کے اس کو دوبارہ راہِ راست پر لانا "لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ" کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق غیر مسلموں سے ہے اور جن کو مجبور کیا جا رہا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمان ہونے کے بعد توراۃ کے احکام کا انکار کر گئے تھے، یہ دونوں باتیں علیحدہ علیحدہ ہیں، ان کا آپس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ

اور یاد کیجئے جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو اور گواہ بنایا ان کو

عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚۛ شَهِدْنَا ۚۛ اَنْ

ان کی جانوں پر کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا ہاں ہے ہم نے اقرار کرلیا کبھی

تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝۱۷۲ۙ

تم کہنے لگو قیامت کے دن کہ ہم تو اس سے غافل تھے ۝۱۷۲

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ

یا تم کہو کہ شرک کیا ہمارے باپ دادا نے پہلے اور ہم ان کی اولاد تھے

بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝۱۷۳ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ

ان کے بعد کیا تو ہلاک کرتا ہے ہمیں اس کام کی وجہ سے جو گمراہ لوگوں نے کیا ۝۱۷۳ اسی طرح ہم کھول کھول کر بیان

الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۱۷۴

کرتے ہیں آیتیں تاکہ وہ لوٹ آئیں ۝۱۷۴

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

گزشتہ آیات میں ان معاہدوں کا ذکر تھا جو بنی اسرائیل سے لیے گئے تھے کہ تم نے توراۃ کے احکام کی پابندی کرنی ہے، اب ان آیات میں اس عہد کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام اولاد آدم سے اس دنیا میں آنے سے پہلے لیا تھا جس کو عام طور پر عہد الست کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔

عہد الست کا ذکر:

اس عہد کی تفصیل بہت سی احادیث مبارکہ میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے، ان تمام احادیث کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بات متعین ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کی تمام اولاد جو

قیامت تک آنے والی تھی اس کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے موجود کر دیا، جنتی، جہنمی جو بھی تھے سب کے سب اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دیے اور پھر ان سب کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت قوت گویائی عطا کی اور ان سے ایک سوال کیا جس کا ذکر اس آیت میں بھی ہے "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ جب اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیا تو ساری مخلوق جو وہاں موجود تھی سب نے جواب میں کہا "بلیٰ" کیوں نہیں، تو ہی ہمارا رب ہے اور ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں، یہ ہے وہ عہد جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اولادِ آدم سے لیا تھا، جس کو عہد الست کہا جاتا ہے، اب کسی کو کوئی عذر نہیں رہا اور اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ کوئی شخص توحید سے منہ موڑ کر اور شرک اختیار کر کے یہ کہے کہ مجھے تو کوئی پتہ نہیں تھا اب اس بات کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ایک تو اللہ تعالیٰ کو رب مان کر اس کا اقرار بھی کر چکے ہیں، اور دوسرا یہ کہ اللہ نے ہمیشہ اپنے نمائندے بھیج کر اس عہد کی یاد دہانی بھی کرائی ہے، اگر اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو نہ بھی بھیجتا تب بھی عذر کی گنجائش ختم ہو چکی تھی کہ اس عہد کا اثر ہے کہ ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ جس نے مجھے پیدا کیا مجھے اس کی عبادت ضرور کرنی چاہیے، ہر انسان فطری طور پر کسی ایسی ذات کو تلاش کرتا ہے جس کی وہ عبادت کرے اور مشرک بھی شرک کو برا سمجھتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہمارا یہ شرک برا نہیں کیونکہ یہ تو اس ذات تک پہنچنے کا ذریعہ ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے تمام اولادِ آدم سے ایک عہد لیا تھا جس کا تذکرہ اس آیت کے اندر کیا گیا ہے۔

مختلف سوالوں کے جوابات:

سوال: اس پر تھوڑا سا یہ اشکال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عہد کس جگہ اور کس وقت لیا تھا؟

جواب: اس کے متعلق حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت ہے کہ جس وقت حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا گیا تھا اس وقت یہ عہد لیا گیا تھا اور اس وقت اقرار کی جگہ وادی نعمان تھی جس کو آج کل میدانِ عرفات کہا جاتا ہے گویا کہ عرفات کے میدان میں یہ عہد لیا گیا تھا۔

سوال: یہ نئی مخلوق جس کو ابھی پوری طرح وجود بھی عطا نہیں کیا گیا تھا ان کو کیا معلوم کہ ہمارا بھی کوئی پیدا کرنے والا ہے اور ہم نے اسی کی عبادت کرنی ہے بظاہر اس تخلوق سے یہ سوال تکلیف مالا یطاق معلوم ہوتا ہے۔

جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ جب تمام اولادِ آدم کو ایک ذرہ کی صورت میں پیدا کر دیا تو اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ اس نے ان کو بقدر ضرورت عقل وفہم اور شعور وادراک بھی عطا کر دیا ہو، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے یہ کوئی بعید نہیں ہے۔

سوال: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ قیامت تک آنے والے تمام انسان ایک ہی میدان میں سما گئے؟

جواب: ایک حدیث مبارکہ میں ایک بات کی صراحت ہے کہ جس وقت حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ذریت نکالی گئی تھی اس وقت وہ اپنے اس ڈیل ڈول کے ساتھ نہیں تھی جس میں وہ دنیا میں آئیں گے بلکہ چھوٹی چھوٹی چیونٹی کے جثہ میں تھی اور سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں اس بات کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہا کیونکہ آج تو ایٹم کے اندر تمام نظام شمسی کے موجود ہونے کا تجربہ کیا جارہا ہے، ٹی وی سکرین کے ذریعے بڑے بڑے پہاڑوں کو ایک نقطہ کی مقدار دکھلایا جارہا ہے اس لیے اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس عہد الست کے وقت تمام اولاد آدم کو بہت چھوٹے جثہ میں وجود عطا فرمایا ہو۔

سوال: اس آیت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا اور جبکہ احادیث کی طرف دیکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا گیا بظاہر دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان لوگوں کو نکالا گیا جو بلاواسطہ حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا ہونے والے تھے پھر ان کی نسل کی پشتوں سے دوسروں کو اور اسی طرح جس ترتیب سے اس دنیا میں اولاد آدم پیدا ہونے والی تھی اسی ترتیب سے ان کی پشتوں سے نکالا گیا۔

اور حدیث میں سب کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کا مطلب یہی ہے کہ آدم سے ان کی اولاد کو پھر اس اولاد سے ان کی اولاد کو ترتیب وار پیدا کیا گیا۔

عہد لینے کی وجہ:

"اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا کُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ" یعنی یہ اقرار ہم نے تم سے لیا ہے کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگ جاؤ کہ ہم تو اس غافل تھے، اس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ اس سوال وجواب کی وجہ سے تمہارے دلوں میں ایمان کی ایسی بنیاد قائم ہوگئی کہ ذرا غور وفکر سے کام لوگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ربوبیت کے اعتراف کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہے گا۔

اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا "اَوْ تَقُوْلُوْا اِنَّمَا اَشْرَکَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ" اور یہ عہد ہم نے اس لیے بھی لیا ہے کہ کہیں قیامت کے دن تم یہ عذر نہ کرنے لگ جاؤ کہ اصل میں شرک تو ہمارے آباؤ اجداد نے اختیار کیا

تھا، ہم تو ان کی اولاد تھے، ہمیں صحیح اور غلط کا پتہ نہیں تھا اس لیے جو ہمارے بڑوں نے کیا ہم نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تو بڑوں کے جرم کی سزا ہمیں کیوں مل رہی ہے؟ اس عذر کو ابھی سے دور کر دیا کہ یہ عہد تم سے لے کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں اپنی ربوبیت کا تعارف کرا دیا ہے، اب اگر تم شرک اختیار کرتے ہو تو یہ جرم تمہارا ہے، اس لیے اس کی سزا بھی تمہیں ہی ملے گی، "وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ" اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں "لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ" تا کہ یہ لوگ اپنی غفلت سے باز آ جائیں، اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کر کے اس کی اطاعت میں لگ جائیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا

اور آپ ان کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنا دیجئے کہ جس کو دی ہم نے اپنی آیتیں پھر اس نے ان کو چھوڑ دیا

فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ

پھر اس کے پیچھے لگا شیطان تو ہوگیا وہ گمراہوں میں سے ﴿۱۷۵﴾ اور اگر ہم چاہتے تو بلند کرتے

بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ

اس کا رتبہ ان آیتوں کی بدولت لیکن وہ تو زمین کی طرف مائل ہوگیا اور اپنی خواہشات کے پیچھے لگ گیا تو اس کا حال ایسا ہے

كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ

جیسے کتا، اگر تو اس پر بوجھ لادے تو بھی وہ ہانپے اور اگر چھوڑ دے تو تب بھی

يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

ہانپے، یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلَا الْقَوْمُ

پس تو بیان کر یہ احوال تاکہ وہ غور و فکر کریں ﴿۱۷۶﴾ بری مثال ہے ان لوگوں کی

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ مَنْ يَّهْدِ

جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے ہیں جسے ہدایت دے

اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

اللہ پس وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے گمراہ کردے تو یہی لوگ نقصان میں پڑنے والے ہیں ﴿۱۷۸﴾

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ښ لَهُمْ قُلُوْبٌ

اور ہم نے پیدا کیے دوزخ کے لیے بہت سارے جن اور انسان، ان کے دل ہیں

لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ

جن سے وہ سمجھتے نہیں، اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، اور ان کے کان ہیں

لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗئِكَ هُمُ

جن سے وہ سنتے نہیں یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ اور یہی لوگ ہیں

الْغٰفِلُوْنَ ۝۱۷۹ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠ وَذَرُوا

غافل ۝۱۷۹ اور اللہ کے لیے اچھے نام ہیں پس تم ان ناموں سے پکارو اور چھوڑ دو

الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَاۗىِٕهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۸۰

ان لوگوں کو جو اس کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں عنقریب جزا دیے جائیں گے وہ ان کاموں کی جو وہ کرتے تھے ۝۱۸۰

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝۱۸۱ ع

اور جن کو ہم نے پیدا کیا ان میں سے ایک جماعت حق کے مطابق ہدایت کرتی ہے اور اسی کے مطابق انصاف کرتی ہے ۝۱۸۱

تفسیر:

ایک عالم مقتداء کی گمراہی کا عبرت ناک واقعہ:

ابتدائی آیات میں ایک عالم مقتداء کی گمراہی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، یہ شخص کون تھا؟ قرآن کریم میں اس شخص کا نام اور تشخص مذکور نہیں ہے البتہ ائمہ تفسیر نے اس شخص کا نام بلعم بن باعوراء لکھا ہے جس کا حال ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، یہ شخص ملک شام میں بیت المقدس کے قریب کسی جگہ کا رہنے والا تھا اور بعض روایات میں ہے کہ یہ بنی اسرائیل میں سے ہی تھا اور اللہ تعالیٰ کی بعض کتابوں کا علم اس کو حاصل تھا جیسا کہ قرآن کریم میں "اَلَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا" کے ساتھ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حاصل اس واقعہ کا یہ ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور بنی اسرائیل کو قوم جبارین یعنی قوم عمالقہ سے جہاد کرنے کا حکم ملا، اور قوم جبارین نے جب یہ دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا لشکر لے کر پہنچ گئے ہیں اور فرعون کے غرق ہونے کا حال ان کو پہلے سے معلوم تھا تو ان کو فکر لاحق ہوئی اور وہ سب کے سب جمع ہو کر اسی بلعم بن باعوراء کے پاس آئے اور کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت سارے لشکر کے لیے کر ہم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ بغیر لڑے ویسے ہی واپس چلے جائیں اس کی وجہ یہ تھی کہ اس بلعم بن

باعوراء کو اسم اعظم معلوم تھا وہ اس کے ذریعے جو دعا کرتا وہ قبول ہوتی تھی۔

اس نے کہا مجھے تم پر افسوس ہے، تم کیسی بات کہتے ہو وہ اللہ کے نبی ہیں، ان کے ساتھ اللہ کی مدد ونصرت اور فرشتے ہیں میں ان کے خلاف دعا کیسے کرسکتا ہوں، اگر میں نے ایسا کیا تو میرا دین و دنیا تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

ان لوگوں نے بے حد اصرار کیا تو بلعم نے کہا کہ اچھا میں رب سے معلوم کرلوں کہ مجھے دعا کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ جب اس نے اپنے معلوم کے مطابق جو بھی استخارہ وغیرہ کیا تو خواب میں اس کو بتا دیا گیا کہ وہ ہرگز ایسا نہ کرے تو اس نے قوم کو بتایا کہ مجھے بددعا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

جب قوم کسی طرح بھی منت سماجت کرکے اس کو بددعا پر راضی نہ کرسکی تو قوم نے اس کو کوئی بڑا ہدیہ پیش کیا جو حقیقت میں رشوت تھی جب اس نے اس ہدیہ کو قبول کرلیا تو پھر قوم کے لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے کہ اب تو ضرور ان کے خلاف بددعا کر، اور بعض روایات میں ہے کہ اس کی بیوی نے مشورہ دیا کہ ان سے ہدیہ قبول کرکے ان کا کام کردیں اس وقت بیوی کی رضا جوئی اور مال کی محبت نے اس کو اندھا کردیا تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے خلاف بددعا کرنا شروع کردی۔

لیکن اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اظہار یوں ہوا کہ وہ جو کلمات بددعا کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لیے کہنا چاہتا تھا اس کی زبان سے وہ بددعا کے الفاظ اپنی ہی قوم کے لیے نکلے، لوگوں نے جب اس کو اس طرح بددعا کرتے ہوئے سنا تو کہنے لگے تم یہ کیا کررہے ہو، یہ تو تم ہمارے خلاف ہی بددعا کر رہے ہو، اس نے کہا یہ میرے اختیار میں نہیں ہے، میری زبان اس کے خلاف پر قادر نہیں ہے، بے ساختہ یہ جملے میری زبان سے نکل رہے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر بھی تباہی نازل ہوئی اور بلعم کو یہ سزا ملی کہ اس کی زبان اس کے سینہ پر لٹک گئی اب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہاری وجہ سے میری تو دنیا اور آخرت برباد ہوگئی اب دعا تو میری چلتی نہیں لیکن میں تمہیں ایک چال بتاتا ہوں اگر اس میں تم کامیاب ہوگئے تو اس طرح تم موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر غالب آسکتے ہو۔

وہ یہ ہے کہ تم اپنی حسین لڑکیوں کو مزین کرکے بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو اور ان کو یہ تاکید کردو کہ وہ لوگ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی کریں ان کو کرنے دو، یہ لوگ مسافر ہیں، مدت سے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں اس تدبیر سے ممکن ہے کہ یہ لوگ حرام کاری میں مبتلاء ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک زنا انتہائی مبغوض چیز ہے

جس قوم میں یہ ہو اس پر ضرور اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے وہ قوم فاتح نہیں ہو سکتی، اگر تم کر سکتے ہو تو یہ کام کرو، انہوں نے اسی طرح کیا بنی اسرائیل کا ایک بڑا آدمی اس چال کا شکار ہو گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو روکا مگر وہ باز نہ آیا اور شیطان کے جال میں پھنس گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنی اسرائیل میں سخت قسم کا طاعون پھیلا جس کی وجہ سے ایک دن میں ہی ستر ہزار اسرائیلی مر گئے یہاں تک کہ جس شخص نے اس بے حیائی کا ارتکاب کیا تھا اس جوڑے کو قتل کر کے منظر عام پر لٹکا دیا تا کہ دوبارہ کوئی شخص یہ حرکت نہ کرے اور توبہ کی تو اس وقت یہ طاعون ختم ہو گیا۔

تفسیر باللفظ:

ابتدائی آیات کے اندر یہی واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ پڑھیے آپ ان پر خبر اس شخص کی جس کو ہم نے اپنی آیات دیں پھر وہ ان آیات سے نکل گیا "فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ" پھر اس کے پیچھے شیطان لگ گیا دیکھو! آیات سے نکلا تو شیطان اس کے پیچھے لگا اگر وہ اللہ کے احکام کا پابند رہتا تو شیطان کو پاس آنے کی جرأت نہ ہوتی، پہلے انسان ڈھیلا ہوتا ہے پھر شیطان بعد میں آ کر دھکا لگاتا ہے، عمل کرنے والوں کے پاس بھی آتا ہے لیکن چھیڑنے کی جرأت نہیں ہوتی لیکن جہاں اس نے ارادے کے اندر کمزوری پائی کہ یہ شخص اب ڈھیلا ہو رہا ہے تو پھر وہ دھکا لگانے کے لیے آ جاتا ہے، خواہشات کی اتباع اور شیطان کے پیچھے لگ جانا یہ دونوں ایسے ہیں جیسے گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں، پھر رفتار تیز ہو جاتی ہے، "فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ" پھر ہو گیا وہ گمراہوں میں سے۔

اگر ہم چاہتے تو ان آیات کی برکت سے اسے اونچا کر دیتے، چاہنا وہی کہ اللہ کی مشیت کے بغیر کوئی کام ہوتا نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ظہور انسان کے عمل اور ارادے کے ساتھ ہوتا ہے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے لیکن اللہ کا چاہنا انہی اسباب کے تحت ہی ہے، اگر اللہ چاہتا یعنی زبردستی اگر اس طرح کرنا چاہتا تو یوں کر سکتا تھا لیکن اللہ نے جب اس کو اس کے ارادے پر چھوڑا اور اس کو عمل کی چھٹی دی پھر اس نے جو راستہ اختیار کیا تو اللہ کی مشیت کے تحت وہی نتیجہ نکل آیا "وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ" لیکن وہ تو زمین کی طرف مائل ہو گیا، خواہشات کی طرف مائل ہو گیا، اس نے اپنا مقصد انہی چیزوں کو بنا لیا جو زمین سے نکلتی ہیں "وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ" اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، یہ اتباع ھویٰ والی بات خوب اچھی طرح سے یاد ہو جائے تو انسان کو عملی زندگی اختیار کرنی آسان ہو جاتی ہے یہ نظریات کی تبدیلی پہلے ہے اور انسان کا عمل سیدھا بعد میں ہوتا ہے اور جب تک انسان کے اندر نظریاتی تبدیلی نہ ہو اس وقت

تک عمل درست نہیں ہوتا۔

کتے کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ:

"فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ" اس کا حال کتے کے حال کی طرح ہے، اگر تو اس پر حملہ کرے تو ہانپتا ہے اور اگر تو اس کو چھوڑ دے تو ہانپتا ہے، ہر جاندار اپنی زندگی کو باقی رکھنے کے لیے اس بات کا محتاج ہے کہ وہ اپنے اندر کی ہوا کو باہر پھینکے اور باہر کی تازہ ہوا اپنے اندر لے جائے، اگر اندر کی ہوا باہر نہ نکلے تو موت ہے اور اگر باہر کی تازہ ہوا اندر نہ جائے تو موت ہے گویا کہ اسی پر جاندار کی زندگی کا دارومدار ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمام جانداروں کے اندر یہ ایسا نظام بنادیا ہے کہ وہ بغیر کسی محنت اور مشقت کے اندر کی ہوا باہر پھینکتے ہیں اور باہر کی ہوا اندر لے جاتے ہیں، ان کو اس عمل میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی، قدرتی اور فطری طور پر یہ کام خود بخود ہوتا رہتا ہے لیکن تمام جانداروں میں صرف کتا ایک ایسا جانور ہے جس کو اپنے سانس کی آمد و رفت میں زبان نکال کر زور لگانا اور محنت کرنی پڑتی ہے اور دوسرے جانوروں کی یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب وہ تھک جائیں یا ان پر کوئی حملہ کرے، عام حالات میں ان کی یہ حالت نہیں ہوتی، اور کتے کی ہر وقت یہی حالت ہوتی ہے جیسا کہ قرآن کریم کے الفاظ "اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ" اسی بات پر دلالت کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے اس شخص کی کتے کے ساتھ مثال دی وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے اس کو یہ سزا ملی تھی کہ اس کی زبان منہ سے نکل کر سینہ پر لٹک گئی تھی اور وہ ہر وقت کتے کی طرح ہانپتا رہتا تھا خواہ اس پر کوئی حملہ کرے یا نہ کرے وہ ہر حال میں ہانپتا رہتا تھا "ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا" یہی مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا پس آپ ان پر واقعہ بیان کیجیے تا کہ یہ تفکر کریں، غور کریں، سوچیں کہ تم نے اپنے اوپر کتے کی مثال کو چسپاں کرنا ہے یا تم نے کامل انسانوں میں شمار ہونا ہے یہ تفکر و تدبر کرو، بری ہے مثال ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کرتے ہیں یعنی آیات کی تکذیب کر کے ہمارا نقصان نہیں کرتے، نقصان اپنا ہی کرتے ہیں۔

دنیا میں ہدایت اور ضلالت کے بارے میں انسان مجبور نہیں:

"مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ" جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جس کو اللہ گمراہ

کردے وہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں، جس کے حصہ میں ضلالت آگئی وہ خسارہ ہے، اور اللہ ہدایت کسے دیتا ہے اس کے اصول اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر واضح کردیے، تقویٰ اختیار کرو، خوف اختیار کرو، آخرت کو ترجیح دو، خواہشات کا مقابلہ کرو تو اللہ تعالیٰ آپ کے لیے وہ راستہ آسان کردیں گے جس راستہ کی طرف چلنا چاہو گے اور اپنے ارادے کو استعمال کروگے تو اللہ تعالیٰ وہ راستہ آسان کردیں گے۔

اس کی حقیقت آپ کے سامنے بالکل روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ ایک آدمی اذان کی آواز سنتا ہے تو حواس اس کے بیدار ہوجاتے ہیں، نرم، گرم بستر میں لیٹا ہوا ہے اور اذان کی آواز آئی تو انسان کے حواس بیدار ہوگئے اب جس وقت تک انسان عادی نہ ہو تو انسان کے قلب میں کشاکشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اٹھوں یا نہ اٹھوں، اب یہ اٹھوں نہ اٹھوں یہی ہدایت اور ضلالت کا چکر ہے، اب یہ جو دو خیال آپ کے دل میں آگئے اب ایک طرف اور جانب کو آپ نے اپنے ارادے کے ساتھ تقویت پہنچائی ہے، اگر نہ اٹھوں کا ارادہ کرلیا تو فوراً نیند آجائے گی اللہ نے وہ بھی آپ کے لیے آسان کردیا، سورج نکلنے تک لیٹے رہو گے اور اگر آپ نے اٹھنے کا ارادہ کرلیا تو اللہ وہ بھی آپ کے لیے آسان کردے گا، اٹھنے والے بھی کوئی دقت محسوس نہیں کرتے، اور ارادہ کرنے کے بعد سونے والے بھی کوئی دقت محسوس نہیں کرتے، یہ دو جہتیں جو ہیں یہی اختیار کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اختیار دیا ہے، اگر آپ مجبور ہوتے تو ایک ہی خیال آتا دوسرا نہ آتا، یا اٹھنے کا خیال آتا تو آپ اٹھنے پر مجبور تھے یا لیٹے رہنے کا آتا تو آپ لیٹے رہنے پر مجبور تھے لیکن بیک وقت دونوں خیالوں کا قلب کے اندر آنا کہ اٹھوں یا نہ اٹھوں یہ علامت ہے کہ اس درجہ میں اللہ نے آپ کو اختیار دے دیا ہے اس لیے تو دونوں خیال آئے۔

اور پھر جب چاہیں آپ دونوں اختیار استعمال کر کے دیکھ لیں، ایک دن یہ ارادہ کرلیں کہ نہیں اٹھنا تو نہیں اٹھو گے اور ایک دن ارادہ کرلو کہ اٹھنا ہے تو اٹھ جاؤ گے۔ یہیں سے آگے آپ کے عمل کی زندگی شروع ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اختیار کو استعمال کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی مشیت متعلق ہو کے انسان کے لیے وہ راستہ واضح کر دیتی ہے، جدھر کو چلنا چاہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھٹی ہے، چاہے تم کفر کرو چاہے تم ایمان لے آؤ، کفر کرو گے نتیجہ یہ نکل آئے گا، ایمان لاؤ گے نتیجہ یہ نکلے گا، ہر وقت اپنے قلب کی کیفیت دیکھ لیا کرو اختیار تمہیں خود معلوم ہوگا اچھائی برائی کے خیال دونوں تمہارے قلب کے اندر آتے ہیں تو یہ علامت ہے کہ اللہ نے تمہیں اختیار دیا ہے اور پھر جیسے جیسے ارادہ متعلق کرتے چلے جاؤ گے وہی راستہ آسان ہوتا چلا جائے گا۔

یہاں چوک میں کھڑے ہو جاؤ اور دیکھو کہ ایک راستہ مسجد کی طرف جا رہا ہے اور ایک راستہ سینما کی طرف جا رہا ہے، وقت دونوں کا ہو چکا ہے، دونوں خیال آئیں گے کہ ادھر کو جائیں یا ادھر کو جائیں یہ دونوں خیالوں کا آنا علامت ہے کہ آپ کو اختیار ہے، پھر جدھر کو ارادہ کرو گے قدم ادھر کو اٹھنے شروع ہو جائیں گے، دونوں ہی راستے آسان ہیں کیونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ جبر نہیں کرتا کہ آپ کو کان سے پکڑ کر نیکی کروالے دنیا میں یہ اللہ تعالیٰ کا اصول نہیں ہے، اتنا سا اختیار دے کے تمہیں چھوڑ دیا ہے اب جدھر کو جاؤ گے اللہ تعالیٰ وہ راستہ تمہارے لیے آسان کرتے چلے جائیں گے "مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِي" جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے "وَمَن يُضْلِلْ" اور جس کو اللہ بھٹکا دے "فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ" تو یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں، معلوم ہو گیا کہ ضلالت میں پڑنا خسارہ ہے اور ہدایت کو اختیار کرنا یہ اصل میں کامیابی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی:

"وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ" یہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اطمینان اور تسلی کی بات ہے کہ آپ اتنا سمجھاتے تھے، اتنی ان کے سامنے وضاحت کرتے تھے لیکن کچھ لوگ اس کو اختیار کرتے تھے اور کچھ اختیار نہیں کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہیں کہ ہم نے پیدا کیا جہنم کے لیے بہت سے جنوں اور انسانوں کو، جنوں میں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی بہت ساروں کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے، وہ جہنم میں ہی جائیں گے۔

تطبیق بین الآیات:

لیکن یہاں پھر وہ سوال ابھرتا ہے کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ تو آیا ہے "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے تا کہ وہ میری عبادت کریں تو وہاں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ بہت سارے جہنم کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تو دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

اس تعارض کو علمی اصلاح میں اس طرح اٹھایا گیا ہے کہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" میں "لیعبدون" میں جو لام ہے یہ غایت تشریعی ہے، شریعت کا تقاضہ یہی ہے کہ ہر انسان اللہ کی عبادت کے لیے پیدا

کیا گیا ہے اور "ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ" میں جولام ہے یہ لام عاقبت ہے، لام عاقبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کرنے والے کا ارادہ تو وہ نہیں ہوتا لیکن نتیجہ یہی نکلتا ہے، وہ مقصود نہیں ہوتا لیکن انجام یہی نکلتا ہے "شرح مأة عامل" میں آپ نے اس کی مثال یہ پڑھی تھی "لَزِمَ الشَّرَّ لِلشَّقَاوَةِ" جس شخص نے شر کو لازم پکڑا نتیجہ بدبختی ہے لیکن جب کوئی شخص شر کو لازم پکڑتا ہے تو کیا اس کا مقصود ہوتا ہے کہ میں بدبخت ہو جاؤں؟ بدبخت ہونا اس کا مقصود تو نہیں ہوتا لیکن جب اس نے شر کو لازم پکڑا تو نتیجہ بدبختی ہے لام عاقبت کا یہ معنی ہوتا ہے یعنی تکوینی طور پر تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ بعض جنت میں جائیں گے اور بعض جہنم میں جائیں گے لیکن ہم نے جو پیدا کیا ہے وہ عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، ہر کسی سے مطالبہ عبادت کا ہے لیکن نتیجہ یہ نکلے گا کہ بعض لوگ عبادت کریں گے اور جنت میں جائیں گے اور بعض نہیں کریں گے جہنم میں جائیں گے، جو نہیں کریں گے جہنم میں جائیں گے یوں سمجھو کہ وہ پیدا ہی جہنم کے لیے ہوئے ہیں، تو یہ لام، لام عاقبت ہے یہ لام غایت نہیں ہے کہ متکلم کا مقصود یہ نہیں ہے ہاں البتہ نتیجہ یہ ہے، ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا تو اس لیے کیا کہ وہ اللہ کی عبادت کر کے جنت حاصل کر لیں لیکن ہمارے پیدا کرنے کے نتیجہ میں بہت سارے ایسے ہوں گے جو عبادت نہیں کریں گے اور جہنم میں جائیں گے، بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ پیدا ہی جہنم کے لیے کیے گئے ہیں۔

اکثریت کا اصول کسی چیز کے حق اور باطل ہونے کی دلیل نہیں:

"كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ" اور یہ بہت بڑی تعداد ہوگئی یہ نہیں کہ تھوڑے سے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بہت سارے لوگ مل کر کوئی کام کرنے لگ جائیں تو یہ اس کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں ہے، تعداد کو دیکھ کے کسی چیز کے حق ہونے کو متعین نہیں کیا جا سکتا، جیسے آپ نے جمہوریت کا اصول اپنا لیا کہ جہاں لوگوں نے مل کے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے تو وہاں قانون بن گیا کہ ٹھیک ہے اور جہاں لوگوں نے مل کے کہہ دیا کہ ٹھیک نہیں ہے وہاں قانون بن گیا کہ ٹھیک نہیں ہے، حق کو اکثریت کے تابع کر دیا کہ اکثریت ہی عنوان ہے حق ہونے کا یہ نہایت غلط اصول ہے اس سے بدتر اصول دینی اعتبار سے اور کوئی نہیں ہے، اب ایک طرف تو امام غزالی جیسے مثال کے طور پر علم والا، فہم والا، عقل والا، اور اس کے مقابلہ میں ننانوے گدھے اور بکریاں چرانے والے ہیں، جنہوں نے صبح سے لے کر شام تک گدھوں پر اینٹیں ڈھوئی ہیں یا بکریاں چرائی ہیں جن کو استنجا کرنے کی بھی تمیز نہیں اور ووٹ لے لیا گیا کہ

یہ کام کیسا ہے تو ننانوے گدھے ایک طرف ہو گئے اور ایک امام غزالی ایک طرف ہو گیا جمہوریت کہتی ہے کہ جو گدھے کہیں وہ ٹھیک ہے اور جو امام غزالی کہتے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہے، جمہوریت کا تو یہی اصول ہے اس میں انسانوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا، اس لیے اس کا نتیجہ جو آج دنیا بھگت رہی ہے وہ آپ کے سامنے ہے کہ حق اب حق رہا ہی نہیں، بس جس طرف لوگ زیادہ اکٹھے ہو گئے اب وہی صحیح ہو گئی دنیا ساری کی ساری بربادی کے کنارے پر آ گئی۔

اور قرآن کریم نے کتنا واضح اعلان کیا کہ "اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" جو لوگ زمین پر موجود ہیں ان میں سے اگر اکثریت کی اتباع کا اصول اپناؤ گے تو یہ تمہیں اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گے، سارا ماحول غلط ہوتا ہے، ایک اللہ کا نمائندہ آتا ہے حق کی آواز اٹھانے والا، حق ایک کے ساتھ ہوتا ہے، ساری کی ساری بستی سارے کا سارا شہر گمراہ ہوتا ہے، تو اکثریت کیسے حق ہو سکتی ہے؟ انبیاء ﷺ جس ماحول میں آتے ہیں تو حق کی آواز اٹھانے والا ایک ہوتا ہے اور سارا ماحول اس کے خلاف ہوتا ہے اب اگر اکثریت کو دیکھا جائے تو چاہیے کہ نبی ان میں مدغم ہو جائے لیکن حق ایک کے ساتھ ہوتا ہے ساری بستی کے ساتھ نہیں ہوتا ہے اس لیے حق کی تعیین دلیل کے ساتھ ہوتی ہے نا کہ سروں کی گنتی کے ساتھ، عقل کے ساتھ تعیین ہوتی ہے کہ یہ حق ہے یا باطل، سر گننے کے ساتھ نہیں ہوتی، اور ایک سر جس میں اللہ تعالیٰ نے عقل اور دماغ رکھا ہے اس کی بات سب پہ وزنی ہو گی اور دوسری خالی کھوپڑیوں کو کچھ نہیں پوچھنا چاہیے تو یہ بھی جنوں اور انسانوں کا وہاں بڑا اجتماع ہو گا، اور اتنی اکثریت ہو گی کہ بالکل حقیقت ہے کہ جمہوریت کے تقاضہ میں تو جہنم ہی ٹھیک ہے۔

حدیث شریف میں صاف آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو آواز دیں گے کہ جہنم کا لشکر اپنی اولاد میں سے ایک طرف کر دے، آدم کہیں گے یا اللہ! "مَنْ كَمْ كَمْ" کتنوں میں سے کتنے؟ اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے، یعنی فی ہزار میں سے ایک جنتی اور نو سو ننانوے جہنمی ہوں گے، بتاؤ جمہوریت کدھر جا رہی ہے؟ تو یہ جمہوریت کے پجاری وہاں کہیں کھڑے نہ ہو جائیں کہ جی جمہوریت تو ادھر ہے ہم اس کو اختیار کریں گے، اس سے معلوم ہو گیا کہ ہر دور کے اندر اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں کی اور اللہ کے باغیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور اللہ کے فرمانبردار تھوڑے ہوتے ہیں۔

تو حق کی تعیین دلیل کے ساتھ ہوتی ہے، حق کی تعیین آدمی گننے کے ساتھ نہیں ہوا کرتی، ایک آدمی کا فکر

دوسو گدھوں کے دماغ میں نہیں آسکتا، جو فکر ایک آدمی کا ہوتا ہے دوسو گدھوں کے دماغ میں وہ بات نہیں آسکتی اس لیے اگر تعداد دیکھو گے تو گدھے زیادہ ہیں۔

"اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ" کی مفصل مدلل تشریح:

تو تکوینی طور پر نتیجہ یہ نکلنے والا ہے کہ بہت سارے لوگ جہنم میں جائیں گے اور اس دنیا میں ان کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس دل ہیں لیکن ان دلوں کے ساتھ سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں لیکن ان کے ساتھ سنتے نہیں، یہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، لیجئے یہ ایک بات آگئی کہ دل ہیں لیکن سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں، کان ہیں لیکن سنتے نہیں، اب یہ کافر، مشرک، خدا کے نافرمان کیا یہ سارے ایسے ہیں کہ ان کے پاس دل ہیں سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں دیکھتے نہیں، کان ہیں سنتے نہیں، اندھے، بہرے کیا یہ سارے ایسے ہی ہیں حالانکہ وہ آپ سے زیادہ سنتے ہیں، آپ سے زیادہ دیکھتے ہیں اور آپ سے زیادہ سمجھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کہتا ہے "صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ" یہ سارے ہی ایسے ہیں کہ اندھے ہیں، گونگے ہیں، بہرے ہیں، بے عقلے ہیں۔

بات اصل میں یہ ہے کہ یہ چیز تھوڑا سا تدبر کو چاہتی ہے اللہ نے پتھر پیدا کیا بظاہر اس میں کوئی صلاحیت نہیں، یہ متحرک بالارادہ نہیں ہے، یہ نامی بھی نہیں ہے، اس سے اوپر درجہ نباتات کا آگیا، نباتات میں پتھر سے زیادہ صلاحیتیں ہیں، اب ایک درخت کٹ گیا تو کٹنے کے بعد وہ نامی نہ رہا تو اس میں اور پتھر میں کوئی فرق نہیں، جب تک وہ جڑ پہ کھڑا ہے وہ نامی ہے لیکن جب وہ کٹ گیا تو اس میں اور پتھر میں کوئی فرق نہیں ہے اب وہ محض جسد ہے، جوہر ہے اس میں نمو نہیں رہا، اور جہاں تک پتھر کی صلاحیتوں اور اس درخت کی کیفیت کا تعلق ہے تو ان میں کوئی فرق نہیں، اب یہ درخت بھی اس پتھر کی طرح ہو گیا اور اس کے بعد حیوانات کا درجہ ہے، یہ منطق کی اصطلاح میں متحرک بالارادہ ہیں، ان کو اللہ نے آنکھیں دی ہیں جن سے یہ دیکھتے ہیں، ان کو کان دیے ہیں جن سے یہ سنتے ہیں، ان کو دل دیا ہے اپنی ضروریات کے مطابق اس سے سوچتے ہیں یہ حیوانات کا درجہ ہے اور ان حیوانات میں سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اور زیادہ ممتاز کر دیا کہ حیوان ہونے میں تو یہ باقی حیوانات میں مشترک ہے اور امتیاز یہ حاصل ہوا کہ انسان ناطق ہے، انسان چونکہ حیوان ناطق ہے اس لیے باقی حیوانات سے ممتاز ہے۔

ناطق ہونے سے کیا مراد ہے؟ نطق آپ کو ظاہری بھی حاصل ہے اور باطنی بھی حاصل ہے، باطنی نطق یہ ہے کہ آپ استدلال کرتے ہیں اور استدلال کر کے مجہولات کو معلومات کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں، یہ خاصہ صرف انسان کا ہے، مجہولات کا اکتساب کرنا معلومات کے ذریعہ سے کہ چند باتیں معلوم ہیں ان کو آپ جوڑتے ہیں تو جوڑنے کے بعد ایک مجہول بات کو معلوم کر لیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان صرف ان سطحی چیزوں کو دیکھنے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ کلیات سے نتائج اخذ کرتا ہے، جزئیات سے کلیات بناتا ہے، کلیات سے پھر آگے نتائج اخذ کرتا ہے، اصل کے اعتبار سے انسان کی یہ پوزیشن ہے۔

اب اگر اس انسان کی آنکھ میں، کان میں، فہم میں حیوان ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی ناطقیت سے کام نہیں لیا، حیوان کا کیا کام ہے؟ حیوان اپنی خوراک تلاش کرتا ہے جو اس کی ضرورت ہے، مثلاً درندے گوشت کھاتے ہیں تو وہ گوشت کو تلاش کرتے ہیں اور گوشت ہی ان کو ملتا ہے، پرندے دانہ کھاتے ہیں تو دانہ انہیں ملتا ہے، وہ اپنی خوراک تلاش کرتے ہیں اور پوری کوشش سے تلاش کرتے ہیں، جوان کا مقصود ہے اسی کو وہ حاصل کرتے ہیں، اور حیوانات اپنے رہنے کے لیے جگہ بھی بناتے ہیں، چڑیا تک اپنا گھونسلہ بناتی ہے، پدی تک اپنا گھونسلہ بناتی ہے، چیونٹیاں اپنی بل بناتی ہیں، چوہے اپنا بل کھودتے ہیں یعنی جیسا انہوں نے اپنے لیے مناسب سمجھا ہے، آپ یہ نہ کہیں کہ جی وہ بلوں (سوراخوں) میں رہتے ہیں اور ہم کوٹھیوں میں رہتے ہیں، یہ فرق ہے، ارے بھائی فرق نہیں ہے اگر تمہیں ان کی جگہ پسند نہیں ہے تو انہیں بھی تمہاری کوٹھی پسند نہیں ہے، وہ تمہاری کوٹھی میں بھی آئیں گے تو اپنی بل کھود کے ہی رہیں گے یہ تو اپنی اپنی پسند ہے یعنی اگر ہمیں چڑیوں کا گھونسلہ پسند نہیں تو چڑیوں کو ہمارا کمرہ کب پسند ہے، وہ اپنے اس تنکوں کے گھونسلے میں مست ہیں کہ یہی ہماری کوٹھی ہے۔

اور ان میں وہ اپنی پوری راحت اور آرام کی رعایت رکھتے ہیں، اور حیوانات کی خواہشات بھی ہیں نر اور مادہ کا جوڑ بھی بنا ہوا ہے، نر کا رجحان مادہ کی طرف ہے، مادہ کا رجحان نر کی طرف ہے تو اس طرح سے ان کا خاندان بھی بنا ہوا ہے اور پھر اس کے نتیجہ میں اولاد بھی جنتے ہیں اور اولاد کے ساتھ پیار بھی کرتے ہیں، اولاد کی ضروریات کا خیال بھی رکھتے ہیں، کتیا کو دیکھو کہ وہ اپنے بچوں کو کس طرح سے پالتی ہے، بندریہ کو دیکھو کہ کس طرح ہر وقت اپنے بچہ کو سینہ کے ساتھ لگائے پھرتی ہے، اور ایک لباس کی بات رہ گئی اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ویسے ہی مستغنی کر دیا

کہ ان کو اس قسم کے بال اور پر دے دیے کہ جو نہ کبھی میلے ہوتے ہیں اور نہ پھٹتے ہیں ان کی یہ ضروریات اس طرح پوری ہوگئی تو ان بدنی ضرورتوں میں آپ میں اور حیوان میں کیا فرق ہے؟ ایک بندر کی زندگی کا مطالعہ کر کے دیکھ لو کہ وہ اپنی ہر ضرورت کس انداز کے ساتھ پوری کرتا ہے، اپنے ہم جنس کے ساتھ مل کے کس طرح خوش ہوتے ہیں، اگر آپ نے سارے کا سارا عقل وفکر، اپنی آنکھ، ناک، کان، زبان، سب کو استعمال کر کے روٹی، کپڑا، اور مکان ہی لیا تو آپ کس طرح حیوان سے ممتاز ہوئے؟

یہ آپ نہیں کہہ سکتے کہ ہم تو اچکنیں پہنتے ہیں، کمبل لیتے ہیں، ان کے کمبل اور ان کی اچکنیں تمہارے کمبلوں اور اچکنوں سے ہزار درجہ اچھی ہیں جو نہ دھوبی کی محتاج نہ درزی کی محتاج، اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنا شاندار لباس دیا ہوا ہے کہ وہ اس کے ساتھ سردی گرمی سے بچتے ہیں، اگر نتیجہ روٹی، کپڑا اور مکان ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ نے آنکھ سے حیوان سے زیادہ کیا کام لیا، اور آپ نے کان سے حیوان سے زیادہ کیا کام لیا، اور آپ نے اپنے دل ودماغ سے حیوان سے زیادہ کیا کام لیا، اگر سارے کا سارا چکر اتنا ہی ہے کہ پیٹ کی خواہش پوری کرنی ہے، بدن کی خواہش پوری کرنی ہے، اور جیب اور پیٹ بھرا ہوا ہونا چاہیے اگر آپ کی ساری کی ساری قوت فکر یہ اسی نقطے کے ارد گرد گھوم رہی ہے تو تم حیوان سے کس طرح ممتاز ہوئے؟ تو اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو صلاحیتیں دی تھیں اور آپ نے ان کو استعمال نہیں کیا اور انہی سفلی خواہشات کے پیچھے لگ کر حیوانی درجہ میں رہ گئے تو یوں سمجھو کہ نہ آپ نے آنکھ سے کام لیا، نہ کان سے کام لیا، نہ دل ودماغ سے کام لیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو صلاحیتیں دی تھیں آپ نے تو حیوانیت کے درجے سے آگے نکل کر کچھ اور کام کرنا تھا، ہوا میں اڑنا حیوانیت سے باہر نہیں ہے کہ آپ کہیں کہ ہم نے تو جہاز بنا لیے ہم کس طرح اڑتے پھرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ ابھی تک تم اس طرح اڑنے پر قادر نہیں ہوئے جس طرح چڑیا اڑتی ہے، تم اڑنے کے لیے کس قسم کی مشینریوں کے محتاج ہو، اور اترنے کے لیے کس قسم کے میدان کے محتاج ہو؟ اور چڑیا کو نہ ہوائی اڈہ کی ضرورت اور نہ پٹرول کی ضرورت، وہ جب چاہے اڑ جائے اور جدھر چاہے چلی جائے، باز اڑتا ہے، کس طرح اڑتا ہے، گدھ اڑتی ہے کس طرح سے اڑتی ہے، پرندے اڑتے ہیں کس طرح سے اڑتے ہیں، پانی میں تم تیرنے لگ گئے، سمندروں کی تہہ میں تم پہنچ گئے، کیا وہاں پر حیوانات نہیں پہنچتے؟ وہ کیا پانی میں نہیں تیرتے، وہ تمہاری طرح مشین کے محتاج نہیں، لوہے کے محتاج نہیں، لکڑی کے محتاج نہیں، جہاں تک بھی تم اپنی ترقی کو دیکھ لو تمہاری کوئی ترقی بھی حیوانیت کی حدود

سے باہر نہیں ہے۔

تو اگر انسان ہو کے اسی چکر میں رہ گئے روٹی، کپڑا اور مکان اور یہی راحت و آرام یا روس کی طرح ٹکر مار کے دوسرے پر چڑھ جاؤ تو یہ تو مینڈھے بھی کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کو دبانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ میری حدود میں نہ آئے، تمہاری یہ خصلت بھی حیوانوں میں موجود ہے۔

تو یہ روٹی، کپڑا اور مکان کا چکر، اپنے مدمقابل پر غلبہ پانے کا جذبہ، ہوا میں اڑنے اور سمندر کی تہہ میں پہنچنے کی بات ساری زندگی میں اگر آپ نے یہی حاصل کیا ہے تو معاف کرنا آپ حیوانیت کی حدود سے باہر نہیں نکلے۔

جب آپ حیوانیت کی حدود سے باہر نہیں نکلے تو کتنی بڑی حقیقت ہے جس کو قرآن نے کہا "اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ" اب اس میں کوئی شک کی بات ہے؟ یہ کتنی بڑی حقیقت کی ترجمانی ہے، یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں اور پھر صرف اتنی بات نہیں "بَلْ هُمْ اَضَلُّ" یہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

ان سے زیادہ بھٹکے ہوئے کیسے؟ کہ چوپایوں کو اللہ نے جس مقصد کے لیے پیدا کیا تھا اور جتنی صلاحیتیں ان کو دی تھیں وہ سب انہوں نے استعمال کر کے اپنا مقصدِ زندگی پالیا ہے، ان کے سامنے کوئی اور بات ہے ہی نہیں، اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے بہت صلاحیتیں دی تھیں اور تم صرف حیوان کی حدود تک رہ گئے تو تم تو زیادہ بھٹکے ہوئے ہو، تمہیں تو اتنی بھی ہدایت نہیں جتنی حیوانات کو ہوتی ہے کم از کم وہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال تو کرتے ہیں اس طرح سے کہو تو "بَلْ هُمْ اَضَلُّ" ٹھیک ہے۔

"اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ" کی دوسری تفسیر:

اور اگر ایک بات اور کہہ دوں وہ تھوڑی سی تفصیل طلب ہے لیکن ہے مزیدار کہ چیز جتنی اچھی ہوتی ہے جب وہ بگڑتی ہے تو اس کا بگاڑ بھی سب سے زیادہ ہوتا ہے، ایک روٹی ہے، دو دن پڑی رہے تو کیا ہوگا، ذرا اکڑ ہی جائے گی اس میں سے بو نہیں آئے گی، کیڑے نہیں پڑیں گے لیکن کھیر ہے، مٹھائی ہے اور اس قسم کی چیز جو روٹی کے مقابلہ میں بہت لطیف ہے وہ اگر باسی ہوگئی، سڑ گئی تو برتن میں ناک نہیں دیا جاتا، تو جو چیز اچھی ہوتی ہے جب اس میں بگاڑ آتا ہے تو اس کا بگاڑ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اسی طرح انسان جب بگڑتا ہے تو ماشاء اللہ اشرف المخلوقات ہے تو جب اس اشرف المخلوقات میں بگاڑ آتا

ہے تو بگاڑ بھی آخری سرے کا آتا ہے، یہ صرف مفروضہ نہیں ہے میں آپ کے سامنے ایک مثال دیتا ہوں غصہ اللہ نے آپ کو بھی دیا اور حیوان کو بھی دیا، اب حیوان کو کوئی شخص یا دوسرا حیوان چھیڑے اور اس کی مرضی کے خلاف کرے تو وہ سینگ مارتا ہے یہ وہی غصہ والی بات ہے کہ وہ مدافعت کرتا ہے یا کسی جگہ وہ جارحیت کرتا ہے، اب کسی وقت وہ جانور جس کے اس نے سینگ مارا تھا ایک دوسرے سے ہٹ جاتے ہیں تو کیا ان جانوروں کا آپس میں ایک دوسرے کے خلاف بغض رہ جاتا ہے؟ ایک گدھے نے دوسرے گدھے کو لات ماری تھی تو کیا وہ گدھا دوسرے گدھے کے باپ سے انتقام لیتا ہے؟ اس کے بیٹے سے انتقام لیتا ہے؟ اس کے خاندان کے پیچھے پڑ جاتا ہے؟

لیکن اگر انسان کو انسان پر غصہ آجائے تو کیا اسی پر رہتا ہے جس پر آیا تھا یا اس کے ماں باپ، بہن بھائی، بیٹا پوتا، دادا پردادا تک یہ بات چلتی ہے؟ تو یہ آپ کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے کہ جہاں غصہ آیا تھا آپ وہیں نہیں نکلے اور اس غصہ نے کہاں تک فساد پھیلا دیا، اتنا سا غصہ تو مناسب تھا کہ اگر آپ کو کوئی نقصان پہنچا رہا ہے تو آپ اس کا دفاع کیجئے لیکن یہ نسلوں تک جو چلا جاتا ہے پھر اس کا باپ ہاتھ آجائے تو اس کو نہیں چھوڑنا، بیٹا ہاتھ آجائے تو اس کو نہیں چھوڑنا، اس کی جائیداد ہاتھ آجائے تو وہ برباد کر دینی ہے، یہ سارے کا سارا غصہ کا فساد ہے کہ جہاں غصہ آیا تھا وہیں نہیں رہا اور وہ کہاں تک پھیل گیا۔

اللہ تعالیٰ نے طبیعت کے اندر شہوت کا جذبہ رکھا ہے، یہ حیوان میں بھی ہے، انسان میں بھی ہے، حیوان کی نسل بھی اسی اصول سے چلتی ہے، انسان کی نسل بھی اسی اصول سے چلتی ہے لیکن حیوان کو آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ اس جذبہ میں بے ارادہ ہو کے اپنی جنس کے علاوہ کسی دوسرے میں قضاء شہوت کرنے لگ جائے، کوؤں کو آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ چڑیوں کے پیچھے لگے ہوئے ہوں، سنڈھوں کو آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ بکریوں کے پیچھے لگے ہوئے ہوں، ان کے شہوانی جذبہ میں کبھی یہ بگاڑ نظر نہیں آیا، فطرت نے ان کا جو راستہ متعین کر دیا ہے وہ اسی پر چلتے ہیں۔

لیکن اگر یہ اشرف المخلوقات بگڑ جائے تو یہ کیا کیا تماشے دکھاتا ہے؟ جب انسان بھٹکتا ہے تو کیا یہ حیوان سے زیادہ نہیں بھٹکتا؟ حیوان تو جس طرح بھی ہو کسی درجہ میں رہ جائیں گے پھر جس وقت اس کی شہوت آزاد ہوتی ہے پھر یہ نہ مرد مرد کو چھوڑے، مرد نہ بھینس کو چھوڑے، نہ بکری کو چھوڑے، نہ گائے کو چھوڑے، یہ اپنے شہوانی جذبہ میں اس طرح اندھا ہوتا ہے کہ جو چیز سامنے آجائے وہ اس کا شکار ہو جاتی ہے، تو انسان میں جب بگاڑ آتا ہے تو اس

طرح آتا ہے اسی طرح باقی چیزیں ہیں یعنی مدرک کلیات ہونے کی وجہ سے پھر یہ کلیے ہی بنالیتا ہے اور پھر اس میں سے جزئیات نکالنے کی کوئی حد نہیں ہوتی کہ اس کے قضاء شہوت کے کتنے طریقے ہیں آپ ان کو شمار نہیں کر سکتے، یہ اس کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔

اس لیے جب انسان بھٹکتا ہے تو صرف جانور ہی نہیں رہتا، اسی حد تک نہیں رہتا جس حد تک حیوان ہے بلکہ وہ پھر "بَلْ هُمْ اَضَلُّ" اس سے بھی آگے نکل جاتا ہے، اس کی ضلالت حیوانات سے بھی آگے نکل جاتی ہے، اب یہ جو حقیقت آپ کے سامنے ان الفاظ میں بیان کردی گئی اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہے؟ آپ یہ کہیں کہ کیسے ان کو جانوروں کی طرح کہہ دیا گیا؟ یہ تو پینٹ پہنتے ہیں، کوٹ پہنتے ہیں، ہوائی جہازوں میں اڑتے ہیں، سمندروں میں سفر کرتے ہیں، میں کہتا ہوں سب کچھ ہونے کے باوجود یہ جانور ہیں بلکہ جانوروں سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، یہ حقیقت ہے۔

لیکن آج ایک پردہ ہے جس دن حقائق رونما ہوں گے اس دن پتہ چلے گا کہ ان میں سے کتنے حقیقت میں بندر تھے جن کے اوپر روپ انسان کا تھا اور کتنے ان میں سے خزیر تھے جن کے اوپر چمڑا انسان کا تھا، شکل انسان کی ہے لیکن حقیقت میں حیوان سے بھی بدتر ہے، جیسے میں نے ایک دو مثالیں آپ کے سامنے دیں کہ جب انسان اس سطح پر اترتا ہے، خون ریزی پر اترا، شہوت رانی پر اترا تو اس کی کوئی حد نہیں ہے، چیرنے پھاڑنے والا درندہ کوئی اس طرح سے درندگی نہیں کرتا جس طرح سے درندگی پھر انسان کرتا ہے، شہوتی جانوروں میں سے سب سے زیادہ شہوتی جانور گدھا مشہور ہے لیکن جب انسان بے راہ ہوتا ہے تو سو گدھے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے جتنی یہ شہوت رانی کرتا ہے، جب انسان بگڑتا ہے تو یوں بگڑتا ہے تو اس لیے ہمارے سامنے یہ حقیقت تو ایسے ہے جیسے دوپہر کا سورج کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی مرضی۔

قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنے اندر کس قسم کے دریا اور سمندر لیے ہوئے ہے، حقیقت انسانی کو سمجھانے کے لیے کتنی معیاری چیز ہے، "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ" یہی لوگ بے خبر ہیں، جو اللہ کے احکام کی رعایت نہیں رکھتے وہ غافلوں میں سے ہیں اور یہی ہیں جو نہ اپنی آنکھوں سے کام لیتے ہیں اور نہ کانوں سے کام لیتے ہیں، نہ دلوں سے کام لیتے ہیں، جانور کے جانور ہیں، روٹی، کپڑا اور مکان ان کا نعرہ ہے اور اس حد کے اندر رہتے ہوئے یہ حیوانوں سے کبھی برتر نہیں ہو سکتے اور یہ چیزیں جیسے جانوروں کو سکون و اطمینان کے ساتھ میسر ہیں ان کو یہ چیزیں کبھی میسر نہیں آسکتیں۔

"اسماء حسنیٰ" کے ساتھ دعا کرنے کا حکم:

"وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا" اچھے اچھے نام اللہ کے لیے ہیں اسی کو پکارا کرو ان ناموں کے ساتھ یا اسی کے سامنے دعا کیا کرو ان ناموں کے ساتھ تاکہ یہ غفلت دور ہو، غفلت دور ہوگی تو تم سے حیوانیت چھوٹے گی اور پھر تم کمال کے درجہ کی طرف جاؤ گے، یہ آگے عبادت کا طریقہ بتایا اس حیوانی حدود سے باہر نکلنے کے لیے، اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں انہی کے ساتھ اس کے سامنے دعا کرو، انہی ناموں کے ساتھ اس اللہ تعالیٰ کو پکارو اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں، اللہ کے ناموزوں نام استعمال کرتے ہیں یا اللہ کے نام کسی دوسرے پر چسپاں کرتے ہیں یا اللہ کے ناموں کا ناجائز کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں، یہ سب "الحاد فی اسماء اللہ" ہیں جو اللہ کے ناموں میں الحاد کرتے ہیں ان کو چھوڑ دیعنی ان سے کوئی تعلق نہ رکھو "سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ" عنقریب بدلہ دیے جائیں گے یہ ان کاموں کا جو یہ کرتے ہیں۔

"وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ یَّھْدُوْنَ بِالْحَقِّ" جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ان میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتی ہے، سارے انسان برے نہیں ہیں ان میں سے حق کے مطابق چلنے والے بھی موجود ہیں "وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ" اور حق کے مطابق عدل کرتے ہیں، اس گروہ کا علیحدہ تذکرہ کر دیا۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾

اور وہ لوگ جو جھٹلاتے ہیں ہماری آیات کو ہم ان کو درجہ بدرجہ لیے جا رہے ہیں ایسی جگہ سے کہ ان کو علم بھی نہیں ہے ﴿۱۸۲﴾

وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ

اور میں انہیں ڈھیل دیتا ہوں، بے شک میری خفیہ تدبیر مضبوط ہے ﴿۱۸۳﴾ کیا یہ سوچتے نہیں کہ ان کے ساتھی کو کوئی

مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ

جنون نہیں ہے، نہیں ہے وہ مگر ڈرانے والا واضح طور پر ﴿۱۸۴﴾ کیا یہ غور نہیں کرتے سلطنت میں

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى

آسمان و زمین کی اور اس چیز میں جس کو اللہ نے پیدا کیا اور اس بات میں

اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

کہ شاید ان کی اجل قریب آگئی ہو پس اس کتاب کے بعد یہ کس بات پر ایمان لائیں گے ﴿۱۸۵﴾

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ

جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے اس کو کوئی راستہ دکھانے والا نہیں اور اللہ انہیں چھوڑتا ہے ان کی سرکشی میں اور یہ بھٹکتے ہیں

يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا

بھٹکتے ﴿۱۸۶﴾ سوال کرتے ہیں آپ سے قیامت کے متعلق کہ کب ہوگا اس کا وقوع، آپ کہہ دیجئے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؔ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ

اس کا علم میرے رب کے پاس ہے، نہیں ظاہر کرے گا اس قیامت کو اس کے وقت پر مگر وہی، وہ قیامت بوجھل ہے آسمانوں میں

وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ

اور زمین میں نہیں آئے گی وہ تمہارے پاس مگر اچانک، یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ اس قیامت کے متعلق مکمل تحقیق کرنے والے ہیں،

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ قُلْ

آپ کہہ دیجئے سوائے اس کے نہیں اس کا علم اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ بے علم ہیں ﴿۱۸۷﴾ آپ کہہ دیجئے کہ

لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ

نہیں اختیار رکھتا میں اپنے لیے نفع کے حاصل کرنے کا اور نہ نقصان کے دور ہٹانے کا مگر جو اللہ چاہے، اور اگر میں

اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۖ وَمَا مَسَّنِىَ السُّوْٓءُ ۚ

غیب کو جانتا ہوتا تو میں خیر کثیر کو حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی،

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع

نہیں ہوں میں مگر ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ان لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں ﴿۱۸۸﴾

تفسیر:

دنیا میں کفار کے عیش وآرام کے متعلق مفصل مدلل بحث:

پچھلے رکوع کی آخری آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے ایک جماعت ایسی ذکر کی تھی جو حق کے ساتھ راہنمائی کرتی ہے اور اسی حق کے مطابق ہی انصاف کرتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ساری مخلوق گمراہ نہیں ہے، ہر دور میں قلیل وکثیر کا فرق ہو سکتا ہے لیکن ایسے اشخاص ضرور موجود رہتے ہیں جو حق کے حامل ہوتے ہیں اور دوسروں کی راہنمائی بھی حق کے ساتھ کرتے ہیں اور جس وقت کوئی معاملہ پیش آجائے تو اس کا فیصلہ بھی حق کے مطابق ہی کرتے ہیں قرآن کریم میں دوسری جگہ یہ الفاظ بھی آئے ہیں "وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ" تو قوم موسیٰ میں بھی اس قسم کے لوگ تھے اور نزول قرآن کے وقت پھر اس کا مصداق سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت ہوگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک ایک طائفہ ایسا ضرور موجود رہے گا جو حق کا حامل ہوگا، حق کے ساتھ ہدایت کرے گا اور حق کے مطابق ہی انصاف کرے گا، جیسا کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، صحیح روایت ہے "لَاتَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَلَفَهُمْ (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)" میری امت میں سے ایک طائفہ ہمیشہ رہے گا جو حق کے اوپر قائم ہوگا اپنے مخالفین کے اوپر دلیل کے اعتبار سے غلبہ پانے والے ہوں گے، ان کی مخالفت کرنے والا ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا، "حَتّٰى يَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ" یہاں تک کہ اللہ کا امر آجائے گا یعنی قیامت تک ایک طائفہ ضرور موجود رہے گا، حق کے اندر اس طرح سے تسلسل ہے۔

"وَمِمَّنْ خَلَقْنَا" کے اندر مِن تبعیضیہ ہے، مطلب یہ کہ ان میں سے بعض ایسے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے

کہ بعض لوگ ایسے نہیں بھی ہوتے، نہ وہ حق کے ساتھ راہنمائی کرتے ہیں اور نہ حق کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔

اب جس وقت ہم دنیا کے اندر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ جو حق کے مطابق ہدایت نہیں کرتے اور حق کے مطابق انصاف نہیں کرتے تو یہ فاسقین کا گروہ ہے جیسا کہ پچھلے رکوع میں ذکر کیا گیا تھا لیکن یہ بظاہر بڑے عیش وآرام میں نظر آتے ہیں، یہی ایک ابتلاء ہے جو انسان کے ذہن میں آتا ہے کہ بظاہر وہ بڑے آرام میں نظر آتے ہیں، بڑی راحت میں نظر آتے ہیں دنیا کی زیب وزینت ان کو زیادہ حاصل ہے، تو یہ ایک مغالطہ ہے جو انسان کو لگتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر یہ غلط ہوتے تو ان کو دنیا کے اندر یہ عیش وآرام کیوں حاصل ہوتا؟

اللہ تبارک وتعالیٰ اگلے الفاظ میں آپ کے ذہن سے یہی مغالطہ دور کرتے ہیں اور قرآن کریم میں بہت سارے مقامات پر اس پردہ کو چاک کیا گیا ہے علمی انداز میں دلائل کے ساتھ اور اس کو سمجھنا دل ودماغ کے اوپر اس کو بٹھالینا یہ ضروری ہوتا ہے، تبھی جا کے انسان کے اندر آخرت کی قدر وقیمت آتی ہے اور دنیا کی کمزوری اور دنیا کے سامان کا قابل قدر نہ ہونا تب سمجھ میں آتا ہے جس وقت انسان ان حقائق کو اپنا لیتا ہے۔

مثلاً سورۃ براۃ میں یہ الفاظ آئیں گے "وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا" اے مخاطب! تجھے تعجب میں نہ ڈالیں ان کے مال اور ان کی اولاد کہ یہ منافق ایسے بدکردار ہیں یوں یہ شرارتیں کرتے ہیں لیکن پھر ان کے پاس مال واولاد ہے، مال کی نعمت بھی حاصل ہے، اولاد کی نعمت بھی حاصل ہے، یہ تجھے تعجب میں نہ ڈالے، "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا" یہ مال اور اولاد ان کے حق میں نعمت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو عذاب میں مبتلاء کرے گا، یہ مال واولاد ان کے لیے عذاب ہے، دیکھو! کتنی صفائی کے ساتھ اس بات کو بیان کیا گیا ہے، عذاب کیسے ہے؟ کہ اس طرح چکر میں پڑے ہوئے ہیں کہ کمانے میں پریشان، سنبھالنے میں پریشان اور جتنا اکٹھے کرتے جارہے ہیں آخرت کا عذاب ہی بڑھے گا، نتیجہ تو یہی ہے، اکٹھا جتنا چاہے کرلیں لیکن آخرت میں یہ باعث عذاب ہے اور اگر یہ مسکین ہوتے، فقیر ہوتے، ان کے اعوان وانصار نہ ہوتے تو ممکن ہے کہ متواضع ہو کے حق قبول کر لیتے تو یہ مال واولاد ان کے لیے تکبر کا باعث اور یہ تکبر ان کے لیے اللہ کے عذاب کا باعث بن جائے گا تو مال واولاد ان کے لیے نعمت نہیں، اس لیے اگر ان کے پاس مال واولاد دیکھیں تو تعجب نہ کریں کہ ان کو اللہ نے کیوں اتنا دے رکھا ہے؟

سورۃ آل عمران کے آخری رکوع میں ایک آیت گذری ہے "لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي

الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ“ یہاں بھی حق پرستوں کے ذہن میں یہی ڈالا ہے کہ ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا، آنا جانا تجھے دھوکہ میں نہ ڈال دے کہ تم دیکھتے ہو کہ کبھی قافلہ کے ساتھ ادھر کو جارہے ہیں، کبھی ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ ادھر کو جارہے ہیں، کہیں سے ان کا مال آرہا ہے، کہیں ان کا مال جارہا ہے، اور آج کل کے حساب سے ہوائی جہاز پر چڑھتے ہیں کراچی سے لاہور پہنچ جاتے ہیں، لاہور سے اسلام آباد پہنچ جاتے ہیں، فضا میں اڑتے پھرتے ہیں، شہروں میں گھومتے پھرتے ہیں، اور ان کا تجارت کا ساز وسامان سارے ملک میں گشت کرتا پھرتا ہے خبردار! ان چیزوں کو دیکھ کے دھوکہ میں نہ پڑ جانا کہ یہ لوگ اچھے ہیں ”لَا يَغُرَّنَّكَ“ کتنی تاکید ہے کہ ہرگز تجھے دھوکہ میں نہ ڈال دے ان لوگوں کا شہروں میں گھومنا پھرنا، ”مَتَاعٌ قَلِيْلٌ“ یہ تو تھوڑا سا برتنے کا سامان ہے ” ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ“ پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، اگر مال و دولت چند دن کے لیے دے دیا جائے اور یہ دھوم دھام چند دن کے لیے ہو جائے اور پھر دائمی طور پر جہنم میں ڈال دیا جائے تو یہ کوئی سودا سستا ہے؟ یہ تو بہت مہنگا سودا ہے کہ چند دن کے لیے سونے چاندی کی جھلکی دکھائی اور جھلک کے ساتھ دل ودماغ الٹ پلٹ ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں ایسے عمل اختیار کر لیے، ایسا کردار اختیار کر لیا کہ نتیجہ جہنم ہے یہ دیکھ کے کبھی دھوکہ میں نہ پڑنا، مال ودولت جو انسان کو اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جانے والا ہے، جو مال اور اولاد کی وجہ سے غرور میں مبتلاء ہیں اور دنیا کی عیش وعشرت میں مبتلاء ہیں وہ خدا کی قسم انتہائی خسارے میں ہیں کیونکہ اس چندروزہ زندگی میں ان چند ٹکوں کے عوض جنہوں نے اس ہدایت کو چھوڑا، نیکی کو چھوڑا، اللہ تعالیٰ کی رضا کو ترک کیا اور اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کا غضب اختیار کیا اگر تمہارے سامنے یہ بات منکشف ہو جائے تو تمہیں پتہ چلے کہ یہ کتنے خسارے میں ہیں۔

قرآن کریم میں دوسری جگہ اس حقیقت کو ان الفاظ میں نمایاں کیا گیا کہ قیامت کے دن جس وقت یہ لوگ اللہ کی گرفت میں آئیں گے اگر ان کے پاس ”مِلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا“ زمین کا بھراؤ سونا ہو یعنی اگر اتنا سونا ان کے پاس ہو کہ اگر آپ زمین کے اوپر ڈھیر لگانا شروع کر دیں اور آسمان تک وہ بھر جائے اتنا سونا اگر ان کے پاس ہو اور کہیں کہ یا اللہ! یہ لے لے اور ہمیں عذاب سے بچالے لیکن یہ فدیہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان ایک ایسی قیمتی چیز ہے کہ اس کے ساتھ آخرت کے بازار میں جو چیز خریدی جا سکتی ہے سونے سے بھری ہوئی زمین بھی اس کا بدل نہیں بن سکتی، تو آج اگر پندرہ بیس تولے سونا لے کے تم ایمان سے ہاتھ دھولو اور اس نعمت

سے محروم ہو جاؤ تو اس سے بڑھ کے اور خسارہ کیا ہوگا؟

اور سورۃ الزخرف کے اندر آپ کے سامنے یہ مضمون آئے گا کہ اگر ہمیں یہ خیال نہ ہوتا کہ لوگ سارے کے سارے ہی ایک راستہ پر چل پڑیں گے چونکہ اکثر و بیشتر لوگ کمزور ہیں اور وہ نقد کو زیادہ چاہتے ہیں ادھار پہ زیادہ اعتماد نہیں کرتے، اس لیے جس وقت لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص کفر اختیار کرتا ہے تو اس کو بہت زیادہ عیش مل جاتی ہے تو اکثر و بیشتر لوگ کفر کی طرف دوڑتے ہیں تو اللہ فرماتے ہیں ہم نے انسانوں کو اتنا ابتلاء میں نہیں ڈالا اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان لوگوں کے لیے جو کافر ہیں ان کے گھر، ان کی سیڑھیاں اور ان کے تکیے ہم سونے اور چاندی کے بنا دیتے، اتنا شدید ہم نے تمہیں ابتلاء میں نہیں ڈالا۔

لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سونا، چاندی دنیا کی زیب و زینت ہماری نظر میں اتنی بے قدر ہے کہ اگر باقی لوگوں کے متعلق ابتلاء کا خطرہ نہ ہوتا تو ان کافروں کے گھر بھی ہم سونے چاندی کے بنا دیتے، ان کی سیڑھیاں بھی سونے کی ہوتیں اور یہ اسی وجہ سے ہے کہ اس مال و دولت کی اللہ کے ہاں کوئی قدر نہیں ہے، یہ تو زندگی گزارنے کا ایک ذریعہ ہے اور اس زندگی کے اندر اس کو استعمال کرو اور مقصد حیات کو سامنے رکھو، اس مقصد حیات کو سامنے رکھو گے تو یہ کامیابی کا باعث ہے اور اگر ان چیزوں کے اندر الجھ کے اپنے مقصد حیات کو بھول گئے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لے لی اور آخرت میں عذاب لے لیا تو اس سے بڑھ کے دنیا میں خسارہ کوئی نہیں ہے۔

خواجہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا استغناء:

بہت ساری آیات میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے، جو لوگ ان حقائق کو سمجھ لیتے ہیں وہ فقیر ہونے کے باوجود بادشاہوں کو نظر میں نہیں لاتے، آپ اپنے اسلاف کے واقعات پڑھیں گے، حکایات پڑھیں گے تو وہ لطیفے نہیں ہیں کہ حسن ظن کے طور پر لوگوں نے بنا بنا کے لکھ دیے ہوں وہ لطیفے نہیں واقعات ہیں کہ یہ لوگ بڑے بڑے رؤساء کو، بڑے بڑے امراء کو، بڑے بڑے سلاطین کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے کہ یہ کون ہے؟ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے غلاموں کے بھی غلام ہیں، حرص ہماری غلام ہے اور یہ حرص کے غلام ہیں یہ تو ہمارے غلاموں کے بھی غلام ہیں، ان کو ہم کیا جانتے ہیں۔

ہندوستان میں ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ مغلیہ خاندان کے بادشاہ جلال الدین اکبر کے زمانہ کے ہیں، جلال الدین اکبر کی اولاد نہیں تھی اور یہ معتقد تھا حضرت خواجہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا، ان کی خانقاہ

میں اس کی آمد ورفت تھی اور وہاں تعلق کی وجہ سے اس نے اپنا دار الخلافہ بھی دہلی کو چھوڑ کے فتح پور کو ہی بنالیا تھا تا کہ شیخ کے ساتھ قرب رہے۔

اور آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ اکبر کا بیٹا جہانگیر جو اکبر کے بعد ہندوستان کا بادشاہ بنا ہے جس کا مقبرہ لاہور میں ہے اس کا اصل نام سلیم ہے، جہانگیر اس کا لقب ہے، جب یہ تخت نشین ہوا تو اس نے جہانگیر لقب اختیار کیا اور یہ حضرت خواجہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں پیدا ہوا تھا یعنی جس وقت اکبر کی بیوی قریب الولادت ہوئی تھی تو اس نے بیوی کو خانقاہ میں بھیج دیا تھا اکبر بادشاہ کو حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے اتنی عقیدت تھی۔

کہتے ہیں کہ خواجہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ کسی درویش کو اپنی گدڑی دی کہ ذرا باہر دھوپ میں بیٹھ کے دیکھ کہ اس میں کہیں جوں نہ ہو، تو وہ درویش باہر بیٹھا جوئیں دیکھ رہا تھا، ادھر سے اس کی نظر پڑ گئی کہ بادشاہ مع اپنے خدام اور لاؤ لشکر کے آرہا ہے تو نظر پڑتے ہی آواز دیتا ہے کہ حضرت! ذرا باہر تشریف لائیے تو حضرت باہر تشریف لائے کہنے لگا وہ بادشاہ آرہا ہے، تو آپ نے فرمایا کمال کر دی بادشاہ آرہا ہے یہ بھی کوئی بتانے کی بات تھی، میں تو یہ سمجھا کہ کوئی موٹی سی جوں پکڑ لی ہوگی شاید وہ دکھائی ہے، بادشاہ آرہا ہے تو میں کیا کروں؟ یہ فقرہ ایسے ہی نہیں ہے یعنی ان لوگوں کی زندگی میں ان واقعات کو اہمیت ہے، ان کے نزدیک بادشاہ کا آنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

کہتے ہیں کہ جس وقت وہ آگیا تو حضرت بیٹھے ہوئے تھے اور لاپرواہی سے آپ نے اپنی ٹانگیں دراز کرلیں جیسے بے فکر اسا ہو کے انسان اپنے خدام اور ساتھیوں میں بیٹھتا ہے، بادشاہ کے ساتھ ایک درباری مولوی تھا اس کو یہ بات ناگوار گزری کہ بادشاہ بیٹھا ہے اور یہ ٹانگیں دراز کر کے بیٹھ گیا تو اس نے کہا کہ حضرت! یہ عادت کب سے اختیار کرلی، (یہ ٹانگیں پھیلانے کی عادت کب سے اختیار کرلی) تو آپ نے فرمایا کہ جب سے ہاتھ بغل میں لے لیے، کیا مطلب کہ جن کے ہاتھ پھیلتے ہیں وہ ٹانگ کیسے پھیلائیں گے اور جن کا ہاتھ بغل میں ہے وہ جو چاہیں پھیلائیں کسی کو کیا اعتراض ہے، جن کا ہاتھ دوسرے کے سامنے پھیلا کرتا ہے وہ کسی کے سامنے ٹانگیں نہیں پھیلایا کرتے اور جب ہاتھ بغل میں لے لیے تو ٹانگیں پھیلانے میں کیا حرج ہے۔

اور اٹھتے وقت بادشاہ نے دولت کی ایک تھیلی ہدیۃً پیش کی اور انہوں نے ٹھکرادی کہ مجھے ضرورت نہیں ہے، وہی درباری مولوی صاحب پھر بولے کہ یہ تو آپ اوپر اوپر سے ایسا کرتے ہیں ورنہ حدیث شریف میں تو آتا ہے کہ انسان جیسے جیسے بوڑھا ہوتا جاتا ہے اس میں دو خصلتیں جوان ہوتی چلی جاتی ہیں ایک حرص علی المال اور ایک

حرص علی العمر اور آپ اب بوڑھے ہوگئے تو حدیث شریف کی رو سے حرص علی المال تو آپ کے اندر جوان ہونی چاہیے اور آپ اوپر اوپر سے ٹھکرا رہے ہیں یعنی مولوی صاحب نے علمی نکتہ بیان کر دیا، حدیث شریف سے استدلال کرلیا کہ جیسے جیسے آدمی بوڑھا ہوتا جاتا ہے اس کے اندر مال کی حرص بڑھتی جاتی ہے تو آپ بوڑھے ہیں اس لیے حدیث شریف کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ حرص علی المال تو ہے لیکن اوپر اوپر سے آپ تصنع کر رہے ہیں کہ مجھے مال کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ فوراً بولے کہنے لگے کہ مولوی تو بن گئے ہو لیکن عقل و ہوش تمہیں نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یشب فیه خصلتان" کہ اس شخص کے اندر دو خصلتیں جوان ہوتی جاتی ہیں اللہ کے بندے جوان وہ ہوا کرتا ہے جو پیدا تو ہو اور یہاں تو اللہ کا فضل ہے حرص پیدا ہی نہیں ہوئی اس نے جوان کیا ہونا ہے، اپنی خبر لو کہ جوانی میں یہ حال ہے بوڑھے ہو جاؤ گے تو کیا ہوگا؟

علم فی القلب کی پہچان:

تو جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق صحیح ہو جاتا ہے تو پھر واقعہ یہ ہے کہ مال و دولت یہ شان و شوکت انسان کو مرعوب نہیں کرتی بلکہ مشکوٰۃ شریف میں کتاب العلم میں ایک روایت موجود ہے جس میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے شرح صدر کی علامات بیان فرمائی ہیں حاصل اس کا میں کچھ اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں اس سے بھی یہ بات نکلتی ہے اور ویسے بھی اہل اللہ کے ہاں یہ بات اس طرح سے بیان کی جاتی ہے کہ علم کی جو دو قسمیں ہیں ایک علم علی اللسان ہے اور ایک علم فی القلب ہے اور جو علم علی اللسان ہے یہ تو صرف اللہ کی حجت ہے جس کے ساتھ انسان کو پکڑے گا اور جو علم فی القلب ہے یہ علم نافع ہے جو انسان کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ علم نافع حاصل ہے یا نہیں؟ اور ہمارا یہ علم قلب پہ اثر انداز ہے یا نہیں؟

کہتے ہیں کہ علم کے قلب پر اثر انداز ہونے کی علامت یہ ہے کہ جو لوگ علم اور ایمان سے محروم ہیں چاہے وہ کتنے ہی دنیا دار اور مال و دولت والے کیوں نہ ہوں جس وقت ان پر نظر پڑے تو انسان کے دل سے یہ آواز آئے کہ یہ لوگ خسارے میں ہیں، کسی کو اچھے لباس میں کار میں بیٹھا ہوا دیکھ کے تم یہ خیال کرو کہ کامیاب تو یہ لوگ ہیں اگر

دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کامیاب تو یہ لوگ ہیں تو آپ دنیادار ہیں پھر آپ دین دار نہیں ہیں آپ کے دل کی تہہ میں دنیا کی محبت ہے اور اگر آپ کسی کو اچھی طرح سے سج دھج کے ساتھ دیکھیں، شان وشوکت کے ساتھ بھی دیکھیں لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ یہ نیکی سے محروم ہے، اس کو عمل صالح نصیب نہیں ہے یا اس کو ایمان نصیب نہیں ہے اور آپ کے پھٹے ہوئے کپڑے ہیں، سوکھے ٹکڑے آپ نے کھائے ہیں، چٹائی پہ آپ بیٹھے ہیں لیکن آپ کا دل یہ کہے کہ یہ لوگ خسارے میں ہیں، معلوم نہیں کہ یہیں سے جاتے ہوئے وہیں چوک میں ہی ایکسیڈنٹ ہوگیا تو اس کے بعد ان کی نہ کار کام آئے گی اور نہ لباس کام آئے گا، اگلی زندگی کے لیے انہوں نے کیا بنایا ہے؟

تو یہ خیال کرنا کہ یہ لوگ خسارے میں ہیں، یہ لوگ بھولے ہوئے ہیں، ان کا یہ طریقہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے جو اس سج دھج کے اوپر مر رہے ہیں اور آخرت کی فکر نہیں کر رہے ہیں ایک ہے زبان سے کہہ دینا جیسے اس وقت میں بھی بول رہا ہوں اور ایک ہے کہ قلب کے اوپر حال یہ طاری ہو اگر قلب کے اوپر حال یہ طاری ہو تو یہ علامت ہے کہ آپ کا ایمان آپ کے قلب میں سرایت کر گیا اور آپ کا علم آپ کے اوپر اثر انداز ہے۔

اہل علم کی شان:

یہ مضمون کہاں سے ماخوذ ہے؟ یہ ایسے ہی زبان زوری نہیں یہ واقعہ ہے قرآن کریم میں اس کا ماخذ بہت صریح ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ قصص کے آخر میں قارون کا واقعہ بیان کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں "فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ" وہ ایک دفعہ اپنی قوم میں سج دھج کے نکلا، بہت خزانوں کا مالک تھا، دنیا کا ساز وسامان اس کے پاس بہت تھا، اتنے خزانوں کا مالک تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ اس کے خزانوں کی چابیاں بھی اگر چند اشخاص اٹھا کر چلتے تو تھک جاتے تھے، بوجھ محسوس کرتے تھے، ایک دفعہ سج دھج کے ساتھ وہ اپنی قوم پر نکلا جس وقت وہ نکلا تو اس کو دیکھنے والے دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔

ایک تو وہ تھے "قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ" ایک گروہ تو یہ ہوگیا، کہاں لوگوں نے جو دنیوی زندگی چاہتے تھے "یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ" اے کاش! ہمیں بھی وہ چیز مل جائے جو قارون کو ملی ہے یہ تو بہت بانصیب ہے، بڑے اچھے نصیب والا ہے، دیکھو! اس کے پاس کتنا سونا، کتنے خادم، کتنے گھوڑے، کتنے غلام اور کتنی جائیداد ہے اور کیسے سج دھج کے نکل رہا ہے اور کیسی ٹھاٹھ باٹھ ہے "یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ" اے کاش! کہ ہمیں بھی وہ چیز مل جائے جو قارون کے پاس ہے "اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ" یہ

بہت نصیب والا ہے یہ ان لوگوں کا قول ہے " اَلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا" تو معلوم ہوگیا کہ کسی دنیا دار کو دیکھ کے اس قسم کی تمنائیں دل کے اندر پیدا ہونا یہ علامت ہے اس بات کی کہ اس کے دل میں دنیا کی چاہت ہے۔

جس وقت یہ قوم للچائی اور ان کے منہ سے پانی ٹپکا تو دوسرا فریق "قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ" اب "اَلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا" کے مقابلہ میں "اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ" ہے کہا ان لوگوں نے جو علم دیے گئے تھے "وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ" ویلکم یہ ایسا ہی لفظ ہے جیسے ہم گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں تمہارا ستیاناس ہو جائے تم نے یہ کیا کہنا شروع کر دیا "ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ" اللہ کا بدلہ جو اللہ کی طرف سے ملے گا وہ اس سج دھج اور سونے چاندی سے بہتر ہے یہ "اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ" کی بات ہے۔

اب اس سے یہ بات نکل آئی کہ علم والے وہ شخص ہوا کرتے ہیں جو دنیا داروں کی ٹھاٹھ باٹھ دیکھنے کے بعد "یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ" نہ کہیں بلکہ ان کے دل کی آواز یہ ہو کہ یہ کوئی چیز نہیں "ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ" اللہ کی طرف سے جو ثواب ملے گا وہی بہتر ہے۔

یہ ماخذ ہے اس سارے بیان کا جو میں آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ علم والے حقیقت کے اعتبار سے وہ ہیں کہ دنیا کی سج دھج کے ان کی آنکھیں چندھیاتی نہیں، ان کی زبان سے رال نہیں ٹپکتی بلکہ اپنے ایمان اور علم کی اتنی قدر و قیمت وہ جانتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں سونے کے پہاڑ بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اگر یہ کیفیت قلب میں آجائے تو پھر انسان کا ایمان محفوظ ہوتا ہے، پھر وہ کسی فتنہ میں نہیں پڑتا اور جب تک دنیا کی محبت دل کے کسی کونے میں بھی چھپی ہوئی ہو تو کسی وقت بھی آپ بازاری چیز بن کے بک جائیں گے دوسرا کوئی آپ کو خرید لے گا، اگر دنیا کے کسی کونے میں بھی دل کی محبت ہے تو آپ بازاری مال ثابت ہو سکتے ہیں، جس وقت کوئی چاہے گا آپ کو پیسے دے کر آپ سے غلط فتویٰ لے لے گا، جب کوئی چاہے گا آپ کو پیسے دے کر آپ سے کوئی غلط کام کروا لے گا، آپ علم کے زور سے پھر باطل کی حمایت میں نکل جائیں گے پھر آپ اور آپ کا علم ایک بازاری چیز اور بکاؤ مال ہوگا جیسے بازار میں گاجر مولی بکتی ہیں اسی طرح آپ بھی بکیں گے۔

سب سے زیادہ استغناء دین میں ہے:

اس لیے ایمان کی حفاظت بھی اسی میں ہے کہ انسان کے دل میں دنیا کی عظمت نہ ہو، آخرت کی عظمت

ہو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ جتنا دے اس کے اوپر انسان شکر کرتا چلا جائے وقت تو ہر کسی کا گذر جائے گا جیسے کسی شاعر نے کہا تھا

عمر اک دن ہو یا سو سال گذر جاتی ہے ۔ کندھے پہ گدڑی ہو یا شال گذر جاتی ہے

اگر امیروں کی خوشحال گذر جاتی ہے ۔ تو غریبوں کی بھی بہر حال گذر جاتی ہے

یہ تو گذر ہی جاتی ہے دیکھنا تو یہ ہے کہ آگے نتیجہ کیا نکلتا ہے، کامیابی اور ناکامی کا مدار مرنے کے بعد کے حالات پر ہے ورنہ موت تک آپ کی زندگی اور ان کی زندگی برابر ہے، حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے، صرف نظر کے دیکھنے اور سوچنے کا فرق ہے، ورنہ جیسے غریب بیمار ہوتا ہے امیر بھی بیمار ہوتا ہے، جیسے جھونپڑیوں سے جنازے نکلتے ہیں اسی طرح محلوں سے بھی جنازے نکلتے ہیں، غریب اگر فاقے کرتا ہے تو امیر اس سے بھی زیادہ فاقے کی زندگی گزارتے ہیں۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات ایسی ہے جو سونے کے پانی کے ساتھ لکھنے کے قابل ہے حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تو اپنے دل کو سمجھا لیا ہے کہ یہ سارا سہارن پور کا بازار ہمارا ہے اور یہ جتنے کام کرنے والے ہیں یہ سب ہمارے نوکر ہیں اور جتنی ضرورت ہوتی ہے میرے پاس آجاتا ہے باقی کا انتظام وہ کرتے ہیں۔

اہل اللہ کا حال بالکل یہی ہوتا ہے کہ ساری دنیا ان کی ایک قسم کی خادم ہے اور سارے ان کے نوکر ہیں، ان کی ضروریات کوئی اٹکی نہیں ہیں اور انتظام ان کے ذمہ نہیں ہے، دوکانیں تم چلاؤ، کاشت تم کرو، زمینداری تم کرو بقدرِ ضرورت ہمارے پاس آئے گا باقی انتظام تمہارے ذمہ ہے، یہ صرف ایک نظر کا مغالطہ ہے اگر اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق دے دے تو خدا کی قسم جتنا استغناء دین میں ہے اتنا استغناء کسی چیز سے آتا ہی نہیں ہے۔

لیکن بات وہی ہے کہ ہم ان حقائق پر غور نہیں کرتے اور یہ زبان کی لذت اور پیٹ کا تندور انسان کو کچھ سمجھنے نہیں دیتا اور کسی چیز کی حقیقت تک پہنچنے نہیں دیتا، پیٹ کی آگ بھڑکتی ہے تو انسان کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، آنکھ للچاتی ہے تو کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، زبان سے رال ٹپکتی ہے تو انسان کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، دل اور دماغ کے سارے تقاضے ہی انسان بھول جاتا ہے اگر اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق دے دے تو دین میں جتنا استغناء ہے کسی چیز میں نہیں ہے، یہ دنیا ہے یہاں امیر وغریب کی برابر سرابر گذرتی ہے یہ نہ خیال کریں کہ ان کی آرام سے گذرتی

ہے، وہ آپ سے زیادہ پریشان ہیں اور آپ سے زیادہ تکلیفوں میں ہیں، پہلے وہ کھانے پہ خرچ کرتے ہیں پھر وہ نکالنے پہ خرچ کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے خوشحال ہیں، تمہارا نہ کھانے پہ خرچ ہوا اور نہ نکالنے پہ خرچ ہو ساری نعمتیں مفت میں حاصل ہیں یہ بات صرف لفظوں تک نہیں ہے یہ بات جب قلب پر اثر انداز ہوگی تو پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ دین کتنی بڑی نعمت ہے۔

آیات کا مفہوم:

اسی چیز کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں واضح کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں ہم ان کو آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ لیے جارہے ہیں ایسی جگہ سے کہ جہاں سے ان کو پتہ ہی نہیں ہے یعنی وہ درجہ بدرجہ ہلاکت کے گڑھے کی طرف جارہے ہیں اور ان کو پتہ ہی نہیں ہے کہ ہم ہلاکت کی طرف جارہے ہیں ایک سپاہی ہے وہ سپاہی ہونے کے زمانہ میں خوب رشوت لیتا ہے، سپاہی ہونے کے زمانہ میں بڑی غلط حرکتیں کرتا ہے پھر اس کی ترقی ہو جاتی ہے کہ وہ حوالدار بن گیا ہے اب آپ جانتے ہیں کہ حوالدار کے لیے رشوتیں لینے اور خباثتیں کرنے کا موقع زیادہ ہے سپاہی کے مقابلہ میں، اب جب وہ حوالدار بن گیا تو اس کے لیے اور راستے کھل گئے اب وہ پہلے سے بھی زیادہ دلیر ہو گیا اور وہ سمجھتا ہے کہ میں ترقی کی طرف جارہا ہوں اور پھر حوالدار سے اس کو تھانیدار بنا دیا جاتا ہے، اب تھانیدار کے لیے جتنے مواقع ہیں اتنے حوالدار کے لیے نہیں ہیں، اس کی اس خباثت کے اندر ترقی ہوتی چلی جارہی ہے وہ سمجھتا یہ ہے کہ میں ترقی کے درجات طے کر رہا ہوں لیکن حقیقت کے اعتبار سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیسے اس کو ہلاکت اور عذاب کی طرف لے جایا جارہا ہے یہی اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا ابتلاء ہے کہ انسان جارہا ہو ہلاکت کی طرف اور وہ سمجھے کہ میں ترقی کرتا جارہا ہوں اس کو کہتے ہیں استدراج، استدراج کا مفہوم ہوتا ہے رسی ڈھیلی چھوڑ دینا اور کسی کو برائیوں اور گناہوں کے باوجود نوازتے چلے جانا یہ ہے جس سے انسان درجہ بدرجہ ہلاکت کی طرف جاتا ہے، آپ نے ایک غلطی کر لی اور میرے علم میں آگئی، میں نے اسی وقت آپ کو تھپڑ لگا کے سزا دی تو ہوسکتا ہے کہ آپ اس غلطی سے باز آجائیں، آپ اس غلطی میں آئندہ ترقی نہیں کریں گے لیکن اگر آپ کی غلطیوں پر اسی طرح نوازشیں جاری رہیں تو آپ سمجھیں گے کہ یہ تو بس ایسے ہی ہے آج ایک کی ہے، کل کو دو کرو گے، پرسوں کو تین کرو گے پھر خباثت کا درجہ بڑھتا چلا جاتا ہے جب انسان دیکھتا ہے کہ اس کے باوجود میرے

اور نوازشات کی بارش ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کسی نے پوچھا ہی نہیں ہے اور بسا اوقات معاملہ یوں ہوتا ہے کہ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ سخت پکڑنا ہے کہ پھر یہ چھوٹنے ہی نہ پائے اگر پہلی غلطی پہ پکڑ لیا تو کہے گا کہ یہ میرا پہلا موقع ہے مجھے معاف کردو اور جس وقت فہرست پوری ہو جائے گی تو پھر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ یہ میرا پہلا موقع ہے اور سخت گرفت کرنے کے لیے اس کی رسی ڈھیلی کر دی بسا اوقات پوری طرح رگڑا نکالنے کے لیے رسی ڈھیلی چھوڑی جاتی ہے تو اللہ کہتا ہے میں نے بھی ان کی رسی ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ جب شکاری مچھلی کا شکار کرنے کے لیے کانٹے کے اوپر گوشت لگا کے پانی میں پھینکتے ہیں اور مچھلی آ کے منہ مارتی ہے تو جو تجربہ کار شکاری ہوتا ہے وہ ڈور جلدی سے نہیں کھینچتا بلکہ وہ ڈور ڈھیلی چھوڑتا ہے تاکہ وہ اچھی طرح سے نگل لے اور جس وقت وہ اچھی طرح سے نگل جاتی ہے تو پھر چھوٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اسی مضمون کو کسی اردو کے شاعر نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ۔

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمہ پہ شاد ہے
صیاد خوش ہوا کہ کانٹا نگل گئی

یعنی مچھلی تو خوش ہے کہ دیکھو! مجھے کتنا شاندار لقمہ مل گیا تو بسا اوقات یہ ڈور جو ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہوتی ہے یہ اس لیے ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہوتی ہے کہ کانٹا اچھی طرح سے اندر چلا جائے اور بعد میں جس وقت جھٹکا لگے گا تو چھوٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

اس لیے اگر کسی شخص کو دیکھو کہ بدمعاشی کے باوجود، گناہوں میں ملوث ہونے کے باوجود، نیکی نہ کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو خوب کھلا رہا ہے، خوب پلا رہا ہے، دنیا کی عیش و عشرت اس کو دن بدن حاصل ہوتی جا رہی ہے باوجود اس کی بدکاریوں کے، باوجود اس کی بدمعاشیوں کے تو سمجھو کہ یہ شخص استدراج کا شکار ہو گیا ہے، اب یہ رکے گا نہیں، اب یہ اس حد تک جائے گا کہ جب اللہ کی گرفت آئے گی تو پھر اس کے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا۔

اور ایک آدمی ایسا ہے کہ غلطی کرتا ہے اور فوراً پکڑا جاتا ہے، تنبیہ ہو جاتی ہے تو یہ تنبیہ ایسی ہوگی کہ آئندہ آپ کو اس غلطی سے بچا لے گی، یہ اللہ کی توفیق ہے۔

"وَاُمْلِیْ لَھُمْ" اور میں انہیں ڈھیل دیتا ہوں، "اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ" میری تدبیر بڑی مضبوط ہے، میں جب پکڑتا ہوں تو ایسی مضبوط تدبیر کے ساتھ پکڑتا ہوں کہ یہ پھر اس کی تلافی نہیں کر سکتے، میری تدبیر بڑی

مضبوط ہے۔

دعوتِ فکر:

اب آگے ان کو غفلت سے بیدار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ان کو متنبہ کرتے ہیں "اَوَلَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا مَا بِصَاحِبِهِمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ" اس میں رسالت کا مضمون آگیا اور آگے معاد کا مضمون آرہا ہے قیامت کے تذکرے کے ساتھ اور قرآن کریم میں یہی بنیادی مضامین توحید، رسالت اور معاد آپ کے سامنے غلط ملط ہو کے آتے رہتے ہیں۔

کیا یہ لوگ سوچتے نہیں کہ ان کے یہ جو ساتھ رہنے والا ہے اس کو کوئی جنون نہیں ہے، صاحب سے مراد حضور ﷺ ہیں، یہ جو ہر وقت سمجھانے کے لیے ان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں ان کو کوئی جنون نہیں ہے کہ جنون کی وجہ سے ایسی حرکتیں کرتے ہوں، اگر یہ تفکر کریں تو خود سمجھ میں آجائے کہ جس شخص نے اتنی زندگی ہم میں گزاری ہے اور جس شخص کی عقل اور فراست پر ان کو اتنا اعتماد تھا اور آج بھی اگر یہ وعظ کہنا چھوڑ دیں، اس وعظ کے علاوہ زندگی کے کسی شعبے میں کسی بات پر ان کو کوئی اعتراض نہیں ہے، ہر بات، ہر عمل اور ہر کردار بالکل صاف ستھرا ہے جس میں کوئی کسی قسم کے نقص کی کوئی نشاندہی نہیں کی جاسکتی، اس وعظ کو چھوڑنے کے بعد ساری کی ساری قوم مداح ہے اور کوئی نقص نہیں تو بتاؤ بھلا دیوانے ایسے ہوا کرتے ہیں، ان کا کوئی قول اور عمل کسی معیار کا نہیں ہوتا جانور اور دیوانے میں کیا فرق ہوتا ہے؟ تو کیا یہ سوچتے نہیں؟ اگر یہ سوچیں تو ان کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے، وہ تو واقعی نذیر ہے جو ان کو عذاب سے ڈراتا ہے اور ان کا بھلا اسی میں ہے کہ یہ اس چیز سے ڈر جائیں جس سے یہ ڈراتا ہے اگر غور کریں تو ان کو سمجھ میں آجائے کہ اس کی عقل میں نقص نہیں ہے، بہت سمجھدار ہے، ہر طرح سے عقلمند ہے اور یہ بات جو انہیں کہتا ہے یہ اس کے منصب کا تقاضہ ہے، اس کو جنون نہیں ہے یہ حقیقت ہے اور یہ صریح طور پر ڈرانے والا ہے اگر یہ غور کریں تو انہیں یہ بات سمجھ میں آجائے۔

کیا یہ دیکھتے نہیں آسمان اور زمین کی سلطنت میں، اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو دیکھیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مناظر دیکھیں اس میں غور کریں اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے اس میں غور کریں تو اس سے ان کو توحید سمجھ میں آئے، اللہ تعالیٰ کی عظمت ان کے ذہن میں آئے، جس اللہ کی عظمت سے یہ رسول انہیں ڈراتا ہے اگر ان کو واقعات

میں غور کرنے کا موقع ملے اور ان میں غور کریں تو ساری چیزیں ان کی سمجھ میں آجائیں، کیا یہ اس بات کو سوچتے نہیں کہ شاید ان کا وقت بھی قریب آیا ہوا ہو، یہ چیزیں غور وفکر کی ہیں، آج یہ دندناتے پھرتے ہیں ایسا نہ ہو کہ وقت سر پہ کھڑا ہو یہ ہنستے پھرتے ہیں اور موت سر پہ کھڑی ہے اس بات میں انہوں نے غور نہیں کیا، کیا ان کے پاس کوئی سرٹیفکیٹ ہے کہ ہم نے اتنی دیر تک زندہ رہنا ہے، موت سر پہ کھڑی ہے، اللہ تعالیٰ کی آیات ان کے ارد گرد محیط ہیں، ڈرانے والا ان کے سامنے موجود ہے اور اس کے باوجود سرکشی کر رہے ہیں، یہ دعوتِ فکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سلطنت میں غور کریں، جو کچھ اللہ نے پیدا کیا اس میں غور کریں اور اس بات کو سوچیں کہ شاید ان کا وقت قریب آیا ہوا ہو اس طرح سے اگر یہ تدبر اور تفکر کریں گے اور اس بات کو سوچیں کہ شاید ان کا وقت قریب آیا ہوا ہو اس طرح سے اگر یہ تدبر اور تفکر کریں گے، نظر وفکر سے اگر کام لیں گے تو ان کو ہدایت حاصل ہو سکتی ہے، اور اگر اتنا سمجھانے کے بعد بھی یہ نہیں سمجھتے تو "فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ" تو اس کتاب کے بعد، اس قرآن کے بعد جس میں اتنے حقائق واضح کیے گئے ہیں وہ کونسی بات ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے گمراہ کرنے کا مطلب:

آگے سرور کائنات ﷺ کے لیے تسلی ہے کہ آپ تو سمجھانے میں کمی نہیں کرتے لیکن ان کی قسمت، آخر نتیجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو بھٹکا دے اس کو کوئی راستہ دکھانے والا نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ بھٹکاتا کس کو ہے؟ جو بھٹکنے کے اصول اللہ تعالیٰ نے بتائے ہیں جو ان کو اپنائے گا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہو جاتا ہے جیسے آپ کہیں کہ زہر اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جو زہر کھالے وہ مرجاتا ہے، موت بھی اللہ دیتا ہے لیکن اس کے درمیان میں تھوڑا سا آپ کے عمل کا واسطہ ہے، ہم کہیں گے کہ جو زہر کھاتا ہے مرجاتا ہے اس طرح کہنا بھی ٹھیک ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو زہر کھالے اللہ تعالیٰ اسے موت دے دیتا ہے، اب اللہ تعالیٰ نے ضلالت کے اصول واضح کر دیے کہ یہ گمراہی کے راستے ہیں جو شخص ان کے اوپر اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ چلنے کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ وہیں گمراہی نمایاں کر دیتے ہیں کیونکہ خالق ہر چیز کا اللہ ہے اس لیے خلق کے اعتبار سے نسبت اللہ کی طرف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے ہدایت کا راستہ واضح کر دیا اب اگر آپ اس راستہ پر چلنے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہدایت کے آثار پیدا فرمادیں گے جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ یہ حقیقت بھی اتنی واضح ہے کہ جس

وقت بھی کسی دوراہے پر آپ کھڑے ہوں تو وہاں سوچ لیا کرو کہ آپ کو دونوں طرف قدم اٹھانے کی اجازت ہے، ایک طرف اٹھاؤ گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت کرتا چلا جارہا ہے، دوسری طرف کو اٹھاؤ گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو گمراہ کرتا جارہا ہے، اللہ کی طرف نسبت ہے باعتبار خلق کے ورنہ ہر قدم پر آپ کو آگے بڑھنے کا بھی اختیار ہے اور پیچھے ہٹنے کا بھی اختیار ہے۔

لیکن ہر کیفیت اور ہر حال کا خالق اللہ ہے، اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا خالق نہیں ہے، اس لیے نسبت اللہ کی طرف ہے، تو گمراہ اللہ ان کو کرتا ہے جو گمراہی کے اصول اپناتے ہیں، ہدایت اللہ ان کو دیتا ہے جو ہدایت کے اصول اختیار کرتے ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں، اور چھوڑ دیتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو ان کی سرکشی میں کہ یہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔

قیامت کے وقوع کا علم صرف اللہ کے پاس ہے:

"یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا" یہ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ یہ اسلام کا تیسرا بنیادی عقیدہ ہے، سرور کائنات ﷺ جہاں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا وعظ کہتے تھے اور اپنی رسالت کا عقیدہ پیش کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ عقیدہ معاد کا تذکرہ بھی کرتے تھے کہ ایک وقت آئے گا جب سارے عالم نے فنا ہونا ہے، فنا ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے، یہ تیسرا بنیادی عقیدہ ہے، توحید کی طرح اس کی اہمیت ہے، رسالت کی طرح اس کی اہمیت ہے جو شخص معاد کا قائل نہیں چاہے وہ توحید ورسالت کا قائل ہو وہ مسلمان نہیں ہے۔

جس وقت حضور ﷺ یہ بیان فرماتے کہ ایک وقت میں جیسے یہ عالم نہیں تھا اللہ نے بنا دیا اسی طرح ایک وقت آئے گا کہ اس کو ختم کر دیا جائے گا اور دوبارہ پھر اٹھیں گے اس کا وہ سب سے زیادہ مذاق اڑاتے تھے، یہ بات ان کو سمجھ نہیں آتی تھی، وہ کہتے کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ ہمیں اس کا وقت بتاؤ، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ کہہ دیجئے کہ اس کا علم اللہ کے پاس ہے، علم الساعة میرے رب کے پاس ہے، لیکن علم الساعة سے مراد ہے اس کے وقوع کا وقت ورنہ قیامت کا علم کہ قیامت آئے گی اور اس میں یہ کیفیات ہوں گی، یہ حالات طاری ہوں گے یہ تو اللہ تعالیٰ نے بتا دیے ہیں اور حضور ﷺ نے لوگوں کو بتا دیے ہیں۔

"لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ" نہیں ظاہر کرے گا اس کو اس کے وقت پر مگر وہی "ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" وہ بہت بڑا حادثہ ہے زمین وآسمان میں، نہیں آئے گا تمہارے پاس مگر اچانک، اچانک کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں توقع نہیں تھی کہ آج قیامت آنے والی ہے لیکن وہ آجائے گی جیسا کہ حدیث شریف میں ہے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قیامت آئے گی تو دنیا تمام اپنے حالات اور معاملات میں لگی ہوئی ہوگی، جس طرح آج یہ حالات ہیں کہ آپ کسی دوکان پر جاکے بیٹھے ہیں، دوکاندار سے کپڑا پوچھتے ہیں کہ یہ کپڑا کیا بھاؤ ہے، وہ کپڑا آپ کے سامنے پھیلا دیتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس دن کسی نے کپڑا پھیلایا ہوا ہوگا لپیٹنے نہیں پائے گا کہ قیامت آجائے گی، ایک آدمی نے اپنی اونٹنی کا دودھ نکالا ہوا ہوگا لیکن پینے کی نوبت نہیں آئے گی کہ قیامت آجائے گی، ایک آدمی اپنے حوض کو درست کر رہا ہوگا لیکن اس میں پانی بھرنے کی نوبت نہیں آئے گی کہ قیامت آجائے گی، ایک آدمی نے کھانے کے لیے لقمہ اٹھایا ہوا ہوگا لیکن منہ میں ڈالنے کی نوبت نہیں آئے گی کہ قیامت آجائے گی، ان سب آثار کا مطلب یہ ہے کہ دنیا اپنے معمول کے مطابق اپنے عمل میں لگی ہوئی ہوگی کوئی روٹی کھا رہا ہوگا، کوئی پانی پی رہا ہوگا، کوئی دودھ نکال رہا ہوگا، کوئی دوکان پہ کپڑے بیچ رہا ہوگا، کوئی خرید رہا ہوگا، اچانک اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وہ صور پھونکا جائے گا اور یہ دنیا تباہ وبرباد ہوجائے گی، یہ نہیں کہ پہلے پتہ ہو کہ دس دن کے بعد آئے گی، پانچ دن کے بعد آئے گی، یہ علم اللہ نے کسی کو بھی نہیں دیا۔

قیامت کے وقوع کے علم کو مخفی رکھنا ہی حکمت کا تقاضہ ہے:

لیکن اس علم کے نہ ہونے کو انکار کا ذریعہ بنالینا یہ انتہائی درجہ کی بدبختی ہے، بسا اوقات کسی چیز کا مخفی رکھنا ہی بہتر ہوتا ہے، اس کو میں آپ کے سامنے ایک مثال سے سمجھاتا ہوں، آپ کو اپنی موت کا یقین ہے کہ یہ آئے گی لیکن کسی کو اپنی موت کے وقت کا پتہ ہے؟ اب اگر کوئی کہے کہ جب مجھے کوئی ڈاکٹر نہیں بتا سکتا، کوئی مجھے طبیب نہیں بتا سکتا کہ میں نے کتنے مہینوں اور دنوں کے بعد مرجانا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسے ہی افواہ ہے، مرنا نہیں ہے، جیسے یہ حماقت ہے ایسے ہی اس دنیا کے متعلق یہ خیال کرنا حماقت ہے، قیامت کا آنا یقینی ہے لیکن وقت معلوم نہیں، وقت معلوم نہ ہونا اسی میں ہماری مصلحت ہے کیونکہ اگر وقت آپ کو بتا دیا جائے کہ آپ نے اس ہفتے بدھ کے روز عصر کے بعد مرجانا ہے، تو اس کے بعد لوگوں پر دو قسم کے حال طاری ہوں گے، بعض تو لاپرواہ قسم کے ہوں گے وہ

کہیں گے ابھی تو تین دن باقی ہیں کوئی بات نہیں کھاپی لو، اور بعض پر ایسی ہیبت طاری ہوگی کہ وہ آج ہی رونے بیٹھ جائیں گے گویا کہ موت آہی گئی، دونوں باتیں ہی خطرناک ہیں، جس چیز کا وقت معلوم نہ ہو اگر اس سے کوئی خوف کھانا چاہے تو یہ زیادہ ڈرنے کی بات ہے، اگر آپ کو فکر آخرت ہے تو آپ یہ سوچیں گے کہ ہر وقت تیاری رکھو، پتہ نہیں کب آجائے، اور اگر آپ کو بتادی جائے کہ ابھی تو آپ کے دس سال باقی ہیں تو آپ کہیں گے چلو آخری سال توبہ واستغفار کے لیے اور نو سال عیاشی کے لیے، لیکن اب جب پتہ ہی نہیں ہے کہ کس وقت آجائے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ چلو اب یہ گناہ کرلو بعد میں توبہ کرلیں گے، ہوسکتا ہے توبہ کی مہلت ہی نہ ملے اور مرنا آپ سب نے ہے پتہ نہیں گھنٹے کے بعد مرجائیں لیکن وقت کا علم نہ ہونے کی بناء پر ایسا استحضار آپ کو نہیں ہے کہ آج ہی آپ کا کھانا پینا چھوٹ جائے، ہر شخص اسی تمنا پر کام کرتا چلا جارہا ہے کہ پتہ نہیں میری زندگی کتنی لمبی ہے اور میں نے کتنا فائدہ اٹھانا ہے اس لیے دنیا کی ساری نقل وحرکت جاری ہے۔

موت کا وقت متعین ہونے کی صورت میں دونوں قسم کی خرابیاں آسکتی ہیں بعض میں لاپرواہی آئے گی اور بعض پر اتنا خوف مسلط ہوجائے گا کہ وہ کسی کام کے نہیں رہیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے جو اس کو مخفی رکھا ہے تو اس مخفی رکھنے کی وجہ سے ہی یہ دنیا کی نقل وحرکت جاری ہے، ورنہ انسان سوچے گا کہ میں نے تو اس سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے اس لیے میں یہ کام کیوں کروں؟ اور کوئی یہ سوچے گا کہ ابھی تو اتنے دن باقی ہیں، جو عیاشی کرنی ہے کرلو بعد میں دیکھی جائے گی، تو موت کا وقت متعین ہونے کی صورت میں یہ دنیا کا نظم برقرار نہ رہتا، تو جیسے اللہ تعالیٰ نے شخصی موت کے وقت کو مخفی رکھا ہے اور یہی چیز اس کی مصلحت اور حکمت کا تقاضہ ہے تو اس عالم کی موت کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح سے مخفی رکھا ہے کہ اسی میں مصلحت ہے۔

وہ آپ سے ایسے سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ اس کے متعلق تحقیق کرنے والے ہیں کہ آپ نے تحقیق کرلی پورے محقق بن گئے اب وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ ہمیں بھی بتادیں تو جب آپ کو اس کے وقت کی تحقیق نہیں ہے تو ان کو سوال کرنے کا کیا حق ہے؟ آپ ان کو صاف صاف کہہ دیجیے کہ اس کا علم میرے اللہ کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ بعض باتوں کا مخفی رہنا ہی اللہ کی حکمت کا تقاضہ ہے وہ بے علمی کی وجہ سے اس قسم کے سوالات اٹھاتے ہیں، ان کو علم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے علم کی تعیین کسی کو نہیں بتائی اور اس طرح بعض چیزوں کا مخفی رکھنا ہی حکمت کا تقاضہ ہوتا ہے۔

حضور ﷺ سے علمِ غیب اور اختیارِ کلی کی نفی:

آپ کہہ دیجئے کہ میں اختیار نہیں رکھتا اپنے نفس کے لیے حصول نفع کا اور نہ دفع مضرت کا مگر جو اللہ چاہے، جتنا چاہے، جتنا اللہ چاہے اتنا اختیار حاصل ہوگا ورنہ میرے بس میں کچھ نہیں، اگر میں عالم الغیب ہوتا تو میں بہت ساری خیر اکٹھی کر لیتا اور مجھے کبھی برائی نہ پہنچتی کہ مجھے پتہ ہوتا کہ اس کام کا نتیجہ غلط نکلے گا میں وہ کام نہ کرتا حالانکہ میری زندگی بھی شاہد ہے کہ اس قسم کے واقعات ہو جاتے ہیں کہ جس میں نتیجہ جب سامنے آتا ہے تو نقصانات بھی ہوتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ اگر پہلے پتہ ہوتا تو ہم ایسا نہ کرتے جیسے سرور کائنات ﷺ جب حج پہ تشریف لے گئے ہیں تو مدینہ منورہ سے ہدی ساتھ لے گئے تھے اور بعد میں حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ آپ نے کہا جن کے پاس ہدی نہیں ہے وہ احرام کھول کے حلال ہو جائیں اور جن کے پاس ہدی ہے وہ حلال نہ ہوں تو کچھ لوگوں نے کچھ تردد سا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر میرے اس معاملہ کا مجھے پہلے پتہ چل جاتا جس کا مجھے بعد میں پتہ چلا ہے تو میں بھی ہدی ساتھ نہ لاتا تو ایسی باتیں ہو جاتی ہیں کہ اگر کسی تدبیر کے متعلق پہلے پتہ چل جائے کہ یہ تدبیر خطا جائے گی تو ہم اس کو اختیار کیوں کریں؟ اور فلاں کام کرنے میں ہمیں نقصان ہوگا تو ہم وہ کام کیوں کریں؟ لیکن میری زندگی میں ایسے واقعات ہیں کہ جن کو دیکھ کے آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم ایک کام اچھا سمجھ کے کرتے ہیں لیکن نتیجہ ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے یہ علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا علم ہمیں نہیں دیا اور جب علم نہیں ہے تو پھر نفع ونقصان کا مستقل اختیار بھی نہیں ہے، بس جتنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار ملے گا اتنا ہی ہوگا اس سے زائد کوئی بات نہیں ہے، نہ علم کا دعویٰ ہے، نہ اختیار کا دعویٰ ہے تو پھر ایسے سوالات کرنا کہ تم یہ کر کے دکھا دو یا تم فلاں بات بتا دو یہ سوال بے محل ہے، میں ان چیزوں کا مدعی نہیں ہوں "اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ" نہیں ہوں میں مگر ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ان لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ

وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہیں ایک نفس سے اور بنایا اسی ایک نفس سے اس کی زوجہ کو تاکہ وہ سکون پکڑے اس زوجہ ،

اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ

کی طرف پس جب ڈھانپ لیا اس مرد نے اس عورت کو تو بوجھ اٹھایا اس عورت نے ہلکا سا بوجھ اٹھانا پھر وہ اس بوجھ کے ساتھ چلتی پھرتی رہی پھر جس وقت

اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ

وہ عورت زیادہ بوجھل ہوگئی تو پکارا ان دونوں نے اللہ کو جو ان دونوں کا رب ہے اگر دے دیا تو نے ہمیں درست بچہ تو البتہ ضرور ہو جائیں گے ہم

الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا ۚ

شکرگزاروں میں سے ﴿۱۸۹﴾ اور جب دے دیا اللہ نے دونوں کو صحیح سالم بچہ تو بنا لیے ان دونوں نے اللہ کے لیے شرکاء اس چیز میں جو اللہ نے ان دونوں کو دی تھی

فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَّهُمْ

پھر اللہ بلند ہے ان چیزوں سے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں ﴿۱۹۰﴾ کیا یہ لوگ شریک ٹھہراتے ہیں ایسی چیز کو جو کچھ پیدا نہیں کرتی اور وہ

يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ

خود پیدا کیے ہوئے ہیں ﴿۱۹۱﴾ اور نہیں طاقت رکھتے وہ ان لوگوں کے لیے مدد کرنے کی اور نہ وہ اپنی

يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ

مدد کر سکتے ہیں ﴿۱۹۲﴾ اگر تم پکارو ان کو ہدایت کی طرف تو وہ تمہاری اتباع نہیں کریں گے ،

سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

برابر ہے تم پر کہ تم ان کو پکارو یا تم چپ رہو ﴿۱۹۳﴾ بے شک وہ چیزیں

تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا

جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ وہ تم جیسے ہی بندے ہیں پھر پکارو تم ان کو چاہیے کہ وہ بات کو مان لیں

لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ

تمہاری اگر تم سچے ہو ﴿۱۹۴﴾ کیا ان کے لیے ٹانگیں ہیں جن کے ساتھ وہ چلتے ہوں یا کیا

لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ

ان کے لیے ہاتھ ہیں جن کے ذریعے سے وہ پکڑتے ہوں، کیا ان کے لیے آنکھیں ہیں جن کے ذریعہ سے وہ دیکھتے ہوں،

اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ

کیا ان کے لیے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے ہوں، آپ کہہ دیجئے پکارو اپنے شرکاء کو پھر تم میرے خلاف تدبیر کرلو

فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ

اور پھر تم مجھے مہلت بھی نہ دو ﴿۱۹۵﴾ بے شک میرا مددگار تو اللہ ہے جس نے کتاب اتاری اور وہ

يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

حمایت کرتا ہے نیکوں کی ﴿۱۹۶﴾ جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ نہیں طاقت رکھتے وہ

نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى

تمہاری مدد کی اور نہ وہ اپنے نفسوں کی ہی مدد کرتے ہیں ﴿۱۹۷﴾ اگر تو پکارے انہیں ہدایت کی طرف

لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

تو وہ سنتے نہیں، تو ان کو دیکھتا ہے کہ وہ تیری طرف جھانکتے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے نہیں ہیں ﴿۱۹۸﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

پچھلے رکوع میں دین کے تینوں اصولوں میں سے رسالت اور معاد کا ذکر کچھ وضاحت کے ساتھ آیا تھا اور آخری آیات میں سرور کائنات ﷺ کی طرف سے اعلان کروادیا گیا تھا اسی مناسبت سے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ اگر قیامت آنے والی ہے تو ہمیں اس کا وقت بتاؤ تو کلام اس طرف منتقل ہوگئی تھی کہ آپ ان کے سامنے اعلان کر دیجئے کہ نہ تو میں عالم الغیب ہوں اور نہ کسی نقصان کا ہٹانا میرے بس میں ہے اور نہ کسی نفع کا حاصل کرنا میرے اختیار میں ہے، نہ کسی اور کے لیے اور نہ اپنے لیے، یہ چیزیں نبوت کے لوازمات میں سے نہیں ہیں کہ نبی مختار کل اور عالم الغیب ہو یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

نبی کا کام ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام لوگوں کو سناتا ہے، اس کے عذاب سے ڈراتا ہے، ماننے والوں کو بشارت دیتا ہے وہ کام میں کر رہا ہوں باقی میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں عالم الغیب ہوں، جو پوچھو میں بتادوں گا، اور یہ بھی دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نفع ونقصان کا مالک ہوں جو کہو گے کر کے دکھادوں گا یہ حضور ﷺ سے اعلان کروادیا گیا جس کے ضمن میں گویا کہ توحید بھی ثابت ہوگئی کہ اللہ کی مخلوق میں سے سب سے عظیم المرتب اللہ کا نبی ہوتا ہے، اور اللہ کے نبیوں میں سے سب سے بڑے، سید الرسل، سید الانبیاء، امام النبین، محمد رسول اللہ ﷺ ہیں تو جب ان سے بھی یہ اعلان کروادیا کہ نفع اور ضرر کا اختیار میرے پاس نہیں ہے اور مجھے علم غیب بھی نہیں ہے تو پھر دوسروں کی کیا پوزیشن رہی، تو عقیدہ توحید کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جمیع حالات کو جاننے والا کوئی نہیں اور اللہ کے علاوہ نفع ونقصان کا مالک کوئی نہیں ہے، یہیں سے آگے کلام منتقل ہوگئی ردشرک کی طرف تو اگلی آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں ہیں یہ ردشرک پر مشتمل ہیں۔

نفس واحدہ اور زوجہ کا مصداق:

پہلی آیت "هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ" اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تمہیں ایک ہی جان سے تو نفس واحدہ سے آدم مراد ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ آدم کو پیدا کرنے والا اللہ ہے اور اس آدم سے اللہ نے تمہیں پیدا کیا تو خالق تمہارا اللہ ہے، اس میں اللہ کے خلق کا ذکر بھی آگیا اور اس کے انعام کا ذکر بھی آگیا کہ اس نے ہمیں وجود کی نعمت بخشی، تو اللہ نے نفس واحدہ کو پیدا کیا اور اس نفس واحدہ کے لیے اس کی زوجہ کو بنایا، "منھا" کی ہاء ضمیر مؤنث کی طرف لوٹ رہی ہے نفس کے اعتبار سے کیونکہ لفظ نفس مؤنث ہے اگرچہ اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اس نفس سے اس کی زوجہ کو کیسے بنایا؟ سورۃ النساء کی ابتداء میں یہ مسئلہ ذکر کیا تھا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حواء کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا تھا، آدم کی پسلی سے مادہ لے کر اس پر خلق حواء کی بنیاد رکھی گئی تو "منھا" یہ ہو جائے گا کہ اسی سے بنایا اس کی زوجہ کو، ان الفاظ کی معروف تفسیر یہی ہے اور بعض مفسرین اس کا مطلب یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی جنس سے بنایا یعنی جیسا آدم ویسی اس کے لیے اس کی بیوی بنادی۔

مرد وعورت اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا شاہکار ہیں:

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دونوں کو اس طرح بنایا کہ مرد عورت کی طرف مائل ہو کے سکون حاصل کرتا ہے اور عورت مرد کی طرف مائل ہو کر سکون حاصل کرتی ہے یہ مرد وعورت اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا ایک شاہکار ہے کہ دونوں

کے بدن کی ساخت ایسی رکھی، دونوں کے بدن میں جذبات ایسے رکھے کہ اُس کا میلان اِدھر ہے اور اِس کا میلان اُدھر ہے اور جس وقت تک مرد کے ساتھ عورت نہ ہو تو مرد اپنی زندگی میں بہت سارا خلا محسوس کرتا ہے، اور عورت کے لیے مرد نہ ہو تو عورت کی زندگی میں بہت سارا خلا ہے اور جب یہ دونوں آپس میں ملتے ہیں تو دونوں کی زندگی مکمل ہوتی ہے پھر یہ معاشرہ میں ایسے ہوتا ہے جیسے کسی گاڑی کے دونوں پہیے ٹھیک ہو گئے اور پھر معاملہ درست چلتا رہتا ہے ورنہ مرد کی بہت ساری ضروریات ایسی ہیں، بہت سارے جذبات ایسے ہیں جو بغیر بیوی کے تسکین نہیں پاتے، اور اسی طرح عورت کی بہت ساری ضروریات ایسی ہیں کہ وہ مرد سے مستغنی ہو کے اپنا گزارہ نہیں کر سکتی تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کر کے دونوں کا ایک دوسرے کی طرف میلان رکھا اور دونوں کے ملنے کے ساتھ زندگی میں سکون آیا۔

تو زوجین کے تعلق سے اصل مقصود سکون ہے، اسی لیے جہاں زوجین کے تعلق میں سکون نہ ہو وہاں کسی صورت میں بھی گھر کی زندگی اچھی نہیں ہو سکتی، آگے نسل خراب ہو جاتی ہے، گھر کے حالات خراب ہوتے ہیں، مال و دولت اور جائیداد ہونے کے باوجود ان گھروں کے اندر سکون نہیں ہوتا جن میں زوجین کا تعلق آپس میں سکون والا نہیں ہے، تخلیق اس کی اگر ہوئی ہے تو اسی سکون کے نظریے سے ہوئی ہے اور یہ مقصد تب ہی پورا ہو گا جب زوجین آپس میں مل کے سکون حاصل کریں۔

اگر خاوند بیوی کے اندر اطمینان کی کیفیت نہیں تو پھر وہ معاشرہ صحیح نہیں رہتا، گھر کا ماحول صحیح نہیں رہتا، یہ بات مقصد کے خلاف ہو جاتی ہے، یہ اللہ کا انعام ہے کہ مرد کے لیے عورت کو پیدا کر دیا جس کے ساتھ اس کو سکون حاصل ہوتا ''لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا'' تو وہ نفس سکون حاصل کرے اس عورت کی طرف مائل ہو کر، اس لیے ہم نے اس کے ساتھ اس کی بیوی کو بنا دیا۔

''فَلَمَّا تَغَشّٰھَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا'' کی بے غبار تشریح:

''فَلَمَّا تَغَشّٰھَا'' اب اللہ تعالیٰ نے یہ زوجین اس طرح سے بنا دیے آگے نسل چلی پھر ایک وقت ایسا بھی آیا یہ ایک حال مذکور ہے، کسی متعین شخص کا واقعہ نہیں ہے یعنی ''تغشھا'' میں ''تغشی'' کی ضمیر مرد کی طرف لوٹی اور ہاء کی ضمیر عورت کی لوٹی یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک نفس پیدا کر کے اس کے لیے زوجہ بنا دی، سلسلہ وہاں سے چل پڑا، وہاں سے اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے، پھر انسانی زندگی میں یہ واقعات بھی پیش آئے کہ مرد نے عورت کو ڈھانپا یعنی

دونوں آپس میں اکٹھے ہوئے، مصاحبت ہوئی تو اس کا نتیجہ میں عورت نے ہلکا سا بوجھ اٹھایا اس سے مراد ہے جو حمل کے ابتدائی حالات ہوا کرتے ہیں، نطفہ کی شکل میں اور نطفہ کے بعد جو تغیرات اس کے اوپر ہوتے ہیں جبکہ کوئی خاص احساس بھی نہیں ہوتا کہ پیٹ میں کوئی بوجھ ہے، عورت نے حمل خفیف اٹھایا اور اس کے ساتھ وہ چلتی پھرتی رہی، اس نے چلنے پھرنے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں کی، ابتدائی مراحل میں ایسے ہی ہوتا ہے "فَلَمَّا أَثْقَلَتْ" اور پھر جس وقت وہ بوجھل ہوگئی، پوری طرح سے محسوس ہونے لگ گیا کہ واقعی پیٹ میں بچہ ہے پھر اس کے بعد عورت کے لیے چلنا پھرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، جب یقین ہو گیا کہ پیٹ میں بچہ ہے اب خاوند بیوی دونوں اس فکر میں ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بچہ کی بنیاد تو رکھ دی اللہ کرے تندرست بچہ پیدا ہو، صحیح سالم پیدا ہو ایسا نہ ہو کہ کوئی لنگڑا پیدا ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ اندھا پیدا ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ بہرہ پیدا ہو جائے، اس قسم کی فکر ماں باپ کو لگ جاتی ہے، جب اس قسم کے فکر لگتے ہیں تو پھر وہ اللہ سے دعائیں کرتے ہیں کہ یا اللہ! ہمیں تندرست بچہ دینا، ہمیں صحیح سالم بچہ دینا تو "صَالِحًا" سے یہاں صالح الاعضاء مراد ہے یعنی عام انسان میں یہ بات ہے کہ جب ایسی حالت پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجحان ہوتا ہے، وہ دعائیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تندرست بچہ پیدا ہوا تو ہم اللہ کا شکر ادا کریں گے، شکر گزار ہو جائیں گے، اس قسم کی تمنائیں ماں اور باپ کے قلوب میں ابھرتی ہیں۔

پھر ہوتا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی آرزو کے مطابق صحیح سالم بچہ پیدا کر دیتا ہے، اس کی آنکھیں ٹھیک ہیں، کان ٹھیک ہیں، زبان ٹھیک ہے، صالح الاعضاء ہے، اب بچہ پیدا ہو گیا، پیدا ہونے کے بعد پھر لوگ کیا کرتے ہیں؟ کبھی کہیں گے یہ فلاں پیر نے دیا ہے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ فلاں پیر سے سلام کروا کے لانا گویا کہ پیر کے فیض سے یہ بچہ آیا ہے، اور کبھی بچہ کی پیدائش کے بعد غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز چڑھانے لگ جاتے ہیں کہ وہاں جا کے چڑھاوا چڑھا کے آؤ کہ بچہ پیدا ہوا ہے جس سے اشارہ اس بات کی طرف ہوتا ہے کہ گویا کہ بچہ اس نے دیا ہے اور کبھی بچہ کا نام اس قسم کا رکھتے ہیں جس میں نسبت غیر کی طرف ہو جاتی ہے جیسے پیر بخش، علی بخش، عبد الشمس وغیرہ گویا کہ وہ اس قسم کے نام رکھ کے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ گویا کہ یہ نعمت ہمیں ان کی طرف سے حاصل ہوئی ہے، درجہ بدرجہ یہ سارے کے سارے شرک کے شعبے ہیں، تو گویا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انسانی برادری کی شکایت کر رہے ہیں کہ انسانی برادری یہ نہیں سوچتی کہ پیدا کرنے والے تو ہم ہیں، ان کو بھی ہم نے پیدا کیا اور ان کی بیویوں کو بھی ہم نے پیدا کیا لیکن اس قسم کے واقعات ہو جاتے ہیں کہ جب خاوند بیوی آپس میں ملتے ہیں، بیوی

حاملہ ہوتی ہے، بچے کے پیدا ہونے کی توقع لگتی ہے تو اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں، تمنائیں ان کے دل سے ابھرتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان کو اچھا بھلا بچہ دے دیتا ہے پھر یہ غیروں کی طرف نسبت کر دیتے ہیں، پھر یہ شرک کرنے لگ جاتے ہیں، یہ انسان کی شکایت ہے کہ دینے والا اللہ ہے اور پیدا ہونے کے بعد لوگ دوسروں کو بھی اس میں شریک کرنے لگ جاتے ہیں "فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا" جب اللہ تعالیٰ انہیں اچھا بچہ دے دیتا ہے تو کر لیتے ہیں اس کے لیے شرکاء اس چیز میں جو اللہ نے ان کو دی، ان کے شریک ٹھہرانے سے اللہ بلند و بالا ہے۔

یہ تفسیر جو میں نے کی اس میں کوئی اشکال نہیں چاہے پہلے ذکر حضرت آدم وحوا کا ہو لیکن آگے کلام منتقل ہوگئی کہ ان کی اولاد میں اس قسم کے واقعات ہوتے ہیں، تو "فَلَمَّا تَغَشّٰهَا" کی ضمیر اس نفس واحدہ اور متعین زوجہ کی طرف نہ گئی بلکہ نسل کے اندر جو زوجین کا قصہ چلا تو اس کا ایک واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، کسی کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں ایسے واقعات ہوتے ہیں، تو یہ عمومی ضمیر لوٹ گئی جنس کی طرف کہ جنس انسان میں اس قسم کے واقعات ہوتے ہیں تو اس میں کوئی کسی قسم کا اشکال نہیں۔

"فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا" کی دوسری تفسیر:

لیکن بعض تفاسیر میں ایک روایت لکھی ہوئی ہے اور وہ روایت ترمذی شریف میں بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ آدم وحوا کا ہی ہے اور واقعہ یوں بیان کیا ہوا ہے کہ جس وقت آدم وحوا آپس میں اکٹھے ہوئے اور یہی صورتحال پیدا ہوئی جس کا قرآن کریم نے نقشہ کھینچا ہے تو ابلیس کسی نیک آدمی کی شکل میں آیا اور آکے حوا کے ساتھ اس قسم کی باتیں کرنے لگ گیا اور اسے کہنا لگا کہ جس وقت یہ بچہ پیدا ہو تو اس کا نام عبدالحارث رکھنا تو پھر یہ بچہ زندہ رہے گا تو جب وہ بچہ پیدا ہوا تو اب عبدالحارث لفظ کے اندر کوئی کسی قسم کی قباحت معلوم نہیں ہوتی کیونکہ عبد ہمیشہ عبادت گزار کو تو نہیں کہتے، عبد خادم کو بھی کہتے ہیں اور حارث کا لفظی معنی پیشہ ور، کام کرنے والا، تو یہ آدم وحوا اس کی چال سمجھ نہ سکے کہ فرشتوں کے اندر شیطان کا ایک نام حارث بھی تھا اور جب بچہ پیدا ہوا تو انہوں نے اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا اب اگرچہ اس میں کوئی شرک کا ارادہ نہیں ہے، نظریات شرک والے نہیں ہیں لیکن اس کی نسبت اس حارث کی طرف کر دی تو گویا کہ من وجہ اس کا مفہوم اس قسم کا ہوگیا کہ حارث کی طرف اس کی نسبت ہوگئی جیسے عبدالنبی یا عبدالعلی کہا جائے، تو اس طرح دوسرے کی طرف اس قسم کی نسبت پسندیدہ نہیں ہے اور انبیاء علیہم السلام سے اگر کوئی تھوڑی بہت بھی لغزش ہو جائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو بہت سخت انداز میں بیان کرتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ" اور جتنا کوئی مقرب ہوتا ہے اتنا ہی وہ ڈرتا بھی زیادہ ہے۔

ان حالات کے تحت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو یہاں ایسے انداز میں ذکر کیا کہ گویا کہ آدم وحوا کسی کو شریک ہی کر بیٹھے، یہ روایت ہے لیکن محققین کے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں، اسرائیلیات سے ماخوذ ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی طرف اس قسم کی باتوں کی نسبت جس وقت تک بہت قوی اور مضبوط دلیل کے ساتھ بات ثابت نہ ہو اس قسم کی کمزور بات پر تفسیر کا مدار نہیں رکھنا چاہیے۔

اب حضرت آدم علیہ السلام سے ایک غلطی ہوئی تھی اس کا ذکر قرآن کریم میں صراحتاً ہے اور قیامت کے دن جس وقت لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے کہ تو چل کے ہماری سفارش کر تو حضرت آدم علیہ السلام اپنی اسی لغزش کو یاد کریں گے کہ مجھے اللہ نے منع کیا تھا کہ درخت نہیں کھانا، میں نے درخت کھالیا تھا اس لیے آج میں اللہ کے سامنے نہیں جاتا، کسی روایت میں بھی یہ نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام یہ کہیں کہ میں اللہ کے سامنے نہیں جاتا کہ مجھ سے یہ غلطی ہوگئی تھی کہ میں نے بچہ کا ایسا نام رکھ لیا تھا جو مشرک کی طرف منسوب تھا، کسی روایت میں اس قسم کی بات بالکل مذکور نہیں ہے اس لیے وہ روایت اس درجہ کی نہیں کہ اس پر تفسیر کا مدار رکھا جائے اگرچہ اس روایت کو لینے کے بعد توجیہ اس کی ہوسکتی ہے جس طرح میں آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں۔

صحیح، آسان اور اس کی بے غبار تفسیر یہی ہے کہ "تَغَشّٰهَا" کی ضمیر اس نفس واحدہ متعین اور زوجہ متعینہ کی طرف نہ لوٹائی جائے بلکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو نسل انسان کی ابتداء کو ذکر کیا کہ ایک آدم وحوا کو پیدا کر کے اسی سے تم سب انسانوں کو پیدا کیا اور پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرد عورت کے پاس جاتا ہے تو یہ حالات پیدا ہو جاتے ہیں تو "تَغَشّٰهَا" کی ضمیر عام لوگوں کی طرف لوٹ جائے گی۔

بہر حال یہ ایک شکوہ ہے انسان سے کہ اولاد دیتا اللہ ہے اور اولاد ہو جانے کے بعد پھر لوگ چڑھاوے دوسروں کے چڑھاتے ہیں۔

آیات مذکورہ کی روشنی میں شرکاء کے مصداق کی مفصل مدلل تشریح:

"اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ" یہاں سے صراحۃً ان شرکاء کی تردید آگئی کہ یہ شریک ٹھہراتے ہیں ایسی چیزوں کو جو خود کچھ پیدا نہیں کرتیں اور وہ خود پیدا کی جاتی ہیں، پیدا نہیں کرتے خود پیدا کیے جاتے ہیں، خود کچھ بنا نہیں سکتے خود بنائے جاتے ہیں، خود مخلوق ہیں خالق نہیں ہیں ایسی چیزوں کو یہ لوگ شریک ٹھہرانے

لگ جاتے ہیں۔

اب ان چیزوں سے کیا چیز مراد ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کو بھی اللہ کا شریک ٹھہرایا اور وہ بھی مشرک ہیں، اگر کوئی شخص نبی کو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے تو وہ بھی مشرک ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ قرار دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الٰہ قرار دیا، حضرت عزیر علیہ السلام کے متعلق اس قسم کے لفظ استعمال کیے یا دوسرے انبیاء علیہم السلام کے متعلق جاہلوں نے اگر اس قسم کے عقیدے رکھے ہیں تو وہ بھی مشرک ہیں، اور اس قسم کے شرک کا وجود بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی اللہ کا شریک ٹھہرادیا گیا اس کی تردید نہیں ہے۔

اور ایسا بھی ہے کہ اولیاء اللہ کو شریک ٹھہرایا گیا اور ایسا بھی ہے کہ ملائکہ کو شریک ٹھہرایا گیا اور ایسا بھی ہے کہ جنات کو شریک ٹھہرایا گیا، جنات، ملائکہ، اولیاء اور انبیاء ان سب کے متعلق لوگوں نے شرک والے نظریات رکھے اور ان کو اللہ کا شریک ٹھہرایا چاہے قدرت میں، چاہے علم میں، چاہے تصرف میں چاہے کسی چیز میں ہو، ان کو ویسا قادر مانا جیسا اللہ قادر ہے، ان کو ویسا متصرف مانا جیسے اللہ متصرف ہے، ان کو ویسا عالم الغیب اور حاضر ناظر مانا جیسا اللہ عالم الغیب اور حاضر ناظر ہے یہ سب شرک کے شعبے ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

اور یہ بھی واقعہ ہے کہ لوگوں نے ان کے علاوہ اور چیزوں کی بھی پوجا کی ہے، سورج کو پوجا، چاند کو پوجا، حیوانات میں سے بعض جانوروں کو پوجا، اسرائیلیوں کا ذکر تو آپ کے سامنے ہو ہی چکا کہ بچھڑے کو پوجا، ستاروں کو پوجا حتیٰ کہ تاریخ میں ہے کہ لوگوں نے سانپ تک کو پوجا، پانی کی عبادت کی، آگ کی عبادت کی اور حد یہ ہے کہ مشرکین میں بعض قومیں ایسی بھی گزری ہیں جو مرد و عورت کے اعضاء تناسل کی بھی عبادت کرتے ہیں، اس کے سامنے بھی سجدہ ریز ہوتے ہیں اور ان کو بھی سلام کرتے ہیں اور اس دلیل کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں بنایا ہے۔

میرے سامنے ایک مجلس میں ایک مرتبہ اس کا ذکر ہوا تو میں نے کہا وہ بڑے بے وقوف ہیں میں نے کہا ان سے کوئی پوچھے کہ یہ پہلے ہیں یا ہم پہلے ہیں؟ اگر پہلے یہ ہیں اور ان کی وساطت سے آدم وجود میں آیا پھر تو مغالطہ کی گنجائش ہے اور اگر آدم پہلے بنا اور یہ اس کی وساطت سے آئے تو پھر ان کی نسبت کس طرح درست ہوئی؟ یہ تو متعین بات ہے کہ آدم تو ان کی وساطت سے نہیں آیا اور نہ حوا ان کی وساطت سے آئی ہے، یہ ان دونوں کی وساطت سے آئے ہیں، بہر حال دنیا کے اندر پاگلوں کی کمی نہیں ہے، اپنی عقل کو دوڑا کے لوگ کہاں تک پہنچے سانپ کو پوجا، مختلف جانوروں کو پوجا، پانی کو، آگ کو، درختوں کو پوجا۔

اور یہ بھی ہے کہ پتھر کی مورتیاں بھی بنائیں، تصویریں بناتے وقت چاہے ان کا خیال یہ ہے کہ یہ ہم فرشتوں کی تصویر بنا رہے ہیں، چاہے ان کا خیال یہ ہے کہ ہم جنات کی تصویر بنا رہے ہیں، چاہے ان کا خیال یہ ہے کہ ہم کسی پیر یا پیغمبر کی تصویر بنا رہے ہیں، ابتداء نظریہ یہی ہے لیکن پھر جب جہالت نے زور مارا تو شخصیات نظروں سے مخفی ہوگئیں اور تصویریں ہی سامنے رہ گئیں، مشرکین کے شرک میں یہ سب مثالیں موجود ہیں حتیٰ کہ بخاری شریف میں ایک روایت آتی ہے ایک صحابی خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جن دنوں ہم پتھروں کو سجدہ کرتے تھے تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک پتھر ہم نے تراش کے رکھا ہوا ہے جس کو ہم سجدہ کرتے تھے چلتے چلتے اگر اس سے اچھا مل جاتا تھا تو پہلے کو چھوڑ کر دوسرا اٹھا لیتے تھے تو اس قسم کے شرک کی ساری کی ساری مثالیں موجود ہیں۔

آپ شاید میرے مضمون کو صحیح طرح سمجھ نہیں رہے ہیں، میں آپ کے سامنے عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس بات میں شرک بند نہیں ہے کہ ہر مشرک کا معبود نبی یا فرشتہ یا ولی یا جن ہی ہے اور بے جان چیزوں کو لوگوں نے نہیں پوجا، بے جان چیزوں کو بھی لوگوں نے پوجا ہے، میں ان کی نفی نہیں کر رہا کہ انبیاء اور اولیاء کو شریک نہیں بنایا گیا، اس بارے میں نصوص قطعیہ قرآن کریم میں موجود ہیں، ان کا کون انکار کرسکتا ہے لیکن ساتھ یہ کہتا ہوں کہ مشرک قوموں کے اندر محض بت پرستی بھی ہوئی کہ ان کے سامنے وہ پتھروں کی تصویریں ہیں اور شخصیات نظروں سے اوجھل ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہی ہیں جو کچھ ہیں۔

جب کبھی میں یہ بات کرتا تھا تو لوگ کہتے کہ اتنے پاگل تھے کہ پتھروں کی تصویروں کو ہی سب کچھ سمجھنے لگ گئے تو میں انہیں کہا کرتا تھا کہ کوئی نبی کو شریک بنائے تو وہ بھی پاگل ہے، کوئی ولی کو بنائے تو وہ بھی پاگل ہے، تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ جنہوں نے نبیوں اور ولیوں کو شریک بنایا وہ عقل مند تھے؟ جب عقل انسان کی اکھڑی تو شرک تو سارا ہی خلاف عقل ہے اس لیے یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے تصویروں کو بھی معبود سمجھا، اللہ کا مصداق بنایا اور شخصیات ان کی نظروں سے اوجھل ہیں، اتنی تعمیم کے ساتھ اگر آپ شرکاء کے وجود کو سمجھیں گے تو قرآن کریم کی آیات حل کرنے میں آپ کو کہیں بھی کوئی کسی قسم کا اشکال پیش نہیں آئے گا۔

لہٰذا جہاں کہیں شرک کی تردید کی گئی ہو اور شرکاء کے حالات ذکر کیے گئے ہوں تو ضروری نہیں کہ ان سب کو آپ انبیاء علیہم السلام پر ہی صادق کریں، اولیاء پہ صادق کریں، ملائکہ پر صادق کریں، جنات پہ صادق کریں، یہ ضروری نہیں کہ سب آیتیں اٹھا کے آپ انہی پر ہی فٹ کریں، عیسائیوں کی تردید میں جہاں بات آئے گی ٹھیک ہے کہ وہ

عیسیٰ اور مریم کو اللہ کہتے تھے تو وہاں جو باتیں ہوں گی وہ ان پر صادق آئیں گی اور مشرکین مکہ ملائکہ کی پوجا کرتے تھے تو ملائکہ کی تردید کے بارے میں بھی آیات ہیں لیکن شرک کی تردید میں جو آیت آئے آپ اسے کہیں کہ اس کا اولیاء مصداق ہیں، اس کا انبیاء مصداق ہیں، ملائکہ مصداق ہیں، جنات مصداق ہیں اس بات کے ہم قائل نہیں ہیں، بلکہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو ان پر صادق نہیں آتیں بلکہ بے جان چیزوں پر صادق آتی ہیں (میری یہ باتیں ذہن میں رکھو کسی وقت کام آجائیں گی۔)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں جس قسم کا شرک تھا بنیاد اس کی چاہے کسی چیز پہ ہو کہ انہوں نے تصویریں بنائی تھیں اور کس نظریہ سے بنائی تھیں؟ فرشتوں کی بنائی تھیں، اولیاء کی بنائی تھیں، انبیاء کی بنائی تھیں، اس سے بحث نہیں ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں جو بت انہوں نے بنائے ہوئے تھے اس وقت جہالت اس درجہ پر تھی کہ وہ قوم ان بتوں کو ہی سب کچھ سمجھتی تھی، شخصیات ان کے سامنے نہیں تھیں، "اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ" کیا تم ایسی چیزوں کو پوجتے ہو جس کو خود تراشتے ہو، تو کیا وہ فرشتوں کو خود تراشتے تھے؟ انبیاء اور اولیاء کو تراشتے تھے؟ "اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ" کیا اس کو پوجتے ہو جس کو خود تراشتے ہو؟ تو اس سے معلوم ہو گیا لکڑی اور پتھر کا تراش کے جو بناتے تھے ان کی عبادت کا تعلق اسی کے ساتھ تھا۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت بت پرستی کی تردید کی ہے تو تردید کرنے کے لیے کیا تدبیر کی تھی؟ ٹکڑے کیے تھے سب بت توڑ پھوڑ دیے تھے اور اس توڑنے پھوڑنے کو اس بات کی دلیل بنایا تھا کہ یہ خود عاجز ہیں، اپنے آپ کو نہیں بچا سکے تمہیں کیا بچائیں گے اور جس وقت بت خانہ کے اندر گئے تھے اور مارنا شروع کیا تھا تو ساتھ یہ بھی کہتے تھے "مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ" تم بولتے کیوں نہیں؟ "اَلَا تَاْكُلُوْنَ" تم کھاتے کیوں نہیں؟ سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، اور جب وہ قوم آئی تو ان کی حماقت اور بے عقلی اسی سے واضح کی کہ انہی کو پوجتے ہو جو اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے، انہوں نے کہا تھا "مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يَا اِبْرٰهِيْمُ" "اے ابراہیم! ہمارے معبودوں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ "قَالَ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ" کہا بڑا یہ کھڑا ہے اور ان سے پوچھ لو اگر یہ بول سکتے ہیں، تو انہی ٹوٹے ہوؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا " فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ" اگر یہ بول سکتے ہیں تو ان سے پوچھ لو، انہوں نے آگے سے کہا تھا ابراہیم! تجھے پتہ تو ہے کہ یہ تو نہیں بول سکتے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا "اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" افسوس ہے تم پر اور تمہاری ان چیزوں پر جن کو تم اللہ کے علاوہ پوجتے ہو کہ جو بول نہیں سکتے۔

ایک آدمی ایک شخص کی تصویر لیے بیٹھا ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں اس تصویر کو نہیں پوجتا، میں نے تو اس کو صرف یاددہانی کے طور پر رکھا ہوا ہے، پوجتا تو میں فلاں آدمی کو ہوں تو کیا اس کی تصویر پھاڑ دینے سے اس کا عاجز ہونا لازم آجائے گا؟ آپ کہیں کہ بھٹو کوئی چیز نہیں ہے دیکھو ہم نے اس کی تصویر پھاڑ دی تو تصویر پھاڑنے سے کیا بھٹو کا عجز معلوم ہوتا ہے؟ تو اگر شخصیت اور ہے اور یہ محض یاددہانی کے طور پر سامنے رکھی ہوئی چیزیں ہیں تو ان کی تصویر توڑنے سے ان کا عاجز ہونا کیسے لازم آگیا؟ تو معلوم ہوگیا کہ یہی جن کو توڑا جارہا ہے ان کی عقیدت انہی کے ساتھ ہے چاہے ان کی بنیاد کچھ ہو لیکن جہالت کے زور سے وہ شخصیات نظروں سے اوجھل ہوگئیں اور سارے کے سارے مرکز توجہ یہی بن گئے اس لیے ان کا توڑ دینا ان کے عاجز ہونے کی دلیل ہے، ان کا نہ بولنا ان کے عاجز ہونے کی دلیل ہے، ان کا اپنے آپ کو نہ بچا سکنا ان کے عاجز ہونے کی دلیل ہے، ”اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ“ یہ تو اتنے عاجز ہیں کہ اگر مکھی ان کے چڑھاوں سے کوئی چیز اٹھا کر لے جائے تو یہ اس سے چھڑا نہیں سکتے، ساری کی ساری صورت انہی پر صادق آتی ہے اس لیے قرآن کریم کی آیات جہاں آجائیں وہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ آپ ان کو انبیاء علیہم السلام پر فٹ کریں، اولیاء پہ فٹ کریں، ملائکہ پہ فٹ کریں، بے جان معبود ان کے تھے، اور بعض آیات ایسی ہیں جو صراحۃً ان پر ہی صادق آتی ہیں اسی سے تعلق ہے ان آیات کا جو میں آپ کی خدمت میں عرض کررہا ہوں۔

اب دیکھئے! آگے جو الفاظ آئیں گے ان الفاظ کے اندر یہ بات ہے کہ یہ مخلوق ہیں، خالق نہیں ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ کرتے ہیں کہ یہ کسی کو بنا نہیں سکتے خود بنائے ہوئے ہیں یہ بات کہ خالق صرف اللہ ہے اور باقی سب مخلوق ہے یہ بات انبیاء علیہم السلام پر بھی صادق آتی ہے، اولیاء پر بھی صادق آتی ہے، ملائکہ پر بھی صادق آتی ہے۔

”وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا“ ان کے لیے کوئی مدد نہیں کرسکتے جس طرح ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہم اگر ان کو مدد کے لیے پکاریں تو یہ مدد کے لیے آتے ہیں، اللہ فرماتے ہیں یہ مدد نہیں کرسکتے، اور نہ وہ اپنی خود ہی مدد کرسکتے ہیں، ان کے اندر جان ہی نہیں، ان کے اندر طاقت ہی نہیں کہ اگر ان کو کوئی توڑنا چاہے تو اپنے آپ کو بچالیں۔

”وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ“ اگر تم انہیں بلاؤ کہ وہ تمہاری راہنمائی کریں تو تمہاری بات وہ مانتے نہیں کیونکہ معبود انسان کی زندگی کی ایک ضرورت ہے وہ صرف دل کا بہلاوا نہیں بلکہ زندگی کی ضرورت ہے

اور بڑی ضرورت یہ ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ ہماری راہنمائی کرے کہ ہم یہ کام کس طرح کریں تو یہ انسان کی ایک بڑی بنیادی ضرورت ہے، اگر تم انہیں ہدایت کی طرف بلاؤ کہ تم ہماری ہدایت کرو، ہماری راہنمائی کرو تو یہ تمہاری بات نہیں مان سکتے۔

یا تم انہیں خود بلاؤ کہ آؤ ہم تمہیں راستہ دکھاتے ہیں تم اس راستہ پر چلو تو یہ ساتھ چلنے کی طاقت نہیں رکھتے،
"سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ" برابر ہے کہ تم انہیں پکارو یا تم چپ رہو، دونوں صورتیں برابر ہیں نہ ان کو پکارنے کا پتہ اور نہ نا پکارنے کا پتہ۔

آگے یہ بات آگئی کہ جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو وہ تمہاری طرح بندے ہی ہیں انہیں پکارو چاہیے کہ یہ تمہاری بات کو مانیں اگر تم سچے ہو، پھر اللہ تعالیٰ ان کے عجز کو زیادہ نمایاں کرتا ہے کہ جن کو تم پکار رہے ہو کیا ان کے پاس ایسی ٹانگیں ہیں جن کے ساتھ یہ چلتے ہوں؟ کیا ان کے پاس ایسے ہاتھ ہیں جن کے ساتھ یہ پکڑتے ہوں؟ کیا ان کے لیے ایسی آنکھیں ہیں جن کے ذریعے سے دیکھتے ہوں؟ کیا ان کے لیے ایسے کان ہیں جن کے ذریعے سے سنتے ہوں؟ یہ سارا ان کے معبودوں پر تبصرہ چلا آ رہا ہے، تو یہ آیتیں زیادہ صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں ان پتھروں کے معبودوں پر اور بے جان چیزوں پر بمقابلہ اس کے کہ ان کو کسی دوسرے پر صادق کرنے کی کوشش کی جائے چاہے وہ بھی تھے ان کی تردید کے لیے دوسری آیات ہیں۔

اگر ہم اس سے فرشتے مراد لے لیں تو کیا ان پر یہ بات صادق آتی ہے کہ ان کے کان بھی نہیں ہیں، ان کی آنکھیں بھی نہیں ہیں، وہ چل پھر بھی نہیں سکتے، کسی کی بات سن بھی نہیں سکتے، اور اگر کسی نے زندہ پیر کو معبود بنا لیا تو پھر کیا زندہ پیر کے اوپر یہ آیتیں صادق آئیں گی کہ اس کے پاس تو ٹانگیں ہی نہیں ہیں جن کے ساتھ وہ چلے، وہ کہے گا ٹانگیں تو ہیں میں تو چلتا ہوں، ان کے پاس ہاتھ ہی نہیں ہیں جن کے ذریعے سے یہ پکڑیں، ان کے پاس آنکھیں ہی نہیں ہیں جن کے ساتھ یہ دیکھیں، ان کے پاس کان ہی نہیں ہیں جن کے ذریعے سے سنیں، ملائکہ کی تردید کے لیے اور آیات ہیں، انبیاء علیہم السلام کو اگر شریک کیا ہے تو ان کی تردید کے لیے اور آیات ہیں لیکن یہ آیات زیادہ صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں بے جان چیزوں پر لیکن چونکہ وہ ان کی شکلیں انسانوں جیسی بناتے تھے تو یہ کہا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اگر تم یہ کہو کہ یہ انسان ہیں تو پھر بھی تم جیسے ہی ہیں جیسے تم اللہ کے پیدا کیے ہوئے ویسے یہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے اس سے بڑھ کر اور حقیقت تو کوئی نہیں ہے۔

اور آگے اس سے بھی زیادہ واضح بات آگئی کہ تو دیکھتا ہے کہ یہ تیری طرف جھانک رہے ہیں تو کیا یہ بات ملائکہ پر صادق آتی ہے؟ تو دیکھتا ہے کہ وہ تیری طرف جھانک رہے ہیں حالانکہ انہیں نظر کچھ نہیں آتا، یہ بات کس پر صادق آتی ہے؟ یہ جو پتھر کا بت تراش کے اتنی بڑی بڑی آنکھیں بنا کے رکھا ہوا ہے آنکھیں اس کی کھلی ہوئی ہیں تو ہم کہیں گے کیوں اس کو پوج رہے ہو نہ اس کی ایسی آنکھیں جن کے ذریعہ سے یہ دیکھے، نہ اس کے ایسے کان جن کے ساتھ یہ سنے، نہ اس کی ایسی ٹانگیں جن کے ساتھ یہ چلے، نہ اس کے ایسے ہاتھ جن کے ساتھ یہ پکڑے، تم دیکھ رہے ہو کہ تمہاری طرف یہ جھانک رہے ہیں حالانکہ نظر انہیں کچھ نہیں آتا، اب اگر خواہ مخواہ ان آیات کو ہم فرشتوں پر لگائیں یا دوسروں پر لگائیں تو اشکالات پیش آئیں گے کہ اگر کسی نے زندہ شخص کو معبود بنالیا تو اس پر یہ بات کیسے صادق آتی ہے، کسی نے فرشتوں کو معبود بنالیا تو کیا فرشتوں کی آنکھیں نہیں ہیں، کیا فرشتوں کے کان نہیں ہیں، کیا فرشتے کسی کو دیکھ نہیں سکتے، خواہ مخواہ کے اشکالات پیدا ہوتے ہیں، پھر اس کو سمجھانے کے بہت پیچ وتاب کھانے پڑیں گے کہ ایک اسباب کے مطابق ہوتا ہے اور ایک اسباب کے خلاف ہوتا ہے، ایک مافوق الاسباب ہوتا ہے، مافوق الاسباب کوئی نہیں سن سکتا، مافوق الاسباب کوئی نہیں دیکھ سکتا تو خواہ مخواہ بات میں پیچیدگی آجاتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو اگر شریک ٹھہرایا گیا تو وہ بھی غلط، اس کی تردید کے لیے بھی قرآن کریم میں آیات ہیں، فرشتوں کو بنایا گیا، جنات کو بنایا گیا سب کو بنایا گیا اور سارے کے سارے جتنے بھی مشرک ہیں چاہے وہ انبیاء علیہم السلام کو شریک بناتے ہوں، چاہے اولیاء کو شریک بناتے ہوں، چاہے جنات کو شریک بناتے ہوں، کسی کو بناتے ہوں وہ سب مشرک ہیں لیکن ان کی تردید کے لیے قرآن کریم میں مختلف جگہ پر مختلف آیات ہیں اور یہ مشرکین مکہ زیادہ تر تصویروں میں ہی الجھے ہوئے تھے، بنیاد ان کی چاہے اس سے اٹھائی گئی ہو کہ یہ مختلف شخصیات کی تصویریں ہیں لیکن بعد میں جہالت نے جو زور مارا تو ان کے سامنے صرف وہ تصویریں اور بت ہی رہ گئے اور شخصیات نظروں سے اوجھل ہوگئیں اس لیے ایسی آیات جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بت شکنی کرنا اور ان کو توڑ کے اس سے استدلال کرنا، اور یہ کہنا کہ تم بولتے کیوں نہیں ہو اب یہ تردید تو کرنی ہے آپ نے ایک آدمی کی جس کو لوگوں نے بنالیا کہ یہی سب کچھ ہے اور آپ اس کی تصویر پہ جوتے مار مار کے کہیں کہ تو بولتا کیوں نہیں تیرے سامنے یہ چیز رکھی ہوئی ہے تو اس کو کھاتا کیوں نہیں تو کیا یہ عقلمندی ہے؟ اس تصویر کو آپ بااختیار سمجھیں گے تو یہ بات صادق آتی ہے اور اگر اس تصویر کو بااختیار سمجھتے ہی نہیں پھر اس کو کہنا کہ تو کھاتا کیوں نہیں، تو بولتا کیوں نہیں معلوم ہوتا ہے کہ تو تو کچھ نہیں یہ بات عقل کے مطابق نہیں ہے تو انبیاء علیہم السلام جو کہ "اعقل الناس" ہوتے ہیں وہ اس قسم کی بے معنی گفتگو نہیں کرتے۔

جب وہ ان بتوں کو سب کچھ سمجھے ہوئے تھے جس طرح اسرئیلیوں نے بچھڑے کو خدا بنایا تو بچھڑے کو ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ذبح کر کے اس کا عجز ظاہر کیا اور قرآن کریم نے یہی کہا کہ دیکھتے نہیں کہ نہ وہ ان سے کوئی بات کرتا ہے اور نہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے، اور نہ ان کو کوئی ہدایت کرتا ہے اس عجل کو انہوں نے الٰہ کیسے بنالیا، تو اس قسم کے حالات ان چیزوں پر صادق آتے ہیں جن کی آنکھیں لوگوں نے بنائی ہیں لیکن بینائی نہیں ہے، ٹانگیں بنائی ہیں لیکن چلنے کی طاقت نہیں ہے، ہاتھ بنائے ہیں لیکن پکڑنے کی طاقت نہیں ہے، تم انہیں پکارتے رہو لیکن وہ تمہاری بات کو سنتے نہیں، تم چیخو، چلاؤ جو کچھ کرو وہ نہیں سنتے، ان میں سننے کی طاقت ہی نہیں ہے، تو اس قسم کی عاجز مخلوق کو تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو یہ کہاں کی عقل مندی ہے؟ تو اگلے الفاظ میں ان کے شرکاء پر تبصرہ ہے کہ یہ عاجز ہیں اور یہ شریک ٹھہرائے جانے کے قابل نہیں، جن کو انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شریک ٹھہرایا یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿١٩٩﴾ وَ اِمَّا

درگزر کرنے کو اختیار کیجئے اور حکم دیجئے بھلائی کا اور جاہلوں سے اعراض کیجئے ﴿١٩٩﴾ اگر

يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ

شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آجائے تو اللہ کی پناہ میں آجایئے بے شک وہ سننے والا

عَلِيْمٌ ﴿٢٠٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ

جاننے والا ہے ﴿٢٠٠﴾ بے شک وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں جس وقت شیطان کی طرف سے ان کو کوئی خیال چھوتا ہے

تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿٢٠١﴾ ۚ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي

تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں پس اچانک وہ مبصر ہوتے ہیں ﴿٢٠١﴾ اور شیاطین کے بھائی شیاطین ان کو کھینچے ہیں

الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿٢٠٢﴾ وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْ

گمراہی میں پھر وہ کوتاہی نہیں کرتے ﴿٢٠٢﴾ اور جب تو نہ لائے ان کے پاس کوئی نشانی تو کہتے ہیں کیوں

لَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ

نہیں چن لایا تو اس نشانی کو آپ کہہ دیجئے کہ میں پیروی کرتا ہوں اس چیز کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے میرے رب کی جانب سے، یہ (قرآن)

مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٢٠٣﴾ وَ اِذَا

تمہارے رب کی طرف سے روشنی کے دلائل ہیں اور راہنمائی اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ﴿٢٠٣﴾ اور جب

قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٢٠٤﴾

قرآن پڑھا جائے تو اس کو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿٢٠٤﴾

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ

یاد کر تو اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی کرتا ہوا، ڈرتا ہوا اور بلند آواز سے کم آواز کے ساتھ

الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿٢٠٥﴾ اِنَّ

صبح اور شام اور غافلوں میں سے نہ ہو ﴿٢٠٥﴾ بے شک

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یُسَبِّحُوْنَهٗ

وہ لوگ جو تیرے رب کے پاس ہیں نہیں تکبر کرتے اس کی عبادت سے اور اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں

وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾

اور اسی کے لیے سجدہ کرتے ہیں ﴿۲۰۶﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

سورۃ الاعراف کی یہ آخری آیات ہیں جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرور کائنات ﷺ اور آپ کی وساطت سے آپ کے ماننے والوں کو کچھ نصیحتیں فرمائی ہیں، کچھ احکام دیے ہیں، ساری سورۃ کے مضامین آپ کے سامنے بالتفصیل گذر گئے آپ نے دیکھا کہ اس میں زیادہ تر مشرکین کی تردید کی گئی ہے اور خاص طور پر ان آخری رکوعوں میں اور پھر اسی رکوع میں جو آپ کے سامنے گذر رہا ہے ان کے معبودوں کے اوپر تبصرہ کیا گیا ہے اور جب اس قسم کے حالات ہوں تو جس وقت جاہل آدمی کے خیالات کی تردید کی جائے اور اس کے مسلک کا حماقت ہونا ظاہر کیا جائے تو جب دلیل کا جواب دلیل سے نہ آئے تو بسا اوقات جاہل آدمی گالی گلوچ پر اتر آتا ہے تو ایسے وقت میں اہل حق کو بھی غصہ آ سکتا ہے اور غصہ آنے کے ساتھ پھر دنگا فساد شروع ہو جائے گا اور یہ دنگا فساد ایسی چیز ہے کہ جب بھی ایک دفعہ شروع ہو جائے تو جانبین میں ضد آ جاتی ہے اور پھر کوئی بھی کسی کے سمجھانے سے سمجھتا نہیں ہے اور یہ روزمرہ کے واقعات ہیں کہ جہاں کسی بات میں اختلاف ہوا اور اس اختلاف کو لڑائی جھگڑے کا ذریعہ بنا لیا گیا تو اس کے بعد پھر ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، پھر ہزار کوشش کرو دلیل کا جواب کسی کے پاس ہو یا نہ ہو لیکن آپ کی بات کوئی مانے گا نہیں اس لڑائی جھگڑے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اس لیے اگلی آیات میں انہی چیزوں کے متعلق ہدایات دی گئیں ہیں۔

درگزر، نیکی کی تلقین اور جاہلوں سے اعراض کا حکم:

اللہ تبارک وتعالیٰ سرور کائنات ﷺ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں اور آپ کی وساطت سے آپ کے متبعین

کے لیے بھی یہی نصیحت ہے "خُذِ الْعَفْوَ" کہ درگزر کرنے کی عادت ڈالیے، اس لیے ان باتوں کو سن کے اگر کوئی شخص اشتعال میں آجائے اور آپ کے سامنے کوئی کسی قسم کی اشتعال انگیزی کرے، بدتمیزی کرے تو آپ اس سے انتقام لینے کی کوشش نہ کریں بلکہ درگزر کر جائیں اور نیکی کی تلقین کرتے رہیں، اچھی باتیں انہیں سکھاتے رہیں باقی جاہلوں سے منہ موڑ لو، جاہل اگر کسی قسم کی جہالت کرتا ہے تو اس کے ساتھ الجھو نہیں جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی اچھے لوگوں کی یہی علامت ذکر کی گئی "اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا" کہ جب جاہل لوگ ان سے کسی قسم کا خطاب کرتے ہیں تو یہ لوگ سلامتی کی بات کہہ کے آگے چلتے بنتے ہیں، ان کے ساتھ الجھاؤ پیدا نہیں کرتے، ایک جگہ یہ لفظ بھی ہے "لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ" کہ وہ یوں کہہ دیتے ہیں کہ ہم جاہلوں سے الجھنا نہیں چاہتے، جاہلوں سے الجھنا ہمارا کام نہیں ہے تو اس لیے اگر کوئی شخص جہالت کی بات کرتا ہے، اشتعال انگیزی کی بات کرتا ہے تو اس سے الجھو نہیں بلکہ اس سے منہ پھیر لو، اس سے اعراض کر جاؤ۔

شیطان کے وسوسہ سے بچنے کا طریقہ:

"وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ" اور ایسے موقع پر شیطان اگر کوئی وسوسہ ڈالے اور تمہیں بھی اشتعال دلائے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو جس طرح عام طور پر آپ لوگوں نے سبق پڑھ رکھا ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو تو تب حالات ٹھیک ہوتے ہیں، ایسی بات نہیں ہے، جہالتوں کو برداشت کرنا اور ان کے ساتھ مقابلے میں خاموشی اختیار کرنا، درگزر سے کام لینا، نیکی کی تلقین کرتے رہنا، اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنا، بسا اوقات اس کے ساتھ حالات جلدی سنبھلتے ہیں بمقابلہ اس کے کہ اینٹ کے جواب میں پتھر اٹھا لیا جائے تو اگر شیطان اس قسم کا وسوسہ ڈالے اور تمہیں بہکائے، اکسائے "فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" تو فوراً اللہ کی پناہ میں آجایا کرو، اللہ سے پناہ طلب کیا کرو، جب اللہ سے پناہ طلب کرو گے تو شیطانی اثرات خود بخود ختم ہو جائیں گے، چنانچہ غصہ جس وقت آتا ہے تو لڑائی کے لیے شیطانی اثرات انسان کے اندر ابھرتے ہیں ایک روایت میں ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا دو شخص آپس میں لڑ رہے تھے ایک شخص کو بہت غصہ آیا ہوا تھا آپ نے فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص وہ کلمہ پڑھ لے تو اس کا غصہ جاتا رہے گا اور وہ کلمہ یہی فرمایا "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" تو غصہ کی حالت میں اگر یہ کلمہ پڑھا جائے تو غصہ ختم ہو جاتا ہے۔

جیسے ایک روایت میں یہ بھی ذکر فرمایا کہ غصہ شیطان کے اثر سے آتا ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اس کو پانی سے بجھایا کرو چنانچہ غصہ کی حالت میں ٹھنڈا پانی پینا مفید ہوتا ہے ان سے غصہ ہلکا ہو جاتا ہے، غصہ کی حالت میں پانی پیا جائے تو اس سے بھی غصہ کے حالات سرد ہو جاتے ہیں تو اللہ کی پناہ لو "انہ سمیع علیم" وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے، سب کے حالات سنتا ہے، سب کے حالات جانتا ہے وہ آپ کی حفاظت کرے گا۔

متقی لوگوں کی شان:

آگے ایک بات عام ضابطہ کے طور پر ذکر کر دی کہ متقی لوگوں کی یہ شان ہے کہ اگر کبھی ان کو شیطانی وسوسہ آ جاتا ہے، شیطان ان کے دل میں خیال توڑ التا ہے ان کو اگر کبھی شیطانی وسوسہ آ جاتا ہے تو وہ فوراً چونک جاتے ہیں ان کو اللہ یاد آ جاتا ہے، اللہ کی طرف سے شیطانی حرکات پر جو وعیدیں ہیں وہ یاد آ جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام یاد آ جاتے ہیں، "فَإِذَاهُمْ مُبْصِرُوْنَ" اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بس اللہ کی طرف دھیان گیا فوراً دل کے اندر ایک روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، سیدھی راہ ان کے سامنے واضح ہو جاتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ شیطان ہمیشہ غافل دل کے اندر وسوسہ ڈالتا ہے، شیطان انسان کے دل کے اوپر بیٹھا رہتا ہے اور اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کے اس کے دل کے اندر وسوسہ ڈالتا ہے اور جس وقت انسان اللہ کو یاد کرتا ہے تو پھر وہ پیچھے کو ہٹ جاتا ہے چنانچہ شیطان کے ناموں میں سے ایک نام خناس بھی ہے خناس کا معنی پیچھے کو ہٹنے والا، اللہ کا نام سن کے فوراً یہ پیچھے کو ہٹتا ہے تو جہاں غفلت آئے گی وہاں شیطان کا وسوسہ آئے گا اور جہاں اللہ یاد رہے، اللہ کی طرف دھیان رہے تو ایسی صورت میں انسان پھر شیطان کے حملہ سے محفوظ رہ جاتا ہے تو وہ لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں پس اچانک ان کو سمجھ آ جاتی ہے، ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں، ہدایت کی راہ ان کے سامنے واضح ہو جاتی ہے۔

اور جو اللہ کو یاد نہیں کرتے بلکہ شیطانوں کے بھائی بنے ہوئے ہیں اللہ سے غافل ہیں اور ان کی دوستی شیطانوں کے ساتھ ہی ہے تو شیاطین ان کو گمراہی میں کھینچتے ہیں، کھینچنے کا معنی کہ مزید ترقی دیتے رہتے ہیں "ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ" پھر وہ کوتاہی نہیں کرتے بلکہ پوری کوشش کے ساتھ ان کو گمراہ کرتے ہیں اور یہ گمراہی سے بچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اس طرح پھر شیاطین ان کو گمراہی کی انتہاء کی طرف لے جاتے ہیں اس لیے جاہلوں کی

اشتعال انگیزی پر اگر کوئی اس قسم کا دل کے اندر وسوسہ آتا ہے تو اس کا علاج اللہ کی یاد سے کیجئے اور استعاذہ کیجئے۔

منہ مانگا معجزہ نہ دینے کی وجہ اور اس کی حکمت:

اور ان جاہلانہ باتوں میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ ان کے سامنے ہزار دلیل پیش کرو، ہزار معجزات پیش کرو، لیکن ان کی پھر وہی بات کہ جیسا معجزہ ہم مانگتے ہیں تم ویسا کیوں نہیں لاتے اور یہ بہت دفعہ آپ کی خدمت میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ ہر انسان کے منہ کی مانگی ہوئی بات اس کے سامنے ظاہر نہیں کرتا اگر ایسا کرے تو پھر حجت ختم ہو جاتی ہے پھر تباہی آجاتی ہے، آپ کے سامنے واقعات میں یہ بات گذری ہے کہ جن قوموں نے انبیاء علیہم السلام سے کوئی خاص معجزہ مانگا اور نبیوں نے ظاہر کیا پھر وہ نہیں مانے تو ان کو برباد کر دیا گیا ورنہ نبوت کے لیے دلائل قائم ہونے چاہئیں جب وہ دلائل قائم ہو جائیں تو ہر شخص جو منہ سے کہے اس کی بات کا پورا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔

اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے تو پھر یہ بات کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتی ایک آدمی کہے گا یہ کر کے دکھاؤ، دوسرا کہے گا یہ کر کے دکھاؤ، تیسرا کہے گا یہ کر کے دکھاؤ تو یہ سارے کا سارا نظام عالم ہی درہم برہم ہو جائے گا، ایک دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دلیل چاہیئے اور ایک دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے گواہ چاہئیں، گواہوں پر آپ جرح کر سکتے ہیں کہ یہ گواہ صحیح نہیں، یہ سچا نہیں، یہ دلیل صحیح نہیں اس کا یہ مقدمہ غلط ہے یہ تو آپ جرح کر سکتے ہیں باقی آپ یہ کہیں کہ میں اس وقت تک نہیں مانوں گا جب تک فلاں آدمی شہادت نہ دے یہ دنیا کی عدالت کا اصول نہیں ہے، جو گواہ پیش کیے جا رہے ہیں ان پر جرح کرو کہ یہ صحیح ہیں یا غلط، جو دلیل دی جا رہی ہے اس کو توڑے کہ اس کا مقدمہ صحیح ہے یا غلط، باقی یہ کہنا کہ فلاں شخص اگر کہے گا تو میں مانوں گا، یہ کوئی اصول نہیں ہے۔

اسی طرح جو معجزات پیش کیے گئے ہیں وہی دلیل نبوت ہیں، ان پر تو آپ اعتراض کرو کہ ان میں یہ خامی ہے باقی یہ کہنا کہ اگر فلاں چیز دکھاؤ گے تب ہم مانیں گے یہ کوئی اصول نہیں ہے، جب آپ ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے یعنی ان کی مانگی ہوئی تو وہ کافر کہتے ہیں کیوں نہیں چھانٹ لاتے آپ ان نشانیوں کو یعنی وہ اس بات میں اشارہ کرتے تھے گویا کہ یہ قرآن کریم کی آیات اور یہ باتیں تو پچھلی تاریخوں سے چھانٹ چھانٹ کر تم ہمارے پاس لا رہے ہو یہ آپ کے بنائے ہوئے قصے کہانیاں ہیں جیسی نشانی ہم کہتے ہیں آپ ویسی نشانی کیوں نہیں لاتے

مقصد ان کا یہ تھا، آپ کہہ دیجئے کہ چھانٹ کے لانا تو میرے بس کی بات نہیں ہے، اللہ کی طرف سے مجھے جو وحی ملتی ہے میں تو اسی کی اتباع کرتا ہوں، یہ ہے آگے سے شریفانہ بات کہ ہم تو اللہ کے احکام کے پابند ہیں جو وحی آتی ہے وہی تمہیں سناتے ہیں۔

آدابِ تلاوت:

باقی یہ کتاب جو تمہارے سامنے پیش کی جارہی ہے یہ تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں، بصیرت کے دلائل ہیں، دل کی روشنی حاصل کرنے کے دلائل ہیں اس کی ایک ایک بات بصیرت کا باعث ہے، بصائر بصیرت کی جمع ہے یہ دل کی روشنی کو کہتے ہیں یعنی یہ کتاب بصائر ہے یعنی اس کی جتنی آیات ہیں وہ ساری کی ساری دل کی روشنی حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، ان میں غور کرو، یہ ہدایت ورحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین لاتے ہیں لیکن اس سے فائدہ کب اٹھا سکو گے جب اس میں تدبر کرو گے، تفکر کرو گے، غور وفکر کرو گے، سوچو گے، توجہ سے سنو گے، سمجھنے کی کوشش کرو گے۔

اور کافروں نے دوسرا طریقہ اپنا رکھا تھا "قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ" کافر ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ جب یہ قرآن پڑھا جائے تو سنا نہ کرو اور شور مچانا شروع کردیا کرو ہوسکتا ہے کہ اس طریقہ سے تم غالب آجاؤ اور ان کی آواز کو دبادو، وہ کہتے تھے کہ اس کو سنا ہی نہ کرو جب یہ پڑھنے لگیں تو شور مچانا شروع کردیا کرو اور جب تم شور مچانا شروع کرو گے تو تمہارے سامنے ایک آدمی کی آواز دب جائے گی جب تم یہ طریقہ اپناؤ گے کہ سننے کی تم کوشش نہیں کرتے، غور اس میں تم نہیں کرتے تو تمہیں ہدایت کیسے حاصل ہو، اس لیے طریقہ یہ ہے کہ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کو توجہ سے سنا کرو اور چپ ہوجایا کرو تا کہ تم پر رحم ہو پھر اللہ کی رحمت حاصل ہوگی۔

یہ آیت جیسا کہ روایات حدیث دلالت کرتی ہیں کہ خطبہ کے متعلق اتری یا نماز باجماعت کے متعلق اتری جس سے احناف استدلال کرتے ہیں کہ جب امام قرآن پڑھ رہا ہو تو اس وقت پچھلوں کے لیے پڑھنا جائز نہیں ہے اس آیت سے بھی استدلال کیا گیا ہے اور اسی طرح خطبہ میں بھی بات کرنا جائز نہیں ہے اور عام حالات میں جس طرح آپ بیٹھ کے تلاوت کیا کرتے ہیں وہاں بھی ادب یہی ہے کہ اگر کوئی پڑھ رہا ہو تو اس کو توجہ کے ساتھ سنا

کرو اور یہ ضروری نہیں ہے۔

مفسرین نے یہیں لکھا ہے کہ جہاں لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہوں، دوسرے کاموں میں لگے ہوئے ہوں وہاں بلند آواز میں قرأت نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ وہ اپنے کام کاج کی وجہ سے توجہ دے نہیں سکیں گے اور یہ بلند آواز سے پڑھنے والا خواہ مخواہ ان کو گناہ میں مبتلاء کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ خود گنا ہگار ہو جاتا ہے تو ایسی جگہ بلند آواز سے تلاوت نہیں کرنی چاہیئے جہاں لوگ متوجہ نہ ہوں، جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کے لیے کان لگایا کرو اور خاموش ہو جایا کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

آدابِ ذکر:

اور اپنے رب کو یاد کرتے رہا کرو یہی غفلت کو دور کرنے والی بات ہے، کثرت ذکر اللہ تمام کامیابیوں کے لیے ایک مفتاح ہے کہ جب اللہ کو کثرت کے ساتھ یاد کیا جائے تو شیطانی اثرات ختم ہوتے ہیں، غفلت دور ہوتی ہے ہر نیکی کا کام آسان ہو جاتا ہے، اور شیطانی اثرات سے بچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ذکر اللہ ہے، اپنے رب کو یاد کیجئے اپنے دل میں، دل میں یاد کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اللہ کی صفات میں غور و فکر کرو، اللہ کی وعیدوں اور بشارتوں کو دل میں سوچتے رہو یہ ذکر قلبی ہے اور ساتھ ساتھ زبان سے بھی کچھ پڑھتے رہو، یہ بھی ٹھیک ہے تو ذکر لسانی اور ذکر قلبی کو اگر جمع کر لیا جائے تو بالاتفاق یہ سب سے افضل ہے اور اگر کوئی شخص زبان سے نہ پڑھے صرف دل کے اندر یاد کرے تو یہ بھی ایک اچھا طریقہ ہے اور اگر دل غافل ہو اور صرف زبان سے ذکر کیا جائے تو اس میں خاص برکات نہیں ہیں اگر چہ نفع سے یہ بھی خالی نہیں ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ذکر کیا گیا ہے کہ تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر کے ساتھ تر و تازہ رہنی چاہیئے اور مشکوٰۃ میں روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اہل ذکر کی مجلسوں میں بیٹھو اور جب خلوت میں چلے جاؤ تو جہاں تک ہو سکے اپنی زبان کو اللہ کے ذکر کے ساتھ حرکت دیتے رہو تو زبان کو حرکت دیتے رہو یہ ذکر لسانی ہے لیکن دل اگر غافل ہو تو اتنے منافع حاصل نہیں ہوتے اگر چہ پھر بھی نفع سے خالی نہیں ہے۔

ذکر کے مختلف طریقے:

اللہ کو یاد ایسی صورت میں کرو کہ دل بھی متوجہ ہو اور زبان کے اوپر بھی اس کا نام ہو تسبیح ہو، تحمید ہو، تلاوت ہو، یہ سارے ذکر اللہ کے طریقے ہیں، یہ ذکر لسانی ہو گیا یہ تو ہے چپکے چپکے اور اگر بلند آواز کے ساتھ ہی کرنا ہو تو چیخو چلاؤ نہیں بلکہ "جهر من القول" سے کم آواز کے ساتھ یعنی تھوڑے سے جہر کے ساتھ بھی اللہ کا ذکر کر سکتے ہو، اور بسا اوقات جہر کے ساتھ ذکر مفید ہوتا ہے کہ اس کو دفع وساوس میں زیادہ دخل ہے، اپنی اپنی طبیعت اور اپنے اپنے

حالات کے مطابق اس کے اوپر عمل کیا جاتا ہے کہیں ذکر سری زیادہ نافع ہوتا ہے اور کہیں جہر مفید ہوتا ہے، قرآن کریم کی تلاوت میں بھی ایسے ہی ہے چپکے چپکے تلاوت کرو تو آپ کی مرضی اور اگر بلند آواز سے کرنا چاہتے ہو تو اتنی بلند آواز رکھو کہ جو اپنے کانوں کو سنے اور دوسرے لوگوں کو پریشان نہ کرے یہ بھی ایک اچھا طریقہ ہے، تہجد میں قرآن پڑھتے وقت بھی اسی طرح ہے کہ کبھی سراً پڑھو کبھی جہراً پڑھو، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت بھی ایسے ہی تھی۔

ذکر اللہ کے خاص اوقات:

اور صبح وشام اللہ کو یاد کرو، صبح وشام سے یا تو صبح وشام کے اوقات مراد ہیں کہ ان کی زیادہ اہمیت ہے چنانچہ اولیاء اللہ کے ہاں ہمیشہ صبح وشام ذکر کا زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے، سورج نکلنے سے پہلے اللہ کو یاد کرنے اور ذکر کرنے کی بہت فضیلت ہے اگر کوئی شخص فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سورج نکلنے تک ان لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں تو اس کی بہت فضیلت آئی ہے، اسی طرح شام کو مغرب تک ان دونوں اوقات کا زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے یا صبح وشام کا لفظ بول کے دوام مراد ہے جیسا کہ آگے فرمادیا "لَاتَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ" غافلوں میں سے نہ ہونا، صبح وشام اللہ کو یاد کرو یعنی ہر وقت اللہ کو یاد رکھو۔

ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہنے کا آسان طریقہ:

تو زبان پہ تسبیح وتحمید ہو یہ بھی ٹھیک ہے ورنہ اللہ کی یاد کا سب سے اعلیٰ معیار یہ ہے کہ جس وقت اللہ کی طرف سے جو حکم آجائے تو اس کی تعمیل کرتے چلے جاؤ کبھی بھی غافل نہ ہو کہ تمہیں اللہ کا حکم یاد نہ رہے۔

اور ایسے ہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مختلف اوقات میں جو دعائیں منقول ہیں ان دعاؤں کا پڑھتے رہنا یہ بھی دائماً اللہ کو یاد کرنے کا طریقہ ہے یعنی ایک شخص ہے جب وہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو گھر میں داخل ہونے کی دعا پڑھتا ہے، مجلس میں داخل ہوتا ہے تو مجلس میں داخل ہونے کی دعا پڑھتا ہے، مسجد میں جاتا ہے تو مسجد میں داخل ہونے کی دعا پڑھتا ہے، باہر آتا ہے تو نکلنے کی دعا پڑھتا ہے، بازار میں جاتا ہے تو بازار کی دعا پڑھتا ہے، یہ دعائیں اگر پڑھتا رہے تو یہ بھی ایک قسم کا دائماً اللہ کو یاد کرنے والا ہو گیا کہ گویا کہ یہ غافل نہیں ہے، "كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ" حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ کو یاد کرتے تھے تو ہر وقت اللہ کو یاد کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ کی طرف دھیان رہے اور جو وقتاً فوقتاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعائیں مختلف اوقات اور مختلف حالات میں آئی ہیں ان کو پڑھتے رہیں تو یہ بھی دائماً اللہ کو یاد کرنے کا ذریعہ ہے۔

عبادت کی ترغیب:

آگے ترغیب دینے کے لیے فرمادیا کہ جو تیرے رب کے پاس ہیں یعنی فرشتے وہ تو اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، وہ اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اسی کے لیے سجدہ کرتے ہیں، وہ مقرب ہیں، فرشتے ہیں، اعلیٰ معیار کے ہیں تو باوجود اس بات کے کہ اللہ کے مقرب ہیں پھر بھی اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، ہر وقت اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اس کے لیے سجدہ کرتے ہیں، ترغیب دینی مقصود ہے کہ تمہیں بھی ایسا بننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تکبر نہ کرو بلکہ تواضع اور انکساری اختیار کرتے ہوئے ہمیشہ اللہ کی عبادت کرتے رہو اور اس کی پاکی بیان کرو اور سجدہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھو کیونکہ نماز کے ارکان میں سے سجدہ ایک رکن ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب انسان کو سب سے زیادہ سجدہ کی حالت میں حاصل ہوتا ہے جس کی بناء پر یہاں سجدہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، کثرتِ سجود یہ بہت بڑی فضیلت کی بات ہے لیکن کثرت سجود کا مطلب ہے کثرتِ صلوٰۃ، اور اگر بغیر نماز کے ویسے ہی سجدہ میں پڑ کے دعا کرنا چاہیں تو وہ بھی جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے زیادہ سجدے کرنے کا مطلب احادیث سے سمجھ یہی آتا ہے کہ نوافل کثرت سے پڑھے جائیں تو فرضوں کے علاوہ اور نمازیں پڑھو جن میں اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ، عام حالات میں اللہ کے سامنے سجدہ میں پڑ کے دعا کرو تو یہ بھی اللہ کو یاد کرنے کا طریقہ ہے اور فرشتے اسی طریقہ سے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔

تو آخری آیت کے اندر یہ ترغیب دے دی گئی کہ اللہ کے مقرب فرشتے جیسے اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، ہر وقت تسبیح وتحمید میں رہتے ہیں اور اللہ کو سجدے کرتے ہیں تو کامل انسانوں کو چاہیے کہ وہ بھی ایسے ہی کریں اگر وہ ایسا کریں گے تو یوں سمجھو کہ وہ فرشتوں کی صف میں شامل ہو گئے، حدیث شریف میں آتا ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے "اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ" جو مجھے یاد کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوں، تو خود یاد کرنے سے اللہ کی معیت ملتی ہے اور اللہ والوں کے ساتھ بیٹھنے سے بھی اللہ کی معیت ملتی ہے جس طرح مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

ہر کہ خواہد ہم نشینی باخدا
گو نشیند در حضور اولیاء

جو شخص اللہ کے ساتھ ہم نشینی چاہتا ہے اسے یہ کہہ دو کہ اولیاء اللہ کی صحبت میں بیٹھا کرے، اگر وہ اولیاء اللہ کی صحبت میں بیٹھے گا تو اولیاء چونکہ ہر وقت اللہ کو یاد کرنے والے ہوتے ہیں اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ" جو مجھے یاد کرے میں اس کے ساتھ ہوں تو اولیاء اللہ کو ہر وقت اللہ کی معیت حاصل ہے عام انسانوں سے زائد تو جس وقت آپ ان کی مجلس کے اندر بیٹھیں گے تو آپ کو بھی معیت حاصل ہو جائے گی، فرشتوں والی خصلتیں آپ کے اندر بھی آجائیں گی، تو "عَلَیْكَ بِمَجَالِسِ اَهْلِ الذِّکْرِ" کے اندر بھی اسی لیے ترغیب دی گئی ہے کہ شیطانی حملوں سے بچنے کے لیے خود ذاکر ہونا، ذاکروں کے پاس بیٹھنا، اہل اللہ کی مجلس کو اختیار کرنا یہ گویا کہ فرشتوں والی خصلت کو اپنانے کا ایک ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت اور معیت حاصل کرنے کے لیے بہت آسان چیز ہے۔

سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا اله الا انت استغفرك واتوب اليك

سورۃ انفال مدینہ میں نازل ہوئی اس میں پچھتر آیات اور دس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا

یہ لوگ آپ سے انفال کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ انفال اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے پس تم ڈرو

اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ

اللہ سے اور آپس میں تعلقات کو درست کرو اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی اگر تم

مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ

ایمان والے ہو (۱) سوائے اس کے نہیں کہ ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ڈر جاتے ہیں

قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ

ان کے دل اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ ان کے ایمان کو زیادہ کردیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر ہی

يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳

بھروسہ کرتے ہیں (۲) جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (۳)

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ

یہ وہ لوگ ہیں جو سچے ایمان والے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس درجات ہیں

وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴

اور مغفرت ہے اور رزق کریم ہے (۴)

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

اس سورۃ کا نام سورۃ الانفال ہے اور یہ سورۃ مدنی ہے اس سے پہلی سورۃ میں مشرکین اور اہل کتاب کے ضد، عناد اور کفر وفساد کا تذکرہ خوب وضاحت کے ساتھ کیا گیا تھا، اور اس سورۃ میں زیادہ تر ذکر غزوہ بدر کا ہے اور غزوہ بدر کے تذکرے کے ضمن میں انہی مشرکین وکفار کے برے انجام کو بیان کیا گیا ہے اور ان کی ناکامی ونامرادی کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف مقابلہ میں مسلمانوں کی کامیابی اور فتوحات کو ذکر کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے لیے احسان وانعام کا باعث ہے اور کافروں کے لیے عذاب وانتقام کا باعث ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کا نام "الانفال" اس سورۃ کی پہلی آیت "يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ" سے ہی ماخوذ ہے "تَسْمِيَةُ الْكُلِّ بِاِسْمِ الْجُزْءِ" کے تحت پوری سورۃ کا نام ہی سورۃ الانفال رکھ دیا گیا۔

شان نزول:

یہ آیات غزوۂ بدر میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے متعلق ہیں آیات کی مفصل تفسیر سے پہلے وہ واقعہ سامنے رکھا جائے تو تفسیر سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر جو کفر واسلام کا سب سے پہلا معرکہ تھا اس میں جب مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کچھ مال غنیمت ہاتھ آیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اس کی تقسیم کے متعلق ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جو اخلاص واتفاق کے اس مقام کے شایان شان نہ تھا جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری زندگی ڈھلی ہوئی تھی اس لیے سب سے پہلی ہی آیت میں اس کا فیصلہ فرما دیا گیا تا کہ اس مقدس گروہ کے قلوب میں صدق واخلاص اور اتفاق وایثار کے سوا کچھ نہ رہے۔

اس واقعہ کی تفصیل غزوۂ بدر کے شریک حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی زبانی مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک، حاکم وغیرہ میں اس طرح منقول ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے کسی نے آیتِ مذکورہ میں لفظ "انفال" کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت تو ہمارے یعنی اصحابِ بدر ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کا

واقعہ یہ تھا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ہمارے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہوگیا تھا جس نے ہمارے اخلاق پر بُرا اثر ڈالا، اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ اموالِ غنیمت کو ہمارے ہاتھوں سے لے کر رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دیا اور رسول اللہ ﷺ نے سب حاضرین بدر میں اُس کو مساوی طور پر تقسیم فرمادیا۔

صورت یہ پیش آئی تھی کہ ہم سب غزوہ بدر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے اور دونوں فریق میں گھمسان کی جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی تو اب ہمارے لشکر کے تین حصے ہوگئے، کچھ لوگوں نے دشمن کا تعاقب کیا تاکہ وہ پھر واپس نہ آسکے، کچھ لوگ کفار کے چھوڑے ہوئے اموالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے اور کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کے گرد اس لیے جمع رہے کہ کسی طرف سے چھپا ہوا دشمن آنحضرت ﷺ پر حملہ نہ کردے، جب جنگ ختم ہوگئی اور رات کو ہر شخص اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو جن لوگوں نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا وہ کہنے لگے کہ یہ مال تو ہم نے جمع کیا ہے اس لیے اس میں ہمارے سوا کسی کا حصہ نہیں، اور جو لوگ دشمن کے تعاقب میں گئے تھے اُنھوں نے کہا کہ تم لوگ ہم سے زیادہ اس کے حقدار نہیں ہو کیونکہ ہم نے ہی دشمن کو پسپا کیا اور تمہارے لیے یہ موقع فراہم کیا کہ تم بے فکر ہو کر مالِ غنیمت جمع کرلو اور جو لوگ آنحضرت ﷺ کی حفاظت کے لیے آپ کے گرد جمع رہے انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے تو ہم بھی مالِ غنیمت جمع کرنے میں تمہارے ساتھ شریک ہوجاتے لیکن آنحضرت ﷺ کی حفاظت جو جہاد کا سب سے اہم کام تھا ہم اس میں مشغول رہے اس لیے ہم بھی اس کے مستحق ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ گفتگو رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو اس پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی جس نے واضح کر دیا کہ یہ مال اللہ کا ہے اس کا کوئی مالک وحقدار نہیں، سوائے اُس کے جس کو رسول اللہ ﷺ عطا فرمائیں، آنحضرت ﷺ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہدایت واحکامات کے تحت اس مال کو سب شرکاءِ جہاد میں مساوی طور پر تقسیم فرمادیا اور سب کے سب اللہ و رسول کے اس فیصلہ پر راضی ہوگئے، اور ان سے جو ان کی شان کے خلاف صورت حال پیش آگئی کہ آپس میں مال کے بارے میں جھگڑا شروع ہوگیا، یہ ان کی شان کے خلاف تھا کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا میدان جنگ میں آنا مال و دولت کو حاصل کرنے کے لیے نہیں تھا بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت اور اس کی سربلندی کے لیے نکلے تھے تو جو ظاہراً توجہ مال کی طرف ہوگئی تھی یہ ان کی شان کے خلاف تھا تو تنبیہ ہوجانے کے بعد سب اس پر نادم ہوئے۔

شانِ نزول کا دوسرا واقعہ:

اور ایک روایت میں اس آیت کے شانِ نزول کا ایک دوسرا واقعہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بھی منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں میرے بھائی عُمیر شہید ہوگئے، میں نے اُن کے بالمقابل مشرکین میں سے سعید بن العاص کو قتل کردیا اور اُس کی تلوار لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، میں چاہتا تھا کہ یہ تلوار مجھے مل جائے کیونکہ اس کو میں نے ہی قتل کیا تھا اور اس کا سامان بھی میں نے ہی لوٹا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو مالِ غنیمت میں جمع کرادو، میں حکم ماننے پر مجبور تھا مگر میرا دل اس کا سخت صدمہ محسوس کررہا تھا کہ میرا بھائی شہید ہوا اور میں نے اُس کے بالمقابل ایک دشمن کو مار کر اُس کی تلوار حاصل کی وہ بھی مجھ سے لے لی گئی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی تعمیل کے لیے مالِ غنیمت میں جمع کرانے کے لیے آگے بڑھا تو ابھی دور نہیں گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۃ انفال کی یہ آیت نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلوا کر یہ تلوار مجھے عنایت فرمادی، بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض بھی کیا تھا کہ یہ تلوار مجھے دے دی جائے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ یہ میری چیز ہے جو کسی کو دے دوں اور نہ آپ کی ملک ہے اس کو پورے مالِ غنیمت میں جمع کرادو اس کا فیصلہ جو کچھ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اُس کے مطابق ہوگا۔

تطبیق:

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں واقعات ہی پیش آئے ہوں اور ان دونوں ہی کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ہو۔

انفال، غنیمت اور فیئی کا معنی ومفہوم:

"یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ" اس آیت میں لفظ "انفال" جو آیا ہے یہ نَفل کی جمع ہے جس کے معنی ہیں فضل وانعام، نفلی نماز، روزہ، صدقہ کو بھی نفل اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کسی کے ذمہ لازم وواجب نہیں ہوتے، کرنے والے اپنی خوشی سے کرتے ہیں، اصطلاحِ قرآن وسنت میں لفظ نفل اور "انفال" مالِ غنیمت کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو کفار سے بوقت جہاد حاصل ہوتا ہے مگر قرآن کریم میں اس معنی کے لیے تین لفظ استعمال ہوئے "انفال" غنیمت، فیئی، لفظ "انفال" تو اسی آیت میں مذکور ہے اور لفظ غنیمت اور اُس کی تفصیل اسی سورۃ کی اکتالیسویں آیت

میں آنے والی ہے جہاں آتا ہے "وَاعْلَمُوْا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ" تو اس آیت میں جو "غَنِمْتُمْ" ہے لفظ غنیمت اسی "غَنِمْتُمْ" سے لیا گیا ہے، اور لفظ فیئی اور اُس کے متعلق تفصیل سورۃ الحشر میں بیان ہوئی ہے "وَمَا أَفَاءَ اللّٰهُ الآية" اور ان تینوں کے معانی تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف ہیں، فرق معمولی اور قلیل ہونے کی وجہ سے بعض اوقات ایک لفظ دوسرے کی جگہ مطلقاً مالِ غنیمت کے لیے بھی استعمال کرلیا جاتا ہے، غنیمت عموماً اُس مال کو کہتے ہیں جو جنگ وجہاد کے ذریعہ مخالف فریق سے حاصل ہو، اور فیئی اُس مال کو کہتے ہیں جو بغیر جنگ وقتال کے کفار سے ملے کفار ویسے ہی چھوڑ کر بھاگ جائیں یا رضامندی سے دے دینا قبول کریں، اور نفل اور انفال کا لفظ اکثر اُس انعام کے لیے بولا جاتا ہے جو امیر جہاد کسی خاص مجاہد کو اُس کی کارگزاری کے صلہ میں غنیمت کے حصہ کے علاوہ بطور انعام عطا کرے، اور کبھی مطلقاً مالِ غنیمت کو بھی نفل اور انفال کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اس آیت میں اکثر مفسرین نے یہی عام معنی لیے ہیں صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی عام معنی نقل کیے گئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ عام اور خاص دونوں معنی کے لیے بولا جاتا ہے اس لیے کوئی اختلاف نہیں۔

گذشتہ امتوں میں مالِ غنیمت کا حکم:

پچھلی امتوں میں مالِ غنیمت کے لیے قانون یہ تھا کہ وہ کسی کے لیے حلال نہیں تھے تمام اموالِ غنیمت کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا تھا، اور آسمان سے قدرتی طور پر ایک آگ (بجلی) آتی تھی اور اس کو جلا کر راکھ کر دیتی تھی اور یہی اس جہاد کے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہونے کی علامت ہوتی تھی، اور اگر کوئی مالِ غنیمت جمع کیا گیا اور آسمانی بجلی نے آکر اس کو نہ جلایا تو یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ یہ جہاد اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں ہے اس لیے اس مالِ غنیمت کو بھی مردود اور منحوس سمجھا جاتا تھا اور اسے کوئی استعمال نہ کرتا تھا۔

مالِ غنیمت کا حلال ہونا امت محمدیہ کی خصوصیت ہے:

امت محمدیہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو خصوصی فضل فرمائے ہیں اور امت محمدیہ کو جو خصوصیات عطا فرمائی ہیں ان میں سے اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی انعام اور فضل یہ بھی ہے کہ جہاد وقتال کے ذریعے کافروں سے جو مال حاصل ہوتے ہیں ان کو مسلمانوں کے لیے حلال کر دیا گیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ

بخاری ومسلم میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا ہوئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر اور ان کی امت کو نہیں ملیں، انہیں پانچ میں سے ایک یہ ہے کہ "اُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تُحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِیْ" یعنی میرے لیے اموالِ غنیمت حلال کر دیے گئے حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہ تھے۔

تطبیق بین الآیات:

آیتِ مذکورہ میں انفال کا حکم یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ اللہ کے ہیں اور رسول کے ہیں، معنی اس کے یہ ہیں کہ اصل ملکیت تو اللہ تعالیٰ کی ہے اور متصرف ان میں اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جو حکمِ خداوندی کے مطابق اپنی صوابدید پر ان کو تقسیم کرتے ہیں یہ آیت جو آپ کے سامنے پڑھی گئی اس میں اور اس سورۃ کی اکتالیسویں آیت جو آگے آرہی ہے ان میں بظاہر تھوڑا سے تعارض معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں تو یہ ہے کہ وہ مال اللہ اور اس کے رسول کا ہے، اللہ کا رسول جہاں چاہے اس کو خرچ کرے، اس میں کسی دوسرے کی کوئی ملکیت نہیں ہے اور جبکہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کی تقسیم کا اصول بیان کرتے ہوئے اس کے پانچویں حصہ میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو بھی ساتھ شامل کیا ہے تو ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے اور یہ آیات ایک دوسرے کے خلاف معلوم ہوتی ہیں۔

اسی لیے ائمہ تفسیر کی ایک جماعت نے جن میں حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد، عکرمہ رضی اللہ عنہم وغیرہ داخل ہیں وہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا جب تک تقسیم غنائم کا وہ قانون نازل نہ ہوا تھا جو اسی سورۃ کے پانچویں رکوع میں آرہا ہے کیونکہ اس میں پورے مالِ غنیمت کو رسول اللہ ﷺ کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں اور آگے جو تفصیلی احکام آئے ہیں ان میں یہ ہے کہ کل مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں عام مسلمانوں کی ضروریات کے لیے محفوظ کر دیا جائے اور چار حصے شرکاء جہاد میں ایک خاص قانون کے تحت تقسیم کر دیئے جائیں جن کی تفصیل احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے اس تفصیلی بیان نے سورۃ انفال کی پہلی آیت کو منسوخ کر دیا۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں کوئی ناسخ منسوخ نہیں بلکہ اجمال وتفصیل کا فرق ہے سورۃ انفال کی پہلی آیت میں اجمال ہے اور اکتالیسویں آیت میں اسی کی تفصیل ہے البتہ مال "فیئی" جس کے احکام سورۃ الحشر میں بیان ہوئے ہیں وہ پورے کا پورا رسول کریم ﷺ کے زیر تصرف ہے آپ اپنی صواب دید سے جس طرح چاہیں

عمل فرمائیں اس لیے اس جگہ احکام بیان فرمانے کے بعد یہ ارشاد فرمایا ہے "وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا" یعنی جو کچھ تم کو ہمارا رسول دے دے اس کو لے لو اور جس کو روک دے اس سے باز رہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مالِ غنیمت وہ ہے جو جنگ و جہاد کے ذریعہ ہاتھ آئے اور مالِ فیئ وہ ہے جو بغیر قتال و جہاد کے ہاتھ آجائے، اور لفظ انفال دونوں کے لیے عام بھی بولا جاتا ہے اور خاص اس انعام کو بھی کہتے ہیں جو کسی غازی کو امیرِ جہاد عطا کرے۔

غازیوں کو انعام دینے کی مختلف صورتیں:

اس سلسلہ میں غازیوں کو انعام دینے کی چار صورتیں آنحضرت ﷺ کے عہد سے رائج ہیں، ایک یہ ہے کہ امیر جہاد یہ اعلان فرمادیں کہ جو شخص کسی مخالف کو قتل کرے تو جو سامان مقتول سپاہی سے حاصل ہو وہ اسی کا ہے جس نے قتل کیا، یہ سامان مالِ غنیمت میں جمع ہی نہ کیا جائے گا، دوسرے یہ کہ بڑے لشکر میں سے کوئی جماعت الگ کر کے کسی خاص جانب جہاد کے لیے بھیجی جائے اور یہ حکم دے دیا جائے کہ اس جانب سے جو مالِ غنیمت حاصل ہو وہ اسی خاص جماعت کا ہوگا جو وہاں گئی ہے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ اس مال میں سے پانچواں حصہ عام مسلمانوں کی ضروریات کے لیے بیت المال میں جمع کیا جائے گا، تیسرے یہ کہ پانچواں حصہ جو بیت المال میں جمع کیا جاتا ہے اس میں سے کسی خاص غازی کو اس کی ممتاز کارگزاری کے صلہ میں امیر کی صواب دید کے مطابق دیا جائے، چوتھے یہ کہ پورے مالِ غنیمت میں سے کچھ حصہ الگ کر کے خدمت پیشہ لوگوں کو بطور انعام دیا جائے جو مجاہدین کے گھوڑوں وغیرہ کی نگہداشت کرتے ہیں اور ان کے کاموں میں مدد کرتے ہیں۔

اللہ سے ڈرنے اور آپس کے تعلقات درست رکھنے کا حکم:

اس آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا "فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور آپس کے تعلقات کو درست رکھو اس میں اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جو غزوۂ بدر میں اموالِ غنیمت کی تقسیم کی بابت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان میں پیش آگیا تھا جس میں باہمی کشیدگی اور ناراضگی کا خطرہ تھا، اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کی تقسیم کا فیصلہ خود اس آیت کے ذریعہ فرمادیا، اب ان کے دلوں کی اصلاح اور باہمی تعلقات کی خوشگواری کی تدبیر بتلائی گئی ہے جس کا مرکزی نقطہ تقویٰ اور خوفِ خدا ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ جب تقویٰ اور خوف خدا غالب ہوتا ہے تو بڑے بڑے جھگڑے منٹوں میں ختم ہو جاتے ہیں، باہمی منافرت کے پہاڑ گرد بن کر اڑ جاتے ہیں، اہل تقویٰ کا حال بقول مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ یہ ہوتا ہے ۔

خود چہ جائے جنگ وجدل نیک وبد   کیں الم از صلحہا ہم میرمد

یعنی ان لوگوں کو کسی جنگ وجدل اور جھگڑے سے تو کیا دلچسپی ہوتی، ان کو تو خلائق کی صلح اور درستی کے لیے بھی فرصت نہیں ملتی کیونکہ جس کا قلب اللہ تعالیٰ کی محبت وخوف اور یاد میں مشغول ہو اس کو دوسروں سے تعلقات بڑھانے کی کہاں فرصت ۔

بسودای جاناں زجاں مشتغل   بذکر حبیب از جہاں مشتغل

اسی لیے اس آیت میں تقویٰ کی تدبیر بتلا کر فرمایا "وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ" یعنی تقویٰ کے ذریعے آپس کے تعلقات کی اصلاح کرو، اس کی مزید تشریح اس طرح فرمائی "وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ" یعنی اللہ اور رسول کی مکمل اطاعت ہو اگر تم مومن ہو یعنی ایمان کا تقاضا ہے اطاعت اور اطاعت نتیجہ ہے تقویٰ کا یعنی ایمان کا سب سے بڑا تقاضہ یہ ہے کہ جس پر تم ایمان لائے ہو پھر تم اس کی اطاعت اور فرمانبرداری بھی کرو اور اطاعت وفرمانبرداری انسان تب ہی کرے گا جب اس کے دل کے اندر خوف وخشیت بھی ہوگی اور اسی کو تقویٰ کہتے ہیں تو تقویٰ کے نتیجہ میں اطاعت نصیب ہوتی ہے اور جب اطاعت آجائے تو پھر انسان گویا کہ اپنے دعویٰ ایمان کے اندر سچا ہے تو انسان کے لیے جو ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اطاعت بھی ضروری ہے اور تقویٰ بھی ضروری ہے اور جب یہ چیزیں لوگوں کو حاصل ہو جائیں تو ان کے آپس کے جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے اور دشمنی کی جگہ دلوں میں الفت ومحبت پیدا ہو جائے گی کیونکہ پھر ہر شخص کا ذہن یہ ہوگا کہ ہم نے وہی کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حکم ہے، ہم نے ان کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرنی جب ہر ایک کی یہی سوچ ہوگی تو اس کا لازمی نتیجہ بھی ہے کہ پھر انتشار وفساد خود بخود ختم ہو جائے گا۔

مومن کی مخصوص صفات:

اگلی آیات میں ان مخصوص صفات کا بیان ہے جن کا ہر مومن میں ہونا ضروری ہے، اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ہر مومن اپنی ظاہری اور باطنی کیفیات اور صفات کا جائزہ لیتا رہے اگر یہ صفات اس میں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر کرے کہ اس نے اس کو مومنین کی صفات عطا فرما دی ہیں، اور اگر ان میں سے کوئی صفت موجود نہیں

یا ہے تو سہی مگر ضعیف وکمزور ہے تو اس کے حاصل کرنے یا اس کو قوی کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صفت خوفِ خدا:

پہلی صفت یہ بیان فرمائی "اَلَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ" یعنی جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل سہم جاتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت ان کے دلوں میں رچی اور بھری ہوئی ہے جس کا ایک تقاضا ہیبت وخوف ہے، قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں اس کا ذکر کر کے اہل محبت کو بشارت دی گئی ہے "وَبَشِّرِ الۡمُخۡبِتِیۡنَ اَلَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ" یعنی خوشخبری دے دیجئے ان متواضع نرم خولوگوں کو جن کے دل ڈر جاتے ہیں جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے، ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد کے ایک خاص تقاضا کا ذکر ہے یعنی ہیبت اور خوف اور دوسری آیت میں ذکر اللہ کی یہ خاصیت بھی بیان فرمائی گئی ہے کہ اس سے دل مطمئن ہو جاتے ہیں "اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ" یعنی اللہ ہی کی یاد سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس خوف وہیبت کا ذکر ہے وہ دل کے سکون واطمینان کے خلاف نہیں جیسے کسی درندے یا دشمن کا خوف قلب کے سکون کو برباد کر دیتا ہے، ذکر اللہ کے ساتھ دل میں پیدا ہونے والا خوف اس سے بالکل مختلف ہے اور اس لیے یہاں لفظ خوف استعمال نہیں فرمایا "وجل" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کا ترجمہ مطلق خوف نہیں بلکہ وہ ہیبت ہے جو بڑوں کی جلالت شان کے سبب دل میں پیدا ہوتی ہے بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ اللہ کے ذکر اور یاد سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی گناہ کے ارتکاب کا ارادہ کر رہا تھا، اسی حال میں اس کو خدا تعالیٰ کی یاد آ گئی تو وہ اللہ کے عذاب سے ڈر گیا اور گناہ سے باز آ گیا اس صورت میں خوف سے مراد خوف عذاب ہی ہوگا۔

دوسری صفت ایمان میں ترقی:

مومن کی دوسری صفت یہ بتلائی کہ جب اس کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو اس کا ایمان بڑھ جاتا ہے، ایمان بڑھنے کے ایسے معنی جن پر سب علماء مفسرین ومحدثین کا اتفاق ہے یہ ہیں کہ ایمان کی قوت وکیفیت اور نور ایمان میں ترقی ہو جاتی ہے، اور یہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ اعمال صالحہ سے ایمان میں قوت اور ایسا شرح صدر پیدا ہو جاتا ہے کہ اعمال صالحہ اس کی عادت طبعی بن جاتے ہیں جس کے چھوڑنے سے اس کو تکلیف ہوتی

ہے اور گناہ سے اس کو طبعی نفرت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کے پاس نہیں جاتا، ایمان کے اسی مقام کو حدیث میں حلاوتِ ایمان کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کو کسی نے اس طرح نظم کیا ہے۔

واذاحلت الحلاوۃ قلبا نشطت فی العبادۃ الاعضاء

یعنی جب کسی دل میں حلاوتِ ایمان جگہ پکڑ لیتی ہے تو اس کے ہاتھ پیر اور سب اعضاء عبادت میں راحت ولذت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اس لیے خلاصہ آیت کے مضمون کا یہ ہوا کہ مؤمن کامل کی یہ صفت ہونی چاہئے کہ جب اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جائیں تو اس کے ایمان میں جلاء و ترقی ہو اور اعمالِ صالحہ کی طرف رغبت بڑھے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس طرح عام مسلمان قرآن پڑھتے ہیں اور سنتے ہیں کہ نہ قرآن کے ادب واحترام کا کوئی اہتمام ہے اور نہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت پر نظر ہے ایسی تلاوت مقصود اور اعلیٰ نتائج پیدا کرنے والی نہیں گو ثواب سے وہ بھی خالی نہ ہو۔

تیسری صفت اللہ پر توکل:

تیسری صفت مؤمن کی یہ بیان فرمائی کہ وہ اللہ پر توکل کرے، توکل کے معنی اعتماد اور بھروسہ کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال واحوال میں اس کا مکمل اعتماد اور بھروسہ صرف ذاتِ واحد حق تعالیٰ پر ہو، صحیح حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ اپنی ضروریات کے لیے مادی اسباب اور تدابیر کو ترک کر کے بیٹھ جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ مادی اسباب وآلات کو اصل کامیابی کے لیے کافی نہ سمجھے بلکہ بقدر قدرت وہمت مادی اسباب اور تدابیر کو فراہم کرنے اور استعمال کرنے کے بعد معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اور سمجھے کہ اسباب بھی اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور ان اسباب کے ثمرات بھی وہی پیدا کرتے ہیں، ہوگا وہی جو وہ چاہیں گے، ایک حدیث میں فرمایا "اجملوا فی الطلب وتوکلوا علیہ" یعنی رزق اور اپنی حاجات کے حاصل کرنے کے لیے متوسط درجہ کی طلب اور مادی اسباب کے ذریعہ کوشش کر لو پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو، اپنے دل ودماغ کو صرف مادی تدبیروں اور اسباب ہی میں نہ الجھائے رکھو۔

چوتھی صفت اقامت صلوٰۃ:

چوتھی صفت مؤمن کی "اقامت صلوٰۃ" بتلائی، اس میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہاں نماز

پڑھنے کا نہیں بلکہ نماز کی اقامت کا ذکر ہے، اقامت کے لفظی معنی کسی چیز کو سیدھا کھڑا کرنے کے ہیں، مراد "اقامت صلوٰۃ" سے یہ ہے کہ نماز کے پورے آداب وشرائط اس طرح بجالائے جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قول وعمل سے بتلائے ہیں، آداب وشرائط میں کوتاہی ہوئی تو اس کو نماز پڑھنا تو کہہ سکتے ہیں مگر "اقامت صلوٰۃ" نہیں کہہ سکتے، قرآن مجید میں نماز کے جو فوائد، آثار اور برکات ذکر کی گئی ہیں اور فرمایا گیا ہے "اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ" یعنی نماز روکتی ہے بے حیائی اور ہر گناہ سے، یہ بھی "اقامت صلوٰۃ" ہی پر موقوف ہے، جب نماز کے آداب میں کوتاہی ہوئی تو گو فتویٰ کی رو سے اس کی نماز کو جائز ہی کہا جائے مگر نماز میں کوتاہی کرنے کے بعد برکات میں ضرور کمی واقع ہوگی، اور بعض صورتوں میں ان برکات سے کلی طور پر محرومی ہو جائے گی تو "اقامت صلوٰۃ" کا معنی ہے اس کو پورے آداب وشرائط کی رعایت رکھتے ہوئے ادا کرنا اس میں وقت کی پابندی، جماعت کا اہتمام، طہارت کا خیال، رکوع وسجود کی صحیح ادائیگی وغیرہ سب چیزیں شامل ہیں۔

پانچویں صفت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا:

پانچویں صفت مرد مؤمن کی یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو رزق دیا ہے وہ اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، یہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا عام ہے اس میں تمام صدقات وخیرات اور عطیات شامل ہیں، صدقات واجبہ جیسے زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور قربانی وغیرہ بھی اس میں داخل ہیں اور نفلی صدقات جو انسان کسی کو دیتا ہے یا مہمانوں، دوستوں اور رشتہ داروں پر جو خرچ کرتا ہے یہ سب صورتیں اس میں شامل ہیں اور مطلب یہ ہے کہ مؤمن وہی ہے جو صدقات واجبہ میں بھی کوتاہی نہیں کرتا اور صدقاتِ واجبہ کے ساتھ ساتھ صدقاتِ غیر واجبہ کا بھی اہتمام کرتا ہے۔

مذکورہ صفات والے سچے مؤمن ہیں:

مرد مؤمن کی یہ پانچ صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا" یعنی ایسے ہی لوگ سچے مؤمن ہیں جن کا ظاہر وباطن یکساں اور زبان اور دل متفق ہیں ورنہ جن میں یہ صفات نہیں وہ زبان سے تو "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کہتے ہیں مگر ان کے دلوں میں نہ توحید کا رنگ اور نہ اطاعت رسول کا جذبہ، ان کے اعمال ان کے اقوال کی تردید کرتے ہیں اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے جب تک وہ حاصل نہ ہو حق حاصل نہیں ہوتا۔

ایک شخص نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ اے ابوسعید! کیا آپ مؤمن ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ بھائی ایمان دو قسم کے ہیں، تمہارے سوال کا مطلب اگر یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر، اور جنت، دوزخ اور قیامت اور حساب کتاب پر ایمان رکھتا ہوں تو جواب یہ ہے کہ بے شک میں مؤمن ہوں، اور اگر تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ مؤمن کامل ہوں جس کا ذکر سورۂ انفال کی آیات میں ہے تو مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں ان میں داخل ہوں یا نہیں، سورۂ انفال کی آیات سے یہی آیات مراد ہیں جو ابھی آپ کے سامنے پڑھی گئی ہیں۔

سچے مؤمنین کا انعام:

آیات مذکورہ میں سچے مؤمن کی صفات وعلامات بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا "لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ" اس میں سچے مؤمنین کے لیے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا، ایک درجات عالیہ، دوسرا مغفرت، تیسرا عمدہ رزق۔

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس سے پہلی آیات میں سچے مؤمنین کی جو صفات بیان ہوئیں وہ تین قسم کی ہیں، ایک وہ جن کا تعلق قلب اور باطن کے ساتھ ہے جیسے ایمان، خوفِ خدا، توکل علی اللہ، دوسری وہ جن کا تعلق جسمانی اعمال سے ہے جیسے نماز وغیرہ، تیسری وہ جن کا تعلق انسان کے مال سے ہے جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

ان تینوں قسموں کے بالمقابل تین انعاموں کا ذکر آیا ہے، درجاتِ عالیہ کا ذکر قلبی اور باطنی صفات کے مقابلہ میں ہے، مغفرت کا ذکر ان اعمال کے مقابلہ میں ہے جو انسان کے ظاہر بدن سے متعلق ہیں جیسے نماز، روزہ وغیرہ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ نماز گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے اور رزق کریم کا ذکر اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے بالمقابل آیا ہے کہ جو کچھ خرچ کیا اس سے بہت بہتر اور بہت زیادہ اس کو آخرت میں ملے گا۔

درجات جنت کی وسعت:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جنت میں سو درجے ہیں اور ان درجات کے درمیان آپس میں اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان وزمین کے درمیان ہے ان میں فردوس سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اسی سے جنت کی چاروں نہریں جاری ہیں اور اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے سو جب تم اللہ سے

سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جنت میں سو درجات ہیں اگر سارے جہان ان میں سے ایک درجہ میں جمع ہو جائیں تو اس ایک درجہ میں سب سما جائیں۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا

جیسا کہ آپ کے رب نے آپ کے گھر سے حق کے ساتھ آپ کو نکالا اور بلاشبہ ایک جماعت کو

مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ

مومنین کی گراں گزر رہا تھا ۝۵ وہ آپ سے حق کے بارے میں جھگڑ رہے تھے

بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶

اس کے بعد کہ ظہور ہو چکا تھا، گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اس حال میں کہ وہ دیکھ رہے ہیں ۝۶

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ

اور جب اللہ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک جماعت تمہارے لیے ہے اور تم خواہش کر رہے تھے

اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ

کہ جو جماعت شوکت والی نہیں ہے وہ تمہارے لیے ہو جائے، اور اللہ چاہتا ہے کہ حق کا حق ہونا ثابت فرما دے

بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ

اپنے کلمات کے ذریعہ اور کافروں کی جڑ کاٹ دے ۝۷ تاکہ حق کو سچا کر دے اور باطل کا

الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ

باطل ہونا ثابت کر دے اگرچہ مجرموں کو ناگوار ہو ۝۸ جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے سو اس نے

لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝۹ وَمَا جَعَلَهُ

تمہاری دعا قبول فرمائی کہ میں ایک ہزار فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد کروں گا جو مسلسل آتے رہیں گے ۝۹ اور اس امداد کو نہیں بنایا

اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ

اللہ نے مگر بشارت اور تاکہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل اور نہیں ہے مدد مگر

عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰ۧ

اللہ ہی کی طرف سے بے شک اللہ غلبہ والا حکمت والا ہے ۝۱۰

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

شروع سورۃ میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ انفال کے اکثر مضامین کفار و مشرکین پر عذاب و انتقام اور مسلمانوں پر احسان و انعام سے متعلق ہیں اور اس کے ضمن میں دونوں فریقوں کے لیے عبرت و نصیحت کے احکام بیان ہوئے ہیں، اور ان معاملات میں سب سے پہلا اور سب سے اہم واقعہ غزوۂ بدر کا تھا جس میں بڑے ساز و سامان اور تعداد و قوت کے باوجود مشرکین کو جانی اور مالی نقصانات کے ساتھ شکست اور مسلمانوں کو باوجود ہر طرح کی قلت اور بے سامانی کے فتح عظیم نصیب ہوئی، اس سورۃ میں واقعہ بدر کا تفصیلی بیان ہے جو آیاتِ مذکورہ سے شروع ہو رہا ہے۔

غزوۂ بدر کے پیش آنے کا سبب:

آگے بڑھنے سے پہلے پورا واقعہ ذہن نشین کر لینا چاہیے تاکہ آیت کریمہ میں جو اجمال ہے اس کی تشریح سمجھ میں آ جائے، حاصل اس واقعہ کا یہ ہے کہ قریش مکہ ہر سال تجارت کے لیے ملک شام جایا کرتے تھے، مکہ معظمہ سے شام کو جائیں تو مدینہ منورہ راستہ میں آتا ہے اور مکہ سے شام یا شام سے مکہ آنے کے لیے مدینہ منورہ سے گزرنا پڑتا ہے، شہر مدینہ میں داخل نہ بھی ہوں تو بھی دور سے یا قریب سے اس کے محاذات سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، اب آگے یہ سمجھیں کہ قریش مکہ کا ایک قافلہ تجارت کے لیے شام گیا ہوا تھا، بہت سے لوگوں نے اس تجارت میں شرکت کی تھی اور اپنے اموال لگائے تھے، قافلہ کے سردار ابوسفیان تھے (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) جب ابوسفیان کا قافلہ شام سے واپس ہو رہا تھا جس میں تیس یا چالیس افراد تھے اور ایک ہزار اونٹ تھے تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قافلہ کے گزرنے کا علم ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ قریش کا قافلہ ادھر سے گزر رہا ہے چلو اس قافلہ کو پکڑیں ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے اموال ہمیں عطا فرما دے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکیدی حکم نہیں فرمایا تھا اور یہ بھی نہیں فرمایا تھا کہ جنگ کرنے نکل رہے ہیں اس لیے بعض صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ روانہ ہو گئے اور بعض مدینہ منورہ ہی میں رہ گئے۔

ابوسفیان کو خطرہ تھا کہ راہ میں مسلمانوں سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے اس لیے وہ راستہ میں راہ گیروں سے اس بات کا کھوج لگاتا ہوا جا رہا تھا کہ کہیں مسلمان ہمارے قافلہ کے درپے تو نہیں ہیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے

صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مدینہ منورہ سے سفر فرمایا تو ابوسفیان کو اس کی خبر مل گئی اس نے اپنا راستہ بدل دیا اور ضمضم بن عمرو غفاری کو اہل مکہ تک خبر پہنچانے کے لیے جلدی جلدی آگے روانہ کر دیا، اس کو اس کام کی اجرت دینا بھی طے کر دیا، ضمضم جلدی سے مکہ پہنچا اور اس نے خبر دے دی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ تمہارے قافلے کے درپے ہیں اور مدینہ منورہ سے روانہ ہو چکے ہیں اپنے قافلہ کی حفاظت کر سکتے ہو تو کر لو، یہ خبر سنتے ہی اہل مکہ میں ہل چل مچ گئی اور مقابلہ کے لیے ایک ہزار آدمی جن کا سردار ابوجہل تھا بڑے کروفر اور اسباب عیش وطرب کے ساتھ اکڑتے اور اتراتے ہوئے بدر کی طرف روانہ ہو گئے۔

بدر ایک آبادی کا نام ہے جو مکہ معظمہ سے براستہ رابغ مدینہ منورہ کو جاتے ہوئے راستہ میں پڑتی ہے یہاں سے مدینہ منورہ سو میل سے کچھ کم رہ جاتا ہے، بدر نامی ایک شخص تھا جس نے اس بستی کو آباد کیا تھا اس کے نام پر اس بستی کا نام ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مقام بدر میں ایک کنواں تھا اس کا نام بدر تھا اسی کنویں کے نام سے یہ آبادی مشہور تھی، قریش مکہ اپنے ساتھ گانے بجانے والی عورتیں لے کر نکلے تھے تاکہ وہ گانا گائیں اور لڑائی کے لیے ابھاریں، اس لشکر میں تقریباً تمام سرداران قریش شامل تھے، صرف ابولہب نہ جا سکا تھا اس نے اپنی جگہ ابوجہل کے بھائی عاصم بن ہشام کو بھیج دیا تھا، ان لوگوں کے ساتھ دیگر سامان حرب کے علاوہ ساٹھ گھوڑے اور چھ سو زرہیں تھیں اور سواری کے اونٹوں کے علاوہ کثیر تعداد میں ذبح کرنے اور کھانے کھلانے کے لیے بھی اونٹ ساتھ لے کر چلے تھے، سب سے پہلے ابوجہل نے مکہ سے باہر آ کر دس اونٹ ذبح کر کے لشکر کو کھلائے پھر مقام عسفان میں امیہ بن خلف نے نو اونٹ ذبح کیے، پھر مقام قدید میں سہل بن عمرو نے اونٹ ذبح کیے پھر اگلی منزل میں شیبہ بن ربیعہ نے نو اونٹ ذبح کیے پھر اس سے اگلی منزل میں (جو مقام جحفہ میں تھی) عتبہ بن ربیعہ نے دس اونٹ ذبح کیے، اس طرح ہر منزل میں دس دس اونٹ ذبح کرتے رہے اور کھاتے رہے، اور ابوالبختری نے بدر پہنچ کر دس اونٹ ذبح کیے۔

قریش مکہ تو مکہ معظمہ سے چلے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تھے، یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا، آپ نے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ بنایا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہونے والوں میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مقام روحاء سے واپس کر دیا اور امیر مدینہ بنا کر بھیج دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ستر اونٹ تھے جن پر نمبروار سوار ہوتے تھے، ہر تین افراد کو ایک اونٹ دیا گیا تھا، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت

ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک اونٹ میں شریک تھے، نوبت کے اعتبار سے آپ بھی پیدل چلتے تھے، مقام روحاء تک یہی سلسلہ رہا جب روحاء سے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو واپس فرما دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مرثد رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک اونٹ میں شریک رہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدل چلنے کی نوبت آتی تھی تو حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ عرض کرتے تھے کہ یا رسول اللہ! آپ برابر سوار رہیں ہم آپ کی طرف سے پیدل چل لیں گے، آپ نے جواب میں فرمایا "لَا اَنْتُمَا بِاَقْوٰی مِنِّی وَلَا اَنَا بِاَغْنٰی عَنِ الْاَجْرِ مِنْكُمَا" (تم دونوں مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو اور ثواب کے اعتبار سے بھی میں تمہاری بہ نسبت بے نیاز نہیں ہوں) یعنی جیسے تمہیں ثواب کی ضرورت ہے مجھے بھی ثواب کی ضرورت ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وادی ذفران میں پہنچے تو وہاں قیام فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جذبۂ ایمانی:

اب تک تو ابوسفیان کے قافلے سے تعرض کرنے کی نیت سے سفر ہو رہا تھا یہاں پہنچ کر خبر ملی کہ قریش مکہ سے جنگ کرنے کی نوبت آئے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کہ قریش ہمارے مقابلہ کے لیے نکل چکے ہیں اب کیا کیا جائے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور اچھا جواب دیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے انہوں نے بھی اچھا جواب دیا، پھر حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ اپنی رائے کے مطابق تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں، اللہ کی قسم ایسا نہ ہوگا جیسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا "اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ" (تو اور تیرا رب چلے جائیں دونوں قتال کرلیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) آپ تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ قتال کرنے والے ہیں، قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے اگر آپ ہمیں "برك الغماد" (یہ یمن میں ایک جگہ کا نام ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ جگہ مکہ معظمہ سے پانچ رات کی مسافت پر ہے) تک ساتھ لے چلیں گے تو ہم ساتھ رہیں گے اور جنگ سے منہ نہ موڑیں گے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَشِيْرُوْا عَلَيَّ اَيُّهَا النَّاسُ" (اے لوگو! مشورہ دو) آپ کا مقصد یہ تھا کہ انصاری حضرات اپنی رائے پیش کریں، آپ کی بات سن کر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا (جو انصار میں سے تھے) کہ یا رسول اللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہم سے جواب لینا چاہتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں!

انہوں نے عرض کیا کہ ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی، ہم نے گواہی دی کہ جو کچھ آپ لے کر آئے ہیں وہ حق ہے اور ہم نے آپ سے عہد کیا ہے کہ ہم آپ کی بات مانیں گے اور فرمانبرداری کریں گے آپ اپنے ارادہ کے موافق عمل کریں اور تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے اگر راہ میں سمندر آ گیا اور آپ اس میں داخل ہونے لگیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ داخل ہو جائیں گے اور ہم میں سے ایک شخص بھی پیچھے نہ رہے گا، ہم جنگ میں ڈٹ جانے والے ہیں اور دشمن کے مقابلہ میں مضبوطی کے ساتھ معرکہ آرائی کرنے والے ہیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے آپ کو ایسی بات دکھا دے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، آپ اللہ کی برکت کے ساتھ چلئے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی بات سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت خوشی ہوئی اور فرمایا کہ چلو خوش خبری قبول کرلو، اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ دو جماعتوں میں سے تم کو ایک جماعت پر غلبہ عطاء فرمائیں گے (ایک جماعت ابوسفیان کا قافلہ اور دوسری جماعت قریش مکہ کا لشکر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ جس جماعت سے مقابلہ ہوگا ان کے مقتولین کہاں کہاں پڑے ہیں۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بدر کی طرف روانہ ہو گئے، راستہ میں ایک غلام سے ملاقات ہوئی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے پوچھا کہ ابوسفیان کا قافلہ کہاں ہے؟ اس نے کہا اس کا تو مجھے کوئی پتہ نہیں، یہ ابوجہل، عتبہ اور امیہ بن خلف آ رہے ہیں، بعض روایات میں یوں ہے کہ جب ابوسفیان کے قافلے سے تعرض کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو ایک دن یا دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ لیا تھا کہ ابوسفیان کو پتہ چل گیا ہے کہ ہم اس سے تعرض کرنے نکلے ہیں (وہ قافلہ تو نکل چکا ہے) اب قریش مکہ کے آنے کی خبر سنی گئی ہے، ان سے مقابلہ ہونے کی بات بن رہی ہے اس بارے میں کیا خیال ہے؟ اس پر بعض صحابہ نے کہا کہ ہم میں تو قریش کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں آپ تو ابوسفیان کے قافلہ کے لیے نکلے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی سوال فرمایا کہ قریش مکہ سے جنگ کرنے کے بارے میں کیا رائے ہے؟ اس پر حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے وہ جواب دیا جو پیچھے گزر چکا، بعض روایات میں ہے کہ یہ سوال جواب مقام روحاء میں ہوئے، بعض صحابہ نے جو یہ کہا تھا کہ ہمیں قریش مکہ سے جنگ کی طاقت نہیں، ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی "وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا

یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ وَھُمْ یَنْظُرُوْنَ" (اور بلاشبہ مومنین کی ایک جماعت کو گراں گزر رہا تھا وہ آپ سے حق کے بارے میں جھگڑ رہے تھے اس کے بعد کہ حق ظاہر ہو چکا تھا گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اس حال میں کہ وہ دیکھ رہے ہیں)۔

ابوسفیان کا قریش مکہ کو واپس جانے کا مشورہ:

جب ابوسفیان اپنے قافلہ کو لے کر مسلمانوں کی زد سے بچ کر نکل گیا تو اس نے قریش مکہ کے پاس خبر بھیجی کہ تم ہماری حفاظت کے لیے نکلے تھے اب جبکہ ہم بچ کر نکل آئے ہیں تو تمہیں آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں، لہٰذا واپس چلے جاؤ اس پر ابوجہل نے کہا اللہ کی قسم! ہم واپس نہیں لوٹیں گے جب تک کہ ہم بدر نہ پہنچ جائیں وہاں تین دن قیام کریں گے، اونٹ ذبح کریں گے، کھانے کھائیں گے، شرابیں پئیں گے اور گانے والیاں گانے سنائیں گی اور عرب کو پتہ چل جائے گا کہ ہم مقابلہ کے لیے نکلے تھے ہمارے اس عمل سے ایک دھاک بیٹھ جائے گی اور لوگ ہم سے ڈرتے رہیں گے، لہٰذا چلو آگے بڑھو۔

اللہ جل شانہٗ نے اپنے رسول ﷺ سے وعدہ فرمایا تھا کہ دونوں جماعتوں میں سے ایک جماعت پر تمہیں غلبہ دیا جائے گا، جب آپ ﷺ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا تو ان میں سے بعض صحابہ نے یہ مشورہ دیا کہ ابوسفیان کے قافلے ہی کا پیچھا کرنا چاہئے کیونکہ وہ لوگ تجارت سے واپس ہو رہے ہیں، جنگ کرنے کے لیے نہیں نکلے، ان میں لڑنے کی قوت اور شوکت نہیں ہے، لہٰذا ان پر غلبہ پانا آسان ہے اور قریش کا جو لشکر مکہ مکرمہ سے چلا ہے وہ لوگ تو لڑنے ہی کے لیے چلے ہیں اور تیاری کر کے نکلے ہیں، لہٰذا ان سے مقابلہ مشکل ہوگا، ان لوگوں کی اس بات کو ان الفاظ میں ذکر فرمایا "وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَةِ تَکُوْنُ لَکُمْ" (اور تم چاہتے تھے کہ وہ جماعت تمہارے قابو میں آجائے جو قوت و طاقت والی نہیں تھی)۔

بدر میں حق کی کھلی فتح:

قریش مکہ نے آنحضرت ﷺ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بہت تکلیفیں دی تھیں اور مکہ مکرمہ کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا، حق نہ خود قبول کرتے تھے اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے تھے، غیر متوقع طور پر بدر میں پہنچے اور معرکہ پیش آنے کی صورت بن گئی، اس میں گو بعض اہل ایمان کو طبعاً کراہت تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر سب پر

غالب ہے، جنگ ہوئی اور اہل مکہ نے زبردست شکست کھائی اور ان کا فخر اور طمطراق سب دھرا رہ گیا، جس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب بیان ہوگی، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ" (اللہ کو یہ منظور تھا کہ اپنے کلمات کے ذریعہ حق کو ثابت فرمادے) "وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ" (اور کافروں کی بنیاد کو کاٹ دے) "لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ" (تاکہ اللہ تعالیٰ حق کا حق ہونا ثابت فرمادے اور باطل کا باطل ہونا ثابت فرمادے) "وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ" (اگرچہ مجرموں کو ناگوار ہو)۔

اللہ تعالیٰ نے ایسی تدبیر فرمائی کہ مشرکین مکہ ذلیل ہوئے، اسلام کا حق ہونا علی الاعلان ثابت ہوا اور باطل کا باطل ہونا بھی ظاہر ہوگیا، دوست اور دشمن سب نے دیکھ لیا اسی لیے یوم بدر کو یوم الفرقان فرمایا۔

"كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ" کا مفہوم:

پہلی بات یہ ہے کہ آیت کا شروع "كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ" سے ہوتا ہے، اس میں لفظ "كَمَا" ایک ایسا لفظ ہے جو تشبیہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں تشبیہ کس چیز کی کس چیز سے ہے، حضرات مفسرین نے اس کی مختلف توجیہات بیان فرمائی ہیں، امام التفسیر علامہ ابوحیان رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح کے پندرہ اقوال نقل کیے ہیں ان میں زیادہ اقرب تین احتمال ہیں۔

اول یہ کہ اس تشبیہ سے مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ جس طرح غزوۂ بدر کے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آپس میں کچھ اختلاف رائے ہوگیا تھا، پھر حکم خداوندی کے تحت سب نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور اس کی برکات اور اچھے نتائج کا ظہور سامنے آگیا، اسی طرح اس جہاد کے شروع میں کچھ لوگوں کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوا پھر حکم ربانی کے ماتحت سب نے اطاعت کی اور اس کے مفید نتائج اور اعلیٰ ثمرات کا مشاہدہ ہوگیا، یہ توجیہ فراء اور مبرد کی طرف منسوب ہے، اسی کو بیان القرآن میں ترجیح دی گئی ہے جیسا کہ خلاصۂ تفسیر سے معلوم ہو چکا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں سچے مؤمنین کے لیے آخرت میں درجاتِ عالیہ، مغفرت اور باعزت روزی کا وعدہ کیا گیا تھا، ان آیات میں اس وعدے کے یقینی ہونے کا ذکر اس طرح کیا گیا کہ آخرت کا وعدہ اگرچہ ابھی آنکھوں کے سامنے نہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ جنگ بدر کے اندر نصرت اور فتح کا کیا تھا اس کا پورا ہونا تم کھلی آنکھوں دیکھ چکے ہو اور اس کا مشاہدہ کر چکے ہو اس سے نصیحت حاصل کرو اور یقین کرلو کہ جس طرح یہ وعدہ دنیا

ہی میں پورا ہو چکا ہے اسی طرح آخرت کا وعدہ بھی ضرور پورا ہوگا۔

تیسرا احتمال یہ ہے ابو حیان نے رحمۃ اللہ علیہ مفسرین کے پندرہ اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مجھے ان میں سے کسی قول پر اطمینان نہیں تھا، ایک روز میں اسی آیت پر غور وفکر کرتے ہوئے سو گیا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی جگہ جا رہا ہوں اور ایک شخص میرے ساتھ ہے، میں اسی آیت کے متعلق اس سے بحث کر رہا ہوں اور یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے کبھی ایسی مشکل پیش نہیں آئی جیسی اس آیت کے الفاظ میں پیش آئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی لفظ محذوف ہے پھر یکایک خواب ہی میں میرے دل میں پڑا کہ یہاں لفظ "نصرتك" محذوف ہے اس کو خود میں نے بھی پسند کیا اور جس شخص سے بحث کر رہا تھا اس نے بھی پسند کیا، بیدار ہونے کے بعد اس پر غور کیا تو میرا اشکال ختم ہو گیا کیونکہ اس صورت میں لفظ "کما" تشبیہ کے لیے نہیں بلکہ بیان سبب کے لیے استعمال ہوا ہے اور معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ غزوۂ بدر میں اللہ جل شانہ کی طرف سے جو خاص نصرت وامداد آپ کی ہوئی اس کا سبب یہ تھا کہ اس جہاد میں آپ نے جو کچھ کیا کسی اپنی خواہش اور رائے سے نہیں بلکہ خالص امر ربی اور حکم خداوندی کے تابع کیا، اسی کے حکم پر آپ اپنے گھر سے نکلے، اور اطاعتِ حق کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے اور یہی ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی امداد ونصرت اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

بہر حال آیت کے اس جملہ میں یہ تینوں معنی محتمل اور صحیح ہیں۔

آیت بالا کے اہم نکات:

اس کے بعد اس پر نظر ڈالئے کہ قرآن کریم نے اس جہاد کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خود نکلنا ذکر نہیں کیا بلکہ یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نکالا، اس میں اشارہ ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال عبدیت واطاعت کی طرف کہ آپ کا فعل درحقیقت حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو آپ کے اعضاء وجوارح سے صادر ہوتا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بندہ جب اطاعت وعبدیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں وہ جو کچھ دیکھتا ہے میرے ذریعہ دیکھتا ہے، میں اس کے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سے سنتا ہے، میں اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جس کو پکڑتا ہے میرے ذریعہ سے پکڑتا ہے، جس کی طرف چلتا ہے میرے ذریعہ سے چلتا ہے، خلاصہ اس کا یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی خاص نصرت وامداد اس کے ساتھ ہو جاتی ہے جن افعال کا صدور بظاہر اس

کے آنکھ، کان یا ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے درحقیقت اس میں قدرت حق تعالیٰ شانہٗ کی کارفرما ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ لفظ "اَخْرَجَكَ" میں اس طرف اشارہ کردیا کہ آنحضرت ﷺ کا جہاد کے لیے نکلنا درحقیقت حق تعالیٰ شانہٗ کا نکالنا تھا جو آپ کی ذات سے ظاہر ہوا۔

یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ "اَخْرَجَكَ رَبُّكَ" فرمایا جس میں اللہ جل شانہٗ کا ذکر صفتِ رب کے ساتھ کرکے اس طرف اشارہ کردیا کہ اس جہاد کے لیے آپ کو نکالنا شانِ ربوبیت سے اور تربیت کے تقاضا سے تھا کیونکہ اس کے ذریعہ مظلوم ومقہور مسلمانوں کے لیے فتح یاب اور مغرور وظالم کفار کے لیے پہلے عذاب کا مظاہرہ کرنا تھا۔

"مِنْ بَيْتِكَ" کے معنی ہیں آپ کے گھر سے، مطلب یہ ہوا کہ نکالا آپ کو آپ کے رب نے آپ کے گھر سے، جمہور مفسرین کے نزدیک اس گھر سے مراد مدینہ طیبہ کا گھر یا خود مدینہ طیبہ ہے جس میں ہجرت کے بعد آپ مقیم ہوئے کیونکہ واقعہ بدر ہجرت کے دوسرے سال میں پیش آیا ہے، اس کے ساتھ لفظ "بالحق" کا اضافہ کرکے بتلادیا کہ یہ ساری کاروائی "احقاقِ حق" اور "ابطالِ باطل" کے لیے عمل میں آئی ہے، دوسری حکومتوں کی طرح ملک گیری کی ہوس یا بادشاہوں کا غصہ اس کا سبب نہیں۔

آخر آیت میں فرمایا "وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ" یعنی ایک جماعت مسلمانوں کی اس جہاد کو گراں سمجھتی اور ناپسند کرتی تھی۔

مسلمانوں کو تنبیہ:

پہلی اور دوسری آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ اطلاع ملی کہ قریش کا ایک عظیم لشکر اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لیے مکہ سے نکل چکا ہے تو اب مسلمانوں کے سامنے دو جماعتیں تھیں ایک تجارتی قافلہ جس کو روایات میں "عیر" سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسری یہ مسلح فوج جو مکہ سے چلی تھی جس کو "نفیر" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اس آیت میں یہ بتلایا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور آپ کے واسطہ سے سب مسلمانوں سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر تمہارا مکمل قبضہ ہوجائے گا کہ اس کے متعلق جو تم چاہو گے کرسکو گے۔

اب یہ ظاہر ہے تجارتی قافلہ پر قبضہ آسان اور بے خطر تھا اور مسلح فوج پر مشکل اور خطرات سے پُر، اس لیے

اس مبہم وعدہ کو سن کر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تمنا اور خواہش بھی ہوئی کہ وہ جماعت جس پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کا وعدہ اللہ کی طرف سے ہوا ہے وہ غیر مسلح تجارتی قافلہ ہو جائے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے اکابر صحابہ کا باشارات ربانی یہ ارادہ ہوا کہ اگر مسلح فوج پر قبضہ ہو جائے تو بہتر ہوگا۔

ان آیات میں غیر مسلح جماعت پر قبضہ چاہنے والے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہیں تو اپنی سہولت پسندی اور خطرات سے یکسوئی کے پیش نظر یہی پسند تھا کہ غیر مسلح تجارتی قافلہ پر تمہارا قبضہ ہو جائے گا، مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا اسلام کا اصل مقصد حاصل ہو یعنی حق کا حق ہونا واضح ہو جائے اور کافروں کی جڑ کٹ جائے اور ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت ہو سکتا تھا جبکہ مسلح فوج سے مقابلہ ہو اور اس پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ اور غلبہ ہو۔

خلاصہ اس کا یہ ہے مسلمانوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ تم نے جو صورت پسند کی وہ نہایت پست ہمتی اور آرام طلبی اور وقتی اور ہنگامی فائدہ کی چیز تھی اللہ تعالیٰ نے جو ارادہ فرمایا وہ عالی ہمتی، بلند مقاصد اور مکمل اور دائمی فوائد پر مشتمل تھا، پھر دوسری آیت میں اس کو مزید واضح فرما دیا، اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت سے تو کوئی چیز باہر نہ تھی اگر وہ چاہتے تو تجارتی قافلہ پر مسلمانوں کا غلبہ اور قبضہ ہو جاتا مگر اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان کے لائق اس کو سمجھا کہ مسلح فوج سے مقابلہ ہو کر اس پر قبضہ ہو تا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح ہو جائے۔

کسی جماعت کو متعین کر کے ذکر نہ کرنے کی وجہ:

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حق تعالیٰ علیم و خبیر ہے اور ہر کام کے آغاز و انجام سے باخبر ہیں ان کی طرف سے اس مبہم وعدہ میں کیا مصلحت تھی کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر مسلمانوں کا غلبہ اور قبضہ ہوگا، وہ ان میں سے کسی ایک کو متعین کر کے بھی فرما سکتے تھے کہ فلاں جماعت پر قبضہ ہو جائے گا۔

اس ابہام کی وجہ " وَاللّٰهُ اَعْلَمُ " یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا امتحان کرنا مقصود تھا کہ آسان کام کو پسند کرتے ہیں یا مشکل کو، میدان جنگ کو ترجیح دیتے ہیں یا مال تجارت کو، ان کے اندر مال کے حصول کا جذبہ زیادہ ہے یا حق کے لیے جانبازی اور جانثاری کا جذبہ زیادہ ہے، دیکھنا یہ تھا کہ یہ اپنی ایمانی کیفیت کے ساتھ کس بات کو اختیار اور پسند کرتے ہیں اور اس میں ان کی اخلاقی تربیت بھی تھی جس کے ذریعہ ان کو عالی ہمتی اور اعلیٰ مقاصد کی جدوجہد اور خطرات سے نہ گھبرانا سکھایا گیا۔

حضور ﷺ کا دعا کرنا:

اگلی آیات میں اس واقعہ کا بیان ہے جو مسلح فوج سے مقابلہ ٹھن جانے کے بعد پیش آیا کہ رسول کریم ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ آپ کے رفقاء صرف تین سو تیرہ اور وہ بھی اکثر غیر مسلح ہیں اور مقابلہ پر تقریباً ایک ہزار جوانوں کا مسلح لشکر ہے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نصرت و امداد کے لئے ہاتھ اٹھائے، آپ ﷺ دعا مانگتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے ساتھ آمین کہتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آنحضرت ﷺ کی دعا کے یہ کلمات نقل فرمائے ہیں

''یا اللہ مجھ سے جو وعدہ آپ نے فرمایا ہے اس کو جلد پورا فرمادے یا اللہ! اگر یہ تھوڑی سی جماعت مسلمین کی فنا ہوگئی تو پھر زمین میں کوئی تیری عبادت کرنے والا باقی نہ رہے گا (کیونکہ ساری زمین کفر و شرک سے بھری ہوئی ہے یہی چند مسلمان ہیں جو صحیح عبادت بجالاتے ہیں)''

آنحضرت ﷺ اسی طرح الحاح وزاری کے ساتھ دعا میں مشغول رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے شانوں سے چادر بھی سرک گئی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر چادر اوڑھائی اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ زیادہ فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ آپ کی دعا ضرور قبول فرمائیں گے اور اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے۔

آیت میں ''اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ '' کے الفاظ سے یہی واقعہ مراد ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب تم اپنے رب سے استغاثہ کر رہے تھے اور مدد طلب کر رہے تھے، یہ استغاثہ اگرچہ دراصل رسول کریم ﷺ کی طرف سے ہوا تھا مگر تمام صحابہ آمین کہہ رہے تھے اس لیے پوری جماعت کی طرف منسوب کیا گیا۔

دعا کی قبولیت:

اس کے بعد اس دعا کی قبولیت کا بیان اس طرح فرمایا ''فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ'' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی اور فرمایا کہ ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کروں گا جو یکے بعد دیگرے قطار کی صورت میں آنے والے ہوں گے۔

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے جو بےنظیر قوت وطاقت عطا فرمائی ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو قوم لوط کی زمین کا تختہ الٹنے کے وقت پیش آیا کہ جبرائیل امین نے ایک پَر کے ذریعہ سے تختہ الٹ دیا، ایسی

بے مثال طاقت والے فرشتوں کی اتنی بڑی تعداد مقابلہ میں بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی ایک بھی کافی تھا مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی فطرت سے واقف ہیں کہ وہ تعداد سے بھی متاثر ہوتے ہیں اس لیے مقابل فریق کی تعداد کے مطابق فرشتوں کی تعداد بھیجنے کا وعدہ فرمایا کہ ان کے قلوب پوری طرح مطمئن ہو جائیں۔

غزوۂ بدر میں فرشتوں کی تعداد:

غزوۂ بدر میں جو اللہ تعالیٰ کے فرشتے امداد کے لیے بھیجے گئے ان کی تعداد اس جگہ ایک ہزار مذکور ہے اور سورۃ آل عمران میں تین ہزار اور پانچ ہزار ذکر کی گئی ہے، اس کا سبب دراصل تین مختلف وعدے ہیں جو مختلف حالات میں کیے گئے ہیں، پہلا وعدہ ایک ہزار فرشتوں کا ہوا جس کا سبب رسول کریم ﷺ کی دعا اور عام مسلمانوں کی فریاد تھی، دوسرا وعدہ جو تین ہزار فرشتوں کا سورۃ آل عمران میں پہلے مذکور ہے وہ اس وقت کیا گیا جب مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ قریشی لشکر کے لیے اور کمک آرہی ہے، روح المعانی میں ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر وغیرہ سے بروایت شعبی منقول ہے کہ مسلمانوں کو بدر کے دن یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی امداد کے لیے کمک لے کر آرہا ہے، اس خبر سے مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا، اس پر آل عمران کی آیت "اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِیْنَ" نازل ہوئی جس میں تین ہزار فرشتے امداد کے لیے آسمان سے نازل کرنے کا وعدہ ذکر کیا گیا۔

اور تیسرا وعدہ پانچ ہزار کا اس شرط کی ساتھ مشروط تھا کہ اگر فریق مخالف نے یکبارگی حملہ کر دیا تو پانچ ہزار فرشتوں کی مدد بھیج دی جائے گی وہ آل عمران کی آیت مذکورہ کے بعد کی آیت میں اس طرح مذکور ہے "بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ" یعنی اگر تم ثابت قدم رہے اور تقویٰ پر قائم رہے اور مقابل لشکر یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑا تو تمہارا رب تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا جو خاص نشان یعنی خاص وردی میں ہوں گے۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس وعدے میں تین شرطیں تھیں ایک ثابت قدمی دوسری تقویٰ اور تیسری مخالف فریق کا یکبارگی حملہ، پہلی دو شرطیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں موجود تھیں اور اس میدان میں اول سے آخر تک ان میں کہیں فرق نہیں آیا مگر تیسری شرط یکبارگی حملہ کا واقعہ پیش نہیں ہوا اس لیے پانچ ہزار ملائکہ کے لشکر کی نوبت نہیں آئی۔

اس لیے معاملہ ایک ہزار اور تین ہزار میں دائر رہا، جس میں یہ بھی احتمال ہے کہ تین ہزار سے مراد یہ ہو کہ ایک ہزار جو پہلے بھیجے گئے ان کے ساتھ مزید دو ہزار شامل کر کے تین ہزار کر دیئے گئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ تین ہزار اس پہلے ہزار کے علاوہ ہوں۔

فرشتوں کی مختلف صفات کا ذکر:

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان تین آیتوں میں فرشتوں کی تین جماعتوں کے بھیجنے کا وعدہ ہے اور ہر جماعت کے ساتھ ایک خاص صفت کا ذکر ہے، سورۃ انفال کی آیت جس میں ایک ہزار کا وعدہ ہے اس میں تو ان فرشتوں کی صفت میں "مُرْدِفِیْنَ" فرمایا ہے جس کے معنی ہیں پیچھے لگانے والے اس میں شاید اس طرف پہلے ہی اشارہ کر دیا گیا کہ ان فرشتوں کے پیچھے دوسرے بھی آنے والے ہیں، اور سورۃ آل عمران کی پہلی آیت میں ملائکہ کی صفت "مُنْزَلِیْنَ" ارشاد فرمائی، یعنی یہ فرشتے آسمان سے اتارے جائیں گے اس میں اشارہ خاص اہمیت کی طرف ہے کہ زمین میں جو فرشتے پہلے سے موجود ہیں ان سے کام لینے کی بجائے خاص اہتمام کے ساتھ یہ فرشتے آسمان سے اسی کام کے لیے بھیجے جائیں گے اور سورۃ آل عمران کی دوسری آیت جس میں پانچ ہزار کا ذکر ہے اس میں ملائکہ کی صفت "مُسَوِّمِیْنَ" ارشاد فرمائی ہے کہ وہ ایک خاص لباس اور علامت کے ساتھ ہوں گے جیسا کہ روایاتِ حدیث میں ہے کہ بدر میں نازل ہونے والے فرشتوں کے عمامے سفید اور غزوۂ حنین میں مدد کے لیے آنے والے فرشتوں کے عمامے سرخ تھے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا "وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" اس میں مسلمانوں کو تنبیہ فرما دی کہ جو مدد بھی کہیں سے ملتی ہے خواہ ظاہری صورت سے ہو یا مخفی انداز سے سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اسی کے قبضہ میں ہے، فرشتوں کی مدد بھی اسی کے تابع فرمان ہے اس لیے تمہاری نظر صرف اسی ذات "وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ" کی طرف رہنی چاہئے کیونکہ وہ بڑا قدرت والا اور حکمت والا ہے۔

إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ

جب تسکین دینے کے لیے اللہ اپنی طرف سے تم پر اونگھ طاری فرما رہا تھا اور نازل فرما رہا تھا

عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ

تم پر آسمان سے پانی تاکہ تمہیں پاک کردے اور دور فرما دے

عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ

تم سے شیطان کے وسوسے کو اور تاکہ تمہارے دلوں کو مضبوط کردے اور جما دے

بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿١١﴾ إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا

اس کے ذریعہ قدموں کو ﴿١١﴾ جب کہ آپ کا رب فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ بلاشبہ میں تمہارے ساتھ ہوں سو تم جماؤ

الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ

ایمان والوں کو میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا،

فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿١٢﴾

سو تم گردنوں پر مارو اور ان کے ہر پورے پر مارو ﴿١٢﴾

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَن يُشَاقِقِ اللَّهَ

یہ اس وجہ سے کہ بلاشبہ انہوں نے اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کی، اور جو شخص مخالفت کرے اللہ

وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١٣﴾ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ

اور اس کے رسول کی پس اللہ سخت سزا دینے والا ہے ﴿١٣﴾ پس یہ سزا تم چکھو اور بلاشبہ

لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ﴿١٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ

کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ﴿١٤﴾ اے ایمان والو! جب تم دوبدو مقابل ہوجاؤ

الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ﴿١٥﴾ وَمَن يُوَلِّهِمْ

کافروں سے تو ان سے پیٹھ مت پھیرو ﴿١٥﴾ اور جو شخص پھیرے گا

يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ

اس دن اپنی پشت بجز اس شخص کے جو لڑائی کے لیے رخ بدلنے والا ہو یا اپنی جماعت کی طرف پناہ لینے والا ہو سو وہ

بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾

لوٹا اللہ کے غصہ کو لے کر اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے ﴿۱۶﴾

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ

اور تم نے انہیں قتل نہیں کیا اور لیکن اللہ نے انہیں قتل کیا، اور آپ نے نہیں پھینکا جب آپ نے پھینکا

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ

لیکن اللہ نے پھینکا اور تا کہ اللہ مؤمنین کو اپنی طرف سے اچھا انعام دے، بے شک

اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے ﴿۱۷﴾ یہ بات ہے اور بلاشبہ اللہ کافروں کی تدبیر کو کمزور کرنے والا ہے ﴿۱۸﴾

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ

اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو فیصلہ تمہارے سامنے آچکا ہے، اور اگر تم باز آجاؤ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے،

وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ

اور اگر تم پھر وہی کام کرو گے تو ہم بھی وہی کام کریں گے، اور تمہاری جماعت ہرگز تمہارے کچھ کام نہ آئے گی، اگرچہ کثیر تعداد میں ہو،

وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ ع

اور بلاشبہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۹﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

سورۂ انفال کے شروع سے اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کا بیان ہو رہا ہے جو اس کے فرمانبردار بندوں پر مبذول ہوئے، غزوۂ بدر کے واقعات بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، غزوۂ بدر میں جو انعامات حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے، ان میں سے پہلا انعام تو خود اس جہاد کے لیے مسلمانوں کو نکالنا ہے جس کا بیان آیت "کَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ" میں ہوا ہے، دوسرا انعام فرشتوں کی مدد کا وعدہ ہے جس کا ذکر آیت "اِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ" میں آیا ہے، تیسرا انعام دعا کی قبولیت اور مدد کا وعدہ پورا کرنا ہے جس کا ذکر آیت "اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ" میں ہوا ہے، مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں چوتھے انعام کا تذکرہ ہے جس میں مسلمانوں کے لیے دو نعمتوں کا ذکر ہے ایک سب پر نیند غالب آ کر پریشانی اور تھکان کا دور ہو جانا دوسرا بارش کے ذریعہ ان کے لیے پانی مہیا فرمانا اور میدانِ جنگ کو ان کے لیے ہموار اور دشمن کے لیے دلدل بنا دینا۔

میدان بدر میں مسلمانوں پر نیند طاری ہونا:

تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے کہ جس وقت کفر و اسلام کا یہ پہلا معرکہ ٹھن گیا تو کفارِ مکہ کا لشکر پہلے پہنچ کر ایک ایسے مقام پر پڑاؤ ڈال چکا تھا جو اونچائی پر تھا، پانی اس کے قریب تھا، آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس جگہ پہنچے تو وادی کے نچلے حصہ میں جگہ ملی، قرآن کریم نے اس میدانِ جنگ کا نقشہ اسی سورۃ کی بیالیسویں آیت میں اس طرح کھینچا ہے "اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی" جس کا مفصل بیان بعد میں آئے گا۔

جس جگہ پہنچ کر رسول کریم ﷺ نے اول قیام فرمایا، اس مقام کے واقف کار حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے اس کو جنگی اعتبار سے نامناسب سمجھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جو مقام آپ نے اختیار فرمایا ہے کیا یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے جس میں ہمیں کوئی اختیار نہیں یا محض رائے اور مصلحت کے پیشِ نظر اختیار فرمایا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں یہ کوئی حکمِ خداوندی نہیں، اس میں تغیر تبدل کیا جا سکتا ہے، تب حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ پھر تو بہتر ہے کہ اس مقام سے آگے بڑھ کر مکی سرداروں کے لشکر کے قریب ایک پانی کا مقام ہے اس پر قبضہ کیا جائے وہاں ہمیں پانی افراط کے ساتھ مل جائے گا، آنحضرت ﷺ نے ان کا مشورہ قبول فرمایا

اور وہاں جا کر پانی پر قبضہ کیا ایک حوض پانی کے لیے بنا کر اس میں پانی کا ذخیرہ جمع فرمایا۔

اس سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارا خیال یہ ہے کہ ہم آپ کے لیے ایک سایہ بان کسی محفوظ جگہ میں بنا دیں جہاں آپ مقیم رہیں اور آپ کی سواریاں بھی آپ کے پاس رہیں۔

منشاء اس کا یہ ہے کہ ہم دشمن کے مقابلہ میں جہاد کریں گے اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح نصیب فرمائی تو یہی مقصد ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی دوسری صورت ہو تو آپ اپنی سواری پر سوار ہو کر ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جا ملیں جو مدینہ طیبہ میں رہ گئے کیونکہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جاں نثاری اور آپ سے محبت میں ہم سے کم نہیں اور اگر ان کو آپ کے نکلنے کے وقت یہ خیال ہوتا کہ آپ کا اس مسلح لشکر سے مقابلہ ہوگا تو ان میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہتا، آپ مدینہ میں پہنچ جائیں گے تو وہ آپ کے رفیق کار رہیں گے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس جانبازانہ پیش کش پر دعائیں دیں، اور ایک مختصر سا سایہ بان آپ کے لیے بنا دیا گیا اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی نہ تھا، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ دروازہ پر حفاظت کے لیے تلوار لیے کھڑے تھے۔

معرکہ کی پہلی رات تھی، تین سو تیرہ بے سامان لوگوں کا مقابلہ اپنے سے تین گنی تعداد یعنی ایک ہزار مسلح فوج سے تھا، میدانِ جنگ کا بھی اچھا مقام ان کے قبضہ میں آچکا تھا، نچلا حصہ وہ بھی سخت ریتیلا تھا جس میں چلنا دشوار مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا، طبعی پریشانی اور فکر سب کو تھی۔

تو صورتحال یہ ہے جو آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہے کہ ظاہری اسباب سارے کے سارے خلاف ہیں اور ایسے وقت میں کسی کو نیند نہیں آسکتی اور جب رات کو نیند نہ آئے اگر کوئی شخص سویا نہ ہو اور پریشانی میں سارا وقت گزر جائے تو صبح اتنے بڑے لشکر کے ساتھ لڑائی کیسے ہوگی، اعصاب ڈھیلے ہو جائیں گے، ذہن کام ہی نہیں کرے گا انسان قدم رکھے گا کہیں اور پڑے گا کہیں، کہنا کچھ چاہے گا منہ سے نکلے گا کچھ، ایک بدحواسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اگر انسان کو نیند نہ آئے اور پریشانی کے اندر ساری رات گزری ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہوا کہ جب ان حالات میں یہ لوگ رات کو بدر کے اندر ٹھہرے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی فوج کے اوپر اطمینان، امن اور سکون اتارا اور سب کو نیند آگئی اور سکون کے ساتھ سو گئے۔

اس رات میں سارے لوگوں کو نیند آئی سوائے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے، یہ

حضرات ساری رات اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے، اور آپ جانتے ہیں کہ قائد جو ہوتا ہے عام حالات میں بھی اس کا حوصلہ، اس کی بیداری اور اس کی تدبیر ساری قوم کی جان ہوتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ربط اگر قائد کا مضبوط ہے اور قوم پیچھے چلنے والی ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت شامل حال ہوتی ہے تو قوم نے لڑنا تھا عملاً اس لیے ان کو تو سلا دیا اور سرورِ کائنات ﷺ کی معرفت اللہ تعالیٰ کی امداد آنی تھی وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلائے بیٹھے رہے، انہوں نے رات اس طرح سے گزار دی۔

تو یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہوا کہ اس میدان کے اندر مسلمانوں کی فوج کے اوپر اللہ تعالیٰ نے نیند طاری کر دی "نعاس" اگرچہ ہلکی سی نیند کو کہتے ہیں جس کو آپ اونگھ کہتے ہیں لیکن یہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسے حالات میں اونگھ ہی آیا کرتی ہے، اگر اونگھ آ جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے باقی میدانِ جنگ کے اندر غفلت کی نیند سو جانا کہ ہوش ہی نہ ہو کہ آپ کہاں پڑے ہیں یہ حالات کا تقاضا نہیں ہوتا اتنی سی نیند اللہ تعالیٰ نے ڈال دی کہ اگر ہوشیار ہونا پڑے تو جلدی سے ہوشیار بھی ہو جائیں اور دماغ کی تھکاوٹ بھی اتر گئی اور اعصاب بھی سکون پکڑ گئے ایک تو یہ اللہ تعالیٰ نے انعام کیا جس کے ساتھ مسلمانوں کی یہ فوج تازہ دم ہو گئی نیند آنے کے ساتھ پریشانیاں بھی ختم ہو گئیں اور تھکاوٹ بھی دور ہو گئی۔

میدانِ بدر میں بارش کا ہونا:

اور دوسرا انعام یہ ہوا کہ پھر رات کو زوردار بارش آ گئی جب زوردار بارش آ گئی تو اس سے میدان جنگ کا نقشہ بالکل پلٹ گیا کہ جدھر کفار ٹھہرے ہوئے تھے انہوں نے مضبوط سی جگہ دیکھ کے جس میں ریت زیادہ نہیں تھی وہ جگہ انہوں نے اپنے لیے تجویز کی تھی اور بارش کے آنے کا اثر یہ ہوا کہ وہاں دلدل ہو گیا اور کیچڑ ہو گیا، گارا ہو گیا جس میں چلنا پھرنا مشکل ہو گیا اور جو جگہ مسلمانوں کے حصہ میں آئی تھی وہ ریتلی تھی اور ریت والی جگہ پر بارش ہو جائے تو وہ جم جاتی ہے وہاں چلنا پھرنا آسان ہو گیا اور بارش کی وجہ سے گڑھوں کے اندر پانی جمع ہو گیا، جس وقت پانی جمع ہو گیا تو وضو کی، غسل کی اور ہر چیز کی سہولت مہیا ہو گئی، اپنے پینے کے لیے بھی مل گیا، جانوروں کے پینے کے لیے بھی مل گیا۔

اور دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کی معرفت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بشارتیں آئیں تو اس کے ساتھ دل اور مضبوط ہو گیا اب یہ باطنی طور پر اس قسم کے اسباب مہیا ہونے لگ گئے کہ جس سے کفار کے حوصلے پست

ہونے شروع ہو گئے اور مسلمانوں کے حوصلے بڑھنے شروع ہو گئے اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے ان انعامات کا ذکر کیا ہے۔

فرشتے آج بھی مدد کے لیے اتر سکتے ہیں:

"اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً" اس کا ترجمہ یہ جو کیا جاتا ہے کہ "یاد کیجئے اس وقت کو" اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد اس وقت کس طرح آئی تھی اور یاد رکھو گے تو پھر فائدہ کیا ہوگا کہ آئندہ کے لیے بھی اس قسم کے حالات پیدا ہو جائیں گے چاہے اس وقت نبی ساتھ نہ ہو جو قطعی طور پر تمہیں اطلاع دے دے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ ہو گیا لیکن ان واقعات کو اگر یاد رکھو گے تو ان واقعات کو یاد رکھنے کے ساتھ اللہ کی نصرت پہ اعتماد ہوگا اور آئندہ بھی تمہارے دل مضبوط رہیں گے، اس مضمون کو کسی اردو شاعر نے ان الفاظ میں بند کیا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں قطار اندر قطار اب بھی

اللہ تعالیٰ کی نصرت صرف یہی نہیں کہ اسی میدان کے ساتھ خاص تھی، نہیں بلکہ فضائے بدر پیدا کر، جب حق اور باطل کھل کر سامنے آجائے تو حق کی حمایت میں اہل حق کھڑے ہو جائیں اور اپنی وسعت کے مطابق ہر قسم کے اسباب مہیا کر لیں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیں کہ یا اللہ! ہم سے تو یہ ہو سکتا تھا ہم نے کر لیا اب تو ہماری مدد کر، جتنی جانبازی کر سکتے تھے کر لی، اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں چھوڑی تو اللہ کی نصرت آج بھی آسکتی ہے۔

"یاد رکھنے کے قابل ہے یہ وقت" میں اس کا مفہوم ان الفاظ میں ادا کرتا ہوں اس وقت کو یاد رکھو، یاد کرو اس وقت کو جبکہ اللہ تعالیٰ نے طاری کر دی تم پر نیند، "اَمَنَةً مِّنْهُ" اپنی طرف سے اطمینان کے طور پر "وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً" اور اللہ اتارتا تھا تم پر آسمان سے پانی، آسمان سے پانی اتار دیا، اب آسمان سے پانی اتار لینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے، نہر سے بھر لاؤ، دریا سے بھر لاؤ یہ تو ظاہری اسباب کے تحت ہوتا ہے لیکن آسمان سے پانی اترنا بالکل اسباب کے خلاف ہے اور یہ بالکل اللہ کے اختیار سے ہے، کسی بندے کے اختیار سے نہیں ہے یعنی دنیا میں ظاہری طور پر جو پانی لینے کے اسباب تھے وہ تو سارے کے سارے کفار کے قبضے میں آگئے، اب

تمہارے بس میں نہیں تھا کہ تم پانی حاصل کرلو، اللہ تعالیٰ نے براہِ راست آسمان سے اتار دیا، اس کی قدرت سے کیا چیز بعید ہے۔

آسمان سے پانی اتارنے کا مقصد:

پانی کیوں اتارا تھا؟ "لِيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ" تا کہ اس کے ذریعے سے تمہیں صاف ستھرا کرے کیونکہ ایمان کے تقاضوں میں سے ایک تقاضہ ہے کہ انسان صاف ستھرا رہے، صاف ستھرا رہنے میں استنجا کرنا ہے، وضو کرنا ہے، غسل کی ضرورت پیش آجائے تو غسل کرنا ہے یہ سب ظاہری اور باطنی طہارتیں ہیں "وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ" اور تا کہ اللہ تعالیٰ تم سے شیطان کی پلیدی دور کردے، شیطان کی پلیدی سے وہی شیطان کے وسوسے مراد ہیں کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جتنا انسان ظاہری طور پر نجس یا ناپاک ہوتا اتنا ہی شیطان کا تسلط اور شیطان کے وسوسے زیادہ آتے ہیں، اور جتنا انسان طہارت کے ساتھ رہے گا اتنا شیطان کے وسوسوں سے بچتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ شیطان جو دل میں وسوسے ڈال رہا تھا کہ یہاں تو پیاسے مروگے، پانی نہیں ملے گا، کیا کروگے اس طرح دلوں میں وسوسے ڈال ڈال کے پریشان کررہا تھا، اب کیا وسوسہ ڈالے گا جبکہ پانی گڑھوں کے اندر بھر گیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بارش ہونے کے ساتھ پانی کی فراوانی ہوگئی شیطان کے یہ سارے کے سارے وسوسے ختم ہوگئے۔

اور تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو مضبوط کردے، یہ نیند کا اثر بھی تھا کہ نیند کے اثر سے دل مضبوط ہوگئے اور جب یہ واقعات سامنے آئیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت کس طرح سے آرہی ہے تو اس سے بھی تو دل مضبوط ہوتا ہے، اور تا کہ تمہارے قدم جمادے، اس کا تعلق بھی دونوں کے ساتھ ہوسکتا ہے کہ تمہیں سلا اس لیے دیا تا کہ صبح ڈٹ کے لڑو اور اگر یہ نیند نہ آتی اور پریشانیاں ہوتیں تو ڈٹ کے مقابلہ کیسے کرتے، یہ تو باطنی تثبیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اسباب مہیا کرکے تمہارے دلوں کو پختہ کردیا اور ایک ظاہری مدد بھی ہے کہ تمہارے پاؤں ریت میں دھنستے پھرتے تھے، ریت میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں تھی تو بارش آکے ریت جو جم گئی تو قدم جم گئے، یہ بات بھی ہوگئی۔

غزوۂ بدر میں فرشتوں کی ڈیوٹی:

"وَاِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ" اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب تیرا رب حکم بھیجتا تھا فرشتوں کی طرف، اب یہ فرشتوں کی فوج چونکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی کمان میں تھی جس طرح ظاہری فوج ظاہری

کمانڈر کے ماتحت ہوتی ہے اور وہ انہیں احکام دیتا ہے اور احکام کے تحت اس کو لڑاتا ہے تو فرشتوں کی فوج براہِ راست اللہ تعالیٰ کی کمان میں تھی اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو احکام مل رہے ہیں، یہ جو میدان میں اترے تھے جن کا ذکر پچھلے رکوع میں آیا تھا کہ ایک ہزار اللہ نے اتار دیے، حکم بھیجتا تھا تیرا رب فرشتوں کی طرف "اَنِّیْ مَعَکُمْ" کہ میں تمہارے ساتھ ہوں "فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" تم مضبوط رکھو مؤمنوں کو یعنی تمہارا فرض یہ ہے کہ تم مؤمنوں کے قلب کو قوت پہنچاؤ کیونکہ لڑنا تو ظاہری طور پر مؤمنوں نے ہے اور اللہ تعالیٰ کی امداد جو ظاہر ہوتی ہے تو وہ ظاہری اسباب کے پردے میں ہی ظاہر ہوتی ہے، تو یہ فرشتے دلوں کو مضبوط رکھیں گے، مؤمنوں کے دل تو مضبوط ہو جائیں گے فرشتوں کی دعا کے ساتھ، فرشتوں کی توجہ کے ساتھ اور فرشتوں کی رفاقت کے ساتھ۔

یہ ہمیشہ قاعدہ ہوتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت دو کا آپس میں مقابلہ ہو، ایک آدمی تو ایسا ہو جس کو شاباش شاباش کرنے والے بہت ہوں اور ایک آدمی ایسا ہو کہ اس کو زندہ باد کہنے والا کوئی نہ ہو تو دونوں کی قوت میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے، یعنی دو بچوں کی کشتی کرا دو، ایک بچہ کی حوصلہ افزائی کرنے والے بہت سارے ہوں تو اس کی ہمت بڑھتی ہے کیونکہ اصل میں جو لڑنا بھڑنا ہے وہ سارے کا سارا دل کی قوت سے ہے، تو دل کی قوت اگر ہو تو انسان کی قوت بلند ہوتی ہے اور حوصلہ بڑھ جاتا ہے، اور اگر دل میں قوت نہیں ہے تو حوصلہ پست ہو جاتا ہے تو یہ ظاہری تھپکانا اور شاباش دینا، حوصلہ بڑھانا یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔

اب مؤمنوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے تو فرشتے آگئے اور کافر جن پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے، جن سے مددیں مانگ کے آئے تھے وہ کیا کرتے؟ ان میں تو کوئی ہمت اور طاقت نہیں ہے کہ کسی کو مدد دے سکیں اس لیے ان کے دل ٹوٹ گئے، ان کے دل کو قوت نہیں ہے یعنی مشرک کا سہارا چونکہ ظاہری معبودوں پہ ہوتا ہے جو خود بے طاقت ہیں اس لیے جب اس قسم کا موقع آتا ہے تو مشرک دل چھوڑ دیتا ہے، اس کے دل میں قوت نہیں ہوتی، مؤمن کے دل میں قوت ہوتی ہے۔

مشرکوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دو:

اس کے نتیجہ میں مشرکوں پر رعب پڑا اور جس وقت رعب پڑتا ہے تو حوصلہ ختم ہو جاتا ہے اور جب حوصلہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر چاہے کتنا ہی اسلحہ کسی فوج کے پاس کیوں نہ ہو، جب فوجیوں کے دل ٹوٹ گئے تو وہی اسلحہ دشمن کے لیے چھوڑ کے سارے بھاگ جاتے ہیں اور وہ اسلحہ الٹا دشمن کے کام آتا ہے، جس وقت کسی فوج کے میدان سے قدم

اکھڑ جائیں اور وہ حوصلہ چھوڑ دے تو اسلحہ کسی کام نہیں آتا، بے جان چیز خود نہیں لڑسکتی، لڑنا ہوتا ہے جانداروں نے، انسانوں نے اور انسان دل کی مضبوطی اور حوصلے سے لڑتے ہیں اور اگر یہ دل ہی اندر سے ہل گیا، جب دل ہی اندر سے ہل گیا تو قدم نہیں ٹک سکتے، اور اسلحہ سارے کا سارا میدان میں پڑا رہ جائے گا اور فوج بھاگ جاتی ہے۔

یہاں بھی وہی صورت پیش آئی کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو کہتا تھا کہ تم نے تو مؤمنوں کو مضبوط رکھنا ہے یہ تو مؤمنین کی حوصلہ افزائی ہے اور میں عنقریب ڈال دوں گا کافروں کے دلوں کے اندر رعب، جب ان پہ رعب پڑ جائے گا، وہ مرعوب ہو جائیں گے تو حوصلہ چھوٹ جائے گا اور ہاتھ پاؤں کام ہی نہیں دیں گے، جب ہاتھ پاؤں کام ہی نہیں دیں گے تو پھر حال یہ ہے کہ مارو ان کی گردنوں پر اور مارو ان کے ہر پور کو یعنی اس طرح تمہارے بس میں آجائیں گے کہ تمہاری مرضی ان کی گردنیں کاٹو، تمہاری مرضی ان کی پشتوں پہ مارو، پھر ہر طرح سے تمہارے بس میں ہوں گے اور یہی حال ہوا یعنی ہر ہر جگہ مارو جہاں تمہارا جی چاہے، ان کے گھٹنے توڑو، ان کے ٹخنے توڑو، ان کی گردنوں پہ مارو، ان کے کندھے اتار دو، ان کے بدن کا ہر ہر حصہ تمہارے قابو میں ہوگا، اور ایسے ہی ہوا کہ جس وقت اندر سے ان کے دل ٹوٹے پھر جس طرح پٹائی ہو سکتی تھی اسی طرح پٹائی ہوئی، یہ بڑے بڑے جو مسلح ہو کے آئے ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دو، ان کے بدن کا کوئی حصہ نہ بچے، ہر ہر حصہ پہ مارو، ہر ہر جوڑ پر مارو۔

مشرکوں کی رسوائی کی وجہ:

اور یہ ان کی رسوائی کیوں ہوئی؟ اتنی تعداد اور اتنے سامان کے باوجود یہ کیوں پٹ گئے؟ اس لیے پٹ گئے کہ یہ اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلہ میں آگئے اور انسان کے اندر فطری طور پر اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑنے کا کوئی جواز نہیں ہے اس لیے اس لڑائی کی بنیاد بہت کمزور ہے، جب لڑائی کی بنیاد کمزور ہے تو کس حوصلہ سے لڑسکتے ہیں، یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے مخالفت کی اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اور جو کوئی اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتا ہے "اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ" پھر وہ یونہی مار کھاتا ہے جس طرح یہ مار کھا رہے ہیں، پس بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا والا ہے۔

آگے کافروں کو یہ تنبیہ ہے "ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ" تم اس کا مزہ چکھ لو جو تمہارے سامنے آگیا اور یہ بات یاد رکھ لو کہ جہنم کا عذاب آگے کھڑا ہے، یہ نہیں کہ صرف دنیا میں تمہاری رسوائی یا پٹائی ہوئی ہے آخرت کا عذاب بھی ہوگا "وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ" کافروں کے لیے جہنم کا عذاب ہے "ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ" کا معنی یہ ہے کہ یہ نقد لے

لو، اس کا مزہ تو ابھی چکھ لو، یہ تو تمہارے سامنے آ گیا اس کا تو مشاہدہ کر لو اور اگلے کی خبر سن لو کہ جہنم کا عذاب کافروں کے لیے ہے۔

گوریلا جنگ اور میدانی جنگ:

اب آگے اہل ایمان کو جنگی طور پر کچھ ہدایات دی جا رہی ہیں، اصل میں جنگ کرنے کے اس وقت بھی دو اصول تھے، ایک ہے جس کو آج کی اصطلاح میں ''گوریلا جنگ'' کہتے ہیں، اردو کے اندر جس کو چھاپہ مار جنگ کہتے ہیں، گوریلا جنگ اور چھاپہ مار جنگ دونوں کا ایک ہی مطلب ہے، یہ کوئی باقاعدہ لڑائی نہیں ہوتی بس دو دو چار چار آدمی مختلف گروہوں کی شکل میں چھپے رہتے ہیں، جنگلات میں چھپ جاتے ہیں، غاروں میں چھپ جاتے ہیں، گھاٹیوں میں چھپ جاتے ہیں اور جہاں دشمن کو نقصان پہنچانے کا موقع ملا بس یکدم حملہ کر کے نقصان پہنچایا اور بھاگ گئے اور جا کے پھر اپنی کمین گاہوں میں چھپ گئے، یہ گوریلا جنگ ہے اور یہ جنگ اس وقت بھی تھی اور آج بھی جاری ہے، جس کو چھاپہ مار جنگ کہتے ہیں کہ چھاپہ مارا، دشمن کو نقصان پہنچایا اور بھاگ گئے اور جا کے چھپ گئے اس جنگ میں میدان کے اندر ڈٹ کے لڑنا نہیں ہوتا، یہ کوئی باقاعدہ فوجوں کی لڑائی نہیں ہوتی، اس میں تو بس موقع تلاش کر کے انسان نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، نقصان پہنچایا اور بھاگ گئے، ان آیات میں جو ہدایات ہیں یہ ہدایات اس گوریلا جنگ کے متعلق نہیں ہیں۔

اور ایک ہوتی ہے فوجوں کی باقاعدہ آمنے سامنے لڑائی کہ دشمن بھی اپنی فوجیں لے آیا اور ادھر سے بھی فوجیں آ گئیں، صف بندی ہو گئی، یہ ہے میدان کے اندر لڑائی، یہ ہوتی ہے کسی آئین اور قانون کے تحت جس کی پابندی دشمن بھی کرتا ہے اور اس کی پابندی اپنے آپ کو بھی کرنی پڑتی ہے، یہ ہدایات اس میدانی جنگ کے متعلق دی جا رہی ہیں اس لیے یہاں ''زَحْفاً'' کا لفظ ہے مطلقاً لڑائی کی یہ بات نہیں کہ میدان سے بھاگا نہ کرو، چھاپہ مار جنگ کا تو اصول یہی ہے کہ بم پھینکو اور بھاگ جاؤ اور جہاں موقع ملا آگ لگاؤ اور بھاگ جاؤ اس میں صرف اس طریقہ سے چھپ چھپا کے دشمن کو نقصان پہنچانا مقصود ہوتا ہے، کارروائی کی اور دوڑ گئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں یہ جنگ بھی تھی اور آج بھی ہیں بلکہ لمبی جنگیں چھاپہ مار جنگوں سے ہی جیتی جاتی ہیں جیسے آج کل آپ سنتے ہیں کہ مجاہدین افغانستان چھاپہ مار جنگ لڑ رہے ہیں اور برسہا برس تک ویت نام کے اندر لوگوں نے چھاپہ مار جنگ لڑی اور فلسطینی کتنے ہی سالوں سے چھاپہ مار جنگیں لڑ رہے ہیں کیونکہ آمنے سامنے کی میدان کی جو لڑائی

ہوتی ہے اس کا فیصلہ چند دنوں اور چند ہفتوں میں ہوسکتا ہے کہ ایک فوج تباہ ہوگئی اور دوسری فوج غالب آگئی کہ میدان اس فوج نے مارلیا۔

جبکہ چھاپہ مار جنگ میں تو سارا ملک ہی میدانِ جنگ ہے، کچھ پتہ ہی نہیں ہے کہ کدھر سے آکر کس نے آگ لگادینی ہے، کدھر سے کس نے آکے گولی چلادینی ہے، کدھر سے آکے کس نے بم پھینک جانا ہے، یہاں کوئی میدان نہیں ہوتا جس کو کہیں کہ اس فوج نے میدان مارلیا ہے یا اس میدان سے فلاں فوج بھاگ گئی، طویل جنگیں ہمیشہ چھاپہ مار اصول سے چلتی ہیں مظلوم قومیں جن کے اوپر زیادہ طاقت ور قوم مسلط ہوجاتی ہے جن کا وہ سامنے کھڑے ہوکر مقابلہ نہیں کرسکتے تو ان کے ساتھ جنگ اس دور میں بھی چھاپہ مار ہی لڑی جاتی ہے جس کو گوریلا واریا گوریلا جنگ کہتے ہیں، فلسطین میں یہی ہورہا ہے، افغانستان میں بھی ہورہا ہے اور اسی طرح دوسرے بعض ممالک جہاں کوئی قوت زیادہ مسلط ہے تو کمزور قسم کے لوگ چھاپہ مار جنگ کے اصول سے ہی نقصان پہنچاتے ہیں تو یہ ہدایات اس جنگ کے متعلق نہیں ہیں۔

میدان جنگ میں پیٹھ پھیرنا کبیرہ گناہ ہے:

وہ ہدایات یہ ہیں کہ جب لشکر ایک دوسرے کے بالمقابل آجائیں اور دوبدو لڑائی ہو اس وقت مؤمنوں سے کہا جارہا ہے کہ دیکھو! اللہ تمہارے ساتھ، فرشتے تمہارے ساتھ، ایسے وقت میں اگر تم پیٹھ پھیر کے بھاگ جاؤ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن کا حوصلہ بلند ہوجائے گا اور تم نے نہ اللہ کی نصرت کی رعایت رکھی اور نہ فرشتوں کی معیت کی رعایت رکھی اس لیے اس میدان سے بھاگنا جبکہ آمنے سامنے لڑائی ہو یہ اللہ سے بھی فرار ہے اور اللہ کے فرشتوں سے بھی فرار ہے اور اللہ کی نصرت سے بھی فرار ہے پھر سوائے اس کے کہ تمہارے حصہ میں اللہ کا غضب آئے اور جہنم آئے اور کوئی چیز نہیں ہے۔

مشکوٰۃ شریف، باب الکبائر کے اندر آپ نے پڑھا ہوگا کہ جہاں سرور کائنات ﷺ نے بڑے بڑے گناہ بیان فرمائے ہیں ان کے اندر میدانِ جہاد سے بھاگنا بھی کبائر کے اندر شمار کیا گیا ہے، میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیر کے بھاگ جانا یہ کبیرہ گناہ ہے تو جس طرح کبیرہ گناہ پہ اللہ کی لعنت ہوتی ہے، اللہ کا غضب ہوتا ہے، اس کے اوپر جہنم کی وعید ہے اسی طرح یہاں بھی میدانِ جنگ سے بھاگنے والے کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

لیکن ایسے واقعات ہوجایا کرتے ہیں کہ ظاہری صورت میں تو پیٹھ پھیری ہے لیکن حقیقت میں میدان سے

بھاگنا مقصود نہیں ہوتا، یا کوئی جنگ کا کرتب اور ہنر ہے پینترا بدلنا ہے ان جنگی اصولوں کے طور پر اگر میدان سے پیچھے ہٹنا پڑے اور پیٹھ پھیرنی پڑے تو یہ اس میں داخل نہیں ہے، اس کی تمہیں اجازت ہے، یہ نہیں کہ کوئی صورت پیش آجائے تم نے دشمن سے منہ موڑنا ہی نہیں ہے اور دشمن کی طرف پشت کرنی ہی نہیں ہے ایسی بات نہیں ہے، جنگی حربہ، جنگی قانون اور جنگی ہنر کے طور پر اگر اس قسم کی بات پیش آجائے تو اس کی اجازت ہے، اے ایمان والو! جس وقت ٹکر ہو جائے تمہاری کافروں کے ساتھ اس حال میں کہ تم ایک دوسرے کے سامنے ہو لشکر کی صورت میں (یہ زحفاً کا مفہوم ہے) تو ان کی طرف پیٹھ نہ پھیرا کرو، جو کوئی ان کی طرف اس دن پیٹھ پھیرے گا سوائے اس شخص کے جو کہ جنگ کے لیے کوئی کرتب اختیار کرنے والا ہے یا اپنی جماعت کی طرف ٹھکانہ لینے والا ہے اس شخص کے علاوہ جو بھی پیٹھ پھیرے گا پس وہ لوٹے گا اللہ کے غضب کے ساتھ اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

دوگنا قوت والے دشمن کا مقابلہ فرض ہے:

سورۃ انفال ہی میں آگے جا کے تفصیل آئے گی کہ پہلے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حکم تھا کہ دس گنا قوت کے مقابلہ میں بھی ڈٹ جاؤ اور اس سے تمہیں ہٹنے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ آئے گا کہ اگر تم میں سے بیس بھی صبر کرنے والے ہوں گے تو وہ دوسو پہ غالب آئیں گے اب بیس اور دوسو کا تناسب دس گنا ہے اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں تو ہزار پہ غلبہ پائیں گے وہ بھی ایک اور دس کی نسبت ہے لیکن اس کے بعد پھر اس کے اوپر نسخ آیا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے تخفیف کر دی کہ ایک اور دو کی نسبت کر دی کہ اگر دشمن کی طاقت دوگنا ہو تو میدان سے ہٹنے کی اجازت نہیں ہے اور اگر اس سے بھی زیادہ قوت آجائے تو پھر ایسی صورت میں انسان اگر میدان چھوڑ کے پیچھے ہٹے تاکہ کسی دوسرے موقع پر مقابلہ کیا جائے اور اس وقت نقصان سے بچا جائے تو پھر اس کی اجازت ہے ایک اور دو کی نسبت اگر ہو تو آج بھی مسلمان کو میدان چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، دگنی قوت کے ساتھ ٹکرانا یہ مسلمان کا ادنیٰ کرشمہ ہے اور اگر اس سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ ٹکراؤ تو پھر آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جنگوں کا مطالعہ کر کے دیکھیے تو پتہ چلے گا کہ ساٹھ ساٹھ آدمیوں نے ساٹھ ساٹھ ہزار آدمیوں کا مقابلہ کیا ہے، یہ علیحدہ بات ہے ورنہ اجازت دے دی گئی کہ دوگنی قوت کے مقابلہ میں میدان نہیں چھوڑنا اس سے زیادہ قوت کے مقابلہ میں اگر کوئی میدان چھوڑے تو اس کی اجازت ہے، یہ تفصیل اسی سورۃ میں آپ کے سامنے آئے گی۔

جنگ بدر میں اللہ کی نصرت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ:

اب بدر میں لڑائی کا نتیجہ ظاہر ہوا کہ ستر مشرک قتل ہو گئے اور ستر گرفتار ہو گئے کہ قتل ہونے سے بھی جن کی ذلت زیادہ تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے صرف تیرہ اس میدان میں شہید ہوئے ہیں، ایک زخمی ہوا ہے جو واپس مدینہ منورہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں فوت ہو گیا تھا تو گویا کہ کل چودہ شہید ہوئے ہیں اور جس وقت یہ لڑائی ہو رہی تھی اس وقت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کی ایک مٹھی اٹھائی اور "شَاهَتِ الْوُجُوْهُ، شَاهَتِ الْوُجُوْهُ" کہہ کر مشرکین کی طرف پھینکی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ وہ کافروں کی آنکھوں میں اس طرح جا کے پڑ گئی کہ جیسے سخت آندھی آئے اور آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے کہ انسان کو نظر نہیں آتا کہ آگے کیا چیز ہے تو ایک مٹی کی مٹھی اس طرح سب کافروں کی آنکھوں کو خراب کر گئی، ہر کوئی اپنی آنکھوں کی طرف متوجہ ہو گیا اور آپ جانتے ہیں کہ میدان جنگ میں تو ایک ایک لمحہ سے فرق پڑ جاتا ہے، جب ایک آدمی کی آنکھوں میں خاک ڈال دی گئی اور اس طرح سے اس کے اوپر مٹی ڈال دی گئی تو اس کی آنکھیں ہی جس وقت بے کار ہو جائیں گی تو وہ آگے کیا کرے گا تو ایک مٹھی نے ہی جنگ کا نقشہ پلٹ کے رکھ دیا۔

اب ظاہری اسباب میں اگر دیکھا جائے تو کوئی صورت نہیں تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ چند تلواریں جو کہ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں اور کوئی بھی اسلحہ ساتھ نہیں تھا عقل کے ساتھ سوچو گے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی اور ایک مٹی کی مٹھی سارے لشکر کو اندھا کر دے ظاہری طور پر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو یہ نہ سمجھو کہ یہ تمہارا کمال تھا یہ ہماری نصرت اور مدد تھی، باطنی ہاتھ تو ہمارا تھا جس نے یہ سارے کا سارا کام کیا، اس لیے یہاں جو نفی کی جا رہی ہے یہ نتیجہ کے اعتبار سے ہے، "فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ" تم نے انہیں قتل نہیں کیا، حالانکہ ظاہری طور پر تلوار تو انہی کی چلی تھی لیکن چونکہ بالکل اسباب ظاہری کے خلاف نتائج ظاہر ہوئے اس لیے نتیجہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس فعل کی نفی کی جا رہی ہے کہ ظاہری اسباب کو دیکھو جو نتیجہ سامنے آیا ہے یہ کام تم نے نہیں کیا یہ براہِ راست اللہ نے کیا ہے "فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ" تم نے انہیں قتل نہیں کیا "وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ" لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کر دیا کیونکہ جو نتیجہ ظاہری اسباب کے خلاف سامنے آیا کرتا ہے اس کی نسبت براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی جاتی ہے اور ایسے ہی یہاں ہے۔

دیکھو! "اِذْ رَمَیْتَ" میں رمی کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی گئی ہے جبکہ تو نے پھینکا تھا، جبکہ مٹی تو نے پھینکی تھی یہ ابتدائے فعل کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے، پھینکنے کا اثبات ہے لیکن "مَارَمَیْتَ" وہ تو نے نہیں پھینکی تھی، نتیجہ کے اعتبار سے نفی ہے یعنی ابتدائے فعل اگرچہ آپ کے ہاتھ سے ہوا، پھینکی آپ نے ہے لیکن اس کے نتائج کی طرف دیکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ آپ نے نہیں پھینکی "وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی" اللہ نے پھینکی ہے، تو اثبات ہے ابتداءِ فعل کے اعتبار سے، اور نفی کی جا رہی ہے انتہاءِ فعل کے اعتبار سے کہ اگرچہ ظاہری طور پر یہ فعل کیا آپ نے ہے کہ مٹی کی مٹھی پھینکی آپ نے تھی لیکن اس کے نتائج کی طرف دیکھ کر ہم کہتے ہیں کہ یہ آپ نے نہیں پھینکی یہ تو اللہ نے پھینکی ہے اس لیے اس کے اوپر ایسے اثرات مرتب ہو گئے۔

"وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا" "ولیبلی" کا معطوف علیہ اگر محذوف نکالنا ہو تو یوں کہہ لیں "لیظھر الکافرین ولیبلی المؤمنین" یہ سارے کے سارے آثار اس لیے نمایاں ہوئے تا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو مغلوب کرے، ان کو ذلیل کرے اور تا کہ مؤمنین پر اپنی طرف سے بہترین انعام کرے "اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ" بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

"ذٰلِکُمْ وَاَنَّ اللّٰہَ مُوْهِنُ کَیْدِ الْکٰفِرِیْنَ" یہ بات ہو چکی، یہ بات ایسے ہی ہے اب آخری امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی تدبیروں کو کمزور کرنے والا ہے، وہ کتنے ہی مکر اور فریب کر لیں ان کی تدبیروں میں قوت نہیں ہو سکتی۔

فیصلہ کن جنگ کی تمنا:

"ان تستفتحوا" یہ آیات نشاندہی کرتی ہیں اس بات کی جو تفصیل آپ کے سامنے آئی تھی کہ جب یہ لشکر نکلا ہے تو یہ بہت دعائیں کر کے نکلے تھے، جب ایک آدمی کو اپنی قوت پر پوری طرح مان ہوتا ہے اور یقین ہوتا ہے کہ آج اگر ہم جا رہے ہیں تو صفایا کر کے ہی آئیں گے تو پھر وہ ڈینگیں مارتا ہے اور ڈینگوں میں یہ بات بھی ہوتی ہے، جیسے فرعون جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں آیا تھا اور اس نے سارے کے سارے جادوگر اکٹھے کر لیے تھے اور جادوگروں نے آکر جو اس فرعون کو ہوا دی اور کہا کہ ہم یوں کر دیں گے، ہم ووں کر دیں گے، یہ اکیلا ہمارا مقابلہ کیا کر سکتا ہے تو یاد ہوگا آپ کو کہ فرعون نے بھی اعلان کروایا تھا اے لوگو! سارے کے سارے اکٹھے ہو جاؤ آج جو جیتے گا ہم اس کے ساتھ ہو جائیں گے، ہم جیتنے والے کے ساتھ ہو جائیں گے، دیکھتے ہیں آج کون غلبہ پاتا ہے

اس طرح سے فرعون نے بھی اعلان کیا تھا اور معاملہ الٹ نکل آیا کہ قوم کا ذہن پہلے بنایا اور ذہن اس طرح بنایا تھا کہ جو جیتے گا وہ حق پہ ہوگا اور جیت گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام تو وہی پہلے کی ڈھینگیں مصیبت بن گئیں تو پھر اور تدبیریں اختیار کرنی پڑیں کہ جی یہ تو سازش ہے، یہ تو انہوں نے آپس میں مل کے کرلیا ورنہ اگر مقابلہ کرتے تو ہمارے جادوگر جیت جاتے یہ تو استاد شاگرد ہیں، یہ تو اندر سے ان کی سازش ہے پھر اس نے اس قسم کی باتیں بنانی شروع کردیں۔

تو یہ بھی اسی طرح کہتے تھے کہ یہ فیصلہ کن جنگ ہوگی، آج جو حق پہ ہوگا وہ جیت جائے گا اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے تھے کہ یا اللہ! جو قاطع الرحم ہے، جو فسادی ہے اس کو برباد کردے، وہ اپنے طور پر گویا کہ تاثر دے رہے تھے کہ چونکہ میدان ہمارے ہی ہاتھ میں رہے گا اور مسلمان ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتے یہ پہلا موقع تھا جب اس طرح وہ کھل کے سامنے آرہے تھے اور اس زعم کے ساتھ آرہے تھے کہ آج ہم صفائی کر کے آئیں گے تو گویا کہ لوگوں کے سامنے اس لڑائی کو میزان بنارہے تھے کہ یہ ترازو ہے جس میں تولا جائے گا کہ کون فسادی ہے اور کون مصلح ہے؟ کون حق پہ ہے اور کون غلط ہے؟ اس جنگ کو انہوں نے فیصلہ کن جنگ بنالیا تھا حتی کہ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوجہل نے آتے ہوئے بیت اللہ کے پاس جا کے بیت اللہ کا غلاف پکڑ کے دعا کی کہ یا اللہ! جو قاطع الرحم ہے، جس نے رشتہ داروں میں پھوٹ ڈال دی، جس نے قوم میں فساد ڈال دیا ہے اس کو ہلاک کردے، اور آگے لفظ آئیں گے " اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ " اے اللہ! جو کچھ یہ کہتے ہیں اگر یہ حق ہے تو پھر ہم پر پتھر برسا یا دردناک عذاب ہم پر بھیج دے تو ہم سمجھ جائیں گے کہ واقعی یہ حق ہے، اس قسم کی دعائیں کر کے نکلے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر تم فیصلہ چاہتے ہو فیصلہ تو آگیا، وہ معاملہ تو صاف ہوگیا کہ جو فسادی تھے شکست کھا گئے اور جو حق والے تھے فتح پا گئے، اگر تم باز آجاؤ، مخالفت کو چھوڑ دو "فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ" تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم عود کرو گے، دوبارہ ایسی حرکتیں کرو گے تو ہم پھر موجود ہیں تمہارا علاج کرنے کے لیے، اگر تم دوبارہ اس قسم کی حرکتیں کرو گے تو ہم کہیں چلے تو نہیں گئے دوبارہ تمہارا علاج کردیں گے " اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ " اگر تم دوبارہ عود کرو گے تو ہم بھی عود کریں گے۔

"وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا" اور یہ یاد رکھ لو! کہ تمہاری جماعت خواہ کتنی زیادہ ہی کیوں نہ ہو تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جیسے آج بھی بدر کے میدان میں تمہاری جماعت تین گنا زیادہ تھی اور کچھ کام نہ آئی، ہرگز فائدہ نہیں پہنچائے گی تمہیں تمہاری جماعت کچھ بھی "وَلَوْ كَثُرَتْ" اگرچہ زیادہ ہی ہو "وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ"

اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کے ساتھ ہے۔

کیا غم ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ

اے ایمان والو ! کہنا مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا

وَلَا تَوَلَّوْا۟ عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَا تَكُونُوا۟

اور اس رسول سے پیٹھ نہ پھیرا کرو حالانکہ تم سنتے ہو (۲۰) اور نہ ہو جایا کرو

كَٱلَّذِينَ قَالُوا۟ سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢١﴾ إِنَّ شَرَّ

ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سنتے نہیں ہیں (۲۱) بے شک بدترین

ٱلدَّوَآبِّ عِندَ ٱللَّهِ ٱلصُّمُّ ٱلْبُكْمُ ٱلَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾

جانوروں میں اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو بہرے ہیں، گونگے ہیں جو سمجھتے نہیں (۲۲)

وَلَوْ عَلِمَ ٱللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوا۟

اور اگر اللہ ان کے اندر کوئی بھلائی جانتا تو انہیں سنا دیتا اور اگر ان کو سنائے ان حالات میں تو وہ پیٹھ پھیر جائیں گے

وَّهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَجِيبُوا۟ لِلَّهِ

اس حال میں کہ اعراض کرنے والے ہیں (۲۳) اے ایمان والو ! حکم مانو اللہ کا

وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ

اور اس کے رسول کا جبکہ وہ رسول تمہیں بلائے اس چیز کی طرف جو تمہیں زندگی بخشتی ہے اور جان لو بے شک اللہ تعالیٰ حائل ہو جاتا ہے

بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ وَأَنَّهُۥٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَٱتَّقُوا۟ فِتْنَةً

انسان اور اس کے دل کے درمیان اور اسی کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے (۲۴) ڈرو تم اس فتنہ سے

لَّا تُصِيبَنَّ ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ مِنكُمْ خَآصَّةً ۖ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ

جو نہیں پہنچے گا ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا خاص طور پر اور جان لو کہ بے شک اللہ

شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ ﴿٢٥﴾ وَٱذْكُرُوٓا۟ إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ

سخت سزا والا ہے (۲۵) یاد کرو اس وقت کو جبکہ تم تھوڑے سے تھے کمزور سمجھے ہوئے تھے

فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ

اپنے ملک میں تم ڈرتے تھے کہ تمہیں لوگ اچک لیں گے پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانہ دیا

وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور تمہیں قوت پہنچائی اپنی مدد کے ساتھ اور تمہیں رزق دیا پاکیزہ چیزوں سے تاکہ تم شکرگزار ہوجاؤ ﴿۲۶﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کیا کرو اور نہ خیانتیں کیا کرو

اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ

اپنے حقوقِ واجب میں حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۲۷﴾ اور جان لو کہ تمہارے مال

وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ ع

اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس اجرِ عظیم ہے ﴿۲۸﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل واحسان سے بدر میں فتح حاصل ہوئی اور کفار ومشرکین کو ذلت نصیب ہوئی، شکست ہوئی، ان کو جو ذلت اور شکست ملی تھی اس کی وجہ پچھلے رکوع میں یہ ذکر کی گئی تھی "ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" یہ ذلت ان کو اس لیے ملی، یہ شکست اس لیے ہوئی، ان کو مار اس لیے پڑی کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی تھی، ان کے خلاف ضد باندھی ہوئی تھی اور جو بھی اللہ اور اللہ کے رسول سے ضد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں تو اس آیت میں مشرکین کو یہ بتایا گیا تھا کہ سزا اس لیے ہوئی کیونکہ اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے تھے۔

اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی، اللہ کی نصرت حاصل ہوئی وہ اس لیے حاصل ہوئی کہ وہ حق کے لیے جانباز تھے، انہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کے لیے جانبازی دکھائی تھی، رسول کی دعوت پر وہ نکل پڑے

تھے، انہوں نے جان و مال کی پرواہ نہیں کی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو نصرت حاصل ہوگئی۔

غزوۂ بدر میں دونوں فریقوں کا حال کھل کر سامنے آگیا تو اس رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ مزید اطاعت کی رغبت دلاتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ کسی اعتبار سے بھی اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کی مخالفت نہ ہونے پائے، آخر رکوع تک مضمون یہی ہے۔

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کا مفہوم:

پہلی آیت میں تو یہ بات بہت صفائی کے ساتھ آگئی کہ اے ایمان والو! اب دیکھو! یہاں "اٰمَنُوْا" کے لفظ کے ساتھ خطاب کیا جارہا ہے جس کی تفصیل آپ کے سامنے بارہا گذر چکی ہے کہ ایمان چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اطاعت کے معاہدہ کا نام ہے وہی معاہدہ یاد دلایا جارہا ہے کہ جنہوں نے اطاعت کا عہد کیا ہے، فرمانبرداری کا عہد کیا ہے ان کو یہ بات کہی جارہی ہے۔

اور پھر ایمان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ عشق ومحبت کی بات ہے کہ جو مؤمن ہوتے ہیں "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ" ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت سخت محبت ہوتی ہے، جب "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے ساتھ خطاب کیا جائے تو گویا کہ اہل ایمان کو ان کا منصب یاد دلایا جارہا ہے کہ تم جو ایمان لائے ہو تو ایمان لا کے عاشقوں کی فہرست میں شامل ہوگئے، محبت کرنے والوں کی فہرست میں آگئے اور تم نے جو اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد باندھا ہے تو تمہیں یاد دلایا جارہا ہے کہ تم یہ کام کرو اس عنوان کے ساتھ خطاب کرنے میں یہ زور ہے، جب یہ ساری تفصیل ذہن میں ہوگی تو پھر ان الفاظ کا مطلب صحیح سمجھ میں آئے گا۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم:

اے ایمان والو! "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ" اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو، ان کے احکام مانو "وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ" اور رسول سے پیٹھ نہ پھیرو یعنی جس وقت رسول تمہیں کسی کام کی طرف بلاتا ہے تو اس سے پیٹھ نہ پھیرو حالانکہ تم اس کی باتیں سن رہے ہو اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی براہِ راست باتیں سن کر بھی تم پیٹھ پھیرو گے یعنی اطاعت نہیں کرو گے بلکہ منہ موڑ لو گے تو اس سے زیادہ بدبختی پھر کیا ہوگی؟ براہِ راست رسول کی زبانی اللہ تعالیٰ کی باتیں سن رہے ہو اور رسول تمہیں براہِ راست باتیں سنا رہا ہے تو ایسے وقت میں پیٹھ پھیرنا بہت عجیب ہے، "وَاَنْتُمْ

"تَسْمَعُوْنَ" حالانکہ تم سن رہے ہو، عقیدت کے ساتھ سنتے ہو، محبت کے ساتھ سنتے ہو، پیار کے ساتھ سنتے ہو، اعتقاد کے ساتھ سنتے ہو تو پھر تمہیں اس پر عمل بھی کرنا چاہیے، اطاعت اور فرمانبرداری کرنی چاہیئے، پیٹھ نہیں پھیرنی چاہیئے۔

کافروں کی طرح نہ ہو جانا:

"وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا" اس سے اشارہ ہے یہود کی طرف، پہلی امتوں کا حال جس طرح سے گزرا کہ وہ زبان سے تو کہہ دیتے تھے کہ ہم نے سن لیا اور حقیقت میں سنتے کچھ نہیں تھے کیونکہ جس سننے کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے، سمجھنے کے بعد اس کے مطابق عقیدہ نہ رکھا جائے، عقیدہ بنانے کے بعد اس کے مطابق عمل نہ کیا جائے تو وہ سننا نہ سننا برابر ہے وہ زبان سے تو "سَمِعْنَا" کہہ دیتے تھے لیکن حال سے "عَصَيْنَا" ہوتے تھے، جیسے یہود کے تذکرے کے اندر یہ بات آپ کے سامنے آئی تھی تو یہ کوئی اچھے لوگ نہیں ہیں جو سننے کی کوشش نہیں کرتے، سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، حق کے مطابق بولتے نہیں، عقل سے کام نہیں لیتے، تو یہ بدترین قسم کے جانور ہیں، جانوروں میں سے بھی بدترین جانور ہیں کیونکہ جانور اگر بگڑے گا تو کتنا بگڑے گا؟ بگڑنے کے بعد پھر بھی وہ کسی نہ کسی حد کے اندر رہ جاتا ہے لیکن انسان جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دی ہیں کہ وہ سوچ سمجھ کر اچھے عمل کو اختیار کر سکتا ہے پھر بھی اگر وہ اپنی اس سوچنے اور سمجھنے والی قوت کو استعمال نہ کرے تو جانوروں سے بھی بدتر ہے۔

سب سے زیادہ بدتر مخلوق کافر ہیں:

سورۃ الاعراف میں آپ کے سامنے لفظ آئے تھے "أُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ" اس مضمون کی تفصیل اس موقع پر آپ کی خدمت میں عرض کر دی تھی، اور یہ اشارہ ان یہود کی طرف ہی ہے جو بظاہر انبیاء ﷺ کی باتیں سنتے تو تھے لیکن عملاً وہ "عَصَيْنَا" کا مصداق تھے کہ ہم مانیں گے نہیں، وہ اڑ جاتے تھے، نافرمانی کرتے تھے تو تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سنتے نہیں تھے، سنتے نہیں ہیں کا مطلب یہ ہے کہ جب سن کر اس پر عمل نہیں کرتے، سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اس کے مطابق عقیدہ نہیں بناتے تو سننا نہ سننا برابر ہے جس کو آپ اس طرح کہتے ہیں کہ "سنی ان سنی کر دی" تو جس پر انسان عمل نہ کرے وہ سننا نہ سننا برابر ہے، بے شک جانوروں میں سے بدترین اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو حق سننے سے بہرے ہیں، حق بولنے سے گونگے ہیں اور جو سوچتے نہیں، عقل سے کام نہیں لیتے اس قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک "شَرُّ الدَّوَابِّ"

ہیں، تیسویں پارہ میں سورۃ البینہ کے اندر بھی یہ لفظ آئے گا " اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ " کہ یہ لوگ جو کفر اختیار کرتے ہیں، شرک اختیار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق عمل نہیں کرتے " اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ " یہ سب مخلوق میں سے بدتر ہیں تو انسان کو جیسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے، اعلیٰ شرف اس کو دیا ہے تو اگر یہ نیکی کی طرف جائے تو واقعی یہ اعلیٰ ہے پھر یہ فرشتوں سے بھی آگے نکل جاتا ہے جیسے علامہ اقبال کا شعر ہے۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس پہ لگتی ہے محنت زیادہ

محنت بہت کرنی پڑتی ہے، محنت کرو گے تو شرف اور فضیلت میں فرشتوں سے بھی آگے نکل سکتے ہو لیکن انسان میں ایک الٹا گیئر بھی لگا ہوا ہے کہ اگر یہ اُدھر کو مڑ جائے تو پھر یہ شیطان سے بھی بدتر ہے، پھر اس کے کردار اور حال کو دیکھ کر شیطان بھی کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے، جس وقت یہ انسان بگڑتا ہے تو پھر یہ بہت آگے نکل جاتا ہے تو جیسے اس کو شرافت اور عظمت میں اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے اس کا بگاڑ بھی انتہائی تیز ہے، جانوروں میں سے بدتر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو حق سننے سے بہرے ہیں، حق بولنے سے گونگے ہیں اور جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

"وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ" کا مفہوم:

"وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ" اگر اللہ تعالیٰ ان میں خیر دیکھتا تو انہیں سننے کی توفیق دے دیتا، انہیں سنا دیتا، سننے سے وہی قبول کرنے والا سننا مراد ہے، خیر سے طلب حق مراد ہے، اگر ان کے اندر طلب حق ہوتی، اگر ان میں خلوص ہوتا تو اللہ انہیں سننے کی بھی توفیق دے دیتا کیونکہ یہ سارے کا سارا سلسلہ جو چلتا ہے تو طلب حق سے چلتا ہے کہ انسان کی طبیعت میں خلوص اور اخلاص آجائے کہ واقعی وہ حق کو سمجھنا چاہتا ہے اگر طلب حق کا جذبہ آجائے تو پھر آگے اللہ تعالیٰ راستہ کھولتے جاتے ہیں پھر انسان بات سنے گا، سمجھے گا اور پھر عمل کی بھی توفیق ہو جائے گی لیکن انہوں نے تو ضد کر کر کے اپنے اندر سے طلب حق والا جذبہ ہی ختم کر دیا اب تو کچھ ہو جائے یہ اپنی ضد پہ اڑے ہوئے ہیں تو ایسے وقت میں اگر ان کے کان میں بات ڈال بھی دی جائے تو کیا فائدہ، اسی طرح سے منہ پھیر جائیں گے، اعراض کر جائیں گے۔

دیکھو! بیج میں ایک صلاحیت ہے جب اس کو زمین میں ڈالا جائے تو ایک تناور درخت بنتا ہے اس کو پھل پھول لگتے ہیں، اب ایک زمین اس کی صلاحیت رکھتی ہے، اچھی زمین ہے، زرخیز زمین ہے اس کے اندر بیج

ڈالو گے تو تناور درخت بن جائے گا تو آپ اس کا پھل بھی کھائیں گے، اس کے پھولوں سے خوشبو بھی لیں گے، اس کے سایہ میں بھی بیٹھیں گے اس سے سارے فوائد حاصل ہو جائیں گے۔

اور دوسری طرف شوریلی زمین ہے، اس میں جو کچھ ڈالا جائے وہ سب کچھ کھا کر ختم کر دیتی ہے تو انسان کہتا ہے بیج تو میں ڈال دوں لیکن آگے اس میں صلاحیت بھی تو ہو؟ جو اس میں ڈالا جائے گا یہ اس کو کھا کے ضائع کر دیتی ہے بالکل اسی طرح سمجھانا بھی اسی شخص کو کارآمد ہوتا ہے جس کے متعلق پتہ تو ہو کہ اس کا سمجھنے کا ارادہ ہے وہاں اگر سمجھانے اور دل میں بات ڈالنے کی کوشش کی جائے تو وہ سمجھے گا بھی اور عمل کرنے کی کوشش بھی کرے گا لیکن اگر کسی شخص کے دل میں طلبِ حق کا جذبہ ہی نہیں ہے تو تم اگر اس کے کان میں بات ڈال بھی دو گے تو کیا فائدہ؟ گویا کہ موتی جیسی بات ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کی بات ہے اگر اس کو قبول کیا جائے اور صالح دل کے اندر وہ بات چلی جائے تو ایک تناور درخت بن سکتا ہے لیکن ان فاسد قلوب میں جس وقت جائے گی تو جا کے بھسم ہو جائے گی۔

یہی مطلب ہے اس کا کہ اگر اللہ ان میں خیر جانتا، دیکھو! بظاہر اس میں علم کی نفی ہے کہ اللہ کو خیر معلوم ہی نہیں تو بظاہر اس میں علم کی نفی ہے لیکن علم کی نفی کر کے اصل میں اس خیر کی نفی کرنا مقصود ہے کیونکہ اگر خیر کا وجود ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ضرور ہوتی، جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں ہی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم واقعہ کے مطابق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں خیر ہی نہیں ہے۔

جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو اپنا کوئی شریک زمین وآسمان میں معلوم نہیں تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اگر ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ضرور ہوتا کیونکہ کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں ہے تو جب اللہ تعالیٰ کہے کہ میں تو اس بات کو جانتا نہیں ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ سرے سے اس کا وجود ہی نہیں ہے۔

اگر اللہ کو ان میں خیر معلوم ہوتی، بظاہر اس میں علم کی نفی ہے کہ اللہ کو خیر معلوم نہیں ہے لیکن حقیقت میں خیر کی نفی مقصود ہے "لَاَسْمَعَهُمْ" تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو بات سنا دیتا یعنی ان کے دل میں بات ڈال دیتا، اگر ان میں طلبِ حق ہوتی تو ان کو سننے کی توفیق دے دیتا، ایسا سننا جس کے اوپر نفع مرتب ہو۔

"وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ" اور اگر اللہ تعالیٰ ان کو ان حالات میں سنا دے جبکہ ان کے اندر خیر نہیں ہے "لَتَوَلَّوْا" تو یہ پیٹھ پھیر جائیں گے "وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ" اس حال میں کہ اعراض کرنے والے ہوں گے، اس سنانے کا فائدہ کوئی نہیں ہے یعنی اگر ان کے کان میں بات پڑ بھی جائے جیسا کہ واقعتاً پڑتی ہے، بات ان کے کان تک جاتی ہے لیکن

طلب حق نہیں ہے جس کی بناء پر باتیں سنتے ہیں اور سن کر پیٹھ پھیر کر اعراض کر کے چلے جاتے ہیں۔

سوال یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خیر ہی نہیں ہے تو پھر قیامت کے دن اس کے متعلق سوال کیوں ہوگا؟

جواب یہ قیامت کے دن جو پوچھ ہوگی وہ اس لیے ہوگی کہ یہ خیر انہوں نے ضد کر کے ضائع کر دی ورنہ اصل کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو فطرت صحیحہ پر پیدا کیا ہے، آپ یہ تجربہ کر لیں ایک آدمی سے آپ کی مخالفت ہو جائے، جب ابتداء ابتداء میں مخالفت ہوتی ہے تو آپ میں صلاحیت ہوتی ہے اور آپ ایک بات کو سمجھ کے طے کر سکتے ہیں لیکن پھر ضد کرتے کرتے انسان اتنا دور نکل جاتا ہے کہ پھر اس میں سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے، یہ انسان کے دل کی ایک حالت ہے۔

تو پہلا جو "لَاَسْمَعَهُمْ" آیا اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو سنا دے یعنی ایسا سنانا جو ان کے لیے مفید بھی ہو اور دوسرا "اَسْمَعَهُمْ" کا معنی ہے کہ اندریں حالات جبکہ ان میں طلب حق نہیں ہے تو اگر ان کے کان میں بات ڈال بھی دی جائے تو فائدہ کوئی نہیں ہے یہ پیٹھ پھیر جائیں گے، اعراض کر جائیں گے جیسا کہ واقعہ ہے کہ بات ان تک جاتی ہے لیکن اس کو قبول نہیں کرتے پیٹھ پھیر جاتے ہیں۔

"وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ" پر ایک منطقی اشکال کا جواب:

منطقی اصول کے تحت اگر آپ اس کو دیکھیں تو اس آیت کے اوپر آپ کے دل میں بظاہر ایک اشکال آئے گا "وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ" یہ تو صغریٰ ہے اور "وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا" یہ کبریٰ ہے اور "اَسْمَعَهُمْ، اَسْمَعَهُمْ" یہ بظاہر حد اوسط ہے اب اس حد اوسط کو اگر گراؤ گے تو نتیجہ نکلا "لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّتَوَلَّوْا" اگر اللہ تعالیٰ کو ان میں خیر معلوم ہوتی تو یہ پیٹھ پھیر جاتے اور یہ نتیجہ بالکل غلط ہے یعنی آپ کے منطقی اصول کے مطابق صغریٰ کبریٰ ملا کے شکل اول کے مطابق نتیجہ بالکل غلط ہے حالانکہ شکل اول قطعی ہے اس کا نتیجہ بدیہی ہے جس میں اشکال کی گنجائش نہیں ہوتی تو منطقی اصول سے جو سوال ہو سکتا تھا اس کا جواب میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہاں حد اوسط متکرر نہیں ہے پہلا "لَاَسْمَعَهُمْ" اور ہے دوسرا "اَسْمَعَهُمْ" مقید ہے اس قید کے ساتھ کہ اگر اللہ تعالیٰ ان میں خیر دیکھتا تو ان کو سنا دیتا ایسا سنانا جو ان کے لیے مفید ہوتا اور اگر اللہ تعالیٰ ان کو اندریں حالات سنا دے جبکہ ان میں خیر نہیں ہے، طلب حق نہیں ہے تو کوئی فائدہ ہی نہیں ہے اس لیے حد اوسط متکرر نہیں ہے۔

پہلا ”لَاَسْمَعَهُمْ“ اور ہے اور دوسرا ”اَسْمَعَهُمْ“ اور ہے اس کے ساتھ اور قید لگی ہوئی ہے تو جب حد اوسط مکرر رہی نہیں ہے تو پھر سرے سے یہ قیاس ہی نہیں بنتا یہ دونوں باتیں ہی علیحدہ علیحدہ ہیں ورنہ بظاہر تو یہ شکل اول بنی پڑی ہے اور نتیجہ غلط دے رہی ہے (منطق سے آپ کی اتنی مناسبت نہیں ہے ورنہ آپ یہ اعتراض ضرور کرتے)۔

منطق دماغ کے لیے ایسے ہے جیسے زمین کے لیے کھاد:

منطق اسی لیے پڑھی پڑھائی جاتی ہے تاکہ سوچنے، سمجھنے، غور کرنے، اشکالات پیدا کرنے کی اور ان کے جوابات دینے کی صلاحیت ابھرے، ہمارے استاذ تھے حضرت مولانا محمد رفیق صاحب شیخ الحدیث دار العلوم ربانیہ (فیصل آباد) ترجمہ میں نے انہی سے پڑھا تھا، وہ بہت شفیق اور مہربان تھے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے (آمین) ہماری بنیاد تو انہی کے ہاتھوں سے ہی اٹھی ہے اگر ابتداء میں ہی ان کی صحبت نصیب نہ ہوتی تو شاید علم کے بارے میں اس قسم کا شوق نہ ہوتا جو ان کی صحبت میں جا کے اللہ تعالیٰ نے عنایت فرما دیا ہے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ منطق بذات خود کچھ نہیں ہے نہ اس میں اللہ کا ذکر، نہ اللہ کے رسول ﷺ کا ذکر، نہ قبر میں کام آئے گی، نہ حشر میں کام آئے گی، بس ایسے ہی جوڑتے جاؤ اور توڑتے جاؤ اس قسم کا حال ہے بظاہر اس میں کوئی فائدہ کی بات معلوم نہیں ہوتی لیکن وہ ہمیں کہا کرتے تھے کہ اس کے اوپر محنت کرو یہ اس طرح ہے جیسے گوبر اور کھاد ہوتی ہے جو فی حد ذاتہ تو ایک نجس چیز ہے لیکن جب اس کو زمین میں ڈال دیا جاتا ہے تو زمین زرخیز ہو جاتی ہے پھر اس میں جو کاشت کرو گے وہ خوب آگے گا تو کہتے تھے کہ یہ منطق اور فلسفہ دماغ کے لیے کھاد ہے تو اگرچہ ظاہری طور پر تمہیں یہ معلوم ہو کہ اس میں تو کام کی بات ہے ہی نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس وقت انسان اس کے اصول اپناتا ہے اور چونکہ چرا اس کہ کرنا سیکھ لیتا ہے تو یہ بالکل ایسے ہے جیسا کہ ذہن کی ورزش کروائی جا رہی ہے۔

جیسے یہ پہلوان ورزش کرتے ہیں بظاہر ایسے ہی ایک دوسرے سے ٹکریں مارتے ہیں، ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس میں بظاہر کوئی فائدہ محسوس نہیں ہوتا اور اگر آپ دوڑ لگانی شروع کر دیں تو ایک بے کاری حرکت معلوم ہو گی کہ یہ کوئی کام نہیں ہے ایسے ہی بھاگے پھر رہے ہیں لیکن اتنا تو آپ کو معلوم ہے کہ اس طرح بھاگنے اور کشتی کرنے کے ساتھ آپ کی قوتیں بڑھ رہی ہیں اور پھر جس وقت کوئی کام کا موقع آئے گا تو یہی قوت آپ کے کام آئے گی تو قوت کو بڑھانے کے لیے بسا اوقات اس قسم کی ورزش کرنی پڑتی ہے۔

منطق اور فلسفہ کے ساتھ بھی سوچ بچار کی قوت بڑھتی ہے تو یہ ایسے ہے جیسے زمین میں کھاد ڈالی جا رہی

ہے تو اگر چہ وہ بذات خود کچھ بھی نہیں ہے ایک نجس یا ناپاک چیز ہے لیکن جب زمین میں ڈال دی جاتی ہے اور اس میں جا کے مل جاتی ہے تو اس سے زمین زرخیز ہو جاتی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ منطقی ذہن کے جو لوگ ہوا کرتے ہیں یا منطق کے اوپر جنہوں نے محنت کی ہے وہ بات کو بہت اچھے انداز سے اخذ کرتے ہیں اور اس میں بہت اچھے اچھے اشکالات پیدا کر لیتے ہیں اور ان اشکالات کا جواب بڑے اچھے انداز سے دے لیتے ہیں تو اس لیے اس کو بے کار نہ سمجھو، اس کے اوپر محنت کیا کرو۔

"اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ" کا مفہوم:

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ" استجابہ کا معنی ہے جواب دینا، کسی کی بات کو مان لینا، قبول کر لینا، اے ایمان والو! اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم مانا کرو، اس کی بات کو قبول کیا کرو کیونکہ اس بات کے قبول کرنے میں فائدہ تمہارا ہے، اللہ اور اللہ کا رسول تمہیں ایسی باتیں بتاتا ہے جو تمہارے لیے حیات بخش ہیں، جس سے تمہاری زندگی بنتی ہے، ارے بھائی! زندگی تو اصل وہی زندگی ہے جس میں کوئی شرافت اور انسانیت ہو، جس میں انسان آخرت کا نفع کمائے ورنہ تو انسان مردہ ہے، اللہ اور اللہ کا رسول تمہیں ایسی باتیں بتاتا ہے جس سے تمہاری زندگی بنتی ہے، یہ حیات بخش چیزیں ہیں، ورنہ تمہاری روح مردہ ہے اور کردار کے لحاظ سے تم مردہ ہو، اور اللہ اور اس کے رسول کی باتیں جس وقت تم سیکھو گے تو تمہارے اندر صلاحیتیں ابھریں گی، نیکی کی توفیق ہوگی، زندگی سے فائدہ اٹھاؤ گے گویا کہ صحیح طور پر زندگی ملتی ہے اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام ماننے سے جبکہ دعوت دے تمہیں اللہ کا رسول ایسی چیز کی طرف جو تمہیں زندگی دیتی ہے، حیات بخش چیز کی طرف تمہیں بلاتا ہے تو تمہیں اس بات کو ماننا چاہیے کیونکہ اس میں فائدہ تمہارا ہے اور اس ماننے میں سستی نہ کیا کرو۔

"اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ" کا پہلا مفہوم:

اس بات کو یاد رکھو اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے درمیان میں حائل ہو جاتا ہے، حائل ہو جانے کے دو مطلب ہیں، ایک تو یہ ہے کہ جس وقت کوئی نیکی کرنے کا موقع آئے، اللہ اور اس کے رسول کی بات پہنچے تو جلدی سے اس کے اوپر عمل کر لیا کرو ورنہ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ انسان کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں کر لیں گے لیکن بعد میں پھر دل ایسا پھرتا ہے کہ پھر اپنے دل پہ کنٹرول ہی نہیں رہتا کہ انسان اگر ارادہ کر بھی لے تو دل ماننے کے لیے تیار

نہیں ہوتا، پتہ ہی نہیں ہے دل کی کیفیت کیا ہو جائے گی، اس لیے وقت سے فائدہ اٹھاؤ جب نیکی کا پیغام پہنچے فوراً نیکی کر لو ورنہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت، اللہ کی حکمت کے تحت دل پلٹا کھا جاتے ہیں، جب دل پلٹا کھا جائے گا تو پھر تمہیں نیکی کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوگی، اس لیے وقت کو ٹالا نہ کرو۔

جیسے حدیث شریف میں آتا ہے "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِكَ" سرور کائنات ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے "اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ آدَمَ بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ یُقَلِّبُهَا كَیْفَ یَشَاءُ" بنی آدم کے قلوب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان میں ہیں "یُقَلِّبُهَا كَیْفَ یَشَاءُ" جیسے چاہتا ہے ان کو پھیرتا رہتا ہے، دو انگلیوں کے درمیان میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس کے اوپر پورا تصرف ہے جیسے کوئی چیز جب آپ کی دو انگلیوں کے درمیان میں آ گئی تو آپ کو اس پر مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا آپ جیسے چاہیں اس کو گھمالیں، آسانی کے ساتھ گھوم جاتی ہے تو بنی آدم کے قلوب بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں جدھر چاہے گھماتا ہے اس لیے حضور ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِكَ" اے مقلب القلوب! میرے دل کو اپنے دین پہ جمائے رکھنا، دین سے میرے دل کو پلٹنا نہ آئے لیکن یہ بات تو ہے کہ پتہ نہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا ہو جائے اس لیے دیر نہ کیا کرو بسا اوقات انسان اور انسان کے دل کے درمیان اللہ کی قدرت حائل ہو جائے گی، اللہ کا تصرف حائل ہو جائے گا پھر اپنے دل پر کنٹرول نہیں رہے گا اس لیے جتنی جلدی ہو سکے عمل کر لیا کرو، دیر نہ کیا کرو، تاخیر کرنے کے ساتھ بسا اوقات دل بدل جاتے ہیں اور پھر انسان کو عمل کی توفیق نہیں ہوتی۔

دوسرا مفہوم:

اور اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کے دل پر جتنا اللہ کا تصرف چلتا ہے اتنا انسان کا بھی نہیں چلتا، اتنا انسان اپنے دل کے قریب نہیں ہے جتنا اللہ اس کے دل کے قریب ہے، اس لیے خلوص کے ساتھ، عقیدت کے ساتھ، محبت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو مانا کرو کیونکہ تمہارے سارے کے سارے حالات اللہ کے سامنے ہیں اللہ حائل ہو جاتا ہے یعنی تم اور تمہارا دل آپس میں اتنا قریب نہیں جتنا اللہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ"۔

تیسرا مفہوم حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی:

اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ مطلب بھی ذکر کیا ہے کہ اگر نیکی کرو گے تو اللہ تمہارے دل کی طرف برائی نہیں آنے دے گا، نیکی کی توفیق مزید بڑھتی چلی جائے گی اور اگر کوئی شخص برائی پہ اڑا ہوا ہے تو اس کے دل میں نیکی نہیں آنے دیتا اس لیے طاعات کے اوپر دوام یہ مفید ہے اور معصیت کے اوپر دوام بہت نقصان دہ ہے، طاعت کرنی شروع کرو گے تو اللہ کی طرف سے مزید اطاعت کی توفیق ہوتی چلی جائے گی اور معصیت پہ اڑ گئے تو پھر معصیت پر ہی چلتے رہو گے پھر اللہ تعالیٰ خیر کو تمہارے دل کے قریب نہیں آنے دے گا، بہر حال اس میں ترغیب ہے کہ جس وقت کوئی بات سامنے آجائے فوراً اس پر عمل کر لیا کرو، دیر نہ کیا کرو بسا اوقات انسان کا اپنے دل پہ بھی اختیار نہیں رہتا، پھر توفیق سلب ہو جاتی ہے۔

اور اس بات کو بھی یاد رکھو کہ اسی کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے، جب اسی کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے تو وہاں جا کے نیکی پر ثواب پالو گے، نیکی نہیں کرو گے تو محرومی ہوگی۔

"وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً" کا مفہوم:

"وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً" اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو بھی سنوارو، اس میں کوئی شک نہیں کہ اطاعت کرو اور اللہ کے احکام مانو لیکن ساتھ ساتھ دنیا سے بھی برائی کو مٹانے کی کوشش کرو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی کیا کرو اگر تمہارے اندر کچھ ایسے لوگ ہیں جو ظالم ہیں، ظلم کرتے ہیں اگر چہ بدکردار وہ ہیں، ظالم وہ ہیں لیکن تم انہیں روکتے نہیں یا ان سے نفرت نہیں کرتے اور اس ظلم کے انسداد کی کوشش نہیں کرتے تو یہ نہ سمجھنا کہ عذاب میں صرف ظالم ہی پھنسیں گے، جب عذاب آئے گا تو سارے ہی لپیٹ میں آجاؤ گے تو بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ خود بھی ظلم نہ کرو اور ظلم کرنے والوں کو بھی ظلم سے روکو تب جا کے تم شر فتنہ سے بچ سکتے ہو ورنہ اگر ظالموں کا ہاتھ نہیں پکڑو گے تو جس وقت بھی ظلم کی سزا ملے گی، ظلم کا وبال آئے گا تو لپیٹ میں سارے ہی آجاؤ گے۔

حدیث مبارکہ سے دلیل:

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ایک مثال کے ساتھ سمجھایا کہ بعض تو وہ ہیں جو اللہ کی حدود کو توڑتے

ہیں، اللہ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اس بارے میں مداہنت کرتے ہیں یعنی انہیں روکتے نہیں، امر بالمعروف ونہی عن المنکر نہیں کرتے یہ مداہنین کا گروہ ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کی مثال ایسے ہے جیسے ایک جماعت کشتی میں سوار ہوئی اور کشتی دومنزلہ تھی، بعض لوگ نیچے والی منزل میں بیٹھے ہیں اور بعض اوپر والی منزل میں بیٹھ گئے، اب نیچے والی منزل میں تو چونکہ دروازہ اور روشن دان بالکل نہیں ہوتا، ان کو پانی کی ضرورت پیش آتی تو وہ اوپر آ کے سمندر میں سے پانی کھینچتے تھے، لیکن اوپر والے تکلیف محسوس کرتے تھے کہ یہاں آ کر پانی کیوں کھینچتے ہیں تو نیچے والی منزل کے لوگوں نے کہا کہ اچھا اگر تمہیں اس سے تکلیف ہوتی ہے تو ہم نیچے سوراخ کر لیتے ہیں ہم وہاں سے پانی لے لیں گے، اب جس وقت وہ نیچے سے سوراخ کرنے لگے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر اوپر والے آ کے ان کا ہاتھ پکڑ لیں تو ان کو بھی بچالیں گے اور اپنے آپ کو بھی بچالیں گے، اور اگر یہی سوچتے رہے کہ ہمیں کیا، اپنے گھر کرتے ہیں جو کچھ مرضی کریں اگر وہ اس طرح سستی کر کے بیٹھیں رہیں گے تو پھر صرف نیچے والے نہیں ڈوبیں گے اوپر والے بھی ساتھ ہی جائیں گے فرمایا یہی حال ہے ان لوگوں کا جو اللہ کی حدود کو توڑتے ہیں اور وہ لوگ جو چپ کر کے تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔

تو جب ان پر وبال آئے گا تو اس وبال کی لپیٹ میں صرف وہی نہیں آئیں گے جو اللہ کی حدود کو توڑنے والے ہیں بلکہ جب عذاب آئے گا تو سارے ہی لپیٹ میں آجائیں گے، اس لیے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ خود بھی نیک عمل کرو اور دوسروں کو بھی نیکی کی تلقین کرو۔

نہی عن المنکر چھوڑنے پر وعید:

بنی اسرائیل میں بندر بننے والا واقعہ آپ کے سامنے آیا تھا وہاں بھی یہی بات تھی کہ روکنے والے جو تھے وہ بچ گئے اور اگر کوئی نہ روکے بلکہ برائی کرنے والوں کے ساتھ ہی شامل رہے اور ان کی برائی سے نفرت بھی نہ کرے تو عذاب کی لپیٹ میں وہ بھی آجاتا ہے۔

باب امر بالمعروف کے اندر مشکوۃ شریف میں ایک واقعہ آتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو کسی بستی کے متعلق حکم دیا کہ اس کو جا کے پلٹ دے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا یا اللہ! اس میں تو ایک ایسا آدمی ہے جس نے کبھی تیری نافرمانی نہیں کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کے ساتھ ہی الٹ دے کیونکہ میری نافرمانی کو دیکھ کے کبھی اس کا چہرہ بھی نہیں بدلتا، وہ ان سے نفرت کا اظہار نہیں کرتا جب نفرت کا اظہار نہیں کرتا تو وہ

بھی ساتھ ہی جائے گا، تو یہاں یہی بات ہے کہ وہ فتنہ جو آئے گا، وہ عذاب جو آئے گا وہ صرف انہی کو نہیں پہنچے گا جو تم میں سے ظالم ہیں بلکہ جو اس ظلم کو روکنے پر قادر تھے اور روکتے نہیں تھے وہ بھی اس فتنہ کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

مثال سے وضاحت:

جیسے ایک بستی کے اندر گندگی عام ہو جائے تو ایک آدمی اگر اپنے گھر کو صاف کیے بیٹھا ہو تو اس گندگی کی وجہ سے اگر کوئی وبا آئے گی تو یہ شخص جس نے اپنا گھر صاف کر رکھا ہے بچے گا یہ بھی نہیں صرف اپنا گھر صاف کر لینا کافی نہیں ہے اگر ساری کی ساری بستی گندی ہے، ساری بستی کو صاف رکھنے کی کوشش کرو گے تو سارے صحت مند رہ جاؤ گے، اگر کوئی کہے ہمیں کیا، ہمارا گھر صاف ہے اگر گندگی پھیلتی ہے تو پھیلتی رہے لیکن اگر کوئی وبا آئی تو جس نے صرف اپنے گھر کو صاف رکھا ہے بچے گا وہ بھی نہیں اس لیے حکم شریعت کا یہی ہے کہ صرف اتنا کافی نہیں کہ آپ نیکی کرلیں اور برائی سے بچ جائیں بلکہ یہ بھی آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق دوسروں کو نیکی کی تلقین کرو اور برائی کو روکنے کی کوشش کرو، بچو اس فتنہ سے جو نہیں پہنچے گا صرف ان لوگوں کو جو تم میں سے ظالم ہیں "وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ" اور یقین کرلو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔

احسانات کا ذکر:

پھر یہ قاعدہ ہے کہ انسان احسانات سے متاثر ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں جگہ بجگہ اپنے احسانات بھی جتلاتے ہیں، یاد کرو اس وقت کو، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کو یاد رکھو! یہ چیزیں یاد رکھنے کے قابل ہیں، ان باتوں کو ذہن میں رکھا کرو، یاد کرو تم اس وقت کو جب تم تھوڑے سے تھے، کمزور سمجھے ہوئے تھے اپنے علاقہ میں، تمہاری کوئی قوت اور طاقت نہیں تھی، ہر وقت تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک لیں گے، معلوم نہیں کہ کب ہم ان کا تر نوالہ بن جائیں، اس طرح تم پر خوف اور ہیبت طاری تھی اللہ نے احسان کیا کہ تمہیں ٹھکانہ دیا، ٹھکانہ مدینہ منورہ میں دیا، اور اپنی نصرت کے ساتھ تمہیں قوت پہنچائی، پاکیزہ چیزیں تمہیں کھانے کے لیے دیں، یہ سارے کام اس لیے کیے تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ، تو اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری یہی ہے کہ اس کے احکام مانو، اس کی اطاعت کرو، اس کی فرمانبرداری کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو، اس قسم کے احسانات کو یاد رکھا جائے تو احسانات کو یاد رکھنے سے اطاعت آسان ہو جاتی ہے، منعم ومحسن کی فرمانبرداری انسان کی فطرت ہے۔

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ" کا مفہوم:

آگے بھی اسی کے متعلق ہی تاکید کرنی مقصود ہے، اے ایمان والو! اللہ اور اللہ کے رسول سے خیانت نہ کیا کرو، خیانت کا وہی مفہوم ہے کہ جو حق واجب آپ کے ذمہ لگا ہے اس کو پورا ادا نہ کرو، تو اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ مانا جائے یا ظاہراً مانا جائے اور دل میں کھوٹ ہو جیسے آپ نماز پڑھیں لیکن دل کے اندر خلوص نہیں ہے یا نماز پڑھ کر محض ٹرخانے کی کوشش کرتے ہیں اور رکوع سجود بھی صحیح طرح ادا نہیں کرتے یہ سارے کے سارے کام خیانت میں شامل ہیں، اور اسی طرح یہ بھی ہے کہ اپنے حقوق میں بھی خیانت نہ کرو، جو حقوق ایک دوسرے کے تمہارے ذمہ لگے ہوئے ہیں ان کو بھی صحیح طور پر ادا کیا کرو، اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرو، اللہ کے رسول کے حقوق ادا کرو، آپس میں ایک دوسرے کے حقوق ادا کرو یہی چیز تمہارے فائدے کی ہے "وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" حالانکہ تم جانتے ہو کہ اللہ کی خیانت بری ہے، اللہ کے رسول کی خیانت بری ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے حقوق میں خیانت کرنا برا ہے یہ بات تم جانتے ہو، تو ایسے جاننے کی صورت میں، علم حاصل ہو جانے کے باوجود تمہیں چاہیے کہ تم خیانت نہ کرو کیونکہ جس وقت خیانت کی عادت پڑ جائے گی تو پھر یہی نہیں ہے کہ صرف تم دوسرے کو نقصان پہنچاؤ گے جب کوئی قومی مرض عام ہو جاتی ہے تو پھر ہر شخص ہی نقصان میں جاتا ہے۔

خیانت جب عام ہو جائے تو پریشانیاں بھی عام ہو جاتی ہیں:

جیسے آجکل آپ دیکھتے ہیں کہ ہر شخص دھوکہ دے کے زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کرتا ہے اگر تو دیانت داری ہو، عدل وانصاف ہو تو سارے لوگ ہی راحت میں رہیں اور امن وچین سے وقت گزرے، ہر کوئی دوسرے کے حق کی حفاظت کرے لیکن جب لوٹ، کھسوٹ پڑ جائے کہ میں اس بات پر خوش ہوں کہ میں نے اس کو دھوکہ دے کے اس سے پیسے زیادہ لے لیے لیکن میں اگر یہاں سے دھوکہ دے کر پیسے زیادہ لے لوں تو کوئی اور مجھ سے بھی ہوشیار چور آئے گا وہ مجھے لوٹ کے لے جائے گا، پریشانی موجود رہے گی، مال اسی طرح چلتا پھرتا رہے گا جس طرح عام حالات میں چلتا پھرتا ہے، اگر عدل وانصاف کے ساتھ اس کو حرکت دو گے تو یہ مال حرکت پھر بھی کرے گا لیکن نتیجہ میں تمہیں امن، سکون اور اطمینان نصیب ہوگا، اور اگر مال کی حرکت غلط طریقے سے ہو تو مال چلے گا پھر بھی آپ زیادہ کما لیں گے تو کہیں زیادہ دینا پڑ جائے گا پریشانی نتیجہ میں ملے گی۔

مثال سے وضاحت:

حضرت تھانوی ؒ اپنے ایک وعظ میں مثال بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک گھوڑا کہیں سے چوری کر لیا، چوری کر کے وہ لیے جا رہا تھا تو راستہ میں کوئی شخص آ گیا اور وہ اس سے پوچھتا ہے کہ کیا گھوڑا بیچنا ہے تو وہ چور بہت خوش ہوا کہ ابھی تو لایا ہوں اور ابھی خریدار بھی مل گیا تو بیچ کے میں اپنے پیسے کھرے کروں تا کہ پھنسنے کا ڈر نہ رہے وہ کہتا ہے ہاں جی بیچنا ہے، اس نے کہا اچھا مجھے ذرا اس پہ سواری کر کے دیکھنے دو، اس نے اپنا جوتا اتار کے اس کو پکڑایا کہ یہ پکڑو میں اس کو ذرا چلا کے دیکھ لوں کہ یہ کیسا چلتا ہے، اس نے جوتے اس کے ہاتھ میں دیے، گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بھگا کے لے گیا، جب وہ گھوڑا بھگا کے لے گیا تو جوتے اس کے ہاتھ میں ہیں اور یہ چلا جا رہا ہے کسی نے پوچھا کہ بھائی ابھی تم گھوڑا لیے جا رہے تھے اس کا کیا ہوا؟ کہنے لگا بیچ دیا، اس نے کہا کتنے کا بیچا؟ کہنے لگا جتنے کا لیا تھا اتنے کا بیچ دیا جوتے نفع میں ہیں، تو یہاں بھی حساب وہی ہوتا ہے کہ اگر دھوکہ کے ساتھ ایک جگہ سے زیادہ کما لو گے تو کوئی آپ سے بھی بڑا دھوکہ باز آپ کو مل جائے گا جو آپ کو لوٹ کر لے جائے گا۔

آپ نے دھوکہ دے کے کسی سے رشوت لے لی اور آپ کے پیسے ڈاکٹر کے پاس چلے گئے، سود کی رقم آپ نے جمع کر لی، پیسے مقدمہ پہ لگ گئے، آپ کسی کی جیب کاٹ کر لائے اور کوئی آپ سے زیادہ ہوشیار جیب تراش آپ کو مل گیا، ہوتا اسی طرح ہے کہ ایک طرف سے آتے ہیں اور دوسری طرف نکل جاتے ہیں لیکن ساری دنیا پریشان ہے ہر شخص اس بات کا گلہ کر رہا ہے کہ بڑی دھوکہ بازی ہے، تو ہر شخص دھوکہ دیتا ہے اور ہر شخص دھوکہ میں آتا ہے۔

اور اگر ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت ہو جائے، بات پھر بھی وہیں رہے گی لیکن ساری دنیا امن وسکون کے ساتھ رہے گی تو اس طرح آپس میں بھی ایک دوسرے کے حقوق میں خیانت نہ کیا کرو کیونکہ اس میں اجتماعی نقصان ہے، امن تب ہی ہوگا کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام میں بھی امانت کا خیال رکھو اور آپس کی امانات کا بھی خیال رکھو ان میں بھی خیانتیں نہ کیا کرو۔

اموال واولاد آزمائش کا باعث ہیں:

"وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ" یہ اصل میں رگ پکڑی ہے جس کی بناء پر انسان خیانت پر برانگیختہ ہوتا ہے، خیانت کا داعیہ جو پیدا ہوتا ہے اس میں سوائے حب مال اور حب اولاد کے کوئی دوسری چیز نہیں ہے

یا تو مال کی محبت ہے جس کی بناء پر انسان خیانت پر آمادہ ہوتا ہے یا اولاد کی محبت ہے، آپ جب چاہیں اس کا تجربہ کرلیں، لوٹ پوٹ کے بات یہیں آ کے ختم ہوتی ہے، اپنی اولاد کے لیے انسان بنانا چاہتا ہے، اپنی اولاد کو انسان زیادہ اچھا کرنا چاہتا ہے تو پھر اللہ کے احکام چھوڑتا ہے، اللہ کے رسول کے احکام چھوڑتا ہے، لوگوں سے دھوکہ بازیاں کرتا ہے، فریب کرتا ہے، زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو مال واولاد کی محبت میں آ کے یہ خیانتیں ہوتی ہیں، اللہ فرماتے ہیں یہ بات تو تم ہمیشہ یاد رکھا کرو، یقین کے درجہ میں جان لو کہ مال واولاد تمہارے لیے آزمائش ہیں، یہ فتنہ ہیں، اس آزمائش میں کامیاب ہوتے ہو یا نہیں؟ اگر اس آزمائش میں کامیاب نہ ہوئے اور اس مال واولاد کی محبت میں مبتلاء ہوگئے تو یہ آخرت میں بھی عذاب بنے گی بلکہ بسا اوقات یہی مال اور دولت دنیا میں بھی عذاب بن جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں، " فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ " اگلی سورۃ کے اندر یہ آیت آئے گی کہ ان منافقوں کے پاس مال واولاد دیکھ کے آپ ان پر تعجب نہ کریں کہ ان منافقوں اور کافروں کو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت کیوں دے رکھی ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارادہ تو ان کو عذاب میں مبتلاء کرنے کا ہے، کمانے میں پریشان، جمع ہونے کے بعد رکھنے میں پریشان، اولاد جس طرح والدین کو پریشان کرتی ہے یہ مثالیں بھی آپ کے سامنے ہیں، یہ دنیا کا عذاب ہے اور جب ناجائز طریقہ سے مال کو حاصل کیا ہوگا، ناجائز مال سے اولاد کو پالا ہوگا تو آخرت کا عذاب تو سر پہ کھڑا ہے۔

یہ مال واولاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض لوگوں کے لیے عذاب ہوتا ہے، یہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نعمت نہیں ہے، نعمت یہ تب بنتا ہے جب اس کو صحیح طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرو اور پھر اس کے اوپر اللہ کا شکر بجالاؤ، اس میں تصرف اسی طرح کرو جیسے اللہ کا حکم ہے تو خیانت چونکہ اسی مال واولاد کی محبت کی وجہ سے ہوتی ہے اس لیے آخر میں اس کے اوپر تنبیہ کردی، یقین کرلو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش کا ذریعہ ہیں "وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ" اور اس بات کا بھی یقین کرلو کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس اجر عظیم ہے، جو مال اور اولاد کی محبت میں مبتلاء نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالاتے ہیں ان کے لیے اللہ کے پاس اجر عظیم ہے۔

شانِ نزول:

اس آیت کا مضمون تو سب مسلمانوں کے لیے عام ہے مگر واقعہ اس کے نزول کا اکثر مفسرین کے نزدیک

حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے جو غزوہ بنو قریظہ میں پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بنو قریظہ کے قلعہ کا اکیس روز تک محاصرہ جاری رکھا جس سے عاجز ہو کر انہوں نے وطن چھوڑ کر ملک شام چلے جانے کی درخواست کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شرارتوں کے پیشِ نظر اس کو قبول نہیں فرمایا بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ صلح کی صرف یہ صورت ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تمہارے بارے میں جو کچھ فیصلہ کریں اسی پر راضی ہو جاؤ، انہوں نے درخواست کی کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بجائے ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو یہ کام سپرد کر دیا جائے کیونکہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے اہل وعیال اور جائداد بنو قریظہ میں تھے، ان سے یہ خیال تھا کہ وہ ہمارے معاملہ میں رعایت کریں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست پر حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا، بنو قریظہ کے سب مرد وزن ان کے گرد جمع ہو کر رونے لگے اور یہ پوچھا کہ اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اتر آئیں تو کیا معاملہ میں وہ کچھ نرمی فرمائیں گے، حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ ان کے معاملہ میں نرمی برتنے کی رائے نہیں ہے، انہوں نے کچھ لوگوں کی گریہ وزاری سے اور کچھ اپنے اہل وعیال کی محبت سے متاثر ہو کر اپنے گلے پر تلوار کی طرح ہاتھ پھیر کر اشارہ سے بتلا دیا کہ ذبح کئے جاؤ گے، گویا اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز فاش کر دیا۔

مال واولاد کی محبت میں یہ کام کر تو گزرے، مگر فوراً تنبہ ہوا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کی، جب وہاں سے واپس ہوئے تو اس درجہ ندامت سوار ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لوٹنے کی بجائے سیدھے مسجد میں پہنچے اور مسجد کے ایک ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک میری توبہ قبول نہ ہو گی، اس طرح بندھا رہوں گا، چاہے اسی حالت میں موت آجائے، چنانچہ سات روز مکمل اسی طرح بندھے کھڑے رہے ان کی بیوی اور لڑکی نگہداشت کرتی تھیں، انسانی ضرورت کے وقت اور نماز کے وقت کھول دیتیں اور فارغ ہونے کے بعد پھر باندھ دیتی تھیں، کھانے پینے کے پاس نہ جاتے تھے یہاں تک کہ غشی طاری ہو جاتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اول اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ اگر وہ اول ہی میرے پاس آجاتے تو میں ان کے لیے استغفار کرتا اور توبہ قبول ہو جاتی اب جب کہ وہ یہ کام کر گزرے تو اب قبولیت توبہ نازل ہونے کا انتظار ہی کرنا ہے چنانچہ سات روز کے بعد آخر شب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیتیں ان کی توبہ قبول ہونے کے متعلق نازل ہوئیں، بعض حضرات نے ان کو خوشخبری سنائی اور کھولنا چاہا مگر انہوں نے کہا کہ جب تک خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے نہ کھولیں گے

میں کھلنا پسند نہ کروں گا، چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے تو اپنے دستِ مبارک سے ان کو کھولا، آیت مذکورہ میں جو خیانت کرنے اور مال واولاد کی محبت سے مغلوب ہونے کی ممانعت کا ذکر آیا ہے اس کا اصل سبب یہ واقعہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو کردے گا وہ تمہارے لیے فرقان اور دور ہٹائے گا

عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ وَ

تم سے تمہارے گناہ اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ فضل عظیم والے ہیں ﴿۲۹﴾ اور

اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ

یاد کرو اس وقت کو جب مکر کرتے تھے آپ کے متعلق وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تاکہ وہ کافر آپ کو قید کرلیں یا آپ کو قتل کردیں یا آپ کو نکال دیں،

وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَاِذَا تُتْلٰى

وہ تو تدبیر کرتے تھے اور اللہ تدبیر کرتا تھا اور اللہ تدبیر کرنے والوں میں سے بہترین ہے ﴿۳۰﴾ اور جب پڑھی جاتی ہیں

عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاۗءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ

ان پر ہماری آیات تو کہتے ہیں ہم نے سن لیا اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسی بات کہہ دیں،

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ

نہیں ہیں یہ مگر پہلے لوگوں کے قصے ﴿۳۱﴾ اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب انہوں نے کہا

هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ

اے اللہ! اگر یہی حق ہے تیری جانب سے پھر برسا تو ہمارے اوپر پتھر آسمان سے

اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ

یا لے آ ہمارے پاس دردناک عذاب ﴿۳۲﴾ اور نہیں ہے اللہ کہ انہیں عذاب دے اس حال میں کہ

فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَمَا لَهُمْ

آپ ان میں ہوں اور نہیں ہے اللہ ان کو عذاب دینے والا اس حال میں کہ وہ استغفار کرتے ہوں ﴿۳۳﴾ اور کیا ہے ان کے لیے

اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

کہ اللہ انہیں عذاب نہ دے حالانکہ وہ روکتے ہیں مسجد حرام سے اور نہیں ہیں

وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ

یہ اس مسجد کے متولی ، نہیں ہیں مسجد کے متولی مگر متقین لیکن ان میں سے اکثر

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً

علم نہیں رکھتے ﴿۳۴﴾ اور نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس مگر سیٹیاں بجانا

وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ

اور تالیاں بجانا ، پس چکھو تم عذاب اس کفر کے سبب سے جو تم کرتے تھے ﴿۳۵﴾ بے شک

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ روکیں اللہ کے راستہ سے

فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۬ؕ

پس وہ عنقریب خرچ کریں گے اپنے مالوں کو پھر وہ مال ان کے اوپر باعثِ حسرت ہوں گے پھر یہ مغلوب ہو جائیں گے

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ ۙ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ

اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وہ جہنم کی طرف جمع کیے جائیں گے ﴿۳۶﴾ تاکہ جدا کردے اللہ خبیث کو

مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ

طیب سے اور کر دے خبیث کو بعض کو بعض پر پھر اس کو

جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ ع

تہہ لگا دے پھر اس کو جہنم میں کر دے یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں ﴿۳۷﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

غزوۂ بدر کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کو جو نصیحتیں کی جارہی ہیں اس رکوع کی ابتدائی آیات بھی اسی مضمون سے تعلق رکھتی ہیں۔

تقویٰ کے نتیجہ میں فتح تمہارا مقدر ہوگی:

غزوۂ بدر کا خاکہ آپ کے سامنے گذر چکا کہ مشرکین کی کثیر تعداد تھی اور وہ بہت زیادہ مسلح تھے، مادی اسباب ان کو حاصل تھے، جتھہ ان کا بڑا تھا، اور ان کے مقابلہ میں اہل ایمان کی تعداد بہت کم تھی، بے سروسامان تھے، فقروفاقہ میں مبتلاء تھے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ ان لوگوں کے پاس تھا، یہ اللہ سے ڈرنے والے تھے، اللہ کے نبی کی قیادت میں کام کررہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کن جنگ کے ذریعے ان کو فتح دی، اسی واقعہ کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! اگر آئندہ بھی تقویٰ اختیار کروگے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہوگے "یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا" تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے فرقان کردے گا کہ یہ میدان بھی فیصلہ کن ثابت ہوا لیکن ابھی چاروں طرف کفر ڈٹا ہوا ہے اور تم لوگ کفر کے گھیرے میں ہو تو یہ نہ سمجھنا کہ یہ عارضی فتح ہوگئی اگر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہوگے، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کروگے تو اللہ تعالیٰ اور فیصلہ نمایاں کردے گا، ایسا فیصلہ ہوجائے گا کہ پھر حق ہی حق چمکے گا اور باطل مٹ جائے گا، جتنا اللہ سے ڈروگے، اس کے احکام کی پابندی کروگے اتنا ہی اللہ تبارک وتعالیٰ حق کو زیادہ چمکائیں گے اور باطل کو مٹائیں گے تو فرقان سے یہی فرقان مراد ہے کہ حق غالب آجائے اور باطل مٹ جائے، تقویٰ کے نتیجہ میں یہ ہوگا۔

تقویٰ سے باطن کی حس تیز ہوجاتی ہے:

اور بعض حضرات نے فرقان سے مراد دل کی کیفیت لی ہے کہ تقویٰ اگر انسان اختیار کرے، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرے تو قلب کے اندر ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے، قلب کا ذوق اور قلب کی حس اس قدر تیز ہوجاتی ہے کہ حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنا انسان کے لیے آسان ہوجاتا ہے پھر ظاہری دلائل میں زیادہ الجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی پھر انسان کا دل گواہی دیتا ہے کہ حق کدھر ہے اور باطل کدھر ہے؟ حرام کیا ہے، حلال کیا ہے؟

تقویٰ کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ دل کے اندر فیصلہ کی قوت پیدا فرمادیتے ہیں اور یہ بات بھی بالکل صحیح ہے، واقعہ کے مطابق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے کے ساتھ باطنی حس انسان کی ایسی اجاگر ہوجاتی ہے کہ پھر دل کی آواز ہوتی ہے کہ یہ بات صحیح ہے اس طرح کرلو اور یہ بات غلط ہے اس سے باز آجاؤ۔

اور جس وقت یہ مرتبہ اور مقام حاصل ہوجاتا ہے تو پھر "اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ" یہ شریعت کی طرف سے حکم ہے، حدیث شریف میں جس طرح آتا ہے کہ اپنے دل سے پوچھ لیا کرو کہ نیکی کیا ہے، برائی کیا ہے، دل بھی تمہیں اطلاع دے دے گا، دل کے ذریعے سے بھی احساس ہوجاتا ہے کہ یہ اچھائی ہے اور یہ برائی ہے، تقویٰ کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ قلب کے اندر یہ بصیرت پیدا فرمادیتے ہیں، اور جتنا انسان فسق وفجور میں مبتلاء ہوتا ہے اتنا قلب کا ذائقہ بگڑتا جاتا ہے حتیٰ کہ قلب میں اتنی بے حسی آجاتی ہے کہ اس کو اچھائی برائی کی کوئی تمیز ہی نہیں رہتی بلکہ اور زیادہ فساد آجائے تو برائی کو لذیذ سمجھنے لگ جاتا ہے اور اچھائی سے بدکنے لگ جاتا ہے تو تقویٰ کا یہ فائدہ بھی ہے۔

بہر حال دونوں باتیں قریب قریب ہی ہیں کہ فرقان حاصل ہوجاتا ہے چاہے ظاہری ہو چاہے باطنی، باطنی تو وہ بصیرت ہے جس کے ذریعہ سے انسان حق اور باطل کے درمیان فرق کرسکتا ہے اور ظاہر کے اندر دلائل کے ساتھ، معجزات کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی نصرت کے ساتھ باطل دب جاتا ہے اور حق غالب آجاتا ہے تو فرقان کا یہ مصداق بھی بن سکتا ہے، متقین کے دل بھی حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو ظاہری طور پر دلائل میں زیادہ الجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی پھر قلب شہادت دیتا ہے کہ یہ کام صحیح ہے یا نہیں؟ یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں؟

تقویٰ پر گناہوں کی معافی اور مغفرت کی بشارت:

ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ تمہارے لیے فرقان ہوجائے گا، حق کا غلبہ نمایاں ہوجائے گا اور باطل مٹ جائے گا، اس کی کوئی شان وشوکت باقی نہیں رہے گی اور دوسرا تقویٰ کا فائدہ یہ ہوگا کہ "يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ" اللہ تعالیٰ تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہ تم سے دور کردے گا "وَيَغْفِرْ لَكُمْ" اور تمہیں بخش دے گا یعنی عام طور پر تو ہے متقی اور متقی بننے کے لیے شرط ہے "اجتناب عن الکبائر" کبیرہ گناہوں سے بچو، کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کرو، فرائض کی پابندی ہو کیونکہ فرائض کا چھوڑنا بھی کبیرہ گناہ ہے جس طرح زنا حرام ہے اسی طرح ترک صلوٰۃ بھی حرام ہے، جس طرح چوری حرام ہے اسی طرح روزہ کا چھوڑنا بھی حرام ہے اس لیے فرائض کی پابندی اور کبائر سے اجتناب یہ ہے تقویٰ، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ" جن

چیزوں سے تمہیں روکا گیا ہے ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے تم بچتے رہو چھوٹے چھوٹے گناہ ہم دور ہٹادیں گے کیونکہ معمولی معمولی لغزشیں یہ تو بشر سے لازماً سرزد ہوتی رہتی ہیں، انسان جس وقت اس دنیا میں رہتا ہے تو چھوٹی موٹی غلطیاں تو ہو ہی جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وہ ہم معاف کردیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ تم بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو۔

یہاں بھی ایسے ہی ہے کہ تقویٰ اختیار کرو، فرائض کی پابندی کرو، کبائر سے بچو، چھوٹے موٹے گناہوں کی کیا بات ہے وہ ہم معاف کردیں گے، تقویٰ کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا اور اگر تقویٰ اختیار نہیں کروگے، کبائر سے نہیں بچوگے تو پھر صغائر ان کبائر کے اندر زیادہ وزن پیدا کرتے ہیں، صغائر کبائر کا وزن اور بڑھادیتے ہیں اور اگر کبائر سے بچوگے تو چھوٹے چھوٹے گناہ اللہ اپنے فضل کے ساتھ، نیکیوں کی برکت سے معاف کرتے رہتے ہیں، "وَيَغْفِرْ لَكُمْ" اور آخرت میں اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دیں گے، یہ سب تقویٰ کے فائدے ہیں اس لیے تمہیں چاہیئے کہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہا کرو، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرو، "وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ" اللہ تعالیٰ تو بہت فضل والے ہیں، بخشیں گے بھی اور اپنی طرف سے اور بھی بڑھا چڑھا کر عطا کریں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرِ ہجرت اور اس کے اسباب:

اگلا واقعہ جو نقل کیا جارہا ہے وہ یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تقویٰ کی برکات بتارہے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہوجائے تو پھر حق وباطل کے درمیان فرق مشکل نہیں رہ جاتا اور متقی لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت ایسے ہوتی ہے چاہے ظاہری اسباب کتنے ہی خلاف کیوں نہ ہوں اللہ تعالیٰ حق کو باطل پر کس طرح غالب کرتے ہیں اس کا ایک نمونہ دکھایا جارہا ہے، یہ نمونہ ہے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے موقع کا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو مدینہ منورہ کی طرف منتقل ہوگئے اور کچھ حبشہ چلے گئے تو مشرکین یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ یہ بات تو بڑھتی جارہی ہے اس کو کسی طرح مٹانا چاہیئے، یہ کشاکشی جو شروع ہوگئی اس کو ختم کرنا چاہیئے تو اپنے دارالندوہ میں اکٹھے ہوگئے کہ اب اس تحریک کو دبانے کی کیا صورت ہے، یہ جو مذہبی اختلاف شروع ہوگیا اس کو ختم کرنے کی صورت کیا ہے؟ اس لیے رؤساء مکہ نے مشورہ کے لیے دارالندوہ میں ایک خاص مجلس طلب کی، دارالندوہ مسجد حرام کے متصل قصی بن کلاب کا مکان تھا جس کو ان لوگوں نے قومی مسائل میں مشورہ اور مجلس کرنے کے لیے مخصوص کررکھا تھا اور زمانہ اسلام میں اس کو مسجد حرام میں داخل کرلیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ موجودہ باب

الزیارات ہی وہ جگہ تھی جس کو دارالندوہ کہا جاتا تھا۔

حسب عادت اس اہم مشورہ کے لیے قریشی سرداروں کا اجتماع دارالندوہ میں ہوا جس میں ابوجہل، نضر بن حارث، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف، ابوسفیان وغیرہ قریش کے تمام نمایاں اشخاص شامل ہوئے اور رسول کریم ﷺ اور اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے مقابلہ کی تدبیریں زیرِ غور آئیں۔

ابھی مشورہ کی مجلس شروع ہی ہوئی تھی کہ ابلیس لعین ایک سن رسیدہ عربی شیخ کی صورت میں دارالندوہ کے دروازہ پر آ کھڑا ہوا، لوگوں نے پوچھا کہ تم کون ہو اور کیوں آئے ہو؟ بتلایا کہ میں نجد کا باشندہ ہوں مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ ایک اہم مشورہ کر رہے ہیں تو قومی ہمدردی کے پیش نظر میں بھی حاضر ہو گیا کہ ممکن ہے میں کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔

یہ سن کر اس کو اندر بلا لیا گیا اور مشورہ شروع ہوا تو ابوالبختری ابن ہشام نے یہ مشورہ پیش کیا کہ ان کو یعنی حضرت محمد ﷺ کو آہنی زنجیروں میں قید کر کے مکان کا دروازہ بند کر دیا جائے اور چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ معاذ اللہ! وہ آپ اپنی موت مر جائیں، یہ سن کو شیخ نجدی ابلیس لعین نے کہا کہ یہ رائے صحیح نہیں، کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو معاملہ چھپے گا نہیں بلکہ اس کی شہرت دور دور پہنچ جائے گی اور ان کے صحابہ اور رفقاء کے فدائیانہ کارنامے تمہارے سامنے ہیں، بہت ممکن ہے کہ یہ لوگ جمع ہو کر تم پر حملہ کر دیں اور اپنے قیدی کو تم سے چھڑا لیں، سب طرف سے آوازیں اٹھیں کہ شیخ نجدی کی بات صحیح ہے اس کے بعد ابوالاسود نے یہ رائے پیش کی کہ ان کو مکہ سے نکال دیا جائے یہ باہر جا کر جو چاہیں کرتے رہیں ہمارا شہر ان کے فساد سے مامون ہو جائے گا، اور ہمیں کچھ جنگ وجدال بھی کرنا نہ پڑے گا۔

شیخ نجدی یہ سن کر پھر بولا کہ یہ رائے بھی صحیح نہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کیسے شیریں کلام آدمی ہیں، لوگ ان کا کلام سن کر مفتون اور مسحور ہو جاتے ہیں، اگر ان کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا تو بہت جلد اپنی طاقتور جماعت بنا لیں گے اور تم پر حملہ کر کے شکست دے دیں گے، اب ابوجہل بولا کہ جو کرنے کا کام ہے تم میں سے کسی نے نہیں سمجھا، میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے وہ یہ کہ ہم عرب کے سب قبیلوں میں سے ہر قبیلہ کا ایک نوجوان لے لیں اور ہر ایک کو عمدہ کام کرنے والی تلوار دے دیں، یہ لوگ یکبارگی ان پر حملہ کر کے قتل کر دیں، ہم ان کے فساد سے تو اس طرح نجات حاصل کر لیں، اب رہا ان کے قبیلہ بنوعبد مناف کا مطالبہ جو ان کے قتل کے سبب ہم پر عائد ہوگا سو ایسی صورت

میں جب کہ قتل کسی ایک نے نہیں بلکہ ہر قبیلہ کے ایک ایک شخص نے کیا ہے تو قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینے کا مطالبہ تو باقی نہیں رہ سکتا، صرف خون بہا یا دیت کے مال کا مطالبہ رہ جائے گا وہ ہم سب قبیلوں سے جمع کر کے ان کو دے دیں گے اور بے فکر ہو جائیں گے۔

شیخ نجدی ابلیس لعین نے یہ سن کر کہا کہ بس رائے یہی ہے اور اس کے سوا کوئی چیز کارگر نہیں، پوری مجلس نے اسی کے حق میں رائے دے دی اور انہوں نے آج ہی رات میں اپنا یہ ناپاک عزم پورا کرنے کا تہیہ کر لیا۔

چنانچہ اسکیم بن گئی، اب سارے کے سارے اسباب ان کے پاس ہیں، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا ہیں یا صرف دو چار آدمی تھے جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور کچھ ضعفاء بھی تھے جو کوئی نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے ورنہ اکثر آپ کے احباب، محبین بمع حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے سب وہاں سے ہجرت کر کے جا چکے تھے، اکثر لوگ جا چکے تھے اور یہ چند افراد باقی تھے، اب سارا مکہ خلاف ہے، ماحول ان کا ہے، غلبہ ان کا ہے، اسباب ان کو حاصل ہیں تو اپنے طور پر ان کو کامیابی کا یقین تھا وہ چاہتے تھے کہ بس آج رات فیصلہ کر دیں تا کہ قصہ ہی ختم ہو جائے، جب انہوں نے اس طرح مشورہ کر لیا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اطلاع ہو گئی جب اطلاع ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لٹایا اور گھر کے اندر جو لوگوں کی امانتیں رکھی ہوئی تھیں وہ امانتیں ان کے سپرد کیں کہ یہ فلاں فلاں کی چیز ہے ان کے سپرد کر دینا اور خود آپ نے رات کے وقت اپنے گھر سے خروج کیا، محاصرہ ہو چکا تھا، مشرکین ارد گرد تھے لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے آپ کی ایسی حفاظت ہوئی کہ آپ نے سورۃ یٰسین پڑھتے ہوئے ایک مٹھی خاک کی لی اور اس طرح بکھیری کہ جو سارے کافروں کی آنکھوں اور ان کے سروں میں پڑ گئی، اس نرغہ میں سے آپ نکلے اور کوئی آپ کو دیکھ نہیں سکا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے ان کو ساتھ لیا مشورہ پہلے ہو چکا تھا، پہلے سے طے شدہ بات تھی، ثور پہاڑ کے اوپر ایک غار متعین تھی وہاں تشریف لے گئے اور اس طرح کفار خائب و خاسر رہ گئے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، ان کا مقصد تھا قتل کرنا، قتل ہونے سے اللہ تعالیٰ نے بچا لیا اور دن کی روشنی میں ان کو پتہ چلا کہ جس کو ہم قتل کرنا چاہتے تھے وہ تو نکل گیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں لیٹے ہوئے تھے، ان کو انہوں نے کچھ کہنا نہیں تھا، ان سے تو دشمنی نہیں تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی تاریخ اور سن ہجری کی ابتداء:

اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ لوگوں نے تو چودھویں صدی کو ختم کر دیا، ۲۹ ذی الحج پر اور یکم محرم سے

پندرھویں صدی شروع ہوگئی اور میں نے نہیں سنا کہ کسی نے اس بات کی طرف توجہ دی ہو، میں نے اس بات کو کئی مجلسوں میں ذکر کیا کہ چودھویں صدی ابھی ختم نہیں ہوئی، چودھویں صدی ختم ہونے کے بعد پندرھویں صدی کا آج (یکم ربیع الاول) پہلا دن ہے، چودھویں صدی کل ختم ہوئی کیونکہ سرور کائنات ﷺ گھر سے جو نکلے ہیں اور حقیقتاً ہجرت کا جو واقعہ پیش آیا تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۷ صفر کو آپ گھر سے نکلے ہیں، پھر آپ تین دن غار میں رہے ہیں، اور ربیع الاول کی یکم تاریخ کو رسول اللہ ﷺ غار سے نکلے ہیں، غار سے نکل کے مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا ہے اور بارہ ربیع الاول کو رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ پہنچے ہیں، تو اب اگر ہجرت کی تاریخ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد قرار دی جائے تو حقیقتاً چودہ سو سال ہونے کو ابھی بارہ دن باقی ہیں، اور اگر سفر کے آغاز کو دیکھا جائے تو جب مکہ معظمہ سے چلے تھے تو وہ آج چودہ سو سال پورے ہوگئے باقی یہ سن ہجری یکم محرم سے جو شروع کیا گیا یہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک انتظامی سہولت کے طور پر کر دیا کہ بارہ ربیع الاول یا یکم ربیع الاول سے سال کیسے شروع ہو جبکہ عام طور پر معمول یہی تھا کہ سال شروع ہوتا ہے محرم سے تو سال کی ابتداء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے یکم محرم سے قرار پائی ہے جیسے آج اگر کوئی اہم واقعہ کسی مہینہ میں پیش آجائے، صفر میں پیش آجائے، ربیع الاول میں پیش آجائے تو اس اہم واقعہ کی تاریخ کو اگر یاد نہ رکھا جائے بلکہ صرف سال کو ہی یاد رکھ لیا جائے کہ اس واقعہ کو چار سال ہوگئے، پانچ سال ہوگئے، چھ سال ہوگئے، اسی طرح ہجری سال کی ابتداء یکم محرم سے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے ہوئی ہے ورنہ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ جانے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو سال شروع کرتے تھے تو یہ ربیع الاول سے شروع کرتے تھے، اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''نشر الطیب'' میں جہاں سن وار واقعات بیان کیے ہیں تو وہاں لکھا ہے کہ یہ جو ہم سن ذکر کریں گے یہ وہ ہوگا جو ربیع الاول سے لیکر ربیع الاول تک ہے اس لیے مثال کے طور پر پہلے سال جو محرم میں واقعات پیش آئے تو وہ سال اول کا واقعہ ہیں، سال ثانی کا نہیں ہیں ورنہ تو ذی الحج پر سال پورا ہو کے محرم اگلے سال میں شمار ہو جائے ایسا نہیں کیا گیا، تو اس لحاظ سے آج (یکم ربیع الاول ۱۵۰۰ھ) جس وقت آپ یہ سبق پڑھ رہے ہیں آج پندرھویں صدی کا پہلا دن ہے اگر ثور سے نکلنے کا اعتبار کیا جائے اور اگر گھر سے نکلنے کا اعتبار کیا جائے تو پھر گھر سے نکلنے کی تاریخ ۲۷ صفر ہے اور ثور سے تین دن کے بعد نکلے ہیں اور پھر بارہ دن کی مسافت کے بعد مدینہ منورہ آپ بارہ ربیع الاول کو پہنچے ہیں تو ہجرت کی ابتداء ربیع الاول میں ہوئی بایں معنی کہ ثور سے چلے اور بارہ کو مدینہ منورہ پہنچے تو اگر آپ نے سن شروع کرنا ہے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد تو ابھی چودھویں صدی کے بارہ دن باقی ہیں اور اگر سفر کا آغاز دیکھنا ہے تو سفر کا آغاز ہوا یکم ربیع الاول کو تو آج گویا کہ پندرھویں صدی کا

پہلا دن ہے اور چودھویں صدی کل پوری ہوئی ہے۔

تو ہجرت کا واقعہ ان آیات کے اندر ذکر کیا گیا ہے جو آج آپ کا سبق ہے اور ہجرت کا واقعہ بھی انہی تاریخوں میں پیش آیا اور یہ حسن اتفاق ہے کہ ہمارا سبق بھی انہی تاریخوں میں ہو رہا ہے۔

اسلامی تاریخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کی اہمیت:

تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے، مشرکوں نے آپ کو قتل کرنے کی تدبیر کی اور تدبیر اللہ نے بھی کی آپ کو بچانے کی لیکن تدبیر اللہ کی غالب آئی اللہ کی تدبیر غالب کس طرح رہی؟ ایک تو اللہ تعالیٰ نے بچانا چاہا تو بچا لیا، وہ قتل کرنا چاہتے تھے لیکن آپ قتل نہ ہوئے پھر دشمن یہ سمجھتا ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہیں کہ ہم نے اپنے شہر سے نکال دیا، ہمارے پہلو کا یہ کانٹا جو ہر وقت چبھتا رہتا ہے وہ ہم سے دور ہو گیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لے جانا ایسے تھا جیسے قوم کا دل رخصت ہو گیا، روح نکل گئی، جس وقت تک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود تھے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے عذاب سے حفاظت تھی جس طرح آگے آپ کے سامنے یہ بات آ رہی ہے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے تشریف لے گئے تو امان ختم ہو گیا، اب وہ وقت ہے کہ جس سے پھر ان کی تباہی شروع ہو گئی، اور ان کی تباہی کی ابتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سن ہجرت سے ہوتی ہے اور آپ وہاں سے تشریف لے گئے تو وہ سمجھے کہ بے دخل ہو گئے ہیں، باہر ان کو مشکلات پیش آئیں گی لیکن آنے والے واقعات نے بتا دیا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ معظمہ سے تشریف لے جانا ایسے تھا جیسے بادلوں سے سورج باہر آ گیا کہ مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے ظلمت کے بادل چڑھے ہوئے تھے اور روشنی نہیں پھیل رہی تھی اب مدینہ منورہ میں جائیں گے تو دیکھو! حق کی روشنی کس طرح پھیلتی ہے۔

یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی تدبیر کے اندر خیر کے پہلو ہیں کہ مشرک کیا چاہتے تھے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح کامیابی کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچایا گیا اور کس طرح کامیابی کے ساتھ آپ کے دین کی اشاعت ہوئی اور یہ مشرک کس طرح حق کے ساتھ ٹکرائے اور ٹکرانے کے بعد کس طرح پاش پاش ہوئے، ان کی بربادی کی تاریخ یہ بھی ہجرت کی تاریخ ہے اور اسلام کے عروج کی تاریخ بھی ہجرت کی تاریخ ہے اور یہی حکمت ہے اس بات میں کہ اسلامی سن کی ابتداء اسی سے کی گئی ہے کیونکہ یہ گویا کہ حق کے چمکنے کا سنگ میل ہے، یہاں سے حق چمکنا شروع ہوا ہے اور مشرکین کی بربادی شروع ہوئی اور اسلام کا غلبہ نمایاں ہونا شروع ہوا، یہ پہلی تاریخ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے

رسول اللہ ﷺ کو مشرکوں کے نرغہ سے نکالا ہے، یہ سورج بادلوں سے باہر آیا ہے ورنہ اگر اسلامی تاریخ کی ابتداء کی جاتی تو سن نبوت سے ابتداء ہو جاتی جب وحی اتری تھی اسی سے سن شروع ہو جاتا، لیلۃ المعراج سے سن شروع ہو جاتا، سرور کائنات ﷺ کی وفات سے شروع کردیا جاتا وہ بھی تو ایک بہت بڑا واقعہ ہے، آپ ﷺ کی ولادت سے شروع کردیا جاتا لیکن نہ یہ سن ولادت سے شروع ہوا، نہ یہ سن نبوت سے شروع ہوا، نہ یہ سن لیلۃ المعراج سے شروع ہوا، نہ یہ سن آپ ﷺ کی وفات سے شروع ہوا بلکہ سن کی بنیاد اگر رکھی گئی تو آپ کی تاریخ ہجرت سے رکھی گئی اس لیے کہ اسلام کے غلبہ کی تاریخ یہی ہے یعنی وہ مٹانا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی تاریخ اور اسی جگہ سے آپ کو ابھارا ہے تو یہ وہی مشورہ ہے جو وہ کر رہے تھے اللہ تعالیٰ کی نصرت کیسے ہوئی اور آپ کو ان مخالف حالات سے کیسے بچالیا گیا اس آیت کے اندر اس کو ذکر کیا گیا ہے۔

غارِ ثور میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کا اظہار:

یاد کیجیے جبکہ آپ کے متعلق تدبیریں کرتے تھے یہ کافر لوگ تاکہ آپ کو قید کردیں، ایک جگہ جما کے بٹھادیں یعنی کسی کو ملنے نہ دیں یا باندھ کے کسی کمرہ میں ڈال دیں یا آپ کو قتل کردیں یا آپ کو نکال دیں اور وہ تدبیریں کرتے تھے اور اللہ بھی تدبیر کرتا تھا، اللہ تعالیٰ بہترین تدبیر کرنے والا ہے، اس تدبیر میں سارے سفر کی تدبیر شامل ہے کہ کیسے آپ ان کے چنگل سے نکلے اور کس طرح آپ ثور پہ پہنچے اور اس غار میں آپ جا کے بیٹھے، مشرکوں نے کس طرح آپ کا پیچھا کیا، اور وہاں پہنچنے کے بعد بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے کس طرح حفاظت فرمائی؟

اگر آپ جا کر اس پہاڑ کو دیکھیں تو پھر یہ مکمل صورت سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرور کائنات ﷺ کی حفاظت کس طرح فرمائی ہے، وہ غار کیسی ہے جس کے اندر آپ ﷺ جا کر بیٹھے اور دروازہ اس کا کس طرح سے ہے کہ اس کے اوپر مکڑی نے جالا تن دیا، کبوتری نے انڈے دے دیے، وہ آئے اور انہوں نے آ کر دیکھا کہ یہاں تو کوئی نہیں ہوسکتا اگر ہوتا تو یہ جالا کیسے باقی رہ گیا اور یہ کبوتری کے انڈے کس طرح باقی رہ سکتے ہیں اور اس غار کی اس طرح بناوٹ ہے کہ اندر بیٹھا ہوا آدمی باہر اگر دیکھے تو دروازہ پر کھڑے ہوئے آدمی کے قدموں پر نظر پڑتی ہے، ہم جس وقت وہاں گئے تو پون گھنٹہ تقریباً ہم نے لگایا ہے اس بات کی تحقیق پر کہ آپ ﷺ اس غار میں کدھر سے آئے ہوں گے اور کیسے اس میں بیٹھے ہوں گے، اور وہ مشرک کہاں کھڑے ہوں گے کہ جیسے ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ اگر یہ اپنے قدموں کی طرف جھک کر دیکھ لیں تو ہم نظر آجائیں گے، رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" ڈرنے کی بات نہیں ہے اللہ ہمارے

ساتھ ہے، ابوبکر! تیرا ان دو کے متعلق کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جھک کے قدموں کی طرف دیکھنے کی توفیق ہی نہیں دی تو پھر ہم نے باہر اپنے ساتھیوں کو کھڑا کیا کہ دیکھیں قدموں پہ نظر کس طرح پڑتی ہے اور جھکنے کے ساتھ اندر کس طرح دیکھا جا سکتا ہے، میں اس میں لیٹا اور میرا سر مولوی فیروز صاحب کی گود میں تھا تو ہم نے وہ ساری کی ساری صورت بنانے کی کوشش کی تا کہ اطمینان ہو جائے کہ واقعی اس طرح واقعہ پیش آیا تھا تو اس سفر میں بہت لطف آیا۔

تو آخر ایک نقشہ بنانے میں ہم کامیاب ہو گئے یعنی جتنے احتمالات نکل سکتے تھے وہ سارے کے سارے احتمال ہم نے نکال کے دیکھے، آخر ہمارا اتفاق ہوا کہ یہ صورت پیش آئی ہوگی، یہاں بیٹھے ہوں گے، یہاں لیٹے ہوں گے، اور یہ دروازہ تھا اور مشرک یہاں کھڑے ہوں گے، یہ ساری صورت ہم نے بنا کے دیکھی تھی۔

تو یہ سارے کے سارے "خَيْرُ الْمَاكِرِينَ" کے اندر چھپے ہوئے تدبیر کے پہلو ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر کیسی اچھی تھی کہ سارے کے سارے اپنے آپ کو سمجھتے تھے کہ ہم سمجھدار ہیں، بہت عقلمند ہیں، ہمارے پاس بڑے اسباب ہیں لیکن ہر جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کو رسوا کیا اور یہ کسی چیز میں کامیاب نہ ہو سکے۔

کوئی رافضی غارِ ثور پر نہیں چڑھ سکتا:

غارِ ثور بہت بلندی پر ہے یعنی غارِ حرا کے مقابلہ میں بھی تین گنا بلندی پہ ہے اور اہل مکہ کہتے تھے اور ہمیں بعض دوستوں نے بتایا کہ مکہ کے اندر اہل مکہ کے نزدیک یہ روایت متواتر چلی آتی ہے کہ کوئی رافضی ثور پہ نہیں چڑھ سکتا اور واقعی وہاں چڑھنا ایک ہمت اور مستقل ارادہ چاہتا ہے اتنی دشوار گزار چڑھائی ہے کہ ہر کسی کے بس کی بات بھی نہیں ہے لیکن یہ سنی لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان کا نقشہ دیکھنے کے لیے کہ کیسی مشقت کی بات تھی اور وہ کیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا کر لے گئے اور کیسی وہ ویران جگہ ہے تو اس کو دیکھنے کے لیے حقیقت ہے کہ عشق کا مارا ہوا ہی جا سکتا ہے، اور اس جگہ کو دیکھنے کے لیے عورتیں تک جاتی ہیں اور ہم نے اوپر جاتے ہوئے کم از کم چھ سات جگہ بیٹھ کر سانس لیا ہوگا تو تب جا کے اوپر پہنچے، پانی ساتھ لے کر جاتے ہیں ورنہ پیاس لگتی ہے، بہت دشوار گزار راستہ ہے تو جب رافضی کو تو نفرت ہے اس کو تو عشق ہے ہی نہیں تو اس نے اس کے اوپر کیا چڑھنا؟ اس پر چڑھنے کے لیے عشق و محبت چاہیئے، ہمیں تو اس سفر میں بہت لطف آیا۔

"وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ" کے اندر یہ ساری چیزیں سمیٹ دی گئی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے کس

طرح محفوظ رکھا اور ان مشرکوں کو اپنے ارادہ کے اندر کامیاب نہ ہونے دیا۔

"وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا" کا مفہوم:

"وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا" جس وقت ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسی باتیں کر سکتے ہیں، یہ نضر بن حارث ایک مشرک تھا وہ یہی کہتا تھا کہ یہ کیا کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کلام ہے، ہم نے یہ ساری آیتیں سن لی ہیں، ان میں کیا رکھا ہے سوائے اس کے کہ پہلے لوگوں کے قصے، کہانیاں ہیں اور اگر ہم چاہیں تو کیا ہم ایسی باتیں نہیں کر سکتے، لوگوں کے دل سے اس قرآن کی عظمت کو ختم کرنے کے لیے وہ اس قسم کی باتیں کرتا تھا لیکن اس احمق سے کوئی پوچھے کہ اگر تم چاہو تو ایسی باتیں کرلو پھر تم چاہتے کیوں نہیں جبکہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ اس جیسی کوئی سورۃ بنا کے لاؤ اگر تم سچے ہو، قرآن کریم نے تو بار بار چیلنج کیا ہے کہ اس کی مثل لے آؤ، پھر کہا کہ دس سورتوں کی مثل لے آؤ اور پھر کہا کہ ایک ہی سورۃ کی مثل لے آؤ اور پھر یہ چیلنج کیا کہ "لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا" کہ یہ اس کی مثل لا بھی نہیں سکتے اور لائیں گے بھی نہیں، اس طرح جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے قرآن کہہ رہا ہے کہ میری مثل لے آؤ تو یہ پتہ چلے کہ یہ انسان کی کلام ہے یا اللہ کی کلام ہے۔

قرآن کریم نے تو اپنی صداقت کا معیار ہی اس بات پہ رکھا ہے کہ تم اس کی مثل لاؤ تو تم سچے کہ یہ کسی انسان کا کلام ہے، وہ کہتے ہیں اگر ہم چاہیں تو بنالیں لیکن پھر بناتے کیوں نہیں؟ صرف وہی بات ہے کہ لوگوں کے ذہن سے اس کی عظمت نکالنے کے لیے اس قسم کی باتیں کرتے تھے جیسے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایسی بات ہے جیسے کوئی کہتا ہے کہ میرا گھوڑا اگر چل پڑے تو ایک ہی دن میں لندن پہنچے لیکن کیا کروں چلتا ہی نہیں ہے، یہاں بھی وہی بات ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ایسی باتیں ہم بھی کر سکتے ہیں لیکن پھر کرتے کیوں نہیں؟ قرآن کریم تو بار بار چیلنج کرتا ہے اور اپنی صداقت کا مدار ہی اس پر رکھتا ہے کہ تم نہیں کر سکتے، لیکن جب بدبختی غالب آتی ہے تو انسان اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔

کفار مکہ کی طرف سے عذاب کا مطالبہ:

"وَإِذْ قَالُوا" اور یہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے جب انہوں نے خود کہا تھا کہ اے اللہ! اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پہ پتھر برسا یا ہمارے پاس آسمان کی طرف سے عذاب لے آ، ہم پر پتھر برسا آسمانوں سے یا لے آ ہمارے پاس دردناک عذاب، یہ بھی ان کی ہٹ دھرمی کی بات ہے ورنہ دیکھو! عقل مندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ

ہاتھ اٹھاتے اللہ کے سامنے اور بیت اللہ کا غلاف پکڑ کے کہتے کہ یا اللہ! اگر یہ تیری طرف سے واقعی حق ہے تو ہمیں سمجھنے کی توفیق دے، ہمیں قبول کرنے کی توفیق دے تو دعا تو یوں ہونی چاہیے اگر یہ واقعی حق ہے تیری طرف سے یہ جو باتیں کی جارہی ہیں تیری طرف سے ہیں اور یہ واقعی حق ہیں تو ہمیں سمجھنے کی توفیق دے، ہماری عقل میں ڈال دے، ہمارے دل میں ڈال دے، ہمارے دل میں جو اس سے نفرت ہے وہ دور کردے، اگر یہ حق ہے تو ہمیں قبول کرنے کی توفیق دے بات تو یوں ہونی چاہیے، لیکن جب انسان ضد میں آجاتا ہے تو اپنی پختگی ظاہر کرنے کے لیے کہتا ہے اگر یہی دین حق ہے تو ہمیں غرق ہو جانا منظور ہے، ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں، یہ ضد کی انتہاء ہوتی ہے تو اگر یہی حق ہے تیری طرف سے جو یہ باتیں کرتے ہیں تو ایسے حق سے تو ہمیں پتھروں کی بارش منظور ہے، پھر تو دردناک عذاب ہم پر ڈال دے یہ ضد کی انتہاء ہے۔

کفارِ مکہ پر عذاب نہ آنے کی وجوہات:

اب وہ اپنی زبان سے عذاب مانگتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں عذاب تو ان پر آنا چاہیے جیسے کہ آگے آئے گا کیا حق ہے کہ ان پر عذاب نہ ہو، کیا استحقاق ہے کہ ان کو عذاب نہ ہو جب ان کی کرتوتیں یہ ہیں لیکن ان کا مانگا ہوا عذاب ان پر کیوں نہیں آرہا؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ان میں موجود ہیں، آپ کا وجود ان کی زندگی کی ضمانت ہے اور اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ جب تک نبی کسی قوم میں موجود رہتا ہے اس وقت تک اس قوم پر عذاب نہیں آتا، استحصالی عذاب نہیں آتا کہ جس میں ان کی جڑ کاٹ دی جائے واقعات آپ کے سامنے گزرے ہیں سورۃ اعراف میں کہ پہلے نبی کو وہاں سے نکالا جاتا ہے پھر قوم برباد ہوتی ہے آپ کا وجود ان کے لیے مستقل مانع ہے یہ آپ کو مصیبت سمجھ رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ ان کے لیے عذاب سے مانع ہیں جب آپ ان میں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو عذاب کیسے دیں۔

اور اسی طرح سے عذاب سے بچنے کی دوسری بات یہ ذکر کی کہ یہ استغفار کرتے ہیں، استغفار یہ تھا کہ وہ احرام باندھتے تھے، حج کرتے تھے تو "غُفْرَانَکَ غُفْرَانَکَ" اس قسم کے لفظ کہتے تھے تو ان سے ظاہری فائدہ ان کو پہنچ رہا تھا یا حضور ﷺ اس قوم میں تھے تو سرور کائنات ﷺ بھی ان کے لیے دعائیں کرتے تھے تو عذاب سے بچنے کی یہ بات تھی اور جب آپ ﷺ تشریف لے گئے تو آپ ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد وہاں سے مسلمان بھی نکل گئے حضور ﷺ بھی نکل گئے تو اس کے بعد ان پر عذاب آیا لیکن عذاب اس طرح سے نہیں آیا کہ

جس طرح سے کسی قوم کو جڑ سے اکھیڑ دیا جاتا ہے جیسے پہلے امتوں پہ آیا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ یہاں عذاب دوسری طرح کا آیا کہ اہل حق اور اہل باطل کو ٹکرایا گیا اور آہستہ آہستہ اہل باطل کو ختم کر دیا گیا صرف اس لیے کہ اگر کوئی سمجھنا چاہے تو اس کے لیے سمجھنے کا بہت موقع ہے ورنہ تو ویسا عذاب آتا جیسے قوم لوط پہ آیا تھا، ویسا آتا جیسے قوم عاد پہ آیا تھا، ویسا آتا جیسے قوم ثمود پہ آیا تھا پھر سنبھلنے کی کسی کو مہلت نہ ملتی، سنبھلنا کوئی چاہتا تو سنبھل نہ سکتا لیکن یہ اللہ تعالیٰ نے سرور کائنات ﷺ کی برکت سے اس امت پر جو امت دعوت ہے جس کو حضور ﷺ دعوت دینے کے لیے آئے تھے ایسا عذاب نہیں ڈالا کہ بالکل جڑ سے کاٹ دیں اور ان کو سنبھلنے کا موقع نہ دیں، نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ ان کو عذاب دیں اس حال میں کہ آپ ان میں ہیں اور نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دینے والے اس حال میں کہ وہ استغفار کرتے ہوں، استغفار کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہیں، کفر و شرک سے توبہ کر لیں تو بھی ہمیشہ بچے رہیں گے، اور سرور کائنات ﷺ کا اپنا وجود بھی ان کے لیے اس قسم کے عذاب سے مانع ہے جس قسم کا عذاب یہ مانگتے تھے کہ پتھروں کی بارش ہو آسمان سے یا دردناک عذاب آئے جو بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دے، اللہ کی حکمت تھی آپ کے آنے کے بعد اس قسم کا عذاب اس قوم پر نہیں آیا۔

اللہ کے دوست کافر نہیں متقی ہیں:

باقی جہاں تک ان کے اپنے استحقاق کا تعلق ہے وہ تو ان پر آنا چاہیئے تھا، کیا ہے ان کے لیے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے حالانکہ ان کی حرکتیں یہ ہیں کہ مسجد حرام سے لوگوں کو روکتے ہیں، مسجد جو کہ اللہ کا گھر ہے، ہر اللہ کا بندہ یہاں آکر عبادت کر سکتا ہے لیکن یہ روکتے ہیں اور وہاں آکر کسی کو عبادت نہیں کرنے دیتے، مسلمانوں کو وہاں جانے نہیں دیتے جس طرح سے وہ حدیبیہ کے موقع پر روک لیا تھا، حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمرہ کرنے کے لیے گئے تھے تو ان کو نہیں پہنچنے دیا وہ واقعہ آپ کے سامنے چھبیسویں پارہ میں سورۃ فتح میں آئے گا۔

"وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ" اور یہ لوگوں میں سے مسجد کے متولی نہیں ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس مسجد کے متولی ہیں، بیت اللہ کے مجاور ہیں جس کی وجہ سے ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم جس کو چاہیں آنے دیں جس کو چاہیں نہ آنے دیں یا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم مسجد حرام کے متولی ہیں اور بیت اللہ کے مجاور ہیں تو ہم اللہ کے ولی ہیں، اللہ کے مقبول ہیں اس لیے دلیر ہو رہے ہیں کہ ہمیں عذاب نہیں آسکتا چونکہ ہم بیت اللہ کے خادم ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہ یہ مسجد

حرام کے متولی ہیں اور نہ ہی یہ میرے دوست ہیں، میرے دوست یا مسجد کے متولی تو متقی ہوسکتے ہیں، اللہ سے ڈرنے والے ہوسکتے ہیں تو اس قسم کے بدمعاش، اس قسم کے لچے، اس قسم کے مشرک کس طرح مسجد حرام کے متولی ہوگئے؟ میں ان کو اپنا دوست کس طرح سے بنالوں؟ اللہ کا ولی اگر ہوسکتا ہے تو متقی آدمی ہوسکتا ہے اور مسجد کی تولیت کا حق اگر ہے تو ان لوگوں کو ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، نہ یہ مسجد کے متولی ہیں نہ یہ اللہ کے دوست ہیں، "وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم شرکیہ رسموں کی پابندی کررہے ہیں اور مسجد حرام کے پاس رہتے ہیں اور یہ چند رسوم شرکیہ کے پابند ہیں تو اسی سے سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کے مقبول ہوگئے اور ہمیں ہر قسم کی گڑبڑ کرنے کا حق ہے، بیت اللہ پر ہمارا استحقاق ہے کہ کسی کو آنے دیں، کسی کو نہ آنے دیں یہ سب ان کی بے وقوفی کی باتیں ہیں۔

مشرکین کی نماز سیٹیاں اور تالیاں تھیں:

اللہ تعالیٰ نے حضرات ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے سے بیت اللہ کو تعمیر کروایا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں آکر اپنی اولاد کو بسایا تھا جن کی اولاد ہونے کا ان کو فخر حاصل ہے لیکن ابراہیم علیہ السلام نے یہ گھر کیوں بنایا اور یہاں اپنی اولاد کو کیوں بسایا یہ سب باتیں انہوں نے اپنی بے عملی کی نظر کردیں اور اپنی جہالت کی بھینٹ چڑھادیں انہوں نے یہ نہیں یاد رکھا کہ بیت اللہ کیوں بنا تھا اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہاں کیوں بسایا تھا۔

قرآن کریم میں وہ تحریک دہرائی گئی ہے قرآن کریم کہتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے سامنے دعا کی تھی "رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ" اے اللہ! اس وادی غیر ذی زرع میں کچھ پیدا نہیں ہوتا میں نے کچھ اولاد کو لاکے بسادی ہے تیرے حرمت والے گھر کے پاس، بسا کس لیے دی ہے؟ "لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ" تاکہ یہ نماز پڑھیں، نماز کی پابندی کیا کریں، توحید اختیار کرنے کے بعد نماز ایک بہت بڑا اہم مقصد ہے یہ تو تعمیر ہی اس لیے ہوئی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو بسایا یہاں اس لیے تھا کہ تاکہ وہ اللہ کی نماز پڑھیں "لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ" سمجھو بت پرستی سے بچیں جیسے کہ اگلی آیات میں آگیا لیکن انہوں نے معاملہ کیا کردیا کہ یہی بیت اللہ بتوں سے بھردیا اور نماز کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجانے لگ گئے۔

اور یہ سیٹیوں اور تالیوں کا کیا مقصد یا تو یہ ہے کہ بیت اللہ کے اردگرد وہ بیٹھتے تھے کہ جس طرح نوجوان طبقہ اکٹھا ہوتا ہے تو ہنستے ہیں، کھیلتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں جیسے میلوں میں، ٹھیلوں میں ہوتا ہے تو نماز کی جگہ انہوں

نے یہ شغل اختیار کرلیا اور توحید کا اس کو مرکز بنایا گیا تھا تو اس کو بت خانے کا مرکز بنادیا تو ان چیزوں کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں فخر حاصل ہے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اور ہم اس مسجد کے متولی ہیں ان کا حال یہ ہے کہ نماز کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں آگئیں اور توحید کی جگہ ساری بت پرستی یہاں اکٹھی ہوگئی پھر ان کو فخر حاصل ہے بیت اللہ کی مجاورت کا یا تو یہ مطلب ہے کہ غفلت کے ساتھ جس طرح سے نوجوان طبقہ اکٹھا ہوتا ہے وہاں کھیلتے ہیں، ہنستے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں تو مسجد کے آس پاس وہ بھی ایسے کرتے تھے اور یہ چیز ان کے لیے عبادت نہیں تھی بلکہ ان کی غفلت اور ان کی جہالت کی یہ حرکتیں تھیں جو وہ مسجد کے پاس کرتے تھے۔

اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ بطور عبادت کے انہوں نے یہ طریقے اپنا لیے ہوں جس طرح آج کل بھی لوگ مزاروں پر جاتے ہیں وہاں جا کے ناچتے ہیں، اچھلتے ہیں، باجے بجاتے ہیں یہ بھی ان کا اپنے بزرگوں کو خوش کرنے کا ایک طریقہ ہے اور ہندو جو ہیں وہ اپنے بت خانے میں گھنٹیاں بجاتے ہیں، یہ گھنٹیاں بجانی ان کے لیے عبادت ہے اور یہ رافضی آپ کے ہاں محرم کے موقع پر کس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں دفیں بجاتے ہیں، شور مچاتے ہیں، اچھلتے کودتے ہیں، ناچتے ہیں، لڑتے ہیں، بھڑتے ہیں، پتہ نہیں وہ کیا کیا کرتے ہیں، کیا ان کے نزدیک یہی ایک عبادت ہے تو جس طرح سے ان جاہلوں نے اس قسم کی جاہلانہ حرکتوں کو عبادت سمجھ رکھا ہے تو لگتا ہے ان جاہلوں نے بھی ان سیٹیوں اور تالیوں کو عبادت قرار دے دیا ہے یا تو یہ ہے کہ نماز کی جگہ یہ سیٹیاں بجانے لگ گئے کہ یہاں شور مچاتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، حالانکہ ان کو نماز پڑھنی چاہیے تھی یا یہ ہے کہ واقعی انہوں نے عبادت کی یہ صورت بنائی، پہلی صورت کا مطلب یہ ہے کہ جیسے مسجد میں بیٹھا کوئی خرافات حرکتیں کررہا ہو تو آپ کہیں گے کہ دیکھو کہ یہ اس کی نماز ہے حالانکہ وہ اپنے خیال کے مطابق نماز نہیں پڑھ رہا لیکن نماز کی جگہ چونکہ یہ ایسی حرکتیں کررہا ہے تو کہتے ہیں بس یہی ان کی حرکتیں ان کی نماز ہے جس طرح لوگ جس وقت آپس میں ملا کرتے ہیں آپ لوگ آپس میں ملتے ہیں تو آپ کی ملاقات کا طریقہ ہوتا ہے "السلام علیکم" اور جس وقت یہ دیہاتی لوگ آپس میں ملتے ہیں تو وہ سلام کی جگہ ایک دوسرے کو گالیاں بکتے ہیں تو آپ کہیں گے کہ ان کا یہی سلام ہے مطلب یہ ہے کہ سلام کی جگہ انہوں نے یہ جو گالی اختیار کی ہے اگرچہ وہ سلام کی نیت سے نہیں کہتے بلکہ وہ سلام کی جگہ آگئیں تو ہم کہیں گے کہ یہی ان کا سلام ہے ان کو نماز تو اس طرح پڑھنی چاہیے تھی جس طرح نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ بنایا اس لیے تھا، اپنی اولاد کو آباد اس لیے کیا تھا کہ وہ نماز پڑھیں، اللہ کی عبادت کریں لیکن یہاں یہ سیٹیاں بجانا، تالیاں بجانا اس قسم کا شغل اختیار کرلیا، تو گویا کہ ان کی یہی نماز ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حرکتیں وہ بطور عبادت کے

کرتے ہیں جیسے آج بھی جاہل لوگ قبروں پر تعزیوں میں اور ہندو اپنے مندروں میں گھنٹیاں بجانا اور ناچنا کودنا دفیں بجانا لوگوں نے بطور عبادت کے اختیار کرلیا انہوں نے بھی ایسے ہی کرلیا ہوگا نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس مگر سیٹی بجانا اور تالی بجانا۔

"فَذُوقُوا الْعَذَابَ" جب یہ حرکتیں آ گئیں تو چکھو عذاب یہ ایک چوٹ تو تمہیں لگ گئی بدر میں تمہارے کفر کی وجہ سے، سمجھو سلسلہ آگے چل پڑا اب چپتیں لگتی جائیں گی اور تم شمار کرتے رہنا کہ کتنی لگتی ہیں اگر باز نہیں آؤ گے جیسے آگے دھمکی آرہی ہے یہ شروع ہوگیا حساب "فَذُوقُوا الْعَذَابَ" اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم آخرت میں ان کو کہیں گے یہ جو اپنے آپ کو اولیاء بنائے بیٹھے ہیں مسجد کے اولیاء یا یہ اللہ کے اولیاء ہیں ان ولیوں کو ہم پوچھ لیں گے قیامت کے دن اور ان سے کہیں گے کہ چکھو عذاب اپنی کفریہ حرکتوں کی وجہ سے جو تم کیا کرتے تھے۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ" کا شانِ نزول:

"اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ" اس آیت میں کفار مکہ کے ایک اور واقعہ کا بیان ہے جس میں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قوت جمع کرنے کے لیے مالِ عظیم جمع کیا اور پھر اس کو دین حق اور مسلمانوں کے مٹانے کے لیے خرچ کیا، مگر انجام کار یہ ہوا کہ وہ مال بھی ہاتھ سے گیا اور مقصد حاصل ہونے کے بجائے خود بھی ذلیل وخوار ہوئے۔

واقعہ اس کا یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے شکست خوردہ، زخم خوردہ، بچے کھچے کفار مکہ جب وہاں سے واپس مکہ پہنچے تو جن لوگوں کے باپ بیٹے اس جہاد میں مارے گئے تھے وہ تجارتی قافلہ کے امیر ابوسفیان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ جنگ تمہارے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لیے لڑی گئی جس کے نتیجہ میں یہ تمام جانی اور مالی نقصانات اٹھانے پڑے، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس مشترک تجارتی کمپنی سے ہماری کچھ مدد کی جائے تاکہ ہم آئندہ مسلمانوں سے اپنا انتقام لے سکیں، ان لوگوں نے اس کو منظور کرکے ایک بڑی رقم دے دی جس کو انہوں نے غزوۂ بدر کا انتقام لینے کے لیے غزوۂ احد میں خرچ کیا اور اس میں بھی انجام کار مغلوب ہوئے اور شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع کرنے کی حسرت مزید ہوگئی۔

قرآن کریم نے اس آیت میں یہ واقعہ پیش آنے سے پہلے ہی رسول کریم ﷺ کو اس کے انجام کی خبر دے دی، ارشاد فرمایا وہ لوگ جو کافر ہیں اپنے مالوں کو اس کام کے لیے خرچ کرنا چاہتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے دین سے

روک دیں، سواس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ اپنا مال بھی خرچ کر ڈالیں گے اور پھر ان کو مال خرچ کرنے پر حسرت ہوگی، اور انجام کار مغلوب ہو جائیں گے، چنانچہ غزوۂ احد میں ٹھیک یہی صورت ہوئی کہ جمع شدہ مال بھی خرچ کر ڈالا، اور پھر مغلوب بھی ہوئے تو شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع ہونے پر الگ حسرت وندامت ہوئی۔

اور بعض مفسرین نے اس آیت کے مضمون کو خود غزوۂ بدر کے اخراجات پر محمول فرمایا ہے کہ غزوۂ بدر میں ایک ہزار جوانوں کا جو لشکر مسلمانوں کے مقابلہ پر گیا تھا ان کے کھانے پینے وغیرہ کے کل اخراجات مکہ کے بارہ سرداروں نے اپنے ذمہ لیے تھے جن میں ابوجہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ شامل تھے، ظاہر ہے کہ ایک ہزار آدمیوں کے آنے جانے کھانے پینے وغیرہ کے اخراجات پر بڑی رقم خرچ ہوئی، تو ان لوگوں کو اپنی شکست کے ساتھ ساتھ اپنے اموال ضائع ہونے پر بھی شدید حسرت وندامت پیش آئی۔

کافروں کو جہنم میں ڈالنے کی وجہ:

اور کافر لوگوں کو جہنم کی طرف اکٹھا کیا جائے گا تا کہ اللہ تعالیٰ خبیث کو طیب سے علیحدہ کر دے سورۃ یسین میں جس طرح الفاظ ہیں "وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ" اے مجرمو! آج صالحین سے ممتاز ہو جاؤ، علیحدہ ہو جاؤ، دنیا کی آبادی کے اندر تو سب لوگ اچھے برے اکٹھے ہوتے ہیں، حق باطل کسی نہ کسی طرح سے ملا جلا تو رہ جاتا ہے لیکن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ خبیث اور طیب کو بالکل علیحدہ علیحدہ کر دیں گے اور خبیث بعض کو بعض پر جمع کر دیں گے جس طرح سے ڈھیر لگایا جاتا ہے تہہ لگائی جاتی ہے "جَمِيْعًا" پھر ان کو اکٹھا کر دیں گے پھر ہم سب کو جہنم میں ڈال دیں گے جس طرح سے کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا ہوتا ہے جھاڑو کے ساتھ آپ ان کو قریب کرتے ہیں پھر ٹوکریاں بھر بھر کر تیل کے ساتھ آگ لگا دیتے ہیں تا کہ نجاست یہ گندگی یہ کوڑا کرکٹ ختم ہو جائے تو یہی صورت ان کے ساتھ پیش آئے گی "فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا" اللہ تعالیٰ اس کو ڈھیر کر دے گا، سب کو تہہ بتہہ کر دے گا قریب کرے گا بعض خبیث کو بعض کے پھر اس کو اکٹھا کر دے گا سب کو "فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ" یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں، ان کی سب جدوجہد کا آخری نتیجہ ان کے حق میں خسارہ ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ

آپ کہہ دیجئے ان لوگوں کو جو کافر ہیں اگر وہ باز آجائیں تو بخش دیا جائے گا ان کو جو کچھ ہو چکا

وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ

اور اگر وہ پہلی حالت کی طرف لوٹیں گے پس تحقیق گذر گیا طریقہ پہلے لوگوں کا ﴿۳۸﴾ اور تم لڑو ان سے

حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ

جب تک کہ فتنہ ختم نہ ہو جائے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر

انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا

یہ لوگ باز آجائیں پس بے شک اللہ تعالیٰ ان کے عملوں کو دیکھنے والا ہے ﴿۳۹﴾ اور اگر انہوں نے پیٹھ پھیری

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

تو تم یقین کرلو کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارا مولیٰ ہے، وہ بہت اچھا مولیٰ ہے اور بہت اچھا مددگار ہے ﴿۴۰﴾

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ

جان لو جو کچھ بھی تم مال غنیمت کے طور پر حاصل کرو تو اللہ کے لیے اس کا پانچواں حصہ ہے اور رسول کے لیے ہے

وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ

اور ذی قرابت ، یتیموں ، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے ، اگر

كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ

تم ایمان لاتے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اتاری تھی اپنے بندے پر فیصلہ کے دن

يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾ اِذْ اَنْتُمْ

جس دن جماعتوں کی آپس میں ٹکر ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۴۱﴾ جبکہ تم

بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ

قریب والے کنارے میں تھے اور وہ دور والے کنارے میں تھے اور وہ قافلہ نچلی جانب تھا

مِنْكُمْ ۙ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ

تم سے اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدے کرتے تو تم وعدہ کرنے میں اختلاف کرتے لیکن لڑا دیا

اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ

اللہ تعالیٰ نے تاکہ فیصلہ کر دے اس امر کا جس کا کرنا منظور تھا تاکہ ہلاک ہو جو شخص کہ ہلاک ہو دلیل کے بعد

وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ اِذْ

اور زندہ رہے جو بھی زندہ رہے دلیل کے بعد بے شک اللہ تعالیٰ البتہ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۴۲﴾ جب

يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ

دکھاتا تھا اللہ تعالیٰ آپ کو وہ لوگ آپ کی نیند میں تھوڑے سے اور اگر آپ کو دکھا دیتا وہ لوگ زیادہ تو تم حوصلہ چھوڑ دیتے

وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ

اور تم جھگڑا کرتے اس معاملہ میں لیکن اللہ تعالیٰ نے بچا لیا بے شک وہ باتوں کو جاننے والا ہے

الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا

دلوں کی ﴿۴۳﴾ اور جب اللہ تمہیں دکھاتا تھا وہ لوگ تمہاری آنکھوں میں تھوڑے سے جب تم آپس میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے

وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ

اور تمہیں کم کر کے دکھاتا تھا ان کی آنکھوں میں تاکہ پورا کر دے اللہ اس امر کو جس کا کرنا منظور ہو چکا تھا

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ ع

اور اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹائے جاتے ہیں ﴿۴۴﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

اس رکوع کی ساری کی ساری آیات غزوۂ بدر ہی سے متعلق ہیں جس کا ذکر پہلے سے آپ کے سامنے چلا آ رہا ہے۔

مشرکین کے لیے ترغیب بھی اور ترہیب بھی:

پہلی آیت جو اس رکوع میں پڑھی گئی اس میں اہل شرک کے لیے ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں فرماتے ہیں، سرور کائنات ﷺ سے کہتے ہیں کہ آپ ان کے سامنے اعلان کر دیں، آپ ان کے سامنے ظاہر کر دیں کہ اگر یہ باز آ جائیں، جو پہلے غلطیاں کر چکے ہیں، جتنے بھی گناہ کر چکے ہیں، اسلام کی مخالفت کر چکے ہیں، اللہ کے رسول کو تکالیف پہنچا چکے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہ مظالم کر چکے، کفر و شرک کے اندر اپنی عمریں بسر کیے بیٹھے ہیں جو کچھ بھی پہلے ہو گیا سب کچھ ان کو معاف کر دیا جائے گا، کسی جرم کی بناء پر بھی ان کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی اگر یہ باز آ جائیں یعنی کفر و شرک سے باز آ جائیں اور ایمان لے آئیں، "اَلْاِیْمَانُ یَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ" کہ ایمان لانے کے ساتھ پہلے کے تمام جرائم مٹ جاتے ہیں، اسلام لانے سے پہلے جو کچھ بھی ہو جائے اسلام اس کو مٹا دیتا ہے یہاں بھی وہی بات ہے کہ اگر باز آ جائیں گے تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے انہیں معاف کر دیا جائے گا۔

"وَاِنْ یَّعُوْدُوْا" یہ وعید ہے، ترہیب ہے، دھمکی ہے کہ اگر یہ باز نہیں آتے ویسے ہی شرارتیں کرنا چاہتے ہیں جیسے پہلے کرتے رہے ہیں تو کوئی بات نہیں، پہلے لوگوں کے واقعات گذر ہی چکے ہیں، اس میں بہت زبردست دھمکی ہے کہ اگر یہ باز نہیں آئیں گے، دوبارہ اسی قسم کی حرکتیں کریں گے تو کیا انہوں نے پہلے لوگوں کے قصے نہیں سنے، ان کے سامنے پہلے لوگوں کا طریقہ نہیں آیا؟ یہ سن ہی چکے ہیں کہ عاد کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ ثمود کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ قوم لوط کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ سرکشی کرنے والوں کو ہم نے کس طرح سبق پڑھایا؟ انہوں نے یہ بات سن ہی لی ہے، مطلب یہ ہے کہ پھر ان کے ساتھ بھی وہی ہوگا "فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ" کے اندر بہت زبردست دھمکی ہے گویا کہ پچھلی تاریخ کی طرف متوجہ کر کے ان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اگر ایسی ہی حرکتیں کرو گے جیسی پہلے کرتے رہے ہو تو پہلے لوگوں کا طریقہ گذر ہی چکا ہے یعنی پھر تم پر بھی وہی دہرایا جائے گا، تم بھی ویسے ہی پٹو گے جیسے وہ پٹے تھے۔

فتنہ کے ختم ہونے تک قتال کا مطلب:

"وَقَاتِلُوْهُمْ" اب یہ مسلمانوں کو ایک نصیحت کی جارہی ہے کہ ان کے ساتھ تمہاری لڑائی جاری رہنی چاہیے اس حد تک جاری رہنی چاہیے کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔

فتنہ باقی نہ رہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب دو طرح سے ادا کیا گیا ہے، فتنہ سے مراد فساد عقیدہ ہے یعنی کفر و شرک باقی نہ رہے، اس حد تک ان کے ساتھ لڑو کہ کفر و شرک باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ ہی کے لیے ہو جائے، اسلام ہی اسلام ہو جائے، کفر و شرک مٹ جائے اس وقت تک ان کے ساتھ تمہاری لڑائی جاری رہنی چاہیے۔

اگر یہ مفہوم لیا جائے تو پھر اس کو جزیرۃ العرب کے ساتھ خاص کرنا پڑتا ہے کہ وہاں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں تھا کہ کسی کافر اور مشرک کو باقی چھوڑیں، وہاں تو صرف اسلام ہی اسلام ہونا چاہیے، حرمین شریفین اور اس کے ارد گرد کفر کو برداشت نہیں کیا گیا اس لیے مشرکین عرب کے لیے جزیہ کا کوئی اصول نہیں تھا، بس ان کے لیے یا اسلام یا تلوار یا تیسری صورت یہ تھی کہ علاقہ ہی چھوڑ جائیں، علاقہ ہی صاف ہو جائے اس علاقہ کے اندر دوسرا مذہب برداشت نہیں، پھر روایات کی روشنی میں اس کو جزیرۃ العرب کے ساتھ خاص کیا جائے گا کیونکہ باقی کفار کے لیے قتل کے انتہاء کے لیے ایک اور بھی چیز متعین ہے، اسلام قبول کرلیں تو لڑائی ختم ہو جائے گی، جزیہ دینا قبول کرلیں تو لڑائی ختم ہو جائے گی، جزیہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ماتحتی قبول کرلیں، ان کی قوت مدمقابل نہ رہے لیکن عرب کے مشرکوں کے متعلق جزیہ کا اصول نہیں تھا، ان کے لیے یہ تھا کہ یا اسلام قبول کریں یا علاقہ چھوڑ جائیں اور یا پھر لڑائی کریں تو اگر فتنہ سے فساد عقیدہ مراد لیا جائے اور لڑائی اس وقت تک جاری رکھنے کا حکم ہو جب تک کہ کفر و شرک ختم نہیں ہو جاتا تو پھر اس کو وہاں کے کفار کے ساتھ خاص کریں گے، دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے یعنی اسلام ہی اسلام ہو جائے، کفر و شرک باقی نہ رہے اس وقت تک ان کے ساتھ لڑائی جاری رکھو یہ تفسیر بھی کی گئی ہے اور اپنی جگہ صحیح ہے۔

فتنہ کا مفہوم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی زبانی:

اور ایک فتنہ کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے معلوم ہوتی ہے، بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ آیا کہ جن دنوں میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور حجاج بن یوسف کے درمیان

لڑائی ہورہی تھی اور اس علاقہ کے اندر فساد ہی فساد تھا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان صحابہ میں سے ہیں کہ جوان اختلافات میں بالکل یکسو ہوگئے تھے اور انہوں نے کسی جماعت کا ساتھ نہیں دیا تھا، ایسے بہت سارے صحابہ تھے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں اختلاف ہوا تو اس وقت بھی وہ علیحدہ ہوگئے تھے، کسی جماعت میں شامل نہیں ہوئے، حضرت سلمہ بن رکوع رضی اللہ عنہ انہی میں سے ہیں، حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ انہی میں سے ہیں، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بھی انہی میں سے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی انہی میں سے ہیں کہ صحابہ کرام کا جب بھی آپس میں اختلاف ہوا، سیاسی سطح پر آپس میں ٹکراؤ ہوا تو یہ حضرات ان اختلافات سے علیحدہ ہوگئے تھے۔

تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس انہی دنوں میں جبکہ بنوامیہ کی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ لڑائی جاری تھی تو کوئی شخص آیا اور آ کے کہنے لگا اے عبداللہ! تو دیکھ ہی رہا ہے کہ دنیا کے اندر کس طرح سے فتنہ وفساد مچا ہوا ہے اور تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا لڑکا ہے، آپ ان معاملات کو سلجھانے کے لیے آگے کیوں نہیں آتے؟ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا کہ بھائی مسلمان کا خون اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے ہم اس میں مبتلاء ہونے کے لیے تیار نہیں یعنی دونوں طرف سے مسلمان ہیں اور میں اس خونریزی میں نہیں آتا، اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے، تو کہنے والے نے کہا کیا قرآن کریم میں یہ نہیں آتا "قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ" تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہنے لگے اس آیت میں تم کہاں پھنسے پھر رہے ہو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک وقت ایسا تھا اہل اسلام کمزور تھے اور جو شخص اسلام قبول کر لیتا تھا وہ کفار کے مظالم کا نشانہ بن جاتا تھا اور لوگ اس کو مجبور کرتے تھے کہ اس دین کو چھوڑ اور کفر کی طرف آ تو اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ تم ان کفار کے ساتھ اتنا لڑو کہ فتنہ ختم ہوجائے کہ ان میں یہ جرأت نہ رہے کہ کسی مسلمان کو مجبور کرسکیں کہ تم کفر اختیار کرو، ان کی طاقت توڑ دو، ان کی طاقت نہ رہے کہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے کسی مسلمان کو دکھ پہنچا سکیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم نے اتنی لڑائی ان کے ساتھ کی ہے کہ وہ فتنہ ختم ہوگیا ہے، اب جو شخص چاہے، جس طرح چاہے، ایمان لائے، اسلام کا عقیدہ اختیار کرے کوئی اس کو کفر کی طرف لے جانے پر مجبور نہیں کرتا، ہم ان کے ساتھ اتنا لڑے کہ فتنہ ختم ہوگیا اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہوگیا، دین اسلام کو غلبہ حاصل ہوگیا، تم اس لیے لڑ رہے ہوتا کہ اور فتنے اٹھیں، یہ تمہاری لڑائیاں فتنے مٹانے کے لیے نہیں ہیں، تمہاری یہ لڑائیاں فتنے اٹھانے کے لیے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مقصد یہ تھا کہ اس آیت سے استدلال نہ کرو، تمہارا اس آیت سے استدلال کرنا درست نہیں ہے، تو اس سے یہ تفسیر بھی سمجھ میں آ گئی کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو اتنا مارو کہ ان کی جرأت ختم ہو جائے، یہ کمزور ہو جائیں ان میں یہ جرأت اور طاقت نہ رہے کہ کسی کو کفر کی طرف لوٹنے پر مجبور کر سکیں بلکہ اسلام کو آزاد ہو جانا چاہیئے، دین کا غلبہ ہو جانا چاہیئے تا کہ لوگ آزادی کے ساتھ ایمان لائیں اور آزادی کے ساتھ اس پر عمل کریں، کفر و شرک کا زور ٹوٹ جانا چاہیئے، "قَاتِلُوْهُمْ" کی غایت یہ ہوگی کہ ان کے ساتھ اتنا لڑو کہ ان کی طاقت ختم ہو جائے، پھر یہ حکم عام ہے کیونکہ جب کوئی شخص جزیہ دینا قبول کر لے تو ہمت تو اس کی پھر بھی ٹوٹ گئی، اب وہ مسلمانوں پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا جس کی وجہ سے قتال ختم ہو جائے گا۔

مسلمانوں کا مولیٰ اور مددگار اللہ تعالیٰ ہے:

"فَاِنِ انْتَهَوْا" اگر یہ باز آجائیں "فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ" تو اللہ تعالیٰ ان کے ہر قسم کے عملوں کو دیکھنے والا ہے، ان کے سب اعمال اللہ کے سامنے ہیں پھر اللہ انہیں ان اعمال کے مطابق جزا دے گا، اور اگر یہ پیٹھ پھیریں، باز نہیں آتے تو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو حوصلہ دلاتا ہے کہ پھر تمہارے اندر یہ بات نہیں ہونی چاہیئے کہ تم ان کے لشکر سے ڈرو، ان کے سامان سے ڈرو، ان کی کثرت سے ڈرو پھر تم یقین رکھو کہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے اور بہت اچھا مولیٰ ہے اور بہت اچھا مددگار ہے، ایسا مولیٰ اور حمایتی ہے کہ جس وقت بھی اس کو مدد کے لیے پکارو گے وہ آئے گا اور ایسا مددگار ہے کہ جس کی مدد کے لیے وہ آجائے وہ کبھی شکست نہیں کھاتا، تم پھر اللہ تعالیٰ کے مولیٰ اور نصیر ہونے پر یقین رکھو پھر ان کافروں کے ساتھ خوب لڑو اور میدان جہاد کے اندر اترو اور پھر ان کی کثرت، سامان اور اسلحہ سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

"وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ" کا مفہوم:

"وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ" یہ وہ مسئلہ آ گیا جہاں سے سورۃ کی ابتداء ہوئی تھی وہاں تو اجمالاً تھا "قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ" کہ یہ جو اموال حاصل ہوتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے استعمال کرنے کے لیے انسان کو مال و دولت دیا ہے، کافروں کے پاس بھی ہے، مسلمانوں کے پاس بھی ہے لیکن اصل کے اعتبار سے یہ مال و دولت نعمت انہی لوگوں کے لیے ہے جو فرمانبردار ہیں، اب کفار باغی ہو گئے، کوئی موقع

ایسا آجائے کہ مسلمان ان باغیوں سے وہ مال چھین لیں اس مال کا پھر مطلب یہ ہوا کہ گویا کہ وہ اموال کافروں سے جو چھینے ہیں وہ بحق سرکار ضبط ہوگئے، وہ سارے کا سارا مال براہِ راست اللہ کی ملکیت میں چلا گیا، جب براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں چلا گیا تو اب اللہ تعالیٰ کی مرضی جس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے، اس کے حصے یہاں متعین کیے ہیں، اس میں سے پانچواں حصہ متعین کر دیا کہ اس کو علیحدہ کر دیا کر و وہ غانمین کا نہیں ہے اور باقی چار غانمین پر تقسیم ہو جائیں یہاں پانچویں حصہ کی تفصیل مذکور ہے، باقی چار کی تفصیل مذکور نہیں ہے لیکن ضمناً سمجھ میں آرہی ہے کہ "مَاغَنِمْتُمْ" میں تو نسبت کر دی سارے مال کی طرف کہ جو کچھ بھی تمہیں غنیمت میں حاصل ہو تھوڑا ہو یا زیادہ، قلیل ہو یا کثیر "مِنْ شَیْءٍ" نے جیسے کہ اس میں تعمیم پیدا کر دی۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ میدانِ جنگ میں اگر کسی کے ہاتھ سوئی بھی آجائے تو وہ بھی جمع کراؤ، دھاگہ بھی آجائے تو وہ بھی جمع کراؤ، کسی کے لیے امام کی اجازت کے بغیر کوئی چیز رکھنے کی اجازت نہیں ہے ورنہ یہ خیانت ہوگی اور غلول ہوگا اور اس قسم کے غلول کرنے والوں کو سخت سزائیں دی گئیں ہیں، مارا بھی گیا ہے، ان کے سامان کو آگ بھی لگائی گئی ہے تو یہ غلول جائز نہیں ہے کہ مالِ غنیمت کی کوئی چیز اٹھا کے بغیر اجازت کے تم اپنے پاس رکھ لو سوئی اور دھاگہ تک واپس لوٹانے کا حکم ہے، سب کچھ جمع کراؤ، امام اس میں سے پانچواں حصہ نکال کے باقی غانمین پر تقسیم کر دے گا، تو "مَاغَنِمْتُمْ" میں نسبت آگئی سب کی طرف اور اس میں سے پانچواں حصہ نکال لیا گیا تو معلوم ہو گیا باقی چار حصے انہی کے ہی ہیں جو غنیمت حاصل کرنے والے ہیں وہ ان پر تقسیم ہو جائیں گے، شاہ سوار کو کتنا ملے گا؟ پیدل کو کتنا ملے گا؟ خدام کو کتنا ملے گا؟ یہ تفصیل ساری کی ساری حدیث شریف میں موجود ہے۔

مالِ غنیمت میں سے خمس کے مصارف:

اس میں سے پانچواں حصہ نکال لو وہ اللہ کے لیے ہوگا، اللہ کا ذکر تو بطور برکت کے ہے، وہ تو ہے ہی سارے کا سارا اللہ کے لیے یا اس میں اس قسم کے کام داخل ہیں جو براہِ راست اللہ کے سمجھے جاتے ہیں جیسے مسجدوں کی تعمیر ہو گئی یہ مال اس قسم کے کاموں میں صرف کر دیا جائے، اور اللہ کے رسول کے لیے ہے کہ وہ اپنی ضروریات اس میں سے پوری کر سکتا ہے، ذی القربیٰ کے لیے ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں میں سے جس کے لیے مناسب سمجھیں اس کو دے سکتے ہیں، اور اسی طرح یتیموں کے لیے ہے، مسکینوں کے لیے ہے اور مسافروں کے لیے ہے اور اس

کے یہ مصارف بیان کردیے گئے، یہ مالک نہیں ہیں کہ ان کے اوپر بانٹنا ضروری ہے بلکہ یہ مصرف ہیں جیسا کہ زکوٰۃ میں ہے کہ آپ اگر سوروپے زکوٰۃ نکالنا چاہتے ہیں تو اس کے مصارف میں فقراء، مساکین، یتیم، مسافر وغیرہ ہیں تو سب کو دینا ضروری نہیں، یہ مصرف ہیں ان میں سے جس کو مناسب سمجھیں جتنا چاہیں دے دیں کیونکہ یہ آپس میں متقابل نہیں ہیں جو ذی القربیٰ ہو وہ یتیم بھی ہوسکتا ہے، وہ مسکین بھی ہوسکتا ہے، وہ مسافر بھی ہوسکتا ہے اور ایک آدمی یتیم بھی ہو، مسکین بھی ہو اور مسافر بھی ہو ایسا بھی ہوسکتا ہے یہ قسمیں آپس میں متقابل نہیں ہیں اس لیے ان سب کو برابر بانٹ دینا ضروری نہیں بلکہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ مصرف یہ ہیں جتنا چاہیں، جس وقت چاہیں، جس کو چاہیں آپ دے سکتے ہیں تو وہ پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہوجاتا تھا اور رسول اللہ ﷺ اپنی صوابدید کے مطابق اسی طرح اس کو خرچ کرتے رہتے تھے۔

"اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ" کا مفہوم:

"اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ" ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں تو جو مال لوٹ لیتا تھا سارے کا سارا اسی کا ہوتا تھا یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ اس کو جمع کر لیتے اور چوتھا حصہ سردار لے لیتا اور باقی کو اپنی مرضی کے مطابق بانٹتا تھا لیکن اسلام میں یہ احکام دے دیے گئے کہ جتنا اکٹھا کرو وہ تمہارا نہیں اللہ کا ہے، اور اللہ کے حکم کے مطابق پانچواں حصہ علیحدہ کر کے باقی تم پر تقسیم ہوگا تو کسی کے ذہن میں یہ اعتراض نہ آئے کہ لوٹا تو ہم نے تھا یہ پانچواں حصہ جدا کیوں کرلیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تمہیں معلوم ہونا چاہیے یہ مال تمہیں اللہ کی نصرت سے حاصل ہوا ہے، اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں ہے حالانکہ جس طرح تم تعداد میں تھوڑے تھے، سامان تمہارے پاس کم تھا، مقابلہ میں لشکر زیادہ تھا اور لڑائی بھی ایسی جگہ ہوئی کہ اچھی جگہ ان کے حصہ میں آئی، گھٹیا جگہ تمہارے حصہ میں آئی اگر تمہارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے ساتھ فتح ہوئی ہے اور سرورِ کائنات ﷺ کی برکت سے اس کا ظہور ہوا ہے تو تمہیں یہ پانچواں حصہ علیحدہ کرنے میں کوئی کسی قسم کی گرانی نہیں ہونی چاہیے اس لیے آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ واقعہ کن حالات میں پیش آیا تھا اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ پر، اور اس چیز پر جو اتاری ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن جس دن کہ دونوں جماعتیں آپس میں ٹکرائی تھیں اس سے اشارہ وہی بدر کے میدان کی طرف ہے۔

بدر کے واقعہ کو "یوم الفرقان" کہا اس کی وجہ ابتداء میں ذکر کی تھی کہ گویا کہ یہ فیصلہ کن جنگ تھی جس سے حق اور باطل بہت نمایاں ہوگیا اور مشرکین نے بھی اس کو فیصلہ کن جنگ بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے دامن

پھیلایا تھا تو اللہ نے حق اور باطل میں فرق کر کے دکھایا اور "یوم الفرقان" کا تعارف کرا دیا "یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ" کا لفظ ساتھ لگا کر کہ جس دن دونوں جماعتیں آپس میں ٹکرائی تھیں، جو کچھ ہم نے اتارا اپنے بندے پر یعنی مدد ہماری تھی اور آئی ہمارے بندے کی وساطت سے، بندے سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں، مدد اللہ کی تھی لیکن اس کا ظہور ہوا سرور کائنات ﷺ کی وساطت سے اگر تمہارا یہ ایمان ہے کہ تم اس مدد کی بناء پر جیتے ہو، اس نصرت کی بناء پر جیتے ہو جو اللہ کی طرف سے اپنے بندے پر آئی تھی تو پھر تمہیں پانچواں حصہ جدا کرنے میں کوئی کسی قسم کی گرانی نہیں ہونی چاہیے، اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر قدرت رکھنے والا ہے۔

میدانِ بدر کا نقشہ اور اللہ تعالیٰ کی نصرت:

اب آگے وہی میدان کے اندر جو واقعہ پیش آیا اس کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے، یاد کیجئے جبکہ تم قریب والے کنارے پر تھے یعنی اس میدان کا جو کنارہ مدینہ منورہ کے قریب ہے تم اس پر تھے "وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى" اور وہ اس کنارے پر تھے جو مدینہ منورہ سے دوسری جانب ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئی قریبی کنارے پر ہو یا بعیدی کنارے پر، اگر اس میدان کو آپ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ یہاں اپنی نصرت ہی بتانا چاہتے ہیں کہ اگر اس میدان کا نقشہ سامنے ہو اور جس طرح وہ میدان دونوں فوجوں کے حصہ میں آ گیا تھا، اس طرح سامنے ہو تو پتہ چلے گا کہ واقعی اللہ کی نصرت سے ہی جنگ جیتی ہے ورنہ ظاہری اسباب سارے کے سارے ہی مسلمانوں کے خلاف تھے، یہ "عُدْوَةُ الدُّنْيَا" سارے کا سارا ریت والا علاقہ ہے، اور آج بھی اسی طرح ریت کے ٹیلے نظر آتے ہیں، یہ ریت والا علاقہ تھا اور وہ میدان بہت اچھا تھا جس پر آ کر انہوں نے قبضہ کر لیا تھا جیسے پہلے اس کی تفصیل گذر چکی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے مخالف ماحول میں جو جنگی اصولوں کے مطابق بھی موزوں نہیں تھا تمہیں کس طرح فتح دی؟ اگر اس واقعہ کو اپنے ذہن میں رکھو تو تمہیں یقین ہوگا کہ واقعی وہ جنگ تم نے اللہ کی مدد سے جیتی ہے ورنہ ظاہری اسباب سارے کے سارے تمہارے خلاف تھے۔

تم مدینہ کے قریب والے کنارے پر تھے اور وہ دور والے کنارے پر تھے "وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ" اور قافلہ تم سے نیچے کو ہو کے گذر رہا تھا، نیچے سے ہو کے گذرنے کا مطلب یہ ہے کہ ابوسفیان نے وہ راستہ چھوڑ دیا تھا جو بدر میں سے ہو کے گذرتا ہے جب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ مسلمان آئے ہوئے ہیں تو پھر وہ سمندر کے کنارے کنارے پہاڑوں کے نیچے سے ہو کے گزرا ہے اور حضور ﷺ کے لشکر سے وہ تین چار میل کے فاصلہ پر تھا، قافلہ تم

سے نیچے تھا۔

”وَلَوْتَوَاعَدْتُّمْ“ اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کرتے یعنی اگر ایک دوسرے سے وقت متعین کر کے لڑائی کی کوشش کرتے جس طرح آپس میں طے کر کے ایک اسکیم کے تحت لڑا جاتا ہے، اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کرتے ”لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ“ تو تم وعدہ کرنے میں اختلاف کرتے تو شاید اس طرح جنگ نہ ہوتی جس طرح اب ہوگئی کیونکہ مشرک اگرچہ تعداد میں زیادہ تھے لیکن ان کو حوصلہ نہ ہوتا مسلمانوں کے مقابلہ میں آنے کا، وہ ان کی ایمانی قوت سے ڈرتے اور تمہاری نظر ان کے ظاہری ساز و سامان پہ جاتی تو شاید اس طرح ٹکرانے کی نوبت نہ آتی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں ٹکرا دیا، یا آپس میں اختلاف کرتے رہتے کوئی کہتا لڑنا چاہیئے، کوئی کہتا نہیں لڑنا چاہیئے، اس طرح مشرکوں کا بھی آپس میں اختلاف ہوسکتا تھا، وقت طے کرنے میں اختلاف ہوسکتا تھا، جگہ طے کرنے میں اختلاف ہوسکتا تھا تو شاید ایسی فیصلہ کن جنگ سامنے نہ آتی اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں ٹکرا دیا تاکہ فیصلہ کرے اس امر کا جس کا کیا جانا مقدر ہو چکا تھا، جو بات اللہ کے حکم میں طے شدہ تھی اس کا فیصلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس طرح کر دیا۔

میدانِ بدر میں کافروں سے مڈبھیڑ کا مقصد:

اس میں مقصد یہ تھا ”لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ“ کہ حق اور باطل اتنا نمایاں ہوجائے کہ اب اگر کوئی برباد ہوتا ہے تو دلیل کے بعد برباد ہو یہاں ہلاکت سے معنوی ہلاکت مراد ہے کہ اب اگر کوئی کفر اور شرک کو اختیار کرے گا تو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد کرے گا، اب حق اور باطل میں کوئی اختلاط اور اشتباہ باقی نہیں رہ گیا، حق علیحدہ نمایاں ہوگیا، باطل علیحدہ نمایاں ہوگیا، اب اگر کوئی برباد ہوتا ہے تو دلیل کے بعد برباد ہو، دلیل بالکل نمایاں ہوگئی اور اگر کوئی زندہ رہتا ہے تو وہ بھی بینہ کے بعد زندہ رہے، زندہ رہنے سے مراد حق کو قبول کرنا ہے کیونکہ حق کو قبول کرنا ہی حقیقت کے اعتبار سے حیات ہے ”اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ“ کے تحت جس طرح ذکر کیا تھا کہ جب رسول تمہیں بلائے ایسی بات کی طرف جو تمہیں زندگی دیتی ہے معلوم ہوگیا کہ حق کو قبول کرنا ہی حقیقت کے اعتبار سے زندگی ہے جو زندہ رہے وہ بھی بینہ کے بعد زندہ رہے یعنی جو حق کو قبول کرے وہ بھی کھلی دلیل کے سامنے آجانے کے بعد کرے اور جو برباد ہوتا ہے وہ بھی بینہ کے بعد ہو، بے شک اللہ تعالیٰ البتہ سننے والا ہے اور جاننے والا ہے۔

حضور ﷺ کا خواب میں مشرکین کے لشکر کو قلیل تعداد میں دیکھنا:

اگلی آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد ہی بتائی ہے کہ دیکھو! کیا صورت پیش آئی، اس کا قصہ یوں ہے کہ مشرکین کا لشکر ابھی سامنے نہیں آیا تھا، سرور کائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خواب کے اندر وہ لشکر دکھایا کہ یہ لشکر آرہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت تعداد ان کی تھوڑی دکھائی تو رسول اللہ ﷺ نے صبح اٹھ کے مسلمانوں کے سامنے بیان کیا کہ چھوٹا سا لشکر ہے جو مشرکین کی طرف سے آرہا ہے، وہ کوئی بڑا لشکر نہیں ہے، اگر پوری تعداد سامنے آجاتی اور رسول اللہ ﷺ اسی طرح ان کی اس شان وشوکت کو بیان کردیتے تو آپ جانتے ہیں کہ بعض تو پہلے ہی دل چھوڑے ہوئے تھے کہ لڑنا نہیں چاہیئے کیونکہ ہم لڑنے کے لیے نہیں آئے، تو اگر پوری قوت سامنے دکھادی جاتی تو اور حوصلہ چھوڑ دیتے پھر مقابلہ کیسے ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت مشرکین کی تعداد خواب میں اپنے نبی کو تھوڑی دکھائی اور نبی نے وہ خواب بیان کیا تو مسلمانوں پر کوئی رعب طاری نہیں ہوا، یہ تو اس میدان کی بات ہے۔

حضور ﷺ کا یہ خواب خلاف واقعہ نہیں ہے:

لیکن اب اس میں بظاہر ایک اشکال ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے اور انبیاء کا خواب ہمیشہ سچا ہوتا ہے، اس میں کوئی کسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں ہوتا لیکن قرآن کریم کے ان الفاظ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ خواب خلاف واقعہ دیکھا کہ تعداد ان کی زیادہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے تھوڑی دکھادی تو یہ خواب خلاف واقعہ ہوا، تو کیا نبی کو خواب کے اندر کوئی خلاف واقعہ چیز نظر آجاتی ہے؟ اور اگر خواب میں خلاف واقعہ چیز نظر آجاتی ہے تو خواب سچا کیسے ہوا؟

یہ ایک سطحی سا اشکال ہے، حقیقت یہ ہے کہ خواب جو بھی ہوتا ہے وہ اپنے ظاہر کے اعتبار سے معتبر نہیں ہوتا بلکہ اپنی تاویل کے تحت اس کا اعتبار ہوتا ہے، خواب حقیقت کے اعتبار سے اپنی تعبیر کے تابع ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشرکین کا لشکر رسول اللہ ﷺ کو دکھایا لیکن لشکر کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک ہے اس کا ظاہری وجود اور ایک ہے اس کی باطنی کیفیت، تو ظاہری طور پر اگرچہ وہ زیادہ تھے لیکن اپنے شرک اور ضعف عقیدہ کی بناء پر وہ ایسے تھے گویا کہ وہ تھوڑے سے ہیں، جیسے ایک ہزار آدمی آپ کے مقابلہ میں آگیا لیکن وہ ثابت ایسے ہوا

جیسے سوجھی نہیں تھے تو ان کی معنوی حیثیت کا اعتبار ہے، تعبیر کے طور پر یہ بات سامنے آئی جیسے جب دونوں فوجیں آپس میں بالمقابل ہوئیں تو مسلمان کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ یہ تھوڑے سے ہیں اور کافر بھی ان کو تھوڑے سے سمجھ رہے تھے۔

کافروں کی نظر ظاہر پر اور مسلمانوں کی نظر باطن پر تھی:

اب دونوں میں دو باتیں آ گئیں، کافر ان کو تھوڑے سمجھ رہے تھے تو ان کے سامنے تو مسلمانوں کا ظاہر آیا، باطن نہیں آیا ورنہ ایک ایک آدمی ان کو طوفان نظر آتا، کافروں نے صرف ظاہری کیفیت کو دیکھا کہ چند گنتی کے آدمی ہیں لیکن یہ نہیں پتہ کہ ایک ایک آدمی کے اندر ہزار ہزار آدمیوں کی قوت چھپی ہوئی ہے اور یہ ایک ایک آدمی ہزار ہزار آدمیوں پہ بھاری ہوگا اگر مسلمانوں کی یہ باطنی کیفیت ان کے سامنے آجاتی تو پہلے ہی میدان چھوڑ جاتے پھر لڑائی کیسے ہوتی؟ اس لیے ان کے سامنے تو صرف ظاہر آیا کہ یہ تعداد تھوڑی ہے کوئی زیادہ نہیں ہے۔

اور مسلمانوں کے سامنے ان کی ظاہری تعداد نہیں آئی بلکہ باطنی تعداد ان کے سامنے پیش کی گئی کہ ان کو یوں سمجھو کہ چاہے ظاہری طور پر کتنے ہی کیوں نہ ہوں تمہارے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے تین سو کے مقابلہ میں سو، اور لڑائی میں تمہیں اتنی ہی مشقت ہوگی جتنی تین سو کو سو کے مقابلہ میں ہوتی ہے یہ باطنی کیفیت بتادی گئی تو ایسے ہوتا ہے کہ انسان کی آنکھیں دیکھتی ہیں لیکن ان کا دیکھنا اکثر و بیشتر دل کے جذبات کے تابع ہوتا ہے، جیسے دل کے جذبات ہوتے ہیں آنکھ ویسا ہی دیکھتی ہے، ایک آدمی کو آپ محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو وہ آپ کو خوبصورت نظر آتا ہے، جب وہ باتیں کرتا ہے تو آپ کہتے ہیں "مَاشَاءَ اللّٰهُ" منہ سے پھول گر رہے ہیں، اور کل کو اسی آدمی سے آپ کو نفرت ہوجاتی ہے تو وہی آدمی آپ کو بگڑی ہوئی شکل کا نظر آئے گا اور اس کی شکل ایسی ہوگی کہ جیسے آپ کو گھن آتی ہے اور جب باتیں کرے گا تو پھول تو کیا جھڑنے ہیں آپ کہیں گے بکواس کر رہا ہے، آدمی وہی ہے، آنکھیں وہی ہیں، چہرہ اس کا وہی ہے، ہونٹ اس کے وہی ہیں ایک وقت میں آپ کو وہاں سے پھول جھڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اور دوسرے وقت میں اس کی باتیں بکواس معلوم ہوتی ہیں تو ظاہر میں تو کوئی فرق نہیں آیا یہ فرق اندر سے پڑا ہے۔

اس لیے جب کسی آدمی کے اندر حوصلہ ہوتا ہے، ہمت ہوتی ہے، اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے اور اپنے مقصد کے لیے مرنا مٹنا جانتا ہے تو اس کے سامنے ہمالیہ پہاڑ بھی اس کو ریت کا ٹیلہ محسوس ہوتا ہے، اور اگر

کوئی شخص ہمت چھوڑ دے اور اس کا دل اندر سے بیٹھ جائے تو سامنے بکری بھی کھڑی ہو تو اس سے ایسے ڈرے گا جیسے شیر سے ڈرتا ہے اور اگر ہمت اور بہادری ہو تو شیر کو بھی گیدڑ سمجھتا ہے تو ظاہر کے حالات ہمیشہ دل کے جذبات کے تحت دیکھے اور سمجھے جاتے ہیں تو مسلمانوں کے قلوب میں جو حوصلہ اور عشق الٰہی تھا، وہ اپنے مقصد کے لیے مرنا منا جانتے تھے، شہادت کا جنون ان کو چڑھ گیا تھا تو ان کے سامنے ہزار کا لشکر ایسے تھا جیسے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ ہوتا ہے۔

اور ان میں چونکہ اس قسم کے جذبات نہیں تھے تو ان کے سامنے ظاہری کیفیت آئی باطن ان کے سامنے نمایاں نہیں ہوا، اس حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے آپس میں ٹکرا دیا، اس لیے نہ تو مسلمانوں کا دیکھنا خلاف واقعہ تھا، نہ مشرکوں کا دیکھنا خلاف واقعہ تھا اور نہ سرور کائنات ﷺ کا خواب میں دیکھنا خلاف واقعہ تھا، کسی کے سامنے ظاہر آیا اور کسی کے سامنے باطن آیا اور ظاہر و باطن دونوں حیثیتیں تو ہوتی ہی ہیں۔

اور خواب ہمیشہ اپنی تعبیر کے تابع ہوتا ہے، نبی کے خواب کی جو تعبیر سامنے آجائے وہاں غلطی نہیں ہو سکتی، ظاہری طور پر خواب کیسا ہی کیوں نہ دیکھا ہو لیکن تعبیر اس کی وہی ہوگی جو نبی نے خواب دیکھنے کے بعد بتائی ہے تو اس لیے ہم یہاں یہ نہیں کہہ سکتے کہ غلط دیکھا، غلط نہیں دیکھا، صحیح دیکھا ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ تمہارے سامنے ایسے ہوں گے جیسے مٹھی بھر ہیں چاہے ظاہری تعداد ان کی کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو؟

تفسیر باللفظ:

یہاں یہ واقعہ جو ذکر کیا جا رہا ہے تو یہ بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت ہی کی ایک قسم ہے اس لیے اس کو یہاں ذکر کر رہے ہیں "یاد کیجئے جبکہ اللہ تعالیٰ آپ کو دکھاتا تھا آپ کی نیند میں وہ لوگ تھوڑے سے، اگر آپ کو دکھا دیتا وہ لوگ زیادہ تو تم حوصلہ چھوڑ دیتے "لَفَشِلْتُمْ" دیکھو! دیکھنا آپ ﷺ نے تھا اور فشل کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی ہے کہ مسلمان حوصلہ چھوڑ دیتے، آپ ﷺ نے تو حوصلہ نہیں چھوڑنا تھا لیکن آپ ﷺ نے خواب دیکھ کے لوگوں کے سامنے بیان جو کرنا تھا تو لوگوں کی ہمت چھوٹ جاتی اگر وہ دکھا دیتا آپ کو زیادہ تو تم لوگ ہمت چھوڑ دیتے اور اس جہاد اور لڑائی کے معاملہ میں آپس میں جھگڑا کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے بچالیا، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے ان باتوں کو جو کہ سینہ میں ہیں اور یاد کیجئے جب تمہیں دکھاتا تھا اللہ تعالیٰ وہ لوگ جب تم ٹکرائے تمہاری آنکھوں میں تھوڑے سے، تم دیکھ رہے تھے تو تمہیں وہ قلیل نظر آتے تھے اور تمہیں قلیل قرار دیتا تھا ان کی آنکھوں میں تاکہ فیصلہ

کر دے اللہ تعالیٰ اس امر کا جس کا کیا جانا طے ہو چکا تھا، تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، ہر امر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے فتح ہو شکست ہو، کسی کی ہلاکت ہو، کسی کی زندگی ہو تمام امور اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس میدان کے اندر حق کو فتح دی اور باطل کو شکست دے دی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا

اے ایمان والو! جس وقت ٹکر ہو جائے تمہاری کسی جماعت سے تو ثابت قدم رہا کرو

وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٤٥﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ

اور اللہ کو بہت یاد کیا کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۴۵﴾ اور اطاعت کرو اللہ کی

وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا

اور اس کے رسول کی اور آپس میں جھگڑا نہ کیا کرو پھر تم ہمت ہار جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٤٦﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن

بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۴۶﴾ اور نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جو نکلے

دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ

اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے اور وہ روکتے ہیں اللہ کے راستہ سے

وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٤٧﴾ وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ

اور اللہ تعالیٰ گھیرا ڈالنے والے ہیں ان کاموں کا جو وہ کرتے ہیں ﴿۴۷﴾ اور قابل ذکر ہے وہ وقت جب مزین کیا شیطان نے

أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي

ان کے عملوں کو اور کہا آج کے دن کوئی شخص تم پر غالب آنے والا نہیں لوگوں میں سے اور میں تمہارا

جَارٌ لَّكُمْ ۖ فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَقَالَ

حمایتی ہوں، پھر جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے آ گئیں تو وہ شیطان واپس لوٹا اپنی ایڑیوں پر اور اس نے کہا

إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ

میں تم سے لاتعلق ہوں، بے شک میں دیکھتا ہوں وہ چیز جو تم نہیں دیکھتے میں اللہ سے ڈرتا ہوں

وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٤٨﴾ إِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ

اور اللہ تعالیٰ سخت سزا والے ہیں ﴿۴۸﴾ جب کہا منافقوں نے اور ان لوگوں نے

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ

جن کے دلوں میں بیماری ہے دھوکہ میں ڈال دیا ان لوگوں کو ان کے دین نے اور جو شخص بھروسہ کرتا ہے

عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۴۹﴾

اللہ پہ پس بے شک اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے ﴿۴۹﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

غزوۂ بدر کے حالات آپ کے سامنے شروع سورۃ سے چلے آرہے ہیں اور اسی غزوہ کے ضمن میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو مختلف ہدایات دے رہے ہیں اس رکوع میں بھی اللہ تعالیٰ نے جنگ کے بارے میں بعض ہدایات دی ہیں۔

میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے کا حکم:

جیسا کہ ابتدائی الفاظ میں آگیا کہ جب تمہاری ٹکر کسی جماعت سے ہوجائے تو تم ثابت قدم رہا کرو، جم جایا کرو، میدان کو چھوڑا نہ کرو۔

ثبات ظاہری بھی ہے کہ اس جگہ کو نہ چھوڑو اور ثبات قلبی بھی ہے کہ دل کو مضبوط رکھا کرو کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت جو آتی ہے تو وہ ظاہری اسباب کے پردے میں ہی آتی ہے، اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں تو میدان چھوڑ کے بھاگ جاؤں اور دشمن کے مقابلہ میں بے ہمت ہوجاؤں، بزدل ہوجاؤں، اللہ تعالیٰ کی مدد آئے اور دشمن کو گرا کے زبردستی مجھے اس کے سینہ پہ چڑھا دے اگرچہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت ہے لیکن اللہ ایسا کرتا نہیں ہے۔

ایمان والوں کا کام یہ ہے کہ اپنے طور پر ہمت دکھائیں، ثابت قدمی دکھائیں، جان بازی دکھائیں تو اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی آئے گی، دشمن مرعوب ہوجائے گا اور اللہ تعالیٰ غلبہ دیں گے۔

وہ اسرائیلیوں کی بات ہے جو آپ کے سامنے گزری کہ جب ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاد کے لیے بلایا تھا تو وہ کہنے لگے "اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ" وہ ہمت چھوڑ گئے کہ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، ہم تو یہاں سے سرکنے والے نہیں ہیں تو جا اور تیرا رب جائے، جا کے لڑائی لڑلو اور جس وقت ہمارے دشمن اس شہر

سے نکل جائیں گے پھر ہم بھی اندر آجائیں گے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اس بات کے کہ نبی کی رفاقت بھی تھی لیکن جب نبی کی ہدایات پر وہ نہیں چلے اور انہوں نے ہمت چھوڑ دی، میدان میں ڈٹے اور جمے نہیں اور اپنی حد تک انہوں نے کوشش نہیں کی تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں یہ لوگ آگئے، وہ دشمن جو کہ مشرک تھے ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ان کے مقابلہ میں نہیں آیا جب تک کہ انہوں نے ظاہری طور پر ہمت نہیں دکھائی۔

اسی طرح تمہارا پہلا کام یہ ہے کہ تم ڈٹ جاؤ، اپنے قدموں کو مضبوط رکھو اور اپنے دلوں کو مضبوط رکھو۔

میدانِ جنگ میں ذکر اللہ کی کثرت کا حکم:

اور دوسرا کام یہ کرو کہ "وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا" اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو، اب لڑائی ایک ایسا وقت ہوتا ہے کہ اس میں افراتفری ہوتی ہے، بھاگ دوڑ مچی ہوئی ہوتی ہے، ہر شخص کو اپنے آپ کی فکر ہوتی ہے تو ایسے موقع پر کوئی کسی کو کیا یاد کرے اکثر و بیشتر ایسے موقع پر ہر چیز بھول جاتی ہے اور وہ بہادر ہی ہوتا ہے جو ایسے موقع پر کسی چیز کو یاد رکھتا ہے جیسا کہ عربی شاعروں کی کلام آپ پڑھیں گے کہ ایک شخص اپنی محبت کی شدت اپنی محبوبہ کو یاد دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تجھے ایسے وقت بھی یاد کیا جبکہ خطی نیزے ہمارے درمیان میں لہرا رہے تھے، جس وقت اپنی جان کی فکر پڑی ہوئی ہوتی ہے میں نے اس وقت بھی تجھے یاد کیا یہ تعلق اور عشق کی علامت ہے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مؤمنوں کا ایسا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونا چاہیئے کہ عین جنگ کے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ کو نہ بھولیں، اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کریں، زبان سے بھی یاد کریں اللہ اکبر پکاریں، اللہ کا نام لیں اور دل میں بھی اللہ کا دھیان رکھیں۔

میدانِ جنگ میں ذکر اللہ کا فائدہ:

اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ اللہ کے ذکر میں یہ خاصیت ہے کہ قلب کو قوت حاصل ہوتی ہے، قلب کو اطمینان نصیب ہوتا ہے اور جس وقت قلب کو قوت حاصل ہوگی اور قلب کو اطمینان نصیب ہوگا تو قدم بھی جمے گا اور مشرک و کافر قوم اسی قوت سے محروم ہیں کہ ان کے قلوب کے اندر قوت نہیں ہوتی اس لیے جب مسلمان کسی کافر قوم کے ساتھ بغیر ذکر اللہ کے ٹکرائے، اللہ اسے یاد نہ ہو، اللہ کے احکام کی پابندی نہ ہو تو پھر ایک انسان ایک انسان سے ٹکرا رہا ہے جس کے بدن میں قوت زیادہ ہوگی، جس کے پاس اسلحہ اچھا ہوگا، جس کے پاس فوجیں اچھی ہوں گی وہ غلبہ پا جائیں گے کیونکہ پھر تو مقابلہ سامان کا سامان کے ساتھ ہے، افراد کا افراد کے ساتھ ہے، لیکن اگر مسلمان قوم

اس باطنی ہتھیار کے ساتھ مسلح ہو اور کافر قوم کے پاس یہ ہتھیار ہوتا نہیں پھر جس میدان میں بھی اللہ کو یاد کرنے والوں کا ٹکراؤ کافروں کے ساتھ ہوا ہے تو تاریخ شاہد ہے کہ پھر وہاں اللہ کے ذکر کرنے والے ہی بھاری رہے ہیں کیونکہ یہ باطنی قوت ایک ایسی قوت ہے جس سے کافر محروم ہیں، ان کے دل مرعوب ہو جاتے ہیں، ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور اللہ کا نام لینے والوں کے دل مضبوط رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے قدم بھی جمتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو فتح اور غلبہ دیتا ہے۔

سورۃ البقرۃ میں آپ کے سامنے طالوت کا قصہ ذکر کیا گیا تھا جو انہوں نے جالوت کا مقابلہ کیا تھا تو وہاں بھی قلیل جماعت تھی لیکن وہ اللہ کو یاد کرنے والے تھے تو بڑی جماعت پہ غالب آگئے اور اسی طرح بدر کے اندر بھی یوں ہی ہوا کہ اللہ کو یاد کرنے والے اور اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے، اللہ پہ بھروسہ کرنے والے قلیل تعداد اور بے سروسامان ہونے کے باوجود کثیر تعداد اور ہر قسم کے چھری کانٹے سے لیس لشکر کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ایک ہتھیار ہے جو ظاہری دشمنوں کے مقابلہ میں بھی کام آتا ہے اور باطنی دشمنوں کے مقابلہ میں بھی کام آتا ہے۔

کثرت کا لفظ صرف ایک عبادت میں ہے:

"وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا" اللہ کو بہت یاد کرو، بہت یاد کرنا اسی طرح ہے کیونکہ نہ تو اس کا کوئی وقت متعین ہے اور نہ اس کا کوئی رخ متعین ہے کہ فلاں طرف منہ کر کے یاد کرو، دوسری طرف منہ کر کے نہیں یاد کیا جا سکتا، اور نہ اس کی کوئی ہیئت اور کیفیت متعین ہے بے وضو ہو یا باوضو، مشرق، مغرب، شمال، جنوب جس طرف بھی منہ ہو، بیٹھے ہو یا کھڑے ہو، لیٹے ہو جیسے بھی ہو اللہ کو یاد کیا جا سکتا ہے، اس میں یہ کثرت اس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں کسی اور عبادت کے متعلق "كَثِيْرًا" کا لفظ نہیں آیا کہ نماز بہت پڑھا کرو، روزے بہت رکھا کرو، جہاں بھی "كَثِيْرًا" کا لفظ آیا ہے وہ اللہ کے ذکر کے ساتھ آیا ہے کہ اللہ کا ذکر بہت کرو، یہ بے قید ہے جس طرح بھی کرنا چاہو کر سکتے ہو، اور اللہ کے ذکر میں زبان سے "سبحان اللہ، الحمد للہ" کہنا بھی شامل ہے دل میں تصور کرنا بھی شامل ہے اور اسی طرح اللہ کے احکام کا استحضار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی یہ بھی ذکر میں داخل ہے۔

"لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" تاکہ تم فلاح پا جاؤ تو فلاح اگر تمہیں ملے گی ظاہری اور باطنی، دنیوی فلاح کہ دشمن

کے مقابلہ میں فتح پا گئے اخری فلاح کہ آخرت میں ثواب حاصل ہو گیا اس کا دارومدار اگر ہے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر پر ہے، اللہ تعالیٰ سے غافل ہو کر اگر ظاہری طور پر کامیابی حاصل کر بھی لو گے تو بے برکت ہوگی اور اگر حقیقی کامیابی پانا چاہتے ہو تو اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو۔

میدانِ جنگ کے بارے میں مختلف ہدایات:

"وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ" اب یہ ذکر کیا جا رہا ہے جہاد کے سلسلہ میں کہ اللہ اور اللہ کے رسول کا کہنا مانو، اطاعت کے اندر یہ بات بھی ہے کہ اللہ اور اللہ کا رسول تمہیں جو ہدایات دیتا ہے اس کی پابندی کرو، عام زندگی میں بھی اور خصوصیت کے ساتھ میدانِ جہاد میں کیونکہ جس وقت اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی پابندی کرو گے تو تمہارا ظاہری جماعتی نظم قائم رہے گا، جہاں اللہ کا رسول کسی کو کہہ دے کہ تم نے یہاں ٹھہرنا ہے وہیں ٹھہر جاؤ، جہاں اللہ کا رسول کہہ دے کہ تم نے اس طرف جانا ہے تو اس طرف چلے جاؤ، جس کو آجکل کی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ جماعتی ڈسپلن (discipline) بحال رکھو، اپنے حاکم اعلیٰ، قائد اور کمانڈر کی ہدایات پر عمل کرو جس طرح وہ کہتا ہے اسی طرح کرو، میدان جنگ کے اندر اس نظم کو بحال رکھنا ضروری ہے ورنہ قلوب کے اندر اگر انتشار ہو تو بھی ضعف کا باعث ہے اور اگر ظاہر میں افراتفری ہو اور کوئی نظم ونسق نہ ہو تو ایسے وقت میں بھی دشمن کے مقابلہ میں ہمتیں چھوٹ جاتی ہیں، ہر شخص اپنی رائے سے چلنے والا ہو، ہر شخص اپنے مشورہ پر دوسرے کو مجبور کرنے والا ہو تو انتشار ہو جائے گا، نظم وضبط قائم نہیں رہے گا جس وقت نظم وضبط قائم نہیں رہے گا تو پھر تم میدان میں ٹھہر نہیں سکتے، آپس میں اگر تمہارا تنازع ہو گیا، ہر شخص اپنی اپنی رائے پر چلنے لگ گیا، اپنے حاکم اعلیٰ کی اس نے بات نہ مانی جیسے اس وقت اللہ کے رسول موجود تھے اگر اس وقت تم نے اللہ کے رسول کی ہدایات پر عمل نہ کیا تو تمہارے اندر تنازع ہوگا، جھگڑے کی کیفیت پیدا ہو جائے گی پھر تمہاری ہمتیں چھوٹ جائیں گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

اور ہوا اکھڑنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دبدبہ ختم ہو جائے گا، دبدبہ تب ہی قائم رہا کرتا ہے کہ جب اپنے سردار اور امیر کے کہنے کے مطابق نظم ونسق کو بحال رکھا جائے، دل بھی مضبوط ہوں، قدم بھی جمے ہوئے ہوں، نظم وضبط بھی قائم ہو ایسے وقت میں پھر انسان مضبوط بھی رہتا ہے اس کی مثال سمجھنے کے لیے آپ یوں سمجھ لیجئے کہ جس وقت آپس میں اتفاق ہوتا ہے پھر کوئی شخص اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتا بلکہ ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میرے ساتھ ایک جماعت کی قوت ہے میں بھی یہ سمجھوں گا کہ میرے ساتھ پوری جماعت ہے تو میری ہمت اکیلے کی نہیں ہوگی اور آپ میں سے بھی ہر شخص یہی سمجھے گا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں بلکہ ایک جماعت ہمارے ساتھ ہے تو انسان کو بڑا حوصلہ ہوتا ہے

اور جس وقت آپس میں اختلاف ہو جائے تو ہر شخص یہ کہتا ہے کہ میرا کسی نے ساتھ تو دینا نہیں ہے، وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے اور جس وقت وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے گا اور کہے گا کہ اس کا بھی میرے ساتھ اختلاف ہے، اس کا بھی میرے ساتھ اختلاف ہے جیسے میں کہتا ہوں یہ نہیں کرتا، جیسے یہ کہتا ہے ویسے میں نہیں کرتا تو انتشار پیدا ہو جانے کی صورت میں ہر شخص کا تصور ہوتا ہے کہ میں اکیلا ہوں میرے ساتھ کوئی نہیں ہے اور جس وقت یہ خیال آ گیا کہ میں اکیلا ہوں میرے ساتھ کوئی نہیں تو آپ جانتے ہیں کہ قوت ختم ہو گئی اور جب آپس میں رائے کا اتحاد اور اتفاق ہوتا ہے تو ہر شخص اپنے آپ کو ایک جماعت سمجھتا ہے اس لیے اندر سے حوصلہ مضبوط رہتا ہے اور ظاہر میں بھی ہمت قائم رہتی ہے۔

اتفاق میں برکت کی حسی مثال:

اگر آپ اس کی حسی مثال سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھو کہ جیسے ایک رسی ہے جس وقت وہ بٹی ہوئی ہوتی ہے اور خوب شدت کے ساتھ آپس میں ملی ہوئی ہوتی ہے تو اس میں کتنی قوت ہے اور اگر اس کا پیچ کھول دو اب چاہے اس کے سارے ریشے اسی طرح ہوں گے جس طرح پہلے ہیں، ان کی گنتی میں فرق نہیں آیا لیکن کیا رسی کی قوت وہی رہ جاتی ہے؟ اب اس میں کوئی قوت نہیں ہے، اب اس کی لڑیاں تو اتنی ہی ہیں جتنی پہلے تھیں لیکن جب آپس میں خوب اچھی طرح سے پھنسے ہوئے تھے، ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے تو اس کی قوت اس سے سوگنا زیادہ تھی اور جب اس کا بٹ کھول لیا گیا چاہے ریشوں کی گنتی اتنی ہی ہے اور دھاگے اس میں اتنے ہی ہیں، لڑیاں اس میں اتنی ہی ہیں لیکن اب قوت ختم ہو گئی ہے۔

اب اتحاد و اتفاق ایسے ہی ہے کہ جیسے رسی کا بٹ مضبوط ہو تو ہر ریشہ دوسرے کے لیے قوت کا باعث بنتا ہے اور آپس میں خیالات کا انتشار، آراء کا انتشار یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے رسی کا بٹا کھل گیا، اور رسی کا بٹ کھل جانے کے بعد اگرچہ افراد اتنے ہی ہوتے ہیں، ریشے اس کے اندر اتنے ہی ہیں، لڑیاں اتنی ہی ہیں لیکن قوت ختم ہو گئی، یہ ایک حسی مثال ہے جماعتی اتحاد کے اندر قوت اور جماعتی انتشار کے اندر ضعف آ جانے کی، اس لیے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانو اور اسی کے حکم میں ہے جہاد کے امیر کی اطاعت، اس لیے سرور کائنات ﷺ بار بار تاکید فرمایا کرتے تھے، "عَلَيْكُمْ بِالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَلَوْ اُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ" اپنے بڑے کی بات سنا کرو اور مانا کرو اگرچہ تمہارے اوپر امیر ایک عبد حبشی کو بنا دیا جائے تو بھی اس کی بات سنو اور مانو، حضور ﷺ سمع و طاعت کی بہت تاکید فرمایا کرتے تھے کہ جو امیر تم پر بنا دیا جائے اس کی بات سنو اور مانو، ظاہری طور پر وہ تمہیں کتنا ہی حقیر کیوں

نہ لگے لیکن اگر وہ تم پر امیر بنادیا جائے تو تمہارا فرض ہے کہ اس کی بات سنو اور اس کا کہنا مانو کیونکہ اپنے امیر کا کہنا ماننے کے ساتھ ہی جماعتی نظم ونسق بحال رہا کرتا ہے اور یہ جماعتی نظم ونسق افراد کے اندر قوت کا باعث بنتا ہے۔

"وَلَا تَنَازَعُوْا" آپس میں جھگڑا نہ کرنا، "فَتَفْشَلُوْا" پھر تم بزدل ہو جاؤ گے، تمہاری ہمت جواب دے دے گی، فشل کمزور ہونے کو کہتے ہیں، اور تمہارا دبدبہ چلا جائے گا، تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، ہوا اکھڑنا یہ دبدبہ چلے جانے سے کنایہ ہوتا ہے۔

میدانِ جنگ میں صبر کا مطلب:

"وَاصْبِرُوْا" یہ سب سے بڑا گر آ گیا کہ صبر کرو، صبر کا معنی ہے کہ برداشت کرو، اپنے نفس کو روک کے رکھو اس جگہ اس کا موقع محل یہ ہے کہ کوئی تکلیف آجائے تو اس کو سہہ جاؤ خاص طور پر اپنے رفقاء کی باتیں برداشت کرو۔

جھگڑے جو آپس میں ہوتے ہیں تو اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ اپنی مرضی کے خلاف کسی کی بات سن نہیں سکتے اور اپنی رائے کے خلاف کسی کی بات مان نہیں سکتے، ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ میری مانی جائے اور میری مرضی کے مطابق کام ہو اور کسی دوسرے کی بات میری مرضی کے خلاف نہ آئے اور یہ صبر ہی ہے جو جماعت کے اندر انسان کو کرنا پڑتا ہے کہ بسا اوقات اپنی طبیعت کے خلاف بات بھی برداشت کرنی پڑتی ہے، اپنی طبیعت کے خلاف کسی کی رائے بھی ماننی پڑتی ہے، بیسیوں جگہ اپنی رائے چھوڑنی پڑتی ہے تب ہی جا کے آپس میں اتفاق رہ سکتا ہے ورنہ اگر ہر آدمی یہی کوشش کرے کہ میری مانی جائے اور میں کسی کی نہ مانوں، میں اپنی طبیعت کے خلاف کسی کی بات برداشت نہیں کرسکتا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ دنیا کی کوئی طاقت آپ کو جوڑ کے رکھ لے، جڑ کے آپ تب ہی رہیں گے جب آپ کی طبیعت میں اتنی برداشت ہو کہ اگر آپ کی طبیعت کے خلاف کوئی معاملہ ہو جائے تو آپ اسے برداشت کرسکیں، مزاج کے خلاف کبھی کسی کی رائے سامنے آجائے تو اس کی مان لو اور اگر اپنی رائے نہ مانی جائے تو مشتعل نہ ہو جاؤ کہ چونکہ میری بات نہیں مانی گئی اس لیے میں یہ کام نہیں کرتا، اپنی منوانے کا جذبہ اور دوسرے کی نہ ماننے کا جذبہ فساد کی اصل جڑ یہ ہے۔

اور اگر آپس میں بیٹھ کے مشورہ کرلیا اور مشورہ کرنے کے بعد ایک رائے سامنے آگئی چاہے اپنی مرضی کے مطابق ہے، چاہے اپنی مرضی کے خلاف ہے، طبیعت چاہتی ہے یا نہیں چاہتی، اپنے آپ کو اس کا پابند کرلو اگر یہ صبر انسان کی طبیعت کے اندر آجائے تو انسان کی اجتماعی زندگی میں اتفاق ہی اتفاق ہوگا، کبھی اختلاف ہوگا ہی نہیں، اور

ہم لڑتے آپس میں اس لیے ہیں کہ اگر کسی کی بات طبیعت کے خلاف ہو جائے تو ہم برداشت نہیں کرتے اور اگر ہماری نہ مانی جائے تو ہم اس کو سہہ نہیں سکتے، ہر شخص کے دل میں یہ ہے کہ میں ہی غالب ہوں، میری رائے غالب رہے اور کسی کی بات میں نہ مانوں ہر کوئی میری مانے جماعتی نظم کے اندر سب سے زیادہ خطرناک چیز یہ ہے تو "وَاصْبِرُوْا" کا موقع محل یہاں یہ بھی ہے کہ ہر قسم کے اختلاف سے بچو، اپنی مرضی کے خلاف رائے کو برداشت کرو اور اپنے آپ کو امیر کی اطاعت کا پابند رکھو تب جا کے اللہ تعالیٰ کی معیت اور نصرت تمہیں حاصل ہوگی، اجتماعی زندگی کے لیے یہ بہترین اصول ہے۔

میدانِ جہاد میں اتراتے ہوئے نہ جاؤ:

"وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ" نہ ہو جاؤ تم ان لوگوں کی طرح جو نکلے اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاتے ہوئے، "بطراً" کا لفظ شکر کے مقابلہ میں آتا ہے، شکر کہتے ہیں قدردانی کو، قدردانی کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے احسان کو احسان سمجھو اور منعم کا حق طاعت بجالاؤ، شکر کا یہ معنی ہوتا ہے کہ احسان کی قدردانی کرو، محسن کا احسان مانو اور اس کی طاعت بجالاؤ اور اس کے سامنے تمہارا دل و دماغ پستی اختیار کرے یہ احسان کرنے والے کا حق ہوتا ہے، اس کے سامنے تواضع، ادب، دب جانا، احترام، اس کے احکام کی اطاعت یہ اس کے احسان کی قدردانی ہے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو نعمتیں دے رکھی ہیں ان نعمتوں کا احساس کر کے کہ یہ اللہ کی دی ہوئی ہیں اللہ کے شکر گزار رہو، جو شکر گزار بندہ ہوتا ہے، وہ ظاہری اسباب پر نظر ڈال کے کبھی اکڑتا نہیں ہے کہ مجھے اتنے اسباب حاصل ہو گئے، اب میرے پاس بہت قوت آ گئی، اب میں یوں کر دوں گا تو یہ احساس نہیں رہتا کہ یہ سب کچھ تو اللہ کا دیا ہوا ہے جب چاہے واپس لے لے، میرے پاس کیا قوت ہے؟ اگر یہ احساس رہے کہ میرے پاس کوئی قوت نہیں، یہ اللہ کا دیا ہوا ہے وہ جب چاہے گا واپس لے لے گا، پھر انسان اکڑتا نہیں ہے اور اکڑتا اسی وقت ہی ہے جب یہ غفلت آ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احسان کو وہ احسان نہیں سمجھتا اور سمجھتا ہے کہ جو کچھ حاصل ہو گیا بس اب یہ میری ہی ہے، میں اپنی طرف سے جو چاہوں کر لوں۔

آپ نے باب الکبر میں پڑھا ہوگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ تکبر ہے کہ کوئی شخص یہ چاہے کہ میرا لباس اچھا ہو، میرا جوتا اچھا ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں یہ تکبر نہیں ہے، یہ تو جمال ہے "اَللّٰهُ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ" اللہ تعالیٰ خود جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے تکبر تو یہ ہے کہ حق کے سامنے اکڑ جانا، حق کو

قبول نہ کرنا، اور غالباً سورۃ القصص میں بھی اس قسم کے الفاظ آتے ہیں "بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا" ہم نے کتنی ہی بستیاں تباہ کر دیں جو اپنی معیشت کے اوپر اترا رہی تھیں، جو کہتے تھے کہ ہمیں بڑے معاشی اسباب حاصل ہیں، ہم بہت خوشحال ہیں اس لیے ان کے اندر اکڑ پیدا ہوگئی تھی اللہ تعالیٰ نے ان سب کو برباد کر کے رکھ دیا اور یہاں اشارہ مشرکین مکہ کی طرف ہے کہ مشرکین مکہ جس وقت مکہ معظمہ سے نکلے تھے تو بڑی سج دھج کے ساتھ، باجے بجاتے ہوئے، ڈھول پیٹتے ہوئے نکلے تھے کیونکہ سمجھتے تھے کہ ہمارا اتنا بڑا لشکر ہے، ہم مسلح ہیں اور اتنی قوت کے مالک ہیں اس وقت ہمارا مقابلہ کوئی نہیں کر سکے گا اور ہم ان کو نیست و نابود کر کے آئیں گے اس طرح فخر کرتے ہوئے، اکڑتے ہوئے اور اتراتے ہوئے مکہ معظمہ سے نکلے تھے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہاری حالت ایسی نہیں ہونی چاہیے، تم ہمیشہ اپنے اللہ پہ نظر رکھا کرو، ظاہری اسباب کے اوپر کبھی نظر نہ لگاؤ، اگر ظاہری اسباب پر نظر لگاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہو جاؤ گے، ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو دکھلاوا کرتے ہوئے، شو بازی کرتے ہوئے اور اتراتے ہوئے گھر سے نکلے ان کی طرح نہ ہو جانا، ہمیشہ نظر اللہ پہ رکھا کرو۔

آپس میں جھگڑا اور کثرت پر بھروسہ مسلمان کے لیے شکست کا باعث ہے:

چنانچہ تاریخ نے ہمارے سامنے اسلامی جنگوں کے جو خاکے محفوظ رکھے ہیں، آپ کے سامنے ہیں ایک تو احد میں مسلمانوں نے مشرکین مکہ سے تھوڑی سے مار کھائی ہے اس کی وجہ قرآن کریم نے خود ذکر کی سورۃ البقرۃ میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے کہ "تَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ" تمہارا اس معاملہ میں جھگڑا ہو گیا "وَعَصَيْتُمْ" اور تم نے اپنے امیر جہاد کی نافرمانی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمہاری فتح شکست سے بدل گئی، اور وہ نافرمانی یہ ہوئی تھی کہ جہاں جمنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا وہاں نہیں جمے، جو تیر انداز ایک پہاڑ کے اوپر کھڑے کیے تھے انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی یہ نافرمانی ہوگئی جب یہ نافرمانی ہوئی تو فتح شکست سے بدل گئی اور مشرک غالب آ گئے۔

اور دوسرا موقع جس میں مسلمانوں نے تھوڑی سے شکست کھائی ہے وہ حنین کا واقعہ ہے "وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ" وہاں شکست کی وجہ یہ ہوئی کہ تمہاری کثرت نے تمہیں تعجب میں ڈال دیا، تم کثرت پہ اعتماد کر بیٹھے کہ آج ہم بہت زیادہ ہیں اس لیے ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا لیکن یہ جماعت کی کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین تم پر کشادہ ہونے کے باوجود تنگ ہوگئی پھر تم پیٹھ پھیر کے بھاگ گئے۔

یہ دو واقعے اسلامی تاریخ میں رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں پیش آئے جس سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ تنازع فی الامر بھی مسلمان کے لیے شکست کا باعث بنتا ہے اور ظاہری اسباب کے اوپر اعتماد اور اپنی کثرت کے اوپر بھروسہ یہ بھی اللہ کی نصرت سے محرومی کا باعث ہو جاتا ہے اس لیے یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے نکلے اتراتے ہوئے، لوگوں کو دکھاتے ہوئے اور وہ اللہ کے راستہ سے روکتے تھے اور وہ اکڑ رہے تھے، ظاہری اسباب کے اوپر ان کو بھروسہ تھا، شو بازی کر رہے تھے اور ان کو یہ یاد نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کے ارد گرد گھیرا ڈالا ہوا ہے، وہ کتنی ہی اپنی جولانی دکھالیں، کتنی ہی قوت اور جوش کا مظاہرہ کر لیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی باڑ سے باہر نہیں نکل سکتے، جب اللہ تعالیٰ ان کے عملوں اور کارروائیوں کو گھیرے ہوئے ہے تو اللہ کی مرضی کے خلاف اللہ کی نصرت کے بغیر ان کی کارروائیاں کیسے کامیاب ہو سکتی ہیں، پھر دیکھ لیا کہ ان اکڑنے والوں اور اسباب کے اوپر بھروسہ کرنے والوں کا کیا حال ہوا؟ اللہ تعالیٰ ان کے عملوں کو گھیرنے والا ہے۔

"وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ" کا مفہوم:

اب آگے ان کی یہی حالت ذکر کی ہے "وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ" قابل ذکر ہے وہ وقت جبکہ مزین کیا شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال کو یعنی شیطان نے ان کے قلوب میں وسوسے ڈالے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو یہ بالکل ٹھیک ہے، یہ تمہاری قومی زندگی کے لیے ضروری ہے، یہ تمہارے مال و دولت کی حفاظت کے لیے ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، یہ بالکل ٹھیک ہے، اس طرح ان کے قلوب کے اندر شیطان نے وسوسے ڈالے اور ان وسوسوں میں یہ بھی تھا کہ ان کو ان کی ظاہری کثرت دکھائی اور دکھا کے کہتا ہے کہ جب تم اتنی تعداد میں ہو، اتنے جنگجو اور بہادر ہو اور اتنا سامان تمہارے پاس ہے تو آج تم پہ کون غالب آ سکتا ہے، یہ ہوا بھر بھر کے ان کو آگے لے آیا اور لا کے تباہی کے گڑھے میں ڈال دیا، یہی وسوسے ڈالے کہ کوئی تمہارے اوپر غالب آنے والا نہیں اور میں بھی تمہارا مددگار ہوں، میری قوت بھی تمہارے ساتھ ہے، اس طرح ان کو بھڑکاتا رہا اور میدان میں لے آیا جس وقت میدان میں دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہو گئیں اور فرشتوں کا نزول شیطان نے دیکھا تو پھر وہ بھاگ گیا اور کہتا ہے کہ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں، مجھے تو ڈر لگتا ہے، میں ایسی چیزیں دیکھ رہا ہوں جو تمہیں نظر نہیں آ رہی ہیں، یہ ہے ان آیتوں کا مفہوم جو آپ کے سامنے ذکر کی جا رہی ہیں۔

شیطان نے وسوسہ کیسے ڈالا؟

لیکن اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ یہ جو شیطان نے انہیں کہا تھا تو کیا یہ کسی انسان کی شکل میں متشکل ہو کے آیا تھا یا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو قدرت دی ہے اپنی طاقت کے ساتھ ان کے قلوب میں صرف وسوسہ ڈالتا رہا اور اس وسوسہ کے ساتھ ان کو بہکا رہا تھا اور جب آگے سے فرشتے اترے اور اللہ کا رسول سامنے آیا اور اللہ کی نصرت سامنے آئی تو سب شیطانی وسوسے ختم ہو گئے ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے قوت کا نشہ بھی اتر گیا اور اپنے یار اور مددگار بھی ساتھ چھوڑ گئے، دل میں جو شیطانی وسوسے تھے وہ سارے ختم ہو گئے اور بے ہمت ہو گئے تو یہ سارے کا سارا قصہ باطنی ہے اور اس کے باطنی وسوسوں کو "قال" کے ساتھ تعبیر کیا ہے کہ شیطان نے ان کو یہ کہا، یہ سمجھایا، یہ سلجھایا اور یہ بات بھی عین محاورہ کے مطابق ہے کہ دل کے خیالات کو بھی "قال" کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، آپ بھی ایسا کیا کرتے ہیں جیسے آپ کہتے ہیں میں نے اپنے دل میں کہا، تو آپ اپنے دل کے خیالات کو بھی ایسے ہی نقل کیا کرتے ہیں جیسے کسی کے ساتھ آپ گفتگو کر رہے ہیں، یا وہ کسی انسانی شکل میں متشکل ہو کے آیا تھا اور انسانی شکل میں متشکل ہو کے آیا تھا تو کس انسان کی شکل میں آیا تھا؟ یہ بات ان آیات میں قابل غور ہے۔

قرآن کریم کے ظاہری الفاظ زیادہ تو اس بات پر ہی دلالت کرتے ہیں کہ وہ کسی انسانی شکل میں متشکل ہی تھا کیونکہ شیاطین انسانی بھی ہوتے ہیں اور جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصل شیطان متشکل ہو کے آ گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسانوں میں سے کچھ شیطان تھے جو ان کو اس طرح بہکا بہکا کے آگے لا رہے تھے اور وقت پہ آ کے ساتھ چھوڑ گئے، دونوں صورتیں متوقع ہیں، اصل کے اعتبار سے تین ہو گئیں کہ شیطان نے قلب میں وسوسہ ڈالا یا انسانی شکل میں متشکل ہو کے آیا، اگر متشکل ہو کے آیا تو واقعی وہ جن تھا جو متشکل ہو کے آیا یا انسانوں میں سے کچھ انسان ہی ایسے شیطان تھے جنہوں نے شیطان کا کردار ادا کیا اور مشرکوں کو بہکایا پھر وقت پہ امداد نہیں کی یہ ساری صورتیں ممکن ہیں۔

منافقین اور شیطان کے وسوسہ میں اتحاد:

قرآن کریم میں اٹھائیسویں پارہ میں سورۃ الحشر میں منافقین کا کردار اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا ہی دکھایا کہ جنہوں نے یہود کو بہکایا تھا مسلمانوں کے مقابلہ میں اور یہ کہا تھا کہ تم اپنی جگہ ڈٹے رہو اگر تمہارے ساتھ لڑائی ہو گئی تو ہم تمہارے ساتھ لڑیں گے اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ مل کے گھروں سے نکل جائیں گے وہاں بھی

اسی قسم کے الفاظ ہیں "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ" اگر تم نکلے تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے "وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا" اور تمہارے بارے میں ہم کبھی کسی کا کہنا نہیں مانیں گے "وَاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ" اگر تمہارے ساتھ لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے "وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ" اللہ گواہ ہے کہ یہ سب جھوٹے ہیں، جھوٹے کس طرح ہیں؟ "لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ" اگر یہ یہودی نکال دیے گئے تو یہ منافق ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے "وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا" اگر ان سے لڑائی ہوگئی "لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ" تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے "وَلَئِنْ نَصَرُوْهُمْ" اگر بالفرض مدد کریں گے بھی تو کیا ہوگا "لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ" پیٹھ پھیر کے بھاگ جائیں گے، ان کے اندر کوئی کسی قسم کی قوت اور طاقت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ ان منافقین کا کردار نقل کیا ہے اور پھر ان کی مثال دی ہے "كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ" ان کی مثال تو شیطان جیسی ہے کہ پہلے انسان کو کہتا ہے کفر کر "فَلَمَّا كَفَرَ" جب انسان کفر کر لیتا ہے "قَالَ اِنِّيْ بَرِيْءٌ مِّنْكَ" پھر شیطان کہتا ہے میرا تجھ سے کوئی تعلق نہیں "اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعَالَمِيْنَ" میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو رب العالمین ہے، پہلے کفر اختیار کرنے کے لیے کہتا ہے اور کفر کروا کے پھر اس سے لاتعلق ہو جاتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی تعلق نہیں، میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو رب العالمین ہے "فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا اَنَّهُمَا فِي النَّارِ" لیکن ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دونوں ہی جہنم میں جاتے ہیں یعنی جس نے اکسا کے کفر کروایا وہ بھی جہنم میں اور کفر کرنے والے بھی جہنم میں، دونوں ہی اس کفر کے ذمہ دار ہوتے ہیں بہکانے والا بھی اور کفر کرنے والا بھی۔

یہ مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک پہلوان تو اکھاڑے میں اتر کے کشتی کرتا ہے، ایک تو جرم کے میدان میں آ گیا اور اس نے جرم میں اپنا زور دکھانا شروع کر دیا، اور ایک کنارے پہ بیٹھ کے اس کو داؤ پیچ بتاتا ہے تو چاہے میدان کے اندر نہ آیا ہو لیکن جرم میں تو برابر کا شریک ہے، ایک چور عملاً چوری کرتا ہے اور ایک چوروں کا استاذ ہے جو چوری کے طریقے بتاتا ہے لیکن وہ خود پولیس سے ڈرتا ہوا چوری میں ملوث نہیں ہوتا تو جس وقت سراغ لگے گا اور پکڑے جائیں گے تو چور اور چور کا استاذ دونوں ایک ہی درجہ کے ہوتے ہیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ استاذ کو زیادہ مار پڑے جس نے چوری کے طریقے بتائے تھے۔

تو یہ کردار بعض لوگوں کا ہوتا ہے جو حقیقت کے اعتبار سے ابلیس کا ہے لیکن کچھ انسان بھی شیطان والا کردار ادا کرتے ہیں تو ان کی مثال بھی اسی طرح دی جاتی ہے تو یہاں دونوں صورتیں ممکن ہیں اور دونوں کا

ذکر ہی تفاسیر میں موجود ہے۔

شیطان نے سراقہ بن مالک کی شکل میں مشرکوں کو دھوکہ دیا:

کہتے ہیں کہ مشرکین جس وقت مسلمانوں کے مقابلہ میں آئے تھے تو ان کے دل میں ایک دھڑکا تھا کہ ہم یہ پوری کی پوری قوت لے کے جارہے ہیں اور پیچھے مکہ معظمہ خالی ہے، کوئی معتد بہ اس میں قوت موجود نہیں ہے اور بعض دوسرے قبائل ہمارے دشمن ہیں اگر ان کو پتہ چل گیا کہ ہم اس طرح لشکر لے کے نکل گئے ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پیچھے وہ ہمارے گھر لوٹ لیں یا کہیں ایسا نہ ہو کہ پیچھے سے یہ جنگ چھیڑ دیں اور ہم ان کے اور مسلمانوں کے محاصرہ میں آجائیں اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی دشمنی نکال لیں یہ ان کے دل میں دھڑکا تھا کہتے ہیں کہ فوراً ابلیس ان کے سردار سراقہ بن مالک کی شکل میں آیا اور یوں محسوس ہوا جیسے جھنڈا اٹھایا ہوا ہے اور لشکر ساتھ ہے اور ان کی مدد کے لیے آیا ہے اور آکے ان کو کہتا ہے فکر نہ کرو تم تو اتنے زیادہ ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں آج کون تم پر غالب آسکتا ہے جبکہ میں تمہارا مددگار ہوں، تم اس سلسلہ میں کوئی فکر نہ کرو، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا یوں آکے تھپکا دیا اور ہوا دے دی۔

پھر جس وقت میدان میں آئے تو یہ ساتھ ہی تھا کہتے ہیں کہ ابوجہل کے بھائی حارث بن ہشام کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا جب میدان میں آئے اور جب ادھر سے فرشتوں کا نزول دیکھا تو ہاتھ چھڑا کے بھاگنے لگا، جب بھاگنے لگا تو انہوں نے کہا سراقہ! اب کہاں جارہے ہو، کہنے لگا یہ میرے بس کی بات نہیں ہے، تم جانو اور تمہارا کام جانے اور وہاں سے پھر وہ بھاگ آیا، پھر یہ واقعہ ہی ایسا پیش آیا کہ سراقہ بن مالک کی شکل میں شیطان آیا اور ان کو بہکا کے اس میدان میں بھیج کے فرشتوں کو دیکھ کے دوڑ آیا یہ کہتا ہوا کہ مجھے ایسی چیزیں نظر آرہی ہیں جو تمہیں نظر نہیں آرہی ہیں، میں تو ڈرتا ہوں کہ کہیں میری پٹائی یہاں نہ ہو جائے، مجھے کیا ضرورت تمہارا اپنا قومی جھگڑا ہے تم جانو اور تمہارا کام جانے اس طرح کہہ کے وقت پہ دھوکہ دے کے واپس آگیا، اور یہ حقیقت میں ابلیس تھا۔

چنانچہ جس وقت یہ مشرکین واپس پہنچے ہیں تو کسی کی ملاقات سراقہ سے ہوئی تو اس نے ملامت کی کہ تو اچھا آدمی ہے وقت پہ آکے تو نے ہمیں دھوکہ دے دیا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور اس نے کہا مجھے تو تمہاری لڑائی کا پتہ ہی تب چلا ہے جب تم واپس مکہ پہنچ گئے ہو، مجھے تو علم ہی نہیں کہ تمہارا مقابلہ کسی کے ساتھ ہوا ہے پھر حقیقت نمایاں ہوئی کہ یہ تو کوئی جن یا شیطان تھا جو اس شکل میں آیا اور مشرکوں کو بہکا کے میدان میں لے گیا، ان آیات کی تفسیر میں

یہ روایت بھی موجود ہے۔

آیت بالا کا ایک اور مفہوم:

اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہود ان سازشوں میں ابتداء ہی سے شریک تھے اور اس قسم کے لوگ مشرکوں کو بہکاتے تھے تو ان بہکانے والوں کی مثال اس طرح ذکر کی گئی ہے کہ یہ لوگ بہکا دیتے ہیں، بہکانے کے بعد خود کنارے پہ رہ جاتے ہیں اور دوسرے کی پٹائی کروادیتے ہیں اور زندگی میں انسان کو اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں کہ کئی شریر قسم کے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ خود تو سامنے آتے نہیں، خود تو کسی وجہ سے ڈرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نمایاں ہوگئے تو ہمارا نقصان ہوجائے گا، ہوشیاری یہ کرتے ہیں کہ کسی اور کو ہوا دے کے آگے میدان میں پہنچادیں گے، مطلب یہ ہوگا کہ جو ہمارا مقصد فساد اور شرارت ہے وہ بھی پورا ہوجائے اور ہم کسی کے سامنے نمایاں بھی نہ ہوں، پٹے تو دوسرا پٹے ہم کیوں مار کھائیں، اس قسم کے ہوشیار آدمی ہر معاشرے کے اندر موجود ہوتے ہیں اور سب سے بڑے فتنہ پرداز یہ ہوتے ہیں، یہ شریر نہیں شریروں کے استاذ ہوتے ہیں، سب سے زیادہ معاشرے میں نقصان یہ کرتے ہیں، ان کی مثال اسی شیطان کی ہے کہ بہکاتا ہے، اکساتا ہے کہ کفر کرو، شرارت پر بہکاتا ہے لیکن جس وقت موقع آتا ہے تو خود روپوش ہوجاتا ہے اور دوسرے کو پٹوادیتا ہے۔

اس لیے ہمیشہ انسان کو معاشرے میں رہتے ہوئے اس بات پہ بھی غور کرنا چاہیے کہ میں کہیں کسی کے ہاتھ میں استعمال تو نہیں ہورہا، اگر میں کسی کے ہاتھ میں استعمال ہورہا ہوں، جو مجھے مجبور کررہا ہے کہ تو یہ کر تو کیا یہ خود بھی میدان میں نکل کر یہ کام کرنے کے لیے تیار ہے، اگر وہ خود میدان میں اتر کے یہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں تو تم اس کے ہاتھ میں استعمال ہو کے آگے کیوں آئے ہو؟ نقصان تمہارا ہوجائے گا وہ باہر بیٹھ کے تماشہ دیکھے گا تو ایسے شیاطین کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

تو مشرکین کو بہکانے والے بھی کچھ لوگ ہوں گے جن پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ان شیاطین نے ان کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈالا ہے اور ان کے اکسانے اور بہکانے کے ساتھ یہ میدان میں آگئے اور خود وقت پہ وہ ساتھ چھوڑ گئے، تو جیسے وہاں منافقین کی مثال اللہ تبارک وتعالیٰ نے شیاطین کے ساتھ دی ہے تو ایسا کوئی گروہ چاہے وہ یہود کا ہو یا کسی دوسرے کا ہو جس نے مشرکین کو بہکایا تھا ان کی مثال بھی یہاں اسی طرح شیطانی کردار کے ساتھ دی گئی ہے۔

تفسیر باللفظ:

مزین کیا ان کے لیے شیطان نے ان کے اعمال کو یعنی ان کے کاموں کی تعریف کی کہ تم بڑا اچھا کر رہے ہو، یہی بہتر ہے یعنی تمہاری قومی زندگی کے لیے یہی مفید ہے، اس کے بغیر تمہارا نقصان ہو جائے گا اس قسم کی باتیں کر کے ان کی کاروائیوں کو مزین کر کے دکھایا اور یہ کہا کہ آج تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں لوگوں میں سے، میں تمہارا مددگار ہوں، جب دونوں جماعتیں آپس میں آمنے سامنے ہوئیں تو وہ شیطان اپنی ایڑیوں پہ واپس لوٹ گیا، ایڑیوں کے بل واپس لوٹ گیا اور کہنے لگا "اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ" میں تم سے لاتعلق ہوں، میں تمہاری اس جنگ میں شریک نہیں ہوتا "اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ" میں ایسی چیز دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے "اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ" میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں، "وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ" اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔

دیکھو! یہ مثال اس مثال کے کتنی مشابہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے منافقین کی بیان فرمائی ہے۔

منافقین کا تبصرہ اور اللہ تعالیٰ کا جواب:

"اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ" یہ آیت بھی اسی مضمون سے متعلق ہے کہ مسلمان جس طرح جانبازی دکھاتے تھے، حوصلہ کے ساتھ کفر کا مقابلہ کرنے کے لیے آتے تھے تو بسا اوقات منافق یا جن کے دلوں میں تردد کی بیماری تھی وہ کہتے کہ یہ لوگ اپنے دین کی بناء پر دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں، یوں سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم حق پہ ہیں اس لیے ہم ہر میدان میں فتح پائیں گے ان کے دین نے ان کو دھوکہ دے رکھا ہے حالانکہ ان کے پاس کوئی طاقت اور زور نہیں ہے، جس دن ان کی کسی کے ساتھ ٹکر ہوگی تو منہ کی کھا کے آئیں گے، اس وقت تو اپنے دین پر بھروسہ کی وجہ سے بہت دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں، اس قسم کی باتیں اور طعنہ زنی وہ منافق ان مسلمانوں پر کرتے تھے جو مسلمان حق کے حامی ہونے کی بناء پر حوصلہ کے ساتھ اپنے سے بڑی طاقت کے ساتھ بھی ٹکرانے کی تمنا رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ دھوکہ نہیں ہے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے اور جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو پھر غالب کیا کرتے ہیں۔

یاد کیجیے جب منافق کہتے تھے اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکہ میں ڈال دیا، مطلب یہ ہے کہ یہ دھوکہ نہیں ہے، دین نے دھوکہ میں ڈال دیا کا مطلب یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہمارا دین حق ہے اس لیے ہم جس سے بھی بھڑ جائیں گے فتح پا جائیں گے، یہ دھوکہ میں ہیں جس وقت کسی سے

فکر ہوگی تو پھر ان کو پتہ چلے گا، ابھی تو اپنے دین کی بناء پر اس طرح کے خیالات جمائے پھرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ دھوکہ نہیں ہے، یہ اللہ پہ توکل ہے اور توکل کی برکت سے فتح ہوتی ہے "وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" جو شخص بھی اللہ کے اوپر بھروسہ کیا کرتا ہے پس بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

شرکاءِ بدر کا مقام:

جن لوگوں نے بدر کی لڑائی میں شرکت کی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی فضیلت اور مقام عطا فرمایا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دوزخ میں ہرگز ایسا شخص داخل نہ ہوگا جو بدر میں یا حدیبیہ میں حاضر ہوا ہو۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص جس کا نام حارثہ رضی اللہ عنہ تھا وہ غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے تھے ان کی والدہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! حارثہ سے مجھے جو خاص تعلق تھا وہ آپ کو معلوم ہی ہے اگر وہ جنت میں چلا گیا تو میں صبر کرتی ہوں اور ثواب کی امید رکھتی ہوں اور اگر کوئی دوسری بات ہے (دوزخ میں چلا گیا) تو آپ دیکھیں گے میں کیا کرتی ہوں یعنی رورو کر ڈھیر کردوں گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا افسوس کی بات ہے تو کیا کہہ رہی ہے وہ کوئی ایک جنت تھوڑی ہے وہ تو بہت سی جنتیں ہیں، اور تیرا بیٹا فردوس اعلیٰ میں ہے، روایات میں آتا ہے کہ یہ حارثہ لڑائی سے دور تھے اور نگرانی کرنے والوں سے دور تھے حوض سے پانی پی رہے تھے کہ اچانک ایک تیر آیا جوان کی موت کا سبب بن گیا، جب اس شخص کو اتنا بڑا درجہ ملا جو عملاً لڑائی میں شریک نہیں تھا کہ فردوس اعلیٰ میں داخل کردیا گیا جو جنت کا سب سے بلند درجہ ہے تو جن لوگوں نے بالفعل قتال میں حصہ لیا، دشمن سے مقابلہ کیا ان کے درجات کا کیا عالم ہوگا۔

جس طرح مہاجرین وانصار میں سے جن لوگوں نے غزوۂ بدر میں شرکت کی تھی ان کو بڑی فضیلت ملی، اسی طرح جو فرشتے اس جنگ میں شریک ہوئے تھے ان کو بھی دوسرے فرشتوں پر فضیلت دی گئی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس جنگ کے بعد ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ اہل بدر کو کس درجے میں شمار کرتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے نزدیک وہ افضل المسلمین میں سے ہیں، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ اسی طرح ہم بھی بدر میں شریک ہونے والے فرشتوں کو دوسرے فرشتوں سے افضل جانتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ

اگر دیکھے تو جب وفات دیتے ہیں ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا فرشتے مارتے ہیں

وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾

وہ ان کے چہروں کو اور ان کی پشتوں کو (اور کہتے ہیں) اور چکھو تم جلنے کا عذاب ﴿۵۰﴾

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾ۙ

یہ ان اعمال کے سبب سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجے اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ بندوں کے لیے بالکل ظلم کرنے والا نہیں ہے ﴿۵۱﴾

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ

ان کا حال فرعون کے متعلقین کے حال کی طرح ہے اوران کی طرح ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں انہوں نے آیات کا انکار کیا

اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ

اللہ کی پس پکڑ لیا ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا ہے سخت دینے والا ہے

الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً

سزا ﴿۵۲﴾ یہ اس سبب سے ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ہے بدلنے والا کسی احسان کو

اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ

جو اس نے کیا ہو کسی قوم پر جب تک کہ نہ بدلیں وہ لوگ اس چیز کو جو ان کے دلوں میں ہے، اور بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا ہے

عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ۙ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا

جاننے والا ہے ﴿۵۳﴾ ان کا حال فرعون کے متعلقین کے حال کی طرح ہے اوران کی طرح ہے جو ان سے پہلے گزرے جھٹلایا

بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ

انہوں نے اپنے رب کی آیات کو پھر ہم نے انہیں ہلاک کر دیا ان کے گناہوں کی وجہ سے اور ہم نے فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا

وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ

وہ سارے کے سارے ظلم کرنے والے تھے ﴿۵۴﴾ بے شک جانوروں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنہوں نے

كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ

کفر کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۵۵﴾ وہ لوگ جن سے آپ نے معاہدہ کیا ہے ان میں سے پھر وہ لوگ توڑتے ہیں

عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ

اپنے عہد کو ہر مرتبہ میں اور وہ ڈرتے نہیں ﴿۵۶﴾ پھر اگر تو پالے انہیں

فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

لڑائی میں پس بھگادے ان کی وجہ سے ان لوگوں کو جو ان کے پیچھے ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۵۷﴾

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى

اور اگر تو اندیشہ کرے کسی قوم کی طرف سے خیانت کا تو پھینک دے ان کی طرف

سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ

برابر سرابر بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتے خیانت کرنے والوں کو ﴿۵۸﴾ وہ ہرگز گمان نہ کریں جنہوں نے

كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ

کفر کیا کہ وہ چھوٹ گئے وہ لوگ عاجز نہیں کرسکتے ﴿۵۹﴾ اور تیار کرو ان کے لیے جو تم سے ہوسکے یعنی ہر قسم کی

مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

قوت اور پلے ہوئے گھوڑے ڈراتے ہو تم اس طاقت کے ذریعہ سے اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو

وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا

اور ان کے علاوہ اور لوگوں کو، نہیں جانتے تم ان لوگوں کو۔ اللہ انہیں جانتا ہے اور جو

تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ

چیز بھی تم اللہ کے راستہ میں خرچ کروگے وہ تمہاری طرف پوری پوری ادا کردی جائے گی اور تم

لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى

حق تلفی نہیں کیے جاؤگے ﴿۶۰﴾ اور اگر وہ مائل ہوجائیں صلح کی طرف تو تو بھی مائل ہوجا اور بھروسہ کر

اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۶۱﴾ وَ اِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ

اللہ پر بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے (۶۱) اگر وہ لوگ ارادہ کریں آپ کو دھوکہ دینے کا

فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِىۡۤ اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۶۲﴾ ۙ

پس بے شک تیرے لیے اللہ کافی ہے ، وہ اللہ ہے جس نے تجھے قوت پہنچائی اپنی مدد کے ساتھ اور مؤمنین کے ساتھ (۶۲)

وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا

اور جوڑ دیا ان کے دلوں کو اگر خرچ کرتا تو ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں

مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيۡنَهُمۡ ؕ

تو آپ ان کے دلوں میں جوڑ نہ لگا سکتے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں آپس میں جوڑ دیا

اِنَّهٗ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶۳﴾

بے شک وہ زبردست ہے حکمت والا ہے (۶۳)

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

"وَلَوۡ تَرٰٓى اِذۡ يَتَوَفَّى الَّذِيۡنَ كَفَرُوا" یہاں سے برزخ کی سزا کا ذکر ہے کہ دنیا کے اندر تو سزا ہو ہی چکی جیسا کہ ظاہر میں مارے گئے، قتل کیے گئے، بدر کے اندر شکست کھا گئے یہ تو دنیا کی سزا ہے اور کافر کے لیے صرف یہی سزا نہیں ہے، اسی پر کفایت نہیں ہے بلکہ آگے برزخ میں بھی ان کے لیے سزا ہے اور قیامت کے بعد بھی ان کے لیے عذاب ہے۔

برزخ کا معنی و مفہوم:

برزخ کا لفظ جو بولا جا رہا ہے تو برزخ کا لفظی معنی ہوتا ہے رکاوٹ، "بَيۡنَهُمَا بَرۡزَخٌ لَّا يَبۡغِيٰنِ" ان دونوں دریاؤں کے درمیان میں رکاوٹ ہے وہ ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کر سکتے، اور یہاں برزخ سے مراد ہوتا ہے اس دنیوی زندگی کے ختم ہونے کے بعد قیامت کے قائم ہونے سے پہلے جو وقت گزر رہا ہے وہ وقت برزخ

کہلاتا ہے، اس موت کے بعد دوبارہ زندگی سے پہلے جو وقت ہے جس کو ہم قبر کی زندگی کہتے ہیں، قبروں میں جو وقت گزرتا ہے یہ برزخ ہے۔

برزخ کا عذاب وثواب برحق ہے:

قیامت کے بعد تو جنت ودوزخ، راحت اور عذاب یہ تو بیسیوں آیات کے اندر آیا ہوا ہے اور یہ قطعیات میں سے ہے جس کے اندر کسی تاویل کی گنجائش نہیں، تاویل کرنے والا بھی کافر ہے جیسا کہ انکار کرنے والا کافر ہے، قیامت جس وقت قائم ہوگی، سارے انسان جس وقت اٹھائے جائیں گے اور دوبارہ زندگی ملے گی اور نیکوں کے لیے جنت اور بروں کے لیے دوزخ یہ بنیادی عقائد میں سے ہے، توحید، رسالت اور معاد یہ تین عقیدے ہی اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ جو برزخ ہے تو برزخ کے اندر بھی راحت اور عذاب ہے، یہ بھی دلائل قطعیہ سے ثابت ہے، روایاتِ متواترہ سے ثابت ہے، قدر مشترک روایات سے ثابت ہے کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے جو یہ وقت گزرے گا جس کو ہم برزخ کا وقت کہتے ہیں، قبر کی زندگی کہتے ہیں، اس میں صرف یہ نہیں کہ مٹی ہو کے پڑے رہیں گے اور نہ کوئی راحت ہو اور نہ کوئی عذاب ہو بلکہ اس میں بھی راحت ہے اور اس میں بھی عذاب ہے تو برزخ کا عذاب اور برزخ کا ثواب یہ بھی اہل سنت والجماعت کے نزدیک قطعیات میں داخل ہے اس لیے اگر کوئی شخص اس کا منکر ہو اور کہے کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے کوئی سزا نہیں یا کوئی ثواب نہیں تو یہ شخص بھی اہل سنت والجماعت کے نزدیک کافر ہے۔

ہاں البتہ جو واقعات آتے ہیں کہ قبروں میں عذاب کس طرح ہوگا ان میں سے ہر ہر واقعہ خبر واحد سے ثابت ہے اس لیے اس کا انکار گمراہی ہے، کسی خاص واقعہ کے انکار پر کفر نہیں آئے گا البتہ کلیۃً اگر انکار کردیا جائے کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے کوئی عذاب نہیں یا کوئی ثواب نہیں بلکہ انسان ایسے ہی پڑا رہے گا، قیامت میں عذاب اور ثواب ہوگا اس طرح اگر کوئی شخص کہتا ہے تو پھر وہ کافر ہے، کسی خصوصی واقعہ کا انکار اگر کرے تو وہ ایسے ہے جیسے کسی نے خبر واحد کا انکار کیا ہے اور خبر واحد کا انکار آپ نے اصول فقہ کے اندر پڑھا ہے کہ گمراہی ہے لیکن کفر نہیں ہے کیونکہ خبر واحد ظنی ہوتی ہے۔

لیکن اتنا قدر مشترک کہ کچھ نہ کچھ عذاب ضرور ہے اور اسی طرح راحت ضرور ہے یہ قدرِ مشترک متواتر ہے اس کا انکار کفر ہے۔

برزخ کے عذاب کی دلیل:

تو جن آیات کے ساتھ اس برزخ کے عذاب اور ثواب پر استدلال کیا جاتا ہے ان آیات میں سے ایک آیت یہ بھی ہے، اسی مناسبت سے میں نے آپ کے سامنے برزخ کے عذاب اور اس کے ثواب کی بات ذکر کی ہے، یہ آیت بھی برزخ کے عذاب پر دلالت کرتی ہے "وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" یہ خطاب عام ہے سرورکائنات ﷺ کو بھی ہے اور ہر مخاطب جو بھی سننے والا ہو، اگر دیکھے تو جس وقت کہ وفات دیتے ہیں فرشتے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا، کافروں کو جس وقت فرشتے وفات دیتے ہیں، "تَوَفّٰى يَتَوَفّٰى" وصول کرنے کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جس وقت ان کی روح کو وصول کرتے ہیں، قرآن کریم میں دوسری جگہ جس طرح آتا ہے "قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ" ملک الموت تمہیں وصول کرتا ہے، تمہیں وفات دیتا ہے جس وقت فرشتے کافروں کو وفات دیتے ہیں "يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ" یہ وہی سزا ہے وہ ان کے چہروں پر بھی مارتے ہیں اور ان کی دبروں پر بھی مارتے ہیں، کیا مارتے ہیں؟ کس طرح مارتے ہیں؟ یہ تفصیل یہاں نہیں ہے، ڈنڈے مارتے ہیں، تھپڑ مارتے ہیں، جوتے مارتے ہیں، کوڑے مارتے ہیں جو کچھ بھی ہو یہاں اس میں اجمال ہے، جیسے پولیس والے جب مجرم کو پکڑتے ہیں تو منہ پہ تھپڑ بھی مارتے ہیں اور پشت پر جوتے اور ڈنڈے بھی مارتے ہیں، فرشتے بھی اسی طرح پٹائی کرتے ہیں ان کافروں کی، ان کے منہ پر بھی مارتے ہیں اور ان کی دبر پر بھی مارتے ہیں اور ساتھ ساتھ زبان سے تنبیہ بھی کرتے ہیں "ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ" چکھو جلنے والی آگ کا عذاب، آگے چلو اور جلنے والی آگ کا عذاب تمہارے سامنے آنے والا ہے، یہ سارے کا سارا عذاب اور تکلیف ہے جو کافروں کو موت کے وقت آتی ہے یہ بھی برزخ کے عذاب کا حصہ ہے، یہ نہیں کہ روح نکلی اور ختم ہو گئے پھر قیامت کے دن اٹھیں گے ایسی بات نہیں، موت جس وقت آتی ہے تو موت کے بعد کے حالات کافر کے لیے باعث تکلیف ہیں اور مؤمنین کے لیے باعثِ راحت ہیں اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے چاہے یہ وفات کے وقت کی بات ہے لیکن اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ وفات کے وقت بھی فرشتوں کی مار پڑتی ہے اور کافروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

برزخ میں کافروں پر عذاب کی وجہ:

اور ساتھ تنبیہ کرنے کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارے اعمال کی وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجے اور اللہ تعالیٰ تو بالکل اپنے بندوں پر زیادتی نہیں کرتا "لَیْسَ بِظَلَّامٍ" یعنی بالکل بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے، ظلام مبالغہ کا صیغہ ہے اور مبالغہ پر نفی داخل کر کے مبالغہ کے ساتھ نفی مقصود ہوتی ہے جیسے اگر یوں کہا جائے "لَیْسَ بِظَالِمٍ" تو معنی ہوگا ظلم کرنے والا نہیں ہے اور جب "لَیْسَ بِظَلَّامٍ" کہا جائے گا تو معنی ہوگا بالکل بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے، یہ تمہاری اپنی کرتوتیں ہیں جو سامنے آ رہی ہیں، یہ تمہاری اپنی فصل ہے جو تم نے بوئی تھی آج تم اس کو کاٹ رہے ہو۔

تطبیق بین الآیات:

قرآن کریم میں ایک جگہ تو ہے "اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ" کہ جانیں اللہ وصول کرتا ہے اور یہاں ہے "اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَۃُ" یہاں وفات کی نسبت فرشتوں کی طرف ہے اور ایک جگہ ہے "قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ" ملک الموت تمہیں وفات دیتا ہے وہاں ایک فرشتہ کا ذکر ہے اور یہاں ملائکہ کا ذکر ہے اور ایک جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی ہے تو اس میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

لیکن حقیقت میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ وفات اصل تو یہ اللہ کا کام ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کام کے لیے چونکہ فرشتے متعین کیے ہوئے ہیں تو کبھی کبھی ان کی طرف نسبت مجازاً ہو جاتی ہے، وفات اللہ تعالیٰ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ملک الموت آتے ہیں اور پھر ملک الموت کے ساتھ ان کے اعوان وانصار بہت سارے ہوتے ہیں وہ تو گویا کہ اس شعبہ کا امیر ہے جس طرح ایک شخص شعبہ کا انچارج ہوا کرتا ہے باقی ان کے ساتھ اعوان وانصار اور بھی بہت زیادہ ہیں اس لیے کبھی تو حقیقت کی طرف دیکھتے ہوئے صرف اللہ کی طرف نسبت آ گئی کہ وفات دینا اللہ کا کام ہے اور کبھی اس شعبہ کے امیر کی طرف نسبت آ گئی کہ ملک الموت وفات دیتا ہے اور کبھی اس کے اعوان وانصار کی طرف نسبت کر دی گئی کہ ملائکہ وفات دیتے ہیں تو تینوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔

کافروں اور فرعونیوں میں مشابہت:

"کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ" ان کا حال فرعون کے لوگوں کے حال کی طرح ہے، فرعون کے لوگوں کا حال

آپ کے سامنے سورۃ الاعراف میں مفصل گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی خوشحالی دی ہوئی تھی، بہت اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر انعامات کیے ہوئے تھے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت تشریف لے آئے تو انہوں نے آیات کا انکار کیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے سامنے پیش کی تھیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہلکی ہلکی تنبیہات عذاب کی شکل میں ان کے اوپر آئیں، ایک تنبیہ آتی پھر ان کو مہلت دی جاتی، پھر تنبیہ آتی پھر مہلت دی جاتی یہ سلسلہ جاری رہا، یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ یکدم ہلاک نہیں کرتا بلکہ اس طرح سے تنبیہات اتارتے ہیں اور تنبیہات کے ساتھ جو سدھر جاتا ہے تو ٹھیک اور اگر نہیں سدھرتا تو پھر ایک ہی دفعہ اچانک عذاب آجاتا ہے اور ان کو تباہ کر دیا جاتا ہے، یہ ابتدائی تنبیہات کا ذکر ہے۔

ان کا حال فرعون کے لوگوں کے حال جیسا ہے اور ان لوگوں جیسا ہے جو ان سے پہلے گزرے انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں پکڑا ان کے گناہوں کے سبب سے اس سے مراد مختلف چھوٹے چھوٹے عذاب ہیں جیسے کئی قسم کے عذابوں کا ذکر آپ کے سامنے آیا تھا، پھلوں کا کم ہونا، ٹڈیوں کا آنا، خون کا آنا وغیرہ، یہ نو قسم کے عذاب جو فرعونیوں پر آئے تھے ان کا ذکر سورۂ اعراف میں گذر گیا ہے، کفر کیا انہوں نے اللہ کی آیات کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑ لیا ان کے گناہوں کے سبب سے، بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا ہے اور سخت سزا والا ہے۔

پہلی ہی غلطی پر عذاب نہ آنے کی وجہ:

"ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً" یہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہات آتی ہیں اس میں یہ حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر کسی قوم کو کوئی نعمت اور احسان دے رکھا ہے جیسے دنیوی طور پر جاہ وجلال حاصل ہے، قوت اور اقتدار حاصل ہے، وہ لوگ معاشی طور پر خوشحال ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام ہے تو اللہ تعالیٰ یہ انعام جلدی نہیں چھینتا بلکہ مختلف طریقوں سے تنبیہ کرتے ہیں اور جس وقت وہ لوگ بالکل ہی اپنے حالات بدل لیتے ہیں کہ ضد پہ آجائیں، عناد پہ آجائیں، حق قبول کرنے کی صلاحیت انہوں نے ختم کر دی، سمجھنے اور سوچنے کا ارادہ ہی نہیں کیا، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان کے لیے مزید سرکشی کا باعث بن گئیں جب وہ اپنے اس قسم کے حالات بنا لیتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ اپنے احسانات کو چھین لیتا ہے یہ نہیں کہ دیا اور دینے کے بعد بلا وجہ چھین لیا ایسی بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ پہلے ان کو تنبیہات کرتے ہیں ان کے سامنے نصیحتیں آتی ہیں اور ان کو تذکیر کی جاتی ہے اگر وہ اس میں اپنے

حالات کو بدل لیتے ہیں تو ٹھیک اور اگر وہ اپنے حالات کو نہیں بدلتے بلکہ اور شدت کی طرف جاتے ہیں کہ پہلے اتنے منکر نہیں ہوتے جتنے پھر ہو گئے، پہلے اتنے سرکش نہیں تھے جتنے پھر ہو گئے جیسے مشرکین مکہ سرور کائنات ﷺ کے آنے سے پہلے بت پرستی کرتے تھے لیکن ان میں کچھ اچھی صفتیں بھی تھیں صلہ رحمی کرتے تھے، بیت اللہ کی خدمت کرتے تھے، بیت اللہ کا حج کرنے والوں کی خدمت کرتے تھے اور اسی طرح اور بھی کئی خوبیاں ان کے اندر پائی جاتی تھیں لیکن اللہ کی طرف سے جب ان کے سامنے نصیحت آئی، قرآن کریم اترا، اللہ کا رسول آیا تو ان کے اندر نہ صلہ رحمی رہی نہ بیت اللہ کا احترام رہا، بیت اللہ میں کسی کو آنے نہیں دیتے، کسی کو اس میں اللہ کا نام لینے نہیں دیتے اپنے ہی عزیزوں اور رشتہ داروں کو کس طرح اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مارنا اور قتل کرنا شروع کر دیا اس کے نتیجہ میں پھر ساری قوم پٹ گئی۔

تفسیر باللفظ:

نہیں ہے اللہ تعالیٰ بدلنے والا اس نعمت کو "لَمْ يَكُ" اصل میں "لَمْ يَكُنْ" تھا اور "كَانَ يَكُوْنُ" کے اندر یہ قاعدہ ہے کہ اس کے آخری حرف کو گرا دیا جاتا ہے، "لَمْ يَقُلْ" کی طرح یہ بھی "لَمْ يَكُنْ" ہے سورہ مریم میں بھی یہ لفظ آئے گا "لَمْ اَكُ بَغِيًّا" اصل میں تھا "لَمْ اَكُنْ بَغِيًّا" اسی طرح یہاں بھی "لَمْ يَكُنْ" کی بجائے "لَمْ يَكُ" آ گیا، نہیں ہے بدلنے والا اللہ تعالیٰ اپنے احسان کو جو کر دے کسی قوم پر جب تک وہ نہ بدلیں ان حالات کو جو ان میں ہیں بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے یعنی اللہ کا عذاب یہ کوئی اندھے کی لاٹھی نہیں کہ جہاں لگ گئی لگ گئی کوئی پتہ نہیں کہ کہاں لگ رہی ہے اللہ کے سارے فیصلے سمع اور علم پر مبنی ہیں اللہ تعالیٰ سب باتوں کو سنتا ہے اور سب باتوں کو جاننے والا ہے۔

ان کا حال فرعون کے لوگوں کے حال کی طرح ہی ہے اور ان لوگوں کی طرح ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا اب یہ شدت پیدا ہو گئی "فَاَهْلَكْنٰهُمْ" پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا پہلے پکڑ تھی اور اب مکمل بربادی ہے "وَاَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ" اور فرعون کے متعلقین کو ہم نے ڈبو ہی دیا "وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ" اور یہ سارے کے سارے ظالم تھے اللہ تعالیٰ کے حقوق کی حق تلفی کرنے والے تھے تو ان سب کو ہم نے غرق کر دیا۔

بدترین مخلوق:

"اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ" یہ مذمت ہے اس قسم کے لوگوں کی کہ زمین کے اوپر چلنے پھرنے والی

چیزوں میں سے بدتر اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو کفر کرتے ہیں اور پھر ایمان لاتے ہی نہیں، سرے سے کفر پر ہی اڑ جاتے ہیں ان کو ہزار تنبیہ کرو وہ ماننے والے نہیں ہیں اس قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام حیوانات میں سے، تمام جانوروں میں سے بدتر ہیں اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی حکمت عملی:

ان بدترین لوگوں میں سے، ان کافروں میں سے جن کے ساتھ آپ معاہدہ کرتے ہیں یہ ہدایات ہیں جنگی اصول کے مطابق، ان کا حاصل یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد آپ کے سامنے جو ملکی صورتحال تھی وہ یہ تھی کہ اصل ٹکر تو تھی آپ کی مشرکین مکہ کے ساتھ جو اپنی برادری اور اپنی ہی قوم تھی اور مدینہ منورہ کے ارد گرد یہودی قبائل آباد تھے اور یہود کے قبائل سے آگے مشرکین کے اور قبائل بھی تھے۔

اب یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت عملی ہے کہ سب کے ساتھ بیک وقت ٹکر لینا بسا اوقات مصلحت کے خلاف ہوتا ہے تو آپ نے پھر وہاں جا کے معاہدوں کا سلسلہ شروع کیا آس پاس کے قبائل کے ساتھ ترک جنگ کا معاہدہ ہو گیا کہ ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے تم ہمیں کچھ نہ کہو اور کوئی شخص ہمارے ساتھ لڑنے کے لیے آئے تو تم نے ان کی امداد نہیں کرنی چاہے ہماری امداد کرو یا نہ کرو یہ ایک علیحدہ بات ہے مخالفین کے ساتھ شامل ہو کے ان کی امداد نہیں کرنی اور ان کو قوت نہیں پہنچانی مقصد یہ تھا کہ قبائل اپنی جگہ ٹکے رہیں اور ہمارا مقابلہ اگر ہو تو قریش کے ساتھ ہی ہو۔

تو ایک قوم یا ایک شہر کو تو انسان سنبھال سکتا ہے اب چاروں طرف سے دشمن کھڑے ہو جائیں اور ہر طرف سے جنگ میں شامل ہو جائیں تو اس میں تو بہت پریشانی ہوتی ہے تو آپ نے حکمت عملی کے طور پر تدبیر یہی رکھی کہ یہود سے ترک جنگ کا معاہدہ کر لیا اور ارد گرد کے قبائل کے ساتھ بھی ترک جنگ کا معاہدہ کر لیا اب جنگ صرف قریش کے ساتھ رہ گئی۔

لیکن ان یہود اور مشرکین کا کچھ ایسا حال تھا کہ یہ اپنے معاہدے کی پابندی نہیں کرتے تھے: یہود تو درپردہ سازشیں کرتے، قریش کو بھڑکاتے، ان کو اسلحہ پہنچاتے اور اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کرتے اور بعض دوسرے لوگ بھی اس طرح کی کاروائیاں کرتے تھے لیکن سامنے نہیں آتے درپردہ سازشیں کرتے تھے چنانچہ جس طرح ان کی سازشوں کا پتہ چلتا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا بھی سرکوٹتے چلے گئے، بنو نضیر کی سازش کا پتہ چلا تو ان کو وہاں سے جلاوطن کیا اور بعد

میں بنو قریظہ کی سازش کا پتہ چلا تو ان کے جوانوں کو قتل کیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا گیا اس طرح جس قبیلہ کی سازش کا پتہ چلتا اس کا سرکوٹ دیا جاتا اور جن کا پتہ نہیں چلتا تھا تو ظاہری طور پر جو ان کے ساتھ ترک جنگ کا معاہدہ تھا اور وہ بھی اس کو ظاہری طور پر نباہ رہے تھے اور مسلمان بھی اس کے پابند تھے اس قسم کے حالات ہوئے تھے۔

لیکن آخر ایک وقت ایسا آگیا کہ یہ یہود قابل اعتبار نہ رہے لیکن اگر براہ راست اس طرح یہود کے ساتھ جنگ کی جاتی جس طرح مشرکین کے ساتھ جاری تھی تو پھر وہی بات تھی کہ مشرک اور یہود متحد ہو جاتے اور جنگ میں شدت پیدا ہو جاتی، اب رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے ساتھ ترک جنگ کا معاہدہ کیا صلح حدیبیہ جو ہوئی تھی تو اس میں مشرکین سے دس سال کا معاہدہ ہو گیا تھا کہ ہم آپس میں لڑیں گے نہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ رہے گا، آتے جاتے رہیں گے، کوئی کسی کو تکلیف اور نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرے گا، اب مشرکین مکہ کے ساتھ معاہدہ کر کے ادھر سے مطمئن ہو گئے اور پھر یہود کا سرکوٹ دیا گیا تو ایک کے ساتھ معاہدہ ہے اور دوسرے کے ساتھ جنگ ہے تاکہ جنگ کے اندر وسعت پیدا نہ ہو اور شدت پیدا نہ ہو، سرور کائنات ﷺ نے یہی حکمت عملی اختیار کی کہ پہلے یہود کے ساتھ معاہدہ تھا جب براہ راست قریش کے ساتھ ٹکر تھی لیکن یہود در پردہ گڑبڑ اور شرارتیں کرتے تھے یہ قابل اعتماد ثابت نہ ہوئے تو پھر مشرکین کے ساتھ ترک جنگ کا معاہدہ کیا گیا اور یہود کے ساتھ لڑائی لڑی گئی اور ان کو فتح کر لیا گیا اور پھر مشرکین نے در پردہ معاہدہ کی خیانت کی اور معاہدہ کو توڑا تو حضور ﷺ نے مکہ معظمہ پر حملہ کر کے اس کو بھی فتح کر لیا، رسول اللہ ﷺ نے بیک وقت سب قبائل کے ساتھ جنگ نہیں لڑی در پردہ وہ جس طرح چاہتے کرتے لیکن آپ نے معاہدات کے ذریعہ سے جنگ کے اندر خفت پیدا کی ہے اور شدت نہیں آنے دی۔

جنگی معاہدوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی ہدایات:

یہاں اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ جن کے ساتھ آپ معاہدہ کرتے ہیں پھر وہ اپنے معاہدے کو ہر مرتبہ توڑ دیتے ہیں، ہر مرتبہ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت بھی جنگ کے حالات ہیں جس میں دشمن آتا ہے تو یہ ہر مرتبہ گڑبڑ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں "وَهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ" اور اس معاہدہ کو توڑنے سے ڈرتے نہیں "اِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ" اگر خفیہ طور پر کرتے ہیں تو کرتے رہیں لیکن اگر لڑائی میں

کہیں سامنے آجائیں تو پھر لحاظ نہ کرنا کہ یہ ہمارے معاہد رہے ہیں "فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ" پھر ان کو اس طرح مارو، ان کی اتنی پٹائی کرو کہ ان کو بھی سبق یاد ہو جائے اور جو ان کے پیچھے ہیں وہ ان کو دیکھ کر سبق حاصل کر لیں، ان کے بھی حوصلے پست ہو جائیں کوئی دوسرا بھی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کرے، جو ان کے پیچھے چھپے ہوئے گڑبڑ کرتے ہیں وہ بھی بھاگ جائیں "فَشَرِّدْ بِهِمْ" بھگا دے ان کے ذریعہ سے ان لوگوں کو جو ان کے پیچھے ہیں، کیا مطلب؟ کہ ان کو ایسی مار مارو اور ان کو ایسی سخت سزا دو کہ جو ان کے پیچھے ہیں پھر وہ بھی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کریں "لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ" تا کہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں اور ان کو پتہ چل جائے کہ معاہدہ کرنے کے بعد جو گڑبڑ کی جاتی ہے اس کا نتیجہ پھر کیا نکلتا ہے۔

"وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً" اگر کسی قوم کے ساتھ آپ نے معاہدہ کیا ہوا ہے لیکن آپ کو اندیشہ ہے کہ وہ قوم اس معاہدے کا خیال نہیں کرے گی، ان کی طرف سے آپ کو خیانت کا اندیشہ ہے تو پھر آپ کو اجازت ہے کہ ابتداء معاہدہ توڑ دیں یہ توڑنا علی الاعلان ہو خفیہ طور پر نہیں "فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ" معاہدہ ان کے منہ پہ دے مارو اگر کوئی قوم قابل اعتماد نہیں ہے یا ان کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہے کہ ہم ان کے ساتھ معاہدہ کر کے ان کی طرف سے مطمئن ہو کے بیٹھے رہیں گے اور یہ گڑبڑ کریں گے تو اس معاہدہ کی پابندی کی کوئی ضرورت نہیں لیکن علی الاعلان توڑ دو یعنی کہ اس کے ٹوٹنے کا انہیں علم ہو جائے اور تمہیں بھی علم ہو جائے تا کہ وہ سمجھ جائیں "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ" بے شک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

"وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا" کا مفہوم:

اور آگے کافروں کو دھمکی دی جا رہی ہے جو اتنا سمجھانے کے باوجود سمجھتے نہیں اور سیدھے راستے پر نہیں آتے تو کافر لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہم چھوٹ گئے "اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ" وہ بچ کے کہیں نہیں جا سکتے وہ عاجز نہیں کر سکتے جس طرح پیچھے آیا تھا کہ ہم ان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں وہ ہمارے ہاتھوں سے کہیں نکل نہیں سکتے۔

"وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" کا مفہوم:

"وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" یہ بھی مسلمانوں کو جنگ کے متعلق ہدایات دی جا رہی ہیں کہ اب جنگ عملاً چھڑ گئی اور براہ راست مقابلے ہونے لگ گئے اس لیے ہر وقت اپنی تیاری مکمل رکھا کرو، تیار رکھو ان کافروں کے لیے جو تم سے ہو سکے "مَا اسْتَطَعْتُمْ" کا بیان آ گیا "مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ" اب قرآن کریم کا

اعجاز دیکھو کہ قوۃ کا لفظ عام بول دیا کہ ان کے لیے قوت جمع رکھو، اب اس قوت کا کیا مصداق ہے؟ ہر دور کے لحاظ سے اس کا مصداق بدلتا چلا جائے گا، سرور کائنات ﷺ کے زمانہ میں جو جنگ لڑی جاتی تھی وہ تیر کی تھی، تلوار کی تھی، نیزے کی تھی لیکن ان میں سے سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز تیر اندازی تھی کیونکہ نیزے اور تلوار کے ساتھ تو انسان قریب سے لڑتا ہے اور تیر اندازی دور سے بھی کر سکتا ہے، اس وقت تیر اندازی ایسے تھی جیسے اس وقت توپ کا گولا پھینکا جاتا ہے اور نیزے اور تلوار کی لڑائی آمنے سامنے اور دست بدست ہوتی ہے تو سرور کائنات ﷺ نے اس وقت فرمایا "اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ، اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ، اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ" بار بار اعلان فرمایا کہ خبردار! سن لو! قوت کا مصداق تیر اندازی ہے، قوت کا مصداق تیر اندازی ہے، قوت کا مصداق تیر اندازی ہے، اس لیے فرمایا کہ تیر اندازی کی خوب مشق کیا کرو، نشانہ بازی کی مشق خوب کرو، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے تمہیں شہر فتح کرائے گا، اس زمانہ میں آپ ﷺ نے اس کا مصداق تیر اندازی کو قرار دیا لیکن تیر اندازی قوت کا اعلیٰ فرد ہے اُس دور کے اعتبار سے ورنہ تلوار، نیزہ بھی قوت کا مصداق ہیں۔

اور "رباط الخیل" کا ذکر علیحدہ کر دیا کیونکہ اس زمانہ میں میدانِ جنگ میں گھوڑے کو یہی اہمیت حاصل تھی جو آجکل ٹینکوں اور ہوائی جہاز کو حاصل ہے کہ جس کے پاس گھوڑے اچھے ہوتے، زیادہ ہوتے وہ لوگ زیادہ کامیابی کے ساتھ جنگ لڑتے تھے اور جن کے پاس گھوڑے نہ ہوتے یا کمزور قسم کے ہوتے، تربیت دیے ہوئے نہ ہوتے تو وہ اچھے انداز کے ساتھ لڑائی نہیں لڑ سکتے تھے ان کا ذکر علیحدہ کر دیا۔

ورنہ اب اس دور میں قوت کا مصداق ہوائی جہاز ہیں، میزائل ہیں، بم ہیں، ٹینک ہیں، توپیں ہیں اور جتنی بھی چیزیں جنگ میں استعمال ہوتی ہیں سب قوت کا مصداق ہیں اور لفظ قوت کے اندر وہ ساری ہی آگئیں حتیٰ کہ بدنی ورزش اور بدنی قوت کو بحال کرنے کی کوشش کرنا یہ بھی اس لفظ قوت کا مصداق ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں اپنی طاقت بحال رکھو، اگر کسی کے بازو میں قوت ہی نہیں ہے پھر اگر اس کے پاس رائفل بھی ہو تو کیا چلائے گا اور اگر کسی کی ٹانگوں میں قوت ہی نہیں ہے اور دشمن کے پیچھے بھاگنا پڑے تو کیا بھاگے گا بلکہ اگر ٹانگیں کمزور ہوں گی تو آدمی دشمن سے جان بچانے کے لیے بھی نہیں بھاگ سکے گا اس قوت کا مصداق بدنی قوت بھی ہے اور اسلحہ کی قوت بھی ہے، اس لفظ کے اندر سارے کا سارا سامان جنگ آگیا، جو تم سے ہو سکے تیار رکھو ان کے لیے ہر قسم کی قوت اور پلے ہوئے گھوڑے۔

"تُرْهِبُوْنَ بِهٖ" ڈراؤ گے تم اس کے ذریعے سے اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمنوں کو بھی، ان کے دشمن اللہ کے دشمن ہی تھے اور اللہ کے دشمن ان کے دشمن تھے کیونکہ مسلمانوں کی لڑائی اللہ ہی کے لیے تھی اس لیے مسلمانوں کے دشمن وہی ہیں جو اللہ کے دین کے دشمن ہیں اور جو اللہ کے دین کے دشمن ہیں وہی مسلمانوں کے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ اور لوگوں کو بھی جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ ان کو جانتا ہے یعنی تمہارے سامنے تو صرف یہی یہود اور مشرک ہیں لیکن اللہ کو پتہ ہے کہ کیسے کیسے دشمن سامنے آنے والے ہیں چنانچہ بعد میں ایران میں فارس میں اور شام میں روم میں جتنی لڑائیاں ہوئیں وہ سب اس میں شامل ہیں یعنی اگرچہ تم یہی سمجھتے ہو کہ دشمن صرف یہی ہیں جو ارد گرد چھپے ہوئے ہیں لیکن اس کے علاوہ اور دشمن بھی ہیں جن کو اللہ جانتا ہے اور ابھی تم نہیں جانتے تو اتنی قوت اور طاقت جمع کرو کہ سب کے اوپر رعب پڑے جو تمہارے سامنے ہیں ان پر بھی اور جو ابھی تمہارے سامنے نہیں ہیں ان پر بھی رعب پڑے اور وہ بھی ہیبت میں آجائیں اتنی طاقت جمع رکھو۔

جہاد کی تیاری میں مال خرچ کرنے کی فضیلت:

"وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" اور اس سامان جنگ کے مہیا کرنے میں، گھوڑوں کے پالنے میں جو تمہیں پیسے خرچ کرنے پڑیں گے یہ فی سبیل اللہ ہے اور جو کچھ بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے وہ تمہاری طرف ادا کر دیا جائے گا اور تم کمی نہیں کیے جاؤ گے، اللہ کی طرف سے تمہاری حق تلفی نہیں ہوگی اس لیے سامان جنگ کے خریدنے اور گھوڑوں کے پالنے میں خوب خرچ کرو یہ فی سبیل اللہ ہے۔

اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ جہاد کی تیاری میں جو روپیہ خرچ کیا جائے عام طور پر اگر آپ کسی نیک کام میں خرچ کرتے ہیں تو ایک پر دس کا وعدہ ہے اور آگے فضل پر اس کی مرضی ہے لیکن جب جہاد میں خرچ کیا جاتا ہے تو ایک پر سات سو کا وعدہ ہے اور اس کے اوپر فضل جتنا چاہے ہو جائے یعنی جہاد کی تیاری میں جو پیسے خرچ کیے جاتے ہیں ان کے اوپر عام خرچ کے مقابلہ اتنا زیادہ ثواب ملتا ہے کہ عام حالت میں ایک پر دس کا وعدہ ہے اور جہاد کی تیاری میں جو خرچ ہو اس پر ایک کے سات سو کا وعدہ ہے۔

سرد جنگ میں شریک لوگ بھی مجاہد کا مصداق ہیں:

یہاں لفظ آیا "تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ" اس کے ذریعہ سے تم اللہ کے دشمنوں کو ڈراؤ گے اس میں تعمیم ہے

جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جہاد باللسان بھی ہوتا ہے اور جہاد بالنفس بھی ہے اور جہاد بالمال بھی ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ جہاد زبان کے ساتھ بھی ہوتا ہے اس سے معلوم ہوگیا کہ زبان ایسے طریقے سے استعمال کرنا جس سے دین کے دشمنوں کو مرعوب کرنا مقصود ہو، اسلام کا دفاع مقصود ہو، دشمنوں کے اعتراضات کا جواب دیا جائے یہ بھی اللہ کے ہاں جہاد کے حکم میں ہے۔

اور پھر آج کے دور میں قلم بھی زبان کے قائم مقام ہوتا ہے دشمن اسلام کو شکست دینے کے لیے تحریری طور پر اعتراضات شائع کرتا ہے یہ سرد جنگ ہوتی ہے میدان میں جو لڑائی لڑی جاتی ہے وہ گرم جنگ ہے، بحث ومباحثہ اور ایک دوسرے کے خلاف تحریریں لکھنا یہ سرد جنگ کہلاتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ عیسائیت اسلام پر حملہ آور ہے، شکوک وشبہات پیدا کر کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی جارہی ہے تو گویا کہ یہ مسلمان قوم کو فتح کرتی جارہی ہے یا مرزائی شکوک وشبہات پیدا کر کے مسلمانوں کو مرزائی بنارہے ہیں تو یہ باقاعدہ جنگ کے محاذ ہیں یا رافضی اپنے شکوک وشبہات پیدا کر کے لوگوں کو رافضی بنارہے ہیں تو یہ باقاعدہ جنگ کا حصہ ہیں ان جنگوں کا دفاع کرنا کہ ان کی زبان کے مقابلہ میں زبان استعمال کی جائے اور ان کی تحریرات کے مقابلہ میں تحریری جواب دیا جائے، ان کے اعتراضات کے جواب دیے جائیں اور ان کے اوپر جارحانہ اعتراضات کیے جائیں جس سے ان کے مذہب کا باطل ہونا معلوم ہو یہ بالکل اس طرح جہاد ہے جس طرح میدان کے اندر جہاد کیا جاتا ہے تو تحریر اور تقریر پر جو پیسے خرچ ہوں جو محنت اور جو مشقت ہو یہ سب فی سبیل اللہ ہے جہاد کے اندر یہ عموم ہے حدیث شریف کے اندر زبان کا لفظ آیا ہوا ہے کہ جہاد زبان کے ساتھ بھی ہوتا ہے، اپنی زبان کے ساتھ بھی جہاد کرو، مشرکین شعروں میں رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مذمت کرتے تھے تو حضور ﷺ اپنے شعراء سے کہتے تھے کہ ان کا جواب دو تو اس طرح سے ان کے اعتراضات کا جواب دینا اور ان کی قباحتیں ظاہر کرنا اور ان کے عیوب ظاہر کرنا جس سے ان کے مذہب کا ابطال ہو یہ بھی باقاعدہ جہاد ہے اس کو سرد جنگ کہتے ہیں اس سرد جنگ میں جو لوگ لگے ہوئے ہیں وہ بھی اس طرح مجاہد فی سبیل اللہ ہیں جس طرح میدان مقابلہ میں ڈنڈا اٹھانے والے مجاہد فی سبیل اللہ ہوتے ہیں، وقت وقت کی بات ہوتی ہے یہ جہاد باللسان اور جہاد بالقلم ہر وقت ہوتا ہے کافروں کی طرف سے جب کوئی اعتراضات والی بات ہو تو اس کا جواب دیا جائے تو یہ تقریر اور تحریر سب جہاد کے حکم میں ہیں یہاں بھی انسان کو اتنی تیاری کر کے رکھنی چاہیے کہ اگر کسی کافر کی طرف سے اس قسم کا حملہ ہو تو زبان کے

ساتھ یا قلم کے ساتھ اس کا دفاع کیا جاسکے۔

قلم اور زبان کا جہاد فرض کفایہ ہے:

قلم اور زبان کا جہاد فرض کفایہ ہے ایسے لوگوں کا موجود رہنا جو زبان سے کیے ہوئے اعتراضات کا جواب زبان سے دے سکیں اور قلم سے کیے ہوئے اعتراضات کا جواب قلم سے دے سکیں بلکہ دوسروں کے اوپر جارحانہ حملہ کرسکیں ایسے لوگوں کا موجود رہنا فرض کفایہ ہے اور اللہ کے فضل وکرم سے ہر زمانہ میں اہل اسلام میں ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو قلم کے میدان میں بھی مقابلہ کرتے ہیں اور زبان کے میدان میں بھی مقابلہ کرتے ہیں یہ ساری صورتیں جہاد کے عنوان میں شامل ہیں۔

کافروں کے ساتھ صلح کے بارے میں ہدایات:

"وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ" اور اگر کوئی کافر قوم صلح کی طرف مائل ہو جائے ترک جنگ پر صلح کرنا چاہیں کہ ہم آپس میں نہ لڑیں تو آپ کو بھی اجازت ہے کہ آپ بھی ان سے صلح کرسکتے ہیں لیکن یہ خیال رکھنا ایسا نہ ہو کہ ظاہری طور پر صلح کرلیں اور اندر ہی اندر گڑبڑ کر کے دھوکہ دینے کی کوشش کریں اس قسم کے توہمات میں پڑنے کی ضرورت نہیں اللہ پہ بھروسہ کیجیے، صلح کی پیشکش کرتے ہیں تو صلح کرلو اور اللہ پر بھروسہ کرو بے شک وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے، اور اگر ان کا ارادہ آپ کو دھوکہ دینے کا ہی ہے کہ ظاہری طور پر صلح کرلیں اور اندر ہی اندر دشمنی کریں تو بھی کوئی بات نہیں "فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ" آپ نیک نیتی کے ساتھ حالات کو سنوارنے کی کوشش کریں اگر ان کے دل میں کسی قسم کا دھوکہ ہوگا تو اللہ ان کو سنبھال لے گا "إِن يُرِيدُوا أَن يَخْدَعُوكَ" اگر وہ ارادہ کریں آپ کو دھوکہ دینے کا "فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ" بے شک اللہ آپ کے لیے کافی ہے اللہ وہ ہے جس نے آپ کو قوت پہنچائی اپنی مدد کے ساتھ یعنی بدر میں جس طرح آپ کو قوت اور طاقت دی اللہ کی وہی نصرت اب بھی موجود ہے اگر یہ کوئی دھوکہ دینے کی کوشش کریں گے تو اللہ پھر آپ کو غالب کردے گا جس نے آپ کو قوت پہنچائی اپنی مدد کے ساتھ اور مؤمنین کے ذریعہ سے یہ جو آپ کے ساتھ اہل ایمان لگادیے یہ آپ کی فوج بنادی یہ اللہ کا انعام ہے۔

اللہ کا سب سے بڑا احسان مؤمنین کا آپس میں اتحاد ہے:

"وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ" یہ اس وقت کے اعتبار سے ایک بہت بڑے انعام کی یاددہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے دل آپس میں جوڑ دیے سورۃ آل عمران میں آیا تھا "إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم

بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا" یہ اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام یاد دلایا کہ یاد کرو تم آپس میں کس طرح دشمن تھے اور اس وقت جس قسم کی دشمنی ہوتی تھی آج آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہ قومی عصبیت اور وطنی عصبیت کی بناء پر کس طرح لڑتے تھے ذرا ذرا سی بات پر اتنی شدت اور لڑائیاں کہ کوئی کسی کے سامنے جھکنے اور کسی سے ملنے کے لیے تیار نہیں تھا سارا ملک خانہ جنگی میں مبتلاء تھا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم کے ساتھ سرور کائنات ﷺ پر ایمان لانے والوں کو آپس میں متحد کر دیا، قبیلوں کا اختلاف ختم ہو گیا، برادریوں کا اختلاف ختم ہو گیا، مذہب کا اختلاف ختم ہو گیا، سارے یک جان ہو گئے، یہ اللہ کا بہت بڑا انعام ہے "اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ" کہ اللہ نے تمہارے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا ورنہ ان میں اختلاف کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ "لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا" اگر اللہ کی طرف سے نصرت نہ ہوتی اور اللہ کی طرف سے ان کے قلوب کو آپس میں ملانا نہ ہوتا تو آپ زمین کا سارا مال و دولت خرچ کر کے بھی ان کو جوڑنا چاہتے تو آپ ان کو جوڑنے میں کامیاب نہ ہوتے "لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا" اگر آپ خرچ کر دیتے وہ سب چیزیں جو زمین میں ہیں تو آپ ان کے دلوں میں جوڑ نہ لگا سکتے "وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ" لیکن اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا، معلوم ہوا کہ آپس میں اتفاق، اتحاد، الفت، پیار کسی جماعت میں یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے اور یہ آپس میں الفت ومحبت اور آپس کا اتحاد واتفاق اللہ کے انعام کے ساتھ ہی ہوتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق نہ ہو تو پھر انسان ظاہری طور پر کتنی ہی کوشش کر لے دل نہیں بدلے جا سکتے، دلوں کو بدلنا اللہ کے ہاتھ میں ہے، اتفاق بہت بڑی نعمت ہے "اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٤﴾ ع

اے نبی ! تیرے لیے اللہ کافی ہے اور وہ مؤمن کافی ہیں جو تیرے تبع ہیں ﴿۶۴﴾

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۚ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ

اے نبی ! برانگیختہ کر مؤمنوں کو لڑائی پر ، اگر تم میں سے

عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ

بیس ہوں گے ثابت قدم رہنے والے تو وہ دو سو پہ غالب آ جائیں گے اور اگر تم میں سے

مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٦٥﴾

سو ہوں گے تو وہ غالب آجائیں گے ہزار پر ان لوگوں میں سے جنہوں نے کفر کیا اس سبب سے کہ وہ ایسی قوم ہے جو دین کی سمجھ نہیں رکھتی ﴿۶۵﴾

الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۚ فَإِنْ يَكُنْ

اب اللہ تعالیٰ نے تم سے بوجھ ہلکا کر دیا اور وہ جانتا ہے کہ تمہارے اندر کمزوری ہے اگر ہوں گے

مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ

تم میں سے سو ثابت قدم رہنے والے تو وہ غالب آ جائیں گے دو سو پر اور اگر تم میں سے ہوں گے

أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٦٦﴾

ہزار تو غالب آ جائیں گے دو ہزار پر اللہ کے حکم کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۶۶﴾

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ

نبی کی شان کے لائق نہیں کہ اس کے لیے قیدی ہوں جب تک کہ زمین میں خون ریزی نہ کر لے

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ

تم ارادہ کرتے ہو دنیا کے سامان کا اور اللہ ارادہ کرتا ہے آخرت کا اور اللہ

عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٧﴾ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا

زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۶۷﴾ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بات لکھی ہوئی سبقت نہ لے جاتی البتہ پہنچتا تمہیں

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ حَسْبُكَ ٱللَّهُ وَمَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٤﴾

اے نبی ! تیرے لیے اللہ کافی ہے اور وہ مؤمن کافی ہیں جو تیرے تبع ہیں ﴿٦٤﴾

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ حَرِّضِ ٱلْمُؤْمِنِينَ عَلَى ٱلْقِتَالِ ۚ إِن يَكُن مِّنكُمْ

اے نبی ! برانگیختہ کر مؤمنوں کو لڑائی پر ، اگر تم میں سے

عِشْرُونَ صَٰبِرُونَ يَغْلِبُوا۟ مِا۟ئَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم

بیس ہوں گے ثابت قدم رہنے والے تو وہ دو سو پہ غالب آ جائیں گے اور اگر تم میں سے

مِّا۟ئَةٌ يَغْلِبُوٓا۟ أَلْفًا مِّنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ﴿٦٥﴾

سو ہوں گے تو وہ غالب آ جائیں گے ہزار پر ان لوگوں میں سے جنہوں نے کفر کیا اس سبب سے کہ وہ ایسی قوم ہے جو دین کی سمجھ نہیں رکھتی ﴿٦٥﴾

ٱلْـَٰٔنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن

اب اللہ تعالیٰ نے تم سے بوجھ ہلکا کردیا اور وہ جانتا ہے کہ تمہارے اندر کمزوری ہے اگر ہوں گے

مِّنكُم مِّا۟ئَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا۟ مِا۟ئَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ

تم میں سے سو ثابت قدم رہنے والے تو وہ غالب آ جائیں گے دو سو پر اور اگر تم میں سے ہوں گے

أَلْفٌ يَغْلِبُوٓا۟ أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿٦٦﴾

ہزار تو غالب آ جائیں گے دو ہزار پر اللہ کے حکم کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿٦٦﴾

مَا كَانَ لِنَبِىٍّ أَن يَكُونَ لَهُۥٓ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِى ٱلْأَرْضِ ۚ

نبی کی شان کے لائق نہیں کہ اس کے لیے قیدی ہوں جب تک کہ زمین میں خون ریزی نہ کرلے

تُرِيدُونَ عَرَضَ ٱلدُّنْيَا وَٱللَّهُ يُرِيدُ ٱلْـَٔاخِرَةَ ۗ وَٱللَّهُ

تم ارادہ کرتے ہو دنیا کے سامان کا اور اللہ ارادہ کرتا ہے آخرت کا اور اللہ

عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٧﴾ لَّوْلَا كِتَٰبٌ مِّنَ ٱللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَآ

زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿٦٧﴾ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بات لکھی ہوئی سبقت نہ لے جاتی البتہ پہنچتا تمہیں

أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٦٨﴾ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا

عذاب عظیم اس کام کی وجہ سے جس میں تم لگ گئے تھے ﴿۶۸﴾ پس کھاؤ تم اس مال میں سے جو تم نے غنیمت میں حاصل کیا حلال اور پاکیزہ

وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٦٩﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ

اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۶۹﴾ اے نبی! کہہ دے

لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ

ان قیدیوں کو جو آپ کے قبضہ میں ہیں اگر اللہ تعالیٰ جانے گا تمہارے دلوں کے اندر

خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ

بھلائی تو دے دے گا تمہیں بہتر اس چیز سے جو تم سے لی گئی ہے اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ

غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٧٠﴾ وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ

بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۷۰﴾ اور اگر یہ لوگ ارادہ کریں آپ سے خیانت کا پس تحقیق انہوں نے اللہ سے خیانت کی

مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٧١﴾ إِنَّ الَّذِينَ

اس سے پہلے بھی اللہ نے ان کے اوپر قدرت دے دی ہے اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۷۱﴾ بے شک وہ لوگ

آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ

جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ راستہ میں

اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ

اللہ کے اور وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانہ دیا اور مدد کی ان کا بعض بعض کا دوست ہے

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ

اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی تمہارے لیے ان کی ولایت سے

شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ

کچھ نہیں جب تک کہ وہ ہجرت نہ کرلیں اور اگر وہ تم سے مدد طلب کریں دین کے معاملہ میں تو تمہارے ذمہ ہے

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

جہاد کا مضمون سورۃ کی ابتداء سے چلا آرہا ہے اب اگلی آیات میں بھی اسی کے متعلق ہی کچھ ہدایات دی گئی ہیں۔

اپنے سے دس گنا قوت سے مقابلہ میں ڈٹ جانے کا حکم:

جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ سرور کائنات ﷺ کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ آپ کے لیے اللہ کافی ہے اور مؤمنوں کی یہ چھوٹی سی جماعت کافی ہے اس لیے آپ دوسروں کی کثرت کو نہ دیکھیے، اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیجیے اور ظاہری طور پر اپنے متبعین یعنی مؤمنین کو ساتھ لیجیے اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت اور ظاہری طور پر ان مؤمنین کے تعاون کے ساتھ اللہ تعالیٰ آپ کو کفار کے مقابلہ میں فتح دے گا۔

اور مؤمنین کو برانگیختہ کرتے رہیے، ان کو بھی بھڑکاتے رہیے، ترغیب دیتے رہیے، شوق دلایئے، ابھاریے لڑائی پر، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگلی بات جو کہی جارہی ہے بظاہر تو یہ خبر ہے لیکن معناً انشاء ہے، صورۃً خبر ہے معناً انشاء ہے، کئی دفعہ مثال آتی رہتی ہے کہ بات کو ذکر تو خبر کے انداز میں کیا جاتا ہے اور حقیقت میں حکم دینا مقصود ہوتا ہے یہاں بھی اسی طرح ذکر تو یوں کیا جارہا ہے کہ اگر تم میں سے بیس آدمی ہوں گے مستقل مزاج، مصیبت برداشت کرنے والے، تکلیفیں سہنے والے، میدان میں جم جانے والے تو اللہ تعالیٰ ان کو دو سو کے اوپر غلبہ دے گا یہ خبر ہے اگر تم میں سے سو ہوں گے تو کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آجائیں گے۔

قلیل مسلمانوں کی کثیر کافروں پر غالب آنے کی وجہ:

اور اتنی بڑی تعداد کے اوپر اتنی قلیل جماعت کا غلبہ اس وجہ سے ہے کہ کافروں کو سمجھ حاصل نہیں ہے، جب ان کو دین کی بصیرت حاصل نہیں ہے تو نہ تو ان کے سامنے کوئی پختہ مقصد ہے اور نہ ان کے اندر خون بہانے کے لیے اس قسم کا جذبہ ہے جس طرح کا جذبہ مؤمنین کے اندر ہوتا ہے، دین کی سمجھ حاصل ہو جانے کے بعد اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے، جنت حاصل کرنے کے لیے، آخرت کی آبادی کے لیے مؤمنین کے اندر جس قسم کا جذبہ ابھرتا ہے کافروں کے پاس اس قسم کا جذبہ نہیں ہے، یہ قلبی بصیرت ہے جو انسان کے قدم جماتی ہے، حوصلہ بڑھاتی

ہے، جانبازی پر انسان تل جاتا ہے، جان قربان کرنے کو اپنے لیے فخر سمجھتا ہے یہ ایک قلبی بصیرت ہے، کافروں کو چونکہ یہ حاصل نہیں ہے اس لیے یہ کمزور ہیں اور مؤمنین کو یہ چیز حاصل ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو مضبوط کر رکھا ہے تو یہ اگر بیس ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے، ایک سو ہوں گے تو کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آجائیں گے تو یہ نسبت دس گنا ہے، بیس کے مقابلہ میں دو سو یہ دس گنا زیادہ ہوئے اور سو کے مقابلہ میں ہزار یہ دس گنا زیادہ ہوئے یہ صورۃً خبر ہے کہ ایسا ہو جائے گا لیکن معناً انشاء ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بیس آدمیوں کے مقابلہ میں اگر دو سو کافر آجائیں تو میدان سے ہٹنے اور بھاگنے کی اجازت نہیں ہے اور اگر سو کے مقابلہ میں ہزار کافر آجائیں تو میدان چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، دس گنا زیادہ طاقت کے ساتھ ٹکرا جانا یہ مسلمانوں پر فرض ہے اور صبر و استقامت کے ساتھ اگر یہ میدان میں ڈٹیں گے تو اللہ تعالیٰ فتح بھی دیں گے تو اس میں یہ حکم تھا کہ اگر دشمن کی قوت دس گنا زیادہ بھی ہو تو پھر بھی پیٹھ نہیں پھیرنی، ابتداء میں ایسے ہی تھا۔

پہلے حکم میں نرمی:

لیکن جس وقت بعد میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور نئے نئے لوگ مسلمان ہو گئے تو کچھ مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس حکم میں تخفیف کر دی "اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ" یہ آیت اگرچہ پچھلے حکم کے متصل ہی رکھی ہوئی ہے لیکن اس کا نزول بہت بعد میں ہوا ہے چونکہ مضمون ایک ہی ہے اس لیے دونوں کو یہاں اکٹھا کر دیا گیا۔

آیات کے اترنے کی ترتیب اور ہے اور قرآن کریم میں رکھے جانے کی ترتیب اور ہے جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس وقت آیات اترا کرتی تھیں تو سرور کائنات ﷺ کاتب کو بلاتے اور لکھواتے اور کہتے کہ ان آیات کو فلاں سورۃ میں فلاں جگہ رکھ لو، ان آیات کو فلاں آیات کے ساتھ جوڑ دو جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے اترنے کی ترتیب اور ہے اور اس کو جمع کرنے کی ترتیب اور ہے۔

تو یہ آیت اتری تو کافی مدت کے بعد ہے لیکن اس کا مضمون چونکہ اسی آیت کے ساتھ ملتا تھا اس لیے اس کو اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا "اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ" اللہ تعالیٰ نے اب تم پہ تخفیف کر دی جس سے معلوم ہو گیا کہ پہلے ذمہ داری ڈالی تھی کہ بیس آدمی دو سو کے مقابلہ میں ڈٹ کر مقابلہ کریں، ایک سو آدمی ایک ہزار کے مقابلہ میں ڈٹ کر مقابلہ کریں پہلے یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی، یہ بوجھ اس اُمت کے کندھوں پر ڈالا گیا تھا کہ اپنے سے دس گنا قوت کا مقابلہ کریں۔

پہلے حکم میں نرمی کی وجہ اور اس کا سبب:

لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے تخفیف کردی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے اندر کمزوری ہے، یہ کمزوری کہاں سے آگئی؟ اصل بات یہ ہے کہ ابتداء میں جو مسلمان تھے خاص طور پر وہ مہاجرین جو مکہ معظمہ کے اندر کفار کے ہاتھوں پٹتے رہے، ظلم وستم کا نشانہ بنتے رہے ان کے اندر جو کفر کے ساتھ ٹکرانے کا جوش خروش تھا، جو پختگی تھی بعد میں جس طرح سے لوگ نئے نئے مسلمان ہوتے گئے ان کے اندر وہ پختگی نہیں تھی، "اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کے جو جذبات تھے بعد والے لوگوں کے ویسے جذبات نہیں تھے اور فقہ وبصیرت جیسی "اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کو حاصل تھی ویسی فقہ وبصیرت بعد والے لوگوں کو حاصل نہیں تھی اور ویسے بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب کام کرنے والے تھوڑے ہوں اور ان کے اوپر کوئی ذمہ داری ڈال دی جائے کہ تم نے یہ کام کرنا ہے تو کتنا ہی مشکل کام کیوں نہ ہو وہ ہمت کر کے لگے رہتے ہیں اور جس وقت بھیڑ زیادہ ہو جائے، بہت سارے لوگ ہو جائیں اور کہہ دیا جائے کہ یہ کام کرنا ہے تو پھر ہر شخص کہتا ہے کہ بہت سارے ہیں، ہو جائے گا فلاں کر لے گا، اس طرح سے پھر ہمت کے اندر کمی آہی جایا کرتی ہے۔

چنانچہ پہلا حکم اس وقت کا ہے جب مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی جیسے کہ بیس اور سو کی مثال اختیار کی گئی اور دوسرا حکم اس وقت آیا جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی اس لیے وہاں سو اور ہزار کی مثال اختیار کی گئی یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ تعداد بڑھ گئی تھی تو تعداد کے بڑھ جانے کی صورت میں بھی ہر شخص کی ہمت کے اندر کمی آجاتی ہے اور "اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کے بعد جو لوگ ایمان لا رہے تھے ان کے اس قسم کے جذبات نہیں تھے اور ان کو اس قسم کی بصیرت حاصل نہیں تھی جس قسم کے جذبات اور بصیرت پہلے لوگوں کو حاصل تھی اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے تخفیف کردی۔

تخفیف کا حاصل یہ ہے کہ اب دوگنا قوت کے ساتھ ٹکرانا ضروری ہے، دوگنا قوت کے مقابلہ میں اگر قدم اکھڑ جائیں گے اور پیٹھ پھیرو گے تو اللہ کے ہاں مجرم ہو گے، میدان جہاد سے بھاگنے کی سزا جس طرح پہلے آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غضب آتا ہے اور اللہ ناراض ہوتے ہیں یہ کبیرہ گناہ ہے، دوگنا قوت کے مقابلہ میں مسلمان اگر میدان چھوڑتا ہے تو اللہ کے ہاں مجرم ہوگا، پہلے حکم تھا کہ دس گنا قوت کے مقابلہ میں ڈٹ جانا ہے اور میدان کو چھوڑنا نہیں ہے تو یہ دونوں آیتیں یہاں اکٹھی رکھ دی گئیں۔

بدر کے قیدیوں کے متعلق مسلمانوں کے فیصلہ پر اللہ تعالیٰ کی تنبیہ:

اگلی آیات کا تعلق بھی غزوۂ بدر کے واقعات سے ہی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بدر میں ستر کافر تو مارے گئے تھے اور ستر گرفتار ہو گئے تھے تو گرفتار کر کے ان کو مدینہ منورہ میں لایا گیا، مدینہ منورہ میں آنے کے بعد مشورہ شروع ہوا کہ ان ستر کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا مشورہ تو یہ تھا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے، جب ہم ان کو قتل کر دیں گے تو کفر کی کمر بالکل ٹوٹ جائے گی، یہ سارے کے سارے لوگ وہ ہیں جو اسلام کے انتہائی درجہ کے بدترین دشمن ہیں ان کو چھوڑنا مصلحت نہیں ہے اگر یہ چھوٹ کے چلے گئے تو بعد میں جا کے پھر اسی قسم کی دشمنیاں کریں گے اور جب ان کا خون بہا دیا جائے گا تو اس جماعت کی کمر ٹوٹ جائے گی اور ان میں کوئی کسی قسم کی شوکت باقی نہیں رہے گی، ان دونوں کا مشورہ تو یہ تھا بلکہ بعض آثار میں آتا ہے کہ ان گرفتار ہونے والوں میں بعض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قریبی رشتہ دار تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تھا کہ ہر شخص اپنے قریبی رشتہ دار کو قتل کرے میرا فلاں رشتہ دار ہے اس کو میرے سپرد کرو اس کو میں قتل کرتا ہوں اسی طرح جس کا جو رشتہ دار گرفتار ہے اس کو وہ قتل کرے، بڑی شدت کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا تھا اور انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی رائے بھی یہی تھی۔

اور بعض دوسرے حضرات کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ان کو فدیہ لے کے چھوڑ دیا جائے، ایک تو فائدہ یہ ہوگا کہ فدیہ سے جو مال حاصل ہوگا اس سے ہماری معاشی حالت اچھی ہوگی، آئندہ جہاد کے لیے تیاری کا موقع ملے گا، دوسرا یہ کہ اپنی برادری ہے، اپنی قوم ہے آج نہیں تو کل ممکن ہے ان میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ اسلام کی توفیق دے دیں اس لیے ان کو چھوڑ دینا چاہیے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر ان کو چھوڑا گیا تو ان کے عوض میں اللہ تبارک وتعالیٰ کسی دوسرے موقع پر تم میں سے ستر آدمیوں کو شہادت دیں گے، اور ستر آدمی تم میں سے قتل کیے جائیں گے، یہ ساری باتیں سامنے آ گئی تھیں اور مشورہ کے اندر یہ بات ذکر کر دی گئی تھی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جس وقت یہ دو رائیں اختیار کر لیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چونکہ طبعاً بہت شفیق اور رحیم تھے، بہت نرم دل تھے ان کی رائے بھی یہی تھی کہ ان کو فدیہ لے کے چھوڑ دیا جائے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب یہ دونوں رائیں آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے رحمۃ للعالمین ہونے کے جذبہ کے تحت اسی کو ترجیح دی کہ ان کو قتل کرنے کی بجائے ان سے فدیہ لے لیا جائے اور فدیہ لے کے ان کو

چھوڑ دیا جائے ممکن ہے کہ آنے والے وقت میں ان میں سے بعض لوگ ایمان لے آئیں جیسا کہ واقعہ ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی ان گرفتار لوگوں میں سے تھے جو بعد میں مسلمان ہوئے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص رضی اللہ عنہ بھی انہی میں سے تھے جو بعد میں مسلمان ہوئے اور بھی ان میں کئی ایسے تھے جن کو بعد میں ایمان کی توفیق ہوئی تو ترجیح اسی کو دے دی گئی کہ فدیہ لے کے ان کو چھوڑ دیا جائے۔

لیکن بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا منشاء اس کے خلاف ظاہر ہوا کہ بات اسی طرح ٹھیک تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہی تھی تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے اوپر تھوڑا سا عتاب فرماتے ہیں لیکن پھر اس کے نتیجہ میں مغفرت کا اعلان کرتے ہیں۔

کسی نبی کے لیے مناسب نہیں کہ اس کے لیے قیدی ہوتے جب تک کہ زمین کے اندر خون ریزی نہ کرے یعنی کفر کی قوت اور شان وشوکت کو بالکل نہ مٹادے، جس وقت تک ان کی قوت اور شان وشوکت کو بالکل ملیا میٹ نہ کردے اس وقت تک قیدی بنانا مناسب نہیں ہے "تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا" یہ خطاب ہے ان لوگوں کو جنہوں نے مشورہ دیا تھا کہ فدیہ لے لیا جائے کیونکہ بظاہر اس میں دنیا کا حصول تھا اس لیے اس جذبہ کے اوپر انکار کیا گیا کہ تم ارادہ کرتے ہو دنیا کے سامان کا اور اللہ ارادہ کرتا ہے آخرت کا، اللہ چاہتا ہے کہ ہر وقت تمہاری نظر آخرت کے سامان پر ہونی چاہیے، دنیا کے مال ودولت کو حاصل کرنے کا ارادہ اللہ کو پسند نہیں ہے، "وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ" اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے پھر کسی دوسرے وقت میں تمہیں غلبہ دیتا اور اپنی حکمت کے ساتھ بہت ساری فتوحات تمہیں دیتا لیکن اب یہ جو ہوگیا بس ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قانون لکھا ہوا ہے کہ مجتہد جس وقت اجتہاد کرے اور اپنے طور پر درستگی کو پانے کی کوشش کرے پھر اگر اس سے لغزش بھی ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اس کے اوپر گرفت نہیں فرماتے۔

یا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قانون یہی لکھا ہوا کہ اس طرح کے فدیہ لینا بھی جائز ہوجائے گا جیسا کہ بعد میں شریعت کے اندر یہ قانون نافذ کردیا گیا کہ امام اگر مناسب سمجھتا ہے تو فدیہ لے کے دشمن کے قیدیوں کو چھوڑ سکتا ہے اگرچہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا اس وقت تک براہِ راست اس بارے میں کوئی ہدایات ابھی تک نہیں آئیں تھیں لیکن آئندہ یہ جواز آنے والا تھا اور ان میں سے بعض لوگ ایمان لانے والے تھے اور اللہ کی تقدیر میں یہ چیز موجود تھی جس کی بناء پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہاری اس لغزش کو معاف کردیا اور اس کے اوپر کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں کی، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھی ہوئی بات نہ ہوتی تو جو تم نے لیا ہے یا جس کام میں تم لگ گئے اس کی وجہ

سے تمہیں عذاب عظیم پہنچتا۔

چنانچہ جب یہ آیات اتری ہیں تو سرور کائنات ﷺ اللہ تعالیٰ سے جس طرح ڈرا کرتے تھے تو آپ ﷺ نے ڈرتے ہوئے مزید توبہ واستغفار کیا اور فرمایا کہ دیکھو! اگر اللہ کا عذاب آجاتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی نہ بچتا کیونکہ ان کی رائے تھی کہ ان کو قتل کیا جائے اور ان کا خون بہادیا جائے۔

"یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْۤ اَیْدِیْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى" کا شانِ نزول:

بہت سارے مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت رسول کریم ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی کیونکہ وہ بھی بدر کے قیدیوں میں شامل تھے اور ان سے بھی فدیہ لیا گیا تھا، ان کی خصوصیت اس معاملہ میں یہ تھی کہ جنگِ بدر میں یہ مکہ سے اپنے ساتھ تقریباً سات سوگنی سونا لے کر چلے تھے تاکہ وہ لشکرِ کفار پر خرچ کیا جائے، اور ابھی یہ خرچ ہونے نہیں پایا تھا کہ وہ مع اس سونے کے گرفتار کر لئے گئے۔

جب فدیہ دینے کا وقت آیا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ میرے ساتھ جو سونا تھا اس کو میرے فدیہ کی رقم میں لگا لیا جائے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو مال آپ کفر کی امداد کے لیے لائے تھے وہ تو مسلمانوں کا مالِ غنیمت بن گیا، فدیہ اس کے علاوہ ہونا چاہیے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنے دو بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ بھی آپ ادا کریں، عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اگر اتنا مالی بار مجھ پر ڈالا گیا تو مجھے قریش سے بھیک مانگنا پڑے گی میں بالکل فقیر ہو جاؤں گا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا، کیوں کیا آپ کے پاس وہ مال موجود نہیں جو مکہ سے روانگی کے وقت آپ نے اپنی زوجہ ام الفضل کے حوالہ کیا ہے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا جب کہ وہ میں نے رات کی تاریکی اور تنہائی میں اپنی بیوی کے سپرد کیا تھا اور کوئی تیسرا آدمی اس سے واقف نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے اس کی پوری تفصیل بتلادی ہے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ سن کر آنحضرت ﷺ کے سچے رسول ہونے کا یقین ہو گیا، اس سے پہلے بھی وہ آنحضرت ﷺ کے دل سے معتقد تھے مگر کچھ شبہات تھے جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت رفع فرمادیئے اور وہ درحقیقت اسی وقت سے مسلمان ہو گئے تھے مگر ان کا بہت سارو پیہ قریش مکہ کے ذمہ قرض تھا، اگر یہ اسی وقت اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیتے تو وہ روپیہ مارا جاتا اس لیے اعلان نہیں کیا اور رسول اللہ ﷺ نے بھی کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا، فتح مکہ سے پہلے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت چاہی کہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ

آجائیں مگر حضور ﷺ نے ان کو یہی مشورہ دیا کہ ابھی ہجرت نہ کریں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو پر رسول اللہ ﷺ نے آیت مذکورہ میں آیا ہوا وعدہ بھی ان کو بتلا دیا کہ اگر آپ نے اسلام قبول کرلیا اور اخلاص کے ساتھ مؤمن ہو گئے تو جو کچھ مال فدیہ میں خرچ کیا ہے اس سے بہتر اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرمادیں گے، چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اظہار اسلام کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں تو اس وعدہ کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کیونکہ مجھ سے بیس اوقیہ سونا فدیہ میں لیا گیا تھا، اس وقت میرے بیس غلام مختلف جگہوں میں تجارت کا کاروبار کر رہے ہیں اور کسی کا کاروبار بیس ہزار درہم سے کم کا نہیں ہے، اور اس پر مزید یہ انعام ہے کہ مجھے حجاج کو آب زمزم پلانے کی خدمت مل گئی ہے جو میرے نزدیک ایسا گرانقدر کام ہے کہ سارے اہل مکہ کے اموال بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا ہوں۔

مالِ غنیمت کے حلال ہونے کا حکم:

"فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ" پھر جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ کام تم نے اچھا نہیں کیا اب ہو گیا تو چلو قابل برداشت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں کچھ اس قسم کی گنجائش تھی تو اب یہ شبہ ہوا کہ چلو گناہ تو معاف ہو گیا لیکن ہم نے یہ جو مال غنیمت حاصل کیا ہے یہ بھی حلال ہے یا نہیں؟ تو اس کے ساتھ ہی اجازت دے دی گئی کہ پھر کھاؤ تم اس مال کو جو تم نے غنیمت میں حاصل کیا اس حال میں کہ حلال اور طیب ہے، "وَاتَّقُوا اللّٰهَ" اللہ سے ڈرتے رہو "اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والے رحم کرنے والے ہیں، اس مال کو تمہارے لیے حلال کر دیا گیا اب تم اس مال کو کھا پی سکتے ہو۔

اساریٰ بدر کو تنبیہ:

"يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰى" اے نبی! آپ کہہ دیجئے ان قیدیوں کو جو آپ کے قبضہ میں ہیں، یہ ان قیدیوں کے لیے کچھ تنبیہات اور ہدایات ہیں، ان قیدیوں کو کہہ دیجئے جو تمہارے قبضہ میں ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں بھلائی دیکھے گا یعنی اگر تمہارے دل میں خلوص پیدا ہو گیا اور تم مخلصانہ ایمان لے آئے تو دے گا تمہیں بہتر اس چیز سے جو تم سے لی گئی ہے یعنی فدیہ میں جو تم سے مال لیا گیا ہے اس سے بہتر اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا اور آخرت میں دے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اور اگر یہ فدیہ دے کے چھوٹ گئے اور جا کے پھر کوئی خیانت کرنے لگ گئے تو اس خیانت سے کسی کا کچھ نہیں بگڑے جیسے اللہ نے پہلے پکڑوا دیے کسی دوسرے میدان میں آپ کو پھر ان کے اوپر قدرت دے دے گا، اگر یہ ارادہ کریں گے آپ سے خیانت کا تو یہ خیانت کر چکے ہیں اللہ سے اس سے پہلے بھی پھر اللہ نے ان کے اوپر قدرت دے دی اور اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔

توارث وتناصر کا تعلق اسلام کی بناء پر ہونا چاہیے:

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانہ دیا (اس سے مراد اہل مدینہ ہیں جن کو ہم انصار کہتے ہیں) اور مدد کی یہ سارے آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں، چنانچہ پہلے پہلے جب مدینہ منورہ گئے ہیں تو مہاجرین وانصار میں سرور کائنات ﷺ نے رشتۂ اخوت قائم کر دیا تھا حتی کہ مہاجرین وانصار کے اندر وارثت بھی جاری ہوگئی تھی اگر انصاری کا کوئی رشتہ دار کافر ہے تو اس کو وراثت نہیں ملتی تھی بلکہ اس کا جو مسلمان بھائی مہاجر تھا اس کی وراثت اس مہاجر مسلمان بھائی کو ملتی تھی اس طرح آپس میں وراثت کا تعلق بھی لگا دیا گیا تھا، اور مہاجرین کے وارث جو کہ کفار تھے وہ وراثت سے محروم ہو گئے اور اگر کوئی مہاجر ہوتا تو اس کی وراثت اس انصاری کو ملتی تھی جس کے ساتھ اس کی اخوت قائم کی گئی تھی لیکن اگر رشتہ دار بھی مسلمان ہو جائیں انصار کے ہوں یا مہاجرین کے تو رشتہ داروں کا حق مقدم ہے جس طرح اس سورۃ کی آخری آیت کے اندر اشارہ کیا گیا ہے یعنی مہاجر اور انصار کو آپس میں وراثت تب ملتی تھی جب رشتہ داروں میں سے کوئی مسلمان نہ ہو اور اگر رشتہ داروں میں سے کوئی وارث مسلمان ہو تو پھر حق دار وہی رشتہ دار ہے۔

اگر کسی مہاجر کا بیٹا ہے اور وہ بھی مسلمان ہے تو پھر وراثت اسی کو ملے گی لیکن اگر کوئی مہاجر ایسا ہے کہ اس کا کوئی رشتہ دار مسلمان نہیں یا ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں نہیں آیا ہوا تو اس صورت میں اس کی وراثت اسی کو ملے گی جو اس کا انصار میں سے بھائی بنایا گیا ہے تو یہاں اسی بات کو ذکر کیا جا رہا ہے کہ بعض بعض کے اولیاء ہیں جس کے اندر وراثت بھی آ گئی کہ بعض بعض کے وارث ہیں، حمایت اور نصرت کا تعلق بھی ہے۔

اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی، دار الحرب میں بیٹھے ہیں تمہارے لیے ان کی ولایت سے کچھ نہیں یعنی تمہارا ان کے ساتھ ولایت والا کوئی تعلق نہیں ہے یہاں وراثت جاری نہیں ہوگی، اختلافِ

دارین کے ساتھ بھی وراثت کا تعلق توڑ دیا گیا جس طرح اختلاف دین کے ساتھ وراثت کا تعلق توڑ دیا جاتا ہے ایک مسلمان ہو دوسرا کافر ہو تو ایک دوسرے کے وارث نہیں اس وقت دارالاسلام اور دارالحرب کا مسئلہ بھی یہی تھا کہ اگر مسلمان رشتہ دار دارالحرب میں بیٹھا ہے تو وہ دارالاسلام والے مسلمان رشتہ دار کا وارث نہیں تھا جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔

ہاں البتہ دینی معاملہ میں اگر تم سے مدد مانگیں تو مدد تمہارے ذمہ ہے ہاں البتہ ایسا ہوسکتا ہے کہ دارالاسلام میں رہتے ہوئے تم نے کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا ہے اور دارالحرب کے مسلمانوں کا الجھاؤ اسی قوم سے ہوگیا، اسی کے خلاف کوئی گڑبڑ ہے اب مسلمان اگر مدد مانگیں تو اپنے معاہدہ کی پابندی تمہارے لیے زیادہ ضروری ہے یعنی دارالحرب کے مسلمانوں کے معاملات دارالاسلام کے معاہدات پر اثر انداز نہیں ہونے چاہئیں جہاں تک ہوسکے ان کی امداد کرو لیکن ایسے لوگوں کے خلاف امداد کرنا تمہارے لیے ٹھیک نہیں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے تو دارالاسلام کا معاہدہ مقدم ہے اور دارالحرب کے اندر رہنے والوں مسلمانوں کے ساتھ مدد و نصرت بھی ضروری ہے لیکن ایسی قوم کے خلاف تم مدد نہیں کر سکتے جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے دارالاسلام کے معاہدے مقدم ہیں مگر ایسی قوم کے خلاف کہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان میثاق ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔

اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وہ بعض بعض کے وارث ہیں، کافروں کی وراثت کافروں کو ملے گی۔

قانون الٰہی کی پابندی نہ کرنے کا نقصان:

۔ اگر تم اس قانون کی پابندی نہیں کرو گے یعنی اسلام کی بناء پر تمہارا آپس میں تناصر اور توارث نہیں ہوگا، ایک دوسرے کی مدد اور وراثت کا تعلق اسلام کی بناء پر نہیں ہوگا اور اگر تم مسلمانوں کی امداد نہیں کرو گے بلکہ وہی جاہلانہ تعصب رہے گا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، جس وقت تک تمہارے یہ جذبات نہیں بنیں گے کہ توارث، تناصر اور آپس میں ولایت اسلام کی بناء پر ہے اس وقت تک اس علاقہ سے فتنہ وفساد ختم نہیں ہوسکتا، اب تمہاری جماعت بندی اسلام اور ہجرت کی بناء پر ہونی چاہیئے کہ تمہارے آپس میں تعلقات مسلمانوں کے ساتھ ہوں، ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو اپنے علاقہ کو چھوڑ کے آگئے ہیں، انہی کے ساتھ وراثت کا تعلق ہو، انہی کے ساتھ نصرت کا تعلق ہو اگر اس ضابطہ کی پابندی نہیں کرو گے تو فتنہ وفساد ختم نہیں ہوسکتا۔

فتنہ وفساد میں اصل یہی ہے کہ مسلمانوں کے اوپر کافروں کے مظالم جاری رہیں، مسلمانوں کی جماعت قوت نہ پکڑے، مسلمانوں کی جماعت قوت تبھی پکڑے گی کہ جب تمہارا آپس میں تناصر اس اصول کے تحت ہوگا، جاہلانہ عصبیت کو ختم کرکے جماعت کی بنیاد اسلام اور ہجرت پہ رکھ دی گئی کہ جو مسلمان ہوتا چلا جائے اور ہجرت کر کے آجائے یہ ہیں تمہاری جماعت کے لوگ، ان کے ساتھ تمہارا آپس میں تناصر کا تعلق ہونا چاہیئے اور انہی کے ساتھ توارث کا تعلق ہونا چاہیئے اگر تم ایسے نہیں کرو گے تو علاقہ میں بڑا فتنہ وفساد ہوگا۔

مؤمنین ومہاجرین کی فضیلت اور گذشتہ حکم کا تتمہ:

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں، ہجرت کرتے ہیں اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ٹھکانہ دیتے ہیں اور مدد کرتے ہیں یہ پکے سچے مؤمن ہیں، ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم ہے۔

اور وہ لوگ جو ایمان لائیں اس کے بعد یعنی یہ تو پہلے "اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کی فضیلت ہوگئی اور یہ اگلی آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو بعد میں ایمان لائیں اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ مل کے جہاد کریں وہ بھی تم میں سے ہی ہیں، ان کے حقوق بھی وہی ہیں جو "اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کے ہیں لیکن اگر تمہارے رشتہ دار موجود ہوں یعنی رشتہ دار مسلمان ہیں اور ہجرت کرکے آئے ہوئے ہیں یہ مقدم ہیں اس اخوتِ اسلامی والے بھائیوں سے، جن کے ساتھ مواخات قائم کردی گئی ان سے وہ رشتہ دار مقدم ہیں، "وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ" کتاب اللہ سے اللہ کا قرآن مراد ہے یہ وضاحت میں نے آپ کے سامنے کردی کہ اگر ایک شخص مسلمان ہے اور اس کا مسلمان رشتہ دار بھی مدینہ منورہ میں ہجرت کرکے آیا ہوا ہے پھر تو وراثت میں یہ رشتہ دار مقدم ہے اور اگر رشتہ دار موجود نہ ہوں تو پھر وراثت پہنچے گی اس مسلمان بھائی کو جس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اخوت کا جوڑ لگا دیا گیا تھا "اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والے ہیں۔

سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا اله الا انت استغفرك واتوب اليك

آیاتها ۱۲۹ ۹ سُورَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ ۱۱۳ رکوعاتها ۱۶

سورۃ توبہ مدینہ میں نازل ہوئی اس میں ۱۲۹ آیات ہیں اور سولہ رکوع ہیں

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱

اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لاتعلقی کا اظہار ہے ان لوگوں کی طرف جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا ①

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ

پھر تم چل پھر لو علاقہ میں چار مہینے اور تم یقین کرلو کہ بے شک تم نہیں ہو

مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝۲ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ

اللہ کو عاجز کرنے والے اور بے شک اللہ تعالیٰ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو ② اعلان ہے اللہ

وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ

اور اللہ کے رسول کی طرف سے ان لوگوں کی طرف حج اکبر کے دن بے شک اللہ تعالیٰ لاتعلق ہے

مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ

مشرکین سے اور اس کا رسول بھی اگر تم توبہ کرلو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر

تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ

تم نے پیٹھ پھیری تو تم یقین کرلو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور خبر دیدیجیے ان لوگوں کو

كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ

جنہوں نے کفر کیا دردناک عذاب کی ③ مگر وہ مشرک جن سے تم نے معاہدہ کیا

ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا

پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی نقص نہیں ڈالا اور نہیں امداد کی انہوں نے تمہارے خلاف کسی قوم کی پھر تم پورا کرو

اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴

ان کی طرف ان کے عہد کو ان کی مدت تک بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں متقین سے ④

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ

پس جس وقت گزر جائیں حرمت والے مہینے پھر تم قتل کرو مشرکوں کو جہاں بھی تم انہیں پاؤ

وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ

اور انہیں پکڑلو اور انہیں گھیرلو اور بیٹھو ان کے لیے ہر گھات میں پھر اگر

تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ

وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دینے لگ جائیں تو ان کا راستہ چھوڑدو بے شک

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ

اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۝۵ اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آپ سے پناہ مانگے

فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

تو آپ اس کو پناہ دیدیں یہاں تک کہ وہ مشرک اللہ کی کلام کو سن لے پھر اس کو پہنچادو امن کی جگہ یہ اس وجہ سے ہے کہ بے شک

قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶ ع

وہ لوگ علم نہیں رکھتے ۝۶

لغوی، صرفی ونحوی تحقیق:

"بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ" میں جو "بَرَاءَةٌ" ہے اس کا معنی ہے لاتعلقی، دست برداری، ترجمہ یوں ہوگا اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لاتعلقی اور بیزاری ہے، آگے اس کا صلہ "الی" آگیا اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ "براءۃ" کے اندر اطلاع والا مفہوم بھی ہے، جس طرح عام طور پر ایک لفظ کے ضمن میں دوسرے لفظ کو ڈال دیا جاتا ہے اور اس کے معنی کا اظہار ہو جاتا ہے تو اسی طرح یہاں ہے اب اس کا مفہوم یوں ادا کریں گے اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لاتعلقی کا اظہار ہے، لاتعلقی کی اطلاع ہے ان لوگوں کو جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا "مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ" یہ "اَلَّذِيْنَ" کا بیان ہے جن مشرکوں سے تم نے معاہدہ کیا تھا ان لوگوں کو اطلاع ہے اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لاتعلقی کی۔

"فَسِيْحُوْا" سَاحَ، يَسِيْحُ چلنا پھرنا "سِيْحُوْا" امر کا صیغہ ہے "یعو ۹" کی طرح، یہ مشرکین کو خطاب ہے جس کا ذکر پچھلی آیات میں آیا ہوا ہے اے مشرکو! تم چل پھر لو "فِي الْأَرْضِ" علاقہ میں، زمین سے وہی عرب کی زمین مراد ہے "أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ" چار مہینے "وَاعْلَمُوْا" اور یقین کرلو "أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ" کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، یہ لفظ سورۂ انفال میں بھی آیا تھا اس کا معنی یہ ذکر کیا تھا کہ تم چھوٹ کے، بچ کے جا کہیں نہیں سکتے، اگر اللہ تمہیں سزا دینا چاہے اور تم بچ کے چلے جاؤ اس کے قابو میں نہ آؤ ایسا نہیں ہوسکتا جیسے عربی کا محاورہ بھی ہے "أَعْجَزَهُ الصَّيْدُ" شکاری کو شکار نے عاجز کردیا یعنی اس کی گرفت میں نہیں آیا، شکاری اس کو پکڑ نہیں سکا تو اس کا بھی ترجمہ یہی ہوگا کہ تم یقین کرلو کہ تم اللہ سے بچ کے جا کہیں نہیں سکتے اور اس بات کا بھی یقین کرلو کہ "أَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكَافِرِيْنَ" "أَخْزٰى يُخْزِيْ إِخْزَاءً" رسواء کرنے کے معنی میں ہے بے شک اللہ رسواء کرنے والا ہے کافروں کو۔

"وَأَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" اذان کا معنی اعلان ہے، اعلان ہے اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے ان لوگوں کی طرف حج اکبر کے دن، حج اکبر کا معنی بڑا حج اور حج اکبر بول کر عمرہ سے احتراز کیا گیا ہے یعنی جس کو ہم حج کہتے ہیں یہی حج اکبر ہے "أَنَّ اللّٰهَ بَرِيْءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ" بے شک اللہ تعالیٰ لاتعلق ہے مشرکین سے اور اس کا رسول بھی "وَرَسُوْلُهٗ" کا عطف "الله" کے اوپر ہے "فَإِنْ تُبْتُمْ" اگر تم توبہ کرلو "فهو خير لكم" تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے "وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ" اور اگر تم نے پیٹھ پھیری تو یقین کرلو کہ "أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ" کہ بے شک تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اللہ تعالیٰ سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکو گے، ایسا نہیں کہ تم اللہ کے قابو میں نہ آؤ، "مُعْجِزِيْ" اصل میں "مُعْجِزِيْنَ" تھا نون اضافت کی وجہ سے گر گیا "وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ" اور کافروں کو دردناک عذاب کی خبر دیدیجیے۔

"إِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ" مگر وہ مشرک جن سے تم نے معاہدہ کیا "ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ" پھر ان مشرکوں نے تمہارے ساتھ کوئی نقص نہیں ڈالا، معاہدہ میں کوئی گڑبڑ نہیں کی تمہارا کچھ قصور نہیں کیا، تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچایا "وَلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ أَحَدًا" "يُظَاهِرُوْا" کا معنی ایک دوسرے کی امداد کرنا باب مفاعلہ ہے اور نہیں امداد کی انہوں نے تمہارے خلاف کسی کی "فَأَتِمُّوْا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ" پھر تم پورا کرو ان کی طرف ان کے عہد کو "إِلٰى مُدَّتِهِمْ" ان کی مدت تک "إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ" بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں متقین سے۔

"فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ" "اِنْسَلَخَ" کا معنی گزر جانا، پس جس وقت گزر جائیں حرمت والے مہینے "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ" پھر تم قتل کرو مشرکین کو "حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ" جہاں بھی تم انہیں پاؤ "وَخُذُوْهُمْ" اور انہیں پکڑلو "وَاحْصُرُوْهُمْ" اور انہیں گھیرلو "وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ" مرصد انتظار کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں جس کو گھات بھی کہتے ہیں اور بیٹھو ان کے لیے ہر گھات میں، ہر مورچہ میں "فَاِنْ تَابُوْا" پھر اگر وہ توبہ کرلیں "وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ" اور نماز کو قائم کرلیں "وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ" اور زکوۃ دینے لگ جائیں "فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ" پھر ان کا راستہ چھوڑ دو "اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

"وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ" "استجار، یستجیر" پناہ مانگنا، پناہ طلب کرنا، اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آپ سے پناہ مانگے "فَاَجِرْهُ" یہ باب افعال سے ہے "اجار یجیر" پھر تو اس کو پناہ دے دے "حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ" یہاں تک کہ وہ مشرک اللہ کی کلام کو سن لے "ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ" پھر اس کو پہنچا دو امن کی جگہ "ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ" یہ اس وجہ سے ہے کہ بے شک وہ لوگ "لَا يَعْلَمُوْنَ" علم نہیں رکھتے، وہ بے علم لوگ ہیں۔

تفسیر:

سورۃ کے نام اور وجہ تسمیہ:

یہ سورۃ جو آپ کے سامنے شروع ہو رہی ہے اس کے دو نام ہیں، سورہ براءۃ بھی اسے کہتے ہیں اور توبہ بھی اس کو کہتے ہیں، سورہ براءۃ تو اس لیے کہ پہلا لفظ "براءۃ" کا آ گیا، اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے براءۃ کی گئی ہے، لاتعلقی کا اظہار کیا گیا ہے اس پہلے لفظ سے سورۃ کا نام اخذ کرلیا گیا اور سورہ توبہ اس لیے کہ اس میں کثرت کے ساتھ توبہ کی تلقین کی گئی ہے جیسا کہ آپ کے سامنے واقعات کے ضمن میں آ جائیگا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی توبہ قبول فرمائی، مسلمانوں سے رجوع فرمایا اور دوسرے لوگوں کو بھی کثرت کے ساتھ توبہ کرنے کی ترغیب دی گئی جیسا کہ پہلا رکوع جو آپ کے سامنے آیا ہے اس میں بھی "فَاِنْ تَابُوْا" کا ذکر آیا ہوا ہے "فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ" اور آگے واقعات کے اندر یہ چیز کثرت کے ساتھ آئے گی۔

سورۃ التوبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ:

اس سورۃ کے شروع میں جو آپ کو ایک نئی چیز نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ عام سورتوں کی طرح اس میں بسم

اللہ نہیں لکھی گئی ہے، کیوں نہیں لکھی گئی ہے؟ اس کی وضاحت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود فرمائی، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ جس وقت قرآن کریم کو اشاعت کے لیے صحائف میں نقل کیا جارہا تھا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ لوگوں نے سورۂ انفال کو جو کہ مثانی میں سے ہے اور سورۂ براءۃ جو کہ مئین میں سے ہے انفال کو پہلے رکھا اور سورۃ براءۃ کو بعد میں رکھا اور پھر سورۂ انفال کو پہلی لمبی سورتوں میں رکھ دیا جن کو سبع طوال کہا جاتا ہے اور پھر انفال اور براءۃ کے درمیان بسم اللہ بھی نہیں لکھی گئی اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تھا۔

سوال کی وضاحت یہ ہے کہ قرآن کریم کو جمع کرتے وقت ترتیب اس طرح رکھی گئی تھی کہ لمبی لمبی سورتیں پہلے اس کے بعد اس سے چھوٹی اور آخر میں بالکل چھوٹی سورتیں رکھی گئیں، جن سورتوں میں سو سے زیادہ آیتیں ہوں ان کو مئین کہتے ہیں مائۃ سو کو کہتے ہیں سو سے زیادہ آیتوں والی سورۃ کو مئین کہتے ہیں اور جن میں سو سے کم آیتیں ہوں جس طرح سورۃ انفال کے شروع میں لکھا ہوا دیکھا ہوگا کہ اس میں پچھتر آیتیں ہیں تو جن میں سو سے کم آیتیں ہیں ان کو مثانی کہا جاتا ہے اور جو چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں ان کو مفصلات کہا جاتا ہے اور پہلی سات سورتوں کو سبع طوال کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے تو ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے لمبی لمبی سورتیں اس کے بعد اس سے چھوٹی اور آخر میں بالکل چھوٹی سورتیں ہوں گی سورۃ بقرۃ ہے، سورۃ آل عمران ہے، سورۃ نساء، مائدہ، انعام، اعراف یہ چھ ہوگئیں اور ساتویں نمبر پہ انفال آگئی حالانکہ انفال کی آیتیں سو سے کم ہیں، یہ مثانی میں سے ہے اور آگے براءۃ آگئی یہ لمبی سورۃ ہے اس میں سو سے زیادہ آیتیں ہیں۔

تو ترتیب کا تقاضہ یہ تھا کہ براءۃ پہلے ہوتی اور انفال بعد میں ہوتی ہے اور عام سورتوں کی طرح درمیان میں بسم اللہ لکھی جاتی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سوال کا یہ مطلب ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آگے سے وضاحت فرمائی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آیات تھوڑی تھوڑی کر کے اترتی تھیں اور جس وقت آیات اترتیں تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو کاتب وحی ہوتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ یہ فلاں آیت فلاں سورۃ میں رکھ دو اور فلاں آیات فلاں سورۃ میں رکھ دو اور جس وقت مکمل ہو جاتی اور دوسری سورۃ شروع ہوتی تو ابتداء میں بسم اللہ بھی لکھواتے تھے اور اللہ کی طرف سے بسم اللہ اتری بھی اس لیے تھی تاکہ دو سورتوں کے درمیان فصل معلوم ہو جائے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت تھی، تو نزولی ترتیب اور ہے اور آیات کے رکھنے کی ترتیب اور ہے جس طرح آپ

اشارہ فرماتے تھے آیات کو ویسے رکھ دیا جاتا تھا۔

سورۃ انفال ان سورتوں میں سے ہے جو مدینہ منورہ میں ابتداء ابتداء میں اتری ہیں کیونکہ اس میں بدر کے حالات سارے کے سارے ذکر کیے گئے ہیں اور سورۃ براۃ ان سورتوں میں سے ہے جو سب سے آخر میں اتریں لیکن مضمون دونوں کا آپس میں ملتا جلتا ہے، مضمون میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں سرور کائنات ﷺ کی طرف سے یہ صراحت ہمارے سامنے نہیں آئی کہ براءۃ مستقل سورۃ ہے یا انفال کا حصہ ہے اس لیے میں نے دونوں کو جوڑ دیا انفال چونکہ نزولاً مقدم ہے اس لیے اس کو پہلے رکھ دیا اور براءۃ چونکہ نزولاً موخر ہے اس کو میں نے بعد میں رکھ دیا کیونکہ یہ بھی احتمال ہے کہ دونوں سورتیں علیحدہ نہ ہوں بلکہ ایک ہی ہوں اس لیے درمیان میں بسم اللہ نہیں لکھی اور ایسا بھی احتمال ہے کہ شاید علیحدہ علیحدہ ہوں تو درمیان میں فصل چھوڑ دیا تو اس میں احتمال جزئیت ہے، احتمال جزئیت کی بناء پر درمیان میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی اور یہ احتمال بھی ہے کہ دونوں سورتیں علیحدہ علیحدہ ہوں اس لیے درمیان میں فصل کر دیا اس کو ایک ہی سورۃ کی طرح مسلسل نہیں رکھا یہ وجہ ہے ان کو جدا جدا رکھنے کی اور درمیان میں بسم اللہ نہ لکھنے کی۔

سورۃ توبہ کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کا مسئلہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ احتمال جزئیت ہے اس لیے قراء کرام کے اندر یہ بات چلی آرہی ہے اور فقہاء کے نزدیک بھی مسئلہ اسی طرح ہے کہ اگر کوئی شخص پیچھے سے تلاوت کرتا ہوا آرہا ہو مثلاً پیچھے سے سورۃ انفال پڑھتا ہوا آرہا ہے تو اس کو سورۃ انفال کے آخر میں "اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" کے بعد بسم اللہ نہیں پڑھنی چاہیے بلکہ اسی طرح "بَرَاۗءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" سے شروع کر دینی چاہیے، مسلسل پڑھتا چلا جائے اور اگر وہ اس سورۃ سے ابتداء کر رہا ہے تو پھر باقاعدہ جس طرح قرآن پڑھا جاتا ہے "اعوذ باللہ، بسم اللہ" کے ساتھ اسی طرح تلاوت کی ابتداء کرنی چاہیے اور اگر سورۃ براءۃ کے وسط سے آپ پڑھنا چاہیں تو اس وقت بھی "اعوذ باللہ" اور "بسم اللہ" کے ساتھ ابتداء کرنی چاہیے۔

اور بعض لوگوں نے اس سورۃ کے شروع میں بسم اللہ کو ویسے ہی ناجائز سمجھ رکھا ہے کہ پڑھنا ٹھیک ہی نہیں ہے کوئی اور عبارت پڑھنا شروع کر دیتے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہے اس کا اس طرح پڑھنا جائز نہیں یعنی اعوذ باللہ اور بسم

اللہ کو چھوڑ کر اس کی جگہ کوئی اور چیز پڑھنا ٹھیک نہیں ہے، ویسے تو دعائیہ کلمات جب چاہو پڑھتے رہو لیکن اعوذ باللہ اور بسم اللہ کی جگہ اس کو پڑھنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ بدعت ہے اس لیے اگر آپ پیچھے سے تلاوت کرتے ہوئے آئیں تو اسی طرح مسلسل پڑھتے چلے جائیں اور اگر تلاوت کی ابتداء یہاں سے کرنی ہے تو جیسے قرآن کریم کی تلاوت کے آغاز میں تعوذ اور تسمیہ پڑھا جاتا ہے ویسے یہاں بھی پڑھیں، بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ احتمال جزئیت ہے تو جب دونوں سوتوں میں ایک ہونے کا احتمال ہے تو پھر یہ طوال میں آسکتی ہیں پھر یہ لمبی سوۃ بن جاتی ہیں۔

ماقبل سے ربط اور سورۂ توبہ کے مضامین:

سورۃ انفال میں زیادہ تر ذکر جہاد پر برانگیختہ کرنے کا تھا اور خاص طور پر بدر کے حالات ذکر کیے گئے تھے اور اب سورۃ براءۃ آرہی ہے اس کے اندر مشرکین سے لاتعلقی کا اعلان ہے جس طرح ابتدائی آیات میں آیا اور چند غزوات کا ذکر ہے، فتح مکہ کا ذکر ہے، غزوہ حنین کا ذکر ہے اور غزوہ تبوک کا ذکر ہے ان تین غزوات کے حالات اس میں آرہے ہیں اور اس کے ضمن میں منافقین کے حالات کو کثرت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جن کا نفاق خصوصیت کے ساتھ غزوہ تبوک کے موقع پر کھلا تھا ان کے حالات ذکر کر کے ان کو پھر توبہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ اپنے حالات سے باز آجائیں توبہ کر لیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب بھی دی گئی ہے یہ اس سورۃ کے مضامین کا خلاصہ ہے۔

شان نزول:

غالباً آپ کے سامنے اس بات کا ذکر پہلے ہو چکا تھا کہ مدینہ منورہ میں تشریف لے جانے کے بعد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جہادی مہم شروع کی تو مختلف لڑائیاں ہوئیں، چھوٹے چھوٹے ٹکراؤ بھی ہوئے، بڑی لڑائیاں بدر، احد اور احزاب بھی ہوئیں، سن چھ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا تھا کہ ہم عمرہ کرنے کے لیے گئے ہیں اور وہاں لوگوں نے سر منڈوایا ہے اور بعض نے قصر کروایا ہے یہ خواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے ذکر کر دیا، خواب کے اندر وقت کی تعیین تو کی نہیں گئی تھی کہ کب جاؤ گے؟ صرف یہ تھا کہ جاؤ گے تو چونکہ مکہ معظمہ سے آئے ہوئے کافی مدت ہو گئی تھی اور ہر کسی کے دل میں تڑپ تھی کہ بیت اللہ کا طواف کریں، بیت اللہ کی

زیارت کریں اس شوق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فوراً تیاری شروع کردی کہ عمرہ پہ جائیں گے اور اللہ ہمیں عمرہ کرنے کی توفیق دے گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں نظر آیا ہے۔

اور بیت اللہ کا علاقہ چونکہ حرم کا علاقہ ہے، جاہلیت میں بھی اگر بدتر سے بدتر دشمن بھی بیت اللہ کا طواف کرنے اور بیت اللہ کی زیارت کرنے آنا چاہے تو مشرکین مکہ روکا نہیں کرتے تھے اور نہ ہی روکنا ان کے لیے جائز تھا لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب جماعت کو لے کر چلے چودہ یا پندرہ سو آدمی علی اختلاف روایات آپ کے ساتھ تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے باہر نکل کر ذوالحلیفہ پر پہنچ کر احرام باندھا جو کہ مدینہ منورہ کا میقات ہے اور مکہ معظمہ کے قریب آ کے حدیبیہ کے اندر آپ ٹھہر گئے، یہ میدان حدیبیہ حرم سے باہر حرم سے متصل ہی ہے، بڑی کھلی وادی ہے، جدہ سے مکہ معظمہ کو جاتے ہیں تو سڑک اسی وادی سے گزرتی ہے اور اس جگہ جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے تھے اب وہاں مسجد بنی ہوئی ہے اور لوگ آتے جاتے اس میں نوافل پڑھتے ہیں وہ بالکل مین روڈ پر ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں آ کے ٹھہر گئے اور معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ آگے سے رکاوٹ ڈال رہے ہیں، مکہ معظمہ میں جانے نہیں دیں گے، بہرحال حالات گزرے جیسے بھی تھے وہ تفصیل یہاں بیان کرنا مقصود نہیں ہے، وہ سورۃ فتح کے اندر آئے گی آخر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکین کے ساتھ معاہدہ ہو گیا۔

اس صلح کے اندر جو شرطیں لکھی گئی تھیں ان شرطوں میں سے ایک شرط یہ تھی کہ دس سال آپس میں جنگ بند رہے گی، ہم ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے، براہ راست بھی نہیں لڑیں گے اور اگر کوئی دوسرا دشمن ہم دونوں فریقوں میں سے کسی فریق کے ساتھ گڑبڑ کرے گا تو خفیہ اس کی امداد نہیں کریں گے اور ایک شرط اس صلح کے اندر یہ تھی کہ براہ راست اس صلح کے اندر فریق دو ہیں (۱) مشرکین مکہ (۲) سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت، اور جو باقی قبائل عرب ہیں ان کو اختیار ہے اس صلح کے اندر اگر شریک ہونا چاہیں ان کی مرضی مشرکین مکہ کے ساتھ مل کر شریک ہو جائیں، ان کی مرضی مسلمانوں کے ساتھ مل کر شریک ہو جائیں، وہ بھی اس معاہدہ میں شریک ہو سکتے ہیں، یہ گنجائش بھی ساتھ رکھی گئی اور ساتھ یہ بھی شرط تھی کہ آپ اس سال عمرہ نہ کریں آپ اس سال واپس چلے جائیں، اسی طرح سے اگلے سال آئیں اور اگلے سال آ کے عمرہ کر جائیں یہ ضد انہوں نے اپنی پوری کروائی کہ اس سال ہم عمرہ نہیں کرنے دیں گے ورنہ لوگوں میں یہ مشہور ہو جائے گا کہ مکہ والے دب گئے ہیں اس لیے اب تو واپس چلے جاؤ اگلے سال آنا پھر عمرہ کر لینا تو جس وقت آپ صلح حدیبیہ کی یہ تفصیل پڑھیں گے تو عجیب وغریب اس کی شرطیں ہیں

کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری کی ساری شرطیں تسلیم کرلیں چاہے بظاہر مسلمانوں پر ان سکتا ہی دباؤ پڑا۔

جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے تو مکہ معظمہ کے آس پاس دو قبیلے ہیں ایک بنوبکر اور ایک بنوخزاعہ، بنوبکر مشرکین مکہ کے ساتھ مل کر حلیف ہو کر صلح میں داخل ہو گئے اور بنوخزاعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہو کر اس صلح میں آ گئے، اب بنوبکر اور بنوخزاعہ کو آپس میں لڑنا ٹھیک نہیں تھا لیکن ایک وقت بنوبکر نے بنوخزاعہ پر رات کو حملہ کیا جاہلیت کے زمانے سے ان کی ٹکر چلی آ رہی تھی تو مشرکین مکہ نے یہ خیال کر کے کہ مدینہ والے تو بہت دور ہیں کیا پتہ چلے گا اور رات کا وقت ہے انہوں نے اپنے حلیف بنوبکر کی امداد اس طرح بنوخزاعہ کو نقصان پہنچایا، بنوخزاعہ نے یہ اطلاع سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دی تو گویا کہ مشرکین مکہ کی طرف سے خیانت ہو جانے کے بعد معاہدہ ٹوٹ گیا جب وہ ٹوٹ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب یہ سمجھا کہ باقاعدہ اعلان کر کے لڑائی نہ لڑی جائے بلکہ ہم خفیہ طور پر تیاری کرلیں اور اچانک اہلِ مکہ پر جا پڑیں تا کہ حرم کے اندر خون ریزی نہ ہو، مشرکین مکہ کی طرف سے معاہدہ تو ٹوٹ گیا تھا، حرم میں خون ریزی سے بچنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کا اعلان نہیں کیا بلکہ ارادہ یہ کیا کہ دفعۃً جا کر ان پر دباؤ ڈال دیا جائے تا کہ مکہ فتح ہو جائے اور لڑائی کی نوبت نہ آئے اس میں بھی گویا کہ ایک قسم کا احترام باقی تھا چنانچہ مکہ کو فتح کرنے کی تیاری کی گئی تو سن آٹھ ہجری دس رمضان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے سفر شروع کیا اور بغیر کسی خاص لڑائی کے مکہ معظمہ فتح ہو گیا، کوئی خاص تصادم نہیں ہوا مکہ معظمہ فتح کرلیا گیا تو آٹھ ہجری رمضان المبارک میں مکہ فتح ہوا اور شوال میں آگے غزوہ حنین پیش آ گیا جس کا ذکر آپ کے سامنے آئے گا غزوہ حنین کے متصل ہی چھوٹے چھوٹے غزوات پیش آئے غزوہ اوطاس اور غزوہ طائف وغیرہ اس علاقہ کو اچھی طرح صاف کر کے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور یہاں اپنا نائب چھوڑ گئے، یہ ہیں آٹھ ہجری کے واقعات۔

نو ہجری میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب سے بڑا جو غزوہ پیش آیا وہ غزوہ تبوک ہے، غزوہ تبوک سے واپس آ کر پھر نو ہجری میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کے حج کے لیے بھیجا، نو ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج نہیں فرمایا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مسلمانوں کو حج کرنے کے لیے بھیجا تو جس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حج کرنے کے لیے آئے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ آیات اتر چکی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا اور

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ منی میں، عرفات میں مختلف جگہوں میں ان آیات کا اعلان کر دیا جائے تا کہ سب اہل مکہ کو پتہ چل جائے کہ اب ہمارے متعلق یہ احکام آ گئے ہیں تو نو ہجری میں یہ اعلانات کروائے جو کہ ان آیات میں آپ کے سامنے آ رہے ہیں اور پھر دس ہجری میں خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج فرمایا، ذی الحجہ کے بعد محرم، صفر گذرے، ربیع الاول میں پھر آپ کا انتقال ہوا تو آخری سال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج فرمایا۔

مشرکین کے مختلف گرہوں کے متعلق مختلف ہدایات:

تو یہ اعلان جو کیا گیا اس اعلان کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت مشرکوں کے طبقات مختلف تھے، بعض تو ایسے تھے کہ جنہوں نے معاہدہ کیا تھا لیکن توڑ دیا ان کے بارے میں اعلان کیا گیا کہ اب ان کو کوئی امن نہیں ہے، مکہ فتح ہونے کے بعد ان کو جو عارضی امن دیا گیا تھا اب وہ امن اشہر حرم کے گزرتے ہی ختم ہو جائے گا ان کو چاہیے کہ اشہر حرم کے اندر اندر یعنی حرمت والے مہینوں کے اندر اندر یا تو مسلمان ہو جائیں یا پھر اس علاقہ کو چھوڑ کر چلے جائیں اب یہ اعلان ذی الحجہ میں کیا جا رہا ہے، ذی الحجہ یہ بھی اشہر حرم ہے اور اس کے بعد محرم بھی شہر حرام ہے، صفر حلت والا مہینہ ہے یہ شہر حرام نہیں ہے تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے یہ معاہدات توڑے تھے، معاہدوں کی پابندی نہیں کی تھی اب ان کو محرم کے آخر تک مہلت ہے یا تو وہ مسلمان ہو جائیں یا وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر چلے جائیں۔

اور بعض فریق ایسے تھے جیسے بنو کنانہ کی دو شاخیں بنو ضمرہ اور بنو مدلج، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مدت معین تک معاہدہ کیا تھا اور یہ معاہدہ کے اوپر پابند رہے انہوں نے کوئی خیانت نہیں کی اور ذی الحج کے موقع پر یہ اعلان کرایا جا رہا تھا مشرکین سے لاتعلقی کا تو ان کے معاہدے میں ابھی نو مہینے باقی تھے ان آیات کے اندر ذکر کر دیا گیا کہ مسلمان اس معاہدہ کے پابند ہیں لیکن آئندہ نیا معاہدہ نہیں کریں گے، وہ اپنے اس معاہدہ کی مدت تک اطمینان سے رہیں کہ اس کے اندر غور کر کے مسلمان ہو جائیں یا اس علاقہ کو چھوڑ جائیں نیا معاہدہ ان کے ساتھ نہیں کیا جائے گا ان کا معاہدہ ختم ہوگا نو مہینوں کے بعد جا کر رمضان المبارک میں، اس وقت تک ان کو مہلت ہوگی۔

اور بعض مشرکوں کے قبائل ایسے تھے کہ جن کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ نہیں تھا یا ان کے ساتھ معاہدہ اس قسم کا تھا جس کی کوئی مدت متعین نہیں تھی ویسے آپس میں معاہدہ ہو گیا تھا کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے لڑیں گے نہیں، مدت کوئی متعین نہیں کی گئی تھی یا سرے سے معاہدہ تھا ہی نہیں ان دونوں فریقوں کے متعلق اعلان کر دیا گیا کہ ان کو چار مہینے کی مہلت ہے، چار مہینے کے اندر اندر اپنی قسمت کا فیصلہ کر لو یا مسلمان ہو جاؤ یا اس علاقہ کو چھوڑ دو ان

کے ساتھ معاہدہ ختم ہوگا جا کر ربیع الثانی میں اور کسی کے ساتھ ختم ہوگا محرم کے اختتام پر صفر کے شروع میں اور دو فریقوں کے ساتھ ختم ہوجائے گا اعلان کے بعد ربیع الثانی میں اور بعض کے ساتھ ختم ہوگا رمضان میں تو سارے مشرک اس کے اندر آ گئے، اگلا حج آنے سے پہلے پہلے مشرکوں سے عرب کو پاک کرنے کا تہیہ کرلیا اور حضور ﷺ نے یہ اعلان کروایا حج کے موقع پر کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کرنے کے لیے نہ آئے اب رکاوٹ ڈال دی گئی کہ آئندہ مشرکوں کو حج کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مشرکین اور اہل کتاب سے جزیرۃ العرب کو صاف کرنا:

چنانچہ رسول اللہ ﷺ جس وقت حج کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں تو اس وقت حج کے اندر مسلمان ہی مسلمان تھے، اس سال کوئی غیر مسلم حج کرنے کے لیے نہیں آیا اس طرح ان کے اوپر پابندی لگ گئی تو رمضان المبارک تک ماحول صاف ہوجائے گا اور جب پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ایک خاص اسلامی حکومت قائم ہوچکی تھی اور اس کے اندر مشرکین کی آبادی باقی نہیں رہی سارے جزیرۂ عرب کو صاف کردیا گیا۔

باقی اہل کتاب سے بھی آپ ﷺ نے جزیرۂ عرب کو صاف کرنے کا ارادہ فرمالیا تھا لیکن آپ ﷺ کو اس کی مہلت نہ ملی تو پھر یہ اہل کتاب جو خیبر وغیرہ کے علاقہ میں آباد تھے ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں سے بھگایا پھر یہ وہاں سے نکلے اور ادھر ادھر منتشر ہوگئے تو یہ علاقہ جو آج سعودی عرب کہلاتا ہے اس کی حدود کے اندر اس وقت اہل کتاب میں سے بھی کوئی باقی نہ رہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سارا علاقہ صاف کروایا تھا۔

حج اکبر کا مصداق:

یہ آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئی ہیں ان کے اندر ہی اعلان براءت ہے جو مختلف فریقوں اور مختلف گروہوں کے متعلق کیا گیا اور ایک سال کے اندر ہی اس علاقہ کو صاف کردیا گیا اگلے سال کوئی مشرک باقی نہ رہا اس تفصیل کے بعد اب آپ کے لیے آیات کا مضمون سمجھنا آسان ہے۔

ان آیات میں حج اکبر کا لفظ آرہا ہے اس حج اکبر سے مراد حج ہی ہے، یہ نو، دس ذی الحجہ اور اس کے بعد جو ایام ہوتے ہیں یہی "یوم الحج الاکبر" ہے اور عام طور پر لوگوں میں مشہور یہ ہے کہ حج اکبر وہ ہوتا ہے جس میں عرفہ یعنی نو تاریخ جمعہ کو آئے، جمعہ کو حج ہو تو اس کو حج اکبر کہتے ہیں یہ عوامی اصطلاح ہے، تحقیقی بات نہیں ہے وہ اس اعتبار سے کہہ دیتے ہیں کہ سرورکائنات ﷺ نے جو حج کیا تھا تو اتفاقی بات ہے کہ جمعہ کا دن تھا تو اب اگر ایسی

موافقت ہوجائے کہ ذی الحجہ کی نو تاریخ جمعہ کو ہوجائے تو رسول اللہ ﷺ سے موافقت ہوجائے گی کہ جیسے آپ ﷺ کا حج جمعہ کو ہوا تھا یہ بھی جمعہ کو ہوگیا تو یہ ایک فضیلت ہے کہ آدمی کو وہی دن نصیب ہوجائے جو سرورِ کائنات ﷺ کے حج کا دن ہے ورنہ حج اکبر مطلق حج کو کہتے ہیں، اکبر کا لفظ بول کر اصل میں عمرہ سے احتراز کرنا مقصود ہے، عمرہ کو حج اصغر کہا جاتا ہے تو اس حج کے موقع پر آپ ﷺ نے یہ اعلان کروایا تھا۔

تفسیر باللفظ:

اب قرآن کریم کے الفاظ میں غور کرو گے تو ساری بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی، اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے براءۃ کا اظہار ہے، لاتعلقی کا اعلان ہے ان لوگوں کی طرف جن مشرکوں سے تم نے معاہدہ کیا تھا اب ہم لاتعلقی کا اعلان کرتے ہیں کہ اب معاہدہ ختم ہوگیا۔

"فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ" اس کا مصداق وہ ہوں گے جن کے ساتھ معاہدہ بلاتعیین مدت ہوا تھا اور اسی کے حکم میں ہیں وہ جن سے کوئی معاہدہ تھا ہی نہیں، ان دونوں کو چار مہینے کی مہلت دی گئی یا کوئی سرے سے معاہدہ ہوا ہی نہیں تھا تو ان کو بھی چار مہینے کی مہلت دیدی گئی پھر تم چلو پھرو اے مشرکو! زمین میں چار مہینے تک اور یقین کرلو کہ اللہ کو تم عاجز کرنے والے نہیں ہو، اس میں دھمکا بھی دیا کہ یہ نہ کوشش کرنا کہ ہم ادھر ادھر بھاگ کے بچ جائیں گے اور اللہ کے عذاب میں نہیں آئیں گے، اللہ تعالیٰ اگر پکڑنا چاہے گا تو تم چھوٹ نہیں سکتے اس میں ترغیب بھی ہے کہ اب ہمت آزمائی اور زور آزمائی کی کوشش نہ کرنا بلکہ مسلمان ہوجاؤ اور بے شک اللہ رسواء کرنے والا ہے کافروں کو، ان کے متعلق تو یہ اعلان ہوگیا۔

"وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ" اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے اعلان ہے لوگوں کی طرف حج اکبر کے دن، وہی حج اکبر کے ایام مراد ہیں، یہ سن نو ہجری کی بات ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ لاتعلق ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول بھی، اللہ اور اللہ کے رسول کا مشرکوں سے کوئی تعلق نہیں "فَإِن تُبْتُمْ" اے مشرکو! اگر تم توبہ کرلو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اپنی یہ ضد چھوڑ دو "وَإِن تَوَلَّيْتُمْ" اور اگر تم نے پیٹھ پھیری پھر یقین کرلو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو پھر تم اللہ کی گرفت میں آجاؤ گے، تم اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکتے اور خبر دیدو ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا عذاب الیم کی۔

"إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم" مگر مشرکوں میں سے وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے تمہارے

ساتھ کوئی نقص نہیں ڈالا، معاہدہ میں کوئی کمی نہیں کی، تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا، کوئی کسی قسم کا قصور نہیں کیا یہ وہ فریق ہے جن سے معاہدہ ہوا تھا اور وہ پابند رہے اور تعیین مدت کا معاہدہ تھا، خصوصیت کے ساتھ اس آیت میں اشارہ ہے بنو کنانہ کی طرف اور ان کی دونوں شاخوں بنوزمرہ اور بنو مدلج کی طرف اور نہ انہوں نے تمہارے خلاف کسی کی مدد کی، نہ خود معاہدے کو توڑا اور نہ در پردہ کسی کی امداد کی "فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ" تم ان کی طرف ان کے عہد کو پورا کرو ان کی مدت تک، عہد کے پورا کرنے میں اشارہ اس بات کی طرف ہو گیا کہ آئندہ تجدید معاہدہ نہیں کرنا جتنی مدت متعین ہے اس وقت تک پورا کردو، اعلان کے وقت ان کی مدت میں نو مہینے باقی تھے "اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ" اللہ تعالیٰ متقین کو پسند کرتے ہیں، یہاں متقین سے تقویٰ اجتماعی مراد ہے کہ تمہاری طرف سے معاہدہ میں کوئی خلل نہ پڑے اس بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

"فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ" یہ اس گروہ کا ذکر آ گیا جنہوں نے معاہدہ توڑا تھا اور گڑبڑ کی تھی، معاہدہ کی پابندی نہیں کی، ان کے بارے میں اعلان آ گیا کہ جب اشہر حرم گزر جائیں، اشہر حرم میں ذی الحجہ اور محرم باقی تھا جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کردیعنی پھر اس کے بعد تادیبی کاروائی شروع کر دو، جو مسلمان ہوتے ہیں وہ مسلمان ہو جائیں یا علاقہ چھوڑ جائیں اور اگر یہ ضد کرتے ہیں نہ علاقہ چھوڑتے ہیں اور نہ ہی یہ مسلمان ہوتے ہیں تو پھر ان کی گردنیں اڑا دو "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ" پھر قتل کرو مشرکوں کو "حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ" جہاں بھی تم انہیں پاؤ اور ان کو پکڑ لو اور ان کو گھیر لو مطلب یہ کہ جیسے جنگ میں کاروائیاں ہوا کرتی ہیں ویسی کاروائیاں ان کے خلاف کرو "وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ" اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ میں بیٹھو یعنی ان کے خلاف مورچہ بندی کرو جیسے جنگ کے اندر تدبیر ہوتی ہے۔

"فَاِنْ تَابُوْا" پھر اگر یہ کفر و شرک سے توبہ کرلیں اور ایمان قبول کرلیں اور ایمان قبول کرنے کی ظاہری علامت یہ ہے کہ تمہارے ساتھ مل کے نماز پڑھنے لگ جائیں اور زکوٰۃ دینے لگ جائیں یہ ایمان قبول کرنے کی ایک ظاہری علامت ہے "فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ" پھر ان کا راستہ چھوڑ دو پھر انہیں کچھ نہ کہو، پرانی دشمنیاں بھول جاؤ کیونکہ تمہاری ساری دشمنی اس لیے تھی کہ وہ کافر ہیں جب وہ مسلمان ہو گئے تو دشمنی کس بات کی؟ پھر ان کا راستہ چھوڑ دو اور ان کو آزاد پھرنے دو "اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" اللہ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

اب آگے یہ کہہ دیا کہ جن کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا ان میں سے کوئی شخص اب بھی تم سے پناہ مانگتا

ہے کہ میں تمہارے دین کی باتیں سننے کے لیے، اس کے اوپر تبادلہ خیال کرنے کے لیے اور معلومات حاصل کرنے کے لیے چند دن پناہ لینا چاہتا ہوں تو اس کو پناہ دو اور خوب ان کو اللہ کی آیات سناؤ، ان کے سارے شکوک شبہات کو دور کرو پھر اس کو امن کی جگہ پہنچادو اور یہ رعایت صرف اس لیے دی جارہی ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے بے علم ہیں، امی لوگ ہیں اور سوچتے نہیں اور سمجھتے نہیں ہیں، پہلے سے کتاب والے نہیں ہیں ان کے سامنے ان باتوں کا چرچا نہیں تھا تو اب ان کو اتنی مہلت ہے کہ اگر تم سے سمجھنے کے لیے پناہ لے تو اس کو پناہ دیدو اس کو باتیں سنا کر امن کی جگہ پہنچادو جہاں وہ جانا چاہتا ہے جب وہ چلا جائے گا تو پھر اس کی پناہ ختم ہو جائے گی۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ

کیسے باقی رہے گا مشرکین کے لیے عہد اللہ کے نزدیک اور اللہ کے

رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ

رسول کے نزدیک مگر وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا مسجد حرام کے پاس

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

پھر جب تک وہ تمہارے لیے سیدھے رہیں پس تم ان کے لیے سیدھے رہو بیشک اللہ محبت رکھتا ہے

الْمُتَّقِيْنَ ۞ كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ

متقین سے ﴿۷﴾ (کیسے عہد ہوگا جبکہ حال یہ ہے کہ) اگر وہ غلبہ پالیں تم پر تو نہیں لحاظ کریں گے تمہارے بارے میں

اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ

قرابت کا اور نہ ذمہ داری کا ، راضی کرتے ہیں وہ تمہیں اپنے مونہوں کے ساتھ اور انکار کرتے ہیں ان کے دل

وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۞ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا

ان میں سے اکثر فاسق ہیں ﴿۸﴾ خرید لیا انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے میں ثمن قلیل کو پھر روکا انہوں نے

عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ لَا يَرْقُبُوْنَ

اللہ کے راستے سے بیشک بہت برا ہے جو وہ کرتے ہیں ﴿۹﴾ نہیں یہ لحاظ کرتے

فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۞ فَاِنْ

کسی مومن کے بارے میں قرابت کا اور نہ ذمہ داری کا یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں ﴿۱۰﴾ پھر اگر

تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ

توبہ کرلیں اور نماز قائم کرلیں اور زکوۃ دینے لگ جائیں پھر یہ تمہارے بھائی ہیں دین کے بارے میں

وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۞ وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ

اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں آیات ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں ﴿۱۱﴾ اگر توڑ دیں یہ اپنی قسمیں

مِّنۢ بَعۡدِ عَهۡدِهِمۡ وَطَعَنُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَٮِٕمَّةَ الۡـكُفۡرِ‌ ۙ

اپنے عہد کے بعد اور تمہارے دین میں طعن کریں پھر لڑو تم کفر کے اماموں سے

اِنَّهُمۡ لَاۤ اَيۡمَانَ لَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ يَنۡتَهُوۡنَ ﴿۱۲﴾ اَلَا تُقَاتِلُوۡنَ قَوۡمًا

بے شک ان کے لیے قسمیں نہیں ہیں تاکہ یہ باز آجائیں ﴿۱۲﴾ کیا نہیں لڑو گے تم ان لوگوں کے ساتھ

نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ وَهَمُّوۡا بِاِخۡرَاجِ الرَّسُوۡلِ وَهُمۡ بَدَءُوۡكُمۡ اَوَّلَ

جنہوں نے توڑ دیں اپنی قسمیں اور ارادہ کیا انہوں نے رسول کو نکالنے کا اور انہوں نے پہلی بار تم سے

مَرَّةٍ‌ ؕ اَتَخۡشَوۡنَهُمۡ‌ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشَوۡهُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳﴾

ابتداء کی کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ زیادہ حق رکھتا ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو ﴿۱۳﴾

قَاتِلُوۡهُمۡ يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَيۡدِيۡكُمۡ وَيُخۡزِهِمۡ وَيَنۡصُرۡكُمۡ عَلَيۡهِمۡ

لڑائی کرو ان لوگوں کے ساتھ عذاب دے گا اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں اور ان کو رسوا کرے گا اور تمہاری ان کے خلاف مدد کرے گا

وَيَشۡفِ صُدُوۡرَ قَوۡمٍ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۙ‏ ﴿ج﴾ وَيُذۡهِبۡ غَيۡظَ قُلُوۡبِهِمۡ‌ ؕ

اور شفا دے گا مؤمنین کے سینوں کو ﴿ج﴾ اور مومنوں کے دلوں کی جلن کو لے جائے گا

وَيَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ‌ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۱۵﴾ اَمۡ

اور اللہ توجہ فرمائے گا جس پر چاہے گا اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے ﴿۱۵﴾ کیا

حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَكُوۡا وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ

تم نے سمجھ لیا کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی تک اللہ نے جدا کر کے نہیں جانا ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا

وَلَمۡ يَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوۡلِهٖ وَلَا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ

اور جنہوں نے نہیں بنایا اللہ کے علاوہ اور اللہ کے رسول کے علاوہ اور مومنین کے علاوہ

وَلِيۡجَةً‌ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

کوئی مخلص دوست اور اللہ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم کرتے ہو ﴿۱۶﴾

تفسیر:

پورے رکوع کا خلاصہ:

یہ آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ مشرکین مکہ کے خلاف جہاد پر برانگیختہ کیا ہے کیونکہ ان میں سے بعض آیات بالیقین فتح مکہ سے پہلے کی ہیں اور بعض آیات اس وقت کی ہیں جس وقت انہوں نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا تھا اور فتح مکہ کی ترغیب دی جا رہی ہے اور مشرکین مکہ کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کے لیے ابھارا جا رہا ہے اور بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے معاہدہ ابھی تک توڑا تو نہیں لیکن اندیشہ ظاہر کر دیا گیا کہ وہ معاہدہ توڑیں گے اور یہ عہد ان کے لیے باقی نہیں رہے گا اس رکوع کے اندر جو آیات ہیں ان کا یہی مضمون ہے۔

مشرکین کی طرف سے بدعہدی کی پیش گوئی:

ابتدائی آیات ان کے معاہدہ توڑنے سے پہلے کی ہیں جس میں ایک قسم کی پیش گوئی ہے کہ یہ ایسا کریں گے اگرچہ حدیبیہ میں انہوں نے معاہدہ کر لیا ہے لیکن ان کا یہ معاہدہ باقی نہیں رہے گا یہ گڑبڑ کرنے کے عادی ہیں، زبانی باتیں کر کے تمہیں خوش کر دیتے ہیں، ان کے دل تمہیں کسی صورت میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس لیے جب بھی موقع ہوگا اس معاہدہ میں خیانت کریں گے اور جب خیانت کریں گے تو ان کے لیے کوئی عہد باقی نہیں رہے گا اللہ کے نزدیک اور نہ اللہ کے رسول کے نزدیک کیونکہ معاہدہ کوئی یک طرفہ چیز نہیں ہے، یہ تو فریقین کے درمیان ہوتا ہے اور دونوں فریق اگر اس کو باقی رکھیں تو باقی رہا کرتا ہے، یہ نہیں کہ ایک تو اس کی خلاف ورزی کرتا رہے اور اس معاہدہ کے خلاف گڑبڑ کرتا رہے اور دوسرا فریق اس کا لحاظ کر کے اس کی پاسداری کرے یہ کوئی طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ دوطرفی چیز ہے اگر دوسرا فریق لحاظ رکھے گا تو تم نے لحاظ رکھنا ہے اور اگر دوسرا فریق لحاظ نہیں رکھتا بلکہ اس کے اندر خیانت کر دیتا ہے تو ان کا معاہدہ بھی ختم ہو گیا۔

دنیا کے اندر اگر انسان ایک دوسرے کا لحاظ رکھتا ہے تو معاشرتی طور پر اس کی وجہ ہوتی ہے رشتہ داری کہ آپس میں رشتہ داری اور قرابت ہے تو قرابت کی وجہ سے انسان ایک دوسرے کا لحاظ رکھتا ہے اور سیاسی سطح پر ایک دوسرے کا لحاظ رکھنے کی وجہ سیاسی معاہدے ہوتے ہیں کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ معاہدہ کر لے، ایک جماعت

دوسری جماعت کے ساتھ معاہدہ کرلے کہ تم نے ہمارا لحاظ رکھنا ہے اور ہم نے تمہارا لحاظ رکھنا ہے اور مشرکوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہ دونوں قسم کی چیزوں کے بارے میں خائن ہیں، مسلمانوں کے خلاف ان کے دلوں میں اتنا بغض اور اتنا عناد ہے کہ اگر یہ کسی صورت میں بھی قابو پاجائیں اور ان کا بس چلے نہ تو تمہارے بارے میں کسی قرابت کا لحاظ رکھنے کے لیے تیار ہیں کہ تمہیں یہ سمجھیں کہ ہمارے قریشی بھائی ہیں، ہماری برادری کے ہیں انہوں نے دوسرا نظریہ قبول کرلیا تو کیا ہوا؟ اس کو یہ برداشت کرلیں ایسی بات نہیں ہے۔

قرابت کا لحاظ بھی نہیں رکھیں گے اور قابو پانے کی صورت میں کسی ذمہ داری اور عہد کا بھی خیال نہیں رکھیں گے تو جو قوم اس قسم کی فاسق اور غدار ہو، جو اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والی نہیں ان کا عہد بھلا کیسے باقی رہ سکتا ہے یہ آیات ایسی ہیں جن کو آپ پیش گوئی پر محمول کرسکتے ہیں کہ ایسا ہوگا چنانچہ آنے والی تاریخ نے واضح کردیا کہ ایسے ہی ہوا مشرکین مکہ کی طرف سے عہد توڑا گیا اور انہوں نے اپنے حلیف قبیلے بنو بکر کی امداد کی تھی بنو خزاعہ کے خلاف جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہد تھا جیسا کہ سورۃ کی ابتداء میں تفصیل گزر چکی ہے تو پہلی آیات کا مفہوم تو یہ ہے۔

تفسیر باللفظ:

"كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ" مشرکین کے لیے عہد کیسے باقی رہے گا اللہ اور اللہ کے رسول کے نزدیک، یہاں تک کلام کرکے آگے استثناء لگا دیا گیا اور اس کلام کو اگلی آیت میں پورا کیا جائے گا، درمیان میں جملہ معترضہ آ گیا مستثنیٰ کے طور پر کہ جنہوں نے تیرے ساتھ معاہدہ کیا مسجد حرام کے پاس، حدیبیہ میں جو معاہدہ ہوا تھا وہ بھی مسجد حرام کے پاس ہی ہوا تھا کیونکہ حدیبیہ کی سرحد حرم کے متصل ہی ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ٹھہرے ہوئے تھے "فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ" جب تک وہ تمہارے لیے سیدھے رہیں "فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ" آپ بھی ان کے لیے سیدھے رہو "اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ" اپنے عہد کی پاسداری یہ تقویٰ ہے اور اللہ تعالیٰ متقین کو پسند کرتا ہے تو یہاں یہ سیاسی تقویٰ ہے اپنے عہد اور اپنی زبان کی پابندی کہ اگر کسی کے ساتھ معاہدہ کرلیا ہے تو اس کی پابندی کرو تقویٰ کا تقاضہ یہی ہے اور اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، یہ درمیان میں بات کہہ دی اور اگلی آیت ماقبل کے مضمون کے ساتھ جڑ گئی "كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ" "کیف" کے اندر اس مضمون کا اعادہ ہو گیا جو پہلے "کیف" کے بعد آیا تھا کہ مشرکین کے لیے اللہ اور اللہ کے رسول کے نزدیک عہد کیسے رہے گا جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تم پر غالب آجائیں "لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً" تو تمہارے بارے میں نہ کسی قرابت کا لحاظ کریں

اور نہ کسی عہد کا خیال کریں، غلبہ پالینے کی صورت میں یہ نہیں سمجھتے کہ تم ان کے بھائی ہو یا ان کے ساتھ تمہاری کوئی قرابت ہے، ان کے ساتھ تمہارا کوئی عہد ہے یہ دو ہی باتیں ہیں جن کی بناء پر انسان کسی کا لحاظ کرتا ہے معاشری طور پر آپس میں قرابت کا تعلق، جماعتی سطح پر سیاسی معاہدات تو جب ان دونوں کا لحاظ ان کے دل میں نہیں ہے تو ایسی صورت میں یہ عہد کیسے باقی رہے گا؟ یہ معاہدہ تم سے کرتے ہیں تو یہ اپنے منہ سے باتیں بنا کے تمہیں خوش کرتے ہیں، باتیں بنا کے تمہیں راضی کر لیتے ہیں گویا کہ تمہارے ساتھ نباہ کرنا چاہتے ہیں، تمہارے ساتھ مل جل کے رہنا چاہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ تمہیں زبان سے خوش کرتے ہیں "تَاْبٰی قُلُوْبُهُمْ" ان کے دل انکار کرتے ہیں، ان کے دل اور زبان کا ایک حال نہیں ہے، مجبوری کی بناء پر اگر یہ صلح کر لیں تو کر لیں ورنہ ان کے دل تمہیں کسی صورت میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں اس لیے جہاں بس چلے یہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے "وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ" ان میں سے اکثر فاسق ہیں، فسق کا معنیٰ ہوتا ہے "خروج عن الطاعت" اور یہاں خصوصیت کے ساتھ فسق سے معاہدہ کی خلاف ورزی مراد ہے جس کو ہم غداری سے تعبیر کرتے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کے دل میں عہد کا کوئی لحاظ نہیں، یہ غدار ہیں، یہ وفادار نہیں، یہ عہد کی پاسداری نہیں کریں گے، گڑبڑ کرنے کے عادی ہیں۔

مشرکین کی طرف سے بدعہدی کی وجہ:

اور ایسا انہوں نے کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیادار ہیں اور دنیادار کی ہمیشہ یہ خاصیت ہوتی ہے کہ جہاں اس کو مفاد نظر آتا ہے تو اس کو اپنا معاہدہ بھی یاد رہتا ہے، جہاں اس کو مفاد نظر آتا ہے وہاں رشتہ داری کا لحاظ بھی رکھے گا اور جہاں اس کا مفاد نہیں ہے یا خلاف کرنے کی صورت میں اس کا مفاد ہے تو وہ نہ پھر رشتہ داری کا لحاظ کرے اور نہ معاہدہ کا اور نہ زبان کا لحاظ کرے، حب دنیا اس کا باعث ہے اور مشرک دنیا کی محبت میں مبتلاء ہیں، دنیا کی محبت میں مبتلاء ہونے کی وجہ سے ان کو اپنا مفاد عزیز ہے، اپنا جاہ، اپنی عزت، اپنے مال اور دولت سے پیار ہے، اس مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر کہیں معاہدہ کی صورت میں ان کو کوئی مفاد ملتا نظر آتا ہے تو معاہدہ کر لیتے ہیں اور اگر کہیں معاہدہ توڑنے کی صورت میں فائدہ محسوس کریں گے تو معاہدہ توڑ دیں گے، اصل بات یہ ہے کہ ان کے سامنے آخرت نہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا یاد نہیں اگر وہ عقیدہ ہوتا تو پھر اپنا فائدہ ہو نہ ہو انسان اپنی زبان کا لحاظ رکھتا ہے کہ اللہ کے سامنے جا کر حساب دینا ہے، آخرت کا تو ان کا عقیدہ ہے ہی نہیں، ان کے سامنے تو صرف دنیا ہے تو جدھر یہ فائدہ محسوس کریں گے ادھر کو جائیں گے تو ایسے لوگوں کے عہد کا کوئی اعتبار نہیں ہوا کرتا۔

لے لیا انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے میں ثمن قلیل کو، ثمن قلیل سے دنیا کا ساز وسامان مراد ہے۔ ساری دنیا اس کا مصداق ہے، ثمن قلیل کا معنی تھوڑی سی قیمت، تھوڑی سی قیمت کا یہ معنی نہیں کہ چند پیسوں کے بدلے میں تو اللہ کی آیات کو بیچنا ٹھیک نہیں ہے اور اگر زیادہ مل جائیں تو بیچ دیا کرو، یہ ساری کائنات اللہ کی آیات کے مقابلہ میں رکھ دی جائے تو بھی وہ ثمن قلیل ہے، اللہ کی آیات کی کوئی قیمت نہیں، اس لیے کسی مال کے لالچ میں آ کے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنا چاہے وہ مال کروڑوں اربوں میں شمار کیوں نہ ہو تو بھی اللہ کے حکم کے مقابلہ میں وہ ثمن قلیل ہے تو ثمن قلیل سے دنیا مراد ہے، لے لیا انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے میں ثمن قلیل کو اور پھر انہوں نے روکا اللہ کے راستے سے یعنی صرف یہ نہیں کہ خود دنیا دار ہو گئے اور اللہ کا راستہ اختیار نہیں کرتے، صرف خود دنیا پر نہیں مرتے بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں "اِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ" جو کچھ یہ کرتے ہیں بہت برا ہے۔

کافر اگر توبہ کرلیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو:

"لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ" یہ مشرکین کا مزاج ذکر کیا گیا کہ صرف یہی نہیں کہ تمہارا لحاظ نہیں کریں گے بلکہ کسی مومن کے بارے میں ان کے دل میں اچھے جذبات نہیں ہیں، نہیں لحاظ کریں گے کسی مومن کے بارے میں کسی قرابت کا اور نہ ذمہ داری کا، یہ لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں، یہ حد پر نہیں رہتے جو معاہدہ کی حد ہے اس پر نہیں رہیں گے، جو رشتہ داری کا تقاضہ ہے اس پر نہیں رہیں گے، یہ حد سے نکلنے والے لوگ ہیں، کسی مومن کے بارے میں کوئی قرابت اور کوئی عہد ان کے نزدیک قابل لحاظ نہیں ہے اس لیے ان کے عہد کا باقی رہنا مشکل ہے تو پھر یہ چاہے تمہارے ساتھ دشمنی کریں جیسے بھی تمہیں نقصان پہنچائیں لیکن اگر اپنے طریقے سے باز آ جائیں، توبہ کرلیں، کفر و شرک چھوڑ دیں، ایمان قبول کرلیں، یہاں توبہ سے "توبہ عن الکفر و الشرک" مراد ہے اگر یہ توبہ کرلیں کفر و شرک سے اور نماز پڑھنے لگ جائیں، زکوٰۃ دینے لگ جائیں کیونکہ ایمان کا تعلق قلب کے ساتھ ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ میں مومن ہوں لیکن میں نماز نہیں پڑھتا یا کہے کہ میں مومن ہوں لیکن میں زکوٰۃ نہیں دیتا تو اس کا ایمان قابل اعتماد نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جہاد کیا اور استدلال اسی قسم کی آیات اور

روایات سے کیا ہے جن میں اللہ اور اللہ کے رسول نے بیان کیا کہ جب تک نماز نہ پڑھیں، زکوٰۃ نہ دیں اس وقت تک ان کا ایمان معتبر نہیں تو یہاں بھی اسی طرح ہے کہ نماز پڑھنے لگ جائیں اور زکوٰۃ دینے لگ جائیں پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، پھر ان کی پچھلی عداوتوں کو یاد نہیں رکھنا کہ پہلے یہ کیا کرتے رہے پھر یہ تمہارے بھائی ہیں پھر ان کے ساتھ معاملہ بھائیوں والا کرنا ہے۔

ائمہ فقہاء کے نزدیک بے نمازی کا حکم:

اور جو لوگ ایمان لا کر نماز میں غفلت برتتے ہیں جیسے آجکل ہمارے مومن بھائی وہ کہتے ہیں کہ نماز فرض ہے، فرضیت تسلیم کرتے ہیں باقی پڑھتے نہیں تو یہ ان کی عملی کوتاہی ہے، یہ بغاوت نہیں ہے، عملی کوتاہی قابل برداشت ہے بایں معنی کہ ہم ان کو کافر نہیں کہیں گے ورنہ اسلامی حکومت کو تو اب بھی حکم ہے کہ ان کو پکڑو "فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ" جو آیا تھا کہ اگر یہ نماز پڑھنے لگ جائیں اور زکوٰۃ دینے لگ جائیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو تو یہ تخلیہ سبیل اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ سے ہے اور اگر اقامت صلوۃ اور ایتاء زکوٰۃ نہیں کرتے تو تخلیہ سبیل نہیں، پھر ان کا راستہ روکا جائے گا اگر اسلامی حکومت آجائے اور پورے طریقے سے شریعت لاگو ہو جائے تو بے نمازی کو آزادانہ نہیں پھرنے دیا جائے گا اس کو پکڑا جائے گا اور اس کو کہیں گے کہ عہد کر کہ آئندہ نماز نہیں چھوڑے گا، سچی پکی توبہ کر، اگر وہ کہے کہ میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ میں نماز پڑھوں گا تو اس کو چھوڑ دو اگر وہ نماز نہیں پڑھتا بار بار تنبیہ کے باوجود نہیں پڑھتا اگرچہ کہتا ہے کہ فرض ہے، فرضیت کا قائل ہے لیکن بار بار تنبیہ کے باجود پڑھتا نہیں ہے تو آپ کے چاروں اماموں کی عدالت جو فیصلہ کرتی ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ شرعی حکومت میں اس کے لیے تخلیہ سبیل نہیں ہے تین امام کہتے ہیں کہ ایسے آدمی کو قتل کر دو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ جو بار بار تنبیہ کے باوجود نماز نہیں پڑھتا چاہے کہتا ہے کہ فرض ہے اس کو قتل کر دو یہ اسلامی حکومت میں رہ نہیں سکتا۔

اب یہ قتل کیوں کیا جائے گا؟ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ قتل سزا کے طور پر ہے ورنہ یہ کافر نہیں جس طرح زانی کو مار دیا جاتا ہے، قاتل کو قتل کر دیا جاتا ہے اسی طرح بے نمازی کو قتل کر دو اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ باقاعدہ مرتد ہے، یہ شخص حقیقتاً کافر ہو گیا اور اس کی سزا مرتد والی ہے اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ حنبلی ہیں اور ان کا مسلک ہے کہ بے نمازی کافر ہے اب یہ جتنے بھی

گیارہویں والے پیر کے نام پہ گیارہویں دیتے ہیں وہ اکثر ہی بے نمازی ہیں اب اگر یہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی عدالت میں پیش ہو جائیں تو ان میں سے کسی کو مسلمان نہیں سمجھا جائے گا سب کے متعلق وہ حکم دیں گے کہ ان کو گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دو اور ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہیں ہے، ان کا جنازہ نہیں پڑھا جائے گا یہ حال ہوگا ان کا جن کے نام پہ گیارہویں کرتے ہیں، ان کے نزدیک بے نمازی مرتد ہے، اس کا جنازہ جائز نہیں اور ان کے نزدیک وہ شخص جہنمی ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایک دودھ کا چلو دینے سے عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے قبضے میں آ گیا جو چاہے کر واب ہر چیز انہی کی ہے یہ کتنا بڑا مغالطہ ہے؟۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بے نمازی کی سزا قتل نہیں ہے ضرب شدید ہے کہ اس کی خوب پٹائی کرو اور جیل میں ڈال دو پھر تھوڑی دیر بعد پوچھو کہ نماز پڑھے گا یا نہیں اگر وہ پابندی کرنے کا عہد نہیں کرتا یا پابندی نہیں کرتا تو پھر مارو اور اسے جیل میں پھینکے رکھو حتی کہ یا تو توبہ کر لے یا وہیں مر جائے تو تخلیہ سبیل ان کے نزدیک بھی نہ ہوا۔

تارک زکوٰۃ کا حکم:

اور اسی طرح زکوٰۃ کی بات ہے کہ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ زکوٰۃ فرض ہے لیکن وہ عملاً دیتا نہیں تو ائمہ اربعہ کے نزدیک یہ مؤمن ہے، یہ کافر نہیں لیکن اگر ایک آدھا آدمی ہے تو حکومت کان سے پکڑ کے حساب لے کے زکوٰۃ وصول کرے گی اور اگر کوئی جماعت ہی اکٹھی ہو جائے تو پھر یہ باغیوں کے حکم میں ہیں پھر ان کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا جائے گا تو تارک زکوٰۃ کے لیے بھی تخلیہ سبیل نہیں ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دونوں قسم کے لوگ تھے بعض تو ویسے ہی انکار کر گئے تھے کہ ہم دیں گے ہی نہیں وہ تو مرتد تھے اور بعض ایسے تھے جو کہتے تھے کہ ہم دیں گے تو سہی لیکن حکومت کو نہیں دیں گے ایسی صورت میں پھر ان کا حکم باغیوں کا تھا یہ کافر نہیں بلکہ باغی تھے اور باغیوں کے خلاف بھی ویسے ہی جہاد کیا جاتا ہے جیسے کافروں کے خلاف کیا جاتا ہے تو اسلامی حکومت کے اندر تخلیہ تب ہی ہے جب ایمان لانے کے بعد انسان اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ بھی کرے اور اگر یہ کام نہیں کرتا چاہے مؤمن ہی کیوں نہ ہو اسلامی حکومت کے اندر اس کے لیے تخلیہ سبیل نہیں کہ اس کو آزاد نہ پھرنے دو، اسلامی حکومت میں ایسے شخص آزاد نہیں پھر سکتے، آخرت کا معاملہ آخرت میں ہوگا لیکن اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اس قسم کے لوگوں کا راستہ روکے، اسلامی حکومت میں پھرنے کی

آزادی تب ہی ہوگی جب یہ ایمان بھی لائیں اور اس کے ساتھ اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ بھی کریں "فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ" پھر یہ تمہارے دینی بھائی ہیں "وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ" ہم علم والے لوگوں کے لیے، سمجھدار لوگوں کے لیے آیات کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔

کافر اگر بدعہدی کریں تو ان کے اماموں سے لڑو:

"وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ" اگر ان لوگوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں عہد کے بعد، دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات عہد توڑنے سے پہلے کی ہیں، یہ ایک قسم کی پیش گوئی کر رہی ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں "وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ" اور تمہارے دین کے بارے میں طعن وتشنیع کرنے لگ گئے جس طرح پہلے مذاق کرتے تھے، استہزاء کرتے تھے، طعن وتشنیع کرتے تھے اگر اسی طرح کرنے لگ گئے "فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ" اس سے مراد قریشی ہیں، مشرکین مکہ چونکہ وہی کفر کے امام تھے، دنیا کی قیادت انہی کے ہاتھ میں تھی، یہ بڑے سمجھے جاتے تھے، انہی کی قیادت میں سارا کام ہوتا تھا بیت اللہ کے مجاور ہونے کی حیثیت سے، ویسے بھی آپ نے سن لیا کہ انہوں نے بیت اللہ کے آس پاس اور بیت اللہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، تین سو ساٹھ گنتی کے ہوں تو ٹھیک ہے جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سال کے تین سو ساٹھ ہی دن ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح ہر دن نئے بت کو پوجتے ہوں گے اور کسی کے متعلق کوئی دن کوئی مہینہ لگا رکھا ہوگا اور کسی کے متعلق کوئی دن اور کوئی مہینہ لگا رکھا ہوگا ورنہ اصل بات یہ تھی کہ عرب کے جتنے قبائل تھے ان میں سے ہر ایک نے اپنا اپنا بت علیحدہ بنایا ہوا تھا، کسی کا لات تھا، کسی کا عزیٰ تھا، کسی کا منات تھا، کسی کا کچھ تھا تو انہوں نے تمام قبائل کے بت بیت اللہ میں جمع کیے ہوئے تھے گویا کہ ایک قومی رشتہ اور قومی اتحاد کیا ہوا تھا تا کہ سارے کے سارے مشرک قبیلے بیت اللہ کو اپنی عبادت گاہ سمجھیں اور اپنی اسی نسبت کے ساتھ وہ بیت اللہ کی طرف آئیں اور یہ سمجھیں کہ اس میں ہمارا حصہ بھی ہے تو ہر قبیلہ کا بت انہوں نے بیت اللہ میں رکھا ہوا تھا۔

اس طرح گویا کہ مذہبی مرکزیت مکہ معظمہ میں تھی اور مشرک دنیا کے یہ قائد تھے اس لیے ان کو "فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ" کے ساتھ تعبیر کیا ہے کہ پھر کفر کے پیشواؤں اور اماموں کے ساتھ خوب لڑو، یہ کفر کے امام ہیں، مقتداء ہیں، پیشواء ہیں اور جب ان کا سر کوٹا جائے گا تو یوں سمجھو کہ شرک والی دنیا کی مرکزیت ختم ہو جائے گی، پھر لڑو کفر کے

اماموں کے ساتھ "اِنَّھُمْ لَآ اَیْمَانَ لَھُمْ" بے شک ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں یعنی معاہدہ دوطرفہ ہوا کرتا ہے ایک طرف کا نہیں ہوتا، ایک فریق اگر معاہدہ کو توڑ دے تو پھر آپس میں اٹھائی ہوئی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہوا کرتا، یہ معاہدہ دوطرفہ چیز ہے صرف ایک طرف کی پابندی ضروری نہیں "اِنَّھُمْ لَآ اَیْمَانَ لَھُمْ" ان کے لیے کوئی قسمیں نہیں "لَعَلَّھُمْ یَنْتَھُوْنَ" تا کہ یہ اپنی شرارتوں سے باز آ جائیں۔

کافروں سے لڑنے کا حکم اور نصرت کا وعدہ:

جیسے آپ کی خدمت میں پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی آیات کے اترنے کی ترتیب اور ہے اور ان کو قرآن کریم میں رکھنے کی ترتیب اور ہے، بسا اوقات آیات اتری تو ہوتی ہیں وقفہ کے ساتھ لیکن سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے اشارہ پا کے ان کو اکٹھا کروا دیتے تھے جیسے سورۂ انفال میں آپ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ پہلے ایک دس کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا تھا اور بعد میں ایک کو دو کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا اور وہ دونوں آیتیں اکٹھی کر دی گئیں حالانکہ ان کے درمیان وقت کے اعتبار سے بڑا فاصلہ ہے۔

یہاں بھی اسی طرح وقت کے اعتبار سے فاصلہ ہے کہ پہلی آیات پیش گوئی کے طور پر ہیں کہ یہ ایسا کریں گے اور جب یہ ایسا کریں تو پھر تم نے بھی عہد کی رعایت نہیں رکھنی اور ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں، جب ان کی طرف سے خیانت ہو جائے تو پھر تم نے بھی کوئی لحاظ نہیں رکھنا اور بعد میں جس وقت عہد ٹوٹ گیا جیسا کہ وہ تقریباً دو سال کے بعد ٹوٹا تو اس معاہدہ کے ٹوٹنے کے بعد اب برانگیختہ کیا جا رہا ہے کہ اب ان کا سر کوٹو۔

"اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ" کیا تم نہیں لڑو گے ایسے لوگوں کے ساتھ، یہ ابھارنے والی آیات ہیں، کیا تم ایسے لوگوں کے خلاف نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں اور انہوں نے رسول کو نکالنے کا قصد کیا تھا، یہ پچھلی کاروائی یاد دلا دی کہ یہ ایسے شریر ہیں کہ پہلے سے ہی انہوں نے اللہ کے رسول کو برداشت نہیں کیا، نکالنے کا قصد یعنی نکالنے کے لیے کاروائی کی، یہ نکلنے کی نسبت ان کی طرف کی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکلنا اللہ کے حکم سے ہوا ورنہ جب تک اللہ نے اجازت نہیں دی تھی اس وقت تک چاہے مشرک کتنا ہی زور کیوں نہ لگاتے رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے نہیں نکلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست اللہ کے حکم اور اللہ کی حکمت کے تحت مکہ معظمہ سے نکلے ہیں اس لیے ان کے قصد کے اوپر تنبیہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے برداشت نہیں کیا بلکہ اپنے

شہر سے نکالنے کے لیے انہوں نے سازشیں کیں اور انہوں نے قصد کیا، کاروائیاں کیں، منصوبے بنائے یہ ان کی خباثت کی طرف اشارہ ہے۔

"وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ" اور بڑی بات یہ ہے کہ پہلے چھیڑ چھاڑ بھی یہی کر رہے ہیں، "أَتَخْشَوْنَهُمْ" کیا تم ان کے مقابلہ میں آنے سے ڈرتے ہو؟ کیا تمہیں ان سے ڈر لگتا ہے؟ "فَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ" اللہ زیادہ حق رکھتا ہے کہ تم اس سے ڈرو "إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ" اگر تم ایمان والے ہو، اور اللہ سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے اور جب اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ "قَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ" کہ جب یہ قسمیں توڑ دیں گے تو پھر تم نے ان کفر کے پیشواؤں سے لڑنا ہے اب اگر تم نہیں لڑو گے تو گویا کہ تم اللہ سے نہیں ڈرتے، اللہ سے ڈرنا چاہیے اور کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے اس لیے ان کے ساتھ لڑو۔

"قَاتِلُوهُمْ" لڑو ان کے ساتھ جس وقت تم ان سے لڑو گے، قتال ہو گا، مقابلہ ہو گا "يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ" اللہ انہیں عذاب دے گا تمہارے ہاتھوں کیونکہ ہمیشہ سے اللہ کی عادت یہی چلی آرہی ہے کہ جب کوئی قوم اپنے میں سے اپنے رسول اور نبی کو نکال دیتی ہے تو پھر وہ قوم بچنے کی حقدار نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ اگر تو نکلنے والے مؤمن تھوڑے اور کمزور ہوتے ہیں پھر تو قوم پر براہ راست آسمان کی طرف سے عذاب آتا ہے اور قوم کو برباد کر دیتا ہے اور اگر مؤمنین کی جماعت طاقتور ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ انہی کے ہاتھوں ان کی پٹائی کروا دیتا ہے تو مشرکین کے لیے یہی عذاب تجویز ہوا تھا، آسمان سے ان کے اوپر عذاب نہیں آیا تھا بلکہ اللہ کی حکمت کے تحت اور اس میں بھلا تھا مشرکین مکہ کا کہ ان کی پٹائی مؤمنین کے ہاتھوں کروائی جارہی ہے تا کہ ان کے لیے توبہ کرنے کا موقع باقی رہ جائے ورنہ اگر آسمان کی طرف سے عذاب آجاتا جو کہ جڑ ختم کرنے والا ہے تو پھر ان کو سنبھلنے کا کوئی موقع نہ ملتا۔

لڑو ان سے اللہ عذاب دے گا انہیں تمہارے ہاتھوں اور اللہ انہیں رسوا کرے گا، ان کی عزت ملیامیٹ ہو جائے گی "وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ" اور اللہ ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا اور مؤمنین کے دل اور سینے ٹھنڈے کر دے گا یعنی مؤمنین کے دل میں جو جلن ہے خاص طور پر وہ مؤمنین جو مکہ معظمہ میں مشرکین کے ہاتھوں پٹتے رہے ان کے دل کے اندر جو ایک آگ بھڑکی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے ان کی پٹائی کروا کے، ان کو رسوا کروا کے ان مؤمنین کے دل ٹھنڈے کر دے گا۔

اور ایسا ہوتا ہی ہے ایک ظالم جس وقت ظلم کرتا ہے اور مظلوم اس سے کوئی انتقام نہیں لے سکتا تو دل میں ایک تڑپ تو پیدا ہوتی ہے کہ یہ کسی طرح برباد ہو تو جس وقت اس ظالم پر کوئی عذاب آتا ہے تو پھر کہتے ہیں کہ اب دل ٹھنڈا ہوا ہے "وَیَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ" کا یہی معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والے لوگوں کے دلوں کو شفا دے گا "وَیُذْهِبْ غَیْظَ قُلُوْبِهِمْ" اور ان کے دلوں کی جلن کو دور کر دے گا "وَیَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ" اور جب تم ان کے ساتھ جہاد کرو گے تو ان میں ایسے بھی ہوں گے جن کو اللہ ایمان کی توفیق دے دے گا چنانچہ ایسا ہوا اور بہت سارے لوگ مسلمان ہو گئے "وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ" اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

"اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَکُوْا وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ" کا مفہوم:

اگلی آیات کا تعلق بھی ترغیب کے ساتھ ہی ہے "اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَکُوْا وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ" کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے یعنی صرف کلمہ پڑھ لیا اور پھر تمہیں وفاداری کا تمغہ دے دیا جائے گا کہ یہ اللہ کے وفادار ہیں ایسی بات نہیں بلکہ اللہ تو آزمائشوں کی بھٹی میں ڈالے گا اور آزمائشوں میں ڈال کے دیکھے گا کہ کون اپنے ایمان میں سچا ہے اور کون وقت آنے پر پیچھے ہٹتا ہے، اب دیکھنا ہے کہ کون تم میں سے جہاد کرنے والا ہے اور یہاں جہاد خصوصیت کے ساتھ اس لیے مطلوب ہے کہ یہاں براہ راست اپنے رشتہ داروں سے ٹکر ہے، اپنی برادری سے ٹکر ہے کہ دیکھیں کون جہاد کرتا ہے اور کون ایسا ہے کہ جس کا تعلق اللہ اور اللہ کے رسول اور مؤمنین سے ہے چاہے وہ مؤمن رشتہ دار ہیں چاہے نہیں لیکن ایمان کے رشتہ کی بناء پر قلبی تعلق اللہ، اللہ کے رسول اور مؤمنین سے ہے اور ان کے علاوہ کسی کو ہم راز نہیں بنایا اور کون ایسا ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول اور مؤمنین کو چھوڑ کر یا ان سے تجاوز کر کے غیروں سے بھی راز داری رکھتا ہے اللہ تعالیٰ امتحان میں ڈال کے یہ آزمائش کرے گا۔

اب جہاد کا حکم آ گیا جو جہاد میں بڑھ چڑھ کے حصہ لے گا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا تعلق صرف اللہ اور اللہ کے رسول اور مؤمنین سے ہے کافروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں چاہے وہ جتنے بھی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہوں اور اگر دل میں کوئی گڑبڑ ہوگی وہ بھی پتہ چل جائے گا، کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے یعنی تمہیں کسی آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا "وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا مِنْکُمْ" "لما" اور "لم" کا فرق آپ جانتے ہیں کہ "لم" کے اندر تو صرف ماقبل کی نفی ہوتی ہے، مابعد کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہوتا اور "لما" کے اندر ماضی میں فعل کی نفی ہوتی ہے اور آئندہ کے لیے توقع کا اظہار ہوتا ہے، اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے ابھی جدا کر کے جانا

نہیں، ظاہری طور پر جدا جدا نہیں کیے جس کا مطلب یہ ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اب جدا جدا کیے جائیں گے، پتہ چلے گا کہ کون صحیح مجاہد ہے، کون اللہ اور اللہ کے رسول اور مؤمنین کے سے صحیح تعلق رکھنے والا ہے یا اس کے دل کا تعلق کسی اور کے ساتھ بھی ہے، اب اللہ تعالیٰ جدا جدا کر کے رہے گا "لما" کے اندر یہ مستقبل کی طرف اشارہ نکل آیا کہ ابھی تک اللہ نے جدا جدا کر کے نہیں جانا ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور جنہوں نے نہیں بنایا اللہ کے علاوہ اور نہ اللہ کے رسول کے علاوہ اور نہ مؤمنین کے علاوہ دوست "وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ" اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم کرتے ہو۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ

نہیں ہے مشرکوں کے لیے کہ وہ آباد کریں اللہ کی مسجدوں کو اس حال میں کہ وہ شہادت دینے والے ہیں

عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ

اپنے نفسوں پر کفر کی ، یہی لوگ ہیں جن کے اعمال ضائع ہوگئے

وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ

اور جہنم میں یہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۱۷﴾ سوائے اس کے نہیں کہ آباد کرتا ہے اللہ کی مسجدوں کو

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ

وہ شخص جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یوم آخرت پر اور نماز قائم کرتا ہے

وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ

اور زکوۃ دیتا ہے اور کسی سے نہیں ڈرتا اللہ کے علاوہ قریب ہے کہ یہی لوگ

اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ

ہوں گے سیدھا راستہ پانے والے ﴿۱۹﴾ کیا بنالیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ

مسجد حرام کے آباد کرنے کو اس شخص کے عمل کی طرح جو اللہ پر ایمان لایا اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اس نے جہاد کیا

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي

اللہ کے راستے میں ، دونوں برابر نہیں ہیں۔ اللہ کے نزدیک ، اللہ ہدایت نہیں دیتا

الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ

ظالم لوگوں کو ﴿۱۹﴾ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا

سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ

اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ یہ زیادہ بڑے ہیں ازروئے درجے کے

اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ

اللہ کے نزدیک اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں ﴿۲۰﴾ بشارت دیتا ہے ان کو ان کا رب اپنی طرف سے رحمت کی

مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ

اور رضا مندی کی اور جنات کی ان جنات میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی خوشحالی ہے ﴿۲۱﴾ ہمیشہ یہ اس میں

فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

رہنے والے ہوں گے بے شک اللہ کے ہاں اجر عظیم ہے ﴿۲۲﴾ اے ایمان والو!

اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا

نہ بنایا کرو اپنے باپ دادا کو اور اپنے بہن بھائیوں کو دوست اگر وہ پسند کریں

الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

کفر کو ایمان کے مقابلہ میں اور جو ان کو دوست بنائے گا تم میں سے یہی لوگ

الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ

ظالم ہیں ﴿۲۳﴾ آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ دادا اور تمہاری اولاد اور تمہارے بھائی بہن

وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ

اور تمہاری بیویاں اور تمہارا قبیلہ اور مال جو تم نے کمائے اور تجارت

تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

جس کے مندے پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو زیادہ محبوب ہیں تمہیں اللہ

وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ

اور اللہ کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد کرنے کے مقابلہ میں تو انتظار کرو حتیٰ کہ لے آئے اللہ اپنا حکم

وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾ ع

اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ان کے مقصد تک نہیں پہنچاتا ﴿۲۴﴾

تفسیر:

مشرکین کے لیے مناسب نہیں کہ وہ مسجد حرام کے متولی رہیں:

جاہلیت کے زمانے میں مسجد حرام کی تولیت قریش کے لیے تھی اور سرور کائنات ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں رہے اس وقت بھی متولی مشرک ہی تھے، مدینہ منورہ میں تشریف لے جانے کے بعد بھی تولیت انہی کے لیے رہی مسجد حرام کو بنانا، ظاہری طور پر اس کی آرائش کا خیال کرنا اور اس کا انتظام کرنا جس طرح آجکل بھی مساجد میں چٹائیوں، پانی، لوٹوں کا انتظام کیا جاتا ہے، بیت اللہ کی جتنی ضروریات تھیں وہ سب قریش کے ذمہ تھیں اور قریش ان خدمات کو سرانجام دیتے تھے اور یہ خدمات ان کے لیے باعث فخر تھیں، ان خدمات کے اوپر یہ فخر کرتے تھے اور لوگوں کے اندر انہی خدمات کی وجہ سے ان کو عزت اور جاہ بھی حاصل تھا۔

جس وقت سرور کائنات ﷺ نے مکہ معظمہ کو فتح کیا تو فتح کرنے کے بعد یکدم ان کو وہاں سے ختم نہیں کیا بلکہ ان مشرکوں کی رسوم جو پہلے سے چلی آرہی تھیں بت تو توڑ دیے لیکن بعض لوگوں کے ساتھ چونکہ معاہدہ تھا بعض کو امن دے دیا تھا تو یکدم مشرکین کا تعلق ختم نہیں کیا گیا بلکہ ایک سال آزادانہ اردگرد سے مشرک آتے رہے اور اپنے رسم ورواج کے مطابق بیت اللہ کا طواف بھی کرتے تھے اور اپنے رسم ورواج کے مطابق عبادت بھی کرتے تھے۔

چنانچہ ننگا طواف کرنے کا جو رواج پڑ گیا تھا یہ طواف بھی اسی طرح جاری تھا، تفصیل آپ کے سامنے پہلے عرض کی تھی کہ نو ہجری میں یعنی فتح مکہ کے تقریباً چودہ مہینے بعد کیونکہ مکہ فتح ہوگیا آٹھ ہجری رمضان المبارک میں شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ یہ اس سال کے تین مہینے اور اگلا سارا سال اور پھر ذی الحجہ تقریباً پندرہ مہینے ہوگئے، پندرہ مہینے کے بعد جب حج آیا تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے بھیجا تھا اور آپ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی بھیجا تھا تو اس وقت منیٰ، عرفات اور ہر جگہ یہ اعلان کر دیا گیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہیں آسکتا گویا کہ مشرکین کا داخلہ نو ہجری میں ممنوع قرار دے دیا گیا، آئندہ کے لیے ان کا داخلہ ممنوع ہوگیا جس قسم کی یہ شرکیہ رسمیں کرتے تھے ان پر پابندی لگا دی گئی۔

اس رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ مشرکین کی انہی باتوں کی تردید کرتا ہے کہ مسجد کی خدمت اور تولیت کے کام جو ہیں تم اس کے حقدار نہیں، سورۃ انفال میں بھی آیا تھا "اِنْ اَوْلِیَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ" کہ مسجد کے متولی متقی ہی

ہو سکتے ہیں کیونکہ مسجد آباد کی گئی ہے اللہ کے نام کے لیے، اللہ کی عبادت کے لیے، مسجد اصل میں توحید کا مرکز ہوتا ہے اگر اس مسجد کے اندر مسجد کے مقصد کے خلاف ہی حرکتیں شروع ہو جائیں تو ظاہری طور پر اگرچہ اس کے اینٹ پتھر درست ہیں حقیقت کے اعتبار سے مسجد کو ویران کر دیا گیا ہے، جس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی وہ مقصد تو فوت ہو گیا۔

اب ایک مسجد کا متولی ہے وہ اس کے اندر ہی شرکیہ کام شروع کر دے اب صرف اس وجہ سے کہ وہ لوٹوں کا انتظام کرتا ہے، چٹائیاں بچھاتا ہے اس کو مسجد کا متولی رہنے دیا جائے ایسی بات نہیں بلکہ اس صورت میں اس کا مسجد پہ حق باقی رہنے نہیں دیا جائے گا کیونکہ یہ تو مقصد کے خلاف ہے، مقصد کو محفوظ رکھتے ہوئے اس قسم کی خدمات قابل تعریف ہیں اور باعث ثواب ہیں کہ مسجد کے مقصد کو بھی محفوظ رکھے کہ اس میں نماز پڑھے اور پڑھنے دے، اللہ کا نام لے اور دوسروں کو بھی لینے دے، اللہ تعالیٰ کی توحید کا پرچار کرے، سرور کائنات ﷺ کے دین کی تعلیم اور تعلم کا سلسلہ جاری ہو پھر اس کے ساتھ ساتھ اگر وہ مصلیٰ اور چٹائی کا انتظام کرتا ہے، پانی کی دیکھ بھال کرتا ہے، صفائی کا خیال کرتا ہے تو باعث تعریف ہے۔

لیکن اگر وہ اس میں قوالی شروع کر دے اور اس میں غیر اللہ کے لیے کام ہونا شروع ہو جائیں تو پھر صرف اس وجہ سے کہ جھاڑو دیتا ہے، صفیں بچھاتا ہے، پانی کا انتظام کرتا ہے تو اس سے اس کا حق مسجد کے اوپر باقی رہنے نہیں دیا جائے گا۔

مشرکین کی یہی بات تھی کہ جس مقصد کے لیے اس بیت اللہ کو تعمیر کیا گیا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو آباد کیا تھا ان مشرکوں نے وہ مقصد تو بالکل ہی ختم کر دیا اب ظاہری خدمات ان کے لیے کیا باعث فخر رہ گئیں، ان کا اب اس کے اوپر کوئی حق نہیں ہے اس لیے اب ان کو معزول کر دیا گیا، ان کے حق کو سرے سے ختم کر دیا گیا اور یہ کہہ دیا گیا کہ یہ تمہاری خدمات بے جان ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں، پہلی آیات کے اندر یہی اعلان کیا گیا ہے کہ مشرکوں کے لیے یہ مناسب ہی نہیں، مشرکوں کے لیے یہ لائق نہیں ہے کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں، مساجد اللہ جمع کا صیغہ آ گیا حالانکہ یہاں قصہ صرف مسجد حرام کا ہے اور قاعدہ عام بتایا گیا کہ یہ صرف مسجد حرام کی بات نہیں ہے، کسی بھی مسجد کی تولیت مشرک کو حاصل نہیں، مشرکوں کی شان کے لائق نہیں کہ مسجدوں کو آباد کریں ان کو تولیت نہیں مل سکتی تو مسجد حرام کی تولیت سے منسوخ کرنا گویا کہ ساری دنیا کی مسجدوں کی تولیت سے

منسوخ کرنا ہے کوئی مسجد ہو مسجد حرام یا کوئی اور مشرک لوگ اس کی تولیت کے لائق نہیں، نہیں لائق مشرکوں کے وہ آباد کریں اللہ کی مساجد کو اس حال میں کہ وہ اپنے نفسوں کے اوپر کفر کا اقرار کرنے والے ہیں، اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ ہم کافر ہیں۔

مشرکین مکہ واحد قوم ہے جو اپنے شرک کا اقرار کرتی ہے:

یہ اقرار کس طرح کرتے تھے؟ مشرکین مکہ کی نوعیت کچھ عجیب قسم کی ہے، مشرک تو ہم نے نصاریٰ کو بھی ثابت کیا ہے، مشرک تو ہم نے یہود کو بھی ثابت کیا ہے لیکن نصاریٰ ہوں یا یہود ان میں سے کوئی شخص ایسا نہیں کہ جو اپنی زبان سے اپنے آپ کو مشرک کہنا گوارہ کرے اور یہ کہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں، اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو الٰہ مانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس بات کا اقرار کرنے کے لیے تیار نہیں، آج بھی نہیں کہتے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو بھی مانتے ہیں، الٰہ ایک نہیں بلکہ متعدد ہیں یہ بات نہ نصاریٰ مانیں نہ یہود مانیں اور نہ وہ لوگ مانیں جن کو آپ مشرک کہتے ہیں یہ اپنے آپ کو مشرک نہیں کہتے، ان کو اگر آپ مشرک ثابت کریں گے تو استدلال کر کے مشرک ثابت کریں گے کہ ان کے بعض اقوال شرک پر دلالت کرتے ہیں، ان کے بعض اعمال وافعال اس قسم کے ہیں جو مشرکانہ ہیں جس سے شرک لازم آ گیا۔

ایک ہوتا ہے التزام کفر اور ایک ہے لزوم کفر، ایک التزامی شرک ہے اور لزوم شرک ہے، التزام کا معنی تو یہ ہے کہ مان لیا کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو الٰہ کہتے ہیں یا اس نے مان لیا کہ ہاں میں آخرت کا منکر ہوں یہ تو التزام ہے کہ اس نے خود تسلیم کر لیا اس میں تاویل کی گنجائش نہیں ہوتی اور ایک ہے لزوم، لزوم کا مطلب یہ کہ تو نے جو بات کی ہے اس سے شرک لازم آتا ہے اگرچہ تیرا مقصد یہ نہیں لیکن اس بات سے شرک لازم آ گیا تو التزام میں اور لزوم میں فرق ہوتا ہے، اب یہ لوگ ایک دوسرے کی عبارتیں لیتے ہیں اور عبارتیں لے کر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں دیکھو! یہاں سے کفر ثابت ہو گیا، یہاں سے شرک ثابت ہو گیا لیکن جو متکلم ہے یا کاتب ہے اس عبارت کو لکھنے والا یا اس کلمہ کو بولنے والا وہ کہتا ہے بالکل یہاں سے شرک ثابت نہیں ہوتا، یہاں سے کفر ثابت نہیں ہوتا اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جس سے تم کفر نکالتے ہو اس کی نوعیت اور ہے اور ایک آدمی کہتا ہے ہاں میں اس چیز کا قائل ہوں جو کافر ہے وہ کہتا ہے میں آخرت کو نہیں مانتا تو اس نے اپنے اوپر کفر کا اقرار کر لیا تو یہ مکہ والے جو تھے یہ اللہ کے علاوہ بتوں کے لیے یا دوسری چیزوں کے لیے اللہ کا لفظ استعمال کرتے تھے "نَعْبُدُ مَا يَعْبُدُ آبَاءُنَا" ہم تو

اسی چیز کی عبادت کریں گے جس کی ہمارے آباء کرتے تھے " اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا " کیا اس نے سارے خداؤں کو چھوڑ کے ایک ہی الٰہ بنا دیا، یہ باقیوں کے لیے آلہہ کا لفظ استعمال کرتے تھے، جب اللہ کے علاوہ دوسروں کے لیے الٰہ کا لفظ استعمال کرتے تھے تو گویا کہ یہ شرک کا اقرار کرتے ہیں اور شرک وکفر ایک ہی چیز ہے، اللہ کو ماننے کے اس کے ساتھ کسی کو شریک بنالیا جائے یہ ایسے ہے گویا کہ اللہ کو مانا ہی نہیں اور سرے سے اللہ کا انکار کر دیا جائے تو بھی کفر ہے تو اسی طرح ان کے جو عقائد تھے گویا کہ وہ شرک کا اقرار تھا۔

مشرکین کے اقرارِ شرک کی دلیل:

جس وقت یہ حج کے لیے آتے، طواف کے لیے آتے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ تلبیہ پڑھتے تھے جس طرح سے ہم تلبیہ پڑھتے ہیں " لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ " یہ تلبیہ جو حاجی پڑھتا ہے، طواف کرتا ہوا پڑھتا ہے، حج کے سفر میں بھی پڑھتا ہے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ مشرک بھی تلبیہ پڑھتے تھے اور ان کا تلبیہ کس طرح سے ہوتا تھا " لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ " جب یہاں تک پہنچتے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں " قَطْ قَطْ " بس بس یہیں ٹھہر جاؤ، آگے نہ بولنا " لَاشَرِيْكَ لَكَ " جس وقت کہتے تھے تو آپ ﷺ فرماتے " قَطْ قَطْ " بس یہیں ٹھہر جاؤ آگے نہ بولو لیکن وہ آگے کہتے تھے " اِلَّا شَرِيْكًا تَمْلِكُهٗ وَمَامَلَكَ " یہ ساتھ وہ اضافہ کرتے تھے، جب وہ " لَاشَرِيْكَ لَكَ " پہ پہنچتے تو حضور ﷺ فرماتے ٹھہر جاؤ آگے نہ بولنا کیونکہ یہاں ٹھہر گئے تو مطلب صاف ہے، وہ آگے کہتے " اِلَّا شَرِيْكًا تَمْلِكُهٗ وَمَامَلَكَ " ہاں ایسے شریک تیرے ہیں جو تیرے کنٹرول میں ہیں تو ان کے کنٹرول میں نہیں یعنی وہ تیرے چھوٹے ہونے کی حیثیت سے تیرے ساتھ شریک ہیں " تَمْلِكُهٗ وَمَامَلَكَ " ایسا شریک ہے جس کا تو مالک ہے وہ تیرے مالک نہیں، وہ ساتھ یہ اضافہ کرتے تھے تو جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ شریک بنانے کا اقرار کرتے تھے کہ اللہ کے شریک بھی ہیں چاہے انہوں نے اپنے طور پر حیثیت ان کی مملوکوں جیسی بنائی، چھوٹے ہونے کی بنائی لیکن " شریکًا " کا لفظ استعمال کرتے تھے، اپنے معبودوں کو شرکاء کہتے تھے قرآن کریم میں کتنی جگہ شرکاء کا لفظ ہے، اپنے معبودوں کے لیے آلہہ کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے، الٰہ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

یہ ہے " شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ " کہ اتنے زیادہ ڈھیٹ ہیں کہ اپنے نفسوں کے اوپر اقرار کرتے ہیں کفر کا اور پھر بھی اللہ کے گھروں کی آبادی کا ان کو حق حاصل ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس حال میں کہ اقرار کرنے

والے ہیں اپنے نفسوں پر کفر کا، یہ لوگ ان کے اعمال ضائع ہو گئے، اعمال سے مراد عمارت مسجد وہ مسجد حرام والے اعمال کہ مسجدوں کی خدمت کرنے کے لیے چاہے یہ کیسے ہی اچھے اچھے کام کرتے ہیں، مسجدوں کی خدمت کرتے ہیں، آنے والوں کی خدمت کرتے ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے تو یہ ساری کی ساری کاروائیاں ضائع ہیں، ایمان اگر نہ ہو تو یہ سارے اعمال کوئی حیثیت نہیں رکھتے، ان اعمال میں اگر روح ہے تو ایمان کے ساتھ ہے، بغیر ایمان کے اگر یہ کام کیے جائیں تو یہ ضائع ہیں ان کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رحمت نہیں آسکتی "اعمالھم" سے یہی اعمال مراد ہیں جو مسجد کی خدمت سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو وہ لوگ کرتے تھے یہ سب ضائع ہیں "وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ" یہ ان کی مسجد کی خدمت ان کو جہنم سے نجات نہیں دلاسکتی، جہنم کے اندر یہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

قرب قیامت میں مساجد کا حال:

سوائے اس کے نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کرتا ہے وہ شخص جو اللہ پر ایمان لائے، یوم آخرت کے ساتھ ایمان لائے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے اور اللہ کے علاوہ کسی سے ڈرے نہیں، یہ لوگ ہیں جن کو مسجد آباد کرنے کا حق ہے اور انہی کی وجہ سے مسجدوں کی آبادی ہے، مسجدوں کے آباد کرنے کا حق بھی انہی کا ہے اور یہی لوگ وہاں جائیں، جا کر اللہ کو یاد کریں، عبادت کریں اور یہی حقیقت میں مسجدوں کی آبادی ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر زمانے کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا یہ کتاب العلم مشکوٰۃ شریف میں روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں "لَا يَبْقٰى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهٗ عُلَمَاءُ هُمْ شَرٌّ مَّنْ تَحْتَ أَدِيْمِ السَّمَاءِ" اور اسی روایت میں یہ لفظ ہیں کہ "مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى" کہ ایک وقت ایسا آجائے گا کہ نشانات ہی نشانات اس کی رسوم باقی رہ جائیں گی حقیقت اس کی اٹھ جائے گی اور اسلام کا صرف نام ہی باقی ہوگا حقیقت اس کی بھی اٹھ جائے گی جو اسٹیج پر چڑھتا ہے اسلام اسلام کا نعرہ لگاتا ہے، جس نے اپنا کام نکالنا ہوتا ہے جتنا یہ لیڈر طبقہ اسلام کو پکارتا ہے کوئی دوسرا نہیں پکارتا ہے، اسلام زندہ باد کے نعرے جتنے آج لگتے ہیں کسی زمانے کے اندر نہیں لگتے تھے لیکن جہاں تک اس کی حقیقت کا تعلق ہے وہ بالکل ختم ہے صرف نام ہی نام باقی ہے، لوگوں نے اپنا مقصد نکالنے کے لیے اس کو استعمال کیا اسی وقت کے بارے میں ہے کہ "مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى" اب یہ دو لفظ آگئے کہ مسجدیں ہوں گی تو عامرة، عامرة بھی فرمایا "وَهِيَ خَرَابٌ مِّنَ

الهُدٰی "لیکن ہدایت سے ویران ہوں گی، آباد ہوں گی بظاہر لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی یہاں عامرۃ سے مراد ہے کہ بڑی ٹیپ ٹاپ کی ہوں گی، بڑی خوبصورت بنائی ہوئی ہوں گی، قالینیں بچھی ہوئی ہوں گی، دریاں بچھی ہوئی ہوں گی، فانوس لگے ہوئے ہوں گے، قمقمے چمک رہے ہوں گے، زیب وزینت خوب کی ہوئی ہوگی جس سے بظاہر لگے گا کہ بڑی آباد ہے لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی، ہدایت کی بات اندر سے نہیں ہوگی یہ ایک ظاہری ڈھانچہ ہے لیکن جس مقصد کے لیے مسجد بنائی گئی کچھ پتہ نہیں، یہ ساری کی ساری بات آجکل آپ کے سامنے ہے دیہاتوں میں جا کر دیکھ لو، مسجدیں بنی ہوئی شاندار ہیں سب کچھ ہوگا لیکن نماز پڑھنے والا موجود نہیں جس طرح سے علامہ اقبال رحمہ اللہ نے اپنے زمانے کے اعتبار سے فرمایا کہ

مسجدیں مرثیہ خواہ ہیں کہ نمازی نہ رہے

یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

تو یہ ظاہری آبادی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے ویرانی ہے اب جس طرح مسجدوں کے اندر شور کرتے ہیں، بدتمیزیاں کرتے ہیں، اچھلتے ہیں، کودتے ہیں اور دنیا کی باتیں ہوتی ہیں تو ظاہری طور پر مسجد اگر خوبصورت بنی ہوئی ہے تو یہ کیا ہے؟

یہ اللہ والے مسجد میں جا کے بیٹھیں اور صحیح طریقے کے مطابق اللہ کی عبادت کریں تو مسجد کی آبادی اسی میں ہے اس لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد کا خیال رکھتا ہے، مسجد میں آتا جاتا ہے، حاضری پابندی سے دیتا ہے تو اس کے لیے گواہی دے دیا کرو کہ یہ مؤمن ہے کیونکہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسجدوں کو آباد کرنا یہ مؤمنوں کا ہی کام ہے، اب وہاں جا کے اللہ کا نام لیا جائے اور اللہ کے دین کی اشاعت کی جائے، پڑھا پڑھایا جائے، نماز پڑھی جائے اور نوافل پڑھے جائیں، تلاوت کی جائے اور دین کا تذکرہ کیا جائے، دین کی باتیں ہوں حقیقت کے اعتبار سے مسجد کی آبادی یہ ہے۔

ایمان بالرسول کے بغیر ایمان باللہ کا کوئی اعتبار نہیں:

سوائے اس کے نہیں کہ مسجدوں کو آباد وہ کرتے ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور ایمان بالرسول اس میں خود آ گیا کیونکہ ایمان باللہ معتبر تب ہی ہے جو ایمان بالرسول کے ساتھ ہو، جو رسول کی وساطت سے لایا جائے، رسول کا واسطہ چھوڑ کر اگر کوئی اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے تو نہ ماننے کے برابر ہے۔

چنانچہ مشکوۃ شریف میں کتاب الایمان میں آپ نے پڑھا وفد عبدالقیس کی روایت میں" اَمَرَهُمْ بِالْاِيْمَانِ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایمان باللہ کا حکم دیا پھر پوچھا کہ " اَتَدْرُوْنَ مَاالْاِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ" تمہیں پتہ ہے کہ ایمان باللہ کیا ہوتا ہے تو جس وقت انہوں نے آگے سے کہا" اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب یہی دیا کہ ایمان باللہ یہ ہے کہ " شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ "اس کی بنیاد اس پر ہی رکھی کہ اللہ کی توحید کی شہادت اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دینا ہی ایمان ہے، بہرحال "ایمان باللہ وحدہ " کی تفصیل یہی فرمائی کہ " شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ "رسالت کی شہادت بھی ایمان باللہ میں داخل ہے، اس کے بغیر ایمان باللہ معتبر نہیں، یہ بات میں نے اس لیے کہہ دی کہ کہیں آپ یہ نہ کہہ دیں کہ اس میں تو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے کا ذکر ہے، کیا رسالت پہ ایمان لانا ضروری نہیں؟ رسالت پہ ایمان لانا اسی طرح ضروری ہے جس طرح اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے، اللہ پر ایمان لانا معتبر وہی ہے جو اللہ کے رسول کے بتانے کے مطابق ہو، اپنے طور پر عقل کے ساتھ سوچ کر اگر آپ ایمان لائیں گے تو وہ ایمان لانا کوئی معتبر نہیں ہے۔

غیر اللہ کا خوف ہی شرک کی بنیاد ہے:

اور آخر میں فرمایا" وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ " یہ شرک کی جڑ کاٹ دی کیونکہ شرک کی بنیاد غیر اللہ کے خوف پر ہے کہ فلاں ہماری ٹانگ توڑ دے گا، فلاں ہماری بھینس مار دے گا یا ہماری بھینس کا بچہ مر جائے گا اس قسم کے اندیشوں کے تحت ہی لوگ شرک میں مبتلاء ہوتے ہیں، موحد وہ ہوتا ہے جس کے دل میں اللہ کے علاوہ کسی کی طرف سے کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہ ہو بس اللہ کے ساتھ ہی اس کا جوڑ ہو یہ عقیدہ کے طور پر خوف اور خشیت ہے۔

اور ظاہری طور پر ظاہری اسباب کے تحت کسی موذی چیز سے ڈرنا جیسے کتا آگے سے آ گیا اور آپ ڈر گئے، سانپ بچھو سے آپ کے دل میں خوف پیدا ہو گیا، دشمن لاٹھی اٹھا کے آ گیا اور آپ اس سے ڈر گئے یہ طبعی خوف ہوتا ہے یہ قابل اعتبار نہیں، یہ عقیدہ کا جو خوف ہے کہ ہمارا کوئی نقصان کر سکتا ہے یہ خوف اور خشیت ان کو صرف اللہ سے ہوتا ہے کسی دوسرے سے نہیں ہوتا باقی تکلیف پہنچانے والی چیزوں سے ظاہری طور پر ڈرنا یہ عقیدہ توحید کے خلاف نہیں ہے۔

مافوق الاسباب نقصان پہنچانے کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور شرک کی جڑ یہی ہے کہ غیر اللہ کا ان کے دل میں خوف ہوتا ہے جس کی بناء پر یہ اس کے سامنے جھکتے ہیں اور مؤمن صحیح طور پر وہی ہے جس کی یہ صفت بھی ساتھ ہو "وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ" کہ اللہ کے علاوہ دل میں خوف اور خشیت کسی کی نہیں ہے۔

"فَعَسٰۤی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ" یہ لوگ جو یہ کام کرتے ہیں یہ ہیں مہتدین میں سے، قریب ہے کہ یہ لوگ مہتدین میں سے ہوں گے اور یہ لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے، یہ امید کا لفظ اللہ تعالیٰ کی کلام میں وعدہ کی جگہ میں ہوتا ہے کہ یہ ہیں اپنے مقصد کو پانے والے۔

شانِ نزول:

"اَجَعَلْتُمْ سِقَایَۃَ الْحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" مفسرین کی تفسیر کے مطابق یہ خطاب مشرکین کو بھی ہوسکتا ہے اور بعض شانِ نزول کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب مؤمنین کو بھی ہے۔

مشرکین کو تو یہ خطاب ہے ہی جو کہ حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کی خدمت کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے ان سے کہا گیا کہ ایمان اور جہاد کے مقابلہ میں یہ کوئی چیز نہیں ہے، یہ کچھ نہیں ہیں ایمان اور جہاد کے مقابلہ میں، ایمان اور جہاد اصل ہے اگر ایمان اور جہاد کے ساتھ یہ چیزیں سرانجام دیں جائیں تو یہ باعث فضیلت ہیں ورنہ کچھ نہیں، تم یہ نہ سمجھو کہ اب تم مؤمنوں اور مجاہدوں کی طرح ہوگئے، تمہاری یہ خدمات ایمان اور جہاد کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

اور مسلمانوں کو خطاب اس طرح ہوگا کہ روایات تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مجلس میں چند مسلمانوں کا آپس میں اس بات پر تذکرہ ہوا کہ افضل کام کونسا ہے؟ بعض نے کہا کہ حاجیوں کو پانی پلانا بہت افضل ہے، مسجد حرام کی خدمت افضل ہے بعض دوسرے کہنے لگے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا افضل ہے، اس میں چاہے بظاہر مسجد سے دوری ہے لیکن اللہ کا نام اونچا کرنے کے لیے جو جدوجہد کی جاتی ہے وہ افضل ہے اس طرح آپس میں تذکرہ ہوا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیات اتاریں۔

تطبیق:

لیکن راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے مشرکوں کا دماغ سیدھا کرنا مقصود ہے لیکن اس کے ضمن میں

یہ بات ثابت ہوگئی کہ حاجیوں کو پانی پلانے کے مقابلہ میں ایمان اور جہاد افضل ہے اس لیے اگر مسلمانوں کا آپس میں کوئی اختلاف ہوتو یہ آیت پڑھی جاسکتی ہے کیونکہ اس آیت میں فضیلت ایمان اور جہاد کی ہے حاجیوں کو پانی پلانے کے مقابلہ میں تو دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہوسکتی ہیں اور اسلاف میں یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی واقعہ پیش آجائے تو اس پر کسی آیت سے استدلال کیا جائے تو اس واقعہ کو بھی اس آیت کے شان نزول میں ہی بیان کردیتے ہیں گویا کہ یہ آیات اسی واقعہ کے متعلق ہی اتری ہیں۔

آیت کا مفہوم:

حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا کیا بنالیا تم نے اس کو اس شخص کے عمل کی طرح جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یوم آخرت پر اور اللہ کے راستے میں جہاد بھی کرتا ہے، ان کو کیا تم نے اس شخص کے عمل کی طرح بنادیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے نہیں ہے ایمان لانا افضل ہے ”سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ“ سے اس لیے اگر کوئی مشرک یہ کام کرتا ہے اور دوسرا شخص ایمان لاتا ہے تو مشرک ”سقاية الحاج“ سے ایمان لانے والا اعلیٰ ہے اسی طرح جہاد بھی مسجد حرام کو آباد کرنے سے افضل ہے جس وقت یہ عمل افضل ہیں تو عامل کی افضلیت خود نکل آئی۔

ایک شخص ایمان لاتا ہے اور جہاد کرتا ہے یہ اس شخص کے مقابلہ میں افضل ہے جو حاجیوں کو پانی پلاتا ہے اور صرف مسجد کی خدمت کرتا ہے تو عاملین کی فضیلت خود نکل آئی ”لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ“ یہ دونوں فریقوں کی طرف اشارہ ہے کہ دونوں فریق برابر نہیں ”وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ“ ظالم لوگوں کو اللہ سیدھا راستہ نہیں دکھاتا، ان کو حقیقت سمجھنے کی توفیق نہیں دیتا کیونکہ کفر اور شرک کے نتیجہ میں دل کا مزاج ایسا بدل جاتا ہے کہ پھر بری چیزوں کی طرف رغبت زیادہ ہوجاتی ہے پھر اچھی چیزوں کی طرف رغبت نہیں ہوتی تو صحیح بات ان کو سمجھ نہیں آتی اور ایمان کی برکت سے اللہ تعالیٰ دل کا مزاج ایسا صحیح کردیتا ہے ” اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا “ ان لفظوں کے تحت جس طرح بیان کیا تھا کہ تقویٰ کی برکت سے اللہ تعالیٰ دل میں ایسی نورانیت پیدا فرمادیتے ہیں جس کی وجہ سے دل خود حق اور باطل میں فرق کرنے لگ جاتا ہے کہ یہ حق ہے یا باطل، تو ظالم لوگ جو بدکردار ہیں ان کو اللہ تعالیٰ صحیح بات سمجھنے کی توفیق ہی نہیں دیتا، ان کا مزاج اس طرح بگڑ جاتا ہے کہ وہ فرق ہی نہیں کرسکتے ورنہ اللہ پر ایمان لانا، یوم آخرت پر ایمان لانا، اللہ کے راستے میں جہاد کرنا ان چیزوں کی بلندی خود بخود نمایاں ہے، ان کے مقابلہ میں حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کی خدمت کرنے کو شرک کے ساتھ گوارہ کرلیا جائے ان کا آپس

میں کوئی مقابلہ نہیں ہے۔

اگر کوئی کافر اور مشرک ہو تو بھی اسی طرح فرق ہے اور اگر کوئی مؤمن اس طرح کہے کہ ایمان لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کی خدمت کرنا یہ جہاد کے مقابلہ میں افضل ہے تو اس کا بھی اس میں جواب آ گیا کہ ایسی بات نہیں، جہاد فی سبیل اللہ افضل ہے، جہاد کو ترجیح ہے ایمان میں چاہے برابر ہوں وہ بھی مؤمن وہ بھی مؤمن لیکن ایک نے حاجیوں کو پانی پلانے کا کام اختیار کر لیا اور ایک نے دین کی نشر و اشاعت کے لیے جدوجہد شروع کر دی کیونکہ جہاد کا حاصل یہی ہے تو جو شخص دین کی نشر و اشاعت کے لیے جدوجہد کر رہا ہے اس کا عمل اس کے مقابلہ میں افضل ہے۔

مؤمن مہاجر اور مجاہد کا مقام:

" اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا "جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور اپنا گھر بار چھوڑتے ہیں اور اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اپنے مالوں کے ساتھ بھی، دین کے لیے مال بھی خرچ کرتے ہیں اور اپنی جانوں کو بھی کھپاتے ہیں، جانوں کے ساتھ جہاد کرنے میں جہاد بالالسنہ بھی داخل ہے جسے جہاد باللسان کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں بھی بدن کو لگایا جاتا ہے، جہاد باللسان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زبان کے ساتھ باطل کی تردید کرو اور حق کے دلائل مہیا کرو، ان کے اعتراضات کا جواب دو، دلائل کا اثبات کرو یہ جہاد باللسان ہے وہ بھی جہاد بالانفس میں داخل ہے، اپنے مالوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں " اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ " اللہ کے نزدیک ان کا درجہ بڑا ہے۔

اب اگر " سقایة الحاج "اور" عمارة المسجد "والا مؤمن ہے تو" اعظم " اسم تفضیل کے معنیٰ میں ہے اور اگر وہ کافر ہے تو پھر " اعظم " صرف مبالغہ کے طور پر ہے یعنی اللہ کے نزدیک ان کا بہت بڑا درجہ ہے کیونکہ کافر کا عمل تو قابل اعتماد ہی نہیں تو اس کو مقابلہ میں کس طرح لایا جا سکتا ہے "وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ " اور یہی لوگ فوز و فلاح پانے والے ہیں، کامیاب ہونے والے ہیں۔

مؤمنین مہاجرین اور مجاہدین کا انعام:

ان کی کامیابی کیا ہے؟ یہ تفصیل اگلے الفاظ میں ذکر کر دی کہ ان کا رب ان کو بشارت دیتا ہے اپنی طرف

سے رحمت کی اور رضا مندی کی اور جنات کی، پیچھے تین عمل آئے تھے ایمان باللہ اور ہجرت اور جہاد اس کے ثمرہ کے اندر بھی تین چیزیں ذکر کر دی گئیں ان کے لیے اللہ کی طرف سے رحمت ہے اور رضا مندی ہے اور جنات ہیں، ان میں لف ونشر غیر مرتب ہے رحمت کا تعلق ایمان کے ساتھ ہے، اللہ کی رحمت تو ایمان سے حاصل ہوتی ہے اور رضوان کا تعلق جہاد کے ساتھ ہے کہ اللہ کی اعلیٰ درجہ کی رضا مجاہدین کے لیے ہے اور جنہوں نے اللہ کی رضا کے لیے گھر بار کو چھوڑا تھا جنات کا تعلق ان کے ساتھ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو رہنے کے لیے ان کے مقابلہ میں اچھے گھر دے گا تو جو شخص تینوں کا جامع ہو گیا ایمان بھی لے آیا اور گھر بار بھی چھوڑا اور اللہ کے راستے میں جہاد بھی کیا تو اس کو رحمت بھی حاصل ہوگی، رضا بھی حاصل ہوگی اور رہنے کے لیے باغات بھی ملیں گے پھر دنیا کے اچھے مکانات، دنیا کے باغات ان کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتے ہیں نہ تو ان کی نعمتیں دائم اور نہ ان کے اندر رہنا دائم۔

اگر آپ کے پاس باغ ہے تو اس کا ایک وقت تک پھل ہوتا ہے دوسرے وقت میں ختم ہو جاتا ہے پھر آپ ترستے رہ جائیں آپ کو کھانے کے لیے نہیں ملے گا، موسم گزر گیا تو پھل ختم ہو گیا اور کبھی ایسا بھی ہوگا کہ پھل لگا ہوا ہے اور خود ہی رخصت ہو گئے یہ بھی ہوتا ہے لیکن جو اللہ کی طرف سے باغات ملیں گے ان میں ہمیشہ خوشحالی ہوگی، کبھی وہ خوشحالی ختم نہیں ہوگی اور یہ لوگ بھی اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ایسا بھی نہیں ہوگا کہ ان جنتیوں کو وہاں سے نکال دیا جائے، مطلب یہ کہ عیش و عشرت ہمیشہ رہے گی، یہ چند دنوں کی مشقت ہے جو لوگ اس کو برداشت کریں گے وہ ہمیشہ کے لیے راحت میں رہیں گے "اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو ظاہری چیزیں ہیں جو تمہارے سامنے ذکر کر دی گئیں ورنہ اور بھی اللہ تعالیٰ نے پتہ نہیں کیا کیا نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں "اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ" میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو کبھی آنکھوں نے دیکھی نہیں، کانوں نے سنی نہیں اور ان کا خیال کسی بندے کے دل میں آیا تک نہیں۔

اللہ، اللہ کے رسول اور اپنے آباؤ اجداد سے محبت کے بارے میں ہدایات:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ" ان آیات کے اندر ہجرت اور جہاد کے اوپر برانگیختہ کرنا مقصود ہے کیونکہ جہاد اور ہجرت سے کونسی چیز مانع ہوتی ہے؟ برادری کے تعلقات، رشتہ داروں سے

محبت، انسان کہتا ہے کہ ٹھیک ہے یہ کافر ہیں میں نے ایمان قبول کر لیا لیکن اب ماں باپ کو چھوڑ کے کہاں چلا جاؤں، بہن بھائی سے جدائی کس طرح اختیار کر لوں؟ اور جہاں میں جاؤں گا پتہ نہیں رہنے کے لیے مکان ملے گا یا نہیں؟ کھانے کو کچھ ملے گا کہ نہیں؟ اس قسم کی چیزیں انسان کے لیے جہاد اور ہجرت سے مانع ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ یہاں اسی چیز کی ترغیب دیتے ہیں اور ساتھ ساتھ فیصلہ سناتے ہیں کہ یہ دوٹوک فیصلہ کر لو کہ اللہ اور اللہ کے رسول سے تعلق رکھنا ہے یا برادریوں اور کاروبار کا خیال رکھنا ہے اگر تو برادری اور کاروبار کو مقدم رکھنا ہے تو اللہ کے عذاب کے منتظر رہو، یہ کوئی ایمان نہیں ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلہ میں تم ان تعلقات کو بحال کرو اور اگر اللہ اور اللہ کے رسول سے تعلق رکھنا ہے تو پھر باپ ہی کیوں نہ ہو، ماں ہی کیوں نہ ہو، بہن بھائی ہی کیوں نہ ہوں جو تمہارے راستے پر نہیں ہیں کفر اختیار کیے ہوئے ہیں، ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کرتے ہیں تو اگر تمہیں ان کے خلاف بھی تلوار اٹھانی پڑ جائے تو اٹھانی ہوگی، انہیں دوست بنانا اور ان سے تعلق رکھنا بالکل صحیح نہیں ہے گویا کہ یہ دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

اے ایمان والو! اپنے آباؤ اجداد کو، اپنے بھائی بہن کو دوست نہ بنایا کرو یہ کب کرنا ہے؟ جب وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کریں تو ان سے تعلق نہ رکھو، اب والدین کے حقوق، بہن بھائیوں کے حقوق، اہل قرابت کے حقوق کتنے زیادہ ہیں اور قرآن کریم نے کتنی وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں لیکن جہاں ایمان کی بات آگئی وہاں کسی کی پرواہ نہیں ہے تو اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کرتے ہیں تو نہ باپ سے محبت رکھنی جائز اور نہ بہن بھائیوں سے محبت رکھنی جائز ہے، اس وقت تک ان کے ساتھ تعلقات رکھے جا سکتے ہیں جب تک ہم یہ سمجھیں کہ ممکن ہے کہ یہ سمجھانے سے سمجھ جائیں گے لیکن جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ ان کے نزدیک کفر ہی پسندیدہ ہے، کسی صورت میں اس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تو ان کے ساتھ تعلقات رکھنا ٹھیک نہیں، محبت کا تعلق ٹھیک نہیں باقی جو ان کے دنیاوی حقوق ہیں وہ کفر کے باوجود بھی ادا کیے جائیں گے قرآن کریم میں جس طرح آتا ہے کہ "صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا" اگر والدین تمہیں کسی غلط کام یا شرک پہ یا کفر پہ مجبور کرتے ہیں تو ان کا کہنا نہ ماننا "وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ" اس شخص کے پیچھے لگ جا جس کا رجوع میری طرف ہے "صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا" لیکن دنیا کے اندر ان کے ساتھ برتاؤ اچھا کرو اس لیے والدین اگر کافر بھی ہوں تو بھی والدین کا خرچ بیٹے کے ذمہ ہے اگر والدین محتاج ہیں اور ان کو کما کر دینے والا کوئی نہیں ہے اور بیٹا خوشحال ہے لیکن دونوں میں دین کا فرق ہے تو بھی

اس کا خرچ اس کے ذمہ ہے تم میں سے جو کوئی ان کے ساتھ دوستی لگائے گا پس یہی ظالم لوگ ہیں۔

آپ اعلان کر دیجیے! اب اس آیت کے اندر سارے ہی تعلق والے شمار کرا دیے کہ تمہارے آباؤ اجداد اور تمہارے بیٹے تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں تمہارے قبیلے یہ تو سارے کے سارے تعلقات آ گئے اور تمہارے مال جن کو تم نے کمایا یہ قید اس لیے لگائی کہ اپنے کمائے ہوئے مال کے ساتھ بہت محبت ہوتی ہے اور دوسرے کے مال کے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوتی اور تجارت وہ بھی ایسی جو چل رہی ہے اور خطرہ ہے کہ اگر ہم نے یہ طریقہ نہ اپنایا تو ہماری تجارت مندی پڑ جائے گی، مال کی نکاسی بند ہو جائے گی، خرید و فروخت چھوٹ جائے گی، تجارت جس کے تم کساد سے ڈرتے ہو اور تمہارے مکانات اور تمہاری حویلیاں اور جو کوٹھیاں بنا رکھی ہیں ان کے ساتھ دل اٹکا ہوا ہے وہ پسندیدہ ہیں اگر یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ اور اللہ کے رسول اور جہاد کرنے کے مقابلہ میں پسند ہیں تو پھر تم اللہ کی طرف سے عذاب کا انتظار کرو جس سے معلوم ہو گیا کہ ان تعلقات میں سے کوئی تعلق بھی اللہ اور اللہ کے رسول سے تعلق کے مقابلہ میں راجح نہیں ہونا چاہیے۔

یہاں اختیاری اور عقلی محبت مراد ہے:

اس محبت سے محبت اختیاری مراد ہے، اضطراری محبت، قلب کا میلان، قلب کے اندر بے چینی یہ بسا اوقات انسان کے بس میں نہیں ہوتی، والدین کے متعلق انسان کے دل میں بے چینی ہے یا اپنے بھائیوں کی طرف جو میلان ہے اتنا میلان ظاہری طور پر اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف نہیں ہے یہ طبعی محبت ہے اور غیر اختیاری ہے یہ انسان کے بس میں نہیں ہے، محبت کے بارے میں لوگ کہتے ہیں ''یہ وہ آگ ہے جو لگائی نہ لگے اور بجھائی نہ بجھے'' کہ کہیں لگانا چاہو تو لگتی نہیں، بجھانا چاہو تو بجھتی نہیں، یہ اپنی آزادی کے ساتھ ہی چلتی ہے اس قسم کی غیر اختیاری محبت زیر بحث نہیں ہے اس کا انسان کو مکلف نہیں کیا جا سکتا یہاں محبت اختیاری اور عقلی مراد ہے جس کا مطلب یہ کہ اگر دونوں کے درمیان میں تعارض آ جائے تو تم کس کو ترجیح دیتے ہو۔

ایک طرف باپ کا حکم آ گیا، ایک طرف اللہ کا حکم ہے اس موقع پر اگر باپ کا حکم لے لیا اور اللہ کا حکم چھوڑ دیا تو تم نے باپ سے زیادہ محبت رکھی بمقابلہ اللہ کے اور اگر ایک حکم شریعت کا آ گیا کہ چلو گھر بار چھوڑ دو اور تم کہتے ہو کہ میں ایسے بنائے ہوئے مکانات چھوڑ کے کہاں چلا جاؤں، وہاں پتہ نہیں کہ مکان ملے گا یا نہیں؟ یا میں اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ کے کہاں چلا جاؤں؟ یا میں اپنے رشتہ داروں کے خلاف تلوار کس طرح اٹھاؤں؟ اگر ان باتوں کو سوچ

کر اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کو پس پشت ڈال دیا تو پھر آپ کی محبت ان چیزوں کے ساتھ ہے اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ نہیں، پتہ مقابلہ میں لگا کرتا ہے ایک طرف بیوی کی فرمائش ہے دوسری طرف شریعت کا حکم ہے اگر شریعت کا حکم مانا تو گویا کہ شریعت، اللہ اور اللہ کا رسول تمہیں زیادہ پسند ہے بیوی کے مقابلہ میں اور اگر بیوی کا کہنا مان لیا اور اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کو چھوڑ دیا تو اللہ اور اللہ کے مقابلہ میں بیوی کو تم نے ترجیح دے دی ہے۔

محبت سے اطاعت آسان ہو جاتی ہے:

اور یہ محبت ہی اصل چیز ہے جس کے ساتھ انسان کے لیے طاعات آسان ہو جاتی ہیں، اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت ترجیح پکڑ جائے تو ہر قربانی انسان کے لیے آسان ہو جاتی ہے، ہر عمل انسان کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور اگر اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت راجح نہیں ہے بلکہ مال کی محبت راجح ہے تو اس میں سے چالیسواں حصہ دینا بھی انسان کے لیے دشوار ہوتا ہے، یہ جو زکوٰۃ نہیں دیتے اللہ کا حکم سامنے آجانے کے بعد یعنی اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے چالیسواں حصہ بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دل میں مال کی محبت زیادہ ہے اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کی پرواہ نہیں ہے، اگر یہ چیزیں تمہیں زیادہ پسند ہیں "احب" یہ تفضیل کا صیغہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فی الجملہ ان سے محبت گوارہ ہے ماں باپ، بھائی بہن سے محبت کر سکتے ہو، بیوی سے محبت کر سکتے ہو، برادری سے محبت کر سکتے ہو، مال سے محبت کر سکتے ہو، اپنے مکانات سے محبت لگا سکتے ہو، کاروبار سے محبت ہو سکتی ہے، سرے سے محبت سے روکنا مقصود نہیں لیکن یہ احب نہیں ہونے چاہئیں، اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلہ میں زیادہ محبوب نہیں ہونے چاہئیں اس لیے ان کے حکم کے تحت تو بے شک سب سے محبت رکھ لیکن جہاں مقابلہ آجائے تم اللہ اور اللہ کے رسول کو ترجیح دیتے ہو تو پھر تو تم مؤمن ہو اور اگر اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کو ترجیح نہیں دیتے بلکہ وہاں بھی ان چیزوں کی رعایت رکھتے ہو تو پھر اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔

فاسقوں کو اللہ ان کے مقصد میں کامیاب نہیں کرتا:

"وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ" یہاں فاسق سے وہی لوگ مراد ہیں جو ان تعلقات کو اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں یہ فاسق لوگ ہیں، یہ اللہ کی اطاعت سے نکلنے والے لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ان کے مقصد میں کامیاب نہیں کرتا، ان کا مقصد ہے کہ ان تعلقات سے فائدہ اٹھائیں لیکن اللہ تعالیٰ ان

کو فائدہ اٹھانے کی بھی توفیق نہیں دے گا موت آئے گی تو سب کچھ ختم کر دے گی اگر ان کا مقصد ہے کہ ہم انہی کے ساتھ ہی رہیں اور انہی سے فائدہ اٹھائیں تو کیا اس مقصد میں کوئی آدمی کامیاب ہو سکتا ہے؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جائے اللہ تعالیٰ یا مال چھین لے گا یا انسان کو مار دے گا، تجارت میں نقصان ہو جائے گا، ماں باپ اور بہن بھائیوں سے موت کے ساتھ جدائی ہو جائے گی ان مقاصد میں کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا ہاں البتہ اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے تحت جس وقت وہ چلے گا تو پھر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے، اللہ کی رضا بھی حاصل ہو گی اور اگر یہ لوگ بھی اچھے ہوئے تو پھر آخرت میں جا کے وہاں پھر رفاقت ہو جائے گی جیسا کہ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" کا یہی مضمون بتایا گیا کہ کوئی مر جائے یا کوئی نقصان ہو جائے تو یہ سوچو کہ ہم تو اللہ کے لیے ہیں جو تصرف بھی اس کا ہو گا ہمیں قبول ہے اور اسی کی طرف ہم لوٹ کر جانے والے ہیں یہ عارضی جدائی ہے اللہ کے پاس جا کے اکٹھے ہوں گے، یہ نافرمان لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے اگر ان کا مقصد ہے کہ ہم ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے تو یہ ممکن نہیں ہے، اس لیے ہمیشہ اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کو ترجیح دو ان تعلقات کے مقابلہ میں اور ان تعلقات کو اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلہ میں ہرگز ترجیح نہ دو۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ

البتہ تحقیق تمہاری مدد کی اللہ نے بہت سے مقامات میں اور بالخصوص حنین کے دن

اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا

جبکہ تعجب میں ڈال دیا تھا تمہیں تمہاری کثرت نے پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی

وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ

اور تنگ ہوگئی تم پر زمین باوجود اس کے کشادہ ہونے کے پھر تم پیٹھ پھیر کر

مُّدْبِرِيْنَ ۚ (۲۵) ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَعَلَي

بھاگ گئے (۲۵) پھر اتارا اللہ نے اپنا اطمینان اپنے رسول پر اور

الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ

مؤمنین پر اور اتارے ایسے لشکر جن کو تم نے نہیں دیکھا اور عذاب دیا اس نے

كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶) ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ

کافروں کو اور یہی بدلہ ہے کافروں کا (۲۶) پھر اللہ تعالیٰ توجہ فرماتا ہے اس کے بعد

ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۷) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

جس پر چاہتا ہے اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے (۲۷) اے ایمان والو !

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ

اس کے سوا کچھ نہیں کہ مشرک ناپاک ہیں یہ قریب نہ آئیں مسجد حرام کے بعد

عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ

اپنے اس سال کے اور اگر تم اندیشہ کرو احتیاج کا تو قریب ہے کہ غنی کردے گا تمہیں اللہ

فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۸) قَاتِلُوا الَّذِيْنَ

اپنے فضل سے اگر چاہے گا بے شک اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے (۲۸) لڑائی لڑو ان سے

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ

جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور نہ یوم آخرت پر اور نہ حرام ٹھہراتے ہیں ان کو جن کو حرام ٹھہرایا

اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

اللہ اور اس کے رسول نے اور نہ دین حق کی اتباع کرتے ہیں یعنی وہ لوگ جو دیے گئے

الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ ع

کتاب حتیٰ کہ وہ تمہارے غلبہ کے سبب سے جزیہ دینے لگ جائیں اس حال میں کہ وہ پست ہو جائیں ﴿۲۹﴾

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ

کہا یہود نے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور کہا نصاریٰ نے کہ مسیح

ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِــُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ

اللہ کا بیٹا ہے یہ ان کی بات ہے اپنے ہی منہ سے ، مشابہت اختیار کرتے ہیں ان لوگوں کی بات کی

كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِتَّخَذُوْٓا

جنہوں نے کفر کیا ان سے پہلے ، اللہ انہیں برباد کرے یہ کہاں پھرے جا رہے ہیں؟ ﴿۳۰﴾ بنا لیا انہوں نے

اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ

اپنے علماء اور مشائخ کو رب اللہ کے علاوہ اور بالخصوص مسیح ابن

مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ

مریم کو اور نہیں حکم دیے گئے یہ مگر یہ کہ عبادت کریں ایک ہی معبود کی ، نہیں ہے کوئی الٰہ مگر وہی

سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِــُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ

وہ پاک ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے ﴿۳۱﴾ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نور کو

بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾

اپنے منہ کے ساتھ اور اللہ انکار کرتا ہے مگر اس بات کا کہ اپنے نور کو پورا کرے اگرچہ کافروں کو یہ بات ناپسند ہی ہو ﴿۳۲﴾

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تاکہ غالب کردے

عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا

اس دین کو سب دینوں پر اگرچہ مشرکوں کو یہ بات ناپسند ہی ہو ﴿۳۳﴾ اے ایمان والو!

اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ

علماء اور مشائخ میں سے بہت سے البتہ کھاتے ہیں لوگوں کا مال

بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ

غلط طریقے کے ساتھ اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، جو لوگ جمع کر کے رکھتے ہیں

الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ

سونا اور چاندی کو اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے پس انہیں بشارت دے دے

بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۳۴﴾ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰی

دردناک عذاب کی ﴿۳۴﴾ جب ان اموال کو تپایا جائے گا ان پر جہنم کی آگ میں داغے جائیں گے

بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ

ان کے ساتھ ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پشتیں یہ ہے جس کو تم گاڑھ گاڑھ کے رکھتے تھے اپنے نفسوں کے لیے

فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

اب اپنی گاڑھی ہوئی چیز کا مزہ چکھو ﴿۳۵﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

اس رکوع سے پچھلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاد کی ترغیب دی تھی اور پوری وضاحت کے ساتھ یہ کہا تھا کہ دنیوی تعلقات چاہے اپنے اقارب اور رشتہ داروں سے ہوں، چاہے کاروبار سے ہوں، چاہے جائیداد سے ہوں یہ جہاد سے مانع نہیں ہونے چاہئیں اگر یہ چیزیں جہاد سے مانع بن گئیں اور اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے مقابلہ میں تم ان کو ترجیح دینے لگ گئے تو پھر یاد رکھو اللہ کی طرف سے عذاب کا حکم آجائے گا وہ جہاد کی ترغیب کی بات تھی اسی طرح اگلی آیات میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی نصرت اور مدد کا حوالہ دے کے جہاد کی ہی ترغیب دیتے ہیں، یہ چیزیں جہاد سے مانع نہیں ہونی چاہئیں اور مد مقابل سے ڈرنا نہیں چاہیے اور اللہ کی رحمت پہ بھروسہ کرنا چاہیے، اپنے ذاتی اسباب پر نظر نہ رکھا کرو اس مضمون کو سمجھانے کے لیے آگے غزوہ حنین کا حوالہ دیا جارہا ہے۔

غزوہ حنین کا ذکر:

غالباً اجمالی طور پر آپ کے سامنے غزوہ حنین کا ذکر گزر چکا ہے یہ غزوہ فتح مکہ کے متصل ہی پیش آیا، جس وقت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پہ تسلط حاصل کرلیا تو مکہ معظمہ سے قریب ہی چند میلوں کے فاصلہ پر یہ حنین ایک وادی ہے، مکہ معظمہ سے طائف کی طرف جائیں تو یہ راستے میں آتی ہے، اس وادی کے آس پاس قبیلہ بنو ثقیف، بنو ہوازن آباد تھے اور ان کی مختلف شاخیں تھیں جو طائف تک پھیلی ہوئی تھیں، تعداد کے اعتبار سے بھی بہت تھے، فنونِ سپاہ گری میں بھی ماہر تھے اور ان کی شہرت تھی کہ یہ بہت لڑاکے ہیں اور بہادر قسم کے لوگ ہیں، مالیات کے اعتبار سے بھی ان کو اردگرد کے لوگوں پر فوقیت حاصل تھی یعنی دنیا کے اعتبار سے کسی بھی قبیلہ کے اعلیٰ ہونے کی جو علامات ہوتی ہیں وہ ان میں موجود تھیں۔

دشمن کی طرف سے فیصلہ کن جنگ کا عزم:

ان کا اس وقت لیڈر اور قائد مالک بن عوف تھا، اس نے اپنے تمام قبائل کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اکٹھا کر کے کہنے لگا کہ مسلمان اب مکہ معظمہ پر غالب آگئے ہیں اور جس وقت ان کے قدم یہاں مضبوط ہوجائیں گے تو ان کا اگلا نشانہ ہم ہیں پھر یہ ہم پہ حملہ کریں گے اور ابھی وہ تازہ تازہ ہیں، پوری طرح ان کے قدم مضبوط نہیں ہوئے

تو یہ موقع ہے کہ ہم اکٹھے ہو کے ان پر حملہ آور ہو جائیں اور ہم انہیں شکست دے دیں تو اپنا بھی تحفظ ہو جائے گا اور آئندہ کے لیے خطرات بھی ٹل جائیں گے اگر اب ہم نے سستی کی اور اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر جس وقت ان کے قدم مکہ معظمہ میں مضبوط ہو جائیں گے تو پھر اگلا نمبر ہمارا ہے اس طرح اس نے اپنے تمام قبائل کی شاخوں کو اکٹھا کر کے ان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور فیصلہ کن جنگ لڑنے کا تہیہ کر لیا۔

غزوہ حنین میں دشمن کی تعداد:

ان کی تعداد کتنی تھی؟ بعض روایات میں ہے کہ ان کی تعداد چار ہزار تھی اور بعض روایات میں ہے کہ ان کی تعداد چوبیس ہزار تھی لیکن یہ چوبیس اور چار ہزار دونوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ میدان میں لڑنے والے تو چار ہزار تھے اور ان قبیلوں کی کل تعداد جن کو یہ اکٹھا کر کے آئے تھے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اہل وعیال کو، بیوی بچوں کو سب کو اکٹھا کر کے یہ میدان میں آئے تھے تاکہ لڑنے والے جوان بھاگنے کی کوشش نہ کریں اگر ان کو بھاگنے کا خیال آ گیا تو فوراً یہ چیزیں مانع ہو جائیں گی کہ ہمارے بیوی بچے اور اولاد سب کچھ اس میدان میں موجود ہے ہم چھوڑ کے کہاں جائیں؟ یہ اپنا پورا سرمایہ نقد کی صورت میں اور مویشی اور بکری اور جو کچھ ان کے پاس تھا مع اہل وعیال سب کچھ میدان میں لے کے آ گئے تھے اور مقابلہ کرنے والے تقریباً چار ہزار تھے اور بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو ملا کے تعداد بیس ہزار سے اوپر تھی اس طرح وہ اکٹھے ہوئے یعنی اپنی موت اور حیات کا فیصلہ کرنے والی بات تھی اگر غلبہ پا گئے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر ہمیں اس طرح ختم ہو جانا چاہیے اور اگر ہم اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے تو آخر ہونا ہمارے ساتھ یہی ہے۔

لشکر اسلام کی تعداد:

سرور کائنات ﷺ کو اطلاع ہو گئی تو آپ ﷺ نے یہ مناسب سمجھا کہ ان کو مکہ پر حملہ کرنے کا موقع نہ دیا جائے بلکہ آگے بڑھ کے ہم ان کا راستہ روکیں اور ان کے ساتھ مقابلہ کسی اور میدان میں ہو تو سرور کائنات ﷺ نے کوچ کا اعلان فرمایا اور چونکہ بہت بڑی قوم تھی جس کے ساتھ مقابلہ تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اہتمام کے ساتھ اس موقع پر سامان جنگ اکٹھا کیا چنانچہ مشرکین مکہ سے جو اس وقت مفتوح ہوئے تھے آپ ﷺ نے بہت سارا مال مستعار لیا، زرہیں لیں اور نیزے لیے اس قسم کی چیزیں لیں، دس ہزار کا لشکر تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا جو مدینہ

منورہ سے فتح مکہ کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آیا تھا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہ ہزار کا لشکر تھا اور تقریباً دو ہزار آدمی مکہ معظمہ سے ساتھ شامل ہو گئے جن میں سے بعض تو وہ تھے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور بعض تماشائی ہونے کی حیثیت سے ساتھ تھے کیونکہ مکہ ابھی نیا نیا فتح ہوا تھا اور سب لوگ ابھی پوری طرح ساتھ نہیں ہوئے تھے، مشرک اپنے شرک پہ قائم تھے، کافر اپنے کفر پہ قائم تھے اگرچہ ان کو امن حاصل ہو گیا لیکن ابھی ان کے عقیدے صحیح نہیں ہوئے تھے اس لیے تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ تو بدنیتی کے ساتھ گئے تھے کہ اگر اس میدان کے اندر مسلمانوں کو شکست ہو گئی تو ہمیں بھی انتقام لینے کا موقع مل جائے گا پھر ہم بھی ان کے ساتھ بغاوت کر دیں گے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے اور اگر مسلمان فتح پا گئے تو پھر جس طرح ہیں اسی طرح رہیں گے تو یہ حنین بہت بڑا میدان اور بہت بڑی وادی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقابل ہوئے۔

بعض مسلمانوں کی لغزش اور اللہ کی طرف سے تنبیہ:

راستے میں جاتے ہوئے بعض مؤمنوں کی زبانوں سے ایسے الفاظ نکل گئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اب ان کی نظر اسباب کی طرف زیادہ ہو گئی اور اللہ کی رحمت اور نصرت کے اوپر وہ نظر نہیں رہی، بعض لوگ کہنے لگے کہ جس وقت ہم تھوڑے تھے اس وقت بھی غالب آئے تھے آج ہم اتنے ہیں تو ہم پر کون غالب آ سکتا ہے؟ اپنی کثرت کے اوپر نظر آ گئی اس گفتگو کے ساتھ کثرت کے اوپر اعتماد سا نمایاں ہوا اور اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ ذہن اس طرح سے پلٹا کھا جائے کہ اسباب پر نظر ہو جائے اور اللہ پر نظر نہ رہے تو جیسے میدان احد میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی خلاف ورزی ہوئی اور فوراً اللہ کی طرف سے تنبیہ آ گئی کہ لوگوں کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی برکت اور اللہ کی نصرت کا باعث ہے، جب بھی عصیان اختیار کیا جائے، ہدایات کی خلاف ورزی کی جائے تو اللہ کی نصرت ختم ہو جاتی ہے تو چند تیر اندازوں کی غلطی تھی جس کی بناء پر ساری قوم شکست سے دوچار ہو گئی۔

اب یہاں بھی بعض لوگوں کی زبان سے یہ بات نکلی تو اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی سبق پڑھایا، وہ لوگ بہت زیادہ تیر انداز تھے انہوں نے پہلے میدان میں آ کے مورچے سنبھال لیے، ادھر ادھر پہاڑوں کی گھاٹیوں میں تیر اندازوں کو چھپا دیا، دوسری طرف مسلمانوں کو اپنی کثرت کا خیال جو آیا تو ان کی وہ چستی اور ان کی ہوشیاری و ہونہاری باقی نہ رہی کیونکہ جس وقت انسان یہ سوچے کہ ہم بہت سارے ہیں، ہمارا مقابلہ کون کر سکتا ہے تو اس کے

نتیجہ میں انسان کچھ نہ کچھ لاپرواہ سا ہو جاتا ہے تو یہ جس وقت آگے بڑھے اور دوسری طرف سے یکبارگی حملہ ہوا اور ہر طرف سے تیروں کی بارش ہوئی تو پھر فوراً قدم اکھڑ گئے جس وقت قدم اکھڑے تو پھر سارے اس میدان کو چھوڑ کے بھاگے۔

مسلمانوں کی فتح:

سرور کائنات ﷺ اس میدان کے اندر ثابت قدم رہے جس طرح روایات میں تفصیل آتی ہے اور بعد میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو آواز دی کہ لوگوں واپس بلاؤ، یہ بہت بلند آواز والے تھے تو انہوں نے "اصحاب السمرۃ" کو آواز دی جنہوں نے کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ کے موت پر بیعت کی تھی اور اسی طرح مختلف طبقات کو آوازیں دیں پھر وہ سارے کے سارے رسول اللہ ﷺ کی طرف دوبارہ سنبھل کے آگئے اور پھر مقابلہ ہوا اور پھر اس مقابلہ میں بنوثقیف اور بنو ہوازن کے قدم اکھڑ گئے کچھ لوگ بھاگ گئے اور جو کچھ وہ مال اور دولت لائے تھے اور اہل وعیال لائے تھے سب کچھ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔

ایک روایت میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ وہاں جا کے ٹھہرے تھے تو کسی نے آکے اطلاع دی کہ یارسول اللہ! وہ تو سارا مال و دولت اور اپنے سب اسباب ساتھ لے آئے ہیں تو آپ ﷺ نے مسکرا کے فرمایا تھا "تِلْكَ غَنِيمَةُ الْمُسْلِمِينَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ" اگر وہ سب کچھ اکٹھا کر کے لے آئے ہیں تو کیا ہو گیا کل کو یہ سب کچھ مسلمانوں کو بطور غنیمت کے ملے گا چنانچہ وہ مال غنیمت کے طور پر ہی سارا اکٹھا کر لیا گیا۔

مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے ان کا انتظار کرنا:

لیکن حالات کچھ اس قسم کے تھے سرور کائنات ﷺ نے جس طرح مکہ معظمہ کے اندر بہت زیادہ نرم دلی کا مظاہرہ کیا تھا تو یہاں بھی آپ ﷺ کا ارادہ یہی تھا کہ اگر یہ لوگ آجائیں اور توبہ کرلیں، مسلمان ہو جائیں تو ان کے اموال بھی واپس دے دوں اور ان کے قیدی بھی چھوڑ دوں کیونکہ یہی علاقہ ہے جس میں حضور ﷺ نے اپنی شیر خوارگی کا زمانہ گزارا ہے اور جس قبیلہ میں آپ ﷺ نے دودھ پیا ہے وہ بھی انہی قبائل کی کوئی شاخ تھی تو یہاں آپ ﷺ کا وقت گزرا ہوا تھا تو آپ کا رضاعی تعلق بھی تھا آپ چاہتے تھے کہ نرمی کے ساتھ یہ معاملہ طے ہو جائے تو یہ سارا مال و دولت آپ ﷺ اکٹھا کر کے وادی جعرانہ میں آکے ٹھہر گئے اور یہ وادی مکہ سے پچیس کلومیٹر کے فاصلہ پر

واقع ہے اور آپ ﷺ نے عمرے کا احرام اسی وادی سے باندھا تھا تو لوگ بھی یہاں سے احرام باندھ کے آتے ہیں اور اس کو بڑا عمرہ کہتے ہیں یہاں تک تو میں بھی دو دفعہ گیا ہوں یہ بہت کھلا میدان ہے تو یہ ساری کی ساری چیزیں وہاں جمع کر لیں اور کتنے دنوں تک رسول اللہ ﷺ نے انتظار کیا کہ یہ لوگ اگر ایمان قبول کر کے آجائیں تو میں ان کو سب کچھ واپس کر دوں گا لیکن جب وہ نہیں آئے تو پھر رسول اللہ ﷺ نے وہ قیدی تقسیم کر دیے اور وہ مال بھی مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔

حضور ﷺ کا قیدیوں کو چھوڑنا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خوشی کا خیال رکھنا:

جب تقسیم کر دیا تو آپ ﷺ واپس آ گئے اس کے بعد بنو ثقیف اور بنو ہوازن کے لوگ ایک وفد کی صورت میں آپ ﷺ کے پاس آئے اور آ کے کہنے لگے یا رسول اللہ! ہم مسلمان ہو گئے ہیں اس لیے ہمارا مال اور ہمارے قیدی واپس کر دو تو یہ مطالبہ انہوں نے کچھ دیر سے کیا تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ دیکھو! بات وہی اچھی ہے جو واقعہ کے مطابق ہو، تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ کتنی بڑی جماعت ہے اور اب وہ مال ان میں تقسیم ہو گیا ہے اور ان کی ملکیت میں جا چکا ہے اب ان دونوں میں سے ایک چیز واپس کرا سکتا ہوں یا تو اپنے افراد واپس لے لو یا اپنا مال واپس لے لو ان میں سے ایک کو منتخب کر لو، دونوں چیزیں مشکل ہیں، وہ کہنے لگے یا رسول اللہ! ہمارے افراد چھوڑ دیے جائیں تو سرور کائنات ﷺ نے لوگوں کو اکٹھا کر کے خطبہ دیا اور اس خطبہ کے اندر ترغیب دی کہ تمہارے بھائی ہیں، مسلمان ہو کے آ گئے ہیں اور میں پہلے ان کا انتظار کرتا رہا یہ نہیں آئے، اب مجھ سے آ کے انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ ہمارا مال بھی واپس کر دیا جائے اور ہمارے افراد بھی واپس کر دیے جائیں تو میں نے ان سے کہا ہے کہ میں ایک چیز واپس کروا دوں گا جو چاہے لے لو اور انہوں نے افراد منتخب کر لیے ہیں، اب میرا ارادہ افراد واپس کرنے کا ہے اس لیے جن لوگوں میں وہ تقسیم ہوئے ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر تو وہ خوشی کے ساتھ چھوڑ دیں تو ان کی مرضی ہے اور اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم نہیں چھوڑتے بلکہ ہم معاوضہ لے کے چھوڑیں گے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب کوئی دوسرا موقع ہوگا تو میں اس کا معاوضہ ادا کروں گا کوئی معاوضہ سے دینا چاہتا ہے تو معاوضہ سے دے دے، خوشی سے دینا چاہتا ہے تو خوشی سے دے دے۔

جب رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا تو مختلف جگہوں سے آوازیں بلند ہوئیں کہ یا رسول اللہ! ہم نے خوشی سے چھوڑا، ہم نے خوشی سے چھوڑا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح مجھے پتہ نہیں چلتا کہ کون خوشی سے

چھوڑ رہا ہے اور کون خوشی سے چھوڑنا نہیں چاہتا؟ جیسے ہمارے قائد عوام کا طریقہ تھا کہ جب بھی کوئی فیصلہ کرنا ہوتا تھا تو ایک جلسہ کروالیتا تھا جیسے جب بنگلہ دیش کو الگ کرنا تھا تو کراچی میں جلسہ کیا اور کہا دیکھو! اس جلسہ میں پنجابی بھی ہیں، سندھی بھی ہیں، بلوچی بھی ہیں، پٹھان بھی ہیں گویا کہ سارے ملک کا نمائندہ اجلاس ہے اور اس میں اعلان کیا کہ ہم یوں کرنا چاہتے ہیں تو جس طرح لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہہ دیتے ہیں ٹھیک ہے کرلو ہم راضی ہیں اس طرح چند ہاتھ اٹھوائے اور پورے ملک پر فیصلہ مسلط کردیا۔

لیکن رسول اللہ ﷺ تو ہر بات کو میزان عدل میں تولتے تھے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون خوشی سے چھوڑ رہا ہے اور کون اس فیصلہ پر خوش نہیں ہے کیونکہ بعض لوگ چپ رہ سکتے ہیں اور بعض دوسروں کی دیکھا دیکھی طبعی ناگواری کے باوجود ہاتھ اٹھا سکتے ہیں جیسے آپ حضرات واعظوں کے سامنے ہاتھ اٹھا کر وعدے کرتے ہیں اور مسجدوں سے نکلنے کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس طرح نہیں کیا کہ چند افراد کے ہاتھ اٹھوا لیے یا چند افراد کی آوازیں سن کر سب پر فیصلہ مسلط کردیا فرمایا اپنی جگہوں پہ واپس جاؤ اور تمہارے سردار فرداً فرداً سب کی مرضی معلوم کریں اور بعد میں آکے مجھے بتائیں کہ کیا لوگ خوشی سے چھوڑ رہے ہیں یا کوئی معاوضہ بھی لینا چاہتا ہے تو لوگ گئے اور سرداروں نے آکر بتایا کہ یا رسول اللہ! سب لوگ خوشی سے چھوڑ رہے ہیں تو آپ ﷺ نے اعلان فرمادیا تو بنوثقیف اور بنوہوازن کے سارے قیدی رہا کردیے گئے یعنی حضور ﷺ نے جب تقسیم کرکے ان کی ملکیت میں دے دیا تو پھر ان کی ملکیت کو حاکمانہ انداز میں سلب نہیں کیا چاہے مصلحت اسی میں سمجھی کہ یہ واپس کرنے ہیں لیکن پھر بھی زبردستی نہیں کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شخصی ملکیت قائم ہونے کے بعد شریعت کی نظر میں اس کا کتنا احترام ہے تو اسی طرح زبردستی کسی املاک پر قبضہ کرلینا چاہے کتنی ہی مصلحت کیوں نہ ہو یہ درست نہیں ہے اور یہ واقعہ یہی بتاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی باوجود اس بات کے کہ مصلحت اسی میں سمجھی کہ واپس کردیے جائیں لیکن جب تک سب کو خوش نہیں کرلیا اس وقت تک واپس نہیں لیا۔

واقعہ ذکر کرنے کا مقصد:

بہرحال اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت چونکہ نمایاں ہوئی کہ پہلے شکست ہوئی تھی پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت آئی اور فتح پائی تو واقعہ یاد دلا کے مسلمانوں کو اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ تمہارا اعتماد اللہ کی نصرت پر ہونا چاہیے، ظاہری اسباب پر نظر نہ رکھا کرو اگر اللہ تعالیٰ تمہاری نصرت اور مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب

آنے والا نہیں " اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ " اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں "وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ " اگر وہ ہی تمہاری مدد چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا؟ اس لیے اسباب پر نظر رکھنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی مدد پر نظر رکھنی چاہیے یہ واقعہ یہاں اس لیے یاد دلایا جا رہا ہے۔

تفسیر باللفظ:

" لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ " اللہ تعالیٰ نے بہت ساری جگہوں میں تمہاری مدد کی اور خصوصیت کے ساتھ حنین کے دن بھی اور یہ واقعہ کب پیش آیا تھا جب تم اپنی کثرت پہ خوش ہونے لگ گئے تھے، تمہاری کثرت نے تمہیں خوشی میں ڈال دیا پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین تم پر تنگ ہوگئی باوجود کشادہ ہونے کے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب افراتفری میں انسان بھاگتا ہے تو چھپنے کی جگہ نہیں ملتی حالانکہ زمین اتنی کشادہ ہے لیکن اس وقت پتہ نہیں چلتا کہ اب کدھر جائے، ایسے ہوتا ہے جیسے راستہ ہی نہیں مل رہا، کشادگی کے باوجود زمین تنگ ہونے لگ گئی اور تم پیٹھ پھیر کے بھاگ گئے۔

پھر اللہ نے اپنا اطمینان اتارا اپنے رسول پر اور مؤمنین پر اور ایسے لشکر اتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا، اس کا مصداق فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نصرت کے طور پر اتارے اور عذاب دیا اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا اور کافروں کا یہی بدلہ ہے، ان کو دنیا میں بھی رسواء کیا جاتا ہے اور آخرت کا عذاب تو ہوگا ہی، پھر اللہ تعالیٰ توجہ فرمائے گا یہ مضارع کے ساتھ ذکر کر دیا گیا مفہوم ماضی والا ہوتا ہے کیونکہ اس کے بعد اکثر و بیشتر لوگ مسلمان ہو گئے تھے پھر اللہ توجہ فرماتا ہے اس کے بعد جس پہ چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے یعنی اس کے بعد کافروں کو سزا ہوئی، شکست کھا گئے، پکڑے گئے، قتل ہوئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس پہ چاہا توجہ فرمائی یعنی اس کو ایمان کی توفیق دے دی۔

حرم میں مشرکوں کے داخلہ کی ممانعت:

یہ بات بھی آپ کے سامنے تفصیل سے عرض کر دی تھی کہ یہ غزوہ سن آٹھ ہجری شوال کے مہینے میں پیش آیا تھا اور رمضان المبارک میں مکہ معظمہ فتح ہوا اور شوال کے اندر یہ غزوہ حنین پیش آیا اور اس کے متصل ہی چھوٹے چھوٹے غزوات پیش آئے کیونکہ جب یہ میدان چھوڑ کے بھاگ گئے تھے تو کوئی پارٹی کدھر کو نکل گئی اور کوئی کدھر کو

نکل گئی تو حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مختلف جماعتیں ان کے پیچھے لگادی تھیں اس لیے غزوہ اوطاس اور غزوہ طائف وغیرہ سب اسی کے ساتھ ہی تعلق رکھتے ہیں، اوطاس میں تھوڑا سا مقابلہ ہوا پھر یہ جا کے طائف کے قلعوں میں محصور ہو گئے تھے وہاں بھی آپ نے ان کا محاصرہ جاری رکھا ہے لیکن پھر ایسے ہی چھوڑ کے آ گئے تھے ان کا پیچھا اس طرح نہیں کیا کہ بالکل ہی ان کو نیست و نابود کر دیا جاتا بہر حال ان کے قدم اکھڑ گئے، فیصلہ کن شکست ہوگئی تو یہ سارے غزوات اسی سفر میں ہی پیش آئے ہیں پھر آپ ﷺ واپس تشریف لے گئے تھے، تو آٹھ ہجری کا حج بالاہتمام نہیں ہوا اس میں اسی طرح چھٹی تھی، جس طرح مشرکین آتے اور آ کے ننگے طواف کرتے تھے تو اس سال اسی طرح آزادی رہی۔

اگلا سال نو ہجری کا آ گیا تو نو ہجری کے حج میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کے بھیجا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ بھیجا تھا اور اس وقت اعلان کر دیا تھا کہ آئندہ کے لیے مشرکین کا داخلہ بند ہے نہ کوئی ننگا شخص طواف کرے اور نہ ہی آئندہ کوئی مشرک حج کرنے کے لیے آئے اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے چنانچہ اس کے آس پاس ایام میں ہی حرم مکہ کفار اور مشرکین سے بالکل صاف کر لیا گیا تھا جیسا کہ اسی سورۃ کے پہلے رکوع میں تفصیل گزر چکی ہے اب اس کے متعلق ہی ہدایات دی جا رہی ہیں۔

" یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا " اے ایمان والو! مشرک ناپاک ہیں، نجس ہیں، نجاست ان میں کس طرح ہے؟ ایک تو نجاست ظاہری ہوتی ہے جیسے کوئی شخص پیشاب، پاخانہ سے آلودہ ہے یہ ظاہری نجاست ہے، ایک نجاست معنوی ہوتی ہے جس کو آپ حدث کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کہ یہ جنبی ہے اور ایک نجاست معنوی ہوتی ہے جس کو آپ خباثت طبعی سے تعبیر کرتے ہیں جیسے عقائد فاسدہ کسی نے دل کے اندر چھپا کے رکھے ہوں تو یہ بھی نجاست ہے تو مشرکوں کے اندر تینوں نجاستوں کا ہی احتمال ہے۔

جیسے شراب وغیرہ کے عادی تھے تو ظاہری بدن بھی پاک نہیں ہو سکتا، پیشاب وغیرہ سے احتیاط نہیں کرتے اور حدث بھی ہو سکتا ہے کہ جنبی ہونے کی حالت میں غسل نہیں کرتے اور عقائد فاسدہ بھی مراد ہو سکتے ہیں لیکن ظاہری بدن ناپاک ہونے کی صورت میں مسجد میں نہ آئیں یہ حکم ایسا نہیں کہ جو صرف مشرکوں کے ساتھ خاص ہو، یہ حکم مسلمانوں کے متعلق بھی ہے کہ اگر ان کا بدن پاک نہیں یا ان کو حدث ہے تو ایسی صورت میں وہ مسجد میں نہیں آ سکتے جیسے حائضہ عورت نہیں آ سکتی، جنبی آدمی نہیں آ سکتا یہ حدث کی حالت ہے اور ظاہری بدن ناپاک ہو تو بھی مسجد

میں نہیں آنا چاہیے۔

کافروں کے دخولِ مسجد کے بارے میں ائمہ فقہاء رحمہم اللہ کا مسلک:

یہاں جس قسم کی نجاست ان کے متعلق ذکر کی جارہی ہے جس کی وجہ سے کہا جارہا ہے کہ یہ مسجد حرام کے قریب نہ آئیں یہ ان کے عقائد فاسدہ ہیں اور قریب نہ آئیں کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کرنے کے لیے نہ آئیں، ان کو مسجد حرام میں عبادت کرنے کا حق نہ دیا جائے، ان کو اب حج کرنے اور طواف کرنے کی اجازت نہ دی جائے، احناف کے ہاں اس کی مراد یہی ہے اس لیے اگر کوئی ظاہری طور پر صاف ستھرا ہے، نہا کے آیا ہے، صاف کپڑے اس نے پہن رکھے ہیں تو کسی مصلحت کے تحت اس کو مسجد میں بٹھا دیا جائے یا مسجد میں اس کو داخل ہونے کی اجازت دے دی تو احناف کے مسلک کے یہ خلاف نہیں ہے۔

چنانچہ یہی وفد ہوازن جو آیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اطاعت کا اظہار کرنے کے لیے غالباً اس موقع پر یا کسی دوسرے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا اور مدینہ منورہ میں بھی ثمامہ بن اثال ایک مشرک تھا جو پکڑا گیا تھا اس کو بھی مسجد میں باندھا گیا تھا اس قسم کے جو وفود آتے تھے چاہے انہوں نے ابھی تک ایمان قبول نہ کیا ہو اکثر و بیشتر حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں مسجد میں ہی ٹھہراتے تھے تو ہمارے ہاں کافر کا داخلہ مسجد میں مطلقاً ممنوع نہیں ہے کسی مصلحت کے تحت اس کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت ہے لیکن کافر کو مسجد میں عبادت کرنے اور شرکیہ رسوم کی ادائیگی کی اجازت نہیں دی جائے گی اس لیے حرم میں کفار کا داخلہ احناف کے نزدیک جائز ہے لیکن بطور غلبہ کے نہیں اور دنیا کی باقی مساجد کا بھی یہی حکم ہے۔

باقی ائمہ کے نزدیک جن میں سے امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک تو ساری دنیا کا مسئلہ ایک ہی ہے کہ کسی کافر کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے چاہے مسجد حرام ہے، چاہے مسجد نبوی ہے، چاہے کوئی اور مسجد ہے کافر مسجد میں نہ آئے مسلمانوں کو اس بات کا حکم ہے مطلقاً ممانعت ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حکم مسجد حرام کے متعلق ہے اور مسجد حرام سے سارا حرم مراد ہے اور اس میں کافر کا داخلہ ممنوع ہے باقی مسجدوں کے متعلق یہ حکم نہیں ہے لیکن حرم کے بارے میں ان کا مسلک یہی ہے کہ حرم کے اندر کافروں کے داخلہ کو مطلقاً روک دیا گیا ہے۔

کافروں کو حرم سے باہر رکھنے کے لیے سعودی حکومت کا اہتمام:

اور موجودہ سعودی حکومت چونکہ حنبلی مسلک کی ہے اس لیے وہ اسی مسلک پر ہی ہیں کہ حرم کی حدود میں کسی کو آنے نہیں دیتے جتنی سڑکیں باہر سے آتی ہیں ان میں سے ہر سڑک پر حرم سے باہر بڑے بڑے بورڈ لگے ہوئے ہیں اور ان پر لکھا ہے "ممنوع دخول غیر المسلمین" غیر مسلم کا داخلہ ممنوع ہے اور یہی عبارت انگریزی میں بھی لکھی ہوئی ہے بڑے بڑے بورڈ لگا کے حد بندی کر دی گئی کہ اس سے آگے غیر مسلم نہ آئے، چوری چھپے اگر کوئی چلا جائے اور ان کو پتہ چل جائے تو وہ گرفتار کرلیں گے یا مرزائی اگر کوئی چلا جائے اور ان کو پتہ چل جائے کہ یہ مرزائی ہے تو اس کو گرفتار کرلیتے ہیں اور ارد گرد پھرنے کے لیے ان کی علیحدہ سڑکیں بنادی گئیں چنانچہ یہ لوگ طائف جانے کے لیے مکہ معظمہ کا راستہ اختیار نہیں کر سکتے بلکہ ان کے لیے حرم سے باہر ایک علیحدہ سڑک بنائی گئی ہے اب تو وہ سڑک جو غیر مسلموں کے لیے بنائی گئی ہے لوگ اس کو کافر روڈ کہتے ہیں کیونکہ وہ کافروں کے لیے بنائی گئی ہے تاکہ ان کا داخلہ حرم کے اندر نہ ہو اور یہ حرم سے باہر باہر گزر جائیں تو وہ حرم مکہ میں بھی نہیں آنے دیتے اور حرم مدینہ میں بھی نہیں آنے دیتے وہاں بھی اسی طرح سڑکوں کے ارد گرد بورڈ لگے ہوئے ہیں جس پر یہ لکھا ہے کہ اس سے آگے غیر مسلم نہ آئے۔

بہر حال ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ بطور حج کرنے اور بطور عمرہ اور طواف کرنے کے ان کو مسجد کے قریب نہ آنے دیا جائے یہ ناپاک لوگ ہیں، یہ گندے لوگ ہیں اور یہاں گندگی سے عقائد کی گندگی مراد ہے، ظاہری اور حسی گندگی مراد نہیں اور اگر ظاہر میں گندگی مراد ہو تو پھر ظاہری گندگی کے ساتھ تو مسلمان بھی مسجد میں نہیں آسکتا، بہر حال جس وقت مسجد میں جائیں تو ظاہری بدن بھی پاک صاف ہو اور معنوی حدث سے بھی طہارت حاصل ہو اس لیے ہمارے ہاں اس آیت کی مراد یہی ہے کہ جس طرح پہلے وہ آتے تھے، ان کو تسلط حاصل تھا، حج کرنے کے لیے آتے تھے، عمرہ کرنے کے لیے آتے تھے، طواف کرنے کے لیے آتے تھے اس لحاظ سے ان کو قریب نہ آنے دیا جائے۔

آیت کا مفہوم:

اے ایمان والو! مشرک ناپاک ہیں، مشرک سراپا ناپاک ہیں یہ مسجد حرام کے پاس نہ آئیں اس سال کے بعد "وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً" اب جس وقت مشرک قوموں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا تو ایک اشکال سامنے آتا تھا

کہ مکہ والوں کا تو گزران ہی تجارت پر ہے اور باہر کی قومیں جو تجارت کے لیے آتی ہیں وہ ساری مشرک اور کافر ہیں وہ حج کے بہانے سے آتے تھے اور ساتھ میں سامان لاتے تھے، حج بھی کرتے تھے اور خرید وفروخت بھی کرتے تھے اس طرح مکہ والوں کا گزارہ ہوتا تھا اب جس وقت ان کو حج کی ممانعت ہو جائے گی تو پہلے کی طرح نہیں آئیں گے جب نہیں آئیں گے تو خرید وفروخت بھی نہیں ہوگی یہ تو معاشی مشکلات پیدا ہو جائیں گی، یہ لوگ معاشی تنگی کے اندر مبتلاء ہو جائیں گے یہ ایک اندیشہ ہو سکتا تھا جس کو اگلے الفاظ میں زائل کر دیا گیا کہ اگر تمہیں احتیاج کا اندیشہ ہے کہ تم محتاج ہو جاؤ گے اور تجارت بند ہو جائے گی تو یاد رکھو! اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا اگر چاہے گا، اللہ کی مشیت ہوگی تو تمہیں غنی کر دے گا۔

چنانچہ ایسے ہی ہوا وہی تاجر قومیں جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اگر ان کا داخلہ بند ہو گیا تو ہم معاشی تنگی میں مبتلاء ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ نے ان سب کو مسلمان کر دیا، وہی مسلمان ہو گئے جب وہ مسلمان ہو گئے تو اب مسلمان ہی تجارت کرتے ہیں اور اتنی وسعت سے کرتے ہیں کہ پہلے سے بھی زیادہ خوشحالی ہو گئی جیسے آج موجودہ دور ہے اب بھی مکہ معظمہ کی خوشحالی تجارت کی وجہ سے ہی ہے اور مسلمان آتے ہیں اور خرید وفروخت وسعت کے ساتھ کرتے ہیں اور اہل مکہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتنی خوشحالی کر دی کہ جس کا کوئی حد وحساب ہی نہیں ہے، بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

اہل کتاب کا ذکر:

" قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" سے لے کر " فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ " تک اہل کتاب کے متعلق احکامات آرہے ہیں، پیچھے مشرکین کے متعلق ہدایات دی گئیں تھیں اور یہاں سے اہل کتاب کا ذکر شروع ہو رہا ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے ہیں تو اردگرد یہود کے قبائل آباد تھے ان کے ساتھ معاہدے ہوئے، ٹوٹے، اختلافات ہوئے، آخر کار یہود کے قبائل میں سے کچھ قبائل لڑائی کے اندر مارے گئے، قتل کیے گئے اور کچھ جلا وطن ہو گئے اور جلا وطن ہونے والے خیبر کے علاقہ میں آباد ہو گئے تھے، صلح حدیبیہ کے بعد مکہ معظمہ کے فتح ہونے کے بعد پھر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو فتح کیا ہے مشرکین کے متعلق تو یہ اعلانات آ گئے جس کا حاصل یہ تھا کہ اس علاقہ کو ان سے صاف کر لیا جائے اور مشرکین مکہ کے لیے دو ہی صورتیں سامنے رکھی گئی تھیں کہ یا

اسلام یا تلوار اور تیسری شق یہ تھی کہ اگر اس علاقہ کو چھوڑ کے جانا چاہیں تو چھوڑ جائیں وہاں رہتے ہوئے مشرکین کا وجود گوارہ نہیں ہے۔

البتہ اہل کتاب کے متعلق اتنی سی گنجائش رکھی گئی تھی کہ اگر وہ جزیہ دینا قبول کرلیں، اسلامی حکومت کو قبول کرکے ان کے ماتحت رہنا گوارہ کرلیں، مزاحمت چھوڑ دیں تو ان کے لیے گنجائش تھی کہ وہ وہاں رہ سکتے ہیں، ان آیات کے اندر صرف اہل کتاب سے جزیہ لینے کا ذکر ہے۔

وصول جزیہ کے بارے میں ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم کا مسلک:

جزیہ کا لفظی معنیٰ بدلہ ہے اور اس کا مصداق کچھ رقم ہے جو اہل کتاب سے لی جاتی تھی ان کے جان، مال اور عزت کے تحفظ کے بدلہ میں، قرآن کریم میں غیر اہل کتاب سے جزیہ لینے کا ذکر نہیں ہے لیکن روایات حدیث سے ثابت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں سے بھی جزیہ لیا ہے اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشرکین عرب کے علاوہ باقی دوسری جگہوں کے کافروں سے بھی جزیہ لیا ہے اور جزیہ کی گنجائش رکھی ہے، اور ائمہ اربعہ کے نزدیک متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اہل کتاب ہوں یا کوئی کافر ہوں اگر وہ مسلمانوں کی حکومت قبول کرلیں اور ان کے ماتحت رہنا گوارہ کرلیں تو ان سے جزیہ لیا جاسکتا ہے اور نزول قرآن کے وقت مسلمانوں کا تصادم چونکہ اہل کتاب سے ہی تھا، مشرکین مکہ کا تو فیصلہ ہوگیا اس لیے خصوصیت کے ساتھ یہاں تذکرہ اہل کتاب کا ہے۔

"قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ" کا مفہوم:

"مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ" یہ "الذین" کا بیان ہے، ان لوگوں سے لڑو جو کتاب دیے گئے ان کا حال یہ ہے کہ "لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ" نہ یہ اللہ پہ ایمان لاتے ہیں، نہ یوم آخرت پہ ایمان لاتے ہیں اور نہ اللہ اور اس کے رسول کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں، یہ اہل کتاب کے متعلق تذکرہ ہوا کہ ایسے اہل کتاب سے لڑو، بظاہر اہل کتاب اللہ کو مانتے تھے اور یوم آخرت پہ بھی ان کا ایمان تھا، توحید، رسالت اور معاد ان کے عقیدوں میں شامل ہے، ان کے ساتھ اگر بنیادی طور پر اختلاف تھا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کو تسلیم کرنے پہ تھا اس لیے یہود کو جب دعوت دی گئی تو یہی دعوت دی گئی کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کرلو، نصاریٰ کو بھی یہی دعوت دی گئی ہے، مشرکین مکہ سے بنیادی اختلاف توحید

کا تھا اس لیے وہاں زیادہ زور توحید پہ دیا گیا ہے اور مدینہ منورہ میں مخاطب چونکہ اہل کتاب تھے اور وہ توحید کے مدعی تھے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُوْسٰی كَلِيْمُ اللّٰهِ" کہتے تھے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عِيْسٰی رُوْحُ اللّٰهِ" کہتے تھے "لا اله الا الله" کے قائل تھے وہاں زیادہ تر مسئلہ رسالت کا آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مانو۔

اس آیت میں یہ کہا جا رہا ہے کہ ان کا نہ اللہ پر ایمان ہے اور نہ یوم آخرت پر جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے کے بعد اگر کوئی شخص اللہ اور یوم آخر کو ماننے کے لیے رسول کا واسطہ اختیار نہیں کرتا تو اس کا نہ اللہ کو ماننا معتبر ہے اور نہ یوم آخرت کو ماننا معتبر ہے، اللہ کو اس طرح مانا جائے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تو ایمان باللہ معتبر ہے اور آخرت پر ایمان اسی طرح رکھا جائے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں تو ایمان بالآخرت معتبر ہے، اب وہ اللہ کے قائل تھے اور توحید کے مدعی تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے عقیدے ایسے ایسے اختیار کر لیے جن کے اندر شرک شامل ہو گیا جیسے اگلی آیات میں آئے گا کہ انہوں نے عزیر کو ابن اللہ کہا یا کسی نے مسیح کو ابن اللہ کہا تو اس قسم کے عقیدے اختیار کرنے کے ساتھ ان کی توحید بے معنیٰ ہو کے رہ گئی اس لیے ان کی توحید معتبر نہیں ہے اور اللہ پر ایمان لانا معتبر نہیں ہے۔

آخرت کا عقیدہ رکھتے تھے کہ آخرت آئے گی، قیامت آئے گی، اللہ کے سامنے حساب کے لیے پیش ہونا ہے لیکن ساتھ ہی انہوں نے "نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ" کے عقیدے بنا لیے اور کہتے تھے کہ ہمارے لیے تو مغفرت ہی ہے، ہم تو مقبولین کی اولاد ہیں، ہم تو بخشے جائیں گے اس قسم کے عقیدے نے ان کا ایمان بالآخرت بھی بے حقیقت کر دیا۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کے توحید کو نکھارا اور آخرت کا صحیح مفہوم واضح کیا تو اب اللہ اور آخرت پر وہی ایمان معتبر ہے جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کے مطابق ہو گا اس لیے اگر یہ زبان سے "لا اله الا الله" کہیں بھی تو ان کا کوئی اعتبار نہیں، آخرت کے عقیدے کا اظہار کریں تو بھی کوئی اعتبار نہیں۔

اور اگلی بات تو صاف ہے کہ اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو یہ حرام نہیں ٹھہراتے بلکہ بہت ساری چیزوں کو انہوں نے اپنے لیے حلال کر لیا حالانکہ اللہ کی طرف سے وہ حرام ہیں اور بعض چیزوں کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اور ان کو یہ حلال سمجھتے ہیں تو یہ اللہ کے احکام بھی تسلیم نہیں کرتے، دین حق کو قبول نہیں کرتے تو جب یہ ساری باتیں ان کے اندر پائی گئیں تو اب ان کے لیے یہ حق نہیں کہ اپنے لیے علمی سیادت اور قیادت کا دعویٰ کریں اب ان کی وہ قیادت

منسوخ کردی گئی اب ان کا حکم بھی باقی کفار کی طرح ہے لیکن صرف اتنی رعایت رکھی گئی کہ اگر یہ جزیہ دے دیں اور مسلمانوں کا غلبہ تسلیم کر کے ماتحتی تسلیم کر لیں تو پھر ان کو زندہ رہنے کا حق ہے یہ "حتیٰ" "قاتلوا" کی غایت ہے، ان کے ساتھ اس حد تک لڑائی لڑو جب تک کہ وہ جزیہ نہ دے دیں "عن ید" میں "عن" سببیہ ہے اور "ید" کا معنی ہے غلبہ یعنی جب تک مسلمانوں کے غلبہ کے سبب سے جزیہ نہ دے دیں اس وقت تک ان کے ساتھ لڑائی جاری رکھو "وَهُمْ صَاغِرُوْنَ" اور اس حال میں کہ وہ مسلمانوں کے سامنے ذلیل ہو جائیں، ذلیل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تابع ہو جائیں، مطیع ہو جائیں، مسلمانوں کے آئین کو قبول کر لیں ایسے طور پر اگر جزیہ دینے لگ جائیں تو بھی ان کے ساتھ لڑائی کو بند کیا جا سکتا ہے۔

اللہ کی طرف اولاد کی نسبت عیب ہے:

اب یہ جو آیا تھا کہ ان کا اللہ پر ایمان نہیں اس کی یہ وضاحت ہے "وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ" یہود کہتے تھے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اللہ کے لیے ابنیت کا قول کر دیا اور بیٹا ہر لحاظ سے باپ کا ہم جنس ہوتا ہے، باپ کی صفات اس کے لیے ثابت ہوتی ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ عزیر علیہ السلام کے لیے بھی الوہیت ہو گئی، اللہ کی صفت بیٹے کے لیے بھی ہو گئی کیونکہ بیٹا باپ کا ہم جنس ہوتا ہے تو جب انہوں نے ابنیت کا قول کر لیا تو ان کی توحید کہاں رہی؟ ان کا اللہ کو ماننا کیسے معتبر رہا؟

حضرت عزیر علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ساڑھے چار سو یا پانچ سو سال پہلے گزرے ہیں اور ان کا زمانہ اہل کتاب کی انتہائی مظلومیت کا زمانہ ہے، بخت نصر جو کہ عراق کا بادشاہ تھا اس نے اہل کتاب کو بہت اجاڑا جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں آئے گا اس نے کس طرح ان کو مارا تھا اور کس طرح ان کو گرفتار کر کے لے گئے تھے اور مسجد اقصیٰ کو بھی برباد کر دیا تھا اور توراۃ بھی اس وقت تقریباً ناپید ہو گئی تھی، اس نے توراۃ کو بھی ضائع کر دیا تھا، حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے پیغمبر ہیں انہوں نے اپنی یادداشت کے ساتھ توراۃ کو دوبارہ مرتب کیا ہے اس لیے بعض مفسرین کا خیال یہ بھی ہے کہ ان کو جو ابن اللہ مشہور کیا گیا تھا شاید اس کے پس منظر میں یہ بات ہو کہ ان کی حیثیت کو عام انسانوں سے زیادہ کر کے اللہ کے ساتھ ان کا خاص رشتہ قائم کر کے توراۃ کی مقبولیت کو زوردار بنایا جا سکے اور لوگوں کے دل و دماغ کے اوپر زور ڈالا جا سکے کہ اگر توراۃ پہلے اللہ نے اتاری تھی اور وہ ہمارے ہاتھوں سے ضائع ہو گئی تو اب یہ اللہ کے بیٹے کی مرتب کی ہوئی ہے اس کی حیثیت وہی ہے جو پہلے تھی، اس کی حقانیت کو زیادہ

ثابت کرنے کے لیے اور لوگوں کے دل ودماغ پر رعب ڈالنے کے لیے گویا کہ مرتب کے لیے انہوں نے ابن اللہ کا لفظ استعمال کیا اور اس کے بعد جہالت کے زور سے وہ حقیقت میں بیٹا سمجھنے لگ گئے، مغالطے اس طرح ہوا کرتے ہیں تو پہلے چاہے کسی اچھے نظریہ کے ساتھ ہی کوئی لفظ استعمال ہوا ہو اور بعد میں لوگوں کے درمیان اس کا مفہوم خلط ملط ہو گیا ہو۔

جیسے ہمارے مفسرین لکھتے ہیں کہ پرانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے اب کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن اس کا مفہوم وہ نہیں جو باپ کا ہوتا ہے اور ابن کا لفظ اگر استعمال ہوا ہے تو اس کا وہ مفہوم نہیں جو بیٹے کا ہوتا ہے یہ اپنے زمانے کی بات ہے۔

بہر حال یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ کا نظریہ وضع کیا چاہے ابتداء کیسے ہوئی اور اسی طرح نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کے متعلق ابنیت کا نظریہ وضع کیا اس کی بنیاد انہوں نے اس بات پر رکھی کہ جب خارج میں ان کا باپ کوئی نہیں تو اس کی نسبت اللہ کی طرف قائم کر دی بہر حال جس وقت اللہ کے متعلق یہ نظریہ قائم کر دیا کہ اللہ کی اولاد ہے، اللہ کا بیٹا ہے تو پھر توحید بے معنیٰ ہوگئی کیونکہ بیٹا باپ کا ہم جنس ہوتا ہے اگر باپ کے لیے الوہیت ثابت ہے تو بیٹے کے لیے بھی الوہیت ثابت ہونی چاہیے، خلاف جنس اگر ثابت کریں گے تو یہ عیب ہے، ہم جنس اگر ہوگا تو اس کے لیے بھی الوہیت ایسے ہوگی جیسے اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔

تو اولاد کا نظریہ اللہ کی طرف یہ عیب کی نسبت ہے جیسے جس طرح سے اللہ تعالیٰ آگے جا کر "سُبْحَانَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" کے اندر عیوب سے اپنی پاکی کو ذکر کریں گے جس کے ساتھ ان کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے۔

ایک بھڑ بھونجے نے عیسائی پادری کو لاجواب کر دیا:

ہندوستان میں جس وقت انگریزوں کی حکومت آئی اور ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لیے پادریوں کا سیلاب آیا تو جگہ جگہ عیسائی پادری تقریریں کرتے تھے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے اور مسلمان چونکہ بٹ چکے تھے، حکومت ان کی ضائع ہوگئی تھی اس لیے لوگوں کے دلوں میں مرعوبیت تھی لیکن علماء کا طبقہ ایک ایسا طبقہ تھا جو علمی سطح پر ان کے مقابلہ میں آتا تھا تو اس وقت عجیب وغریب لطیفے بنتے تھے۔

ایک واقعہ کتاب میں نقل کیا گیا ہے کہ ایک پادری دہلی میں تقریر کر رہا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ثابت کر رہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے تو یہ جو بھٹیوں پر دانے بھونا کرتے ہیں ان کو کہتے ہیں بھڑ بھونجے تو ایک

بھڑ بھونجا اٹھ کر کھڑا ہوگیا، ان پڑھ سا تھا تو پادری سے سوال کرتا ہے کہ پادری! عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں؟ تو پادری کہنے لگا ہاں عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، تو اس نے پوچھا کہ ان کے علاوہ کوئی اور بیٹا بھی ہے تو پادری کہنے لگا کہ نہیں اور کوئی بیٹا نہیں یہ اکلوتا بیٹا ہے اور ان کی کتابوں میں اکلوتا بیٹا ہی لکھا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا اکلوتا بیٹا ہے تو بھڑ بھونجا کہنے لگا کہ بتایئے کہ اس میں اللہ کا کیا کمال ہے کہ اس نے اتنے عرصے میں ایک ہی بنایا، میری شادی کو اتنے سال ہوئے ہیں اور میرے بارہ بیٹے ہیں اتنے سالوں میں میرے تو بارہ ہوگئے اور اللہ تعالیٰ نے ایک ہی بنایا۔

اب یہ بظاہر دیکھنے میں جاہلانہ اعتراض ہے لیکن پادری چپ ہوگیا جس وقت یہ بات دیوبند میں حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچی جو دارالعلوم کے صدر اول ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ پادری کیا پادری کا باپ بھی آجائے تو جواب نہیں دے سکتا کہ بھڑ بھونجے کی بات کا حاصل یہ ہے کہ بتاؤ اولاد کا ہونا کمال ہے یا نقص، انہوں نے اس کو یہ علمی اصطلاح چڑھادی، اگر اولاد نقص ہے تو ایک بھی عیب ہے تو ایک بھی نہیں ہونا چاہیے اور اگر یہ کمال ہے تو جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کے اندر کمال ہر مخلوق سے زیادہ ہے، جو کمال کی صفت ہے وہ اللہ تعالیٰ میں سب سے زیادہ ثابت ہے تو پھر اگر اولاد کا ہونا کمال ہے تو پھر اللہ کی اولاد دنیا میں سب سے زیادہ ہونی چاہیے کہ اس کے مقابلہ میں مخلوق اس کا مقابلہ نہ کرسکتی تو یہ کیسا کمال ہوا کہ اللہ کی مخلوق اللہ سے بڑھ گئی، اگر اولاد کا ہونا کمال ہے تو اولاد اللہ کی اتنی ہونی چاہیے تھی کہ مخلوقات میں سے کسی کی اتنی نہ ہوتی تاکہ یہ کمال سب سے زیادہ اللہ میں موجود ہوتا۔

اور اگر یہ نقص ہے تو جس طرح سو کا ہونا نقص ہے تو ایک کا ہونا بھی نقص ہے تو بات اس طرح سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت بہر حال عیب ہے جس کو اللہ تعالیٰ "سُبْحٰنَهٗ" کے لفظ کے ساتھ رد فرماتے ہیں یہ بھی ایک شرک کا شعبہ ہے کہ جو انہوں نے ابن قائم کر کے دوسروں کو میری الوہیت میں شریک کرلیا میں تو ان کے شریک کرنے سے پاک ہوں، اس قسم کا عیب میرے اندر نہیں ہے، دوسری آیت کے اندر اور بھی مختلف انداز کے ساتھ اس کی تردید کی گئی ہے " اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ " کہ اللہ کی اولاد کیسے ہوسکتی ہے اس کی کوئی بیوی تو ہے نہیں یعنی اگر تم نے بیٹے کو اسی مفہوم میں لینا ہے جس طرح دنیا میں بیٹا ہوتا ہے تو پہلے اللہ کی کوئی بیوی تو ثابت کرو پھر اللہ کی بیوی ثابت کر کے اس کے ساتھ اللہ کے اسی قسم کے تعلقات ثابت کرو جو دنیا میں خاوند بیوی کے ہوتے ہیں تو یہ اللہ کی شان کیا ہوئی یہ تو عیب ہی ہے تو جب اس قسم کے ان کے نظریے ہیں تو

ان کا ایمان باللہ معتبر نہیں۔

یہود و نصاریٰ کا یہ عقیدہ بے بنیاد ہے:

"ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ" یہ ان کی اپنی مونہوں سے بولی ہوئی باتیں ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ خارج میں کوئی واقعہ نہیں ہے، بات جو ہوا کرتی ہے اگر تو خارج میں کوئی واقعہ ہو اور وہ خبر اس خارج کے واقعہ سے اخذ کی گئی ہو تو اس کا مصداق خارج میں ہوتا ہے اور اگر خارج میں اس کا مصداق نہیں اور اپنی طرف سے بنالی تو ایک منہ سے بولی ہوئی بات ہے اس میں حقیقت کچھ نہیں، یہ ان کے اپنے مونہوں کی بولی ہوئی باتیں ہیں "ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ" جو لوگ پہلے کافر ہوئے یہ ان کی نقل اتارتے ہیں، یہ نقال ہیں حقیقت ان کے سامنے بھی نہیں "الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ" سے کون مراد ہیں؟ یا تو موجودہ یہود و نصاریٰ کے پیشوا کہ یہ تنقید تو ان پہ کی جارہی ہے جو اس وقت موجود ہیں اور کہا جارہا ہے کہ ان کے پہلوں نے کفر ایجاد کیا اور یہ پچھلے ان کی نقل اتارتے ہیں اس بات کی تحقیق انہوں نے بھی نہیں کی کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟ جنہوں نے پہلے کفر ایجاد کیا ہے اور اس قسم کی بات بولی ہے یہ اس کی نقل اتارتے چلے آرہے ہیں اور یا "الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ" سے مشرکین اقوام مراد ہیں جن کا نظریہ تھا کہ فرشتے بنات اللہ ہیں، یہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں مشرکین مکہ کا بھی یہی نظریہ تھا اور بعضے دوسری اقوام جو مشرکانہ ہیں ان کا بھی یہی نظریہ تھا کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، انہوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں تو نہ کہا اور ایک ایک بیٹا تجویز کرلیا کہ فلاں اللہ کا بیٹا ہے، فلاں اللہ کا بیٹا ہے تو یہ مشرک لوگوں کی نقل اتارتے ہیں جیسی بات انہوں نے کہہ دی تو ویسی انہوں نے شروع کردی دونوں طرح اس کا مطلب ذکر کیا جاسکتا ہے، باقی آج جو یہودی موجود ہیں ان میں کوئی شخص عزیر ابن اللہ کا قائل نہیں ہے ہمارے مفسرین جس طرح سے لکھتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس وقت قرآن اتر رہا تھا اور قرآن کریم نے یہ آیات نقل کیں اس وقت ایسے یہود موجود ہوں گے جو اس نظریہ کے تھے ورنہ فوراً وہ اس بات کے اوپر اعتراض کرتے کہ قرآن کریم ہم پر اتہام لگاتا ہے اور یہ غلط کہتا ہے، ہم کوئی عزیر ابن اللہ کے قائل نہیں اور تاریخ کے کسی ورق پر یہود کا یہ اعتراض منقول نہیں اور اگر اس قسم کی بات ہوتی تو وہ قرآن کریم کے خلاف شور مچادیتے کہ ہمارے اوپر اتہام ہے، ہم پر بہتان لگایا جارہا ہے، ہم عزیر ابن اللہ کے قائل نہیں ہیں۔

احبار ورہبان کو رب بنانے کے متعلق حضرت عدی رضی اللہ عنہ کا سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب:

جس طرح آگے ایک بات آرہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" ان یہود ونصاریٰ نے اپنے احبار ورہبان کو "اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" بنالیا ہے، اس بات پر اعتراض ہوا ہے، حاتم طائی جو مشہور سخی گزرا ہے یہ عیسائی تھا، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہے لیکن ایمان نہیں لایا، یہ اسی طرح عیسائیت پہ مرا ہے اور اس کا بیٹا عدی مسلمان ہوا ہے، عدی بن حاتم جس وقت مسلمان ہو کے آئے چونکہ یہ عیسائی تھے، نصرانی تھے تو اس نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ اعتراض کیا یا رسول اللہ! قرآن یہ کہتا ہے "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" حالانکہ ہم لوگ یا عیسائی لوگ احبار ورہبان کو رب تو نہیں بناتے تو گویا کہ اس کے نزدیک یہ بات اپنے عقائد کے مطابق خلاف واقعہ ہے اس لیے جب وہ مسلمان ہو کے آیا تو اس نے یہ اعتراض کیا کہ قرآن کیسے کہتا ہے کہ انہوں نے احبار ورھبان کو رب بنالیا ہے حالانکہ عیسائی اور یہودی تو ان کو رب نہیں کہتے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا احبار ورھبان کے متعلق ان کا یہ رویہ نہیں کہ جن چیزوں کو یہ چاہیں حلال کردیں چاہے اللہ کی کتاب میں حرام ہی ہوں یہ حلال جاننے لگ جاتے ہیں اور جس چیز کو یہ چاہیں حرام کردیں چاہے اللہ کی کتاب میں حلال ہی ہو یعنی تحلیل وتحریم کا اختیار کیا ان لوگوں نے اپنے پیروں اور مولویوں کو نہیں دے رکھا؟ کیا ان علماء اور درویشوں کو یہ حیثیت نہیں دے دی؟ ان کے فتوے پر عمل کرتے ہیں چاہے کتاب اللہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، جس چیز کو چاہیں وہ منسوخ کردیں، جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرادیں، جس چیز کو چاہیں حرام ٹھہرادیں کیا یہ حیثیت احبار ورھبان کی نہیں ہے؟ وہ کہنے لگے جی یہ بات تو ہے تو فرمایا یہی اتخاذ رب ہے۔

یعنی قرآن کریم میں جس کے متعلق کہا ہے کہ انہوں نے اس کو رب بنالیا ہے تو رب بنانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کی اطاعت اس طرح کرنے لگ گئے کہ جس طرح رب کی کی جاتی ہے تو رب کا لفظ استعمال نہ کرو لیکن جب تم نے ان کو یہ حیثیت دے دی تو تم نے ان کو رب بنالیا، جس پر وہ خاموش ہوگئے تو معلوم ہوا کہ جس بات کو خلاف واقعہ سمجھا گیا تھا تو اس پہ اعتراض فوراً ہوگیا اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت کردی، وضاحت کرنے کے بعد وہ مطمئن ہوگئے تو اگر عزیر ابن اللہ والی بات بھی خلاف واقعہ ہوتی تو کوئی تو اس اعتراض کو اٹھاتا اور جب کوئی اس

اعتراض کو اٹھاتا تو اس کی وضاحت ہو جاتی جب انہوں نے آگے سے خاموشی سادھ لی، چپ ہو گئے تو معلوم ہوا کہ اس زمانے میں اس نظریہ کے لوگ تھے، آج اگر موجود نہیں ہیں تو اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے، فرقے اٹھتے ہیں، پیدا ہوتے ہیں، ختم ہو جاتے ہیں اس میں کوئی بات نہیں ہے۔

حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں حاجی امیر احمد خان رحمۃ اللہ علیہ ارواح ثلاثہ میں جن کی روایتوں سے بہت سارے واقعات لکھے ہوئے ہیں، یہ سیاح قسم کے آدمی تھے، یہ کہتے ہیں کہ جس وقت میں شام میں گیا تو بعض یہودی مجھے اس طرح کے ملے ہیں جو عزیر ابن اللہ کہتے تھے وہ لوگ عزیریہ کہلاتے ہیں یعنی وہ جماعت، وہ فرقہ عزیریہ کہلاتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی سطح پر نہ ہوں کہ جن کا کوئی تذکرہ ہو یا وہ اس قسم کے عقیدے کو علی الاعلان بیان نہ کرتے ہوں تو کچھ باقی بھی ہو سکتے ہیں لیکن عام طور پر مفسرین یہی لکھتے ہیں کہ اس وقت تو یہودی اس نظریہ کے نہیں ہیں اور اس زمانے میں ایسا ہوگا۔

یہود و نصاریٰ اب بھی احبار و رہبان کو رب کی طرح سمجھتے ہیں:

اور یہ واقعہ ہے کہ اس وقت بھی احبار و رھبان کی ان کے ہاں حیثیت یہی ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہی دین ہے، جو نظریہ وہ پیش کرتے ہیں وہی ان کے ہاں دین بن جاتا ہے، چند سال پہلے کی بات ہے جب میں کبیر والہ کے آخری سالوں میں تھا تو ایک دفعہ بہاولپور آیا تو ہم نے سنا کہ یہاں امریکہ کا ایک بہت بڑا گرجا گھر ہے تو ہم نے یہ خواہش کی کہ ہم گرجا گھر دیکھیں کہ اس میں کیا ہوتا ہے؟ تو اجازت لے لی، اس وقت یہاں ایک امریکی پادری تھا، ہم گئے تو اس نے گرجا گھر کھول دیا تو ہم نے اندر دیکھا کہ وہ ساری کیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دے رہے ہیں اور کس طرح سے پکڑ رہے ہیں اور کس طرح سے ان کو پھانسی پہ چڑھا رہے ہیں اور کس طرح سے اسے باندھ رہے ہیں وہ ساری کی ساری مجسم فلم بنا کے دیواروں پہ انہوں نے لگائی ہوئی ہے اور اتوار کے دن وہ عبادت کے لیے جمع ہوتے ہیں، اب ان کا قبلہ تو بیت المقدس ہے، ہم نے اس سے پوچھا کہ یہ نماز کس طرح سے پڑھتے ہیں؟ پادری کے کھڑے ہونے کی جگہ بھی دیکھی، کہتے ہیں کہ پہلے تو رواج تھا کہ پادری کا منہ بھی ادھر کو ہوتا تھا جدھر کو ہمارا قبلہ ہے اور قوم کا منہ بھی ادھر کو ہوتا تھا اب کچھ عرصہ سے ہم نے یہ رواج بدل دیا ہے، اب پادری کا منہ قوم کی طرف ہوتا ہے اور قوم کا منہ قبلہ کی طرف ہوتا ہے تا کہ قوم یہ دیکھتی رہے کہ پادری صاحب کیا پڑھتے ہیں اور کس طرح سے پڑھتے ہیں، انہوں نے اس کو قبول کر لیا یعنی قوم کا منہ اِدھر کو اور امام کا منہ اُدھر کو، اب وہ کہتے ہیں

کہ یہ طریقہ جاری ہے یعنی یہ میں نے خود سوال کیا ہے اور اس کی وضاحت انہوں نے یہ کی ہے یعنی کچھ دیر سے یہ طریقہ بدل دیا گیا ہے اب جس وقت بیٹھتے ہیں تو قوم کا منہ ادھر کو ہوتا ہے اور پادری کا منہ ادھر قوم کی طرف ہوتا ہے اور اس میں مقصد یہ ہے کہ قوم دیکھتی رہے کہ پادری کیا پڑھتا ہے اور کس طرح سے پڑھتا ہے تو جو طریقہ وہ تجویز کرلیں قوم اس کو قبول کرلیتی ہے انہوں نے احبار و رہبان کو یہ منصب دے رکھا ہے، وہ ان کو نائب خدا سمجھتے ہیں، جس طرح سے مسیح کو اللہ کا بیٹا بنایا تو اب ان کا جو پوپ اور بڑا پادری ہوتا ہے وہ سمجھو کہ مسیح کا قائم مقام ہوتا ہے، مسیح کا قائم مقام ہونے کی وجہ سے اس کے احکام کو یہ لوگ بالکل احکام الٰہیہ کے برابر سمجھتے ہیں تو جس وقت احکام الٰہیہ کے برابر سمجھتے ہیں تو چاہے اس کو رب نہ کہیں لیکن رب والا مفہوم ثابت ہوگیا جس وقت ثابت ہوگیا تو اتخاذ رب کی ان کی طرف نسبت کی جاسکتی ہے تو بہر حال حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے یہ اعتراض کیا تھا اور اس اعتراض کا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب دیا۔

اتخاذ رب والی بات مسلمانوں پر صادق نہیں آتی:

ہمارے ہاں یہ حیثیت نہیں ہے، ہم بھی مولوی سے فتویٰ لے کر کام کرتے ہیں، مولوی حلال کہہ دے تو ہم کہتے ہیں کہ حلال ہے، مولوی حرام کہہ دے تو ہم کہتے ہیں کہ حرام ہے یا ہم ائمہ مجتہدین سے پوچھتے ہیں لیکن ائمہ مجتہدین کی بات یا علماء کی بات ہمارے ہاں یہ حیثیت نہیں رکھتی کہ اگرچہ ہمارے علم میں ہو کہ اللہ کی کتاب میں اس کے خلاف ہے اور حدیث میں اس کے خلاف ہے تو بھی ہم اس کے فتوے کو مانیں یہ حیثیت امت مسلمہ میں نہیں ہے بلکہ وہ علماء پر اگر اعتماد کرتے ہیں تو اس لحاظ سے کرتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ کی تشریح کر کے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، مثال کے طور پر بالفرض اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے کہ اس طرح مولوی اکٹھے ہو کر کہہ دیں کہ نمازیں پانچ نہیں ہیں تین ہیں، تو قوم چاہے جاہل ہے جوتا اتار کے پٹائی کردے گی یعنی چاہے جاہل ہیں کیسے بھی ہیں اگر وہ اس قسم کی باتیں کرنا شروع کردیں تو آج ہی لوگ ڈنڈا اٹھا کر کھڑے ہو جائیں گے جاہل بھی اگر بات مانتے ہیں تو اس حیثیت سے مانتے ہیں کہ ہم براہ راست قرآن کریم سمجھتے نہیں، حدیث کو سمجھتے نہیں، یہ لوگ قرآن اور حدیث کی بات ہمیں بتاتے ہیں ہم ان کو ترجمان سمجھ کر ان کی بات لیتے ہیں، ہم ان کو مستقل حیثیت نہیں دیتے کہ ان کو احکام دینے کا حق ہے، ان کو احکام دینے کا قطعاً حق نہیں آج اگر ثابت ہو جائے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا

فلاں قول حدیث کے خلاف ہے، حدیث صحیح غیر مؤول غیر منسوخ کے خلاف ہے تو آج ہم اس قول کو چھوڑ دیں گے اور حدیث صحیح کو لیں گے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اقوال اگر ہم لیتے ہیں تو اس لیے لیتے ہیں کہ ان کو حدیث کی تشریح اور قرآن کریم کی تفسیر سمجھتے ہیں چنانچہ ان حضرات کا اپنا قول بھی ہے کہ ہمارے قول کے خلاف اگر تمہیں کوئی صحیح حدیث مل جائے یعنی حدیث صحیح کا مطلب یہ ہے کہ سند کے لحاظ سے صحیح ہو اور اس کا مفہوم قطعی ہو یعنی تاویل کی اس میں گنجائش نہ ہو اور وہ منسوخ نہ ہو اس قسم کی حدیث اگر سامنے آجائے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی مجتہد کے اجتہاد کو لینا جائز نہیں اور یہ خود ان ائمہ کے اقوال ہیں کہ اس قسم کی اگر حدیث مل جائے تو ہمارے قول کو چھوڑ دو لیکن حدیث جس قسم کی سامنے آتی ہیں جن کو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ فقہ کے اقوال کے خلاف ہیں یا وہ صحیح نہیں ہوتیں یا صحیح ہوتی ہیں تو قابل تاویل ہوتی ہیں یا وہ منسوخ ہوتی ہیں۔

فقہ حنفی کا مسئلہ حدیث صریح کے خلاف نہیں:

مثلاً یہی روایت عام طور پر لوگ سنتے رہتے ہیں " لَاصَلٰوةَ اِلَّابِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ " لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو! متفق علیہ روایت ہے بخاری میں بھی ہے، مسلم میں بھی ہے " لَاصَلٰوةَ اِلَّابِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ " صحیح حدیث ہے لیکن اس کے مقابلہ میں یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول لیتے ہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے قراءت نہیں کرنی چاہیے یہ مثال دے رہا ہوں کہ فقہاء کا یہ قول حدیث کے خلاف ہے یہ حدیث صحیح کو چھوڑتے ہیں اور امام کا قول لیتے ہیں، یہ غلط اتہام ہے۔

حدیث صحیح ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن یہ صریح نہیں، قابل تاویل ہے، "لَا صَلٰوةَ " کا جو لفظ ہے یہ حدیث شریف کے اندر دو مفہوم ادا کرتا ہے کہ لا نفی جنس کے لیے بھی ہوتا ہے اور لا نفی کمال کے لیے بھی ہوتا ہے اگر لا نفی جنس کے لیے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بالکل سرے سے نماز ہوئی ہی نہیں اس میں یہ احتمال بھی ہے اور نفی کمال کے لیے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نہیں پڑھو گے تو کامل نہیں ہوگی، نماز صحیح ہے لیکن اس میں کمال نہیں آئے گا دونوں احتمال اس میں نکل آئے تو یہ اگر ثبوت کے اعتبار سے روایت قطعی بھی ہو مثال کے طور پر تو دلالت کے اندر یہ قطعی نہیں اس کا مفہوم واضح نہیں۔

اور پھر اس میں "لَاصَلٰوةَ كَامِلَةً " کی توجیہ کرتے ہیں اس لیے بعض صحیح روایتوں کے اندر یہ اضافہ بھی ہے

کہ "لَاصَلٰوةَ اِلَّابِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَصَاعِدًا" "لَاصَلٰوةَ اِلَّابِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَشَيْءٍ مِّنَ الْقُرْآنِ" "لَا صَلٰوةَ اِلَّابِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسُوْرَةٍ مَّعَهَا" کہ صلوٰۃ بفاتحۃ الکتاب کے بغیر کوئی صلوٰۃ نہیں اس لیے زیادہ بھی پڑھنا پڑتا ہے، فاتحۃ الکتاب کے بغیر نماز نہیں ہوتی اس کے ساتھ ایک سورۃ بھی ملانی پڑتی ہے تو یہ جو اضافہ ہے یہ اضافہ بتاتا ہے کہ جس طرح سورۃ کا ملانا واجب ہے اس طرح فاتحہ کا پڑھنا بھی واجب ہے اور واجب کے چھوٹ جانے کی وجہ سے نماز ناقص ہوتی ہے، نماز ادا ہو جاتی ہے۔

اور پھر یہ تو ہوئی ایک اجمالی بات لیکن یہ جو آیا "لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَءْ اِلَّابِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ" کہ نماز اس شخص کی نہیں جو فاتحۃ الکتاب نہ پڑھے اس "من" سے کیا مراد ہے؟ اس "من" کے اندر تاویل کی گنجائش ہے ہم اس "من" سے مراد لیتے ہیں منفرد اور امام کیونکہ سورۃ پڑھنے کا حکم انہی دونوں کو ہے، امام بھی سورۃ پڑھتا ہے اور منفرد بھی سورۃ پڑھتا ہے اور مقتدی کے لیے بالاتفاق سورۃ ملانے کا حکم نہیں تو ہم کہتے ہیں یہ حکم اسی کے متعلق ہوگا جس کو سورۃ بھی ساتھ ملانے کا حکم ہے لہٰذا منفرد کے بارے میں یہی ہے کہ فاتحۃ الکتاب پڑھنی چاہیے اور امام کے بارے میں بھی یہی ہے کہ فاتحۃ الکتاب پڑھنی چاہیے اگر نہیں پڑھیں گے تو ایسی صورت میں نماز نہیں ہوگی یعنی اس کا اعادہ واجب ہے، جب اعادہ واجب ہو گیا تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ نماز نہیں ہوتی "تَنْزِيْلُ النَّاقِصِ بِمَنْزِلَةِ الْمَعْدُوْمِ" ہمارا نظریہ بھی یہی ہے کہ ہم اگر یہ کہیں کہ فاتحۃ الکتاب کے بغیر نماز نہیں ہوتی تو ہمارے لیے بھی گنجائش ہے کیونکہ ہم اعادہ کو واجب کہتے ہیں۔

باقی رہا مقتدی کہ مقتدی کیا کریں؟ مقتدی کے متعلق آگے بخاری میں دوسری روایت موجود ہے، متفق علیہ روایت ہے وہ مسلم میں بھی موجود ہے، بخاری میں بھی ہے، جس میں حضور ﷺ نے تقسیم کر دی کہ مقتدی نے کیا کرنا ہے امام نے کیا کرنا ہے "اِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا اِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا اِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا" یہ سارے کے سارے الفاظ ہیں اور ساتھ ہے " قَالَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ قُوْلُوْا آمِيْنَ " جس وقت وہ "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کہے تم نے کہنی ہے آمین اور اسی روایت میں مسلم شریف میں اضافہ ہے "اِذَا قَرَءَ فَاَنْصِتُوْا" یعنی جب وہ قرآن پڑھے تو تم چپ رہا کرو۔

اب ان سب روایتوں کو سامنے رکھ کے ایک امام نے یہ تاویل کی ہے کہ مقتدی کے لیے فاتحہ کی قراءت نہیں ہے یہ مسئلہ جو سمجھا ہے تو یہ احادیث سے سمجھا ہے، یہ حدیث کی مخالفت نہیں ہے، یہ ایک مثال دے رہا ہوں کہ

ایک بڑا اہم مسئلہ ہے، لوگوں کے اندر یہ مسئلہ چلتا ہے تو جہاں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ ائمہ کے اقوال کے خلاف روایات صحیحہ موجود ہیں تو وہ موؤل ہوتی ہیں، ان کے اندر تاویل کی گنجائش ہوتی ہے لیکن حدیث صحیح غیر منسوخ، غیر موؤل اگر مل جائے تو ممکن ہی نہیں کہ اس کے مقابلہ امام کا قول موجود رہ جائے، امام کا قول اٹھا کے دیوار پہ مار دیا جائے اس لیے ہم ائمہ کے جو اقوال لیتے ہیں تو ہمارے لیے یہ حیثیت نہیں ہے کہ ہم ان کو ارباب بناتے ہیں یا ان کو رب بنائیں، وہ خود کہتے ہیں کہ اگر اس قسم کی حدیث تمہیں مل جائے تو ہماری بات اٹھا کے دیوار پہ مار دو اور ہم اپنے امام کی بات دیوار پر ماریں گے اگر ہمیں مل جائے کہ ہمارا امام قرآن کریم کی صریح آیت کے خلاف کہتا ہے یا حدیث غیر موؤل اور غیر منسوخ کے خلاف کہتا ہے تو ہم قطعاً ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تو پھر ہمارے لیے اتخاذ رب کا مصداق کیسے بنا؟ تو ان کے جو فتوے مانتے ہیں، ان کی تحقیق کو جو مانتے ہیں وہ قرآن اور حدیث کی تشریح سمجھ کر مانتے ہیں کہ یہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کی تشریح ہمارے لیے کرتے ہیں ورنہ اگر ہمیں پتہ چل جائے کہ اپنی طرف سے بناتے ہیں اور اس کے پاس کوئی سند نہیں ہے تو ہم قطعاً ماننے کے لیے تیار نہیں چاہے کوئی ہو اس لیے جو ہمارا عقیدہ ہے وہ اتخاذ رب کا نہیں ہے۔

" قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ " یہ لعنت کا لفظ ہے اللہ انہیں برباد کرے، اللہ انہیں غرق کرے، اللہ انہیں سکون نہ دے، یہ کدھر کو پھرے جا رہے ہیں یعنی جس وقت یہ حقیقت بہت ہی نمایاں ہوگئی اور کوئی شخص تسلیم نہ کرے تو اس وقت اسی طرح ان سے بے زاری کا اظہار کیا جاتا ہے، ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ انہوں نے اپنے احبار و رھبان کو، احبار حبر کی جمع ہے عالم کے معنیٰ میں، رھبان راھب کی جمع درویش کے معنیٰ میں، انہوں نے اپنے علماء کو، درویشوں کو اللہ کو چھوڑ کے رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی رب بنا لیا اور نہیں حکم دیے گئے تھے مگر یہی کہ عبادت کریں الٰہ واحد کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں " سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ " ان کے شریک ٹھہرانے سے وہ پاک ہے، حکم تو ان کو توحید کا دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید اختیار کر لیں لیکن اتخاذ رب کے ساتھ یہ مشرک ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی ابنیت کا عقیدہ اختیار کرنے کے ساتھ یہ لوگ مشرک ہو گئے، اللہ تعالیٰ ان سب عیوب سے پاک ہے۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا:

خود اپنی تو یہ دین کی دولت یوں برباد کر بیٹھے جو اللہ کی طرف سے ان کو دی گئی تھی اور اب یہ کرتے ہیں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور اسلام کی مخالفت کرتے ہیں اور یہ زور اس بات پہ لگا رہے ہیں کہ اسلام کی اشاعت

نہ ہو اور اس دین کو مٹا دیا جائے، یہ بھولے ہوئے ہیں، یہ اب مٹے گا نہیں، ان کے اعتراضات کی حیثیت ایسی ہے جس طرح سے اللہ کا چراغ سورج آسمان کے اوپر دمک رہا ہے اور کوئی نادان اس کو پھونک مار کے بجھانا چاہے تو بھلا کسی کے پھونک مارنے سے یہ چراغ بجھتا ہے؟ اب اسی سے سمجھو کہ یہ اسلام ایک آفتاب کی طرح چمک اٹھا ہے، نکل آیا ہے، طلوع ہو گیا ہے اب لوگوں کے اعتراضات کی باتیں اس کو مٹا نہیں سکیں گی اس لیے اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس طرح سے مخالفت کر کے، اعتراضات کر کے اس کو مٹا دیں گے تو یہ بھول میں پڑے ہوئے ہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، یہ ممکن نہیں ہے، اس میں ان کو مایوس کیا جا رہا ہے کہ اب یہ مزاحمت، یہ زبانی اعتراضات اور اس قسم کے اشکالات اس دین کا راستہ نہیں روک سکتے "یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ" یہ ارادہ کرتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اپنے مونہوں کے ساتھ، مونہوں کے ساتھ بجھانے کا وہی معنیٰ کہ منہ سے پھونک مار کے یہ اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے کہ پھونک ماری جائے اور اللہ کا نور ان کی پھونکوں سے بجھے گا نہیں۔

"وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ" اس کا ترجمہ آپ کو سمجھایا تھا کہ اللہ انکار کرتا ہے مگر اس بات کا کہ اپنے نور کو پورا کرے اگرچہ کافروں کو یہ بات ناگوار گزرے، لیکن محاورۃً اس کا یہ مفہوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نور کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا اگرچہ کافروں کو یہ بات ناگوار گزرے، کافروں کے علی الرغم، ان کے چڑنے اور باوجود پریشان ہونے کے اللہ تعالیٰ اس کو پورا کر کے رہے گا وہ جیسے آپ اردو میں اسی مضمون کو ادا کرنے کے لیے شعر بھی پڑھا کرتے ہیں،

نورِ خدا ہے کفر کی حرکتوں پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اس میں اسی آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

دینِ اسلام تو آیا ہی غالب ہونے کے لیے ہے:

"ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی" اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ غالب کر دے اس دین کو سب دینوں پر اگرچہ مشرکوں کو یہ بات ناگوار ہی گزرے، تو اس دین کو اللہ تعالیٰ سب دینوں پر غالب کر کے رہے گا، غلبہ کی دو صورتیں ہیں ایک ہے علمی غلبہ کہ اس دین کی باتوں کو اتنا مدلل کر دیا گیا اور اتنا واضح کر دیا گیا کہ اس کے مقابلہ میں کسی کی بات نہیں چل سکتی یہ غلبہ پہلے دن سے لے کر آج تک نمایاں ہے چودہ سو

سال کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جس میدان کے اندر بھی اسلام کے مقابلہ میں کوئی دوسرا نظریہ آیا، بحث مباحثہ کی نوبت آئی، دلائل کی بات آئی تو دلائل کے میدان میں اسلام پہ آج تک کوئی فتح نہیں پا سکا، چودہ سو سال کی تاریخ اس بات پہ شاہد ہے کہ اسلام وزنی ہے اور کوئی شخص اس کے مقابلہ میں نہیں آسکتا یہ غلبہ تو اللہ تعالیٰ نے دے دیا۔

اور ایک ہے حسی غلبہ کہ اس کے مقابلہ میں کسی کا اقتدار نہ رہے یہ بھی معتد بہ درجے میں تقریباً ایک ہزار سال تک رہا کہ سرور کائنات ﷺ کے بعد بہت تیزی کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں بڑی بڑی حکومتیں ختم کر دی گئیں اور بڑی حکومتیں اس وقت دو ہی تھیں ایک قیصر اور ایک کسریٰ کی، ایک روم کی اور ایک ایران کی یہی دو حکومتیں تھیں جو خلفاء راشدین کے زمانے میں زیر ہو گئیں اور باقی اپنے علاقوں میں معمولی معمولی ریاستیں چھوٹی چھوٹی بستیاں اگر تھیں تو ان کی مسلمانوں کی حکومتوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں تھی آپ اس طرح سمجھ لیجیے کہ جس طرح آج دنیا کے اوپر امریکہ اور روس کا ڈنکا بج رہا ہے اور کوئی شخص ان دونوں کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا لے ایک ٹانگ اس کی روس اور ایک امریکہ پہ ہو جائے، ان دونوں پر غالب آجائے تو یوں سمجھو کہ ساری دنیا کے اوپر غالب آگیا کیونکہ ان دونوں کے مقابلہ میں باقی حکومتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے وہ تو ایسے ہیں چھوٹے چھوٹے معمولی معمولی، بڑے چوہدری تو یہی دو ہیں اور اگر ان کے ناک میں نکیل ڈالی جائے اور ان کو قابو میں لے لیا جائے تو یوں سمجھو کہ ساری دنیا پہ تسلط ہو گیا اس طرح سے قیصر اور کسریٰ کی حکومتیں توڑنے کے بعد جب مسلمانوں کا طول اور عرض پر قبضہ ہوا تو یوں سمجھو کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی دوسری طاقت نہیں تھی ایک ہزار سال تک تقریباً مسلمانوں کی یہی کیفیت رہی۔

اس کے بعد پھر زوال شروع ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ساتھ پھر برطانیہ کو عروج ہوا ایک وقت ایسا تھا کہ برطانیہ کے مدمقابل کوئی بڑی حکومت نہیں تھی، اس کی بڑی قوت تھی، سورج اس کی حکومت میں غروب نہیں ہوتا تھا تقریباً ڈیڑھ سو سال اس کے اقتدار کا گزرا اور یہ جنگ عظیم ثانی جو ہوئی اس میں برطانیہ کو زوال شروع ہوا یہ روس اور امریکہ کی عمر تو چالیس سال یا پچاس سال ہے جب ان کو عروج ہوا ہے، جنگ عظیم پہلی جو ہوئی تھی اس کے بعد ترکی کی قوت ٹوٹی ہے اور اس کے بعد یہ روس اور امریکہ اور اس قسم کی حکومتیں جو ہیں انہوں نے سر اٹھایا اور پھر برطانیہ کا زوال شروع ہوا اور اب یعنی کوئی زیادہ سے زیادہ پینتیس یا چالیس سال سے غلبہ روس اور امریکہ کا ہے برطانیہ کی کوئی حیثیت نہیں رہی ورنہ اس سے پہلے برطانیہ سب پر غالب تھا تو بہت تھوڑے زمانے سے یہ لوگ

سامنے آئے ہیں۔

اور ایک ایسا وقت آئے گا اب بھی جس طرح آثار بڑی تیزی سے پیدا ہوتے جا رہے ہیں کہ یہ قومیں پھر ٹوٹیں گی اور انشاء اللہ العزیز دنیا دیکھے گی کہ ساری دنیا پر کلمہء اسلامی جاری ہوگا اور یہ آثار بڑی تیزی کے ساتھ بنتے جا رہے ہیں کہ جب ساری کی ساری دنیا ایک کلمہ پر اکٹھی ہوگی اور وہ کلمہء اسلام ہوگا، اللہ تعالیٰ نے یہ جو اعزاز تھا وہ بھی پاکستان کے صدر کو بخشا کہ اقوام متحدہ میں جہاں ساری کی ساری دنیا کے چنے ہوئے دماغ اکٹھے تھے، ساری دنیا کے نمائندے وہاں موجود تھے یہ پہلا موقع ہے ساری تاریخ میں کہ وہاں کھڑے ہو کر اسلام کی دعوت اتنی جامعیت اور اتنے کھلے الفاظ کے ساتھ دی گئی ہو اس سے پہلے ایسا موقع کوئی نہیں آیا وہ تقریر اس جگہ پر ہوئی پھر ریڈیو پر نشر ہوئی، ٹیلی وژنوں پہ دکھائی گئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام ساری دنیا پر کھلے طور پر کر دیا ہے تو پہلے بھی ریڈیو پر قرآن پڑھا جاتا ہے اور دوسری جگہ پڑھا جاتا ہے سب کچھ ہے لیکن اتنے شاندار طریقے سے اور اتنے اعلیٰ معیار پر یہ شرف پہلی دفعہ ہمارے صوفی ضیاء الحق کو حاصل ہوا ہے اور وہ تقریر اس کی واقعی ایسے تھی جس طرح سے کوئی بہت بڑا مبلغ بڑی صراحت کے ساتھ اور اپنے عقائد کے ساتھ پورا یقین رکھتا ہوا پختگی کے ساتھ جس طرح سے پیش کرتا ہے اس نے اقوام متحدہ کے سامنے اسلام کی دعوت اس طرح سے پیش کی اور اس طرح بات آگے آہستہ آہستہ بڑھے گی لوگ سوچیں گے، سنیں گے جس طرح وہاں بہتوں نے تعریف بھی کی کہ بہت اچھی تقریر ہوئی اور بڑے اچھے دلائل پیش کیے گئے پھر اس نے غلاف کعبہ جو تھا وہ بطور نشان کے پیش کیا کہ یہ امن کا مذہب ہے اور نشان کے طور پر غلاف کعبہ جو پیش کیا وہ شیشے میں لگا کے اقوام متحدہ کے دفتر میں لگا دیا گیا گویا کہ مرکز تک آواز بہت صاف انداز میں پیش ہوگئی۔

آگے تصادم ہوگا، شکست و ریخت ہوگی، کہیں مسلمان نقصان اٹھائیں گے، کہیں کفر کو نقصان پہنچے گا، کرتے کراتے نتیجہ انشاء اللہ امام مہدی کے زمانے میں اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایسا آئے گا کہ بالکل کفر اس دنیا سے ناپید ہو جائے گا، کفر کی آواز باقی نہیں رہے گی اور سارے کے سارے لوگ اس وقت جو موجود ہوں گے اور یہ بڑے چوہدری تو آپس میں لڑ کر مر چکے ہوں گے جب ان کی آپس میں جنگ چھڑے گی اس کے بعد دو منٹوں میں جائیں گے دیر ہی نہیں لگے گی اور جو باقی رہ جائیں گے وہ سارے کے سارے انشاء اللہ العزیز کلمہ اسلام کے تابع ہوں گے، پیش گوئیاں روایات کے اندر صراحت کے ساتھ موجود ہیں اور آنے والا وقت اس کے ایک ایک نقطے

کو ثابت کر کے رہے گا جس طرح باقی پیش گوئیاں حضور ﷺ کے آنے والے وقت کے متعلق ایک ایک ہو کے سچی ہو رہی ہیں اس طرح یہ بھی سچی ہو کر رہیں گی وہاں پھر غلبہ جو ہے وہ اسی دور پہ نمایاں ہو جائے گا۔

یہود و نصاریٰ کے احبار و رھبان کا لوگوں کے مالوں کو باطل طریقے سے کھانا:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا" اب یہ بات کہی تو جا رہی یہود و نصاریٰ کی لیکن خطاب کیا جا رہا ہے مسلمانوں کو اے ایمان والو! احبار و رھبان میں سے بہت سے "اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ" یہ بھی قرآن کریم کا انصاف ہے، کل احبار و رھبان نہیں کہے، عیسائی اور یہودیوں کے سارے مولوی، سارے عالم، سارے درویش بت پرست، حرام خور ہو گئے ایسا نہیں کہا کیونکہ انہی میں کئی گنے چنے اہل حق بھی تھے جو ان کتابوں سے ان کے سامنے عقیدے تھے وہ ان پر ثابت تھے چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے ان کے سامنے حقیقت آ گئی جس کو وہ پہچانے بیٹھے تھے اس کو فوراً قبول کر لیا دیر ہی نہیں کی کہ جس طرح یہودیوں میں سے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا گروہ تھا رسول اللہ ﷺ سے ایک ہی ملاقات ہوئی پہچان گیا کہ جن کا ذکر کتابوں میں ہے یہ وہی ہیں فوراً مسلمان ہو گئے اور نصاریٰ میں سے نجاشی تھا اور اس طرح سے دوسرے لوگ بھی جب ان کے سامنے یہ حقیقت آئی فوراً قبول کر لی اس لیے سارے ایسے نہیں تھے، کثیر کا لفظ بولا ہے کہ بہت سارے احبار علماء، رھبان درویش ایسے ہیں "لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" لوگوں کے مال غلط طریقے سے کھا رہے ہیں انہوں نے دنیا کو مقصود بنا لیا ہے اور مال سمیٹنے کے لیے انہوں نے بہت سارے دھندے ایجاد کر لیے ہیں، باطل طریقے سے مال کھاتے ہیں۔

باطل طریقے سے کھانا کیسے تھا؟ رشوتیں لے کر مسئلہ غلط بتاتے مثلاً کوئی چلا گیا کہ میں یوں کرنا چاہتا ہوں تو کہتے کہ اتنے پیسے دے دو تو فتویٰ ہم دیتے ہیں، پیسے لیے اور غلط فتویٰ دے دیا یہ بھی حرام خوری ہے پھر سب سے آسان طریقہ لوگوں نے جو ایجاد کیا ہوتا ہے وہ ہے رسوم کی ایجاد، فلاں موقع پر تم اتنا دو، فلاں حرام خوری کے موقع پر اتنا دو تو تمہیں آخرت میں ثواب ملے گا، فلاں موقع پر اتنا دو تو یہ ملے گا، عیسائیوں کے پادریوں نے تو خاص طور پر یہ گویا کہ براءت نامے لکھنے شروع کر دیے کہ ہمارے پاس آؤ اور اپنے گناہ کا اعتراف کرو کہ ہم نے یہ گناہ کیا تو ہم معافی نامہ لکھ دیں گے اور اتنی فیس ہو گی اور وہ اللہ کی طرف سے یوں سمجھو کہ معافی ہو گئی اس طرح سے لوگوں کو جہالت میں ڈال کر لوگوں کے ذہن پہ مسلط ہو کے یہ انہوں نے طریقے اختیار کیے ہوئے تھے۔

امت محمدیہ کا یہود و نصاریٰ کے طریقہ پر چلنا:

اور سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ میری امت یہود اور نصاریٰ کے طریقے پر چلے گی اور اتنی ان میں آپس میں مطابقت ہوگی جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مطابق ہوتا ہے اور روایات میں آتا ہے کہ یعنی مطابقت میں کمال مشابہت بیان کرنے کے لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص گوہ کی بل (سوراخ) میں گھسا ہوا ہوگا تو میری امت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو ان کے پیچھے گوہ کی بل میں گھسے ہوئے ہوں گے بلکہ یہاں تک فرمایا اگر کوئی شخص ان کے اندر ایسا ہوگا جو اپنی ماں سے زنا کرتا ہوگا تو میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اس طرح سے روسیاہی کریں گے اتنا حضور ﷺ نے زور دے کر فرمایا کہ امت جو ہے ان کے طریقے پر چلے گی جس طرح سے پہلے لوگ چلے ہیں۔

جس طرح سے وہ ایک روایت آتی ہے کہ بنی اسرائیل کے بہتر فرقے ہوئے تھے اور میری امت کے تہتر ہوں گے اس وجہ سے کہ بہتر تو بہتر کے مطابق ہو گئے جو گمراہی کی طرف چلے گئے اور یہاں ہمیشہ اہل حق کا ایک ٹولہ موجود رہے گا وہ تہتر واں فرقہ ہے جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا کہ "مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ" جو میرے اور اصحاب کے طریقے پر چلنے والے ہیں یہ ہے ناجی گروہ، یہ ہے اہل حق کا ٹولہ اور جو اس طریقے سے ہٹتے چلے جائیں، مختلف راہیں اختیار کرتے چلے جائیں گے ان کی مثال یہود و نصاریٰ جیسی ہوگی "مَا اَنَا" یہ ہے سنت "اَصْحَابِیْ" یہ ہے جماعت تو ہم جو اہل سنت والجماعت کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ اسی حدیث سے ماخوذ ہے "مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ" اہل سنت والجماعت کون ہیں جو سرور کائنات ﷺ کے طریقے کو اور صحابہ کے طریقے کو اپناتے ہیں؟ اہل سنت والجماعت کا یہ معنیٰ ہے اور اہل سنت والجماعت وہ ہیں جو اپنے آپ کو سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے کے مطابق رکھتے ہیں تو یہ ہیں نجات پانے والے باقی بہتر کے بہتر فرقے ویسے ہوں گے جیسے یہود و نصاریٰ نے مختلف راہیں نکال لیں ان کی بھی مختلف راہیں ہوں گی۔

اب اس چیز کو سامنے رکھ کے اگر ان قبروں کا یا قبور شریعت کا مطالعہ کریں، یہ "قبور شریعت" ایک مستقل شریعت ہے، یہ قبروں سے متعلق جو لوگوں نے عقیدے بنا لیے اور وہاں جو گدی نشین بیٹھے ہوتے ہیں انہوں نے کیسے کیسے نظریے بنا لیے کہ فلاں تاریخ کو گائے دو گے تو یہ کام ہو جائے گا، اگر دودھ دو گے تو یہ ہو جائے گا، اگر دودھ نہیں دو گے تو تمہاری بھینس خراب ہو جائے گی اور اس طرح سے چادر چڑھائی جائے تو یہ فائدہ ہے اور یہ کیا جائے تو

یہ فائدہ ہے اور آئے دن نذرانوں کے ڈھیر لگتے جا رہے ہیں جو انہی غلط نظریوں کے نتیجے میں ہیں جو لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دیے گئے اور اپنے معتقدین کو سمجھا دیے گئے، اس لیے وہ معتقدین اپنی جہالت کی وجہ سے پٹ رہے ہیں، لٹ رہے ہیں، محنت کے ساتھ کماتے ہیں لیکن پیر کے ہاں چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔

ورنہ ان کو یہ اندیشہ ہے کہ ہمارا کوئی نقصان ہو جائے گا، ہم برباد ہو جائیں گے، سالانہ بکرے جاتے ہیں، کپڑے جاتے ہیں، سونے چاندی کے ڈھیر جاتے ہیں یہ سب "اکل بالباطل" اور حرام طریقے سے کھاتے ہیں، جب ایک رسم ایجاد کر دی گئی جس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے اور حدیث میں نہیں اور اس رسم کے انداز سے جو شخص وصول کر کے کھائے گا مثلاً اب یہ کہہ دیا گیا کہ مردے کے لیے ضروری ہے کہ قل خوانی کے اندر اتنے چھوارے ہوں، اتنے چھولے ہوں، اتنا فلاں کچھ ہو، اتنا فلاں کچھ ہو تب اس کی جان چھوٹے گی ورنہ اس کی جان نہیں چھوٹے گی حالانکہ اس کی اصلیت نہیں ہے تو اس بہانے کے ساتھ اس مولوی کے پیٹ میں اور اس لیٹر بکس میں جو کچھ آئے گا وہ سارے کا سارا "اکل بالباطل" ہے تو یہ حرام خوری کے طریقے علماء اور درویشوں نے جاری کیے ہوئے تھے، ان خانقاہوں میں بیٹھنے والے اور قبروں پہ بیٹھنے والے یہ عیسائی اور یہودیوں کے رہبان کا مصداق ہیں اور یہ غلط مسئلہ بتانے والے اور لوگوں کو خواہ مخواہ غلط فہمی کے اندر ڈال کر قوم کو لڑا کے اپنا الو سیدھا کرنے والے یہ سارے یہود اور نصاریٰ کے احبار کی مثال ہیں اور اس قسم کے طریقے دنیا کے اندر چلتے رہتے ہیں، یہ جو قبریں بنا کے بیٹھ گئے اور قبروں کے چڑھاووں پر جن کے گزارے ہیں وہاں کونسا اللہ کے نام کو اجاگر کیا جاتا ہے وہ تو بس یہود و نصاریٰ کی طرح ہیں، یہود اور نصاریٰ کے حالات سمجھنے کے لیے ان کا دیکھ لینا کافی ہے پھر انہوں نے طریقے ایسے ایجاد کر لیے کہ جہالت کا استحضار بھی عجیب طریقے سے کرتے ہیں۔

"اکل بالباطل" پر ایک لطیفہ:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وعظ کے اندر ایک لطیفہ بیان کیا ہوا ہے کہ ایک مولوی مسجد میں رہتا تھا اور لوگ اس کو ختم پہ بلایا کرتے تھے جو کچھ انہوں نے اپنے مردوں کو دینا ہوتا تھا اس مولوی کو دے دیتے اور مولوی خوب اچھی طرح سے عیش کرتا تھا، ایک دفعہ ایک درویش اس مسجد میں آ کے ٹھہر گیا اور کسی نے ختم پڑھوانا تھا، مولوی صاحب تھے نہیں، وہ اسی درویش کو لے گیا تو اس نے جا کر ختم پڑھا دیا، جب مولوی کو پتہ چلا کہ یہ تو اس سے ختم پڑھوالیا تو اس کو فوراً خیال ہوا کہ لوگ اس طرح کرنے لگ گئے کہ دوسروں کو بلوا کے ختم پڑھوانے لگ گئے پھر تو کام

خراب ہو جائے گا، کہتے ہیں کہ مسجد میں آ کر وہ اس طرح جس طرح کوئی کسی کے ساتھ لڑ رہا ہو کبھی اس کونے میں بھاگتا ہے، کبھی ادھر بھاگتا ہے، کبھی ڈنڈا اٹھا کر مارتا ہے، کبھی چیختا ہے، کبھی چلاتا ہے تو اس نے ساری مسجد میں اودھم مچا دیا، لوگ جمع ہو گئے کہ مولوی کو کیا ہو گیا ہے؟ کہتا ہے کیا ہو گیا ہے چھوڑو میری تو جان جانے لگی ہے، میں یہاں نہیں رہتا، انہوں نے کہا کہ بتاؤ تو سہی کیا بات ہے؟ کہنے لگا بات کیا بتاؤں میں اتنے دنوں سے تمہارے ہاں رہتا ہوں، مجھے پتہ ہے کس کا مردہ ہے، کیا اس کا نام ہے، کیسے اس کو چیز بھیجنی ہے، کس چیز کی اس کو ضرورت ہے، میں تو ہر ایک کو اس کا حصہ پہنچا دیتا ہوں۔

یہ ایک نیا آدمی آپ کے پاس آیا ہوا تھا پتہ نہیں اس نے ثواب کس کو پہنچایا، کس کو نہیں پہنچایا، سارے مردے میرے ساتھ لڑ رہے ہیں، اب مجھ سے یہ مصیبت برداشت نہیں ہوتی، وہ کہنے لگے مولوی صاحب! ہماری توبہ جو کچھ کرنا کرانا ہوگا تمہاری وساطت سے کیا جائے گا، آپ یہیں رہ جائیں، اب کیا یہ "اکل بالباطل" نہیں ہے؟ لوگوں کے ذہن میں یہ ڈال دیا کہ جب تک مجھے نہیں دو گے اس وقت تک تمہارے مردوں کو صحیح نہیں پہنچے گا اب اس قسم کے نظریات لوگوں کے ذہن میں ڈال کر جو بھی وصول کرتا ہے وہ سب "اکل بالباطل" ہے، صحیح بنیاد پر نہیں ہے اور اپنی طرف سے نظریات بنا لیے اور اس کو آمدنی کا ذریعہ بنا لیا "لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" کے یہ سارے طریقے ہیں "وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ" اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور الٹا ان کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں، یہ نہیں کہ ان سے پیسے لیں اور بات صحیح بتا دیں، صحیح بات نہیں بتاتے، اللہ کے راستے سے روکتے اس لیے ہیں کہ اگر یہ لوگ سیدھے راستے پہ چل پڑے تو ہماری آمدنی بند ہو جائے گی۔

مالی فرائض ادا کیے بغیر مال جمع کر کے رکھنے پر وعید:

اب انہی کے متعلق وعید ہے کہ جو باطل طریقے سے مال جمع کرتے ہیں، حرام خوری کرتے ہیں، اصل مصداق تو ان الفاظ کے یہود و نصاریٰ ہیں "وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ" جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑھ کے رکھتے ہیں "وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ" اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے، جس دن اس سونے چاندی کو ان پہ تپایا جائے گا جہنم کی آگ میں پھر داغا جائے گا ان کے پہلوؤں کو، ان کی پیشانیوں کو اور ان کی کمروں کو اور کہا جائے گا یہ وہی چیز ہے جس کو تم جمع کر کے رکھتے تھے اپنے نفوس کے لیے زمین میں آج اپنے گاڑھنے کا مزہ چکھو، یہ آیات اس موقع پر ہیں تو یہود و نصاریٰ کے متعلق ہی جو غلط طریقے سے مال کو جمع کرتے تھے اور غلط طریقے سے اس کو کھاتے تھے، اللہ کے راستے میں خرچ

نہیں کرتے تھے لیکن انداز ایسا اپنایا گیا کہ جو عموم کے طور پر مسلمانوں پہ بھی صادق آئے گا جو یہ طریقہ اپنائے کہ سونا چاندی کو جمع کر کے رکھتا ہے اور اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا تو وہ بھی اسی طریقے سے معذب ہوگا، اللہ کی طرف سے اس کو اسی طرح سے عذاب دیا جائے گا۔

اس لیے جس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ آیات سنیں تو ان کے اوپر یہ آیات ذرا گراں گزریں جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ وہ گراں اس لیے گزریں کہ اس میں تو یہ کہہ دیا گیا کہ سونا چاندی کو زمین میں گاڑھ کے رکھنا عذاب کا ذریعہ ہے اور ہر شخص اپنی ضرورت کے لیے کچھ نہ کچھ بچا کے رکھتا ہے، ہمارے ہاں بینک میں جمع کرا دیتے ہیں اور ان دنوں میں چونکہ بینک نہیں تھے تو کسی گڑھے میں ڈال کر زمین میں دفن کر دیتے تھے اور آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل جمع کر کے رکھنا جائز نہیں ہے اور جو جمع کر کے رکھے گا اس کو آخرت میں عذاب ہوگا، اس لیے اس آیت کو سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرائے، ان کی گھبراہٹ اور ان کے ذہن میں یہ اشکال آنا اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس آیت کو مسلمانوں کے متعلق بھی سمجھا، یہ صرف اہل کتاب کے متعلق نہیں ہے اگرچہ سلسلہ کلام اہل کتاب کے متعلق ہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ اس مشکل کو میں حل کرتا ہوں، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ یا رسول اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہ پہ بہت گراں گزری ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ گھر میں سونا چاندی کا رکھنا بالکل ہی ٹھیک نہیں ہے، اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنا چاہیے ورنہ یہ عذاب کا ذریعہ بن جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے زکوٰۃ کو اس لیے فرض کیا ہے تاکہ باقی تمہارے لیے حلال ہو جائے اور اللہ نے میراث کا قانون جو جاری جو کیا ہے وہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ جمع کر کے رکھنا ٹھیک ہے اگر کوئی جمع کر کے نہیں رکھے گا تو وراثت میں کیا تقسیم ہوگا اور زکوٰۃ اللہ تعالیٰ نے اس لیے فرض کی ہے کہ باقی ماندہ مال تمہارے لیے حلال ہو جائے اسی سے اخذ کر کے وہ ایک فقرہ مشہور ہے کہ جس سونا اور چاندی سے زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز مذموم نہیں ہے، جس کی وعید اس آیت میں آئی ہوئی ہے اگر کوئی شخص زکوٰۃ ادا بھی نہیں کرتا تو ایسی صورت میں اس کا جمع کیا ہوا مال اس کے لیے وبال بنے گا۔

ادائیگی زکوٰۃ کے بعد دیگر مصارف میں خرچ کرنا:

لیکن یہ ایک عمومی عنوان ہے جس وقت عام حالات میں دیکھا جائے تو شریعت کے اندر یہ مسئلہ بالکل

صاف الفاظ میں ہے قرآن کریم کے اندر بھی اور حدیث کے اندر بھی کہ انسان کے اوپر خرچ صرف زکوٰۃ کے طور پر ہی فرض نہیں ہے بلکہ کچھ مصارف اور بھی ہیں مثلاً جن اہل وعیال کا نفقہ اس کے ذمہ ہے وہ نفقہ دینا فرض، اگر یہ نفقہ نہیں دے گا تو بھی اسی قسم کا عذاب ہوگا اور دوسرے صدقات واجب ہوگئے، صدقۃ الفطر ہے، قربانی ہے، اس طرح حج اگر فرض ہوگیا تو حج کے اندر صرف ہے اور وہ پیسوں میں بخل کرتا ہوا زکوٰۃ تو دیتا ہے لیکن حج کے مصارف برداشت نہیں کرتا، قربانی کا خرچ برداشت نہیں کرتا، صدقۃ الفطر ادا نہیں کرتا تو بھی اس کے لیے یہی وعید ہے اور اس سے بڑھ کر قومی اور دینی ضرورتیں اس قسم کی آجایا کرتی ہیں موقع محل کے مطابق جس میں خرچ کرنا فرض ہوجاتا ہے ایک آدمی بھوکا ہے اور بھوک سے مر رہا ہے اور آپ کے پاس ضرورت سے زائد کھانا ہے تو اس کو دینا فرض ہے، آپ کے ذمہ ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا وہ شخص مومن نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

قومی ضرورتیں پیش آجاتی ہیں اگر لوگ بخل کریں، پیسہ خرچ نہ کریں تو قوم کی قوم برباد ہوتی ہے، ضرورتیں اس قسم کی پیش آجاتی ہیں کہ اگر لوگ اس میں خرچ ہی نہیں کریں گے تو دین کی نشر واشاعت بند ہوتی ہے یہ بھی فرض ہے اور یہ فرض ہوتے مختلف حالات کے تحت ہیں جو شخص اس قسم کے فرض ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا وہ اس طرح سے جمع شدہ مال کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوگا لیکن ایک قطعی اور دائمی فرض زکوٰۃ ہے اس لیے عنوان زکوٰۃ کا اختیار کرلیا جاتا ہے کہ زکوٰۃ دیتے رہو تو ایسی صورت میں مال تمہارے لیے وبال نہیں ہوگا لیکن فرض صرف زکوٰۃ ہی نہیں، موقع محل کے مطابق اس میں عموم ہے اس لیے اگر حکومت کوئی قومی ضرورت سمجھتی ہے اور دینی اشاعت کے لیے کسی قسم کی ضرورت سمجھتی ہے تو دولت مند طبقوں پر فرض ہے کہ اس سلسلے میں چندہ دیں اور اس سلسلے میں تعاون کریں اگر تعاون نہیں کریں گے تو دین کو نقصان پہنچے گا تو یہ مال ان کے لیے اس طرح سے وبال بنے گا جس طرح زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی صورت میں وبال ہے تو حاصل یہ ہوا کہ مالی فرائض جتنے بھی انسانوں کے اوپر عائد ہیں ان کو ادا کرتا رہے اور ان کو ادا کرنے کے بعد پھر اگر کچھ بچ جاتا ہے اور گھر کے اندر پڑا رہ جائے تو ایسی صورت میں وہ عذاب کا ذریعہ نہیں بنے گا اگرچہ یہ اعلیٰ معیار بھی نہیں۔

اعلیٰ معیار یہی ہے کہ سرور کائنات ﷺ کی سنت کی طرف دیکھتے ہوئے ضرورت پوری کرو باقی مال جمع کرکے گاڑھ کے نہ رکھو بلکہ اس کو آگے چلتا کرو، جتنا چلتا ہوگا اتنا صاف ہوگا اور اتنا ہی لوگوں کے لیے باعث راحت بنے گا اور اپنے لیے بھی باعث راحت بنے گا، جتنا بھی جمع ہوکے ایک جگہ ٹھہرنا شروع ہوگا اتنا ہی یہ وبال بن

جاتا ہے، مال کے جمع کرنے کی شریعت میں حوصلہ افزائی نہیں کی گئی اگرچہ مالی فرائض کے ادا کرنے کے بعد ہی بچا ہوا ہو یہ پھر بھی قابل تعریف نہیں ہے اگرچہ بعض صورتوں کے اندر جائز قرار دیا گیا ہے تو اب اس آیت کا مفہوم یہی ہوگا اس لیے "لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کا لفظ ہے جہاں فی سبیل اللہ خرچ کرنا ضروری ہو جائے گا اور آپ لوگ خرچ نہیں کریں گے اور مال آپ کے پاس موجود ہوگا تو ایسے وقت میں یہ مال وبال بن جائے گا تو جس میں زکوۃ بھی شامل ہے، صدقات واجبہ بھی شامل ہیں، قومی ضرورتیں اور دینی ضرورتیں بھی ساری کی ساری اس میں شامل ہیں اگر ان کے اندر کوتاہی ہوگئی اور مال کو جمع کر کے مال کی محبت میں رکھو گے، گاڑھ گاڑھ کے رکھو گے اور ان ضرورتوں کے اندر صرف نہیں کرو گے تو یہ ساری کی ساری وعید آئے گی۔

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتٰبِ اللّٰهِ

بے شک مہینوں کی گنتی اللہ کے ہاں بارہ ہے اللہ کی کتاب میں

يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ط

جس دن اس نے پیدا کیا آسمان کو اور زمین کو ان میں سے چار حرمت والے ہیں

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ لا فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ أَنْفُسَكُمْ

یہی سیدھا دین ہے پس تم ظلم نہ کیا کرو ان مہینوں کے بارے میں اپنے نفسوں پر

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ط

اور لڑو تم سب مشرکین سے جس طرح وہ تم سب سے لڑتے ہیں

وَاعْلَمُوْٓا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾ إِنَّمَا النَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي

اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے ﴿۳۶﴾ سوائے اس کے نہیں مہینوں کو موخر کر دینا زیادتی ہے

الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ

کفر میں گمراہ کیا جاتا ہے اس کے ذریعہ سے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا وہ حلال قرار دیتے ہیں اس کو کسی سال اور حرام قرار دیتے ہیں اس کو

عَامًا لِّيُوَاطِئُوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ط زُيِّنَ

کسی سال تاکہ موافق کریں وہ اللہ کے حرام ٹھہرائے ہوئے مہینوں کی تعداد کو پس حلال ٹھہرا لیا اس کو جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا مزین کر دیے گئے

لَهُمْ سُوْٓءُ أَعْمَالِهِمْ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ ع

ان کے لیے ان کے برے اعمال اور اللہ ہدایت نہیں دیتا کافر لوگوں کو ﴿۳۷﴾

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ إِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ نکلو اللہ کے راستے میں

اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ط أَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ج

تو تم زمین کی طرف بوجھل ہوئے جاتے ہو کیا تم نے پسند کر لیا دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں،

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا

نہیں ہے دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں مگر بہت تھوڑی سی ﴿۳۸﴾ اگر تم نہیں نکلو گے

يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ

تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور بدلے میں لے آئے گا اور لوگوں کو اور تم اس کو نقصان نہیں پہنچا سکو گے

شَيْـًٔا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ

کچھ بھی اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۳۹﴾ اگر تم اس کی مدد نہیں کرو گے پس تحقیق اس کی مدد تو

اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ

اللہ کر چکا جب نکال دیا اس کو کافروں نے اس حال میں کہ یہ دو میں سے ایک تھا جب کہ وہ دونوں غار میں تھے

اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ

جب کہ وہ رسول اپنے ساتھ والے سے کہہ رہا تھا غم نہ کر بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے پھر اتارا اللہ تعالیٰ نے

سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ

اپنا اطمینان اپنے رسول پر اور اسے قوت پہنچائی ایسے لشکروں کے ذریعے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کر دیا ان لوگوں کی بات کو

الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا ۭ

جنہوں نے کفر کیا نیچی اور اللہ کی بات ہی اونچی ہے

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۴۰﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

شروع سورۃ سے مشرکین کا تذکرہ چلا آرہا تھا اور پچھلی چند آیات میں اہل کتاب کا ذکر کردیا گیا تھا اور ان کے خلاف جہاد کی ترغیب دی گئی تھی اور اہل کتاب کے خلاف جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے ظاہر کیا گیا تھا کہ اب ان اہل کتاب اور مشرکین میں کوئی فرق نہیں، ان کا دعویٰ اگرچہ توحید کا ہے، آخرت کا یہ قول کرتے ہیں لیکن ان کا ماننا نہ ماننا برابر ہے کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ شرک کے نظریات وضع کر لیے ہیں اور انہوں نے اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرانا شروع کردیا ہے، دنیا دار ہوگئے ہیں اور دنیا کو ترجیح دینے لگ گئے ہیں، مال کے پیچھے مرتے ہیں، ان کا ایمان اور دین بکاؤ مال کی طرح ہے، حرام خور ہیں، رشوتیں لیتے ہیں، دین فروشی کرتے ہیں اس لیے اب ان میں اور مشرکین میں کوئی فرق نہیں رہا تو جس طرح مشرکین کے ساتھ جہاد کیا گیا ان کے ساتھ بھی اسی طرح جہاد کرو یہ پچھلی آیات کا خلاصہ ہے۔

اور اگلی آیات جو رکوع تک پڑھی گئیں ہیں ان میں مشرکین کی ایک عادت کو ذکر کیا گیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حلال ٹھہرانا اور اللہ تعالیٰ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرانا مذکور ہے تو گویا کہ ان کی یہ خصلت اہل کتاب کی خصلت کی طرح ہے جیسے پیچھے آیا تھا "لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" جس چیز کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا اس کو یہ حرام نہیں ٹھہراتے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو حلال ٹھہرا لیتے ہیں تو اسی طرح مشرکین کی بھی ایک عادت ذکر کی جارہی ہے، وہ بھی اللہ کی محرمات کے اندر تبدیلی کرتے تھے تو اس خصلت کے اعتبار سے بھی اہل کتاب اور مشرکین آپس میں برابر ہیں۔

ہر دور میں احکام شریعت کا تعلق قمری مہینوں کے ساتھ رہا ہے:

یہاں جو بات ذکر کی جارہی ہے اس کو آپ اس طرح سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت زمین اور آسمان پیدا فرمائے، اس وقت سے اپنے قانون میں سال کے بارہ مہینے قرار دیے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنی شریعتیں آئیں وہ ساری کی ساری چاند کے مہینوں سے ہی متعلق تھیں یعنی اگرچہ اوقات کا تعین سورج کے ساتھ بھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو ذکر کرنے کے بعد کہا "لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ" تا کہ تم سالوں کی

گنتی اور حساب معلوم کرلو اللہ نے سورج کو چلایا، چاند کے لیے منزلیں متعین کیں اور لفظ یہ ذکر فرمائے "لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ" تاکہ تمہیں سالوں کی گنتی اور حساب معلوم ہو جائے تو سورج کی حرکت کے ساتھ بھی سال بنتا ہے، یہ موسموں کا تغیر اور تبدل آتا ہے، یہ چکر سال میں پورا ہوتا ہے تو سال شمسی بھی ہے اور قمری بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے شریعت کے احکام ہمیشہ قمری سال کے ساتھ لگائے ہیں اور چاند کے ساتھ ہی بارہ مہینے بن جاتے ہیں، حج کا تعلق بھی قمری مہینے سے ہے، رمضان المبارک کا تعلق بھی قمری مہینے سے ہے، زکوٰۃ کا وجوب بھی قمری مہینے کے ساتھ ہے، دس محرم کے روضہ کی فضیلت وغیرہ بھی قمری مہینے کے حساب سے ہے۔

قمری اور شمسی سال میں فرق اور اس کا نتیجہ:

قمری سال اور شمسی سال میں تقریباً گیارہ دن کا فرق ہے کہ شمسی سال گیارہ دن بڑا ہے اور قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہے یہی وجہ ہے کہ جو شمسی مہینے ہیں وہ تو ہمیشہ ایک ہی حالت پہ رہتے ہیں مثلاً ہمارے اس علاقہ میں دسمبر اور جنوری سردی کے مہینے ہیں تو ہر سال سردی دسمبر اور جنوری میں ہی آئے گی اور جولائی اگست گرمی کے مہینے ہیں تو ہر سال گرمی جولائی اور اگست میں ہی ہوتی ہے، سورج کا موسم ایک جیسا رہتا ہے لیکن قمری مہینے چونکہ گیارہ دن چھوٹے ہیں تو شمسی مہینوں کے ساتھ یہ چکر چلتا رہتا ہے، ہر سال ایک مہینہ گذشتہ سال سے گیارہ دن پہلے آجاتا ہے اور تینتیس سال کے بعد چاند کے مہینے لوٹ کے انہی دنوں میں آجاتے ہیں جن دنوں میں پہلے ہوتے ہیں۔

مثلاً جس وقت آپ کا پاکستان بنا ہے آپ کو پتہ ہی نہیں ہوگا کیونکہ آپ میں سے اکثر میڈ ان پاکستان (پاکستانی پیداوار) ہیں جب پاکستان کے وجود اور ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہوا ہے تو تاریخ چودہ اگست تھی، اس میں پاکستان کا اعلان ہوا تھا اس لیے پاکستان میں اس دن چھٹی ہوتی ہے اور یہ دن یوم آزادی کے طور پر منایا جاتا ہے تو جب یہ چودہ اگست کی تاریخ تھی تو رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور ستائیس تاریخ تھی، ستائیس رمضان اور چودہ اگست یہ دونوں آپس میں مطابق تھے اب یہ جو اگست ابھی گزرا ہے چودہ اگست تو آپ کو معلوم ہوگا یہ بھی رمضان شریف میں ہی آیا ہے اب یہ تینتیس سال پورے ہوگئے تھے جب یہ تینتیس سال پورے ہوگئے تو تینتیس سال کے بعد پھر وہی تاریخیں آگئیں اور اس وقت چودہ اگست کو ستائیس تاریخ تھی اور اب ستائیس رمضان کو دس اگست تھی تو تینتیس سال کے بعد صرف دو تین دن کا فرق پڑا باقی بالکل وہی تاریخیں ہیں۔

اور گیارہ دن جب چھوٹا ہوا تو تینتیس سال کے اندر تین سو تریسٹھ دن بنتے ہیں اور قمری سال کے تین سو

ساٹھ دن ہوتے ہیں تو سال پورا ہو کے تین دن زائد ہو گئے تو تینتیس سال کے بعد یہ چکر پورا ہو گیا یہ کچھ فرق ہے چاند اور سورج کے مہینوں میں یہی وجہ کہ ماہ رمضان کبھی گرمیوں میں آگیا اور کبھی سردیوں میں آگیا، کبھی معتدل موسم میں آگیا سارے سال کے اندر یہ مہینے گھومتے رہتے ہیں، جب ہر سال کے گیارہ دن پیچھے ہٹتے جائیں گے تو تین مہینے کے بعد ایک مہینہ کا فرق پڑ جائے گا اور تینتیس سال کے اندر یہ چکر پورا ہو جاتا ہے یہ ہے مہینوں کا حساب جو چلا آرہا ہے۔

مشرکین مکہ کی مہینوں کے بارے میں گڑبڑ:

اب ملت ابراہیمی میں بھی حساب قمری مہینوں کا ہی تھا اور بارہ مہینے تھے لیکن مشرکین مکہ نے کچھ اس طرح سے گڑبڑ کر رکھی تھی کہ چار مہینے اس میں حرمت والے تھے جس میں لڑائی جائز نہیں تھی اب یہ عقیدے کے طور پر تو اس کو حرمت والے سمجھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ کل مہینے بارہ ہیں اور ان میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں لیکن جس وقت یہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے آزاد ہوئے تو انہوں نے اپنی شہوت پرستی کے طور پر ان میں گڑبڑ کرنی شروع کر دی کہ اگر مثال کے طور پر محرم کا مہینہ آگیا اور ان کو کسی کے ساتھ لڑنے کی ضرورت ہے، کسی سے لوٹ مار کرنا چاہتے ہیں تو یہ کہتے کہ اس دفعہ محرم بعد میں آئے گا اور صفر پہلے آئے گا، صفر کو مقدم کر لیتے اور محرم کو مؤخر کر دیتے اور اگر کسی سے لڑائی ہوتی اور ادھر سے رجب کا مہینہ آجاتا تو اس کو آگے کر دیتے اور دوسرے مہینہ کو پہلے لے آتے، اس طرح مہینے آگے پیچھے کرتے رہتے تھے، آگے پیچھے کرنے کے ساتھ اس طرح سال کے دوران چار کی تعداد تو پوری کر لیتے کہ چار مہینے حرمت کے گزر گئے لیکن تعیین باقی نہیں رہی، کسی مہینہ کو کسی سال حلال ٹھہرا لیتے اور کسی مہینے کو کسی سال حرام ٹھہرا لیتے تو اللہ تعالیٰ نے جن کو حرام ٹھہرایا تھا ان کی حرمت لوگوں نے باقی نہیں رکھی۔

جس وقت مکہ معظمہ فتح ہو گیا تو فتح مکہ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سن نو ہجری میں حج کے لیے تشریف لے گئے ہیں تو اس وقت اعلان کروا دیا گیا تھا کہ اب اس قسم کی جاہلانہ رسوم کو ختم کیا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ جس سال حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حج کرنے کے لیے گئے ہیں وہ اگرچہ مشرکین مکہ کی قرارداد کے مطابق ذی الحجہ کا مہینہ تھا لیکن مہینوں میں چونکہ انہوں نے گڑبڑ کر رکھی تھی تو حقیقت کے اعتبار سے وہ ذی الحجہ نہیں بنتا تھا بلکہ ذی قعدہ تھا تو حج ان دنوں میں صحیح نہیں ہو رہا تھا۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان:

اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس سال سے اگلے سال حج کے لیے تشریف لے گئے تھے تو اس وقت وہ مہینہ ان کے لحاظ بھی ذی الحجہ تھا اور واقعہ کے لحاظ سے بھی ذی الحجہ تھا اس لیے حج کے موقع پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ خطبہ کی صورت میں اعلان کیا "اِنَّ الزَّمَانَ قَدِاسْتَدَارَ عَلٰی هَیْئَتِهٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَلسَّنَةُ اِثْنَا عَشَرَ شَهْرًا وَمِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ" یہ خطبہ کے الفاظ ہیں جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر دیا ہے کہ زمانہ گھوم کے آ گیا اپنی اسی حالت پر جس حالت پر وہ اس وقت تھا جب اللہ تعالیٰ نے یہ زمین آسمان پیدا کیے ہیں سال کے مہینے بارہ ہیں اور ان میں سے چار حرمت والے ہیں، لوگوں سے تعیین کرا کے پوچھا کہ یہ کونسا مہینہ ہے؟ سب کے سامنے ذکر کیا کہ ذی الحجہ ہے اور آج ذی الحجہ کی نو تاریخ ہے یہ ذکر کرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس طرح آج کے دن کی حرمت تم کرتے ہو آج کے مہینے کی تم حرمت کرتے ہو اسی طرح ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کی جان مال عزت ایک دوسرے پر حرام ہے، بہرحال خصوصیت کے ساتھ یہ ذکر فرمایا "اِنَّ الزَّمَانَ قَدِاسْتَدَارَ عَلٰی هَیْئَتِهٖ" زمانہ گھوم کے اپنی حالت کے اوپر آ گیا ہے اب اس کے اندر کوئی کسی قسم کا تغیر اور تبدل نہیں کیا جا سکے گا۔

مشرکین مکہ کی مہینوں کے بارے میں دوسری گڑبڑ:

عام طور پر مفسرین نے ذکر یہ کیا ہے کہ جو گڑبڑ کرتے تھے یہ صفر اور محرم کے مہینے میں ہی کرتے تھے، محرم کو پیچھے ہٹا دیتے اور صفر کو پہلے لے آتے لیکن جس وقت روایات کی طرف دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ گڑبڑ ایک ہی مہینے سے تعلق نہیں رکھتی تھی اگر ایک ہی مہینے سے تعلق رکھتی تو وہ لوگ مہینے بارہ ہی قرار دیتے اور بارہ میں سے اشہر حرم چار قرار دیتے اور گڑبڑ ایک ہی مہینے کی تقدیم اور تاخیر کے ساتھ ہوتی تو اتنے اہتمام کے ساتھ یہ اعلان کرنے کی ضرورت نہیں تھی "اِنَّ الزَّمَانَ قَدِاسْتَدَارَ عَلٰی هَیْئَتِهٖ" کہ سال کے بارہ مہینے ہیں اور زمانہ لوٹ کے اپنی پہلی کیفیت پہ آ گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہینوں میں بھی گڑبڑ کرتے تھے اور تعداد میں بھی گڑبڑ کرتے تھے۔

اس کی جو مفسرین نے صورت لکھی ہے وہ زیادہ اطمینان بخش ہے، وہ کہتے ہیں کہ کچھ آثار سے معلوم یوں ہوتا ہے کہ مشرکین نے اپنے آرام کے لیے قمری مہینوں کو شمسی مہینوں کے مطابق کر لیا تھا تا کہ حج ہمیشہ کسی ایک ہی

موسم میں ہو کبھی گرمی کبھی سردی اس طرح نہ ہو ایک موسم متعین کر لیا کہ اس میں حج ہونا چاہیے اس کے بعد انہوں نے قمری مہینوں کو اس کے مطابق بنانے کی کوشش کی تو جب اس طرح شمار کریں گے تو آپ جانتے ہیں کہ گیارہ دن کم ہو جائیں گے اور گیارہ دن کم رہنے کے بعد آٹھ سال بعد تین مہینوں کا فرق پڑ جائے گا تو جس وقت تین مہینوں کا فرق پڑے گا تو اب موسم کو برابر کرنے کے لیے وہ ان تین مہینوں کا آٹھ سال کے بعد اضافہ کر دیتے یعنی کسی سال کو پندرہ مہینے کا بنا دیتے اور کبھی ان کا سال بارہ مہینوں کا ہوتا تو سال کے پندرہ مہینے بنا کے اس کو پھر اس کے مطابق کر لیتے تو تینتیس سال کے بعد وہ مہینہ اصل مہینہ میں آئے گا تو وہ سال جو ہوگا وہ صحیح اپنے وقت پر ہوگا۔

اس طرح مشرکین نے جو گڑبڑ کر رکھی تھی تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس سال حج کے لیے تشریف لے گئے ہیں تو اس وقت تینتیس سال کے بعد ذی الحجہ صحیح وقت پہ آ گیا تھا اور وہ صحیح وقت تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج کرنے کے لیے گئے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ نہ مہینوں کی تعداد میں گڑبڑ کرنی جائز ہے اور نہ مہینوں کے اندر تقدیم و تاخیر جائز ہے آئندہ کے لیے مہینے بارہ ہی رہیں گے اور ان کے اندر چار مہینے حرمت والے ہیں جن کی تعیین کر کے بتائی ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم یہ تین اکٹھے ہیں اور ایک رجب جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان میں ہے رجب کی تعیین اس طرح صراحت کے ساتھ فرمائی کیونکہ بعض مشرک رجب شعبان کے بعد قرار دیتے تھے اور رمضان المبارک والے مہینے کو وہ رجب کہتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعیین کر دی کہ رجب وہ ہے جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان ہے یہ رجب حرمت والا مہینہ ہے۔

تو وہ مہینوں کی تعداد میں بھی گڑبڑ کرتے تھے اور اس طرح تقدیم اور تاخیر میں بھی گڑبڑ کرتے تھے یہ ایک مشرکانہ رسم تھی جس کے نتیجہ میں حرمت والا مہینہ کبھی حلال ہو جاتا تھا اور کبھی حرمت والا مہینہ حرام ہی رہتا جیسا کہ وقت گزرنے پر محرم اپنے صحیح وقت پر آ گیا، ذی الحجہ اپنے صحیح وقت پہ آ گیا، کبھی ایسا ہوا کہ محرم ذی الحجہ میں ہو گیا اور ذی الحجہ ذی قعدہ میں ہو گیا اور کبھی محرم صفر کی جگہ پہ آ گیا اور کبھی صفر ذی الحجہ کی جگہ آ گیا اس طرح یہ مہینے بدلتے رہتے تھے "یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا" کا یہ مطلب ہوگا کہ کسی سال حرمت والا مہینہ ان کے ہاں حرام ٹھہرتا اور کسی سال ان کے ہاں حرمت والا مہینہ حلال ہو جاتا تو یہاں اس رسم بد کی تردید کی گئی ہے۔

آیات کا مفہوم:

اب ان آیات کا ترجمہ دیکھئے "اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا" یہ لفظ بھی اس بات کی

نشاندہی کرتے ہیں کہ انہوں نے مہینوں کی تعداد کے بارے میں بھی گڑبڑ کر رکھی تھی، مہینوں کی گنتی اللہ کے ہاں بارہ ہے "فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ" اللہ کے قانون میں، اللہ کی تحریر میں "یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" جس دن اس نے پیدا کیا آسمان اور زمین کو یعنی اس دن ظہور ہوا بارہ مہینوں کا کیونکہ دن رات کی گردش تب ہی شروع ہوئی جب زمین آسمان پیدا ہو گئے ورنہ اللہ کے علم میں تو یہ ساری چیزیں پہلے سے ہی موجود تھیں "مِنْھَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ" ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں اور یہی سیدھا دین ہے، ان مہینوں کے بارے میں اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو یعنی مہینوں کی تعداد اور ان کو مقدم اور موخر کر کے گڑبڑ نہ کرو یا حرمت والے مہینوں کی حرمت کو بحال رکھا کرو ان کی حرمت کے خلاف حرکت کر کے اپنے آپ پر ظلم نہ کرو" وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً "اور سب مشرکوں سے لڑو جس طرح وہ تم سے لڑتے ہیں اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے۔

قمری مہینوں اور ان کی تاریخوں کو یاد رکھنا فرض کفایہ ہے:

شریعت نے اپنے احکام کا مدار قمری مہینوں پہ رکھا ہے اس لیے مفسرین لکھتے ہیں کہ قمری مہینوں کی یادداشت اور ان کے تاریخوں کی تعیین یاد رکھنا فرض کفایہ ہے اگر ساری امت ہی بھول جائے کہ یہ کونسا مہینہ ہے اور آج کونسی تاریخ ہے تو ایسی صورت میں سارے ہی گناہ گار ہوں گے البتہ اگر بعض کو یاد رہے اور بعض کو یاد نہ رہے تو یہ فرض ادا ہو گیا اور ان تاریخوں کو یاد رکھنے کا آسان ذریعہ یہی ہے کہ اپنے کاروبار میں ان تاریخوں کو استعمال کرو، خط وکتابت میں ان تاریخوں کو استعمال کرو اس لیے قمری مہینے کی تاریخیں استعمال کرنا بہرحال ایک فرض کی ادائیگی ہے اور باعث ثواب ہے، اگرچہ مسئلہ کی رو سے شمسی مہینوں کی تاریخ استعمال کرنا بھی جائز ہے، ان کو استعمال کرنا حرام نہیں ہے لیکن اگر ان کو ایسے طور پر استعمال کیا جائے کہ قمری مہینے یاد ہی نہ رہیں اور ان کی تاریخیں یاد نہ رہیں یہ البتہ بری بات ہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ قمری مہینے اور ان کی تاریخ کو یاد رکھنے کی کوشش کریں اور اس کا آسان طریقہ یہی ہے کہ اپنے روزمرہ کے معمولات میں اس کو استعمال کرنا شروع کردو۔

نماز کے علاوہ تمام اسلامی احکام کا تعلق قمری مہینوں سے ہے:

تو ہمارے جتنے بھی احکام ہیں وہ سارے کے سارے قمری مہینوں سے متعلق ہی ہیں اگرچہ روزمرہ کی ہماری جو نمازیں ہیں ان کا تعلق شمسی حساب کے ساتھ لگایا گیا ہے کہ سورج جس وقت اتنا چڑھ آئے گا تو یہ نماز پڑھی

جائے گی، سورج کے زوال کے وقت یہ نماز پڑھی جائے گی، زوال کے بعد اتنا وقت گزر جائے گا تو یہ نماز پڑھی جائے گی، سورج غروب ہو جائے گا تو یہ نماز پڑھی جائے گی، غروب ہونے کے بعد اتنا وقت گزر جائے گا تو یہ نماز پڑھی جائے گی، طلوع ہونے سے اتنا وقت پہلے یہ نماز پڑھی جائے گی یہ روزمرہ کی نمازیں سورج کے حساب سے ہیں اس لیے کتب سابقہ میں اس امت کی علامات جو ذکر کی گئی ہیں ان میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ سورج کی بہت رعایت رکھنے والے ہوں گے سورج کی رعایت یوں ہے کہ ہمارا جو چوبیس گھنٹوں کا نمازوں کا نظام ہے اس کا تعلق شمس سے ہے، سورج کے ڈھلنے اور غروب ہونے اور طلوع ہونے کے ساتھ ہے۔

باقی شریعت کے جتنے احکام ہیں مثلاً زکوٰۃ کی فرضیت ہے، حج کی فرضیت ہے، روزہ کی فرضیت ہے، یہ ساری چیزیں قمری مہینوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

آیت کا مفہوم:

"اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ" یہ مہینوں کا پیچھے کو ہٹا دینا کفر میں زیادتی ہے یعنی یہ کافرانہ حرکت ہے جتنی یہ حرکت کریں گے اتنا کفر میں اضافہ ہوگا "یُضَلُّ بِہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" گمراہی میں ڈالے جاتے ہیں اس کے ذریعہ سے کافر لوگ، حلال ٹھہراتے ہیں اس مہینہ کو کسی سال اور حرام ٹھہراتے ہیں اس کو کسی سال تاکہ موافق کرلیں حرام ٹھہرائے ہوئے مہینوں کی گنتی کو یعنی اس گنتی کو تو موافق کر لیتے ہیں، تعداد پوری کر لیتے ہیں لیکن تعیین نہیں رہنے دیتے "فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰہُ" پس حلال ٹھہراتے ہیں اس کو جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا "زُیِّنَ لَھُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِھِمْ" ان کے لیے ان کے برے اعمال مزین کر دیے گئے یعنی یہ اپنی کاروائیوں پہ خوش ہیں، ان کو یہ کام اچھے لگ رہے ہیں "وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ" اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو صحیح بات سمجھنے کی توفیق نہیں دیتا، کفر کرتے کرتے ان کے دل اس طرح سیاہ ہو جاتے ہیں کہ پھر صحیح بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

مہینوں کی عظمت ملت ابراہیمی سے چلی آرہی ہے:

یہ بھائی سوال کر رہا ہے کہ محرم کو حرمت والا مہینہ قرار دیا ہے ربیع الاول کو یہ فضیلت کیوں نہیں دی گئی حالانکہ حضور ﷺ اس میں پیداء ہوئے؟

ربیع الاول کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے اور اس کے متعلق شریعت میں کوئی حکم نہیں ہے یہ باقی مہینوں کی

طرح ہے اور محرم کی جو اہمیت ہے وہ کربلا کی وجہ سے نہیں ہے، اس مہینے کو عظمت پہلے سے حاصل ہے، کربلا کا واقعہ تو سرور کائنات ﷺ کی ہجرت کے ساٹھ سال بعد پیش آیا ہے اور ان مہینوں کی حرمت ملت ابراہیمی سے چلی آرہی ہے بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد سے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی تمام شریعتوں کے اندر قمری حساب کو مدنظر رکھا گیا ہے اور فطرت کے بھی زیادہ مطابق ہے، پہچاننا اس کا زیادہ آسان ہے، سورج کے ساتھ پہچاننا کہ اب کونسا مہینہ ہے جس وقت تک کوئی شخص علم ھیت کے قانون نہ جانتا ہو یہ معلوم نہیں کرسکتا، اس کا حساب رکھنا بہت مشکل ہے اور اگر چاند میں ایک مہینہ میں مغالطہ ہو ہی جائے تو جس وقت نیا چاند چڑھے گا حساب آپ پھر صحیح کرلیں گے اور اس کی کمی بیشی خود تعیین کرتی رہتی ہے کہ یہ کتنے دنوں کا ہے تو اس دین فطرت کے لیے یہ قمری حساب ہی مناسب ہے اور اللہ تبارک تعالیٰ نے اسی کو قرار دیا ہے، باقی یہ حرمت والے چار مہینے پہلے سے متعین چلے آرہے ہیں سرور کائنات ﷺ کے تشریف لے آنے کے بعد واقعات کے سلسلوں کے ساتھ مہینوں پر کوئی اثر نہیں پڑا کہ اس مہینہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور اس کو شریعت میں کوئی اہمیت دی گئی ہو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

اگلی آیات کا شان ورود:

اگلی آیات کا تعلق غزوہ تبوک کے ساتھ ہے اس کا اجمالی ذکر بھی آپ کے سامنے ہوگیا تھا کہ مکہ آٹھ ہجری میں فتح ہوگیا اور نو ہجری میں یہ غزوہ پیش آیا تھا اور یہ سرور کائنات ﷺ کا آخری غزوہ ہے، تبوک ایک جگہ ہے شام کی سرحد کے قریب اور شام میں اس وقت رومیوں کی حکومت تھی سرور کائنات ﷺ کو اطلاع ملی کہ رومی فوجی اکٹھے کررہے ہیں اور وہ مدینہ منورہ کے اوپر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔

آپ ﷺ نے مناسب یہ سمجھا کہ ان کو حملہ کرنے موقع نہ دیا جائے بلکہ ان کی سرحد پر ہی ان کو روکا جائے موسم گرمی کا تھا، کھجوریں پک رہی تھیں اور باغات اپنی انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے آپ جانتے ہیں کہ جس وقت فصل پکنے کے دن ہوتے ہیں تو تقریباً کاشتکار خالی سے ہوئے بیٹھے ہوتے ہیں، پچھلی فصل کی آمدنی ختم ہوچکی ہوتی ہے اور نئی فصل کی توقع ہوتی ہے جس طرح ملازم طبقہ مہینے کے آخر میں تقریباً خالی ہوتا ہے اسی طرح کاشتکار بھی آنے والی فصل کے موقع پر پچھلی فصل کی آمدنی سے تقریباً خالی ہوئے بیٹھے ہوتے ہیں تو یہ وقت کچھ افلاس اور تنگدستی کا بھی تھا آئندہ امید تھی کہ فصل قریب آنے والی ہے، گرمی کا شدید موسم تھا، سفر بہت لمبا تھا اور مقابلہ باقاعدہ ایک بہت بڑی سلطنت کی فوج کے ساتھ تھا۔

سرورِ کائنات ﷺ نے نفیرِ عام کا اعلان فرمادیا کہ سب چلو تو ایسے وقت پھر لوگوں کے مختلف طبقات ہو گئے جو مخلص تھے وہ تو اعلان سنتے ہی آمادہ ہو گئے اور انہوں نے اپنی تیاری شروع کر دی اور بعض ایسے تھے کہ جو پہلے متردد ہوئے لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا اور حضور ﷺ کے ساتھ ہو گئے اور بعض خالص قسم کے منافق تھے جنہوں نے نکلنے کا ارادہ ہی نہیں کیا اور جھوٹے بہانے تراش لیے اور بعض مخلص بھی ایسے تھے کہ ان کے پاس عذر کوئی نہیں تھا لیکن سستی کی بناء پر وہ رہ گئے تو اگلی آیات میں مختلف طبقات کے متعلق تذکرے ہیں بعض آیات ایسی ہیں جو غزوہ سے پہلے کی ہیں اور بعض آیات ایسی ہیں جو غزوہ کے بعد کی ہیں۔

غزوہ تبوک میں سستی برتنے والوں کو تنبیہ:

پہلے جو آیات آپ کے سامنے ذکر کی گئی ہیں ان میں اگرچہ عمومی عنوان کے ساتھ جہاد کی ترغیب دی گئی ہے لیکن اس میں اصل کے اعتبار سے تنبیہ ان لوگوں کو ہے جو اس اعلان کے بعد کچھ ڈھیلے سے ہو گئے اور سوچنے لگ گئے کہ اتنے سخت موسم میں اتنا لمبا سفر اور دوسری طرف باغات پھلے ہوئے ہیں ان میں نقصان کا اندیشہ ہے ایسے موقع پر جانا بہت مشکل ہے تو جو ڈھیلے ہو رہے تھے ان کو ان آیات کے اندر تنبیہ کی گئی ہے۔

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کے راستے کی طرف نکلو تو تم زمین کی طرف گرے جارہے ہو، زمین کی طرف بوجھل ہوئے جارہے ہو کیا تم نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں پسند کر لیا ہے تو اصل بنیادی کمزوری یہی ہے کہ جب دنیوی زندگی پسند ہو جاتی ہے اور انسان اس کی محبت میں مبتلاء ہوتا ہے تو پھر نیکی کے کام کرنے کی جراءت ختم ہو جاتی ہے خاص طور پر وہ کام جس میں دنیا کی زیب وزینت یا دنیا کے سامان کی قربانی دینی پڑے، مشقت اٹھانی پڑے تو یہی وہ دکھتی رگ ہے جس کی نشاندہی کر دی گئی، کیا تم نے دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا ہے، دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہے، یہ سودا تمہیں مہنگا پڑے گا اگر تم نے دنیا کی زندگی کا سامان لیا اور آخرت کے کام چھوڑ دیئے تو تم نے کثیر کو چھوڑ کے قلیل کو لے لیا ہے، یہ سودا نفع کا نہیں خسارہ کا ہے، آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کا سامان بہت تھوڑا ہے تو ہم جو کہہ رہے ہیں کہ نکلو اور اس دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دو اور اس میں فائدہ تمہارا ہے ورنہ اگر تم نہیں نکلو گے تو ہمارا کام تم پر موقوف نہیں اگر تم چھوڑ دو گے تو یہ دین کا کام نہیں رکے گا، اگر نہیں نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہارے علاوہ اور لوگوں کو بدل کے لے آئے گا اور تم اللہ کا کیا بگاڑ سکو گے، اللہ کو تم کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ ہر

چیز پر قادر ہے، تمہیں عذاب دینے پر بھی وہ قادر ہے تمہارے بدلے میں اور لوگوں کو لانے پر بھی قادر ہے اور اپنے دین کو بچانے اور پھیلانے اور بالا دست کرنے پر بھی قادر ہے، یہ نہ سمجھو کہ یہ کام تم پر موقوف ہے یہ تو تمہاری سعادت ہے کہ تم ایسا کر رہے ہو اگر ایسا کرو گے تو اس میں نفع تمہارا ہے کسی دوسرے کا نہیں ہے جیسا کہ کہا کرتے ہیں کہ تم بادشاہ کی خدمت کرتے ہو تو یہ احسان تمہارا نہیں بلکہ اس بادشاہ کا احسان ہے جس نے اپنی خدمت کے لیے تمہیں تجویز کر لیا ورنہ اس کی خدمت کے لیے اور تھوڑے ہیں۔

اللہ کا رسول تمہاری مدد کا محتاج نہیں:

"اِلَّا تَنْصُرُوْهُ" یہ ایک واقعہ کی طرف توجہ دلا دی کہ آج اللہ کے رسول ﷺ نے جہاد کا اعلان کیا ہے اور اگر تم اس کے ساتھ مدد کے لیے نہیں اٹھو گے تو یاد رکھو! میرا رسول بھی تمہاری مدد کا محتاج نہیں ہے، تمہارے سامنے یہ واقعہ ہونا چاہیے کہ جس وقت ان کو بے کسی کی حالت میں نکال دیا گیا تھا، صرف دو تھے ایک آپ اور ایک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، صاحب کا مصداق بالاتفاق قطعی طور پر یہاں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، دو ہی تو تھے تیسرا کوئی بھی نہیں تھا، دو میں سے ایک یہ تھے ایک ان کا ساتھی تھا جب ان کو نکال دیا تو اس وقت بھی اللہ نے ان کی مدد کیسے کی؟ سارا شہر مخالف تھا، قتل کرنا چاہتا تھا، محاصرہ کیا ہوا تھا لیکن وہاں سے نکل آئے اور وہ کچھ نہیں بگاڑ سکے۔

اور پھر غار کے اندر پہنچ گئے تو وہ تلاش کرتے کرتے غار کے دروازے تک بھی آئے لیکن دیکھو! اللہ نے کیسے حفاظت کی، یہ اللہ کی مدد نہیں تو کیا ہے؟ ان حالات میں نکال کے بچا لینا یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نصرت ہے جب ایسے موقع پہ اللہ نے ایسی نصرت کی ہے تو جب کوئی اور موقع آئے گا تو اللہ پھر بھی مدد کرے گا یہاں غار سے وہی غار ثور مراد ہے۔

یار غار کی اصطلاح:

یہاں چونکہ غار ثور کا ذکر آیا ہے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ چونکہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے اور صاحب تھے تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سرور کائنات ﷺ کے یار غار کا مصداق ہیں، یہ یار غار کا لفظ جو آپ استعمال کرتے ہیں کہ فلاں میرا یار غار ہے یا فلاں کا فلاں یار غار ہے تو یہ لفظ تشبیہاً ہوتا ہے یعنی اس لفظ کا استعمال کر کے آپ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ فلاں شخص میرے نزدیک ایسے ہی قابل اعتماد ہے جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سرور کائنات ﷺ کے لیے قابل اعتماد تھے اب یار غار کا لفظ مخلص دوست کے لیے محاورہ بن گیا، جبکہ وہ دونوں غار میں تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عشق رسول:

"اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ" جس وقت وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا "لَا تَحْزَنْ" غم نہ کر "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" اللہ ہمارے ساتھ ہے جیسے حدیث شریف میں آتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا " مَاظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا " ابوبکر! تیرا ان دو کے متعلق کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے؟ اس لیے یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اطمینان کا اظہار کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اطمینان دلایا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غم کس بات کا تھا؟ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کی فکر ہوتی تو وہ ساتھ آتے ہی کیوں؟ کونسی مجبوری تھی؟ جب اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جوڑ لیا تو اپنی جان کی فکر نہیں تھی کہ اب یہ غار کے دروازے پر پہنچے ہوئے ہیں اور ہم اندر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے قدم دیکھ رہے ہیں اگر انہوں ذرا سا جھک کر دیکھ لیا تو اندر نظر پڑ جائے گی اور ہم پکڑے جائیں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان پہنچے گا یہ غم تھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جو کھائے جا رہا تھا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دے دی کہ یہ ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے آپ غم نہ کیجیے ورنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اول سے آخر تک جذبات ایسے ہیں کہ اپنی جان کی تو پرواہ کوئی نہیں ہے۔

جیسے سورۃ انفال کے اندر میں نے آپ کو بتایا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے غار کے اندر گئے اور جا کے غار کو صاف کیا اور اس میں ایک سوراخ میں اپنا پاؤں دے دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندر بلایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی ران پہ سر رکھ کے لیٹ گئے اور اسی سوراخ کے اندر کوئی سانپ تھا جس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کاٹا وہاں واقعات میں یہ آیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پتہ چل گیا کہ مجھے زہریلی چیز نے کاٹ لیا ہے زہر نے اثر کرنا شروع کر دیا لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ حرکت نہیں کرتے تھے "مُخَافَةَ اَنْ يَّنْتَبِهَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم" اس اندیشہ سے کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ نہ کھل جائے یعنی اپنی جان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند پہ قربان کر رہے ہیں کہ تھکے ہوئے آئے ہیں، تھوڑی سی آنکھ لگی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آنکھ کھل جائے تو یہاں جان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند پہ قربان کیا جا رہا ہے تو اس وقت میں ان کو اپنی جان کی کیا پرواہ ہوگی؟ اپنی جان کی فکر نہیں تھی، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فکر تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اطمینان دلایا کہ فکر کرنے کی بات نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے یہ کافر مشرک ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

اللہ نے مکڑی کے جالے کے ذریعہ اپنے نبی کی حفاظت کی:

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پھر اپنے نبی کی نصرت فرمائی کہ وہ دروازہ تک پہنچے لیکن بعض آثار سے جس طرح

معلوم ہوتا ہے کہ دروازے پہ مکڑی نے جالا تن دیا اور وہیں کسی کبوتری نے انڈے دے دیے تو مشرکین نے کہا کہ قیافہ شناس نے قیافہ غلط لگایا ہے، یہ جالا تو محمد ﷺ کی ولادت سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے اگر یہاں آتے تو یہ جالا نہ ٹوٹ جاتا؟ تو لوگ جو کام ٹینکوں اور قلعوں سے لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے وہ کام مکڑی کے جالے سے لیا جس کو قرآن کریم نے خود "اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ" سے تعبیر کیا ہے کہ تمام کمزور چیزوں میں سے سب سے کمزور چیز مکڑی کا جالا ہے لیکن آج مکڑی کا جالا ہی قلعہ کا کام دے گیا تو اللہ نے اس طرح حفاظت فرمائی۔

"فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ" اللہ تعالیٰ نے اپنا اطمینان اتارا اس پر "علیہ" سے مراد حضور ﷺ ہیں کیونکہ اصل تو حضور ﷺ ہی تھے، حضور ﷺ کو اطمینان ہوا تو آپ کے اطمینان کا اثر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہ بھی پڑا "وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا" اور قوت پہنچائی اس کو اللہ نے ایسے لشکروں کے ذریعے جن کو تم نے دیکھا نہیں اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کی بات نیچی کر دی ان کی تدبیر فیل ہوگئی "وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا" اللہ کی بات ہی اونچی رہی کہ اللہ تعالیٰ حفاظت کرنا چاہتا تھا، اپنے رسول کو بچانا چاہتا تھا، بچا لیا "وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے اس لیے نہ میرا رسول تمہاری مدد کا محتاج ہے اور نہ میرا دین تمہاری مدد کا محتاج ہے، تمہیں جو نکلنے کے لیے کہا جا رہا ہے اس میں فائدہ تمہارا ہی ہے۔

اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ

نکلو اس حال میں کہ ہلکے ہو یا بوجھل ہو اور جہاد کرو اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ

فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۱﴾ لَوۡ كَانَ

اللہ کے راستے میں یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانتے ہو ﴿۴۱﴾ اگر وہ

عَرَضًا قَرِيۡبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوۡكَ وَلٰـكِنۡۢ بَعُدَتۡ

جلدی حاصل ہونے والا سامان ہوتا اور ہلکا سا سفر ہوتا تو البتہ یہ لوگ آپ کی پیروی کرتے لیکن دراز ہو گئی

عَلَيۡهِمُ الشُّقَّةُ‌ ؕ وَسَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسۡتَطَعۡنَا لَخَـرَجۡنَا

ان کے اوپر مسافت اور عنقریب قسمیں کھائیں گے اللہ کی کہ اگر ہم طاقت رکھتے تو ضرور نکلتے

مَعَكُمۡ‌ ۚ يُهۡلِكُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ‌ ۚ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّهُمۡ لَـكٰذِبُوۡنَ ﴿۴۲﴾

آپ کے ساتھ، اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں ﴿۴۲﴾

عَفَا اللّٰهُ عَنۡكَ‌ ۚ لِمَ اَذِنۡتَ لَهُمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيۡنَ

اللہ آپ سے درگزر کرے آپ نے ان کو کیوں اجازت دی جب تک کہ آپ کے لیے واضح نہ ہو جاتے وہ لوگ

صَدَقُوۡا وَتَعۡلَمَ الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسۡتَاۡذِنُكَ الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ

جنہوں نے سچ بولا اور جب تک آپ جان نہ لیتے جھوٹوں کو ﴿۴۳﴾ نہیں اجازت طلب کرتے آپ سے وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں

بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ اَنۡ يُّجَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ‌ ؕ

اللہ کے ساتھ اور یوم آخرت کے ساتھ اس بات سے کہ وہ جہاد کریں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ

وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسۡتَاۡذِنُكَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ

اللہ جاننے والا ہے متقین کو ﴿۴۴﴾ سوائے اس کے نہیں کہ اجازت طلب کرتے ہیں آپ سے وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے

بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَارۡتَابَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ فَهُمۡ فِىۡ رَيۡبِهِمۡ

اللہ اور یوم آخرت کے ساتھ اور شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے دل پس وہ لوگ اپنے شک میں

يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ

متردد ہیں ﴿۴۵﴾ اگر یہ نکلنے کا ارادہ کرتے تو تیار کرتے اس کے لیے سامان لیکن

كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿٤٦﴾

اللہ نے ناپسند کیا ان کے اٹھنے کو پس منع کر دیا اللہ نے ان کو اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھے رہو تم بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ ﴿۴۶﴾

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ

اگر یہ نکلتے تم میں تو نہ زیادہ کرتے مگر خرابی اور راستہ میں دوڑاتے یہ اپنی سواریوں کو تمہارے درمیان

يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ

طلب کرتے تم میں شرارت اور تمہارے اندر ان کے سننے والے موجود ہیں اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں

بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٧﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ

ظالموں کو ﴿۴۷﴾ البتہ انہوں نے شرارت طلب کی تھی اس سے پہلے بھی اور الٹ پلٹ کیے آپ کے لیے بہت سے کام

حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَمِنْهُمْ

یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا امر غالب آ گیا اس حال میں کہ وہ ناخوش ہیں ﴿۴۸﴾ ان میں سے وہ بھی ہے

مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۗ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۗ

جو کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دو اور مجھے فتنے میں نہ ڈالو اور خبردار فتنے میں تو وہ لوگ گر گئے

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٩﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ

اور جہنم البتہ گھیرا ڈالنے والی ہے کافروں کو ﴿۴۹﴾ اگر پہنچتی ہے آپ کو کوئی اچھی حالت تو وہ ان کو غم میں ڈالتی ہے

وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ

اور اگر پہنچتی ہے آپ کو کوئی مصیبت تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اختیار کر لیا اپنا امر اس سے پہلے ہی

وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿٥٠﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ

وہ پیٹھ پھیرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں ﴿۵۰﴾ آپ کہہ دیجئے کہ ہرگز نہیں پہنچے گی ہمیں مگر وہی چیز جو اللہ نے لکھ دی

لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ

ہمارے لیے وہ ہمارا کارساز ہے اور اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے ایمان والوں کو (۵۱) آپ کہہ دیجیے کہ نہیں

تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ

انتظار کرتے تم ہمارے متعلق مگر دو اچھی باتوں میں سے کسی ایک بات کا اور ہم انتظار کرتے ہیں تمہارے متعلق

اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا

کہ پہنچا دے تمہیں اللہ عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں سے پس تم انتظار کرو

اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ

ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں (۵۲) آپ کہہ دیجیے کہ تم خرچ کرو خوشی سے یا ناگواری سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا

مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ

تمہاری طرف سے بے شک تم نافرمان لوگ ہو (۵۳) نہیں روکا ان کو اس بات سے کہ قبول کیے جائیں

مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ

ان کے صدقات مگر اس بات نے کہ بے شک انہوں نے کفر کیا اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اور نہیں آتے

الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾

نماز کے پاس مگر اس حال میں کہ وہ سستی کے مارے ہوتے ہیں اور نہیں خرچ کرتے مگر اس حال میں کہ ناخوش ہوتے ہیں (۵۴)

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ

پس آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد سوائے اس کے نہیں اللہ ارادہ کرتا ہے

لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ

کہ عذاب دے ان کو ان کے مالوں کے ذریعہ سے دنیوی زندگی میں اور چلی جائیں ان کی جانیں اس حال میں کہ یہ

كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ

کافر ہیں (۵۵) قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ بے شک وہ البتہ تم میں سے ہیں، وہ تم میں سے نہیں

وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿٥٦﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ

لیکن وہ لوگ ڈرتے ہیں (۵۶) اگر وہ پائیں ٹھکانہ یا پائیں کوئی غاریں

اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ

یا گھسنے کی جگہ البتہ پیٹھ پھیر کے بھاگ جائیں اس کی طرف اس حال میں کہ وہ بے قابو ہوتے ہیں (۵۷) اوران میں سے بعض وہ ہے

يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ

جوآپ کوطعنہ دیتا ہے صدقات کے بارے میں اگر دے دیے جائیں وہ ان صدقات میں سے تو یہ خوش ہو جاتے ہیں اوراگر

يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿٥٨﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ

ان میں سے نہ دیے جائیں تواچانک یہ ناراض ہو جاتے ہیں (۵۸) اوراگر یہ خوش ہوتے اس چیز پر جو دی ان کو

اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

اللہ نے اوراس کے رسول نے اور کہتے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے عنقریب دیں گے اللہ اپنے فضل سے

وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿٥٩﴾ ع

اوراس کا رسول بھی، بے شک ہم اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں (۵۹)

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

پہلی آیت تو پچھلے مضمون سے متعلق ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاد کی ترغیب دی تھی اور یہ موقع ہے غزوۂ تبوک کا اوراس موقع پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نفیرِ عام ہوگیا تھا، امام کی طرف سے جب نفیرِ عام ہو جائے تو پھر جہاد فرض علی الکفایہ نہیں رہتا بلکہ فرض علی العین ہو جاتا ہے تو یہ موقع بھی ایسے ہی تھا کہ اس جہاد کو فرض علی العین کر دیا گیا تھا سب لوگوں کو حکم دیا گیا تھا کہ نکلو چاہے کسی کے پاس پورا سامان ہے چاہے کسی کے پاس نہیں ہے جیسے کیسے بھی ہیں اس جہاد کے اندر نکلو۔

غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سخاوت:

تفصیل عرض کرتے ہوئے یہ بات آپ کے سامنے آئی تھی کہ اس موقع پر لوگوں کے مختلف گروہ ہو گئے تھے، بعض تو مخلصین جو اعلیٰ درجے کے تھے وہ تو فوراً تیار ہو گئے، انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہی موقع ہے کہ جس میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان جہاد کے لیے چندے کی اپیل کی تھی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سو اونٹ پیش کیا تھا اور ایک ہزار دینار دیا تھا اور پھر دوبارہ اپیل کی تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے پھر سو اونٹ پیش کیا بمع ساز و سامان کے پھر تیسری دفعہ اعلان کیا تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سو اونٹ پیش کیے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ کی تعبیر علماء نے دو طرح سے کی ہے کہ پہلے اعلان پہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے ذمہ ایک سو اونٹ ہے بمع ساز و سامان کے اور دوسری دفعہ اعلان کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے ذمے دو سو اونٹ ہیں بمع ساز و سامان کے اور تیسری دفعہ اعلان کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے ذمہ تین سو اونٹ ہیں بمع ساز و سامان کے تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہوئے منبر سے اتر آئے کہ آج کے بعد عثمان کوئی نیکی کا کام نہ بھی کرے تو اس کا کوئی نقصان نہیں مطلب یہ تھا کہ یہی عمل اس کی نجات کے لیے کافی ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہر بعد والے اعلان میں پہلے اونٹ شامل ہیں یا نہیں؟ اس میں دونوں احتمال ہیں، اگر شامل کر لیں تو کل تین سو اونٹ بنتے ہیں اور اگر پہلے والوں کو بعد والے اعلان میں شامل نہ کریں تو کل تعداد چھ سو بنتی ہے، اس طرح لوگوں نے اس غزوہ میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا ہے جتنے مخلص تھے کسی نے کمی کوتاہی نہیں کی۔

پورے سبق کا خلاصہ:

اور منافقین جو تھے وہ بھی اس جہاد میں اچھی طرح کھل کے سامنے آگئے ان کی حالت بھیبت نمایاں ہو گئی بعض تو ایسے تھے جو گھروں میں بیٹھے رہے نہ کوچ کرنے کے لیے آئے اور نہ وہ ساتھ چلے ان کا ذکر آگے آرہا ہے اس پارے کے آخر میں اور بعض ایسے تھے جن کا ارادہ جہاد پہ جانے کا بالکل نہیں تھا، تیاری بھی کوئی نہیں کی لیکن جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہونے لگے تو آئے اور جھوٹی قسمیں کھا گئے کہ ہمارا ارادہ تو تھا لیکن یہ عذر پیش آگیا، ہمارا ارادہ تو تھا لیکن یہ مجبوری پیش آگئی اس قسم کی انہوں نے معذرت کرنی شروع کر دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کریم النفسی کی وجہ سے کسی پر کوئی گرفت نہیں کی بلکہ جو آ کے عذر کرتا تو اس کا عذر قبول فرماتے اور اسے اجازت دے دیتے

اب آپ جانتے ہیں کہ جس وقت سرور کائنات ﷺ کی طرف سے اجازت ہوگئی تو سچے اور جھوٹے کے اندر کوئی ظاہری فرق نہ رہا اگر سرور کائنات ﷺ اجازت نہ دیتے اور کہتے کہ نہیں کوئی عذر قبول نہیں ہے تو جو منافق تھے انہوں نے جانا تو تھا نہیں نہ انہوں نے تیاری کرنی تھی تو پھر بالکل نمایاں ہوجاتے، ان کے اندر کسی قسم کا کوئی خفاء نہ رہتا اور جب وہ عذر کرکے اجازت لے گئے تو اب اس طرح اشتباہ ہوگیا کہ ان میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرور کائنات ﷺ پر تھوڑی سی اس بارے میں کچھ گرفت فرمائی کہ اگر آپ جازت نہ دیتے تو آج یہ کھل کے سارے کے سارے سامنے آجاتے، آپ نے اجازت جو دے دی تو ان کے اوپر ایک پردہ پڑ گیا اس بات کو کہتے وقت ابتداء کے اندر "عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ" پہلے ہی معافی کا اعلان کردیا، یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس پر آپ کی گرفت ہو یا نعوذ باللہ کسی قسم کی کوئی ناراضگی باقی رہ جائے لیکن مصلحت کے خلاف بات ہوگئی کہ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ ان کو اجازت نہ دیتے تا کہ ان کا جھوٹ اچھی طرح نمایاں ہوجاتا، سچے اور جھوٹے میں فرق ہو جاتا اگر تو یہ سچے ہوتے کہ ہمارا ارادہ تو تھا کہ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو بھی چل پڑتے اور اگر اجازت نہ دینے کے باوجود گھروں میں بیٹھے رہتے تو ان کا نفاق کھل کر سب کے سامنے آجاتا۔

اصل بات یہ ہے کہ جن چیزوں کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں اگر کوئی تر لقمہ نصیب ہونے والا ہوتا، بہت جلدی غنیمت کا سامان ملنے والا ہوتا، سفر تھوڑا سا ہوتا پھر تو یہ بھاگ کے آتے لیکن چونکہ اب سفر دراز ہے، مشقت اس میں بہت ہے اس لیے یہ لوگ گھروں کے اندر دب کے بیٹھ گئے جہاد کرنے پہ یہ آمادہ نہیں ہیں تو اگلے رکوع میں ساری انہی لوگوں کی کوتاہیاں واضح کی ہیں، کافی دور تک یہ مضمون چلا گیا ہے ساتھ ساتھ آیات دیکھتے چلیے۔

آیات کا مفہوم:

پہلے تو وہی جہاد کے متعلق ترغیب ہے کہ سامان اگر تمہارے پاس کم ہے یا زیادہ ہے جیسا بھی ہے نکلو، یہ نفیر عام ہے اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو اللہ کے راستے میں یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو یعنی جہاد پر جس قسم کا منافع ملتا ہے اللہ کی رضا آتی ہے اس کے مقابلہ میں یہ دنیا کی مشقت کوئی چیز نہیں ہے، آگے تذکرہ شروع ہوگیا منافقین کا اور "کَانَ" کا اسم میں نے واضح کردیا کہ وہ چیز جس کی طرف آپ ان کو دعوت دے رہے ہیں یہ جلدی حاصل ہونے والا سامان ہوتا یا کوئی سفر زیادہ لمبا نہ ہوتا، درمیانہ سا سفر ہوتا تو پھر یہ آپ کی

اتباع کرتے کیونکہ اس میں پھر ان کو دنیوی منافع معلوم ہوتے تھے، یہ جو مسافت بعیدہ ہے جدھر آپ ان کو بلا رہے ہیں وہ ان کو بڑی دراز معلوم ہو رہی ہے اس لیے وہ ادھر جانے کی جرات نہیں کر رہے اور قسمیں کھائیں گے اللہ کی کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور آپ کے ساتھ چلتے اس طرح سے جھوٹ بول بول کر اپنے آپ کو مزید ہلاکت میں ڈالتے چلے جا رہے ہیں کیونکہ ایک تو جہاد سے کوتاہی کہ دبک کے گھر میں بیٹھ جانا یہی بری بات ہے، یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا اور پھر اس کو چھپانے کے لیے مزید جھوٹ بولا اور جھوٹی قسمیں کھائیں اور جھوٹی قسمیں کھانا ان کے لیے یہ اور زیادہ وبال میں اضافہ ہوا تو اپنے نفسوں کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔

اللہ آپ سے درگزر کرے، آپ کو معاف کرے، دیکھو! یہ فقرہ پہلے ذکر کر دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ آگے جو بات ذکر کی جا رہی ہے یہ خلاف مصلحت ہے، یہ ایک قسم کی نشاندہی کی جا رہی ہے کہ بات خلاف مصلحت ہوگئی ورنہ اس کے اوپر کوئی گرفت پیش نہ آتی اللہ آپ سے درگزر کرے آپ نے ان کو کیوں اجازت دی یعنی اگر آپ اجازت نہ دیتے تو آپ کے سامنے سچے اور جھوٹے واضح ہو جاتے "لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ" آپ نے ان کو کیوں اجازت دے دی؟ "حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا" حتیٰ کہ واضح ہو جاتے وہ لوگ جنہوں نے سچ بولا اور حتیٰ کہ آپ جان لیتے جھوٹوں کو یعنی اجازت نہ دیتے تو یہ دونوں گروہ ممتاز ہو کے سامنے آ جاتے، نہیں اجازت طلب کرتے آپ سے وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں جہاد سے بچنے کے لیے "اَنْ يُّجَاهِدُوْا" جہاد کو ترک کرنے کے لیے، جہاد کو چھوڑ کر بیٹھنے کے لیے یہ لوگ آپ سے اجازت طلب نہیں کرتے جو جہاد کریں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ متقین کو خوب جانتا ہے، جن میں ایمان ہے جب آپ کی طرف سے اعلان ہو گیا تو وہ جہاد پر آمادہ ہیں اپنی جان اور مال لگانا چاہتے ہیں، جان اور مال کو بچانا اور جہاد کو ترک کرنا اس کی اجازت مؤمن نہیں لیتے، اجازت وہی لوگ لیتے ہیں جن کا اللہ پر ایمان نہیں اور یوم آخرت پر ایمان نہیں ہوتا اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں، شک ان کو یہی تھا کہ معلوم نہیں کہ اتنے لمبے سفر میں جائیں گے، آگے بہت بڑی حکومت کے ساتھ ٹکر ہے، بڑی بڑی فوجیں ہیں وہاں سے بچ کے آئیں گے یا نہیں آئیں گے، ادھر ہمارے باغات کا نقصان ہو جائے گا اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر ان کو یقین نہیں اسی قسم کے تردد میں یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

منافقین کے جھوٹ کی علامت:

اور ان کے جھوٹے ہونے کی علامت یہ ہے کہ اگر ان کے نکلنے کا ارادہ ہوتا تو کچھ تیاری کرتے پھر موقع پر اگر کوئی عذر آجاتا تو سب کو معلوم ہوتا کہ ان کی تیاری تھی اور اگر عذر نہ آتا تو یہ ضرور چلتے دیکھو! سچے اور جھوٹے عذروں میں ظاہری امتیاز ہے کہ ایک آدمی اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہے، ارادہ اس کا مکمل ہوتا ہے مثلاً صبح اٹھنے میں کسی کا ارادہ ہے کہ میں اٹھوں گا اور تہجد پڑھوں گا اپنے طور پہ وہ وقت پہ سوتا ہے، کسی دوسرے ساتھی سے کہہ کے سوتا ہے کہ اگر آنکھ کھل جائے تو مجھے جگا دینا یا کوئی الارم کا انتظام کرتا ہے کہ جب یہ الارم بجے گا تو میں اٹھوں گا، ہر چیز کا وہ انتظام کر کے سوتا ہے لیکن پھر اتفاق ایسا ہوا کہ ایسی گہری نیند آئی کہ آنکھ نہ کھلی یا وہ جگانے والا نہیں آیا تو اب یہ شخص معذور ہے اگر تہجد کے لیے نہیں اٹھ سکا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو اس کے ارادہ کے طور پر اس کا ثواب دیں گے اور ایک شخص ہے کہ اس کی ابتداء سے ہی نیت خراب ہے اور سویا وہ اس انداز سے کہ اس کا اٹھنے کا ارادہ نہیں تو یہ شخص اس نیکی سے محروم ہوگا پھر اس کا یہ کہنا کہ جی مجھے جگانے کے لیے نہیں آیا، میں تو اس لیے نہیں اٹھا آلارم مجھے نہیں سنا تو یہ ایک دین داری کا پردہ ڈالنے والی بات ہے اور حقیقت کے اعتبار سے اس کا خود ارادہ تھا کہ اچھا آنکھ نہ کھلے تو ساری رات سوئیں گے تو ایک آدمی حتی الامکان کوشش کرے پھر اگر موقع پر کوئی عذر آجائے تو یہ سچا عذر ہوتا ہے۔

جمعہ کا دن ہے اور جمعہ کی تیاری آپ کرتے ہیں اچھی طرح سے کپڑے دھوئے، نہائے اور اگر عین موقع پر کوئی اس قسم کی تکلیف پیش آگئی یا کوئی رکاوٹ پیش آگئی کہ آپ پہنچ نہ سکے تو ہر کوئی جانتا ہے کہ آنے کا ارادہ تو تھا لیکن یہ عذر پیش آگیا اور جو کوتاہی کر کے کسل مندی کے ساتھ بیٹھے ہوں اور اس طرح سے حیلے بہانے کرتے ہیں تو ان کا جھوٹ نمایاں ہو جاتا ہے کہ قبل از وقت ان کو پتہ نہیں تھا کہ ہمارے سامنے کوئی رکاوٹ پیش آنی ہے یہ پہلے سے ہاتھ جوڑ کے بیٹھ گئے تو منافقین کا بھی یہی حال تھا یہ نہیں کہ انہوں نے سامان اکٹھا کرنے کی کوشش کی تھی، سواری تیار کی تھی، ہتھیار مہیا کیے تھے لیکن عین روانگی کے وقت سخت بخار ہو گیا یا کوئی چوٹ لگ گئی یا کوئی اور عذر پیش آگیا ایسی بات نہیں ہے، یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے جھوٹ کے لیے ان کی کسل مندی کو بطور نشانی کے پیش کرتے ہیں کہ اگر ان کے نکلنے کا ارادہ ہوتا تو وہ ضرور سامان تیار کرتے۔

منافقین کا نہ نکلنا ہی بہتر ہے:

اب آگے اہل ایمان کو تسلی دی جارہی ہے کہ ان کا نہ نکلنا ہی تمہارے لیے یوں سمجھو کہ مفید ہے کیونکہ یہ مخلص تو ہیں نہیں اور ایسے موقع پر اگر غیر مخلص جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں تو مختلف حرکتیں کر کے شرارتیں بھڑکاتے ہیں، کسی کے ساتھ لڑیں گے، یہ غلط افواہیں پھیلائیں گے، کبھی بزدلی کا مظاہرہ کر کے باقیوں کا دل بھی توڑیں گے اور ایسے موقع پر اتنے دراز سفر کے لیے، اتنے مشکل جہاد کے لیے ان کا نہ نکلنا تمہارے لیے بہتر تھا "وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ" اللہ نے ان کا اٹھنا مکروہ جانا، جس کو پسند ہی نہیں کیا اور ان کو بے رغبت کر کے بٹھا دیا اور تکوینی طور پر کہا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو، اگر یہ نکلتے تمہارے اندر تو سوائے خرابی کے کچھ نہ بڑھاتے، ان کے نکلنے کا فائدہ نہ تھا، نقصان زیادہ تھا، نقصان اس طرح تھا کہ شرارتیں کرتے، کسی کے ساتھ لڑتے اور کسی کے ساتھ فتنے اٹھاتے اور مختلف قسم کی افواہیں پھیلاتے، بزدلی پھیلاتے "وَلَا اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ" تمہارے اندر یہ سواریاں دوڑاتے ہیں شرارت طلب کرنے کے لیے، لگائی بجھائی جس طرح منافقین کی عادت ہے ادھر کی ادھر لگا و "وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ" تمہارے اندر بعض ان کے جاسوس موجود ہیں جو تمہارے حالات ان تک پہنچائیں گے یا تمہارے اندر کچھ کمزور لوگ اس طرح کے موجود ہیں جو ان سے متاثر ہیں اور ان کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں، ان کی طرف بھی ذرا نظر رکھنا، ان کو تاڑ کر رکھو تاکہ یہ بھی اپنی کمزوری کی بناء پر کوئی شرارت نہ اٹھادیں اگر چہ ان کے سرغنے نہیں آئے، ان کے بڑے نہیں آئے لیکن پھر بھی چھوٹے لوگ موجود ہیں اور ایسے لوگ تھے جن سے ایسی بعض باتیں پیش آئیں جن کا ذکر آگے قرآن مجید میں آئے گا، اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتے ہیں۔

"لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ" کا مفہوم:

انہوں نے اس سے پہلے بھی شرارت کی تھی "لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ" اس "من قبل" سے اشارہ ہے جنگ احد کی طرف کہ یہ سارے شامل ہو کے نکلے تو تھے لیکن شہر سے باہر جا کے پھر کوئی بہانہ کر کے عبداللہ بن ابی اور اس کے تمام رفقاء واپس آگئے اور اس قسم کی حرکت بسا اوقات باقیوں کے حوصلے توڑنے کے لیے اثر انداز ہوتی ہے جب ایک ہزار آدمی نکلیں تین سو ان میں سے کوئی بہانہ کر کے واپس آجائیں تو باقیوں کے دل بھی چھوٹ سکتے ہیں، جس طرح دو قبیلوں نے، دو گروہوں نے اس طرح سے دل چھوڑنے کا کچھ ارادہ کر لیا تھا "اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ

مِنۡكُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا " دو طائفوں نے دل چھوڑنے کا قصد کر لیا تھا لیکن اللہ نے انہیں سنبھال لیا تو اس طرح جیسے انہوں نے شرارت کی تھی اب بھی تو ایسی شرارت کرتے، احد میں شرارت کی تھی، اس سے پہلے غزوہ مریسیع پیش آیا تھا اس میں مہاجرین وانصار کو لڑانے کے لیے شرارت برپا کی تھی، حضرت امی عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اس قسم کی باتیں اڑا کے فتنہ اٹھایا تھا، یہ سارے فتنوں کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے "وَقَلَّبُوۡا لَكَ الۡاُمُوۡرَ" آپ کے لیے بھی بہت ساری باتوں کو الٹ پلٹ کرتے رہے ہیں، اس قسم کی گڑبڑ کر رہے ہیں آپ کو شکست دینے کے لیے لیکن اللہ کی طرف سے حق آ گیا اور اللہ کا امر غالب رہا اور یہ اسلام کا غلبہ دیکھ کر دل سے خوش نہیں ہیں اور آپ کا غلبہ دیکھ کر ان کو کوئی خوشی نہیں ہے۔

ایک منافق کا حال:

اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دو اور مجھے فتنے میں نہ ڈالو، مفسرین نے یہاں ذکر کیا کہ ایک منافق تھا جد بن قیس، جد اس کا نام تھا قیس کا بیٹا یہ آپ کے پاس آیا اور تقویٰ کا مظاہرہ کیا بایں الفاظ کہ یا رسول اللہ! میں نے سنا ہے کہ روم کی عورتیں بہت خوبصورت ہیں اور میں عورتوں کے بارے میں بڑا جذباتی واقع ہوا ہوں تو میں اگر چلا گیا اور میری کسی عورت پر نظر پڑ گئی تو میں خواہ مخواہ فتنے میں پڑ جاؤں گا اس لیے میرا یہاں بیٹھا رہنا مناسب ہے مجھے اجازت دے دیں اور میں جہاد میں چندہ دے دیتا ہوں یعنی تھی اندر خباثت جہاد میں جانا نہیں چاہتا تھا اوپر سے تقویٰ کا اور خدا خوفی کا پردہ ڈال لیا کہ میں اگر وہاں جاؤں گا تو کسی فتنے میں مبتلاء ہو جاؤں گا جیسے کوئی شخص نماز باجماعت میں اس لیے نہ جائے کہ آرام طلبی ہے، کون سردی میں جائے مسجد میں لیکن کہے کہ میں اس لیے مسجد نہیں آتا کہ ریاکاری کا اندیشہ ہے اس لیے چھپ کے نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے تو اس قسم کے کلابی تقویٰ کی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے اوپر انسان کچھ اور ڈال لیتا ہے تو ایسی باتیں ہوتی ہیں، اپنی باطنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے انسان اس کے اوپر دین کا پردہ ڈال لیتا ہے تو اس نے بھی دین کا پردہ ڈالا کہ میں جاؤں گا اور کسی عورت پہ میری نظر پڑ جائے گی تو میں اپنی اس کمزوری کی بناء پر کسی فتنے میں پڑ جاؤں گا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فتنے میں پڑ جاؤں گا یہ تو بعد کی بات ہے اور یہ وہی بات ہے کہ وہاں جا کے کوئی فتنہ پیش آتا ہے یا نہیں آتا، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے طور پر گھر میں بیٹھ جانا، جہاد کو چھوڑ دینا یہ نقد فتنہ ہے جس کے اندر یہ واقع ہو گئے، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو چھوڑ کر فتنہ میں پڑ گئے، فتنہ میں تو یہ لوگ مبتلاء ہو گئے اور

وہاں جاتے، کسی عورت پہ نظر پڑتی، دل میں کوئی خلل آتا نہ آتا اس کا ان کو قبل از وقت کیا پتہ ہے؟ وہ تو بعد کی بات ہے تو موہوم فتنے سے بچنے کے لیے یہ حقیقی فتنے میں واقع ہو گئے، یہ بات ان کی صحیح نہیں باقی رہا خدا کا معاملہ چندہ دیتے ہیں خوشی سے دیں یا ناگواری سے دیں ان کے صدقات قبول نہیں ہیں کیونکہ ان کے دل کے اندر ایمان نہیں ہے اور خلوص نہیں اور جو شخص حالات سے مجبور ہو کے خرچ کرتا ہے، دل کے اندر خلوص نہیں، اللہ کی رضا کی طلب نہیں تو ایسے لوگوں کے صدقات قبول نہیں ہوتے، ان میں سے کوئی یہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دو اور مجھے فتنے میں نہ ڈالو، خبردار فتنے میں یہ لوگ پڑ گئے اور جہنم کافروں کو گھیرنے والی ہے، آخرت میں خوب اپنے احاطے میں لے لے گی اور دنیا میں جہنم میں جانے کے اسباب انسان کے اردگرد جب پھیلے ہوئے ہوں تو دنیا کے اندر بھی یہ دنیا جہنم بن جاتی ہے تو دنیا میں بھی کافروں کو جہنم نے گھیرا ہوا ہے۔

منافق تمہارے خیر خواہ نہیں ہیں:

"اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ" یہ ان کا جذبہ نمایاں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کے خیر خواہ نہیں ہیں اور آپ کے ساتھ ان کو کوئی ہمدردی نہیں ہے، دوست دوست کے ساتھ جس وقت ہمدردی رکھتا ہے تو دوست کی خوشی اس کے لیے خوشی ہوتی ہے، دوست کی مصیبت اس کے لیے مصیبت ہوتی ہے لیکن یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر تمہیں کوئی اچھی حالت پہنچ جاتی ہے، اللہ کی طرف سے کامیابی ہو جائے، مال غنیمت مل گیا تو ان کو صدمہ ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور اگر کسی جگہ آپ کو تکلیف پہنچ جاتی ہے، نقصان ہو جاتا ہے تو پھر یہ بغلیں بجاتے ہیں کہ اچھا ہو گیا کہ ہم نے احتیاط اختیار کر لی اگر یہ مخلص ہوتے، مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ اور آپ کے ساتھ ان کو ہمدردی ہوتی تو آپ کی خوشی ان کے لیے خوشی ہوتی اور اگر آپ کو کوئی صدمہ پہنچتا تو اس صدمے کو یہ ایسے ہی محسوس کرتے جیسے انہیں صدمہ پہنچا ہے تو دوسرے کو اچھی حالت پہنچنے پر دل میں صدمہ محسوس کرنا یہ حاسد ہونے کی علامت ہے اور دوسرے کو تکلیف پہنچنے پر اپنے لیے خوشی محسوس کرنا یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ تمہارے ساتھ ہمدرد نہیں ہیں، خیر خواہ نہیں ہیں بلکہ اندر اندر سے دشمن ہیں اس لیے تمہاری برائی چاہتے ہیں، اچھائی نہیں چاہتے اگر تمہیں پہنچے کوئی اچھی حالت تو انہیں غم میں ڈال دیتی ہے اور اگر تمہیں پہنچے کوئی مصیبت تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنا امر اختیار کر لیا یعنی احتیاطی امر اختیار کر لیا اس سے قبل ہی وہ اٹھ کے جاتے ہیں خوشی مناتے ہوئے یعنی جب مجلس سے جاتے ہیں تو بغلیں بجاتے ہیں، خوشیاں مناتے ہیں کہ اچھا ہو گیا کہ ہم اس سفر میں ساتھ نہیں تھے۔

مؤمن کی دونوں حالتیں بہتر اور منافق کی دونوں حالتیں باعث نقصان ہیں:

آپ انہیں کہہ دیجیے کہ تکلیف تو ہمیں وہی پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے اور اللہ کی طرف سے آئے گی، اللہ کارساز ہے، ہمارا تو ہر لحاظ سے اللہ پر ایمان ہے اس لیے ہماری تکلیف آپ کے لیے کوئی خوشی کا باعث نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے لیے ظاہری کامیابی ہو یا ناکامی ہو دونوں ہی حسنہ کا مصداق ہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ نبی کو اللہ نے فتح دی ہے، مال غنیمت دے دیا، کامیابی ہوگئی یہ تو حسنہ کا مصداق ہے اور اگر اللہ کی طرف سے کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ بھی ہمارے لیے حسنہ ہی ہے کہ اس کے ساتھ گناہ معاف ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ آخرت میں ثواب دے گا، نتیجہ کے اعتبار سے مؤمن مخلص کے لیے مصیبت بھی حسنہ کا مصداق ہے اس میں مسلمانوں کا کوئی نقصان نہیں جیسے کہتے ہیں کہ مریں تو شہید اور ماریں تو غازی، مسلمان تو دونوں صورتوں میں کامیاب ہے کہ جب انسان مخلص ہو جاتا ہے تو ہر طور کامیابی اسی کی ہے۔

اگر مر گیا تو شہید ہے اور اگر مار کے آ گیا تو غازی ہے اس کے لیے تو کوئی بری حالت ہے ہی نہیں تو تم ہمارے لیے حسن ہی کے منتظر ہو چاہے وہ اچھی حالت ہو چاہے وہ بری حالت ہو تمہارے خیال کے مطابق لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ ہمارے لیے حسنہ ہی ہے اس لیے ہماری تکلیف پر تمہارے خوش ہونے کی کوئی بات نہیں ہے اور ہم کس کے منتظر ہیں تمہارے متعلق؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست عذاب آ جائے، تمہیں ہلاک کر دے یا اللہ تعالیٰ ہمارے ہاتھوں تمہاری پٹائی کرا دے، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کفر تمہارا ظاہر ہو جائے اور نفاق نمایاں ہو جائے اور اللہ کی طرف سے حکم آ جائے کہ منافقوں کے ساتھ مسلمانوں والا برتاؤ نہ کرو بلکہ کافروں والا کرو تو ایسی صورت میں بھی تمہاری پٹائی ہمارے ہاتھوں ہو سکتی ہے تو تمہارے لیے دونوں حالتیں جن کا ہم انتظار کیے ہوئے ہیں نقصان کی ہیں اور ہمارے متعلق تم جو بھی سوچو وہ ہمارے لیے نفع کی بات ہے، نہیں انتظار کرتے تم ہمارے متعلق مگر حسنہ یا ان میں سے ایک کا اور ہم انتظار کرتے ہیں کہ پہنچائے تمہیں اللہ تعالیٰ عذاب اپنی طرف سے براہ راست جس میں ہمارا دخل نہ ہو یا ہمارے ہاتھوں، تم بھی انتظار میں رہو اور ہم بھی انتظار میں ہیں کہ دیکھیں گے کون لوگ نتیجہ کے اعتبار سے نقصان میں رہتے ہیں۔

نفاق اور کفر کی علامت:

اور یہ جو صدقات پیش کرتے ہیں، جہاد میں چندہ دیتے ہیں تو کہہ دو تم خوشی سے دو یا ناگواری سے دو اللہ تمہاری طرف سے ہرگز قبول نہیں کرے گا، بے شک تم بدمعاش لوگ ہو، نافرمان لوگ ہو ایسے لوگوں کے صدقات اللہ قبول نہیں کرتا اور قبول کیوں نہیں کرے گا؟ اس کی وجہ ایک یہ ذکر کردی کہ یہ اندر سے کافر ہیں اور جو کفر کی حالت میں صدقہ پیش کرتا ہے وہ قبول نہیں ہوا کرتا نہیں روکا ان کو یعنی ان کے صدقات قبول کرنے کو مگر اس بات نے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ، کفر کی وجہ سے ان کے صدقات قبول نہیں کیے اور اس سے مراد اندرونی اور باطنی کفر ہے ورنہ ظاہر میں تو یہ کلمہ پڑھتے تھے، یہ باطنی کفر ہے اور اس باطنی کفر کا یہ اثر نمایاں ہے کہ "لَا يَأْتُونَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى" نہیں آتے نماز کی طرف مگر سستی کے مارے ہوئے، جی ہارے ہوئے، اٹھنے کی قوت نہیں جیسے بندھا ہوا ہے، نماز میں ذوق وشوق سے نہ آنا یہ علامت ہے کہ ان کے دل میں کفر ہے اور اسی طرح دل کی خوشی کے ساتھ اللہ کی رضا چاہنے کے لیے خرچ نہ کرنا یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ منافق ہیں، ان کے اندر کفر ہے، سستی کے مارے ہوئے اٹھتے ہیں کیونکہ شوق ذوق جو نہیں ہوتا، یہاں جو کسلان ذکر کیا گیا ہے اور سستی جو ذکر کی گئی یہ اعتقادی کسل ہے کیونکہ وہ آخرت کے قائل ہی نہیں اور اللہ کے حکم کو وہ سمجھتے نہیں ہیں، سرور کائنات ﷺ کے اوپر ایمان نہیں ہے اور نماز پڑھنی صرف دکھلاوے کی ہے جہاں دکھلاوا ہو وہاں وہ آئیں گے اور جہاں دکھلاوا نہیں ہے وہاں وہ کترا جائیں گے، جہاں دکھلاوا کرنا ہوا پھر بھی کوئی اٹھک بیٹھک ہوگی باقی دل کے اندر تو خلوص ہوگا نہیں تو ایسے وقت میں انسان کے اندر چستی چالاکی تو نہیں ہوا کرتی بس وقت ٹالنے والی بات ہوتی ہے، مرے مرے آگئے دو چار ٹھونگے لگا گئے، اٹھنا بیٹھنا ہو گیا اور حقیقت میں ان کی کوئی نماز نہیں ہے جیسا کہ غالباً یہ الفاظ پہلے بھی آئے تھے "اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا" اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں، محض ایک دکھلاوا ہی مقصود ہوتا ہے اور دل کی خوشی سے خرچ نہ کرنا یہ بھی نفاق کی ایک علامت ہے اور نہیں وہ خرچ کرتے مگر اس حال میں کہ ناخوش ہوتے ہیں۔

مال اور اولاد کی وسعت کافروں اور منافقوں کے لیے عذاب کا ذریعہ ہے:

جب یہ اس قسم کے بدباطن ہیں تو ان کے مال واولاد آپ کو کسی تعجب میں نہ ڈالیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو

اتنا مال کیوں دیا ہوا ہے؟ مال اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اس میں کوئی شک نہیں اگر اللہ تعالیٰ کسی کو مال دے اور اس کو پھر حق پر صرف کرنے کی توفیق دے دے تو یہ شخص ان دو شخصوں میں سے ہے جن پر سرور کائنات ﷺ نے غبطہ کرنے کا ذکر کیا ہے، مشکوۃ شریف میں آپ نے یہ حدیث پڑھ لی ہوگی "لَا حَسَدَ اِلَّا فِیْ اِثْنَتَیْنِ" ان میں سے ایک آدمی آپ ﷺ نے یہی ذکر کیا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو "آتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَسَلَّطَهٗ عَلٰی هَلَكَتِهٖ فِی الْحَقِّ" پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو حق میں خرچ کرنے کی توفیق دی ہو ایک تو یہ شخص ہے کہ اس جیسا ہونے کی تمنا کرنی چاہیے مطلب اس روایت کا یہ ہے کہ دنیا میں دو شخص ہی ایسے ہیں جن جیسا بننے کی انسان کے دل میں تمنا ہونی چاہیے کہ یا اللہ! مجھے بھی ایسا کر دے، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور حق میں صرف کرنے کی ہمت دی ہے اور دوسرا وہ ہے جس کو اللہ نے علم دیا اور حکمت دی اور وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور اس کے مطابق نشر و اشاعت کرتا ہے تو یہ بھی اس درجے کا شخص ہے کہ تمنا کرو کہ اللہ ہمیں ایسا کر دے اور اگر اللہ نے کسی کو مال دیا ہے پھر اس کو حق میں صرف کرنے کی توفیق دے دی تو یہ شخص بھی اس قابل ہے کہ تمنا کرو کہ اللہ ہمیں بھی ایسا کر دے اس کے علاوہ کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جس کے متعلق تمنا کرو کہ اللہ ہمیں ایسا کر دے "لَا حَسَدَ" والی روایت کا مطلب یہی ہے، یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ جس سے انسان دنیا میں بھی راحت اٹھاتا ہے اور آخرت میں بھی درجات پاتا ہے۔

لیکن اگر یہی مال انسان کے دل میں گھس جائے اور انسان اللہ کے مقابلہ میں اس مال سے زیادہ محبت کرنے لگ جائے تو یہی مال آپ کی بیڑی ڈبو دیتا ہے، بیڑی میں پتھر ڈال دیتا ہے جیسے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مال کی مثال تو پانی کی ہے اگر یہ کشتی کے نیچے نیچے رہے تو کشتی کے لیے مفید ہے، کشتی اس پہ تیرتی ہے اور ایک کنارے سے دوسرے کنارے لگ جاتی ہے اور اگر یہی پانی کشتی کے اندر آ جائے تو کشتی کو ڈبونے کا ذریعہ بنتا ہے، یہ کشتی کو ڈبو دیتا ہے، مال کی مثال بھی ایسے ہی ہے کہ اگر یہ دل کے باہر باہر ہو، انسان اس کی محبت میں مبتلاء نہ ہو تو دنیا میں بھی راحت اور آخرت میں بھی راحت، یہ مال بہت ساری کامیابیوں کا ذریعہ بنتا ہے آپ زکوٰۃ دیں گے، صدقہ کریں گے، خیرات کریں گے، حج کریں گے اور اس قسم کے کتنے کام ہیں جو مال کی وجہ سے ہو سکتے ہیں اور اگر مال نہ ہو تو یہ نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح اولاد بھی مفید ہے کہ اللہ تعالیٰ بچے دے اور ان کو دین کے کام میں لگا دیا جائے تو صدقات جاریہ میں حضور ﷺ نے ان کو ذکر کیا ہے کہ کسی کا نیک بچہ پیچھے رہ گیا ہو جو اس کے لیے دعا کرے گا، نیک کام کرے گا، ماں باپ اس کو نیکی کے راستے پہ لگائے گا تو جس وقت تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا ماں باپ کو ثواب ملتا رہے گا چاہے آپ اس دنیا سے چلے جائیں یہ امر ختم ہونے والا نہیں ہے لیکن اگر یہی اولاد باپ کو اللہ کے راستے میں جہاد کرنے سے روک لے، بخل اور جبن کا باعث بن جائے تو یہی اولاد دوبال جان بھی ہے، سوائے اس کے نہیں اللہ ارادہ کرتا ہے ان کے ذریعہ سے ان کو دنیوی زندگی میں عذاب دینے کا کہ یہاں بھی ان کی محبت میں یہ ہر طرح سے پریشان ہیں، حاصل کرنے میں پریشان، بچانے میں پریشان، سنبھالنے میں پریشان اور اس اندیشہ سے پریشان کہ کہیں مال ضائع نہ ہو جائے، بچے کہیں چلے نہ جائیں اور چلی جائیں ان کی جانیں اس حال میں کہ کافر ہوں، جب ان کی محبت میں مبتلاء ہوں گے تو ان کو ایمان نصیب نہیں ہوگا، ان کے لیے یہ عذاب کا ذریعہ ہیں، ان کے مال اور اولاد کی وسعت ان کے لیے کامیابی کا ذریعہ نہیں ہے اور اللہ کی رحمت نہیں ہے۔

منافقوں کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں:

اور قسمیں کھاتے ہیں یہ اللہ کی کہ یہ تمہی میں سے ہیں یا تمہاری جماعت میں سے ہیں، کہتے ہیں ہم بھی تمہاری جماعت میں شامل ہیں "وَمَا هُمْ مِنْكُمْ" حقیقت یہ ہے کہ تم میں سے نہیں ہیں "وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ" باقی تمہارے اندر یہ خلط ملط کیوں رہتے ہیں؟ قسمیں کھا کر اپنی کمزوریوں پہ پردہ ڈالتے ہیں، کہتے ہیں کہ زیادہ قسمیں کھانا انسان کے جھوٹے ہونے کی علامت ہوتی ہے، وجہ وہی کہ جب انسان کا عمل اس کے قول کی تصدیق نہ کرے تو اس خلا کو پر کرنے کے لیے پھر انسان قسمیں کھاتا ہے ورنہ اگر انسان کا عمل اور اس کا طرز عمل اس کے قول کی صداقت کو پیش کرتا ہے کہ جو یہ زبان سے کہہ رہا ہے دل بھی اس کا ایسے ہی ہے، حقیقت بھی ایسے ہی ہے تو قسمیں کھانے کی کیا ضرورت ہے، بات خود وزنی ہوتی ہے اگر کوئی آپ کا سچا دوست ہے تو اس کے اٹھنے بیٹھنے سے آپ کا دل یہ شہادت دیتا ہے کہ یہ آپ کا سچا دوست ہے، میل ملاپ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی دوست ہے اور اگر کردار تو ہو دشمنوں جیسا پھر وہ اپنی زبان سے قسم کھا کھا کے وزن ڈالے اپنی بات کو وزنی کرنے کے لیے اور آپ کو یقین دلائے کہ واقعی میں آپ کا سچا دوست ہوں اور مخلص دوست ہوں تو یہ ایسے ہی ہے کہ کردار اور عمل تو قول کی

تصدیق نہیں کرتا تو قسم کھا کے اس میں وزن ڈالتے ہو، اس کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرو گے تو اس طرح سے کوئی دھوکے میں نہیں آتا، قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ تمہی میں سے ہیں وہ تم میں سے نہیں لیکن یہ ڈرپوک ہیں، ڈرتے ہیں اس لیے دل کی بات ظاہر نہیں کرتے اور تمہارے اندر شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں ان کے دل میں تمہارا خوف ہے تو خوف کی بناء پر یہ جھوٹ بولتے ہیں اور سچی بات بتاتے نہیں کہ ہمارا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

اگر ان کو کوئی ٹھکانہ مل جائے یا کوئی کنواں مل جائے یا کہیں سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو یہ ایسے بھاگیں گے کہ تم انہیں روکتے رہو تو پھر بھی نہیں رکیں گے، جس طرح کوئی رسے تڑوا کے بھاگتا ہے یوں بھاگیں گے یعنی دل تم سے ان کے اتنے متنفر ہیں لیکن کریں کیا کوئی جگہ ہی نہیں کہ جہاں جائیں، کوئی سر چھپانے کی جگہ ہی نہیں ملے گی اور یہ جائیدادکو چھوڑ نہیں سکتے، مکانات چھوڑ نہیں سکتے، اپنے مفادات قربان کر نہیں سکتے ورنہ اگر ان کو کسی جگہ تحفظ مل جائے چاہے کسی پہاڑ کی غار میں ہو تو یہ تو تمہارے اندر ایک منٹ بھی نہ رہیں "وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ" یہ بھی چونکہ مال کی محبت میں مبتلاء تھے اگر سرور کائنات ﷺ کوئی مال وغیرہ تقسیم کرتے تو ان کی نظر اس بات کی طرف ہوتی کہ زیادہ ہمیں ملے اور اگر کسی وقت کسی کو کم ملتا تو پھر وہ طعن کرتے کہ فلاں کو اتنا دیا اور مجھے اتنا دیا اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ مال کی محبت ان میں زیادہ ہے اور سرور کائنات ﷺ کی تقسیم اور آپ کے فیصلے پر مطمئن نہیں ہیں یہ بھی ایک نفاق کی علامت ہے، اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کو طعنہ دیتے ہیں صدقات کے بارے میں اور اگر ان کو صدقات میں سے دے دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر ان کو نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں ان کی یہ بات بھی ان کے لیے نقصان دہ ہے، اگر یہ راضی رہتے اس بات پر جو اللہ نے انہیں دے دیا اور رسول اللہ ﷺ نے یعنی اللہ کے حکم کے تحت اللہ کے رسول ﷺ نے جو دیا اس پر خوش رہتے اور یوں کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے، عنقریب اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور رسول بھی دے گا یعنی آئندہ بھی اس قسم کے مواقع آتے رہیں گے کہ اللہ بھی ہمیں دے گا اور اس کا رسول بھی ہمیں دے گا تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا

اس کے سوا کچھ نہیں کہ صدقات فقراء مساکین کے لیے ہیں اور ان کے لیے ہیں جو عمل کرنے والے ہیں

وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ

اور ان کے لیے ہیں جن کے قلوب مانوس کیے گئے ہیں اور گردنوں کے چھڑانے میں اور مقروضوں کے لیے ہیں اور اللہ کے راستے میں

وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾

اور مسافروں کے لیے ہیں یہ فرض ہے اللہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے ﴿٦٠﴾

وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۚ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ

ان میں سے کچھ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نبی کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو کان ہے آپ کہہ دیجیے کہ کان ہے تمہاری

لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا

بھلائی کے لیے ایمان لاتا ہے اللہ پر اور مؤمنین کی باتوں پہ تصدیق کرتا ہے اور سراپا رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے

مِنكُمْ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦١﴾

تم میں سے جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿٦١﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

پچھلے رکوع کی آخری آیات میں ذکر کیا گیا تھا کہ منافقین سرور کائنات ﷺ کو صدقات کی تقسیم کے بارے میں طعنہ دیتے ہیں، الزام لگاتے ہیں، مقصد ان کا یہ ہے کہ دوسروں کو دے دیا اور ہمیں نہیں دیا، تقسیم صحیح نہیں کی اور ان کے نزدیک تقسیم صحیح وہی ہے جس میں ان کو مل جائے اگر ان کو دے دیا جائے اور دوسروں کو محروم کر دیا جائے تو ان کو کوئی اعتراض نہیں کہتے ہیں بالکل صحیح تقسیم ہوئی اور اگر کسی وقت دوسروں کو دے دیں اور ان کو نہ دیں یا کم دیں تو ان کے نزدیک اس تقسیم پہ اعتراض ہے تو اصل میں ان کی خود غرضی ہے، اپنی غرض سامنے رکھتے ہیں اور جس وقت اپنی غرض پوری ہوتی ہے تو خوشی کا اظہار کرتے ہیں، یہ رویہ ان کے لیے اچھا نہیں ان کو چاہیے تھا کہ اللہ اور اللہ کے

رسول کی تقسیم پہ راضی رہتے جو کچھ اللہ نے دلوایا اور جو کچھ اللہ کے رسول نے دیا اس کے اوپر قناعت کرتے اور آئندہ کے لیے اللہ کی رحمت پہ امید رکھتے یہ ان کے لیے بہتر تھا پچھلی آیت کا مفہوم یہ ہے اور اس رکوع کی پہلی آیت کا تعلق اسی مضمون کے ساتھ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ ظاہر فرماتے ہیں کہ صدقات کی تقسیم ایسے نہیں ہے کہ بے ڈھنگے پن سے جس کو چاہے دے دی جس کو چاہے نہ دی۔

بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مستحقین متعین کیے ہیں اور اللہ کے رسول تقسیم کرتے وقت ان کی رعایت رکھتے ہیں، جس کو مستحق پاتے ہیں اسے دیتے ہیں، جس کو مستحق نہیں پاتے اسے نہیں دیتے، چنانچہ بعض روایات میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے پاس سوال کرنے لیے آتا تو آپ ﷺ فرماتے کہ دیکھ بھائی صدقات کی تقسیم ایک ایسی چیز ہے کہ جو اللہ نے اپنے رسول کو بھی سپرد نہیں کی بلکہ اس کے مصارف خود بتائے ہیں اور یہ یہ اس کے مصرف ہیں اگر تو ان میں سے کسی کے اندر داخل ہے تو بتادے میں تجھے دیتا ہوں اور اگر ان میں تو داخل نہیں ہے، ان میں سے کسی قسم کا بھی تو مصداق نہیں ہے تو پھر میں نہیں دے سکتا تو یہ تقسیم اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے خود بتادیا کہ فلاں کو دینا ہے، فلاں کو نہیں دینا اگر تو ان قسموں میں سے کسی قسم کا مصداق ہے تو میں تمہیں دے دیتا ہوں اور اگر ان میں سے کسی قسم کا مصداق نہیں تو پھر نہیں دیتا اور صدقہ سے یہاں باجماع امت اور باجماع صحابہ صدقات فرض یعنی زکوٰۃ مراد ہے کیونکہ نفلی صدقات کے اندر وسعت ہوتی ہے وہ غنی کو بھی دیا جاسکتا ہے اور دوسرے مصارف کے اندر بھی خرچ کیے جاسکتے ہیں لیکن یہ زکوٰۃ صدقہ فرض جو ہے جیسا کہ دوسری جگہ لفظ آیا کہ "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ" تو وہاں بھی صدقہ سے زکوٰۃ مراد ہے تو یہاں بھی "اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ" سے صدقات مفروضہ مراد ہیں یعنی یہ زکوٰۃ کے مصارف ہیں، عام صدقات نفلیہ کے مصارف نہیں ان میں وسعت ہے جو اور مقامات پر بھی صرف ہوسکتے ہیں۔

فقیر اور مسکین کا مفہوم:

سب سے پہلے ذکر کیا فقراء کا، دوسرے نمبر پہ ذکر کیا مساکین کا، فقراء اور مساکین دو لفظ آگئے عام طور پر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا، فقیر کا لفظ بولیں تو اس کا مفہوم مسکین کو بھی شامل ہوتا ہے، مسکین کا لفظ بولیں تو اس کا مفہوم فقیر کو بھی شامل ہوتا ہے اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ محتاج آدمی جس کے پاس اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے سرمایہ نہیں ہے، وہ نصاب کا مالک نہیں، مسکین آدمی محتاج آدمی جس کے پاس اپنی ضروریات پورا کرنے

کے لیے کچھ نہیں اس کو فقیر یا مسکین ہم کہہ دیتے ہیں لیکن جب دونوں لفظ اکٹھے آجائیں تو پھر ان میں کچھ فرق کر دیا جاتا ہے پھر فقیر اس کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو مسکین اس کو کہتے ہیں جس کے پاس بقدر ضرورت نہ ہو یا فقیر اس کو کہتے ہیں جو محتاج ہے اور محتاج ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے احتیاج کو لوگوں کے سامنے ظاہر بھی کرتا ہے اور مسکین اس کو کہتے ہیں کہ جو محتاج تو ہے لیکن اپنے احتیاج کو چھپائے ہوئے ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کامل درجے کا مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال بھی نہیں ہے کہ جس سے اپنی ضرورت کو پورا کرلے اور اپنی حاجت کو وہ کسی کے سامنے ظاہر بھی نہیں ہونے دیتا کہ دوسرے صدقہ دے دیں، کہیں کھڑا ہو کے سوال نہیں کرتا تو ایسے مسکینوں کو تلاش کر کر کے دیا کرو تو فرق کرنے کے لیے اس قسم کی بات کہہ دی جائے گی ورنہ مفہوم کے اعتبار سے دونوں لفظ قریب قریب ہیں کہ محتاج اس کو کہتے ہیں جس کے پاس اپنی ضرورت پورا کرنے لیے سرمایہ نہ ہو۔

"وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ" کا مفہوم:

"وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا" اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کا وصول کرنا اسلامی حکومت میں حکومت کا فرض ہے جس طرح سرور کائنات ﷺ کے زمانے میں بیت المال کے لیے وصول کی جاتی تھی اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خلفاء راشدین کے زمانے میں بھی بیت المال میں اکٹھی کی جاتی تھی اور وہاں سے تقسیم کی جاتی تھی اور آپ جانتے ہیں کہ جس وقت ملک کے سارے باشندوں سے زکوٰۃ وصول کرنی ہے تو سربراہ مملکت تو گھر گھر جا کر وصول نہیں کر سکتا آخر اس وصول کرنے کے لیے کوئی عملہ رکھنا پڑے گا جو لوگوں سے لے کر آئیں گے پھر اس کا حساب کتاب کرنے کے لیے منشی اور کلرک رکھنے پڑیں گے اور اس کو سنبھالنے کے لیے دفاتر قائم کرنے پڑیں گے یعنی جو زکوٰۃ کو اکٹھا کرنے کا شعبہ ہے اس کے جتنے مصارف ہیں اکٹھا کرنے والوں کی تنخواہیں اور سفر خرچ اور ان کی دیگر ضروریات وہ بھی اسی شعبہ سے پوری کی جاتی ہیں تو "والعاملین" سے مراد ایسے لوگ ہیں جو اس شعبہ کے لیے متعین کر دیے گئے اور زکوٰۃ جمع کرنے والوں کے لیے محتاج ہونا ضروری نہیں ہے، یہ نہیں کہ زکوٰۃ اکٹھی کرنے کے لیے محتاج آدمی متعین کیے ہوں تو یہ لے سکتے ہیں ورنہ نہیں بلکہ یہ غنی ہوں تو بھی لے سکتے ہیں ہاں البتہ ہاشمی نہیں ہونا چاہیے اس کی ممانعت صراحتاً آگئی ہے، جس کو ہماری زبان میں سید کہتے ہیں، سرور کائنات ﷺ کی آل سے جو تعلق رکھنے والے ہیں ان کو عامل ہونے کی حیثیت سے بھی زکوٰۃ کے مال سے نہیں دیا جا سکتا باقی اگر غنی مالدار ہے اس کو

اس شعبے میں متعین کر دیا گیا ہے وہ اب اس میں سے لے سکتا ہے تو اصل بات یہ ہے کہ امام وقت کو ملک کے اوپر ولایت عامہ حاصل ہے تو جس وقت کوئی شخص بیت المال کے لیے زکوۃ سپرد کرے تو امام خود اس پر قبضہ کرلے یا اس کا نمائندہ کرلے تو ایسی صورت میں دینے والے کی زکوۃ فوراً ادا ہو جاتی ہے تو یہ جو عاملین ہیں یہ گویا کہ امام کی طرف سے کارندے ہیں اور زکوۃ دینے والوں کی طرف سے وکیل ہیں ایسی صورت میں جو کچھ ان کو دیا جائے گا ان کی خدمت کے عوض تو یہ زکوۃ نہیں زکوۃ تو ادا ہو گئی تو یہ ایسے ہے جیسے قومی خزانے میں سے ان کی خدمت کر دی جاتی ہے اس لیے ضروری نہیں کہ وہ فقراء ہوں اور نہ ان کا محتاج ہونا ضروری ہے البتہ عامل اگر ہاشمی ہو تو وہ اس میں سے نہیں لے سکتا۔

"وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ" اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں تو ان کو اسلام کے ساتھ مزید مانوس کرنے کے لیے ان کے اوپر کچھ مالی عنایت کر دی جائے تو زکوۃ میں سے ان کو دیا جا سکتا ہے باقی اس میں مفسرین کی دونوں رائے ہیں کہ ان کا فقیر ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ فقیر ہونا بھی ضروری نہیں بلکہ ان کی دل جوئی کے لیے دیا جا سکتا ہے یا ایسے لوگ ہوں جو کافر ہیں لیکن کچھ کچھ مسلمانوں کی طرف مائل ہیں تو ان کو مزید مالی امداد پہنچائی جائے تا کہ وہ اسلام قبول کر لیں "وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ" کے اندر یہ داخل ہیں تو یہاں مفسرین کی آراء مختلف ہیں جو کہ تفاسیر کے اندر لکھی ہوئی ہیں کہ ان کا فقیر ہونا شرط ہے یا شرط نہیں ہے، یہ ایک وقتی مد ہے کہ اگر امام مناسب سمجھے یا اس کی ضرورت سمجھتا ہے جس طرح سے سرحدوں پہ لوگ آباد ہوتے ہیں ان کو مانوس رکھنے کے لیے ان کی مالی امداد کی جاتی ہے تا کہ کوئی دوسرا شخص ان کو خرید نہ لے اور خریدنے کی بناء ان کو شر اور فساد کا ذریعہ نہ بنالے ان کو مطمئن رکھنے کے لیے امام اگر مصلحت سمجھتا ہے تو ایسا کرے ورنہ جہاں یہ ضرورت نہ ہو تو یہ مد ختم ہو جائے گی جیسا کہ خلفاء راشدین کے زمانے میں اس قسم کی ضرورت نہیں رہی تھی تو انہوں نے اس مد کو ختم کر دیا تھا اور اگر کسی وقت اس کی ضرورت پیش آجائے تو اگر ملکی خزانے میں اور مدات کے اندر گنجائش نہ ہو تو زکوۃ میں سے ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کچھ رقم دی جا سکتی ہے "وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ" جن لوگوں کی تالیف کی گئی ہے، جن کے دلوں کو جوڑا گیا ہے، مانوس کیا گیا ہے ان کے لیے ہے۔

"وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ" کا مفہوم:

"وَفِي الرِّقَابِ" گردنوں کے چھڑانے میں زکوۃ صرف ہونی چاہیے، گردنوں کے چھڑانے کا مصداق

ائمہ ثلاث کے نزدیک تو مکاتب ہے جس کو مالک نے کہا کہ اتنا مال کما کے دے دے تو تو آزاد ہے تو اس کو عملاً کمانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے تو ایسے شخص کی امداد کی جائے تا کہ وہ اپنا بدل کتابت دے کر اپنی گردن چھڑا لے اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول آتا ہے کہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ غلام خرید کر اس کو آزاد کر دیا جائے یعنی قیمت مالک کی طرف ادا کر دی جائے اور غلام آزاد کر دیا جائے باقی ائمہ کے نزدیک یہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں تملیک کی صورت نہیں پائی جاتی۔

"وَالْغَارِمِیْنَ" غارمین کے معنی مقروض کے ہیں، کوئی چٹی پڑ گئی، کوئی تاوان آگیا جیسے کاروبار میں گھاٹا آجاتا ہے، کوئی حادثہ پیش آگیا، آگ لگ گئی، کسی کا سامان جل گیا، پانی کا سیلاب آیا اور سارا گھر بہہ گیا، فصلیں برباد ہو گئیں اور تجارت کے اندر گھاٹا آگیا انسان بوجھ تلے دب گیا تو ایسے شخصوں کو اٹھانے کے لیے، دوبارہ پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے زکوٰۃ کو صرف کرنا چاہیے۔

"وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" باقی امورِ خیر کے لیے یہ عام ہو گیا، عام طور پر "فی سبیل الله" کا مصداق جہاد ذکر کیا گیا ہے لیکن لغوی معنی کے لحاظ سے اور بھی بہت سارے امور "فی سبیل الله" کا مصداق بن سکتے ہیں جیسے ایک آدمی پر حج فرض ہو گیا لیکن اب اس کے پاس اتنا سرمایہ رہا نہیں کہ جس کے ساتھ وہ حج کر لے تو ایسے شخص کو زکوٰۃ ادا کی جائے تو یہ فی سبیل اللہ ہے اور اسی طرح سے مجاہد جہاد پہ گیا ہوا ہو، راستے کے اندر اس کا زادِ راہ ختم ہو گیا یا اس کو سامانِ جنگ خریدنے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے تو اپنے گھر کے اندر اگر چہ وہ فقیر نہیں لیکن اس کے اپنے پاس اتنی مالی گنجائش نہیں کہ جس کے ساتھ وہ سامانِ جنگ خرید لے یا سفر خرچ برداشت کرے تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہے اور اسی کے حکم میں طالب علم کو لکھا ہے کہ علم پڑھنے کے لیے کوئی وطن سے نکلا ہے تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہے جیسا کہ صراحتاً روایت کے اندر آتا ہے کہ علم کے طلب کرنے کے لیے کوئی شخص نکلے تو "فَهُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَرْجِعَ" جب تک واپس لوٹ کر گھر نہ آجائے وہ بھی فی سبیل اللہ ہے اس لیے طالب علم کو جو امداد دی جاتی ہے علم حاصل کرنے کے لیے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تو یہ بھی فی سبیل اللہ کا مصداق ہے اور ان کا فی سبیل اللہ ہونا صراحتاً حدیث شریف سے ثابت ہے "مَنْ خَرَجَ فِیْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَرْجِعَ"

"وَابْنِ السَّبِیْلِ" سے مسافر مراد ہے اور مسافر سے مراد لیا ہے وہ شخص جو سفر میں اپنی ضروریات پورا کرنے سے محتاج ہو گیا ہو اپنے گھر کے اندر اس کے پاس چاہے کتنا ہی مال کیوں نہ ہو لیکن سفر کے اندر کسی وجہ سے

ختم ہوگیا یا جیب کٹ گئی ایسی صورت میں اس کو کرائے کی ضرورت ہے، کھانے پینے کی ضرورت ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور ضرورت ہو تو ایسی صورت میں اس مسافر کو بھی دیا جائے چاہے وہ اپنے گھر کے اندر کتنے ہی مال کا مالک ہو جس کو غنی کہتے ہیں لیکن سفر میں وہ محتاج ہوگیا تو اس طرح اس کو سفر میں خرچ دیا جاسکتا ہے "فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ" یہ اللہ کی طرف سے متعین کی ہوئی چیز ہے، اس کی خلاف ورزی جائز نہیں "وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ" اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے:

اس آیت کے ضمن میں مفسرین نے ایک مسئلہ ذکر کیا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی ایسے طور پر ہونی چاہیے کہ کسی نہ کسی مستحق کو اس کا مالک بنا دیا جائے اور اس کو متفق علیہ قرار دیا گیا ہے، ایسے کاموں پر زکوٰۃ کے پیسوں کو خرچ کرنا جن کا فائدہ اگرچہ محتاج لوگ اٹھائیں یا رفاہی کام جس سے عام لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن کوئی اس کا مالک نہیں ہوتا تو ایسے کاموں میں زکوٰۃ کا پیسہ لگانا ٹھیک نہیں اگر کوئی لگائے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی جیسے کوئی زکوٰۃ کے پیسوں سے مسجد بنوادے، زکوٰۃ کے پیسوں کا کنواں لگوادے، زکوٰۃ کے پیسوں سے سرائے وغیرہ تعمیر کرادے جس سے مسافر لوگ فائدہ اٹھائیں، زکوٰۃ کے پیسوں سے ہسپتال بنوادے جس سے مریض فائدہ اٹھائیں لیکن چونکہ کوئی اس کا مالک نہیں ہوتا، تملیک نہیں ہوئی، کوئی اس کا مالک نہیں بنا، کسی کے ملک میں زکوٰۃ نہیں گئی تو ایسے طور پر زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کو معارف القرآن میں اچھی طرح سے واضح کر کے لکھا ہے اور یہ جو جماعت اسلامی والوں کا طریقہ ہے، یہ زکوٰۃ میں تملیک کو ضروری نہیں سمجھتے اور زکوٰۃ اکٹھی کرتے ہیں اور اس کے بعد اس کو رفاہ عامہ پہ خرچ کرتے ہیں، ہسپتال قائم کردیے اور لائبریریاں قائم کردیں اس قسم کی چیزیں جو کسی کی ملکیت میں نہیں ہوتیں جب تک کسی مستحق کو خصوصیت کے ساتھ زکوٰۃ کا مالک نہ بنا دیا جائے اس وقت یہ ادا نہیں ہوتی اس مسئلے کو ائمہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے اور امت کا متفق علیہ مسئلہ لکھا ہے اس لیے محض قرآن کریم کے الفاظ میں الجھاؤ پیدا کر کے جو مطلب سمجھا جائے وہ ہمارے نزدیک معتبر نہیں ہے قرآن کریم کا مطلب وہی معتبر ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دینی مزاج کے تحت سمجھا، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے جو ان کا مزاج بنا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مسلک کی تعیین کے لیے مابعد والے علماء جو چودہ سو سال سے سمجھتے آرہے ہیں

ہمارے ہاں قرآن کریم کی آیت کا وہی مطلب صحیح ہے آج الفاظ کے پیچ وتاب کے ساتھ الٹ پلٹ کر کے اگر کوئی شخص مطلب نکالتا ہے اور اسلاف نے وہ بات نہیں سمجھی تو ہم اس قسم کے مطلب کو اخذ کرنے لیے تیار نہیں۔

اس بات کو ہمیشہ یادرکھیں اگر اس اصول پہ آپ قائم رہیں گے تو بہت ساری گمراہیوں سے بچ سکتے ہیں اور اگر صرف الفاظ میں الجھنے لگ گئے تو کئی جگہ لغزش کھاجاؤ گے قرآن کریم سمجھنے کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی کتاب کو اللہ کے رسول کی زبان سے سمجھیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مبین بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کی کلام کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعبیر کے ساتھ سمجھیے کہ سرور کائنات ﷺ نے "مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ" کے اندر ان کے طریقے کو معیار قرار دیا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال، سنت رسول اللہ، کتاب اللہ کی آیات کا صحیح مفہوم وہی ہے جو بعد کے اسلاف نے ان سب چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اخذ کیا ہے چاہے لفظی دلالت کے ساتھ آپ کو بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے مطلب وہی ہے جو ان مزاج شناسان شریعت نے اخذ کیا ہے اس اصول کو اگر اپناؤ گے تو بہت ساری گمراہیوں سے بچ جاؤ گے، لفظوں کے چکر کے اندر تو انسان بہت دفعہ دھوکہ کھا جاتا ہے اور لفظوں کی مراد سمجھنے کے لیے صرفی ولغوی معنی کافی نہیں ہوتا ایک خاص مزاج بھی ہے جس کی وجہ سے کلام کا صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور وہ مزاج سرور کائنات ﷺ کی تربیت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہوا اور پھر اس کے بعد صحابہ کے اقوال کو مدنظر رکھ کر جو دین کا مطلب سمجھنے والے ہیں وہی ہیں مزاج شناس اور وہی کلام کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں۔

اس آیت کا تعلق پچھلے مضمون کے ساتھ تھا کہ صدقات کی تقسیم کے بارے میں یہ لوگ زبان درازی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے مصارف متعین کر دیے کہ نبی ان مصارف کا لحاظ رکھے گا لہٰذا جو شخص ان مصارف میں شامل ہوگا اسے تو صدقہ میں سے ملے گا اور جو ان مصارف میں نہیں ہوگا اس کو نہیں ملے گا پھر ان میں بھی قوت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے کسی میں فقر زیادہ کسی میں مسکنت کم اور کسی کی حاجت کتنی، کسی کا قرضہ کم اور کسی کا قرضہ زیادہ ہے، کسی کا قرضہ ہے اور ذرائع آمدنی بھی ہیں تو ان چیزوں کی طرف دیکھتے ہوئے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے یہ اللہ کا رسول جس طرح مصلحت سمجھے اس طرح ان مصارف کے اندر کمی بیشی کے ساتھ تقسیم کر سکتا ہے۔

ماقبل سے ربط:

آگے پھر وہی منافقین کا تذکرہ ہے، ان آیات کا مفہوم سمجھنے کے لیے آپ پہلے ایک بات ذہن میں

بٹھالیں منافقین کے دل میں تو تھا کفر اور اوپر سے وہ ظاہر کرتے تھے ایمان، نہ ان کو دین کے ساتھ ہمدردی تھی اور نہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو محبت تھی، مجبوری کے مارے ہوئے، پھنسے ہوئے تھے اور ظاہری فوائد حاصل کرنے کے لیے اور نقصان سے بچنے کے لیے مسلمانوں کے ساتھ وہ شامل تھے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پچھلی آیات کے اندر ذکر کیا تھا کہ یہ قسمیں کھاتے ہیں کہ یہ تم میں سے ہیں لیکن یہ تم میں سے نہیں، ڈرتے ہیں اس لیے اپنے آپ کو علیحدہ ظاہر نہیں کر سکتے، تمہارے اندر شامل ہو کے رہتے ہیں "وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ" ڈرنے کی بناء پر ایسے کرتے ہیں باقی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تم میں سے ہیں حقیقت میں تم میں سے نہیں ہیں اگر یہ تمہارے ہوتے، تم میں سے ہوتے تو تمہاری بھلائی پہ خوش ہوتے، تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی تو تمہارے صدمے میں یہ برابر کے شریک ہوتے اب یہ کیسا دوست ہے کہ اپنے دوست کی تکلیف پہ خوش ہوتا ہے اور اگر اس کو بھلائی پہنچ جائے تو اس کو دکھ ہوتا ہے کہ اس کو بھلائی کیوں نصیب ہوئی یہ کیفیت جس شخص کی ہو کہ آپ کی تکلیف پہ وہ خوش ہو اور آپ کی بھلائی پہ وہ جلے کہ ایسا کیوں ہوگیا تو سمجھ لو کہ درپردہ یہ دشمن ہے چاہے دعویٰ دوستی کا کرتا ہو، دوستی دشمنی کا اصل جذبہ دل سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کو پہچاننے کے لیے کچھ آثار ہوتے ہیں۔

ان آثار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر آپ کو کسی وقت خوشی کی بات نصیب ہوگئی، کوئی کامیابی نصیب ہوگئی، کوئی اچھی حالت آپ کو پہنچ گئی تو وہ بھی آپ کے ساتھ خوش ہو ایسے سمجھے کہ جیسے اسے خوشی ہوئی ہے پھر تو آپ سمجھ لیجیے کہ وہ آپ کا ساتھی ہے اور آپ کے ساتھ دلی طور پر یہ تعلق رکھتا ہے کہ آپ کی خوشی کو اس نے اپنی خوشی سمجھا اور اگر آپ کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو جس طرح سے آپ دکھ محسوس کر رہے ہیں وہ آپ کی طرح دکھ محسوس کرے کہ آپ کو یہ تکلیف کیوں پہنچی؟ بخار آپ کو چڑھا ہوا اور پریشان وہ پھرتا ہو یہ ہے دلی طور پر ہمدردی اس وقت انسان سمجھ سکتا ہے کہ یہ میرا مخلص دوست ہے دیکھو! میری تکلیف کی بناء پر کس طرح سے دکھ محسوس کرتا ہے لیکن اگر حالت ایسی ہے کہ دستر خوان پر تو آپ کے ساتھ شریک ہے، کھانے پینے کے لیے تو ساتھ لگا رہتا ہے اور جہاں کہیں آپ کو دکھ پہنچ جائے تو کہتا ہے کہ بڑا اچھا ہوا ایسا ہونا چاہیے تھا اگر کسی جگہ آپ کو کوئی کامیابی ہو جائے تو دل کے اندر جلے کہ ایسا کیوں ہوا؟ آپ کی اچھی حالت کو دیکھ کر اس کا چہرہ افسردہ ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ کسی مصلحت کے طور پر آپ کے ساتھ لگا ہوا ہے ورنہ درپردہ یہ دشمن ہے، ان کی دشمنی کی یہ علامت ذکر کی تھی اور کہا گیا تھا کہ قسمیں کھا کھا کر بھی کہیں کہ ہم تم میں سے ہیں تو ان کو اپنے میں سے نہ سمجھنا یہ ڈرپوک ہیں اس لیے اپنے دل کی بات سیدھے طریقے

سے کہتے نہیں اور عدم عقیدت ان کی نبی کے ساتھ واضح ہے کہ اگر تو ان کو مال دے دیا جائے تو بڑے خوش ہوتے ہیں اور جہاں کسی مصلحت کے طور پر نہ دیا جائے تو فوراً طعنکر نے لگ جاتے ہیں کہ دیکھو جی کیا ہو گیا فلاں کو دیا ہمیں نہیں دیا یہ بھی کوئی تقسیم ہے، یہ بھی کوئی عدل ہے، یہ بھی کوئی انصاف ہے اس قسم کی باتیں اس موقع پر ظاہر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ دلی طور پر یہ اللہ کے رسول کے ساتھ کوئی عقیدت نہیں رکھتے اگر یہ عقیدت اور محبت رکھتے تو کسی وقت کمی پیشی ہو جاتی یا کسی وقت نہ بھی دیتے تو چاہیے تھا کہ یہ کہتے کہ اللہ کی مرضی اور اللہ کے رسول کی مرضی جیسے انہوں نے حکمت سمجھی ویسے کیا، ان کے دل کی حالت کو سمجھنے کے لیے یہ علامات متعین کی گئیں ہیں ان سے ان کے باطن کی نشاندہی ہوتی ہے۔

"وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ" کا مفہوم:

اسی طرح اب یہ اگلی بات ہے، سمجھانے کے لیے ایک مثال عرض کر دوں، یہ قاعدہ ہے کہ جن طلباء کی ہمارے ساتھ محبت ہو وہ جس وقت اپنی مجلس کے اندر بیٹھیں گے تو جس وقت بھی ہمارا تذکرہ کریں گے تو لفظ لفظ سے محبت نمایاں ہوگی، ہماری خوبیاں نمایاں کریں گے، تعریف کا پہلو اختیار کریں گے، اچھی باتوں کا تذکرہ کر کے خوشی کا اظہار کریں گے کہ دیکھو! میرے استاد کی یہ صفت اچھی ہے، یہ عادت اچھی ہے، ہم پہ یوں مہربان ہیں تو اس طرح آپس میں تذکرہ کر کے خوش ہوتے ہیں، اہل محبت تو خلوت میں بھی یوں تذکرہ کرتے ہیں کہ جب نام لیں گے تو عظمت سے لیں گے۔

لیکن بعض لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ جن کے دل میں عقیدت نہیں ہوتی اور وہ مصیبت کے مارے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہیں، دل میں کوئی عظمت اور عقیدت نہیں تو وہ جس وقت خلوت میں اکٹھے ہوں گے تو مذاق اڑائیں گے اور اس قسم کے تذکرے کریں گے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ان کے دل میں کوئی کسی قسم کی عزت نہیں ہے، کوئی کسی قسم کی عظمت نہیں ہے، نقلیں اتاریں گے، مذاق اڑائیں گے، ہنسیں گے، اس قسم کی باتیں اچھالیں گے کہ جس قسم کی باتیں ظاہر نہیں کرنی چاہئیں، کمی کے پہلو تلاش کریں گے اور ان پہلوؤں کے ساتھ اپنی مجلس کو سجائیں گے بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے۔

اس قسم کے جو لوگ ہوتے ہیں ان سے اگر کسی وقت کوئی کہہ دے کہ بھائی! ایسے نہ کیا کرو، ان کو پتہ چل جائے گا وہ ناراض ہو گئے تو پھر کیا کرو گے؟ وہ کہتے ہیں کہ بھائی کوئی بات نہیں ان کی عادت ہے ہر قسم کی بات سن

لیتے ہیں جس وقت جا کے ہم معذرت کرلیں گے کہ ہم نے تو ایسی بات نہیں کی، قسمیں اٹھالیں گے تو وہ یقین کرلیں گے جس سے وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ بھولے بھالے لوگ ہیں ان کی کوئی بات نہیں جس طرح مرضی چاہو ان کو دھوکہ دو، وہ تو کان ہی کان ہیں اس کا مطلب ایسے ہی ہے جیسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ وہ تو کانوں کا کچا ہے اس کو جس طرح کوئی بھر دے وہ بھر جاتا ہے، ہر کسی کی بات توجہ سے سن لیتا ہے تو ہم بھی جا کے کہہ دیں گے کہ ایسی بات نہیں ہے تو وہ فوراً یقین کرلیں گے۔

یہ دھوکہ ان کو کیوں لگتا ہے؟ یہ اس لیے لگتا ہے کہ کئی واقعات ایسے پیش آتے ہیں کہ وہ آ کے جھوٹ موٹ کی معذرت کرتے ہیں اور بڑا آدمی اپنی کریم النفسی کے تحت سن کے خاموش ہو جاتا ہے، کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں کرتا، گرفت اس لیے نہیں کرتا کہ ہر وقت ان کے پیچھے لگنے کی کیا ضرورت ہے درگزر کرلیتا ہے جیسے سرورِ کائنات ﷺ کی عادت تھی آپ ان کے حالات کو سمجھتے تھے جب بھی یہ آپ کے سامنے جھوٹ موٹ کا عذر کرتے تو آپ گرفت نہ فرماتے بلکہ درگزر فرماتے اس سے ان لوگوں کو دھوکہ یہ ہوا کہ ان کے کان ایسے ہی ہیں بس جو ڈال دو یہ یقین کرلیتے ہیں اگر کوئی اس قسم کی نوبت آ بھی گئی تو ہم جا کے معذرت کرلیں گے اور وہ قبول کرلیں گے کیا بگڑتا ہے؟ عادت نہیں چھوڑتے تھے خبث کو ظاہر کرتے لیکن ساتھ یہ کہتے کہ وہ کانوں کے کچے ہیں جب ہم کوئی بات کہیں گے تو وہ ہماری بات مان لیں گے، اب آپ جانتے ہیں کہ یہ بات کہنا کہ وہ کانوں کے کچے ہیں، ہر کسی کی بات سن لیتے ہیں، جیسے چاہو ان کے کان بھر دو یہ الٹا اور ایذاء کا باعث ہے اس قسم کی باتیں وہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں صفائی دی کہ یہ اس قسم کے تذکرے کرتے ہیں جو باعث ایذاء ہیں اور نبی کو سمجھتے ہیں کہ یہ کانوں کا کچا ہے لیکن کیا ان کو پتہ نہیں ہے کہ نبی ہر قسم کی بات سن کے قبول نہیں کیا کرتا، نبی کا ایمان تو اللہ پہ ہے، اللہ کی طرف سے جو بات پہنچے اس پہ یقین کرتے ہیں یا نبی مؤمن مخلص کی بات کا یقین کرتا ہے باقی عام طور پر بھی یہ مہربان ہیں اس لیے ہر بات پہ گرفت نہیں کرتے، درگزر کر جاتے ہیں یہ تمہیں دھوکہ لگا ہوا ہے جو تم سمجھتے ہو کہ اللہ کا رسول تمہاری حالت سمجھتا نہیں، وہ سمجھتا سب کچھ ہے لیکن اپنی کریم النفسی کی بناء پر مہربان ہے اس لیے تمہیں کچھ کہتا نہیں اور تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم اسے دھوکہ دے رہے ہیں ان آیات کے اندر یہ بات ذکر کی گئی ہے یعنی ان کے باطنی خبث کو ذکر کر کے ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تمہارے ان حالات کی نبی کو خبر ہے اللہ کی طرف سے بھی خبر پہنچتی ہے اور مؤمنین کی طرف سے بھی، یہ نبی کے لیے اس قسم کی باعث ایذاء باتیں کرتے ہیں تو اس لیے ان کے لیے

دردناک عذاب ہے۔

ان میں سے بعض وہ ہیں جو نبی کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو کان ہیں یعنی سراپا کان ہے، ہر قسم کی بات سن لیتا ہے اور یقین کر لیتا ہے آپ کہہ دیجیے کہ وہ کان تمہاری بھلائی کے ہیں یعنی تمہاری بھلائی کے لیے باتیں سنتے ہیں اور ان کی ہر وقت خواہش ہے کہ تمہاری طرف سے ان کو کوئی بھلی بات پہنچے باقی جہاں تک یقین کرنے کی بات ہے تو یقین تو وہ اللہ پر کرتے ہیں یا مؤمنین کی باتوں پر کرتے ہیں اور عام مؤمنین جو تم میں سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں ان پر وہ مہربان ہے، مہربان ہونے کی وجہ سے زیادہ کھود کرید نہیں کرتا اور تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے دھوکہ دے لیا ہے اور یاد رکھو! جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

دوسرا مفہوم:

بعض مفسرین نے ان آیات کا مفہوم دوسری طرح بھی ادا کیا ہے اور وہ بھی ان کی نفسیاتی بیماری ہے جس کو ذکر کیا گیا ہے، اس سورۃ کے اندر منافقین کا تذکرہ بہت کثرت کے ساتھ آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہاں نفسیات کو بہت اچھی طرح واضح کیا ہے، نفاق کی کیا علامتیں ہوتی ہیں؟ مؤمن مخلص کے نفسی تقاضے کس قسم کے ہوتے ہیں؟ اس سورۃ میں بہت وسعت کے ساتھ ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے، اس میں بھی ایک نفسیاتی بات ہے جس کو واضح کیا گیا ہے۔

ایک جماعت میں ایک بڑا آدمی ہے جیسے آپ یہاں مدرسے میں ہیں تو مدرسے کے اندر ایک منتظم بیٹھا ہوا ہے بعض لوگ جو دلی طور پر اس سے ہمدردی نہیں رکھتے یا ان کے دل میں عقیدت یا محبت نہیں ہے یا مدرسے کے تقاضے سے متفق نہیں ہیں تو وہ مجرمانہ حرکتیں کرتے ہیں، اپنی مجلسوں کے اندر مذاق اڑائیں گے اور قانون کی خلاف ورزی کریں گے ان کا طرز عمل مجرمانہ ہوتا ہے تو اس مجرمانہ طرز عمل کا خاصہ یہ ہے کہ ہر وقت وہ ڈرتے بھی ہیں کہ ہماری کوئی بات آگے پہنچ نہ جائے، کوئی ہماری شکایت نہ کر دے جس آدمی کا باطن صاف ہوتا ہے وہ قاعدے اور قانون کے مطابق چلتا ہے کبھی وہ دل کے اندر خوف محسوس نہیں کرتا کہ کوئی میری شکایت نہ کر دے کیونکہ اس کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے کہ اگر کوئی میرے متعلق کچھ کہے گا بھی تو کیا کہے گا؟ جب اس نے کسی جرم کا ارتکاب ہی نہیں کیا تو شکایت کا ڈر کیسا اور جب وہ مجرم ہوتا ہے تو پھر اندر سے ڈرتا ہے کہ کوئی ہماری شکایت نہ کر دے۔

اب دوسری بات کہ شکایت کون کیا کرتے ہیں؟ شکایت ہمیشہ وہ لوگ کرتے ہیں جو اس شخص کے معتمد علیہ ہوتے ہیں جو اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے ہوتے ہیں وہی جا کے شکایت کر سکتے ہیں اور بات کی اطلاع دینا کسی درجے میں فرض بھی ہوتا ہے، وہ کیسے؟ حدیث شریف میں آپ نے پڑھا کہ "مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَراً فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ" جو تم میں سے کوئی بری بات دیکھے اسے چاہیے کہ اسے ہاتھ سے بدلے اور اگر ہاتھ سے بدل نہیں سکتا تو زبان سے بدل دے اگر زبان سے بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے "فَبِقَلْبِہٖ" تو اپنے دل کے ساتھ اس کو بدلے "وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ مِّنَ الْاِیْمَانِ" ایک روایت میں ہے "اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ" قلبی کراہت یہ ایمان کا آخری درجہ ہے اور فرمایا کہ اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں رہتا۔

اب ایک آدمی دیکھتا ہے کہ جماعتی سطح پر کوئی برا کام کیا جا رہا ہے یا ادارہ کے مفاد کے خلاف حرکتیں کی جا رہی ہیں یا اس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں جن کے نتیجہ میں کسی بھی وقت نقصان سامنے آ سکتا ہے تو مخلص مؤمن اور کامل کا فرض ہے کہ پہلے تو خود روکے کہ ایسی باتیں نہ کرو، ہاتھ اٹھانے کی تو اجازت نہیں ہوتی یہ ہاتھ اٹھانا حکام کا کام ہے وہ صرف زبان سے منع کرے اگر زبان سے منع کرنے کے باوجود اس قسم کی زندگی کو نہیں چھوڑتے اور اندیشہ ہے کہ ماحول خراب ہو جائے گا یا ادارہ کو نقصان پہنچے گا تو پھر مومن مخلص کو ہر وہ تدبیر اختیار کرنی چاہیے جس کے ساتھ اس جرم کی جڑ کاٹ دی جائے اور ان تدبیروں میں سے ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ جس کے ہاتھ میں اختیار ہے اسے اطلاع دے دو کہ اس قسم کی حرکتیں ہوتی ہیں اگر ان کو روکا نہ گیا تو کسی وقت بھی نقصان ہو سکتا ہے، یہ اخلاص کا تقاضہ بھی ہے، محبت کا تقاضہ بھی ہے اور فرض شناسی بھی ہے، ایمان کامل کا تقاضہ بھی ہے کہ اگر انسان خود اس جرم کو مٹا نہ سکے تو کم از کم ایسے شخص کو اطلاع دے جس کے ذریعہ سے اس جرم کو مٹایا جا سکے تو یہ ایمان کامل اور اخلاص کا نتیجہ ہے۔

اور اگر جاننے کے باوجود آپ اس کو اطلاع نہیں دیتے چاہے آپ اس جرم میں شریک نہیں اس حدیث صحیح کی رو سے آپ اس گناہ کے اندر برابر کے شریک ہوں گے، چور بھی مجرم ہے اور جو چوری کو چھپانے والا ہے اس کی پردہ داری کرنے والا بھی اس جرم میں برابر کا شریک ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ فلاں شخص لوگوں کو نقصان پہنچا رہا ہے اور وہ اطلاع دے کے اس کے سد باب کی کوشش نہیں کرتا تو اس جرم کے اندر وہ بھی برابر کا شریک ہے اس لیے مخلصین کا ہمیشہ اصول یہی ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کی بات کی نشاندہی کرتے ہیں تا کہ اس کا ازالہ ہو جائے۔

آپ جانتے ہیں جو بھی منتظم ہوگا براہ راست تو وہ ہر کام کی نگرانی کر نہیں سکتا اس کو احوال پہنچیں گے تو وہ کاروائی کرے گا اب اگر کسی مخلص سے ہی لغزش ہوگئی اور اطلاع پہنچ گئی اور تنبیہ ہوگئی تو مطمئن ہو جائے گا لیکن جن کی عادت مجرمانہ ہوتی ہے وہ چاہتے ہیں کہ ہماری شکایت کوئی نہ کرے پھر اس کے ساتھ ساتھ ان میں ایک عادت یہ بھی اجاگر ہوتی ہے کہ اپنے جرموں کو چھپانے کے لیے اپنے ساتھیوں کے سامنے پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ جو ہمارے منتظم ہیں یہ تو کانوں کے کچے ہیں، گھٹیا قسم کے لوگ، شرارتی قسم کے لوگ جا کے ہماری شکایت کر دیتے ہیں تو فوراً اعتبار کر لیتے ہیں گویا کہ ان کے اوپر بھی بداعتمادی کا اظہار کہ ہم تو اپنی جگہ صحیح ہیں لیکن ان کو شکایت سننے کی عادت ہے جو بھی جیسے بھی کہہ دے مان جاتے ہیں اور بات پہنچانے والے پر بھی بداعتمادی کا اظہار ہے کہ یہ لوگ ایسے ہی کان بھرتے ہیں ورنہ ہم تو ایسے نہیں ہیں یہ اپنا پروپیگنڈہ ساتھ ساتھ کرتے ہیں صرف اس لیے کہ اگر کسی وقت یہ گرفت کے اندر آ بھی جائیں تو دوسرے لوگ یہ سمجھیں کہ یہ تو صرف شکایت کرنے والوں کی شکایت کی بناء پر ان کے اوپر گرفت کی گئی ہے ورنہ یہ ایسے نہیں ہیں، مجرم آدمی کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنے حاکم کے متعلق اور بڑے کے متعلق ماحول میں اس قسم کا پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ ہمارا حاکم اور ہمارا امیر، ہمارا منتظم کانوں کا کچا ہے اور یہ جو آس پاس اٹھنے والے، بیٹھنے والے ہیں یہ شکایتی ہیں، یہ چغلچی ہیں یہ جس قسم کی باتیں کہتے ہیں وہ ان کے یقین کر لیتے ہیں اور ہمارے مخالف ہو جاتے ہیں اس طرح کام بگڑتا ہے ورنہ ہم تو ایسے نہیں یہ پروپیگنڈے کر کے رکھتے ہیں تا کہ اگر کسی وقت گرفت میں آ جائیں تو اس کا دفاع انہوں نے پہلے سے کیا ہوا ہوتا ہے، مجرمانہ زندگی کی یہ خاصیت ہے۔

ورنہ جن کے دل صاف ہوں اور صحیح طور پر زندگی گزاریں تو ان کے دل میں یہ کھٹکا آتا ہی نہیں ہے کہ کوئی ہماری شکایت نہ کر دے اور جو مجرم ہوتا ہے وہ ہر وقت ہر کسی سے خوف محسوس کرتا ہے تو قبل از وقت ہی اس کے متعلق پروپیگنڈہ شروع کر دیتا ہے حالانکہ سمجھدار آدمی ان کے چہرے سے سمجھ جاتا ہے کہ یہ مجرم ہیں۔

لطیفہ مشہور ہے، لوگوں میں یہ بات مشہور ہے اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بھی ایک جگہ اپنے وعظ میں یہ بات ذکر فرمائی کہ جو کانا ہوتا ہے وہ حرام زادہ ہوتا ہے، حرام زادہ سے مراد ہے کہ شرارتی ہوتا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ اس کی ایک رگ زائد ہوتی ہے، ایک کانا چلا جا رہا تھا اور سامنے سے ایک آدمی آ رہا تھا تو یہ کانا اس کو دیکھ کے کہتا ہے کہ تو حرام زادہ ہے، وہ شریف آدمی کہتا ہے کہ میں نے تجھے کچھ کہا نہیں تو نے مجھے یہ کیوں کہا؟ میں نے تو تجھے کچھ نہیں کہا وہ کہتا ہے کہ مجھے پتہ ہے کہ تیری نظر مجھ پہ پڑتی اور تو دیکھتا کہ یہ کانا ہے تو تو نے دل میں سمجھنا تھا کہ میں حرام

زادہ ہوں میں نے اس کا جواب دیا ہے کہ تو حرام زادہ ہے۔

یہ اصل میں اپنی کمزوری کا احساس اپنے دل میں ہے کہ جو شخص بھی ہمیں دیکھے گا وہ ایسے ہی سمجھے گا تو قبل از وقت اس کا دفیعہ کرنے کے لیے یہ طرز اپنایا جاتا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے خلاف پہلے ہی پروپیگنڈہ کردو تا کہ موقع پر اس کو لوگ صحیح نہ سمجھیں۔

جو بھی منتظم ہوگا اس کو حالات پر کان رکھنے پڑتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟ اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے کان میں اچھی باتیں ہی آئیں، اچھی باتیں سن کر وہ خوش ہوگا کہ یہ سارے کے سارے ٹھیک چل رہے ہیں، ٹھیک ان کا کردار اور ان کا عمل ہے یہ باتیں سن کے طبیعت خوش ہوتی ہے اور اگر کسی قسم کی بری بات سامنے آجائے اور پہنچانے والا ثقہ ہو تو اس کا اعتبار نہ کرنا بھی ایک غلطی ہے، اعتبار کر کے ازالہ کرنا چھوٹوں پر شفقت ہوتی ہے اگر پتہ ہو کہ چھوٹے اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں، اپنے ماتحت کوئی اس قسم کی حرکت کرلیں جو ان کے لیے نقصان دہ ہو تو بات سن کے اور اس کے اوپر یقین کر کے اس کے ازالہ کی کوشش کرنا یہ اپنے چھوٹوں پر مہربانی ہوتی ہے اور جو اچھے لوگ ہوتے ہیں وہ اس قسم کی گرفت اور اس قسم کی تنبیہ کو اپنے لیے مفید سمجھتے ہیں کہ ہم میں ایک غلطی تھی اس پر تنبیہ ہوگئی آئندہ ہم ٹھیک ہو کے رہیں گے وہ تو اس طرح سے اصلاح کریں گے اور جو بد باطن ہوتے ہیں وہ اسی کو ہی فساد کا ذریعہ بنا لیتے ہیں تو منافقین کی یہ خصلت تھی جو یہاں ذکر کی گئی کہ جب وہ اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں اور حضور ﷺ کو پتہ چل جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے بتانے کے ساتھ یا مؤمن مخلصین کے بتانے کے ساتھ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ غزوہ حنین کے اندر آپ ﷺ نے غنیمت کا مال تقسیم کیا تھا تو بعض انصار کے نوجوانوں نے کچھ اس قسم کی باتیں کہیں جو رسول اللہ ﷺ کی عظمت کے خلاف تھیں تو ان باتوں کی اطلاع حضور ﷺ کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دی تھی اور پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کو بلایا اور سمجھایا تو یہ قصہ ختم ہو گیا تو یہ مہربانی ہوتی ہے کہ بات کا پتہ چل جانے کے بعد اس کا ازالہ کر دیا جائے۔

جب حضور ﷺ کو پتہ چلتا اور آپ ﷺ تنبیہ کرتے تو پھر یہ منافق اپنی تسلی منانے کے لیے یوں کہتے کہ کیا کریں ہمارے بڑے تو کانوں کے کچے ہیں، جو ان کے کان میں ڈال دیتا ہے یہ اس کی بات کو مان جاتے ہیں اور ہمارے اوپر یہ گرفت شروع کر دیتے ہیں حالانکہ ہم ایسے نہیں ہیں، یہ باتیں نبی کے لیے مستقل باعث ایذاء تھیں، اللہ فرماتے ہیں ایسے نہ کہو یہ باعث ایذاء ہے وہ تو تمہاری بھلائی کی بات سنتے ہیں اور ان کا سننا تمہاری بھلائی کے

لیے ہی ہے، اچھی بات کی خبر پہنچے گی خوش ہوں گے اور اگر کوئی بری خبر پہنچے گی تو اس کو ختم کریں گے اس میں بھی تمہارا بھلا ہے، باقی نبی ہر کسی کی نہیں مانتا نبی تو اس پر یقین رکھتا ہے جو اللہ کی طرف سے اطلاع آئے یا مؤمن مخلص جو بتائیں اس پہ ایمان لاتا ہے اور یہ انتظام کے لیے ضروری ہے اگر ثقہ آدمیوں کی رپورٹ کا بھی اعتبار نہ کیا جائے تو پھر یہ انتظام بحال کیسے رہے گا؟ اور مؤمن مخلص کے ذمہ ہوتا ہے کہ کہیں اگر کمی خامی ہو تو اس کی اطلاع دیں کیونکہ یہ بھی تغییر منکر ہے ورنہ اگر کسی برائی کو دیکھنے کے بعد یہ کہہ کے اس کے جرم پہ پردہ ڈالیں کہ ہمیں کیا؟ تو یہ لفظ کہہ کے آپ اس جرم میں برابر کے شریک ہو، یہ فرض ہوتا ہے کہ جہاں بھی کمی کوتاہی محسوس کر دیا تو خود ازالہ کرنے کی کوشش کرو اور اگر خود ازالہ کرنے کی کوشش نہیں کر سکتے تو کم از کم ایسے شخص کو اطلاع دو جو اس کا ازالہ کرے اور اس کے اوپر کنٹرول کرے تو ان آیات کے اندر ان کو اس طرح بھی تنبیہ کی گئی ہے۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ

یہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تمہارے لیے تاکہ تمہیں خوش کرلیں اللہ اور اس کا رسول بہ زیادہ حق رکھتے ہیں

اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ

اس بات کا کہ یہ لوگ اس کو راضی کریں اگر یہ لوگ ایمان والے ہیں ﴿۶۲﴾ کیا انہیں معلوم نہیں کہ پس جو شخص مخالفت کرے

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ

اللہ اور اللہ کے رسول کی پس اس کے لیے جہنم کی آگ ہے ہمیشہ رہے گا اس میں یہ رسوائی ہے

الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ

بہت بڑی ﴿۶۳﴾ منافق لوگ ڈرتے ہیں اس بات سے کہ اتاری جائے مومنین پر کوئی سورة

تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ

جو خبر دار کردے ان کو ان باتوں سے جو ان کے دلوں میں ہیں آپ کہہ دیجیے تم مذاق کرتے ہو بے شک اللہ ظاہر کرنے والا ہے

مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ

اس بات کو جس سے تم ڈرتے ہو ﴿۶۴﴾ اور اگر تو ان سے سوال کرے تو البتہ ضرور بالضرور کہیں گے یہ لوگ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم باتیں کرتے تھے

وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾

اور دل لگی کرتے تھے آپ کہہ دیجیے کیا اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ تم مذاق کرتے تھے ﴿۶۵﴾

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ

عذر مت کرو تم نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد اگر ہم درگزر کریں گے

طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾ ع

ایک طائفہ سے تم میں سے تو عذاب دیں گے دوسرے کو اس سبب سے کہ وہ جرم کرنے والے تھے ﴿۶۶﴾

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ

منافق مرد اور منافق عورتیں ان کا بعض بعض سے ہیں حکم دیتے ہیں

بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ

برائی کا اور روکتے ہیں بھلائی سے اور بند کرتے ہیں اپنے ہاتھوں کو انہوں نے اللہ کو بھلا دیا ہے

فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ

اللہ نے انہیں بھلا دیا ہے بے شک منافق نافرمان ہیں ﴿۶۷﴾ وعدہ کیا اللہ نے منافق مردوں

وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ

اور منافق عورتوں اور سب کافروں سے جہنم کی آگ کا اس میں ہمیشہ رہیں گے یہ آگ ان کے لیے کافی ہے

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾ ۙ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اور لعنت کی اللہ نے ان پر اور دائمی عذاب ہوگا ان کے لیے ﴿۶۸﴾ تم ان لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے گزرے ہیں

كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا

وہ زیادہ سخت تھے بمقابلہ تمہارے از روئے قوت کے اور بہت زیادہ تھے از روئے اموال کے اور اولاد کے پس انہوں نے فائدہ اٹھایا

بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ

اپنے حصہ کے ساتھ اور تم نے فائدہ اٹھایا اپنے حصہ کے ساتھ جیسا کہ فائدہ اٹھایا ان لوگوں نے

مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ

جو تم سے پہلے تھے اپنے حصہ کے ساتھ اور تم بھی باتوں میں گھسے جس طرح وہ بھی گھسے تھے یہی لوگ ہیں

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

جن کے اعمال ضائع ہوگئے دنیا اور آخرت میں اور یہی لوگ

الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ

خسارہ پانے والے ہیں ﴿۶۹﴾ کیا نہیں آئی ان کے پاس خبر ان لوگوں کی جو ان سے پہلے گزرے ہیں یعنی قوم نوح

وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ

قوم عاد اور قوم ثمود اور ابراہیم کی قوم اور مدین والے

وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ۭ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ

اور الٹنا کھانے والی بستیاں آئے تھے ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کے پس نہیں تھا اللہ

لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝٧٠ وَالْمُؤْمِنُوْنَ

کہ ان پر ظلم کرتا مگر انہوں نے ظلم کیا اپنی جانوں پر خود ہی (۷۰) اور مومن مرد

وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

اور مومن عورتیں ان میں سے بعض بعض کا دوست ہے یہ حکم دیتے ہیں بھلائی کا

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ

اور روکتے ہیں برائی سے اور قائم کرتے ہیں نماز اور دیتے ہیں

الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ

زکوٰۃ اور اطاعت کرتے ہیں اللہ اور اللہ کے رسول کی یہی لوگ ہیں رحم کرے گا اللہ ان پر

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝٧١ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ

بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے (۷۱) وعدہ کیا اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ

باغات کا کہ چل رہی ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں ان میں ہمیشہ رہیں گے وعدہ کیا اچھے مکانات کا

طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ

ہمیشگی کے باغات میں اور اللہ کی رضا تو بہت بڑی چیز ہے یہ

هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝٧٢ ع

بہت بڑی کامیابی ہے (۷۲)

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

منافق جو در پردہ کافر تھے اور ظاہری طور پر ایمان لائے ہوئے تھے، ایمان کا اظہار کرتے تھے ان کی طرف سے جس قسم کی تکلیفیں حضور ﷺ کو پہنچی تھیں اور جیسے ان کے ظاہر اور باطن کے تضاد کا مظاہرہ ہوتا تھا اس کا تذکرہ ہو رہا تھا ان آیات میں بھی وہی بات بیان کی جا رہی ہے، ان کی ایک بات کی تشریح پچھلے سبق میں کر دی گئی تھی کہ وہ کہتے ہیں "ھُوَ اُذُنٌ" کہ یہ تو سراپا کان ہیں اس کی مکمل وضاحت ہو گئی تھی آج کے سبق میں بھی اس کے متعلق ہی کچھ باتیں بیان کی گئی ہیں۔

منافقین کا کردار اور آیات کا مفہوم:

قصور تو وہی کہ اپنی مجلسوں کے اندر وہ استہزاء کرتے تھے، مذاق اڑاتے تھے اور جب اس قسم کوئی بات ظاہر ہوتی تو "یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ لِیُرْضُوْکُمْ" تمہارے سامنے آ کے قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تمہیں خوش کریں، تم ان پہ راضی رہو اور تم ان پہ مطمئن رہو یعنی در پردہ ان کی زندگی مجرمانہ ہے، اپنی مجلس کے اندر تمہارا مذاق اڑاتے ہیں، استہزاء کرتے ہیں لیکن سامنے آ کے یہ قسمیں کھا کے یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں "لِیُرْضُوْکُمْ" تا کہ تمہیں راضی کر لیں کیونکہ تمہاری طرف سے ان کو ڈر ہے، اللہ اور اللہ کے رسول کی رضا مندی کی ان کو فکر نہیں ہے ورنہ خلوتوں اور نجی مجلسوں میں اس قسم کی باتیں کیوں کریں؟ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتا ہے کہ یہ لوگ اس کو خوش کریں، اللہ اور اللہ کا رسول خوش ہو جائے تو مومنین کی جماعت تو خوش ہے اور اگر بالفرض انسان خوش نہ ہوں اور اللہ اور اس کا رسول ﷺ خوش ہو جائے تو یہ کافی ہے اور اگر اپنے جیسے انسان کو خوش کر لے اور لیکن اللہ کی ناراضگی ہو اور اللہ کی ناراضگی کی بناء پر اس کا رسول بھی ناراض ہو تو پھر صرف مومنین کی رضا کیا کام آ سکتی ہے؟ یہ ان کی حماقت ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی پرواہ نہیں کرتے اور نجی مجلسوں کے اندر ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور تمہارے سامنے آتے ہیں تو تمہیں قسمیں کھا کے خوش کرتے ہیں اگر ان میں ایمان ہے جس طرح یہ اپنی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں تو ان کو اللہ اور اس کے رسول کی فکر ہونی چاہیے اس لیے اپنی خلوتوں کو ٹھیک کریں، نجی زندگی کے اندر اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کریں۔

آگے وعید ہے کیا ان کو پتہ نہیں کہ یہ جو اللہ کے رسول کے مقابلہ میں پارٹی بنائے بیٹھے ہیں اور اللہ کے رسول کا مقابلہ کر رہے ہیں کیا ان کو پتہ نہیں کہ جو شخص بھی اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ میں آتا ہے، ان کی مخالفت کرتا ہے ان کے لیے جہنم ہے، ہمیشہ وہ جہنم میں پڑا رہے گا اور یہ بہت بڑی رسوائی ہے آج اگر قسمیں کھا کے بچتے بھی ہو تو کل کو اس رسوائی سے نہیں بچ سکو گے اور اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلہ میں گروہ بندی جہنم میں لے جائے گی اور یہ بہت بڑی رسوائی ہے اس سے ڈرنا چاہیے۔

اور آگے جو "یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ" کہا ہے تو یہ بھی ایک نفسیاتی بات ہے جیسے پیچھے بھی گزر چکا ہے کہ جب ان کی زندگی مجرمانہ تھی تو وہ ہر وقت ڈرتے تھے کہ کہیں اللہ کی طرف سے کوئی ایسی سورۃ نہ آجائے کہ جن کو ہم قسمیں کھا کے خوش کر لیتے ہیں ان پر اللہ کوئی ایسی سورۃ نہ اتار دے جس کے ساتھ ہمارے اندرونی جذبات نمایاں ہو جائیں تو جب اللہ کی طرف سے ایسی سورۃ اترے گی جس میں ہمارے باطن کے جذبات کو نمایاں کیا گیا ہوگا تو پھر مسلمان ہماری قسموں کا کہاں اعتبار کریں گے تو جس خطرہ سے بچنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے تھے وہ خطرہ پھر سر پہ آ کھڑا ہوگا جب کوئی سورۃ نازل ہوتی یا اس قسم کی بات ہوتی تو یہ ڈرتے ہیں کہ اس میں کہیں ہمارا تذکرہ نہ آجائے جیسے تفصیل سے میں نے عرض کر دیا تھا کہ جب نجی زندگی انسان کی مجرمانہ ہوتی ہے تو نفسیاتی طور پر انسان کے دل اور دماغ پہ خوف سا سوار ہوتا ہے جیسے سورۃ المنافقون کے اندر یہ لفظ آئیں گے "یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَةٍ" کہ جہاں بھی کوئی آواز بلند ہوتی ہے، کوئی شور بلند ہوتا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے متعلق ہی ہے یہ وہی اندر کا خوف ہے اور جس وقت انسان اپنی زندگی کے اندر صالح ہوتا ہے تو اس کو اتنا اطمینان ہوتا ہے کہ کبھی بھی اس کو خوف محسوس نہیں ہوتا تو مجرمانہ زندگی انسان کو کسی وقت بھی اطمینان سے وقت نہیں گزارنے دیتی اور جو غیر مجرمانہ زندگی ہوتی ہے اس میں اطمینان ہی اطمینان ہوتا ہے۔

ڈرتے ہیں منافق کہ اتار دی جائے مومنین پہ کوئی سورۃ جو خبر دے مومنین کو ان باتوں کی جو ان کے دلوں میں ہیں، جو چھپی ہوئی ہیں، اللہ کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ ڈرتے ہو تو ڈرتے رہو اللہ تو ظاہر کر دے گا جو تم کرتے ہو "قُلِ اسْتَهْزِءُوْا" تم استہزاء کرتے رہو اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر مومنین کا اور اللہ کا اور اللہ کے رسول کا بے شک اللہ ظاہر کرنے والا ہے اس چیز کو جس سے تم ڈرتے ہو، تمہاری یہ باتیں چھپی نہیں رہیں گی آخر کار نمایاں ہو جائیں گی اور ان کے حالات ان آیات کے اندر نمایاں کیسے جا رہے ہیں "وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ" یہ ان کی پھر ایک کمزوری بتائی کہ

اگر آپ ان کو بلا لیں اور پوچھیں کہ خلوت میں تم نے ایسی باتیں کی تھیں؟ تم نے اس طرح سے مذاق اڑایا تھا تو وہ کہیں گے کہ نہیں وہ تو ایسے ہنسی مذاق تھا، دل لگی کے طور پر اس قسم کی باتیں ہو جاتی ہیں، ہمارا عقیدہ تو اس کے مطابق نہیں ہے، وہ تو ہم صرف دل لگی کرتے تھے تو ان بدبختوں سے کہہ دو کہ تمہیں اپنی مجلسوں کے لیے اور ہنسی مذاق کے لیے، رونقیں پیدا کرنے کے لیے کوئی اور بات نہیں ملتی؟ جیسے فارسی کا محاورہ ہے "بازی بازی باریش بابا ھم بازی" تمہیں کھیلنے کی اتنی عادت پڑ گئی کہ تم بابا کی داڑھی سے بھی کھیلنے لگ گئے، اس کو بھی تختہ مشق بنالیا تو یہاں وہی حساب ہے کہ اگر تم دل لگی کرتے ہو تو کیا تمہیں دل لگی کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی باتیں ہی ملتی ہیں؟ یہ ان کو ڈانٹ پلادی گئی۔

"لَا تَعْتَذِرُوْا" عذر نہ کرو یعنی تمہارا عذر کوئی قبول نہیں ہے "قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ" تم نے کفر کیا ایمان کے اظہار کرنے کے بعد، ان باتوں کے ذریعہ سے کفر کا اظہار کیا تم کافر ہو گئے اس لیے فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے ساتھ چاہے استہزاء دل لگی کے طور پر ہو تو بھی کفر ہے جیسا کہ اس آیت کے اندر صراحتاً آ گیا اللہ اور اس کے رسول کے مقام کو پہچانو اور اس کی آیات کے مقام کو پہچانو ان کے ساتھ دل لگی کفر ہے کیونکہ یہ مذاق اس بات پہ دلالت کرتا ہے کہ دل میں عظمت نہیں ہے ورنہ اگر دل میں عظمت ہوتی تو کبھی اس قسم کی بات زبان پہ نہیں آسکتی "قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ" کا مطلب ہے کہ اگر ظاہری طور پر تم ایمان لائے تھے تو ان باتوں کے ساتھ تم نے کفر کر لیا "لَا تَعْتَذِرُوْا" تم عذر نہ کرو یعنی تمہارا عذر قبول نہیں ہے، تم نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد اگر تم میں سے ایک طائفہ سے ہم درگزر کر گئے تو ہم دوسرے طائفہ کو عذاب دیں گے، طائفہ دونوں جگہ نکرہ ہے اور اصول فقہ کے اندر آپ نے پڑھا ہوگا کہ اگر نکرہ کا تکرار نکرہ کے ساتھ آ جائے تو ثانی غیر اولی ہوتا ہے، پہلے طائفہ کا مصداق اور ہے دوسرے طائفہ کا مصداق اور ہے، ایک طائفہ سے ہم درگزر کر گئے تو ہم دوسرے طائفہ کو عذاب دیں گے، یہ دوسرے کا لفظ جو بول رہا ہوں یہ اسی اصول سے اخذ کیا ہے کہ نکرہ کا تکرار نکرہ کے ساتھ ہے اور دوسرے طائفہ سے اور طائفہ مراد ہے، ہم عذاب دیں گے دوسرے طائفہ کو اس وجہ سے کہ وہ جرم کرنے والے تھے یعنی اگر کسی طائفہ سے درگزر کر بھی گئے تو کسی کو پکڑ کے رگڑا بھی دیں گے، یہ ہماری اپنی حکمت ہے کہ کس کو پکڑنا ہے اور کس سے درگزر کرنا ہے، منافقین کا نجی مجلسوں کے اندر جو کردار ہوتا ہے اس کی نشاندہی ان آیات کے اندر کی گئی ہے اور ان کی دل اور دماغ کی کیفیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

"اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ" منافق مرد ہوں یا عورتیں ہوں سب ایک جیسے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاق عورتوں میں بھی تھا بلکہ نفاق میں زیادہ تر انسان مال اور اولاد کی وجہ سے ہی مبتلاء ہوتا ہے، جبن اور بخل انسان پہ طاری ہوتا ہے تو انسان منافق بنتا ہے اور اس قسم کے کاموں کے اندر عورتیں مردوں پہ اثر ڈالتی ہیں، مال اور اولاد کی محبت میں مبتلاء کرنے کے لیے عورتوں کا کردار ہوتا ہے وہ اپنے خاوندوں کو اس پر زیادہ مجبور کرتی ہیں تو یہ بھی ان کے ساتھ اس برائی میں برابر کی شریک ہوگئیں، ان کے مزاج میں اتنا فساد آ گیا کہ جہاں کہیں برائی کی تحریک اٹھے اس میں دوڑ کے شامل ہوتے ہیں، برائی کی اشاعت کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں اور جہاں کہیں بھلائی کی تحریک اٹھائی جائے، بھلائی کے لیے کہا جائے وہاں طرح طرح کے بہانے کر کے رکاوٹ ڈالتے ہیں، اچھے کام کی طرف دعوت دی جائے تو بہانے ان کے پاس بہت ہوتے ہیں اور اگر کوئی برائی آجائے تو چھلانگیں لگا لگا کے اس میں شریک ہوتے ہیں یہ علامت ہے اس بات کی کہ مزاج میں فساد ہے اور اگر مزاج صالح ہو تو اچھائی کی طرف انسان کھچا ہوا جاتا ہے اور اس کو آگے پھیلانا چاہتا ہے اور جہاں برائی کا نشان ملے اس کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جس وقت مزاج میں فساد آجائے تو اچھائی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب برائی سامنے آجائے تو اس کی طرف بھاگ کے جاتے ہیں تو یہ دل کے فساد کی علامت ہے کہ طبیعت کی مناسبت برائی کے ساتھ ہے، طبیعت کی مناسبت اچھائی کے ساتھ نہیں ہے اس لیے برائی کی طرف راغب ہیں، برائی کی اشاعت چاہتے ہیں تو یہ منافق مرد ہوں یا عورتیں ہوں یہ سب برابر ہیں، ان سب کا آپس میں مزاج ملتا ہے، ان کی آپس میں باہمی مناسبت ہے۔

"وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ" اور جہاں کہیں کار خیر میں خرچ کرنے کا موقع آجائے تو اپنی مٹھیاں بند کر لیتے ہیں، ہاتھ روک لیتے ہیں، ان کو خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی "نَسُوا اللّٰهَ" ان لوگوں نے اللہ کو بھلا دیا ہے، یہ اللہ کے احکام کو یاد نہیں رکھتے، اللہ ان کو یاد نہیں ورنہ اس قسم کی حرکتیں نہ کرتے تو کیا نقصان ہوا؟ اللہ نے انہیں بھلا دیا، اللہ کی رحمت ان کی طرف متوجہ نہیں، بے شک یہ منافق بدکردار ہیں۔

اللہ نے ان منافق مردوں اور ان منافق عورتوں اور سب کافروں سے وعدہ کیا ہے جہنم کی آگ کا یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یہ جہنم ان کے لیے کافی ہے، اللہ نے ان کو بھٹکا دیا ہے، اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے، اتنے کھلے الفاظ میں ان کا تذکرہ اور ان کے اوپر وعیدیں اور ان کے کردار کی نمائش جس طرح

اس سورۃ میں کی گئی ہے قرآن کریم کی دوسری سورتوں میں نہیں ہے یہاں بہت وضاحت کے ساتھ ان کے کردار کو ذکر کیا گیا ہے اور ان کے اوپر وعیدیں ذکر کی گئی ہیں۔

یہ انہی منافقوں کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ تمہارا حال ان جیسا ہے جو تم سے پہلے تھے "کَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً" قوت کے اعتبار سے وہ تم سے زیادہ تھے، مال اور اولاد کے اندر تم سے کثیر تھے، مال اور اولاد ان کے پاس تم سے زیادہ تھا، قرآن کریم میں یہ جو الفاظ آتے ہیں ان کی طرف دیکھو کہ جیسے ہم آج سمجھتے ہیں کہ ہم بہت ترقی یافتہ ہیں اور گزشتہ لوگ ترقی یافتہ نہیں تھے، جو امتیں اللہ نے فناء کر دیں، جن کا نام اور نشان اس زمانے سے مٹا دیا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس قسم کے ترقی یافتہ تھے اور اتنے ترقی یافتہ ہیں کہ بعد میں آنے والے یہاں تک پہنچے ہی نہیں، قوت ان کے پاس زیادہ، اسباب ان کے پاس زیادہ، تمہیں کیا پتہ کہ انہوں نے اپنی عیش اور عشرت کے لیے کیا سامان بنایا ہوا تھا، اب اس دنیا کے اندر جو ترقی یافتہ اقوام موجود ہیں ان کو اگر اللہ فناء کر دے اور دوبارہ لوگ آباد ہوں تو ان کا حال ان کے سامنے کہاں رہے گا؟ اور وہ سمجھیں گے کہ ہم نے جو اسباب بنائے ہیں پچھلوں کو وہ اسباب کہاں حاصل تھے؟ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ان کو تم سے زیادہ اسباب حاصل تھے یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزول سے قبل جو لوگ تھے وہ بھی اپنے وقت کے ترقی یافتہ تھے انہوں نے بڑی قوت جمع کر رکھی تھی، مال اور اولاد کے اعتبار سے بہت تھے، پس انہوں نے فائدہ اٹھالیا اپنے حصہ سے جو ان کا تھا اور تم نے بھی اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا جیسا کہ فائدہ اٹھایا اپنے حصہ سے ان لوگوں نے جو تم سے پہلے تھے اور تم بھی اس مشغلے میں لگے ہوئے ہو جس طرح وہ مشغلوں میں لگے ہوئے تھے، جس قسم کے خوض میں وہ تھے اسی قسم کے خوض میں تم ہو، بس یہی لوگ ہیں جن کے اعمال برباد ہو گئے اور یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔ اب سب کچھ گنواں بیٹھے، اولاد بھی گئی، اور مال بھی گیا اور جانیں بھی گئیں اور زندگی بھی ختم ہوگئی اور اللہ کا عذاب خریدا اس سے زیادہ خسارہ کیا ہوگا یہ لوگ بہت خسارے میں رہے۔

کیا ان کے پاس خبر نہیں آئی ان لوگوں کی جو ان سے پہلے گزرے ہیں؟ کیا انہوں نے ان کے واقعات نہیں سنے یعنی قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ابراہیم کی قوم، اصحاب مدین اور موتفکات، ان کے واقعات کیا انہوں نے نہیں سنے اور قرآن کریم کے اندر دوسری سورتوں میں یہ واقعات واضح کر دیے گئے ہیں، مکی سورتوں کے اندر یہ واقعات بہت کثرت سے موجود ہیں اور یہ سورۃ مدنی ہے جس کا مطلب یہ کہ سن چکے ہیں، ان کو عبرت حاصل کرنی

چاہیے اور عبرت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو حال ان کا ہوا تھا اگر اس قسم کا کردار ہم نے اپنایا تو وہی حال ہمارا ہو گا اسی کو قیاس کہتے ہیں، اسی طرح اپنے آپ کو ان پر قیاس کرو، اچھے لوگوں پر قیاس کرو جیسے اعمال انہوں نے کیے تھے اور وہ کامیاب ہو گئے ہم اگر ایسے اعمال کریں گے تو ہمیں بھی کامیابی ملے گی اور جیسا برا کردار انہوں نے اپنایا تھا اگر ہم ایسا کردار اپنائیں گے تو وہی عذاب ہم پر آئے گا "اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ" ان کے پاس رسول واضح دلائل لے کے آئے پھر اس کے بعد اللہ نے ان کے اوپر ظلم نہیں کیا کہ وہ تو اچھے تھے اور اللہ نے خواہ مخواہ ان کو نشانہ بنا دیا ایسی بات نہیں ہے "وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ" لیکن وہ اپنے نفسوں پہ ظلم کرنے والے تھے انہوں نے اپنے نفسوں پہ خود ظلم کیا جو شخص زہر کھائے گا تو اس کو موت ضرور آئے گی کوئی کہے کہ اللہ نے زیادتی کی ہے تو یہ کیسی بات ہے؟ اللہ کا قانون ہے کہ زہر کھاؤ گے تو مر جاؤ گے، گاڑی کے نیچے سر دے دو تو کچلے جاؤ گے تو انہوں نے اسی قسم کا کردار اپنایا جس کے نتیجہ میں بربادی آنی تھی آ گئی تو اللہ کو اس کا الزام کس طرح دیتے ہیں۔

ظاہری عادات اور دوست باطن کی عکاسی کرتے ہیں:

اب ان منافقین کے مقابلہ میں مومنین کا تذکرہ آ رہا ہے، مومن مرد ہوں یا عورتیں ہوں سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے دوست ہیں، یہ بات بھی آپ کے سامنے بار بار ذکر کی جا چکی ہے کہ دوستی اور محبت یہ بھی باطنی مناسبت پر مبنی ہوتی ہے اس لیے کہا کرتے ہیں کہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ اچھا ہے یا برا ہے اس کے دوستوں کو دیکھ لو وہ کیسے ہیں اگر اس کے دوست اچھے ہیں تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ اس میں اچھائی والا جذبہ ہے اگر اس کے دوست برے ہیں تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ اس کی طبیعت میں برائی ہے، برائی برائی کے ساتھ مانوس ہوتی ہے اور اچھائی اچھائی کے ساتھ مانوس ہوتی ہے اگر آپ کے دل میں نیکی ہے تو آپ نیک ماحول میں خوش ہوں گے اور نیک دوست اختیار کریں گے اور اگر آپ کے دل میں برائی ہے تو آپ برائی کو ہی پسند کریں گے اور برے لوگوں سے ہی مانوس ہوں گے، جیب تراش جیب تراش سے بہت جلد دوستی کرے گا، چور چور کو بہت جلد دوست بنالے گا، ولی کی دوستی ولی کے ساتھ ہو گی تو باطنی جذبات اس ظاہری میلان کے ساتھ نمایاں ہوتے ہیں، جس آدمی کے دل میں ایمان خالص ہو گا وہ یقیناً مومنین سے ہی تعلق رکھے گا اور جس کے دل میں نفاق ہے وہ منافقوں کو ہی پسند کرے گا تو ظاہری دوستی باطنی جذبات کو سمجھنے کی علامت ہوتی ہے، یہ

انسان کا قلب اتنا گہرا ہے اس میں کیا کچھ بھرا ہوا ہے یہ دوسرا انسان دیکھ کے محسوس نہیں کر سکتا اللہ نے اس کو بڑا پردہ میں رکھا ہوا ہے اور اتنی بڑی سلاخوں کے ساتھ جکڑ رکھا ہے، اس کو باہر اگر سینے کے اوپر ہی لگا دیا جاتا تو پھر آپ توڑ کے بھاگ جایا کرتے لیکن اللہ نے اس کو بہت محفوظ جگہ میں رکھا ہے اس میں جو خیالات آتے ہیں، جو جذبات ہیں وہ تو اتنے مخفی ہیں کہ ان کو کسی طرح بھی معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ کس کے دل میں کیا ہے؟ جیسے کسی نے کہا ''دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانے ہو''

یعنی دل ایسا دریا ہے جو سمندر سے گہرا ہے اس لیے کوئی نہیں جان سکتا کہ دل میں کیا ہے، دل کے جذبات اگر پہچانے جاتے ہیں تو ظاہری عادات سے پہچانے جاتے ہیں کہ ظاہر میں اس شخص کا رجحان کس طرف ہے؟ کیسی چیزوں کو یہ پسند کرتا ہے مثلاً ایک آدمی خلوت میں بیٹھا شعر گنگنا رہا ہو تو وہ شعر بھی اس کے باطنی جذبہ کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ انسان خلوت میں بیٹھ کے اسی قسم کی باتیں گنگناتا ہے اس کے دل میں جس قسم کے خیالات آتے ہیں، اشعار اس کو وہی پسند ہوں گے جو اس کے جذبات کے مطابق ہوں اور ایسے ہی ظاہری طور پر میل جول جس قسم کے لوگوں سے ہے یہ بھی باطنی جذبات کو پہچاننے کا ایک ذریعہ ہے۔

مؤمنین کی صفات:

مومن مرد ہوں یا عورتیں ہوں یہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں ان کا مزاج مشترک ہے، نیکی کے کام میں دلچسپی لیتے ہیں ''یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ'' لوگوں کو بھلے کام کے لیے کہتے ہیں، بھلے کام کی کوئی تحریک اٹھے تو اس میں تعاون کرتے ہیں اپنے کردار اور گفتار کے ساتھ اس کو قوت پہنچاتے ہیں ''وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ'' اور برائی کو مٹاتے ہیں، جہاں کوئی برائی اٹھتی ہے اس کو مٹانے کی ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں، قول اور فعل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں، وہ تو اللہ کو بھولے ہوئے تھے لیکن یہ نماز پڑھتے ہیں ''يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ'' وہ تو مٹھیاں بند کر لیتے ہیں اور یہ لوگ مال کی زکوٰۃ دیتے ہیں، مال خرچ کرتے ہیں وہ ''اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'' یہ ''يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ'' وہ نافرمان تھے لیکن یہ اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں ان کے بارے میں تھا ''لَعَنَهُمُ اللّٰهُ'' اللہ نے انہیں پھٹکار دیا ان کے بارے میں آ گیا'' اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ'' ان کے اوپر اللہ کی رحمت ہو گی ''اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ'' بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

مؤمنین کا انجام:

"وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ" یہ "وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ" کے مقابلہ میں آ گیا، وہاں تھا کہ اللہ نے منافق مردوں اور کافروں سے وعدہ کیا جہنم کا اور یہاں آ گیا کہ اللہ نے وعدہ کیا مومن مردوں سے اور عورتوں سے باغات کا جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں تو وہ باغات جن میں نہریں جاری ہوں وہ سرسبز ہوتا ہے، شاداب ہوتا ہے، ہر قسم کی آرائش سے مزین ہوتا ہے، وہ جہنم میں ہمیشہ رہنے والے تھے، ان کے لیے اللہ نے بڑے عمدہ باغ اور ہمیشگی کے باغات بنائے ہیں، باغات ہوں گے اس میں کوٹھیاں ہوں گی، بنگلے ہوں گے، اس میں نہریں بہتی ہوں گی، دنیا کے اندر اگر آپ زیب و زینت اور آرام سوچ سکتے ہیں تو اس سے زیادہ کا تصور نہیں لا سکتے، وہاں اللہ ان کے اوپر ناراض ہوتا تھا اور یہاں ہے "رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" ان نعمتوں کے بعد اللہ کی رضا بہت بڑی چیز ہے، ان نعمتوں کے مقابلہ میں اللہ کی رضا بہت بڑی چیز ہے جو مؤمنین کو حاصل ہوتی ہے۔

جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس وقت جنتی جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ جنتیوں سے پوچھیں گے کہ کچھ اور چاہیے، مانگو تمہیں کیا ضرورت ہے؟ وہ کہیں گے یا اللہ! اب تو کوئی ضرورت نہیں، ہر ضرورت تو نے پوری کر دی، ہمیں تو نے ایسی عیش دے دی کہ ہم جہاں چاہتے ہیں پھرتے ہیں، وہ آگے سے اپنی خوشی کا اظہار کریں گے، اس کے بعد اللہ اعلان کریں گے کہ آج تم پر اپنی رضا کا اعلان کرتا ہوں آج کے بعد میں تم پہ ناراض نہیں ہوں گا اب دیکھو! جو اپنا محسن ہوتا ہے، جو اپنا بڑا ہوتا ہے اس کی ناراضگی ساری عیش کو مکدر کر کے رکھ دیتی ہے، اچھا کھانے کو موجود ہے، اچھا پینے کو موجود ہے لیکن اپنا مہربان ناراض ہے تو اس سے انسان کی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے، نہ کھانے میں مزہ، نہ پینے میں مزہ، نہ رہنے میں مزہ، انسان پریشان سا ہو جاتا ہے تو جس وقت ان کو اللہ کی ناراضگی کا تصور ہو گا تو جنت کی نعمتوں میں کیا عیش کریں گے؟ کیا لطف محسوس کریں گے اور جب اللہ کی طرف سے اعلان ہو گیا اور ساتھ یہ بھی ہو گیا کہ اب کبھی ناراض نہیں ہوں گا تو اب بے فکری ہو گئی اب خوب کھاؤ اور پیو اور مزے کرو جو چاہو کرو اب کوئی فکر نہیں ہے اب یہ خوف بھی ذہن سے نکل جائے گا کہ کہیں کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے کہ جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس رضا کے اعلان کے بعد جنتی اتنا خوش ہوں گے اور اس میں اتنا مزہ لیں گے کہ جنت کی کسی نعمت میں انہوں نے اتنی خوشی محسوس نہیں کی تھی جتنی اس اعلان کے بعد کریں گے کہ اللہ

راضی ہوگیا اور اس نے کہہ دیا کہ میں اب کبھی ناراض نہیں ہوں گا تو "رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" کا معنی ہے کہ جنت کی تمام نعمتوں کے مقابلہ میں اللہ کی رضا سب سے بڑی نعمت ہے اور ان بدبختوں کے متعلق ذکر کیا تھا کہ "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ" کہ یہ لوگ خسارے اور گھاٹے میں ہیں اور ان نیک بختوں کے متعلق کہہ دیا "ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ" یہ بہت بڑی کامیابی ہے اس لیے کامیابی ہے کہ اس زندگی کے چندروز اللہ کی مرضی کے مطابق گزار دیے، اللہ کا دیا ہوا تھا اللہ کے راستے میں دے دیا، مال اور اولاد اللہ نے دیے تھے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے ان کے اندر بھی اللہ کے احکام کی رعایت رکھی، دس سال کی مشقت ہے یا پچیس، پچاس سال کی مشقت ہے آخر ایک وقت ختم ہوجائے گی جو چیز ختم ہونے والی ہے چاہے دس سال میں ہو، چاہے بیس سال میں ہو، چاہے چالیس سال، پچاس سال میں ہو بالآخر ختم ہو ہی جاتی ہے، محدود ہی ہے لیکن اس کے مقابلہ میں جو کچھ حاصل ہوا کھوٹا سکہ دے کے جس قسم کی نعمتیں حاصل کرلیں اس سے زیادہ نفع کی تجارت اور کونسی ہوسکتی ہے یہ بہت بڑی کامیابی ہے جو ان مومنین کو حاصل ہوئی۔

نتیجہ:

یہاں مقابلۃً دونوں جماعتوں کی کیفیت کو واضح کردیا گیا، جب دونوں جماعتوں کی کیفیتیں سامنے آگئیں تو کبھی بیٹھ کے سوچو گے تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ یہ جماعت اختیار کرنے کے قابل ہے اور یہ جماعت اختیار کرنے کے قابل نہیں، جب دونوں باتیں صاف طور پر سامنے آجائیں تو پھر انسان کو سوچنے کے لیے آسانی ہوجاتی ہے کہ ہمیں کس جماعت کو اختیار کرنا ہے اور کس جماعت کے مطابق ہمیں زندگی گزارنی چاہیے تاکہ ہماری عاقبت اچھی ہوجائے، دونوں جماعتوں کے حالات دیکھنے کے بعد یہ بات سوچنی آسان ہوجاتی ہے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ

اے نبی جہاد کیجئے کفار اور منافقین سے اور سختی کیجئے

عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٧٣﴾

ان پر اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے ﴿٧٣﴾

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ

وہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ انہوں نے نہیں کہا البتہ تحقیق کہی انہوں نے بات

الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ

کفر کی اور انہوں نے کفر کیا اپنے اسلام کے بعد اور انہوں نے قصد کیا ایسی چیز کا جس کو وہ حاصل نہیں کر سکے

وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ

اور نہیں انتقام لیتے وہ مگر اس بات کا کہ اللہ اور اس کے رسول نے انہیں غنی کر دیا اللہ کے فضل سے

فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ

پھر اگر وہ توبہ کرلیں تو یہ بہتر ہے ان کے لیے اور اگر یہ پیٹھ پھیریں گے تو اللہ عذاب دے گا انہیں

عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ

دردناک عذاب دنیا اور آخرت میں اور نہیں ہوگا ان کے لیے زمین میں

مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٧٤﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ

کوئی یار اور نہ کوئی مددگار ﴿٧٤﴾ اور ان میں سے وہ شخص بھی ہے جس نے اللہ سے معاہدہ کیا کہ اگر

اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾

اللہ ہمیں دے دے اپنے فضل سے تو ہم ضرور بالضرور صدقہ کریں گے اور البتہ ہم ضرور ہو جائیں گے اچھے لوگوں میں سے ﴿٧٥﴾

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ

جب اللہ نے ان کو دے دیا اپنے فضل سے تو وہ اس کے ساتھ بخل کرنے لگ گئے اور انہوں نے پیٹھ پھیری اس حال میں کہ وہ

مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ

اعراض کرنے والے ہیں ﴿۷۶﴾ پس پیدا کر دیا اللہ نے نفاق ان کے قلوب میں اس دن تک جس دن اللہ سے وہ ملاقات کریں گے

بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمْ

بسبب اس کے کہ انہوں نے خلاف کیا اس کے جو انہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا اور بسبب ان کے جھوٹ بولنے کے ﴿۷۷﴾ کیا

يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ

ان کو پتہ نہیں ہے کہ اللہ جانتا ہے ان کی پوشیدہ باتوں کو اور ان کی سرگوشیوں کو اور اللہ جاننے والا ہے

الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

غیب کی باتوں کو ﴿۷۸﴾ وہ لوگ جو طعنہ دیتے ہیں مومنین میں سے ان لوگوں کو جو خوشدلی اپنانے والے ہیں

فِى الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ

صدقات میں اور ان کو جو نہیں پاتے مگر اپنی کوشش پس یہ مذاق کرتے ہیں

مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ

ان سے ، اللہ نے ان سے مذاق کیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۷۹﴾ آپ ان کے لیے استغفار کیجیے

اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ

یا استغفار نہ کیجیے اگر آپ ان کے لیے استغفار کریں گے ستر مرتبہ تو بھی

يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ

اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ اللہ تعالیٰ

لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ

ہدایت نہیں دیتا فاسق لوگوں کو ﴿۸۰﴾ خوش ہو گئے پیچھے چھوڑے ہوئے اپنے بیٹھے رہنے کی وجہ سے

خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

اللہ کے رسول کے بعد انہوں نے ناپسند کیا اس بات کو کہ جہاد کریں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ

اللہ کے راستے میں اور انہوں نے کہا کہ گرمی میں نہ نکلو آپ کہہ دیجیے کہ جہنم کی آگ

اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا

زیادہ سخت ہے ازروئے گرمی کے کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ سمجھتے ﴿۸۱﴾ چاہیے کہ ہنس لیں یہ تھوڑی دیر اور روئیں گے یہ

كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى

طویل مدت بدلے کے طور پر اس کے جو یہ کرتے تھے ﴿۸۲﴾ اگر لوٹا دے آپ کو اللہ

طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا

ان میں سے ایک طائفہ کی طرف پھر وہ اجازت طلب کریں آپ سے نکلنے کی تو آپ کہہ دیں کہ ہرگز نہیں نکلو گے تم

مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ

میرے ساتھ کبھی بھی اور نہیں لڑو گے تم میرے ساتھ مل کر کسی دشمن سے بے شک تم خوش ہوگئے

بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى

بیٹھنے کے ساتھ پہلی مرتبہ پس بیٹھے رہو تم پیچھے رہنے والوں کے ساتھ ﴿۸۳﴾ نہ نماز پڑھو

اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا

ان میں سے کسی پر بھی جو مرجائے اور نہ کھڑا ہو اس کی قبر پہ بے شک انہوں نے کفر کیا

بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ

اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ اور مر گئے اس حال میں کہ وہ نافرمان ہیں ﴿۸۴﴾ نہ تعجب میں ڈالیں تجھے ان کے مال

وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا

اور اولاد سوائے اس کے نہیں اللہ ارادہ کرتا ہے کہ انہیں عذاب دے ان کے سبب سے دنیا میں

وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ

اور چلی جائیں ان کی جانیں اس حال میں کہ یہ کافر ہوں ﴿۸۵﴾ اور جب اتاری جاتی ہے کوئی سورۃ کہ

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ

ایمان لاؤ اللہ پر اور جہاد کرو اس کے رسول کے ساتھ مل کر تو اجازت طلب کرتے ہیں آپ سے قدرت والے

مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا

ان میں سے اور کہتے ہیں کہ چھوڑ دیں ہمیں کہ ہم ہو جائیں بیٹھنے والوں کے ساتھ ﴿۸۶﴾ خوش ہو گئے وہ کہ ہو جائیں وہ

مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾

عورتوں کے ساتھ جو پیچھے رہنے والی ہیں اور ان کے دلوں کے اوپر مہر ہو گئی پس یہ سمجھتے نہیں ﴿۸۷﴾

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ

لیکن رسول اور وہ لوگ جو رسول پہ ایمان لائے جہاد کرتے ہیں اپنے مالوں کے ساتھ

وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ؗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور اپنی جانوں کے ساتھ انہی کے لیے بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿۸۸﴾

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

تیار کیے اللہ نے ان کے لیے باغات جاری ہیں ان کے نیچے سے نہریں ہمیشہ

فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾ ع

اس میں رہنے والے ہوں گے یہ بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۸۹﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

منافقین کا ذکر چلا آ رہا ہے، اس سورۃ کے نازل ہونے سے پہلے منافقین کے ساتھ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ نرمی کا تھا اور ان کو مسلمانوں میں کسی حیثیت سے ممتاز نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کی دل جوئی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے زیادہ اچھا معاملہ کرتے تھے کہ کسی طرح یہ احسان سے متاثر ہو کے سیدھے ہو جائیں لیکن جب ہر تدبیر ناکام

ہوگئی اوران لوگوں کے دلوں کا روگ نہ گیا تو اس سورۃ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے منافقین پر کھل کے بات کی ہے اوران کے حالات کی وضاحت کی ہے اور سرور کائنات ﷺ کو کہا ہے کہ اب ان کو ننگا کیجئے، اب ان کی پردہ داری نہ کریں اوران کے اوپر سختی کا معاملہ کریں، نرمی کے ساتھ تو یہ ٹھیک نہیں ہوتے، اب یہ نا قابل اصلاح ہیں اب ان کو اپنی جماعت میں ممتاز کر دینا چاہیے جیسے کہ پیچھے بھی یہی مضمون ذکر کیا گیا تھا اگر آپ ان کو اجازت نہ دیتے تو یہ نمایاں ہو جاتے اب یہ آپ کی اجازت کا پردہ ڈال کے بیٹھ گئے، لوگوں کو پتہ نہیں کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے اگر آپ اجازت نہ دیتے تو جو مخلص تھے وہ جاتے اور جو مخلص نہیں تھے وہ پیچھے رہ جاتے تو جب آپ کی اجازت کے بغیر رہ جاتے تو ایسی صورت میں ان کا نفاق کھل کے سامنے آجاتا تو یہاں بھی اسی قسم کی ہدایات دی گئی ہیں اوران کے کردار کو نمایاں کیا گیا ہے۔

کفار کے ساتھ ساتھ منافقین سے جہاد کا حکم:

اے نبی! کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو، یہاں منافقین کو کافروں کی صف میں شامل کیا گیا ہے لیکن دونوں کے ساتھ جہاد کی نوعیت علیحدہ علیحدہ ہے، کافروں کے ساتھ تو جہاد بالسیف والسنان تھا، تلوار اور نیزے کے ساتھ تھا اور منافقین کے ساتھ جہاد باللسان ہے کہ خوب ان کی برائی کرو اوراپنی جماعت کے اندر خوب ان کو نمایاں کرو "وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ" ان کے ساتھ سختی کا معاملہ کرو، اب ان کے ساتھ نرمی نہ کریں، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے، آخرت میں تو برباد ہیں ہی بلکہ آخرت میں ان کی سزا کافروں کے مقابلہ میں زیادہ سخت ذکر کی گئی ہے "إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ" کہ منافق نچلے درجے میں ہوں گے کیونکہ کھلے اور پوشیدہ دشمن میں فرق ہوتا ہے پوشیدہ دشمن زیادہ برا ہوتا ہے، کافر کھلے دشمن ہوتے ہیں اور منافق پوشیدہ دشمن ہیں جنہیں "مار آستین" کہا جاتا ہے۔

"يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا" یہ بھی ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے، غزوہ تبوک میں جو منافق ساتھ رہ گئے تھے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس سفر میں رسول اللہ ﷺ کو نقصان پہنچایا جائے جس کی صورت یہ تھی کہ راستے میں پہاڑی سفر تھا، آپ جس وقت پہاڑوں میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ جس وقت پہاڑوں میں سے راستہ گزرتا ہے تو بہت چھوٹی سی پگڈنڈی ہوتی ہے، دائیں بائیں اس قسم کی گہرائی ہوتی ہے کہ اگر کسی کا ذرا سا بھی

قدم پھسل جائے تو پھر کلا بازی کھاتا ہوا سینکڑوں فٹ گہرائی میں جا کے گرتا ہے اور بچنے کی امید نہیں ہوتی اور وہ راستے بہت تنگ تنگ ہوتے ہیں تو ایک جگہ ایسی آنے والی تھی جہاں سے رسول اللہ ﷺ کی سواری نے گزرنا تھا تو انہوں نے مشورہ کیا کہ کوئی ایسی صورت بنائی جائے کہ ایسے موقع پر آپ ﷺ کی سواری بدک جائے، اس کو ڈرایا جائے یا اس کے آگے کوئی مزاحمت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے جس سے سواری کا قدم پھسلے اور آپ ﷺ پہاڑ سے گر جائیں اور اس طرح (نعوذ باللہ) آپ ﷺ وفات پا جائیں یہ انہوں نے تدبیر کی اور اور آپس میں اس قسم کی گفتگو کی۔

اور بعض تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پھر انہوں نے اس قسم کی کوشش بھی کی لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی کوشش سے وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے اور کوئی کسی قسم کی کاروائی نہ کر سکے، منہ وغیرہ چھپائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے رات کی تاریکی میں پہچانے نہیں گئے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو اطلاع ہوئی یا بعض اس قسم کے آثار سامنے آئے کہ یہ شرارت فلاں لوگوں کی ہے تو ان کو بلایا گیا اور ان سے پوچھا گیا تو وہ قسمیں کھا گئے کہ ہم نے نہ اس قسم کی بات کی ہے اور نہ کوئی اس قسم کی حرکت کی ہے جس طرح ان کی عادت تھی کہ آ کے قسمیں کھا جاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کے جھوٹ کو نمایاں کیا ہے۔

آیت کا مفہوم:

"یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ مَا قَالُوْا" وہ قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے بات نہیں کی "وَلَقَدْ قَالُوْا" یہ قد تاکید کے لیے ہے اس میں قسم والا معنی ہوتا ہے کہ انہوں نے کفر کی بات کی ہے، نبی کو ہلاک کرنے لیے اپنی مجلسوں کے اندر اس قسم کے مشورے کیے ہیں "وَکَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِھِمْ" اپنے اسلام کے بعد انہوں نے کفر کا اظہار کیا ہے یعنی پہلے زبانی طور پر ایمان لائے اور پھر اس قسم کی باتیں کر کے کفر کو ظاہر کر دیا اور انہوں نے قصد کیا ایسے معاملہ کا جس تک یہ پہنچ نہیں سکتے اور وہ ہے آپ ﷺ کو نقصان پہنچانا "مَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰھُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ" اس عبارت کا مفہوم ہے "تَاکِیْدُ الشَّیْءِ بِخِلَافِہٖ" خلاف چیز کو ذکر کر کے کسی کو پختہ کرنا جیسے ہم کسی پر کوئی احسان کریں اور وہ اس احسان سے متاثر ہو کے ہم سے محبت نہ کرے، اطاعت قبول نہ کرے بلکہ الٹا دشمنی کرے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو جس وقت اس کی طرف سے ایسا معاملہ پیش آئے جو نقصان پہنچانے کا ہے یا دشمنی کرنے کا ہے تو ہم

کہیں گے کہ یہ میرے احسان کا بدلہ دے رہا ہے، اس نے یہ معاملہ میرے ساتھ اس لیے کیا ہے کیونکہ میرے اس کے اوپر بہت سارے احسانات ہیں تو آپ جانتے ہیں کہ یہ احسانات کا بدلہ تو نہیں ہے یہ تو نمک حرامی ہے لیکن اس کو ذکر ایسے ہی انداز میں کیا جاتا ہے اور اس میں زیادہ قباحت نمایاں ہوتی ہے۔

یہاں بھی یہی حال ہے کہ منافقین کا جو ٹولہ تھا یہ آپ ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لے جانے سے قبل فقرو فاقہ میں مبتلاء تھے، یہود ان سے سود لے کے ان کو کنگال کرتے رہتے تھے حضور ﷺ تشریف لائے تو یہ فتوحات جو شروع ہوئیں تو مدینہ منورہ کے بسنے والے سارے خوشحال ہوئے لیکن یہ منافقین کا ٹولہ سب سے زیادہ خوشحال ہوا، سب سے زیادہ خوشحال کیوں ہوا؟ ایک تو آپ ﷺ ان کی دل جوئی کے لیے ان کو ہر موقع پر دیتے تھے کہ یہ کھا پی کے مطمئن ہو جائیں، ان کے دلوں کا روگ چلا جائے آپ ان کو ترجیح دیتے تھے اور پھر وہ بھی حضور ﷺ سے مختلف بہانوں سے لیتے رہتے تھے اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان منافقوں کے پاس لینے والا ہاتھ ہی تھا دینے والا ہاتھ تھا ہی نہیں، رسول اللہ ﷺ کی طرف سے باقی مسلمانوں کو بھی مال ملتا تھا لیکن جب اعلان ہوتا کہ جہاد کے لیے چندہ دو تو لوگ گٹھڑیاں بھر بھر کے لاتے تھے، بوریاں بھر بھر کے لاتے تھے اور اپنے گھروں کو پھر خالی کر دیتے تھے، اس طرح ان کا گھر پورا خالی ہو جاتا لیکن یہ ایسے تھے کہ لینے میں تو سب سے آگے ہوتے تھے اور جب دینے کا موقع آتا تو سب سے پیچھے ہوتے تھے اس لیے ان کے پاس مال جمع رہا تو یہ صحیح معنیٰ میں غنی ہو گئے تو ان کے اوپر اللہ اور اللہ کے رسول کا اتنا احسان تھا کہ فقر و فاقہ سے نکلے، غنی بن گئے، مالدار ہو گئے آج یہ اس چیز کا بدلہ چکا رہے ہیں کہ جہاں دشمنی کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہاں سب سے آگے ہوتے ہیں، اس لفظ کا مفہوم یوں ہے کہ نہیں بدلہ دیتے مگر اس بات کا کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے انہیں غنی کر دیا، یہ اللہ اور اللہ کے رسول کے احسانات کا بدلہ ہے جو یہ انتقام لیتے ہیں تو گویا کہ یہ مخالف سمت ذکر کر کے مذمت کی گئی ہے۔

"مِنْ فَضْلِهٖ" کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ فضل اصل میں تو اللہ ہی کا ہے اگر چہ اس کی تقسیم اللہ کے رسول کے ہاتھ سے ہوئی "فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ خَیْرًا لَّهُمْ" اب بھی ان کے لیے توبہ کا دروازہ بند نہیں ہے اگر یہ توبہ کر لیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے، اگر یہ پیٹھ پھیریں تو اللہ تعالیٰ انہیں دردناک عذاب دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، پھر یہ دنیا اور آخرت میں رسوا ہوں گے، جب یہ اللہ کی گرفت میں آئیں گے تو ان کو اپنے علاقہ

میں یا روئے زمین میں کوئی یار اور مددگار نہیں ملے گا، چنانچہ یہاں مفسرین نے لکھا ہے کہ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے صدق دل سے توبہ کرلی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرلی۔

شان نزول:

"وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ" اس میں بھی ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے، ثعلبہ بن حاطب یہ انصاری ہیں جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ! میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے مالدار کردے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سمجھایا کہ زیادہ مالدار ہونا اچھا نہیں ہے، تھوڑا ہو ضرورت کے لیے کافی ہو وہ بہتر ہے اس زیادہ سے کہ جس میں انسان مشغول ہو کے اللہ کی اطاعت سے ہی غافل ہوجائے، وہ کہنے لگا کہ میں اللہ سے وعدہ کرتا ہوں اور آپ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر میں غنی ہوجاؤں گا تو میں اللہ کے راستے میں خرچ کروں گا، حقوق ادا کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سمجھایا لیکن پھر بھی وہ پیچھے پڑا رہا کہ میرے لیے دعا کردیجیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا کردی، اس کا مال بڑھنا شروع ہوگیا پہلے مدینہ منورہ میں رہتا تھا لیکن جب اس کی بکریاں بڑھیں تو باہر جنگل میں چلا گیا، نماز باجماعت سے محروم ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے محروم ہوا، آٹھویں دن جمعہ کے لیے آجاتا پھر جب اور مال بڑھا تو اور انتظام مشکل ہوگیا تو جمعہ بھی چھوٹ گیا پھر جس وقت زکوٰۃ کا حکم آیا "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاملین کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا تو اس کی طرف بھی دو آدمی گئے جن کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تحریری فرمان بھی تھا اور حساب کتاب ان کے پاس تھا، جب وہ ثعلبہ کے پاس گئے تو اس نے جس وقت وہ تحریری فرمان دیکھا تو کہتا ہے کہ زکوٰۃ جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے اس کا مسلمانوں سے کیا تعلق ہے؟ ٹال مٹول کردی کہ تم آگے سے ہو آؤ میں سوچتا ہوں وہ باقی لوگوں سے صدقات وصول کرکے آئے تو پھر اس نے ٹال مٹول کی کہ اب جاؤ پھر کسی دن آنا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت افسوس کا اظہار کیا تو ثعلبہ کو کسی نے جاکر یہ بات بتائی کہ تیرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اس طرح سے تذکرہ ہوا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرے اوپر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

پھر اس کو کچھ تنبیہ ہوئی پھر وہ اپنی زکوٰۃ لے کے آیا لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف ظاہر داری کے لیے لے کے آیا تھا ورنہ اس نے زکوٰۃ کی اہمیت اور اس کے فرض ہونے کو اپنے دل سے قبول نہیں کیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ

یہ آیات نازل ہو چکی تھیں، آپ ﷺ نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تیری زکوۃ کو قبول کرنے سے منع کر دیا ہے اس لیے میں وصول نہیں کرتا پھر اس نے بہت چیخ و پکار کی لیکن کوئی بات نہیں ہوئی وہ واپس چلا گیا، حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے بھی رد کر دیا کہ جب حضور ﷺ نے تیری زکوۃ وصول نہیں کی تو ہم بھی نہیں کر سکتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں بھی رد کر دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں بھی رد کر دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس کا انتقال اسی حالت میں ہو گیا اس طرح وہ برباد ہوا تو یہاں منافقین کا عمومی انداز بھی مذکور ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کا مصداق ثعلبہ بھی ہو سکتا ہے۔

آیت کا مفہوم:

ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے معاہدہ کیا اللہ کے ساتھ کہ اگر ہمیں اللہ اپنے فضل سے دے دے تو ہم اس کے راستے میں ضرور بالضرور خرچ کریں گے، صدقہ کریں گے اور ہم ضرور ہو جائیں گے اچھے لوگوں میں سے، جب اللہ نے ان کو اپنا فضل دے دیا یا اپنے فضل سے مال کثیر دے دیا تو اس مال کے ساتھ بخیل ہو گئے، انہوں نے اللہ کے فضل کے ساتھ بخل کیا اور پیٹھ پھیر گئے اس حال میں کہ وہ منہ موڑنے والے تھے، منہ موڑنے کا مطلب یہ کہ مکمل طور پر پیٹھ پھیر کے چلے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اس بخل کی سزا کے طور پر اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا موت تک، یہ آیات گویا کہ قطعی طور پر نشاندہی کر رہی ہیں کہ یہ لوگ منافق ہیں، منافق کا معنی ہوتا ہے دل سے بے ایمان، جب وہ دل سے بے ایمان ہیں، زکوۃ کو فرض ہی نہیں سمجھتے، ان کے دل میں زکوۃ کی اہمیت ہی نہیں تو جو کچھ وہ لے کے آئے ہیں یہ صرف ظاہر داری ہے، زکوۃ نہیں ہے تو اللہ کی طرف سے حکم تھا کہ اب ان کے اوپر سختی کیجیے اور ان کی پردہ داری نہ کیجیے اس طرح ظاہر کر دیا کہ اب تمہاری کوئی عبادت قبول نہیں ہے، زکوۃ بھی قبول نہیں ہے کیونکہ اس آیت نے نشاندہی کر دی کہ ان کے اس کردار کے نتیجہ میں، ان کے اس کردار کی سزا کے طور پر اللہ نے ان کے دل میں نفاق موت تک قائم کر دیا ہے، جس کا مطلب تھا کہ اب یہ مخلص مومن بن ہی نہیں سکتے، اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ان کی عبادت جو بھی ہے وہ ظاہر داری ہے حقیقت میں ایمان ان کے دل میں ہے ہی نہیں، اب پردہ داری کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لیے حضور ﷺ نے رد کر دیا، اللہ نے نفاق ثابت کر دیا اب موت تک ان کے دل میں نفاق رہے گا اور مرنے کے بعد تو توبہ کا امکان ہی نہیں ہے، یہ سزا کیوں ملی؟ "بِمَآ اَخْلَفُوا

اللّٰہَ مَاوَعَدُوْہُ" جوانہوں نے اللہ سے معاہدہ کیا تھا اس کے خلاف کرنے کی وجہ سے اور ان کے جھوٹ بولنے کی وجہ سے، کیا ان کو پتہ نہیں ہے کہ اللہ ان کے بھید کو جانتا ہے اور ان کی سرگوشیاں جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والا ہے۔

تطبیق بین الآیات:

پچھلی آیت میں آیا تھا" فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ " اگر یہ توبہ کرلیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور اس آیت میں ہے کہ موت تک اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق ثابت کردیا ہے کہ یہ توبہ نہیں کرسکتے تو دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے حقیقت کے اعتبار سے کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ پیچھے جو" فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ "کا ذکر آیا ہے وہ اور گروہ کے متعلق ہے اور یہاں جن کا ذکر ہے یہ اور گروہ ہے اس لیے دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

صدقہ خیرات کرنے والے مؤمنین کو منافقین کا طعنہ:

آگے بھی ان منافقین کا ہی ایک کردار ذکر کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں ان کی ایک نفسیاتی بات ہے، ان کا دل چاہتا ہے کہ باقی لوگ بھی بخیل ہوجائیں تو کسی کو سخاوت کرتا ہوا دیکھتے ہیں تو چڑتے ہیں کیونکہ جب سارے ایک جیسے ہوجائیں گے تو حال ایک جیسا رہ جائے گا اور ان کا عیب نمایاں نہیں ہوگا اگر باقی لوگ خیرات کریں، صدقہ دیں اور سخاوت کریں یہ نہ کریں تو یہ علیحدہ نمایاں ہوں گے تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح ہم بخیل ہیں اسی طرح باقی بھی بخل کریں تاکہ ہم ایک جیسے ہوجائیں اور ہمارے اوپر انگلی نہ اٹھے "اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ" خود بخیل ہیں تو لوگوں کو بھی بخل کرنے کے لیے کہتے ہیں اور جس وقت کوئی صدقہ کرتا ہے یا کوئی سخاوت کرتا ہے تو ان کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، یہ طعن و تشنیع کرتے ہیں تاکہ یہ تنگ آکے باز آجائیں اور سارے کے سارے ایک ہی طرح کے ہوجائیں جب سارے ایک جیسے ہوجائیں گے تو کوئی کسی کے اوپر انگلی نہیں اٹھائے گا۔

یہاں بھی یہی قصہ تھا کہ منافق خود صدقہ دیتے نہیں تھے، خیرات کرتے نہیں تھے تو جب اللہ کے رسول کی طرف سے اعلان ہوتا اور لوگ خوشی خوشی زکوٰۃ کے علاوہ اور مال لاکے پیش کرتے تو یہ طعنے دیتے یعنی اگر کوئی کثیر

مقدار میں لے آیا تو کہتے کہ دیکھو! ریا کار ہے، مال خرچ کر کے شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے اور جو لوگ محنت مزدوری کر کے کما کے لاتے چند کھجوریں لاتے اور اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے تو کہتے کہ دیکھو! آگئے ہیں یہ خیرات کرنے کے لیے انہوں نے تو حاتم کی قبر پہ لات ماردی ہے، کیا ضرورت تھی اتنا سالانے کی اس طرح باتیں کرتے تھے، نہ زیادہ لانے والے کو چھوڑتے اور نہ تھوڑا دینے والے کو چھوڑتے، اس طرح طعنہ دیتے تھے اور مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ باز آجائیں اور ہمارا عیب چھپا رہ جائے یہاں اللہ تعالیٰ ان کی خبر لیتے ہیں کہ یہ لوگ طعنہ دیتے ہیں صدقات میں خوشی کے ساتھ زیادہ دینے والوں کو اور ان لوگوں کو جو نہیں پاتے مگر اپنی کوشش کے مطابق، محنت مشقت کر کے کماتے ہیں اور تھوڑا بہت جو بھی میسر ہو جائے لے آتے ہیں منافق ان سے مذاق کرتے ہیں "سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ" اللہ نے ان سے مذاق کیا یعنی ان کے مذاق کا اللہ نہیں بدلہ دے گا "وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ" اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے گویا کہ یہ تنبیہ کر دی گئی کہ چاہے نام نہ لیے جائیں کہ مذاق کون کرتے ہیں لیکن جس معاشرے کے اندر یہ آیات اتر رہی ہیں اس معاشرے کے اندر اس قسم کے لوگ ممتاز ہوتے ہیں لوگوں کو خود پتہ چل جاتا ہے کہ "اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ" کا مصداق کون کون ہیں؟ اور اس آیت کے اندر ان کو تنبیہ کی گئی ہے۔

"اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ" کا مفہوم:

اب ان کی شرارتیں اس درجے تک پہنچ گئیں کہ حضور ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ "اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ" آپ ان کے لیے استغفار کریں چاہے نہ کریں، ان کے لیے معافی مانگیں یا نہ مانگیں "اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً" اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے "فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ" اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا اب یہ اس حد تک پہنچ گئے کہ آپ کا استغفار ان کے لیے کوئی مفید نہیں ہے، ستر کا ذکر کثرت کے لیے ہے جیسے ہم بھی کہتے ہیں کہ میں نے تجھے ستر دفعہ سمجھایا ہے لیکن تو سمجھتا نہیں ہے، میں نے تجھے سو دفعہ سمجھایا ہے تو سمجھتا نہیں ہے، یہ اپنی اپنی زبان کے محاورے ہوتے ہیں تو "سبعین" کا لفظ عربی کے اندر کثرت کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی جتنا چاہیں آپ ان کے لیے استغفار کریں ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا، اب یہ لوگ کسی طرح بھی اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکتے، نافرمان لوگوں کو اللہ تعالیٰ سیدھا راستہ نہیں دکھاتا اس میں یہ فیصلہ سنا دیا گیا۔

"اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ" کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ جس طرح صحابہ کے لیے استغفار کرتے

تو اس کی لپیٹ میں یہ بھی آجاتے تھے اللہ تعالیٰ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے مغفرت مانگتے تھے کہ یا اللہ! ان کو معاف کردے یہ صحیح راستے پہ آجائیں لیکن ان کے کردار نے ان کو انتہا تک پہنچا دیا اب اللہ کے رسول کا استغفار بھی ان کے لیے کافی نہیں ہے۔

"فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ" کا مفہوم:

"فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ" یہ آیات غزوہ تبوک کے سلسلے کی ہی ہیں تو جن کو پیچھے چھوڑ دیا گیا، مخلف کے لفظ میں تصور دیا گیا ہے کہ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ہم بہانے کرکے پیچھے رہ گئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ٹھکرائے گئے ہیں، یہ پیچھے چھوڑ دیے گئے، ان سے خیر کی توفیق ہی سلب ہوگئی، یہ پیچھے چھوڑے ہوئے اپنے پیچھے بیٹھنے کی وجہ سے خوش ہیں، اللہ کے رسول کے بعد پیچھے رہنے پہ خوش ہیں کہ ہم نے بہت اچھا کام کیا ہے اور یہ مکروہ جانتے ہیں کہ یہ اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کریں، خود بھی نہیں نکلتے اور دوسروں کو بھی کہتے ہیں کہ "لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ" موسم بہت گرم ہے جانے کی ضرورت نہیں، گرمی میں باہر نہ نکلو دوسروں کو بھی اس طرح سے کہتے ہیں، یا "لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ" اپنے آپ کو کہتے ہیں یعنی اپنے متعلق ہی ان کے دل میں خیال آیا کہ گرمی میں نہ نکلو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا" انہیں کہہ دو کہ تم اس دنیا کی گرمی سے تو بچ رہے ہو اور اپنے آپ کو جہنم کی آگ کا مصداق بنا رہے ہو یہ کونسی عقلمندی ہے؟ کہ ایک آدمی بارش سے ڈر کے بھاگا اور پرنالے کے نیچے جا کے کھڑا ہو گیا، چھوٹی مصیبت سے بچتا بچتا بڑی مصیبت میں جا پھنسا تو تم اس گرمی سے بچتے بچتے جہنم میں جا گرے یہ کونسی عقلمندی ہے؟ جہنم کی آگ زیادہ سخت ہے از روئے گرمی کے "لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ" کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ سمجھ جائیں، ان کو اگر سمجھ ہوتی تو یہ سوچتے کہ آج کی گرمی برداشت کرکے اگر جہنم کی گرمی سے بچتے ہیں تو یہ اچھا ہے اور آج کی گرمی سے بچ کے اگر جہنم کی گرمی میں جاتے ہیں تو یہ نقصان ہے۔

"فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا" کا مفہوم:

مطلب یہ ہے کہ ان کے ہنسنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے اور ان کے رونے کا زمانہ زیادہ ہے، یہ چند دن کی زندگی ہے اس میں یہ خوش ہو رہے ہیں یہ ہنسنے کے دن تھوڑے ہیں اور رونے کا زمانہ زیادہ ہے اور یہ بدلہ دیے

جائیں گے اپنے ان کاموں کا جو یہ کرتے ہیں، روئیں گے زیادہ یعنی آخرت میں اب دنیا کے اندر تو بہت خوش ہیں کہ ہم نے بہت اچھا کام کیا ہے، سائے میں بیٹھے رہے، دھوپ میں نہیں نکلے لیکن یہ زمانہ بہت کم ہے اور اس کے مقابلہ میں رونا زیادہ ہے یہ خبر کے طور پہ ہے۔

اور اگر اس کو انشاء کے طور پہ ذکر کیا جائے پھر بھی بڑا لطیف معنی پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنے اس کردار پہ خوش ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ روئیں زیادہ اور ہنسیں کم، ان کا یہ کردار رونے کے قابل ہے، یہ بات رونے کی ہے ہنسنے کی نہیں ہے، تھوڑا ہنسیں کہ ظاہری طور پر فائدہ ہے اور زیادہ روئیں کہ حقیقت میں برباد ہو گئے ان کا یہ کردار ہنسنے کا نہیں رونے کا ہے، بدلہ دیے جائیں گے اس کام کا جو یہ کرتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ آپ کو واپس لے جائے ان میں سے ایک طائفہ کی طرف، اگر کا مطلب ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے جانے سے پہلے کچھ مر ہی جائیں اگر ان میں سے ایک طائفہ کی طرف تمہیں اللہ واپس لے جائے پھر یہ تجھ سے اجازت مانگیں گے نکلنے کی آئندہ کے لیے، کہیں گے کہ ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں جہاد کے لیے آپ کہہ دیجیے ہرگز نہیں نکلو گے تم میرے ساتھ کبھی بھی اور نہیں لڑو گے تم میرے ساتھ مل کر کسی دشمن سے تم نے پسند کر لیا ہے بیٹھے رہنے کو پہلی مرتبہ اب بیٹھے رہو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ، اب معاملہ بالکل صاف کر دو اور ان کو اپنے سے بالکل کاٹ دو، اب ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں اگر اب یہ شامل ہونا بھی چاہیں تو ان کو شامل نہ کرو۔

منافق کا جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں:

اب اگلی بات اور زیادہ نمایاں کر دی کہ وہ منافق چونکہ ظاہری طور پر مؤمنین کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے ان کے ساتھ معاملہ مسلمانوں جیسا ہوتا تھا تو زندگی کا آخری آخری معاملہ یہی ہوتا ہے کہ یہ اگر مر جائے تو مسلمانوں کی جماعت اسے نہلائے، اسے کفن دے، عزت احترام کے ساتھ اس کا جنازہ پڑھے، دعاؤں کے ساتھ اس کو رخصت کرے یہ ایک اعزاز ہے جو مسلمان شخص کے لیے مسلمان جماعت کی طرف سے ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں منع کر دیا ہے کہ جو نمایاں قسم کے منافق ہیں ان کا جنازہ پڑھنے کی اجازت نہیں اور ان کے کفن دینے کے لیے وہاں جا کے کھڑا ہونے کی بھی ضرورت نہیں، ایک ہے کہ عبرت حاصل کرنے کے لیے یا کسی اور کام کے لیے قبرستان چلے گئے وہ ایک علیحدہ بات ہے، یہاں یہ ہے کہ جس طرح انسان احترام

محبت کے ساتھ جا کے کھڑا ہوتا ہے تو ایسا کرنے کی بھی اجازت نہیں، نہ جنازہ پڑھو، نہ فاتحہ پڑھنے اور ایصال ثواب کے لیے ان کی قبر کے پاس جا کے کھڑے ہو۔

شانِ نزول:

عبد اللہ بن ابی ابن سلول یہ منافق تھا اس کا نفاق بہت کھلا ہوا تھا یہ مر گیا تو اس کا بیٹا اس کا نام بھی عبد اللہ ہے اور وہ مخلص ہے وہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور آ کر اس نے اطلاع دی کہ یا رسول اللہ! میرا والد انتقال کر گیا ہے آپ اپنی قمیص دے دو میں اس کو اپنے والد کے کفن میں دے دوں، آپ ﷺ نے اس کو اپنی قمیص دی اور اس میں اس کو خوش کرنا مقصود تھا جو کہ مخلص تھا، دوسری بات یہ بھی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ عبد اللہ بن ابی کا ایک احسان بھی تھا جو رسول اللہ ﷺ چکانا چاہتے تھے، جس وقت بدر کے قیدی گرفتار ہو کے آئے ہیں کہتے ہیں کہ ان میں حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے اور ان کے بدن کے اوپر قمیص نہیں تھی، رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ کوئی اس کو اپنی قمیص پہنا دے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ چونکہ دراز قد کے تھے اس لیے ان کو کسی دوسرے کی قمیص پوری نہیں آئی تھی تو عبد اللہ کی قمیص ان کے فٹ آ گئی تو اس نے حضور ﷺ کے چچا کو قمیص پہنائی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا احسان باقی نہیں رکھنا چاہا بلکہ اس کو اپنی قمیص کفن میں دے دی اور اس کے کفن میں رسول اللہ ﷺ نے تبرک کے طور پر اپنا لعاب دہن ڈالا اس طرح اس کے ساتھ معاملہ کیا اور اس کے بیٹے کو کہا کہ جب جنازہ تیار ہو جائے تو مجھے اطلاع کر دینا آپ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ ﷺ جنازہ پڑھانے کے لیے تیار ہو گئے۔

اور وہ آیت پہلے اتر چکی تھی "اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ" حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے آ گئے اور حضور ﷺ کا کپڑا پکڑ کر کہا کہ یا رسول اللہ! اس منافق کا جنازہ پڑھانے کے لیے جا رہے ہو، اس نے فلاں وقت یوں کہا تھا فلاں وقت یوں کہا تھا اور اللہ نے کہہ دیا ہے کہ ان کے لیے آپ استغفار نہ کریں تو آپ جنازہ پڑھانے کے لیے کیسے جا رہے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ نے کوئی منع نہیں کیا، اختیار دیا ہے کہ تو استغفار کر یا نہ کر اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے کے ساتھ یہ بخشا جا سکتا ہے تو میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ استغفار کروں گا، یوں کہہ کر دامن چھڑایا اور جنازہ پڑھانے کے لیے چلے گئے، اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا جب آپ نے نہیں مانا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ساتھ ہی ہو گئے پھر یہ نہیں کہ احتجاج کر کے بیٹھ گئے کہ جب میری بات نہیں مانی

تو میں کیوں جاؤں؟ ایسی بات نہیں مشورہ تھا جب نہیں مانا گیا تو وہ بھی ساتھ ہو گئے۔

اب جنازہ تو پڑھ لیا لیکن اللہ کی طرف سے حکم آگیا کہ "لَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ" ان کا جنازہ بالکل نہیں پڑھنا چاہیے آئندہ کے لیے ممانعت کر دی باقی حضور ﷺ نے اپنے اس عمل کی خود وضاحت کی کہ نہ میری قمیص اس کے لیے مفید ہے اور نہ میرا تھوکنا اس کے لیے مفید ہے لیکن اس کے ساتھ حسن سلوک کر کے یہ چاہتا ہوں کہ اس کے متعلقین پہ اس کا اثر پڑے اور اس اخلاق سے متاثر ہو کے کم از کم وہ تو صحیح مسلمان بن جائیں، دوسروں پر اچھا اثر ڈالنے کے لیے میں نے اس طرح کیا ہے۔

حضور ﷺ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے موقف میں اختلاف کی وجہ:

اب صورت یہ ہے کہ یہی آیت مختلف فیہ ہوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضور ﷺ کے درمیان، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ آپ کو استغفار کرنے سے روک دیا گیا ہے، حضور ﷺ کہتے تھے کہ نہیں روکا گیا، اب آیت ایک ہی ہے، عربی الفاظ ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیسے سمجھا کہ یہاں روک دیا گیا ہے اور حضور ﷺ نے کیسے سمجھا کہ نہیں روکا گیا یہ استدلال کس طرح ہوا؟ دونوں کے سامنے ایک ہی آیت ہے ایک سمجھتا ہے کہ ممانعت ہے اور ایک سمجھتا ہے کہ ممانعت نہیں ہے بلکہ اباحت ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ "اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ" یہ جو ترکیب ہے اپنی وضعی حیثیت سے نہ یہ ممانعت پر دلالت کرتی ہے اور نہ اجازت پر دلالت کرتی ہے، یہ ترکیب دونوں باتوں کو برابر ٹھہرانے کے لیے ہے استغفار کرو یا نہ کرو دونوں باتیں برابر ہیں، ان کے اوپر کوئی فائدہ مرتب ہونے والا نہیں ہے، دونوں ایک ہی چیزیں ہیں، اب اگر کوئی اور مصلحت ہو جائے تو اس کام کے کرنے کو بھی ترجیح دی جا سکتی ہے اور اگر مصلحت یہ ہو کہ نہ کرنا بہتر ہے تو نہ کرنے کو ترجیح دی جا سکتی ہے اس میں یہ تو بتایا گیا کہ آپ کا استغفار اور عدم استغفار دونوں برابر ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں تو یہ بات تھی کہ اگر ان منافقوں کے ساتھ یوں ہی دلداری رہی تو اس میں مخلصین کی حوصلہ شکنی ہے اور منافقین کی حوصلہ افزائی ہے اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مصلحت یہ تھی کہ ان کے لیے استغفار نہیں کرنا چاہیے، جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے۔

حضور ﷺ نے دوسری مصلحت سمجھی کہ جب اس قسم کے دشمن کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کروں گا تو اخلاق

سے متاثر ہو کر ہو سکتا ہے کہ ان کے متعلقین مخلص ہو جائیں اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استغفار کرنے کو ترجیح دی تو یہ ترکیب ذاتی طور پر نہ ممانعت پر دلالت کرتی ہے اور نہ اجازت پر دلالت کرتی ہے بلکہ ممانعت یا اباحت خارجی قرائن کے ساتھ سمجھی جاتی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اور قرائن تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور قرائن تھے۔

آیات کا مفہوم:

اگلی آیت پہلے گزر چکی ہے کہ آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد بظاہر یہ مال اور اولاد والے نظر آ رہے ہیں تو آپ اس میں تعجب میں نہ پڑیں، یہ ان کے لیے نعمتیں نہیں ہیں بلکہ ان کے لیے آلہ عذاب ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دے گا اور ان کی جانیں چلی گئیں اس حال میں کہ یہ کافر ہیں یعنی کفر کی حالت میں ان کو موت آئے گی اپنے مال اور اولاد کی وجہ سے اس طرح مست رہیں گے کہ ان کو اللہ یاد ہی نہیں آئیگا مال بھی ان کے لیے نافرمانی کا باعث اور اولاد بھی ان کے لیے نافرمانی کا باعث ہے اس طرح کفر کی حالت میں ان کی جانیں نکل جائیں گی۔

اور جب کوئی سورۃ اتاری جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اللہ کے رسول کے ساتھ مل کے جہاد کرو تو قدرت والے بھی چھٹی کی درخواستیں لے کے آجاتے ہیں کہ ہمیں چھٹی دے دو ہم نہیں جاسکتے کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دو کہ ہم پیچھے بیٹھنے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہیں، خوش ہو گئے یہ اس بات پہ کہ یہ عورتوں کے ساتھ شامل ہو کے بیٹھیں یعنی ان کی غیرت ہی ماری گئی، ان کو حیا ہی نہیں آیا پیچھے چوڑیاں پہن کے گھروں میں بیٹھ جانا جس طرح عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں یہ کوئی مردوں کا کام ہے؟ یہ پسند کرتے ہیں اس بات کو کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ ہو جائیں، ان کے دل ہی مسخ ہو گئے ان کے دلوں پہ ہی مہر ہو گئی اب یہ سمجھتے نہیں کہ حیا کیا ہوتی ہے؟ مردانگی کیا ہوتی ہے؟ اور بے حیائی کیا ہوتی ہے؟

لیکن اللہ کا رسول اور وہ لوگ جو اللہ کے رسول پہ ایمان لائے ہیں جب بھی اس قسم کا اعلان ہوتا ہے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو تو وہ چھٹی کی درخواستیں لے کے نہیں آتے بلکہ وہ تو مال اور سر اللہ کے راستے میں پیش کرتے ہیں، اللہ کے رسول کے سامنے جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، وہ جہاد کرتے ہیں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ "أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ" انہی کے لیے خوبیاں ہیں "أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" اور یہی لوگ

فلاح پانے والے ہیں "اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ جَنّٰتٍ" اللہ تعالیٰ نے انہی کے لیے باغات تیار کیے ہیں " تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ " ان کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی "خٰلِدِیْنَ فِیْھَا" ہمیشہ ان باغات میں رہنے والے ہوں گے "ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ" یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ

آگئے جھوٹے بہانے والے لوگ بدووں میں سے تاکہ انہیں اجازت دے دی جائے اور بیٹھے رہے

الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

وہ لوگ جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اللہ اور اللہ کے رسول سے عنقریب پہنچے گا ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا

مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى

ان میں سے دردناک عذاب (۹۰) نہیں ہے کمزوروں پہ اور نہ

الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ

بیماروں پہ اور نہ ان لوگوں پہ جو نہیں پاتے ایسی چیز جو وہ خرچ کریں

حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ

کوئی حرج جبکہ وہ خیر خواہی کریں اللہ اور اللہ کے رسول کے لیے نہیں ہے نیکو کاروں پہ

سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ

کوئی الزام اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے (۹۱) اور نہ ان لوگوں پہ کوئی حرج ہے جس وقت وہ آپ کے پاس آئے

لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ

تاکہ آپ انہیں سوار کریں تو آپ نے کہہ دیا کہ نہیں میں پاتا ایسی چیز جس پہ میں تمہیں سوار کروں وہ اٹھ کے چلے گئے اور ان کی آنکھیں

تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا

بہہ رہی تھیں آنسوؤں سے غم کی وجہ سے اس بات پر کہ وہ نہیں پاتے ایسی چیز جس کو وہ خرچ کریں (۹۲) سوائے اس کے نہیں

السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ

الزام تو ان لوگوں پہ ہے جو آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں حالانکہ وہ مالدار ہیں پسند کیا انہوں نے

يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

کہ ہو جائیں وہ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ اور مہر کر دی اللہ نے ان کے دلوں پر پس وہ جانتے نہیں ہیں (۹۳)

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا

عذر بیان کریں گے تمہاری طرف جب تم لوٹو گے ان کی طرف آپ کہہ دیجیے تم عذر بیان نہ کرو

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ

ہم تم پہ یقین نہیں کریں گے بتا دیے ہیں اللہ نے تمہارے حالات ہمیں عنقریب دیکھے گا اللہ

عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

تمہارے عمل کو اور اس کا رسول بھی پھر تم لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو جاننے والا ہے غیب اور حاضر کو

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا

وہ خبر دے گا تمہیں ان کاموں کی جو تم کام کرتے تھے ﴿۹۴﴾ عنقریب وہ قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب

انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ

تم لوٹو گے ان کی طرف تاکہ تم اعراض کر جاؤ ان سے آپ منہ موڑ لو ان سے بے شک وہ

رِجْسٌ ۫ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ

ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے بدلہ کے طور پر ان کاموں کے جو وہ کرتے تھے ﴿۹۵﴾ وہ قسمیں کھائیں گے

لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى

تمہارے لیے تاکہ تم راضی ہو جاؤ ان سے پس اگر تم ان سے راضی بھی ہو گئے بے شک اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا

عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ

نافرمان لوگوں سے ﴿۹۶﴾ بدو لوگ زیادہ سخت ہیں ازروئے کفر اور نفاق کے اور یہ زیادہ لائق ہیں

اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

اس بات کے کہ نہ جانیں اس دین کی حدود کو جو اللہ نے اتاری ہیں اپنے رسول پہ اللہ علم والا ہے

حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ

حکمت والا ہے ﴿۹۷﴾ بدویوں میں سے بعض وہ ہیں جو قرار دیتا ہے اس مال کو جو وہ خرچ کرتا ہے تاوان اور انتظار کرتا ہے

بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾

تمہارے متعلق گردشوں کا انہی پر ہی بربادی گردش کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۹۸﴾

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا

بدویوں میں سے بعض وہ بھی ہے جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یوم آخرت پر اور سمجھتا ہے اس چیز کو جس کو وہ

يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ

خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربت کا ذریعہ اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ خبردار ان کے مال ان کے لیے قربت ہیں

سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾ وَالسّٰبِقُوْنَ

عنقریب داخل کرے گا اللہ انہیں اپنی رحمت میں بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۹۹﴾ وہ لوگ جو سبقت لے جانے والے ہیں

الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ

سب سے پہلے مہاجرین اور انصار میں سے اور وہ لوگ جنہوں نے ان کی اتباع کی اچھے طریقے سے

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

راضی ہو گیا اللہ ان سے اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور تیار کیے ہیں اللہ نے ان کے لیے باغات جاری ہوں گی

تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

ان کے نیچے سے نہریں ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے یہ بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۰۰﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط و خلاصہ مضامین:

پہلے ان منافقوں کا ذکر آیا تھا جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور ان آیات میں ان کا ذکر کیا جا رہا ہے جو مدینہ منورہ سے باہر ملحقہ علاقہ میں رہتے تھے، باہر جنگل میں دیہات میں رہتے تھے یہ لوگ چونکہ شہری آبادی سے دور ہوتے ہیں اور اللہ کے رسول کے پاس ان کی آمد و رفت کم تھی اور مجلسوں میں بھی کم آتے تھے ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو اسلام کی خوبیاں دیکھ کر یا اسلام کے اندر جس قسم کی روحانیت ہے اس کو محسوس کر کے وہ

مسلمان نہیں ہوتے تھے بلکہ جیسے شہر کے اندر ایک مسلک آ گیا اس نے زور پکڑا اور اس کے سیاسی غلبہ اور اس کی طاقت سے متاثر ہو کر سطحی طور پر انہوں نے کلمہ پڑھ لیا، اس کی حقیقت سمجھنے کی کوشش نہ کی، علم حاصل نہ کیا، سرور کائنات ﷺ کی مجلسوں میں نہ آئے بلکہ باہر جنگلوں میں، دیہاتوں میں اور اپنے جانوروں میں وہ لوگ مشغول رہتے تھے اس قسم کے جو لوگ تھے وہ قلبی طور پر مسلمان کم تھے یہی وجہ ہے کہ جب فتنۂ ارتداد بڑھا، سرور کائنات ﷺ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ آگ بھڑکی تو اس آگ کا زیادہ تر ایندھن انہیں بدویوں اور دیہاتیوں سے مہیا ہوا، زیادہ تر یہ فتنہ انہی میں پھیلا ہوا تھا تو اللہ نے ان کا تذکرہ یہاں کیا ہے۔

لیکن ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی تھے جو بالکل سچے مسلمان ہوئے باوجود اس کے کہ وہ جنگل میں رہنے والے تھے گاہے گاہے وہ حضور ﷺ کی خدمت میں آتے تھے، صحبت میں بیٹھتے تھے، آپ ﷺ سے دعائیں لیتے تھے، اللہ کے راستے میں خرچ کرتے تھے، ان کی ساتھ ساتھ تعریف بھی کر دی گئی ہے جس طرح مشکوٰۃ شریف میں "باب المزاح" کے اندر ظاہر بن حرام کا قصہ آیا ہوا ہے، وہ بھی تو بدوی تھا جس کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا "ظاهر باديتنا و نحن حاضرة" یہ ہمارے بدوی ہیں اور ہم اس کے شہری ہیں، رسول اللہ ﷺ اس کے ساتھ کتنی محبت کرتے تھے اور وہ حضور ﷺ کے ساتھ کتنی محبت کرتا تھا تو باب المزاح کے اندر مشکوٰۃ شریف میں یہ واقعہ گزرا ہے تو اس قسم کے لوگوں کی ساتھ تعریف بھی کر دی گئی تو یہاں ابتدائی آیات انہی دیہاتیوں کے بارے میں ہیں اور درمیان میں جو صحیح عذر کرنے والے تھے یعنی صحیح معذور تھے ان کا ذکر بھی کر دیا تاکہ جو لوگ جہاد سے پیچھے بیٹھے رہے ہیں کہیں سننے والے ان کو ایک ہی ڈنڈے سے نہ ہانک لیں کہ جتنے تھے سب ایک ہی جیسے ہیں اور جتنی مذمتوں کی آیتیں ہیں وہ سب ان پہ صادق آتی ہیں اور جتنے ہی عذر کرنے والے ہیں سب ہی جھوٹے ہیں، ایسی بات نہیں، اللہ کی کتاب میں بہت اعتدال ہے، واقعات بیان کرنے میں پوری پوری بات کو نقل کیا جاتا ہے تاکہ کہیں غلطی سے مخلصین پر بھی ان آیات کو فٹ نہ کیا جائے جو جھوٹے بہانے کرنے والوں کے بارے میں اتری ہیں اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان کو مستثنیٰ کر دیا گیا کہ یہ لوگ واقعی معذور ہیں اگر ان میں سے کوئی پیچھے رہ جائے تو اس میں کسی قسم کا کوئی حرج نہیں درمیان میں وہ آیات آئی ہوئی ہیں۔

قاعدہ:

" اَلْمُعَذِّرُوْنَ " یا تو یہ باب افتعال سے ہے "اعتذر يعتذر معتذرون" تا کو دال سے بدل کے ذال کا ذال میں ادغام ہوا ہے یا یہ باب تفعیل سے ہے، "اعتذر" جس وقت باب افتعال سے اپنے ظاہر پر ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے عذر بیان کرنا جس میں دونوں احتمال ہوتے ہیں کہ عذر صحیح ہے یا غلط، جو جھوٹ موٹ کا عذر کر رہا

ہو اس پر بھی "اعتذر" صادق آتا ہے اور جو صحیح عذر پیش کر رہا ہو اس پر بھی "اعتذر" صادق آتا ہے لیکن جس وقت تاء کا ذال میں ادغام کریں گے یا اس کو باب تفعیل پہ لے جائیں گے تو پھر اس کے مفہوم میں جھوٹا عذر ہی داخل ہوتا ہے پھر اس میں سچائی کا احتمال نہیں ہوتا تو یہاں "اَلْمُعَذِّرُوْنَ" ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف جھوٹا عذر بیان کرنے والے ہیں۔

"وَجَاءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ" کا مفہوم:

اب بدوی جو کہ غیر مخلص تھے ان کی بھی دو قسمیں ہو گئیں بعض تو ایسے تھے کہ جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جھوٹ موٹ بہانے لے کے آ گئے اور اپنی کوئی مجبوری ظاہر کر دی کہ ہم نہیں جا سکتے، ہم مجبور ہیں اور بعض ایسے تھے جنہوں نے صرف زبان سے کلمہ پڑھا تھا اور خالص جھوٹے تھے تو انہوں نے وہ ضرورت ہی محسوس نہیں کی ویسے بیٹھے رہے، یہ بدوی جو تھے جن کے دل میں ایمان نہیں اترا تھا نفاق تھا وہ بعض تو ایسے تھے کہ جنہوں نے اپنی بات کو ظاہری طور پر نبھایا تو کم از کم وہ بہانہ کرنے کے لیے آ گئے چاہے وہ بھی جھوٹے تھے اور جو بالکل جھوٹے تھے جن کے دل میں اللہ کی اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی کسی قسم کی عظمت نہیں تھی اور انہوں نے دل سے ایمان قبول نہیں کیا تھا تو ایسے لوگ ویسے ہی بیٹھے رہے وہ آئے ہی نہیں تو پہلی آیت میں دونوں فریقوں کو ذکر کیا ہے۔

"وَجَاءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ" بدویوں میں سے بعض جھوٹے بہانہ باز آ گئے تا کہ ان کو اجازت دے دی جائے "وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" اور جو اللہ اور اللہ کے رسول کے معاملہ میں بالکل جھوٹے تھے ویسے ہی بیٹھے رہے انہوں نے تو کوئی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کوئی عذر کریں، ان میں سے جو لوگ کافر ہیں جنہوں نے توبہ نہیں کی اور اپنے دل سے کفر کو نہیں مٹایا تو ان کو عذاب الیم پہنچے گا، کافر رہیں گے اگر دل کے اندر کفر ہے اگر یہ توبہ کر لیں تو پھر یہ کفر زائل ہو جائے گا جب کفر زائل ہو گا تو اللہ کی رحمت آ جائے گی لیکن جو نہیں جذبات پہ رہیں گے توبہ نہیں کریں گے ان کے لیے عذاب الیم ہے۔

"لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى" کا مفہوم:

آگے سچے معذوروں کا بیان آ گیا اگر کوئی شخص کمزور ہے، کمزور سے مراد ہو جائے گا جو بوڑھا ہے اس کے بدن میں اتنی طاقت نہیں یا بعض لوگ جو خلقی طور پر چاہے عمر کے کسی حصے میں ہوں ان میں اس قسم کی کمزوری ہوتی ہے کہ نہ سفر میں جا سکتے ہیں نہ دشمن سے مقابلہ کر سکتے ہیں اس قسم کے ضعفاء اور کمزور یا بیمار ہیں اور سفر کے متحمل نہیں

یادہ لوگ ایسے ہیں جن کے پاس خرچ کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیونکہ یہ سفر جو پیش آرہا تھا اس وقت غزدہ تبوک کا بہت ہی لمبا سفر تھا اس لیے سرور کائنات ﷺ نے تیاری کا حکم دیا اور جس کے پاس سواری نہیں تھی اس کو بھی معذور سمجھا گیا کہ وہ اگر نہ بھی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اتنا لمبا سفر بغیر سواری اور بغیر سامان کے کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے تو جن کے لیے یہ سامان نہیں تھا وہ تو بالکل صحیح طور پر معذور تھے "لَا یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ "نہیں پاتے اس چیز کو جس کو وہ خرچ کریں ان پر کوئی حرج نہیں، اللہ کی طرف سے ان کو کوئی ملامت نہیں ہے اور ان کا کوئی نقصان نہیں ہے اور یہ واقعی طور پر معذور ہیں لیکن ان کے ساتھ بھی قید لگا دی "اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ " ان لوگوں کے دلوں میں اللہ اور اللہ کے رسول کی خیر خواہی ہونی چاہیے پھر اگر گھر میں بھی بیٹھے رہے تو کوئی حرج نہیں، اللہ اور اللہ کے رسول کی خیر خواہی کس طرح سے ہو جس طرح ایک جماعت جہاد کے لیے چلی گئی ہے اور پیچھے بعض لوگ ایسے ہیں جو عذر کی بناء پر بیٹھے ہیں، دل ان کا ہمیشہ اس جماعت کی طرف لگا ہوا ہے، دل سے دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! ان کو فتح دینا اور سلامتی کے ساتھ یہ لوگ واپس آجائیں، کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے اور نہ پیچھے کوئی افواہیں اڑاتے ہیں اور نہ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس قسم کے مخلص اگر کسی عذر کی بناء پر گھروں میں بیٹھے رہیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اور کوئی بیمار گھر رہ گیا کمزوری کی بناء پر لیکن پیچھے وہ حرکتیں ایسی کرتا ہے اور افواہیں اڑاتا ہے اور اس کے دل میں اس قسم کے جذبات اٹھتے ہیں کہ ان لوگوں کا ذرا سر کوٹا جائے تو ٹھیک ہے، یہ شکست کھائیں اور اس طرح کے ان کے دل میں جذبات ہیں تو پھر وہ بھی معذور نہیں چاہے کمزوری کی بناء پر گھر پڑا ہے اس کے لیے حرج ہے، ہاں جو خیر خواہ ہوتے ہیں وہ دعا کرتے ہیں، عذر کی بناء پر بیٹھے ہوئے ہیں ان کے متعلق تو سرور کائنات ﷺ نے فرمایا جس وقت وہ واپس آرہے تھے مدینہ کے قریب آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو مدینہ منورہ میں گھروں میں پڑے ہوئے ہیں لیکن وہ تمہارے ساتھ ثواب میں ہر معاملہ میں برابر کے شریک ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا یا رسول اللہ! باوجود اس کے کہ وہ گھروں سے نہیں نکلے، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں باوجود اس کے کہ وہ گھروں سے نہیں نکلے وہ تمہارے ساتھ ثواب میں برابر کے شریک ہیں اور یہ وہی ہیں جن کو صحیح عذر نے روک رکھا ہے اور ان کے دل تڑپتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہوتے اور ان کے دل میں اس قسم کی خواہشات کروٹیں لیتی ہیں تو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ثواب برابر سرابر دیتے ہیں ان کے لیے یہ بشارت ہے تو اللہ اور اللہ کے رسول کے لیے

خیرخواہی ہونی چاہیے، پھر گھر میں بھی بیٹھے رہیں تو کوئی حرج نہیں، یہ لوگ محسنین کا مصداق ہیں، یہ نیکوکار ہیں، اچھا کام کرنے والے ہیں، ان کے اوپر کوئی کسی قسم کا الزام نہیں، اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں وہ تو حقیقی کوتاہیوں کو معاف کردیتا ہے ان کی طرف سے تو کوئی کوتاہی ہے ہی نہیں وہ تو بیچارے مجبور ہیں۔

"وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَا اَتَوْكَ" کا مفہوم:

اوران میں بھی خصوصیت کے ساتھ ایک ٹولہ کا ذکر آیا ہے کہ جب جہاد کے لیے حضور ﷺ کی طرف سے اعلان ہوا تو کچھ لوگ آپ ﷺ کے پاس آئے اور آکر کہنے لگے یا رسول اللہ! ہم بھی جہاد کے لیے جانا چاہتے ہیں، ہمارے لیے کوئی سواری کا انتظام فرمادیں، ہمارے پاس سواری نہیں ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس کوئی ایسی سواری نہیں ہے جس پہ میں تمہیں سوار کردوں یا تمہیں کوئی جانور دے دوں جس پہ تم سوار ہوکے چلے جاؤ، آپ ﷺ نے بھی معذوری ظاہر کردی کہ اس وقت میرے پاس بھی کوئی گنجائش نہیں ہے اب ان کے دل میں رسول کے ساتھ جانے کی کتنی تڑپ تھی اوران کو جہاد کا کتنا شوق تھا، وہ کس طرح سے اللہ کے راستے میں جان کی بازی لگانا چاہتے تھے تو اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ جب وہ مایوس ہوگئے کہ نہ ہمارے پاس کچھ ہے اور نہ دربار رسالت سے کوئی امداد ملی ہے کہ ہم وہ اسباب مہیا کرکے ساتھ چل لیتے تو بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

یہ علامت ہے اس بات کی کہ ان کے دل میں صحیح تڑپ تھی اور وہ جانا چاہتے ہیں لیکن مجبوری کی بناء پر وہ اس سعادت سے محروم ہوتے ہیں تو ایک ایک بال ان کا گواہی دیتا ہے کہ ان کو شوق تو تھا اگر رہ گئے تو مجبوری کی بناء پر رہ گئے، اس جذبے سے ان کے دل سے پانی ٹپکا، دل کے شوق ذوق نے جو آنسوؤں کی صورت اختیار کی تو اللہ نے ان آنسوؤں کی بھی اپنی کتاب میں قدر کی، دیکھو! ان کو بھی ضائع نہیں کیا، اللہ نے کتاب کے اندر ذکر کرکے یہ آنسو بہانے والوں کے آنسوؤں کو ذکر دوام بخشا ہے جس سے معلوم ہوگیا کہ اگر ایک نیک آدمی کسی نیکی کے کرنے پر قادر نہیں اوراس کے دل کے اندر تڑپ ہے اس نیکی کو کرنے کی تو اس محرومی کی بناء پر اس کے آنسو ٹپکتے ہیں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قدر ہیں تو ان کو "لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ" میں سے اس گروہ کو علیحدہ کرکے ذکر کیا ہے اوران کا شرف ظاہر کیا ہے اوران کے خلوص کے اوپر ان کے آنسوؤں کو دلیل بنایا ہے کہ اگر یہ مخلص نہ ہوتے تو یہ اسباب مہیا نہ ہونے کی صورت میں روتے کیوں؟ روتے ہوئے اٹھ کے جارہے ہیں جس سے معلوم

ہوتا ہے کہ ان کا جی تو بہت چاہتا تھا، طلب تو بہت ہے لیکن کیا کریں مجبوری ہے تو ان کے آنسوؤں کو اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر کر کے ان کو دوام بخشا ہے اور اس گروہ کو باقیوں سے ممتاز کر کے ذکر کیا ہے، اللہ کی دربار میں رو لینا کسی نیکی کے اسباب مہیا نہ ہونے پر یہ بھی اللہ کے ہاں بڑی قدر کی چیز ہے "وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ إِذَا مَآ أَتَوْكَ" اور ان لوگوں پر بھی کوئی حرج نہیں کہ جب وہ آئے آپ ﷺ کے پاس تاکہ آپ انہیں سوار کر دیں، آپ نے کہہ دیا کہ میں نہیں پاتا ایسی چیز جس پہ میں تمہیں سوار کروں اور وہ لوگ آپ کی مجلس سے اٹھ کے چلے گئے اس حال میں کہ ان کی آنکھیں آنسوں بہا رہی تھیں، ان کی آنکھیں بہہ رہی تھیں آنسوؤں سے "فاض یفیض" بہنا، ان کی آنکھوں سے آنسوں بہہ رہے تھے، لفظی معنیٰ ہے کہ ان کی آنکھیں بہہ رہی تھیں آنسوؤں سے، حاصل یہ ہے کہ ان کی آنکھیں آنسوں بہا رہی تھیں، آنسوں کیوں بہا رہی تھیں اس بات پر صدمہ اور غم کرنے کی وجہ سے کہ وہ نہیں پاتے وہ چیز جس کو اللہ کے راستے میں خرچ کریں، ان کو مال نہیں مل رہا جس کو وہ خرچ کریں اللہ کے راستے میں جہاد کریں، اس پر ان کو اتنا حزن اور دکھ ہوا کہ بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسوں بہنے لگے، ان پہ کیا حرج ہے؟ کوئی حرج نہیں ہے۔

"إِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَأْذِنُوْنَكَ" کا مفہوم:

الزام تو ان لوگوں پہ ہے جو آپ سے اجازت لینے آجاتے ہیں "وَهُمْ أَغْنِيَآءُ" حالانکہ وہ غنی ہیں، سب کچھ موجود ہے، خرچ کرنے کے لیے اسباب ان کو مہیا ہیں لیکن آپ سے اجازت لینے کے لیے آجاتے ہیں الزام تو ان لوگوں پہ ہے، یہ راضی ہیں اس بات پہ کہ عورتوں کے ساتھ شامل ہو کے گھروں میں بیٹھے رہیں، دیکھو! یہ ان کی مذمت کا پہلو ہے یعنی ایسے موقع پر دبک کے بیٹھنا یہ تو چوڑیاں پہننے والی عورتوں کا کام ہوتا ہے ان مردوں کو حیا نہیں آتی جو عورتوں کے ساتھ شامل ہو کے ایسے موقع پر پیچھے رہنا چاہتے ہیں جب ان کا ذکر کیا جا رہا ہے تو "خوالف" کے ساتھ محبت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ عورتوں کے ساتھ مل کے بیٹھ لینا اور بچوں کے ساتھ مل کے بیٹھ لینا، زنانیوں کے ساتھ مل کے بیٹھ لینا ہی ان کو اچھا لگتا ہے، خوش ہو گئے اس بات کے ساتھ کہ وہ رہ جائیں "خوالف" کے ساتھ، پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ، اللہ نے ان کے دلوں پہ مہر کر دی یہ جانتے نہیں، اس قسم کی بات کو اب یہ سمجھتے نہیں ان کی اہمیت ختم ہو گئی۔

"يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ" کا مفہوم:

اور جس وقت تم لوٹ کے مدینہ پہنچو گے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات سفر میں اتری تھیں مدینہ منورہ میں پہنچنے سے پہلے پہلے، جس وقت تم ان کی طرف لوٹ کے جاؤ گے تو یہ عذر کرنے کے لیے آجائیں گے، عذر کریں گے یہ تمہاری طرف جس وقت تم ان کی طرف لوٹ کے جاؤ گے تو صاف صاف کہہ دینا، ان کی باتوں میں آنے کی ضرورت نہیں "لَا تَعْتَذِرُوْا" مت کرو تم کوئی عذر، اب تمہارا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہے، تم غلط کہتے ہو، جھوٹے ہو "لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ" ہم تمہاری باتوں کی ہرگز نہیں تصدیق کریں گے، یقین نہیں کریں گے ہم تمہاری باتوں کا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے حالات بتا دیے ہیں، جب اللہ نے تمہارے حالات بتا دیے ہیں تو سچی بات وہی ہے جو اللہ نے بتائی ہے اب اگر اپنی زبان سے قسمیں کھا کھا کے خوش بھی کرنا چاہو گے تو ہم تمہاری بات کیسے مان سکتے ہیں؟ دیکھو! اگر کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے کوئی قوی دلیل مل جائے تب تو ہم اس کی زبان کا اعتبار نہیں کریں گے اور اگر اس کے جھوٹے ہونے کا کوئی قرینہ ہمارے سامنے نہ ہو تو مسلمان کا کام یہی ہے کہ جب کوئی عذر کرتا ہے تو اس کے عذر کو قبول کر لیا جاتا ہے لیکن یہاں تو اللہ تعالیٰ نے حقیقت ظاہر کر دی کہ یہ زبان سے کچھ کہتے ہیں، دلوں میں کچھ ہے عذر کریں گے تو انہیں کہہ دو اللہ نے ہمیں تمہاری خبریں بتلا دیں "وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ" آئندہ اللہ اور اللہ کا رسول تمہارا رویہ دیکھے گا کہ آئندہ کیا عمل اختیار کرتے ہو، تمہارا عمل تصدیق کرے کہ تم دل کے اعتبار سے سچے ہو صرف زبان سے نہیں، آئندہ کے لیے دیکھیں گے ہم کہ تم کیا عمل اختیار کرتے ہو اور پھر تم لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف پھر تم کو وہ خبر دے گا جو تم عمل کرتے ہو۔

عنقریب قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے لیے جب تم ان کی طرف لوٹ کے جاؤ گے، مقصد ان کا ہوگا کہ تم ان سے اعراض کرو، ان پہ تعارض نہ کرو، ان پہ ملامت نہ کرو، ان پہ کوئی سرزنش نہ کرو ان کا مقصد یہ ہے کہ یعنی اعراض معافی والا اعراض کہ ان کے حالات سے درگزر کر لیا جائے، ان کو کچھ کہا نہ جائے بلکہ ان کو سچا سمجھ لیا جائے، آپ ان سے منہ موڑ لیجیے، لیکن یہ اعراض ناراضگی والا اعراض ہے کیونکہ یہ ناپاک ہیں ان کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ملامت تو آدمی وہاں کرتا ہے جہاں سمجھنے کی توقع ہو، ان کا مقصد یہ ہے کہ تم ان کو کچھ نہ کہو انہیں پس اللہ کے سپرد کر دو یہ اللہ کی جہنم میں جائیں گے، جلیں گے، یہ جلدی جہنم میں ڈالنے کے قابل ہیں، توبہ کرنے کے قابل

نہیں یہ لوگ نجس ہیں "مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ" ان کا ٹھکانہ جہنم ہے "جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" جزا کے طور پر جو یہ کرتے تھے، قسمیں کھائیں گے تمہارے لیے یہ اللہ کی تا کہ تمہیں خوش کر دیں، تم ان پہ مطمئن ہو جاؤ "تَرْضَوْنَه" اگر تم خوش ہو بھی گئے تو اللہ ان بدمعاشوں سے خوش نہیں ہوتا اس لیے تمہیں خوش کر کے کیا پالیں گے یعنی اول تو تم ہی خوش نہیں ہو گے جیسا کہ بالفرض کے طور پر ہے کہ اگر تم خوش بھی ہو گئے تو کیا فائدہ جب اللہ ہی خوش نہیں ہے، یہاں خوب صفائی کے ساتھ جھوٹے بہانہ بازوں کو نمایاں کر دیا گیا ہے۔

"اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا" بدو لوگ شہریوں کے مقابلہ میں زیادہ اشد ہیں از روئے نفاق اور کفر کے "اشد" اسم تفضیل کا صیغہ ہے ان میں کفر اور نفاق زیادہ ہے اور یہ اس لائق ہیں کہ یہ اللہ کے اتارے ہوئے دین کی حدود کو نہ جانیں کیونکہ ان کے ہاں علم کا چرچہ نہیں ہے، حضور ﷺ کی مجلسوں کے اندر آتے نہیں ہیں، حضور ﷺ کی صحبت میں بیٹھتے نہیں ہیں تو اس قابل ہیں کہ یہ ان چیزوں سے جاہل رہیں، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

"وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا" کا مفہوم:

اور بعض بدوی ایسے ہیں، بعض اعراب ایسے ہیں کہ وہ جو کچھ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں اس طرح دبے دبائے خرچ کرتے ہیں جیسے ان کو کوئی جرمانہ ہو گیا ہو، جیسے کوئی مطالبہ کیا جائے کہ نیکی کا کام ہے اس میں کچھ دو تو ایک آدمی تو خوشی کے ساتھ دیتا ہے اور ایک آدمی اس طرح دیتا ہے کہ اگر میں نے نہ دیا تو لوگ کیا کہیں گے اور دل میں سمجھتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ خواہ مخواہ کا جرمانہ ہے، یہ بوجھ پڑ گیا تو برداشت کرو اس قسم کے جذبات دل میں ابھرتے ہیں تو یہاں انہی کا ذکر ہے کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو تاوان سمجھتے ہیں اور تمہارے متعلق وہ دوائر کے منتظر ہیں کہ تم کسی چکر میں آجاؤ، تم پر کوئی گردش پڑ جائے، ان کے دل میں یہ ہوتا تھا کہ یہ کہیں جائیں اور کوئی ان کو سنبھال لے اور ہماری جان چھوٹ جائے، آئے روز یہ مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو، صدقہ دو، زکوۃ دو ان سے جان اس طرح چھوٹے گی کہ یہ کہیں جائیں اور کسی مصیبت کا شکار ہو جائیں یعنی دل میں خیر خواہی نہیں تھی وہ یہ دیکھتے رہتے تھے کہ کہیں یہ پھنسیں اور ہماری جان چھوٹے اس قسم کے حادثات کے وہ تمہارے متعلق منتظر ہیں، انہی پر ہی بری گردش پڑنے والی ہے، یہ گردش مسلمانوں پہ نہیں آئے گی، ان کو تو دن بدن عروج

ملے گا، برا چکر انہی پر ہی پڑے گا، اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

مخلص بدویوں کا ذکر:

اور آگے اچھے اعراب کا ذکر کر دیا کہ بعض اعراب ایسے بھی ہیں جن کو اللہ نے خلوص دیا ہے، حضور ﷺ کی مجلس میں آتے جاتے رہتے ہیں، علم حاصل کرتے ہیں، اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، سب دیہاتی بھی ایک جیسے نہیں ہیں لیکن جہالت کی وجہ سے اکثریت ان کی ہے اور ان میں سے بعض اچھے بھی ہیں اور بعض بدوی ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور یوم آخرت پر جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ کے نزدیک قربت کا باعث سمجھتے ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں کیونکہ سرور کائنات ﷺ کی عادت تھی کہ جس وقت کوئی شخص صدقہ لے کے آتا تو آپ ﷺ اس کو دعائیں بھی دیتے تھے "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ" ان سے صدقہ لو اس سے ان کے مال پاک صاف ہوں گے اور ان کے لیے دعائیں بھی کرو تو حضور ﷺ کی عادت تھی کہ جو بھی صدقہ لے کے آتا تو آپ ﷺ اس کے لیے دعا بھی کرتے تھے اور اسی لفظ کے ساتھ کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ" کیونکہ قرآن کریم میں یہی لفظ آیا ہوا ہے، سمجھتے ہیں وہ اس مال کو جس کو وہ خرچ کرتے ہیں اللہ کے نزدیک قربت کا ذریعہ اور اللہ کے رسول کی دعاؤں کا ذریعہ "اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ" خبردار! یہ ان کے اموال جو وہ خرچ کیے ہوئے ہیں یہ ان کے لیے قربت کا ذریعہ ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی دعائیں تو وہ کانوں سے سن لیتے تھے اس کو ذکر کرنے کی کیا بات ہے؟ "سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ" عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا "اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

"اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ" کے مصداق کی توجیہات:

یہ خصوصیت کے ساتھ "السابقون الاولون" کی تعریف ہے "السابقون الاولون" کا مصداق کون ہیں؟ اس میں مختلف اقوال ہیں لیکن ان میں تعارض نہیں ہے بعض لوگ کہتے ہیں مہاجرین اور انصار میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے یہ "السابقون الاولون" ہیں اور قبلہ تبدیل ہونے کے بعد جو لوگ مسلمان ہوئے چاہے وہ مہاجر ہوں چاہے وہ انصار ہوں وہ "السابقون الاولون" نہیں

ہیں بلکہ دوسرے درجے کے لوگ ہیں یہ آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس وقت مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تھے تو اس وقت آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور اس کے بعد تحویل قبلہ کا حکم ہوا تھا جس کا ذکر دوسرے پارے کی ابتداء میں گزر چکا ہے اور جہاں یہ آیات اتری تھیں اس مسجد کو ذوقبلتین کہتے ہیں دو قبلوں والی مسجد ویسے تو مدینہ منورہ میں جو مسجدیں بنی ہوئی تھیں جیسے مسجد نبوی اور مسجد قباء ہے ان دونوں مسجدوں میں دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی گئی ہے تو ہر مسجد ہی ذوقبلتین ہے، اس مسجد میں دونوں قبلے ایک ہی نماز میں استعمال ہوئے ہیں اس لیے اس ایک مسجد کو ذوقبلتین کہا جاتا ہے تو اس کو ذوقبلتین اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں یہ آیات اتری تھیں، حضور ﷺ اس محلے میں تشریف لے گئے تو ظہر کی نماز کے وقت یہ آیات اتریں تو پہلی نماز کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے اس مسجد میں پڑھی گئی تھی، مسجد نبوی میں عصر کی نماز پہلی کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے پڑھی گئی تھی تو وہاں چونکہ یہ آیات اتری تھیں تو ان آیات کے اترنے کی وجہ سے اس مسجد کو ذوقبلتین کہتے ہیں تو اس دور میں جتنے لوگ مسلمان ہوئے وہ سب "السابقون الاولون" میں داخل ہیں اور اس کے بعد جو مسلمان ہوئے چاہے وہ ہجرت کر کے آئے یا وہ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے وہ دوسرے نمبر پہ ہیں۔

اور بعض حضرات نے "السابقون الاولون" کا فرق ذکر کیا ہے غزوہ بدر سے کہ بدر میں شریک ہونے والے اور بدر سے پہلے اسلام قبول کرنے والے "السابقون الاولون" ہیں اور بعد والے دوسرے نمبر پہ ہیں اور بعض نے صلح حدیبیہ کے اوپر اس کا مدار رکھا ہے کہ حدیبیہ کے واقعہ سے پہلے جو مسلمان ہو گئے وہ "السابقون الاولون" ہیں اور بعد والے دوسرے نمبر پہ ہیں اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مدار فتح مکہ پہ ہے اور اس کی صراحت آپ کے سامنے سورۃ حدید میں آئے گی "لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا" جو فتح مکہ سے پہلے اللہ کے راستے میں خرچ کرتے رہے اور فتح مکہ کے بعد جنہوں نے اللہ کے راستے میں خرچ کیا اور فتح مکہ سے پہلے جو اللہ کے راستے میں لڑتے رہے اور فتح مکہ کے بعد جنہوں نے قتال کیا یہ دونوں برابر نہیں ہیں لیکن "كُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ" اللہ نے حسنیٰ کا وعدہ سب کے ساتھ کیا ہے جس سے معلوم ہو گیا کہ چاہے "السابقون الاولون" ہوں چاہے بعد والے ہوں مہاجر و انصار جتنے تھے اللہ کی طرف سے اچھائی کا وعدہ سب کے ساتھ ہے اس لیے سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ

کے ہاں مغفور ہیں اگر چہ درجے میں برابر نہیں ہیں لیکن "کُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى" اللہ نے حسنیٰ کا وعدہ سب کے ساتھ کیا ہوا ہے تو "السابقون الاولون" کا مدار فتح مکہ کو بھی بنایا جا سکتا ہے۔

اور ایک توجیہ یہ ہے کہ مہاجرین اور انصار حضور ﷺ کے زمانہ میں جتنے مسلمان تھے وہ سارے کے سارے ہی "السابقون الاولون" ہیں بعد والی امت کے اعتبار سے تو اس توجیہ میں "من المہاجرین" کا "من" تبعیضیہ نہیں ہوگا باقی توجیہات میں من تبعیضیہ ہے کہ بعض مہاجرین وانصار "السابقون الاولون" کا مصداق ہیں اور بعض "السابقون الاولون" کا مصداق نہیں ہیں، اس توجیہ میں من بیانیہ ہے یعنی مہاجرین اور انصار جو "السابقون الاولون" کا مصداق ہیں اور ان کو "السابقون الاولون" کہہ دیا گیا مابعد کے اعتبار سے تو سارے مہاجرین اور انصار اس میں آجائیں گے۔

صحابہ کی اتباع اللہ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے:

وہ لوگ جو سب سے پہلے سبقت لے جانے والے ہیں یعنی مہاجرین اور انصار اور وہ لوگ جو ان کے پیچھے لگ گئے اچھے طریقے سے، نیک نیتی کے ساتھ اور خلوص کے ساتھ جنہوں نے ان کی اتباع کی، پہلی توجیہات کے مطابق اس کا مصداق ہوں گے دوسرے نمبر والے صحابہ اور آخری توجیہ کے مطابق اس کا مصداق ہوں گے تابعین جو صحابہ کے بعد والے دور کے ہیں، بہر حال ان لفظوں میں وسعت ہے کہ جو لوگ بھی صحابہ کی اتباع کریں گے ان کے لیے بھی یہی بشارت ہے کہ "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" اتباع صحابہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جیسا کہ آپ سامنے اہل حق کی علامات ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ نجات پانے والی جماعت، حق پر ثابت قدم رہنے والی جماعت وہی ہوگی "مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ" جو اس طریقے کی پابندی کریں گے جو میری طرف منسوب ہے اور جو میرے صحابہ کا طریقہ ہے تو گویا کہ اس کو بھی اتباع صحابہ کے لیے دلیل بنایا جا سکتا ہے کہ صحابہ کی اتباع اللہ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، جنہوں نے ان کی اتباع کی چاہے وہ دوسرے نمبر کے صحابہ مہاجرین اور انصار ہیں چاہے صحابہ کے دور کے بعد خلوص نیت کے ساتھ ان کی اتباع کرنے والے ہیں سب اس میں آجائیں گے، اللہ ان سے راضی ہو گیا وہ اللہ سے راضی ہو گئے، اللہ ان سے خوش ہے وہ اللہ سے خوش ہیں، تیار کیے ہیں اللہ نے ان کے لیے باغات جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں، یہ ان کے اندر ہمیشہ رہنے والے ہوں گے یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ

جو دیہاتی آپ کے اردگرد ہیں ان میں سے بعض منافق ہیں اور اہل مدینہ میں سے بھی بعض

مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۛ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ

جو اڑے ہوئے ہیں نفاق پر آپ ان کو نہیں جانتے ہم انہیں جانتے ہیں ضرور ہم عذاب دیں گے ان کو

مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠١﴾ ۚ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا

دو مرتبہ پھر یہ لوٹائے جائیں گے ایک بڑے عذاب کی طرف ﴿١٠١﴾ اور کچھ دوسرے بھی ہیں جنہوں نے اعتراف کرلیا ہے

بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ

اپنے گناہوں کا ملادیا انہوں نے نیک عمل کو اور دوسرے برے عمل کو قریب ہے کہ اللہ

يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً

ان کے اوپر توجہ فرمائے گا بے شک اللہ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿١٠٢﴾ لے لیجئے ان کے مالوں میں سے صدقہ

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ

اس کے ذریعہ سے آپ ان کو پاک کریں گے اور ان کا تزکیہ کریں گے اور ان کے لیے دعا کیجئے بے شک آپ کی دعا سکون کا باعث ہے

لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٣﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ

ان کے لیے ، اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿١٠٣﴾ کیا ان کو پتہ نہیں ہے کہ بے شک اللہ ہی توبہ قبول کرتا ہے

عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾

اپنے بندوں کی جانب سے اور لیتا ہے صدقات کو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿١٠٤﴾

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ

اور آپ کہہ دیجئے تم عمل کرتے رہو پس دیکھے گا تمہارے عمل کو اللہ اور اس کا رسول اور مومنین

وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾ ۚ

اور پھر تم لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو جاننے والا ہے غیب کو اور حاضر کو پھر تمہیں خبر دے گا ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے ﴿١٠٥﴾

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ

اور کچھ لوگ اور بھی ہیں جو مؤخر کردیے گئے ہیں اللہ کے حکم سے یا تو وہ ان کو عذاب دے گا یا رجوع کرے گا ان پر

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا

اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے (۱۰۶) اور وہ لوگ جنہوں نے بنائی مسجد نقصان پہنچانے کے لیے اور کفر کے لیے

وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

اور تفریق پیدا کرنے کے لیے مؤمنین کے درمیان اور پناہ دینے کے لیے ایسے شخص کو جس نے لڑائی لڑی اللہ اور اللہ کے رسول سے

مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ

اس سے قبل البتہ ضرور قسمیں کھائیں گے یہ لوگ کہ ہم نے نہیں ارادہ کیا تھا مگر اچھی بات کا اور اللہ گواہ ہے کہ بے شک یہ لوگ

لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ

جھوٹے ہیں (۱۰۷) قیام نہ کریں آپ اس مسجد میں کبھی بھی البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد رکھی گئی ہے تقویٰ پر

اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ

پہلے دن سے ہی حق دار ہے اس بات کی آپ کھڑے ہوں اس میں، اس مسجد میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں پاک رہنے کو

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى

اور اللہ پسند کرتا ہے پاک صاف رہنے والوں کو (۱۰۸) کیا وہ شخص جو بنیاد رکھے اپنی عمارت کی اللہ کے ڈر پر

مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا

اور اللہ کی رضا پر بہتر ہے یا وہ شخص جو بنیاد رکھے اپنی عمارت کی گرنے والی گھاٹی کے کنارے پر

جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ

پس وہ گھاٹی گر گئی اس بانی کو لے کر جہنم کی آگ میں اللہ تعالیٰ سیدھا راستہ نہیں دکھاتا ایسے لوگوں کو

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ

جو ظالم ہیں (۱۰۹) ہمیشہ رہے گی ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ان کے دل میں کھٹکے کا ذریعہ

اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع

مگر یہ کہ ان کے دل ہی ٹوٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۱۱۰﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

غزوہ تبوک کے موقع پر جو مختلف طبقات بن گئے تھے ان کا تذکرہ چلا آرہا ہے اور خاص طور پر منافقین کو بہت نمایاں کیا جارہا ہے اور ان کے بالمقابل مخلصین کی تعریف کی جارہی ہے، جس طرح پچھلی آیت مخلصین کی تعریف میں تھی اور آگے کچھ اسی طرح کے طبقات کا ذکر ہے۔

"وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ" کا مفہوم:

پہلے تو یہ ذکر کیا کہ ایسے منافق جن کو آپ نے پہچان لیا ہے یا جن کی نمایاں علامات ہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ صرف یہی منافق ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ مخفی اور گہرے منافق باہر دیہات میں اور تمہارے شہر میں اردگرد موجود ہیں یہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تا کہ مؤمنین کی جماعت زیادہ ہوشیار ہو جائے اور کبھی ان لوگوں کے دھوکہ میں نہ آئے ایک تو اس طرح اپنی جماعت کو ہوشیار کر دیا گیا، رسول اللہ ﷺ کو کہہ دیا گیا کہ ہر شخص قابل اعتماد نہیں ہے، بعض لوگ ابھی بھی تمہارے اردگرد ایسے موجود ہیں جن کا نفاق ابھی نمایاں نہیں ہے، علامات سے آپ ان کو نہیں پہچان سکتے ہیں اللہ ان کو جانتا ہے آپ ان کو نہیں جانتے اس میں سبق دے دیا کہ ہر آدمی اعتماد کے قابل نہیں، ہر کسی سے چوکس رہیں، پتہ نہیں کون کون لوگ ہیں جو منافق ہیں اور یہ بات کہنے کے ساتھ ان منافقوں پر بھی سرزنش ہوگئی کہ جو دل میں اتنا نفاق چھپائے ہوئے تھے، کسی بات اور کسی حال سے ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ ہم اندر سے مخلص نہیں ہیں ان کے سر پر بھی یہ چوٹ لگ گئی کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ دل کی گہرائیوں میں اگر تم نے کوئی مخالفت چھپا رکھی ہے تو وہ سب سے چھپی ہے ایسی بات نہیں ہے اس کو اللہ جانتا ہے اور جب چاہے گا اس کو نمایاں کر دے گا تو یہ ان لوگوں کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا ہے تا کہ وہ اگر سمجھنا چاہیں تو سمجھ جائیں، وہ یہ جان لیں کہ ہم اگر دل کی گہرائی کے اندر اسلام کی مخالفت کا جذبہ رکھیں گے تو وہ مخفی نہیں رہے گا، ہم بہت عقلمند بنے ہوئے ہیں، بہت ہوشیار بنے ہوئے ہیں کہ نہ کسی بات سے ظاہر ہونے دیتے ہیں اور نہ کسی حال سے ظاہر ہونے دیتے ہیں لیکن ان کو پھر بھی ہمارے مخفی جذبات معلوم ہیں تو اگر کسی کی قسمت میں توبہ ہوئی اور اگر کوئی سمجھنے والا ہوگا تو وہ سمجھ جائے گا۔

تو یہاں ہوشیار کر دیا کہ جب جماعت میں اس قسم کے لوگ موجود ہوں تو ہر کسی کی بات کو سن کے جانچ کے قبول کیا جائے تا کہ کسی کے دھوکہ میں نہ آئیں ورنہ اگر ہر کسی پر ظاہری طور پر اعتماد شروع ہو جائے کہ یہ بھی مخلص ہے، یہ بھی مخلص ہے تو مخفی عداوت رکھنے والے لوگ اسی طرح اخلاص کے پردے میں آتے ہیں اور اپنی بات کا یقین دلا کے اپنی کاروائی کر گزرتے ہیں، پتہ اس وقت ہی چلتا ہے جب کوئی خاصا نقصان ہو جاتا ہے جیسے ہمارے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی نصیحت کرتے ہیں کہ وہی آدمی اپنی جیب میں موتی کو محفوظ رکھ سکتا ہے کہ جو ہر کسی کو جیب تراش ہی سمجھے، جب ہر کسی کو جیب تراش سمجھے گا تو جیب محفوظ رہ جائے گی اور جب اعتماد کر لیا کہ یہ تو سارے صوفی ہیں، لاپرواہ ہو جائے گا، بے فکر ہو جائے گا تو کوئی جیب تراش آئے گا اور جیب کاٹ کے لے جائے گا تو اس طرح ماحول کے اندر چوکس رہنا چاہیے، ہر کسی کی بات کو اچھی طرح سے سنا جائے پھر اس کو جانچا جائے، اس کا نشیب و فراز دیکھا جائے تب جا کے اس کے اوپر اعتماد کیا جائے ورنہ بعض ایسی مخفی عداوتوں والے لوگ ہوتے ہیں جو نہایت مخلص بن کے آتے ہیں اور اخلاص کے پردے میں اس قسم کی باتیں کر جاتے ہیں، ایسے مشورے چھوڑ جاتے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں نقصان اٹھانے پڑتے ہیں، ہر آدمی پہ اعتماد نہ کیا جائے اور دوسری طرف انہیں بھی دھمکا دیا کہ یہ دنیا میں بھی ذلیل ہوں گے اور اللہ ان کو آخرت میں دردناک عذاب دے گا "سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ" ہم انہیں دو مرتبہ سزا دیں گے، اگر واقعی دو دفعہ مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں بھی اپنے نفاق کی سزا پائیں گے اور دوزخ میں بھی یہ سزا پائیں گے یہ دو دفعہ ہو گئی اور آگے جس عذاب کی طرف رد کرنے کا ذکر ہے اس سے آخرت کا عذاب مراد ہے یا مرتین تکرار کے لیے ہے کہ ہم انہیں بار بار سزا دیں گے، بار بار سزا یہی ہے کہ جب بھی مسلمانوں کو کامیابی نصیب ہوتی ہے تو یہ جلتے ہیں تو یہ بار بار سزا ہے اور پھر برزخ میں بھی ہوگی اور پھر آخرت میں جا کے بڑے عذاب کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔

پہلی آیت کا مضمون تو یہی ہے کہ جو اعراب تمہارے اردگرد ہیں ان میں سے بعض منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ سے بھی، یہ زیادہ جمے ہوئے ہیں نفاق پہ، ان کے دل سے نفاق ہلتا نہیں ہے آپ انہیں نہیں جانتے یعنی آپ اتنے زیرک ہیں، ہوشیار ہیں اور صاحب فراست ہیں لیکن ان کا نفاق اتنا مخفی ہے کہ اس کے اوپر علامت نمایاں نہیں ہے ہم انہیں جانتے ہیں، ہم عذاب دیں گے انہیں بار بار پھر یہ لوٹائے جائیں گے بڑے عذاب کی طرف، عذاب عظیم سے مراد قیامت کے بعد والا عذاب ہے اور مرتین کے اندر یا تو دنیا کی پریشانیاں مراد ہیں اور دوزخ کا عذاب

مراد ہے یا مرتین تکرار کے لیے ہے۔

غزوہ تبوک سے پیچھے رہنے والے مخلص صحابہ کی قبولیت توبہ کا ذکر:

"وَآخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ" اب یہ ایک اور طبقہ کا ذکر آ گیا، آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ جس وقت غزوہ تبوک پیش آیا تھا اس وقت لوگوں کے مختلف حالات ہو گئے تھے بعض تو مخلصین تھے اور مخلصین نے اعلان سنا اور فوراً تیاری شروع کر دی اور بعض مخلص ایسے تھے جن کے دل میں نفاق نہیں تھا، اسلام اور اہل اسلام کے لیے ہر طرح سے جانباز تھے، پہلے غزوات میں بھی شرکت کرتے رہتے تھے، ہر موقع پر انہوں نے جانثاری دکھائی لیکن اس موقع پر طبعی سستی کی بناء پر وہ پیچھے رہ گئے، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ میں شریک نہ ہو سکے، اس قسم کے دس آدمی تھے جن سے یہ کوتاہی ہوئی تھی وہ مخلص تھے، نفاق ان میں بالکل نہیں تھا لیکن طبعی سستی ہو گئی۔

اب یہ مخلص جو پیچھے رہنے والے تھے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے سات ایک جانب اور تین ایک جانب، سات تو ایسے تھے کہ جب ان کو پتہ چلا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ سے واپس آ رہے ہیں تو ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ہم تو بہت بڑی غلطی کر بیٹھے، ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا تو ان لوگوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا گویا کہ اپنے آپ کو مجرم قرار دے کے پیش کر دیا اور یہ کہا کہ یہ ہماری غلطی ہے، ہم اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کرتے ہیں، جس وقت تک اللہ کا رسول ہمیں خود نہیں کھولے گا ہم یہاں بندھے رہیں گے، کھانا چھوڑ دیا، پینا چھوڑ دیا، ہر قسم کی راحت کو چھوڑ دیا گویا کہ اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کر دیا یہ ایک قسم کی لجاجت ہوتی ہے کہ ہمیں معاف کر دیا جائے۔

اس بات پہ تعجب نہ کیجئے کہ ان لوگوں نے اس قسم کا اقدام کیا، آج کے اس مادی دور میں جب کہ پیٹ ہی انسان کا سب کچھ ہے تو کیا یہ مزدور طبقہ تنخواہ میں چند ٹکوں کے اضافہ کے لیے بھوک ہڑتال نہیں کرتا؟ ہڑتال کر کے بیٹھ جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر ہمارا مطالبہ نہ مانا گیا تو ہم اس طرح مر جائیں گے تو آج کے اس مادی دور میں پیسوں کی عظمت ہے، پیسوں کی قدر و قیمت ہے اس لیے پیسے حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ بھوکا مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن روحانی دور میں اللہ کی معصیت ہو جانے کے بعد انسان پہ یہ کیفیت ہو جاتی ہے گناہوں کی معافی کے لیے وہ سونا چھوڑ دے اور کھانا چھوڑ دے اور مرنے کے لیے تیار ہو جائے کہ یا تو مجھے معاف کر دیا جائے ورنہ میں اسی طرح بلک بلک کر اور تڑپ تڑپ کے جان دے دوں گا تو جس چیز کی عظمت کسی

کے دل میں ہوتی ہے اس کے لیے وہ ہر قسم کی بازی لگا دیتا ہے آج لوگ اپنے مطالبے منوانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے لوگ اپنے مطالبے منوانے کے لیے موت تک کا اقدام کر جاتے ہیں اور بھوک ہڑتال تو عام ہے کہ جہاں کسی کا مطالبہ نہیں مانا گیا وہ بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ جاتا ہے یہ ایک زبردست احتجاج ہوتا ہے کہ میرے مطالبہ کو مان لیا جائے۔

ان لوگوں کے لیے چونکہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے معافی کا اعلان ایک بہت بڑا مقصود تھا اور انہیں اپنی کوتاہی کا احساس ہوا تو وہ مرنے کے لیے تیار ہو گئے کہ بھوکے رہیں گے سوئیں گے نہیں، سب راحتیں چھوڑ دیں گے تو یہ ایک قسم کی لجاجت ہے کہ ہمیں معاف کر دیا جائے اور اس میں اپنے دل کی بے چینی کا اظہار ہے، ان سات نے تو اس طرح کر لیا تھا، ان سات میں سے خصوصیت کے ساتھ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا ذکر آتا ہے اور اس وقت جو مسجد نبوی میں ستون بنے ہوئے ہیں ترکوں نے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جہاں جہاں ستون تھے تو مسجد نبوی میں انہی جگہوں میں پختہ ستون بنائے گئے اور انہوں نے نشان باقی رکھے ہوئے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ مسجد نبوی تھی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی اس میں توسیع ہوئی تو ان ستونوں کے ساتھ ہی جن میں کوئی واقعہ پیش آیا ہوا ہے ان ستونوں کے اوپر لکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا، وہ ستون جس کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کے خطبہ دیا کرتے تھے بعد میں منبر بن گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پہ تشریف لے گئے وہ کھجور کا تنا رونے لگ گیا، بلکنے لگ گیا تھا، چیخنے لگ گیا تھا اس میں سے اس طرح رونے کی آواز آنے لگ گئی کہ جس طرح کوئی بچہ بڑی بے تابی سے روتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اتر کے آئے اور اس کو اپنے ساتھ لگایا اور تسلی دی تو وہ اس طرح ہچکی لینے لگ گیا جس طرح کوئی بچہ رو رہا ہو اور آپ اس کو چپ کرا دیں تو وہ ہچکیاں لیتا ہے تو وہ بھی بچوں کی طرح ہچکیاں لینے لگ گیا اس کو اسطوانہ حنانہ کہتے ہیں اور اس کا دوسرا نام اسطوانہ مخلقہ ہے اس کے بعد لوگ اس کے اوپر خوشبو چھڑکا کرتے تھے تو مخلقہ یہ خلوق سے ہے اور خلوق خوشبو کو کہتے ہیں تو اس کا نام اسطوانہ مخلقہ پڑ گیا۔

اور ایسے ہی حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے جس ستون سے اپنے آپ کو باندھا تھا اور اس کی توبہ قبول ہوئی تھی اس کے اوپر یہی نام لکھا ہوا ہے اسطوانہ توبہ یا اسطوانہ ابولبابہ جس سے معلوم ہوتا ہے یہ ابولبابہ رضی اللہ عنہ والا ستون ہے جس کے ساتھ ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو باندھا تھا تو وہاں مسجد کے اندر اس قسم کے نشانات باقی رکھے ہوئے

ہیں جن کے ساتھ ان کے زمانہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

جب سرور کائنات ﷺ تشریف لائے اور ان کو اس طرح اپنے آپ کو پیش کیے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت اللہ کی طرف سے ان کی توبہ کی اطلاع آجائے گی اس وقت میں بھی کھول دوں گا، جب انہوں نے خود کو اللہ کے سامنے پیش کر دیا تو اللہ جانیں اور یہ جانیں چند دن اس طرح رہے پھر اللہ کی طرف سے آیات اتریں جن میں ان کی توبہ کی قبولیت کا اشارہ ہے پھر سرور کائنات ﷺ نے ان کو جا کے کھولا اور اس طرح ان کا یہ جرم معاف ہوا۔

اور باقی تین رہ گئے انہوں نے اپنے آپ کو اس طرح بھی پیش نہیں کیا وہ تینوں ہی بہت اعلیٰ درجے کے لوگ تھے ایک کعب بن مالک رضی اللہ عنہ یہ بیعت عقبہ میں شریک ہونے والوں میں سے تھے جنہوں نے مکہ معظمہ میں ابتداء ابتداء میں بیعت کی تھی جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تھے اس بیعت کے اندر یہ شریک تھے اتنے اعلیٰ درجے کے تھے اور دوسرے دو تھے مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہ اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ یہ دونوں بدری ہیں اور اس کے بعد بھی حضور ﷺ کے ساتھ غزوہ میں شریک ہوتے تھے ان تینوں نے اپنے آپ کو وہاں باندھا نہیں تھا، جب آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے، آ کے مسجد میں بیٹھے جیسا کہ آپ ﷺ کی عادت تھی کہ جس وقت سفر سے تشریف لاتے تھے تو سیدھے مسجد میں آتے تھے، مسجد میں آ کے دو رکعتیں پڑھتے تھے پھر وہیں بیٹھ جاتے تھے اور لوگ ملاقاتوں کے لیے آتے تھے، جب ملاقاتوں سے فارغ ہوتے پھر اٹھ کے گھر جایا کرتے تھے۔

جس وقت آپ ﷺ مسجد میں بیٹھے تھے تو یہ کعب رضی اللہ عنہ آگئے ان کا بہت لمبا واقعہ بخاری میں آتا ہے، حاصل اس کا یہی ہے کہ جس وقت یہ آئے تو حضور ﷺ ان کی طرف دیکھ کے مسکرائے جس طرح کوئی غصہ والا آدمی دیکھ کے مسکراتا ہے اور پوچھا کہ کیا بات ہے تم کیوں نہیں گئے؟ انہوں نے صاف صاف بات کہہ دی کہ یا رسول اللہ! اگر ہم کسی دنیا دار کے سامنے ہوتے تو ہمیں اللہ نے جھگڑا کرنے کی بہت توفیق دی ہے کہ ہمیں بات بنانے کا بڑا طریقہ آتا ہے ہم ضرور بالضرور اپنے آپ کو بری الذمہ کر کے نکل جاتے لیکن آپ ﷺ کے سامنے ہم غلط بات نہیں کر سکتے اگر آپ کو آج خوش کر لیں گے تو اللہ کل کو ناراض کر دے گا اور آج اگر ہمارے سچ بولنے کی وجہ سے ناراض ہو بھی گئے تو ہمیں اللہ سے توقع ہے کہ ہماری توبہ قبول ہو جائے گی اور اللہ آپ کو خوش کر دے گا اصل بات یہ ہے کہ کوئی عذر نہیں تھا سوائے اپنی کوتاہی کے، کوئی عذر نہیں تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بہت اچھا کہ پھر جاؤ، یہ

معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اللہ کی طرف سے جو اطلاع آئے گی اس کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔

پچاس دن تک پھران کا بائیکاٹ رہا کوئی مسلمان ان سے بولتا نہیں تھا جس کا ذکر آگے آئے گا ان کا یہ حال ہوگیا کہ "ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ" دل ان کے تنگ ہوگئے، زمین ان کے لیے تنگ ہوگئی، پچاس دن بعد پھر اللہ کی طرف سے ان کی توبہ قبول ہوئی تو پھر ان کو بھی معاف کیا گیا اب اگلی آیات میں ان دونوں گروہوں کا ذکر ہے۔

"وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ" اور کچھ اور لوگ بھی ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا اور نیک عمل کو اور برے عمل کو خلط ملط کرلیا کہ ان کے پاس نیک عمل بھی ہیں لیکن ساتھ برے عمل کو بھی شامل کرلیا ہے اور یہ برا عمل تھا "تخلف عن الغزوہ" غزوہ سے پیچھے رہنا یہ برا عمل تھا جس کو ساتھ ملالیا "عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ" یہی اللہ کی طرف سے توبہ کی قبولیت ہے، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرے گا، اللہ تعالیٰ ان کے اوپر رجوع کرے گا لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی الفاظ سے سمجھا کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی کیونکہ "عسیٰ" کے لفظ کے ساتھ جو امید دلائی جاتی ہے یہ امید اللہ کی طرف سے وعدہ ہوتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا" کا مفہوم:

منافقین کے بارے میں آیا تھا کہ اگر یہ صدقہ کریں، اور اعلان کردو چاہے رضامندی کے ساتھ خرچ کرو چاہے کراہت کے ساتھ خرچ کرو تمہارے صدقات قبول نہیں ہیں اور ان کے صدقات ان کے لیے گناہوں کی معافی کا ذریعہ بنتے تھے اور نہ درجات کی بلندی کا ذریعہ بنتے تھے اور جنازہ پڑھنے تک کی ممانعت کردی گئی تھی کہ ان کے لیے استغفار کوئی مفید نہیں ہے پھر صراحت کے ساتھ آگیا کہ اگر یہ مرجائیں تو ان کا جنازہ بھی نہ پڑھو گویا کہ ان کے نفاق کی وجہ سے ان کو دو چیزوں سے محروم کیا گیا ہے ایک اس چیز سے محروم کیا گیا کہ ان کے صدقات قبول نہیں ہیں اور ان کے صدقات ان کے لیے صفائی ستھرائی کا ذریعہ نہیں بنیں گے اور دوسرا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں سے ان کو محروم کیا گیا ہے کہ اول تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا ہی نہیں کریں گے اور اگر کریں گے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا صراحتاً منع کردیا کہ ان کا جنازہ نہ پڑھنا۔

اب یہ لوگ عملاً اگرچہ منافقین میں شامل ہوگئے تھے جس طرح منافقین غزوہ سے پیچھے رہ گئے تھے یہ بھی

پیچھے رہ گئے لیکن قلبی جذبات کا فرق تھا اور اس غلطی کی انہوں نے سزا پائی تو اب آگے دونوں باتیں آگئیں کہ ان کے صدقات کو بھی قبول کرو اور ان صدقات کے ذریعہ سے ان کو صاف ستھرا کرو، ان کے ظاہری باطنی گناہ دھلیں گے، صاف ہوں گے کیونکہ اگر کسی شخص سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے بعد اگر انسان شرعی طریقے کے مطابق توبہ بھی کر لے تو ٹھیک ہے کہ آخرت کا وبال ٹل جاتا ہے لیکن دل کے اوپر اس گناہ کے اثرات رہ جایا کرتے ہیں کہ اگر ان کے ازالہ کی فکر نہ کی جائے تو خطرہ ہے کہ انسان پھر اس گناہ کے اندر مبتلاء ہو جائے گا اس لیے توبہ کرنے کے بعد بار بار استغفار اور اللہ کے راستے میں صدقہ خیرات یہ ہے جو قلب کو اچھی طرح صاف کرتا ہے۔

اب اس کے بعد وہ اپنے صدقات آپ کے پاس لائیں گے آپ ان کو قبول کیجئے اور ان صدقات کے ذریعہ سے ان کو صاف ستھرا کیجئے، اس سے ان کے دل میں زیادہ صفائی آئے گی، ان کی باطنی صلاحیتیں ابھریں گی "وَصَلِّ عَلَيْهِمْ" اور ان کے لیے دعا بھی کیجئے اس میں یہ بھی شامل ہے کہ ان کا جنازہ بھی پڑھنا ہے، زندگی میں بھی ان کے لیے دعا کرو اور آپ کی دعائیں ان کے لیے سکون کا باعث ہیں "وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ" اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

زکوٰۃ کی وصولی اور خرچ اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عادت اسی طرح تھی کہ جس وقت کوئی صدقہ خیرات کرنا ہوتا تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کے آیا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وصول کرتے تھے، زکوٰۃ میں تو حکم یہی تھا، ابتداء سے ہی زکوٰۃ کی وصولی حکومت کے ذمہ داری ہے، حکومت زکوٰۃ وصول کرتی ہے، صدقات وصول کرتی ہے پھر اس کو اس کے مصارف کے اوپر خرچ کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو ارتداد پھیلا تھا اس میں دونوں قسم کے لوگ تھے بعض تو وہ تھے جو بالکل ہی منکر ہو گئے وہ صحیح معنی میں مرتد تھے جنہوں نے زکوٰۃ کا انکار کر دیا کہ ہم نماز تو پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے یہ تو مرتد قرار پائے یہ تو کافر ہو گئے اور بعض وہ تھے جو کہتے تھے کہ ہم امام کے پیچھے نماز تو پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ امام کو نہیں دیں گے کیونکہ یہ خصوصیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" وہ کہتے تھے کہ صدقہ لینا صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی اب یہ زکوٰۃ ہم حکومت کو نہیں دیں گے تو جس وقت انہوں نے اس قسم کا انکار کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کو باغی قرار دے دیا اور ان کے ساتھ لڑائی ویسے ہی ہوئی جیسے باغیوں کے ساتھ ہوتی ہے اور آپ نے فرمایا کہ میں اس وقت تک ان سے لڑوں

گا جس وقت تک یہ ایک رسی جو حضور ﷺ کی طرف یہ ادا کرتے تھے اور میری طرف ادا نہیں کریں گے اس وقت تک میں ان کے ساتھ لڑوں گا حتیٰ کہ وہ رسی بھی میری طرف ادا کریں جو یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ادا کرتے تھے تو یہ نظام زکوٰۃ اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ حکومت زکوٰۃ اکٹھی کرے اور اس کے مصارف میں خرچ کرے۔

قومی اتحاد کے منشور نظام زکوٰۃ پر حضرت حکیم العصر مدظلہ کے خدشات:

آپ حضرات کو شاید یاد ہوگا کہ نظام مصطفیٰ کی جو تحریک چلی تھی اس میں قومی اتحاد نے الیکشن سے پہلے اپنا منشور شائع کیا تھا، میں نے جس وقت اس منشور کا مطالعہ کیا تو اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اگر قومی اتحاد کی حکومت قائم ہوگئی تو ہم نظام زکوٰۃ رائج کریں گے جس کا مطلب ہے کہ زکوٰۃ اور عشر حکومت وصول کرے گی اور اس کے مصارف پہ خرچ کرے گی، مطالعہ کرتے وقت جب میں اس دفعہ پہ پہنچا تو میں پیشانی پکڑ کے بیٹھ گیا کہ قومی اتحاد والوں نے جو یہ شوشہ چھوڑ دیا ہے اگر حکومت ان کی بن گئی اور انہوں نے اپنے منشور پہ عمل کیا اور نظام زکوٰۃ اور عشر جاری کر دیا تو کیا ضروری ہے کہ قومی اتحاد والوں کی حکومت بن جانے کے بعد سربراہ مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی ہوں گے؟ اس لیے زکوٰۃ اور عشر صحیح ہاتھوں میں جائے گا، صحیح طور پر وصول کریں گے اور صحیح طور پر خرچ کریں گے اور اگر حکومت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں چلی ہی گئی تو کیا یہ متوقع ہے کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بھی مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا ہی حاکم آئے گا جو زکوٰۃ صحیح طور پر وصول کرے گا اور صحیح طور پر خرچ کرے گا اور اگر بالفرض مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکومت نہ بنی اور بھٹو صاحب آگئے تو انہوں نے اچھا بھلا راستہ بھٹو صاحب کو دکھا دیا کہ زکوٰۃ اور عشر بھی حکومت وصول کر سکتی ہے اور جس طرح چاہے اپنے مصارف پہ خرچ کرے تو مدارس کا گلہ گھونٹنے کے لیے بھٹو صاحب کے ہاتھ ایک بہت شاندار ہتھیار آجائے گا کیونکہ مدارس کے لیے جو چیز روح کی حیثیت رکھتی ہے وہ تو صدقات اور زکوٰۃ ہی ہیں اور جس وقت ان کو حکومت وصول کرے گی تو اس طرح مدارس کی رگ حکومت کے ہاتھ میں آجائے گی تو اس وقت میرا دل دھڑکا تھا کہ یہ دفعہ ان کو اشاعت میں نہیں لانا چاہیے تھی اور اگر حکومت بن جاتی اور پھر اس قسم کا اقدام ہوتا تو بالکل صحیح تھا کیونکہ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ زکوٰۃ وصول کرے اور اپنی صوابدید کے مطابق اس کے مصارف پہ خرچ کرے۔

ہوا وہی کہ منشور قومی اتحاد نے دیا تھا اور اس کے اوپر عمل کرنے کی توفیق ہمارے صوفی (ضیاء الحق) کو ہوگئی اور جس وقت صوفی صاحب نے اعلان کیا تھا کہ زکوٰۃ ہم وصول کریں گے اور اس کی تقسیم کا انتظام بھی ہم کریں گے تو

پھر وہی خطرات سامنے آگئے کہ ان کے زکوۃ وصول کرنے کا طریقہ صحیح ہے یا غلط؟ ان کے اوپر ہم کیسے اعتماد کر سکتے ہیں کہ یہ صحیح مصرف میں خرچ کریں گے؟ یہ تو خود کھا جائیں گے پھر اس قسم کے خطرات ابھرابھر کے سامنے آگئے لیکن صوفی صاحب اس معاملہ پڑے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اس نظام کو صحیح چلانے کی توفیق دے جس وقت کوئی کام کسی غلط ماحول میں شروع کیا جاتا ہے تو ابتداء ابتداء میں اس کے اندر واقعی دشواریاں ہوتی ہیں اور کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں، علماء کا فرض ہے کہ گرفت کرتے رہیں اور ان کو صحیح مشورے دیتے رہیں اور اگر وہ دیانت دار ہوں گے تو علماء کے مشورے کے ساتھ اپنے اس قانون کے اندر ترمیم کرتے رہیں گے اور جس قسم کی خامیاں سامنے آئیں گی ان کا ازالہ کرتے رہیں گے تو اس طرح دوطرفہ تعاون اور علماء کی ہمدردانہ تنقید جو خیر خواہی کے ساتھ ہو اور ان کی طرف سے خیر خواہی کے ساتھ ان کے مشوروں کے اوپر نظر ڈالنا اور جس چیز کی نشاندہی علماء کریں اس کو اپنانا کوتاہیوں کو دور کرنا اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کچھ ہی دیر میں یہ نظم صحیح بھی ہو جائے گا۔

اور اگر ضد شروع ہوگئی کہ علماء صحیح طور پر ایک بات کہتے ہیں لیکن وہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اس کو اپنی عزت کا مسئلہ بنالیں تو پھر یہ عنوان اسلام کا ہوگا اور معاملہ سارے کا سارا گڑبڑ ہو جائے گا تو اس نظام کو جاری کرنے کا طریقہ اتحاد نے دکھایا ہے، اس قسم کے خطرات جو اس وقت میں نے محسوس کیے تھے کہ اگر یہ غلط ہاتھوں میں چلا گیا تو عنوان تو اچھا ہوگا لیکن معاملہ گڑبڑ ہوگا، اب اسی قسم کے خطرات سامنے آگئے، یہی باتیں کہی گئیں کہ یہ نظام دیانت دار ہاتھوں میں نہیں ہے، وصولی کا طریقہ صحیح نہیں ہے، اس قسم کے سارے خطرات ابھر کے سامنے آگئے بہر حال جو عنوان اس نے رکھا ہے وہ یہی ہے کہ چونکہ اسلامی حکومت ہے اور اسلامی حکومت کی وجہ سے زکوۃ اور عشر کا نظام انہی کے ذمہ ہے، اعلان کر دیا اب دیکھو! آگے کیا ہوتا ہے؟ بہر حال یہ راستہ قومی اتحاد کا دکھایا ہوا ہے۔

ادائیگی زکوۃ میں اصل فائدہ دینے والوں کا ہے:

"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ" اس کے اندر اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ صدقہ دینے والوں میں اصل فائدہ دینے والوں کو ہی ہوتا ہے کہ ان کی تطہیر اور تزکیہ ہوتا ہے پہلا فائدہ انہی کا ہے اور یہ دوسرا فائدہ ہے کہ اس سے مساکین کی ضرورت بھی پوری ہو جائے محتاجوں کو گزران مہیا ہو جائے، اس قسم کے فوائد ثانوی درجے میں ان کے ہیں، اول فائدہ دینے والوں کا ہے، ان کے ذریعہ سے یہ پاک صاف ہوتے ہیں اور ان کو

تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔

"اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡٓا" کیا ان کو پتہ نہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا ہے اپنے بندوں سے یہ ترغیب ہے توبہ کرنے کی کہ اگر پھر بھی کوئی برا کام ہو جائے تو اس طرح توبہ کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ صدقات قبول کرتا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ تواب اور رحیم ہے۔

"وَقُلِ اعۡمَلُوۡا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمۡ" کا مفہوم:

اور آگے ایک اور تنبیہ آگئی کہ جب ایک دفعہ غلطی کر بیٹھے، دیکھو! اس نے اپنی پچھلی تاریخ داغدار کر لی، پہلے مخلص چلے آرہے تھے اور اب یہ غلطی ہوگئی اور مخلصین کو غلطی پر رگڑا کچھ زیادہ ہی لگا کرتا ہے کیونکہ اس میں غصہ اسی بات پر ہوتا ہے کہ پہلے سے جب صاف چلے آرہے تھے تو اب اپنے دامن کو داغدار کیوں کر دیا؟ جو پہلے اعتماد تھا اس کو بحال کیوں نہیں رکھا؟ اس لیے جن کی عادت مخالفت کرنے کی ہوتی ہے، سازشیں کرنے کی ہوتی ہے ان کی طرف سے اگر کوئی مخالفت یا سازش سامنے آجائے تو انسان کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی ہے اور اگر اپنے یاروں اور دوستوں سے تھوڑی سی بھی کوئی کوتاہی ہوتی ہے تو تکلیف زیادہ ہوتی ہے، اسی طرح ان مخلصین کو رگڑا زیادہ لگا ہے، اس گروہ کو آئندہ کے لیے دھمکایا بھی گیا ہے کہ اب تو کوتاہی ہوگئی آئندہ دیکھتے ہیں کہ کیا کرتے ہیں اللہ اور اس کا رسول اور مؤمنین تمہارے عمل کو دیکھیں گے کہ آئندہ کے لیے تم کیا طرز عمل اختیار کرتے ہو اور اگر توبہ سچی ہوئی تو ایسی کوتاہی نہیں کروگے اور اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس طرح پھسل جاؤ گے۔

آپ کہہ دیجیے تم عمل کرو ضرور دیکھیں گے اللہ تمہارے عمل کو اور اس کا رسول اور مؤمنین اور عالم الغیب والشھادۃ کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے پھر وہ خبر دے گا تمہیں ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے۔

اور اسے ذکر ہے ان تین آدمیوں کا جن کی توبہ کو مؤخر کر دیا گیا تھا، اور کچھ اور بھی ہیں جن کو مؤخر کر دیا گیا ہے، ڈھیل دی گئی ہے اللہ کے حکم کی وجہ سے، اللہ کے حکم کے لیے کہ اللہ کا حکم کیا آتا ہے، یا اللہ انہیں عذاب دے گا یا اللہ ان کی توبہ قبول کرے گا اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے، یہاں ان کے معاملہ کو ابھی معلق کر دیا گیا ہے دیکھو! ان کا کیا حال سامنے آتا ہے چاہے اللہ انہیں عذاب دے چاہے ان کی توبہ قبول کرے اگلی آیات میں آپ کے سامنے آجائے گا کہ پھر ان کی توبہ قبول ہوگئی۔

مسجد ضرار کی تعمیر اور اس کا پس منظر:

"وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا" اب یہ بھی منافقین کے ایک ٹولہ کا ذکر ہے، جس وقت سرور کائنات ﷺ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے ہیں تو سب سے پہلے آپ کا قیام قباء میں ہوا ہے، یہاں اردگرد اوس قبیلہ آباد تھا اور رسول اللہ ﷺ جس جگہ جا کے ٹھہرے تھے اس مکان میں آجکل مدرسہ ہے، یہ حکومت کا بہت اچھا اقدام ہے کہ اس قسم کے جتنے بھی مقامات تھے حکومت نے ان جگہوں پہ مکتب اور لائبریریاں بنادی ہیں اور وہاں مسجد کی بنیاد رکھی گئی ہے جہاں حضور ﷺ نماز پڑھتے تھے، جس کو اب مسجد قباء کہا جاتا ہے اور اس کی فضیلت رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی کہ جو شخص گھر سے وضو کر کے مسجد قباء میں آ کے دو رکعت پڑھے تو اس کے لیے ایسے ہی ثواب ہے جیسا کہ اس نے عمرہ کرلیا تو جو لوگ مدینہ منورہ جاتے ہیں اور پھر وہ اکثر و بیشتر مسجد قباء میں نوافل پڑھنے کے لیے جاتے ہیں اور آپ ﷺ کی عادت بھی یہی تھی کہ آپ ﷺ کبھی سوار ہو کے یا کبھی پیدل مسجد قباء میں جایا کرتے تھے اور مسجد قباء کا جو امام ہے اس سے میری ملاقات ہوئی، عبدالحمید اس کا نام ہے، اوس قبیلہ میں سے ہے اس سے میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہمارے یہ باغات "مِنْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ" ہیں یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے چلے آرہے ہیں تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ انہی کی نسل میں سے ہیں تو اس نے کہا "ان شاء اللہ" یہ تبرک کے طور پر اس نے کہا، وہ اس علاقہ کا بہت بڑا عالم اور بہت بڑا زمیندار بھی ہے بلکہ حکومت میں محکمہ زراعت کا سربراہ بھی ہے اس سے تو مجھے پوچھنا اس وقت یاد نہ رہا، مسجد قباء کے سامنے ایک چھوٹی سی کتابوں کی دکان ہے اور اس دکان دار کا نام نصر اللہ ہے اور افغانستان کا رہنے والا ہے اور اس سے میری پہلی ملاقات بھی عبدالحمید کی مجلس میں ہوئی تھی تو اس نے کہا کہ کسی وقت میرے پاس آئیے تو پھر میں تمہیں سیر کراؤں گا تو ایک دن ہم چلے گئے تو اس نے ہمیں بنو قریظہ کا قلعہ دکھایا اور مختلف جگہوں کی سیر کرائی اور اس سے میں نے پوچھا کہ مسجد ضرار کہاں تھی؟ اس نے کہا کہ اس کا کوئی نشان متعین نہیں ہے لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ اب جہاں طہارت خانے بنے ہوئے ہیں یہاں مسجد ضرار تھی اور وہ اب مسجد سے زیادہ فاصلہ پہ نہیں ہے کیونکہ اب تو مسجد میں توسیع کردی گئی ہے تو اس نے کہا اب جہاں بیت الخلاء بنے ہوئے ہیں لوگ کہتے ہیں کہ مسجد ضرار یہاں تھی۔

سرور کائنات ﷺ کے زمانہ میں مسجد بہت چھوٹی ہوگی اور اگر مسجد درمیان میں بنائی ہو تو فاصلہ زیادہ نہیں ہے لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ فاصلہ اگرچہ زیادہ نہ ہو لیکن محلے والوں کو اس دوسری مسجد سے سہولت ہو جاتی ہے تو یہ مسجد قباء جو پہلے بنائی گئی تھی یہ وہ لوگ تھے جو مخلصین تھے اس کی تو بنیاد ہی اللہ سے ڈرنے پہ رکھی گئی تھی یہ تو مقبول ترین عمارت ہے، رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے اخلاص کے ساتھ اس کی بنیاد رکھی تھی اور وہاں کچھ منافق بھی تھے اور

منافق چونکہ در پردہ اسلام کے دشمن تھے تو وہ چاہتے تھے کہ ہمیں کوئی ایسا مقام یا ایسا اڈا مہیا ہو جائے کہ جہاں بیٹھ کے ہم مشورے کرلیا کریں اور جب مزاج ایک جیسا نہ ہو تو ایک مجلس میں اکٹھے بیٹھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے اور اس علاقہ میں ایک راہب تھا اس کا نام ابو عامر لکھا ہے قبیلہ بنو خزرج سے تعلق رکھتا تھا، عیسائی ہو گیا تھا اور راہبانہ زندگی گزار رہا تھا اور اس کا بیٹا ہے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جو غسیل الملائکہ ہیں، بہت مخلص مسلمان تھے، احد میں شہید ہوئے، فرشتوں نے ان کو غسل دیا ہے جس کا ذکر روایات میں آتا ہے، اس راہب کی ان منافقوں کے ساتھ کوئی سازباز تھی تو انہوں نے اپنے بیٹھنے کے لیے تجویز یہ بنائی کہ ایک مسجد کی شکل کی عمارت بنائی جائے تاکہ اس میں اکٹھا ہونا کسی کے نزدیک اشتباہ کا باعث بھی نہ ہو کیونکہ مسجد میں مسلمان اکٹھے ہوا ہی کرتے ہیں تو وہاں نماز کے بہانے سے اکٹھے ہو جایا کریں گے اور جو مشورہ ہو گا وہ مشورہ بھی کرلیا کریں گے اور اگر وہ ابو عامر آجائے تو اس کو بھی ٹھہرنے کے لیے جگہ مل جائے گی تو مسجد کی صورت بنا کے وہ ایک پردہ مہیا کرنا چاہتے تھے کہ اپنی سازش کے اوپر ایک پردہ پڑ جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے یارسول اللہ! ہم نے اپنے محلے میں ایک چھوٹی سی مسجد بنائی ہے، اندھیرے اور بسا اوقات بارش کی وجہ سے لوگ مسجد میں نہیں جاسکتے اگرچہ وہ پہلے سے بنی ہوئی ہے ہم نے ان کی سہولت کے لیے ایک مسجد بنائی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے ہاتھوں اس کا افتتاح ہو جائے، آپ تشریف لے آئیں ایک نماز پڑھ لیں تاکہ وہ مسجد برکت والی ہو جائے اور آپ کے ہاتھوں اس کا افتتاح ہو جائے، مقصد یہ تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں جا کے نماز پڑھیں گے تو گویا کہ ہر طرح سے ان کے لیے جواز مہیا ہو جائے گا کہ ہم نماز پڑھنے کے لیے وہاں نہ جایا کریں یہاں پڑھ لیا کریں کیونکہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں نماز پڑھی ہے تو یہاں بھی پڑھی ہے، حقیقت کے اعتبار سے انہوں نے اپنے لیے ٹھکانہ بنایا تھا اور صورت مسجد جیسی بنالی۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان دنوں غزوہ تبوک کی تیاری میں تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس طرح وعدہ فرمایا کہ اب تو فرصت نہیں، اب تو ہم جا رہے ہیں، واپسی پہ دیکھا جائے گا جس وقت واپس تشریف لا رہے تھے تو راستے میں یہ آیات اتریں جس میں ان کی سازش کو ظاہر کردیا کہ یہ مسجد نہیں اصل کے اعتبار سے یہ کفر کا اڈہ ہے۔

مسجدوں کا تعدد انتشار کا باعث ہے:

اور ان کا مقصد مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا ہے کیونکہ جب مسجد دوسری بنے گی تو نمازی لازماً دو حصوں میں بٹ جائیں گے اور اجتماعیت ختم ہو جائے گی، یہ مسجدیں جو زیادہ بنتی جا رہی ہیں اس کے ساتھ واقعی پارٹی بازی زیادہ

ہوتی ہے، آپس میں تفریق ہو جاتی ہے، مسجد ایک ایسی جگہ ہے کہ جہاں مسلمان پانچ وقت اکٹھے ہوں تو آپس میں ایک دوسرے کے حال سے بھی آگاہ ہو جائیں گے اور اکٹھے مل کے اللہ کی عبادت کر لیں گے تو آپس میں الفت اور محبت بھی رہے گی اور جہاں ذرا سا اختلاف ہوتا ہے تو وہاں فوراً دوسری مسجد بن جاتی ہے تو اس مسجد کے بننے کے ساتھ لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں جب دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، نماز بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل کے نہیں پڑھتے تو پھر آگے اختلاف زیادہ ہوتے ہیں کم نہیں ہوتے، ان کا مقصد ان مسلمانوں کے درمیان تفریق ڈالنا تھا اس لیے شرعی مزاج یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے مسلمان اکٹھے ہو کر نماز پڑھیں، جماعتیں متعدد نہ ہوں مثلاً جمعہ سارے شہر میں ایک جگہ ہو فقہ حنفی میں مسئلہ اسی طرح لکھا ہوا ہے کہ اصل تو یہی ہے کہ جمعہ ایک جگہ ہوتا کہ ہفتہ وار سارے مسلمان ایک جگہ جمع ہو جائیں اور اگر شہر دو حصوں میں تقسیم ہے مثلاً درمیان میں کوئی دریا ہے ادھر والوں کو ادھر جانے میں دقت ہے تو ایسی صورت میں دو جگہ جمعہ ہو سکتا ہے۔

لیکن جب مسلمانوں میں پھوٹ پڑی اور اکٹھے ہو کے ایک جگہ نماز پڑھنے پہ آمادہ نہ ہوئے تو پھر دو جگہ شروع ہوا، تین جگہ شروع ہوا، اب تو حال یہ ہے کہ محلے کی چھوٹی سی چھوٹی مسجد میں بھی جمعہ ہوتا ہے، مسلمان اب ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے کہ ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں، عیدیں علیحدہ ہونے لگ گئیں، جمعے علیحدہ ہونے لگ گئے اور مسلمانوں کی اجتماعیت پارہ پارہ ہوگئی۔

پہلے تو صرف مسلک کا اختلاف تھا مثلاً فقہ کے اعتبار سے لوگ مختلف المسلک تھے کوئی حنفی، کوئی شافعی، کوئی حنبلی، کوئی مالکی ہے اور کوئی اہل ظواہر میں سے ہے یہ اختلاف فقہی ہوا لیکن یہ فقہی اختلاف رواداری کے درجے میں تھا اور آج بھی یہ اختلاف رواداری کے درجے میں ہے جہاں مختلف مسلک کے لوگ ہیں وہ ان فقہی مسائل پہ نہیں لڑتے، حنفیوں کے پیچھے شافعی پڑھ لیتے ہیں اور شافعیوں کے پیچھے حنفی پڑھ لیتے ہیں، اب حرمین شریفین میں لوگ جاتے ہیں تو کسی مسلک کے ہوں وہاں کے ائمہ کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں چاہے وہ امام کسی مسلک کے ہوں جنہوں نے رفع یدین کرنا ہے وہ رفع یدین کرتا ہے اور جس نے نہیں کرنا نہ کرے۔

جس نے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی ہے پڑھے، جس نے نہیں پڑھنی نہ پڑھے، اس اختلاف کو برداشت کیا گیا ہے، اس فقہی اختلاف کے بعد لوگ اب بھی ایک مسجد میں اکٹھے ہوتے ہیں یہ مسلک کا اختلاف آپس میں بغض اور عداوت کا ذریعہ نہیں بنا جو اختلاف نفسیات سے پیدا ہوئے ہیں وہ بغض کا ذریعہ بنے جس طرح ہمارے علاقہ

میں دیوبندی اور بریلوی کا اختلاف ہوا ہے تو اس نے آ کے مسجدوں کو تقسیم کر دیا، ایک نظریہ کے لوگ ایک مسجد میں اکٹھے ہو گئے اور دوسرے نظریہ کے لوگوں نے علیحدہ مسجد بنالی، ایک سے دو مسجدیں بن گئی پھر آپس میں اتنا بعد ہوا کہ وہ ان کی مسجد میں نہیں جاتے اور یہ ان کی مسجد میں نہیں جاتے اور ایک دوسرے کی مسجد کو اس طرح سے دیکھتے ہیں گویا کہ یہ مسجد ہی نہیں کوئی بت خانے ہیں تو مسلمانوں میں اس طرح تفریق پیدا ہوتی چلی گئی، مسجدوں کا تعدد انتشار کا باعث بنتا چلا گیا۔

پھر یہ اختلاف تو تھا کہ مسجدیں علیحدہ ہو گئیں، اہل حدیثوں کی مسجدیں علیحدہ ہو گئیں اور دیوبندیوں کی علیحدہ ہو گئیں اور بریلویوں کی علیحدہ ہو گئیں۔

سیاسی اختلاف نے بھی مسلمانوں کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کر دیا:

پہلے تو یہ تفریق تھی اب یہ جو مصیبت آئی سیاسی اختلاف میں جو تشدد پیداء ہوا تو یہ حال ہو گیا کہ ایک سیاسی پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی کی مسجد میں نہیں جاتے اس طرح اس سیاسی تشدد کو منبر پہ لانے کے بعد مسجدوں کو ویران کیا گیا تو اس تجربہ کے بعد میری رائے تو یہ ہے کہ جمعہ میں ایسی تقریر ہونی چاہیے جو مشترکہ موضوع پہ ہو تذکیر آخرت ہو ذکر اللہ کی تلقین ہو کبائر سے احتراز کا ذکر ہو نیکی کی ترغیب ہو صحابہ کرام کی عظمت اور قرآن اور علم دین کی عظمت اور اس قسم کے موضوعات پہ خطبہ مشتمل ہونا چاہیے جس کو ہر خیال کا آدمی تسلی سے سن سکے باقی سیاست میں حصہ لینا یہ بھی نیک نیتی کے ساتھ اگر ہو تو یہ بھی عبادت ہے یہ بھی خدمت خلق ہے لیکن اس کا تشدد مسجد میں مناسب نہیں ہے تا کہ دوسرے لوگ مسجدیں چھوڑ نہ جائیں ہاں البتہ اگر سیاسی تقریر کرنی ہو تو پوری شدت کے ساتھ کریں لیکن اس کے لیے مسجد سے باہر کا پلاٹ تجویز کرو کہ جب بھی سیاسی جلسہ کرنا مقصود ہو تو پارک میں کسی پلاٹ میں ہو کسی کھلے میدان میں ہو مسجد میں نہ ہو ہر قسم کے لوگ آئیں اور آپ کی تقریریں سنیں جمعے کے خطبے کو اس چیز سے خالی ہونا چاہیے کیونکہ جمعے کے خطبہ میں اگر کسی قسم کا تشدد آ جائے تو پھر مخالف قسم کے لوگ اس خطبے میں بیٹھ نہیں سکتے یا تو وہ مسجد میں آئیں گے نہیں اور اگر آئیں گے دل میں بیٹھے کڑھتے رہیں گے اور جب امام کے ساتھ دلی تعلق ہوگا نہیں دماغ ادھر متوجہ ہوگا نہیں اس کے نماز پڑھنے کا کیا فائدہ؟ تو یہ سیاسی تشدد جس وقت یہ مسجدوں میں شروع ہوا یا خانقاہی بزرگ اس تشدد میں آ گئے تو جتنی کثرت کے ساتھ ان دس سالوں میں لوگ مدرسوں سے خانقاہوں سے اور مسجدوں سے دور ہوئے ہیں شاید اتنی تیزی کے ساتھ کبھی زوال نہیں آیا تھا حتیٰ کہ سمجھدار لوگ مجبور ہو گئے کہ مسجدوں

کے اندر لکھ کے بورڈ لگا دیئے کہ یہاں کسی کو سیاسی تقریر کرنے کی اجازت نہیں یا کسی کو یہاں کے منتظم کی اجازت کے بغیر تقریر کرنے کی اجازت نہیں تو جس جگہ اس اصول کی پابندی کی گئی وہاں آج مسجدوں میں رونق ہے لوگ کثرت کے ساتھ آتے ہیں اور جن مسجدوں کے اندر اس قسم کا تشدد شروع ہو گیا وہاں وہ مسجدیں ویران ہو گئیں۔

جب نماز میں لمبی قراءت برداشت نہیں تو سیاسی تقریر کیا چیز ہے؟

آپ نے فقہ کے اندر مسئلہ پڑھا ہوگا اور حدیث شریف کے اندر صراحتاً آتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ عشاء کی نماز پڑھانے لگے تو سورۃ بقرۃ شروع کر دی، قراءت لمبی کر دی اور پیچھے سے ایک آدمی نے نماز توڑ کے اپنی شروع کر دی اور نماز پڑھ کے چلا گیا لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے "اَنَافَقْتَ یَا فُلَانُ" اے فلاں! کیا تو منافق ہو گیا؟ تو نے جماعت کو کیوں چھوڑ دیا؟ وہ کہنے لگا میں منافق نہیں ہوا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کے یہ واقعہ ذکر کروں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! ہم پورا دن محنت مزدوری کرتے ہیں، سارا دن تو ہم مشقت کا کام کرتے ہیں، تھکے ہوئے رات کو آتے ہیں اور معاذ رضی اللہ عنہ یہاں سے دیر سے پہنچا اور عشاء کی نماز دیر سے پڑھائی اور سورہ بقرہ شروع کر دی، مطلب اس کا یہ تھا کہ اتنی لمبی نماز ہم نہیں پڑھ سکتے اور جماعت چھوڑنے پہ ہم مجبور ہیں تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وعظ میں کبھی اتنا غصہ میں نہیں دیکھا گیا جتنا اس دن وعظ میں غصے تھے اور فرمانے لگے کہ تم لوگوں کو متنفر کرتے ہو اور لوگوں کو بھگاتے ہو خبردار! اگر [illegible] کو نماز پڑھاؤ تو ہلکی نماز پڑھاؤ، اس میں کوئی ضرورت مند ہوتا ہے، اس میں کوئی بیمار ہوتا ہے جو زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا تو نماز ہلکی پڑھاؤ جس کو مقتدی برداشت کر لیں یعنی لمبی قراءت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں کیا جس کے نتیجہ میں نمازی کم ہو جائیں تو اس قسم کی سیاسی تقریروں کے ساتھ اگر نمازی بھاگتے ہیں تو کیا شرعی طور پہ یہ قابل برداشت ہے یعنی نماز میں قرآن کریم اتنا پڑھنا برداشت نہیں کیا جو مقتدی کی برداشت سے زیادہ ہو اور مقتدی تکلیف محسوس کرتے ہوئے اس امام کے پیچھے نماز پڑھنی ہی چھوڑ دیں کہ یہ بہت لمبی قراءت کرتا ہے اور ہم اتنی لمبی قراءت برداشت نہیں کر سکتے اس پہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی ناراض ہوئے اور فرمایا نماز میں قراءت اتنی ہی کرو جتنی تمہاری قوم برداشت کر سکے اس لیے طویل مناسب نہیں، طویل کے نتیجہ میں لوگ بدکتے ہیں اتنا اہتمام تھا لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے کہ امام کو پابند کر دیا کہ طویل قراءت سے احتراز کرے کہ لوگ کہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنا نہ چھوڑ دیں تو مسجدوں کی آبادی تو اس طرح ہو گی اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ مسجدوں کے اوپر رحم کرو پہلے تو تقسیم ہو گئیں دیوبندی بریلوی کی، شیعہ سنی

کی، اہل حدیث اور غیر اہل حدیث کی، اب تم سیاسی مسلک کے طور پر مسجدوں کو تقسیم نہ کرو، اس طرح امت کے اندر انتشار برپا کرنا مناسب نہیں ہے اس لیے مسجد نے ماحول کو ایسا رکھو کہ ہر مسلک کا آدمی آ کے نماز پڑھ سکے۔

ہاں البتہ سیاست میں حصہ لو سیاست میں حصہ لینا بھی عبادت ہے، خدمت خلق ہے، صحیح اصول پہ سیاسی زندگی انبیاء علیہم السلام نے بھی اپنائی ہے جیسا کہ حدیث شریف کے اندر آتا ہے "كَانَتْ بَنُوْاِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ" بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ میں تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی تو ہوگا نہیں، خلفاء کثرت کے ساتھ ہوں گے تو خلفاء سیاسی زندگی کا نشان ہیں، سارا سیاسی انتظام خلفاء کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو سیاست بھی دین کا ایک شعبہ ہے اور یہ ایک عبادت ہے لیکن اس کے لیے جب تقریر کرنی ہو اور اپنے نظریہ کو لوگوں میں پھیلانا ہو تو مسجد کی بجائے باہر کے میدان کو اختیار کرنا چاہیے تاکہ جس کا جی چاہے سنے، جس کا جی چاہے نہ سنے وہاں کوئی آئے یا نہ آئے اس کا کوئی الزام نہیں ہے اور اگر مسجدوں میں اس قسم کی باتوں کی وجہ سے نمازی کم ہونا شروع ہو گئے یا لوگ بٹنے شروع ہو گئے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب نہیں اس میں مسجدوں کی ویرانی ہے۔

مسجد ضرار کے واقعہ کا تتمہ:

تفریق بین المسلمین بہت بڑا جرم ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس مسجد کے بنانے والوں کے متعلق یہی نشاندہی کی کہ وہ دوسری مسجد بنا کے یہ تفریق بین المسلمین کا جرم کر رہے ہیں اور اس مسجد کے بنانے کا داعیہ کفر ہے اور یہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، اسلام کے مخالفین کو اپنی اس جگہ میں ٹھکانہ دینا چاہتے ہیں، یہ مسجد صحیح نیت کے ساتھ نہیں بنائی گئی اس لیے حقیقت کے اعتبار سے یہ مسجد نہیں ہے جب یہ مسجد نہیں ہے تو ہم آپ سے کہتے ہیں کہ آپ کبھی بھی اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے نہ جائیں۔

جب بھی قباء کی طرف جانا ہو تو اسی مسجد میں نماز پڑھو جس کی بنیاد مخلص ہاتھوں کے ساتھ تقویٰ کے ساتھ اٹھائی گئی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے یہ ساری نشاندہی کر دی گئی جب یہ نشاندہی کر دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ میں پہنچ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند افراد کو بھیجا اور انہوں نے جا کے مسجد کو آگ لگا دی، گرا دیا اور بے نشان کر دی اور سرے سے اس کو مٹا دیا۔

اب وہ لوگ جنہوں نے ایک سازش بنائی تھی اور وہ چال چلے تھے اور وہ چال کامیاب نہ ہوئی اور اس طرح ان کی بنی بنائی عمارت گر گئی یہ چیز ان کے دل کے اندر غصہ اور کینہ زیادہ پیدا کر گئی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ سارا

اقدام ان کے دل کے اندر ایسا تردد اور ایسا نفاق پیدا کر گیا کہ اب یہ مٹے گا نہیں، جب تک ان کے دل ہیں بطور کانٹے کے یہ مسجد ان کے دل میں چبھتی رہے گی مقصد یہ ہے کہ اب یہ نفاق کبھی بھی ان کے دل سے ختم نہیں ہوگا تو یہ آیات اسی منافقوں کے ٹولے کی نشاندہی کر رہی ہیں۔

آپس کے اختلاف کی وجہ سے وجود میں آنے والی مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے:

اور وہ لوگ جنہوں نے مسجد بنائی نقصان پہنچانے کے لیے اور کفر کرنے کی وجہ سے ”وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ“ اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے لیے یعنی اس عمارت کو بنانے کا داعیہ ایک تو مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے دوسرا اللہ کے ساتھ کفر کیونکہ دل کے اندر یہ کفر چھپائے ہوئے تھے اور تیسرا مقصد مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنا ہے، چوتھا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلہ میں لڑائی لڑ رہا ہے جو محارب ہے اسی ابو عامر راہب کی طرف اشارہ ہے اس کو ٹھکانہ دینے کے لیے، اس کو مورچہ مہیا کرنے کے لیے یہ عمارت بنائی ہے تو جنہوں نے ان مقاصد کے لیے یہ عمارت بنائی ہے یہ بھی منافقوں میں شامل ہیں، یہ برے لوگ ہیں، اب ان مقاصد کے تحت جو مسجد بنائی گئی تو صورتاً مسجد تھی حقیقتاً مسجد نہیں تھی اس لیے حضور ﷺ نے اس کو آگ لگوادی، گروادیا۔

اب جو مسلمانوں میں آپس میں پھوٹ پڑتی ہے اور پھوٹ پڑنے کے بعد دوسری مسجد بن جاتی ہے تو چاہے اس کی بنیاد آپس کا اختلاف ہی ہو لیکن یہ مقاصد اس میں نہیں ہوتے اس لیے اگر اختلاف کے نتیجہ میں دوسری مسجد کھڑی ہو جائے تو اس کو مسجد ضرار نہیں کہا جا سکتا وہ مسجد ہی ہوگی، اس کے احکام بھی مسجد والے ہی ہوں گے، اس کی توہین اور بے حرمتی جائز نہیں ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ فرقہ بازی کی بناء پر یہ اقدام جائز نہیں ہے لیکن اس مسجد میں نماز پڑھنا درست ہے، اس مسجد کو مسجد ہی سمجھا جائے گا کیونکہ ان کے یہ مقاصد نہیں ہوتے اس لیے اپنی مسجد کے مقابلہ میں اگر کوئی اختلاف کر کے دوسری مسجد بنائے تو چاہے یہ اقدام برا ہے کہ اس سے نمازیوں میں پھوٹ پڑ گئی، اس سے اختلاف پیدا ہو گیا لیکن اس کو مسجد ضرار نہیں کہا جا سکتا اس کے لیے یہ نہیں ثابت کیا جا سکتا کہ یہ جلانے اور گرانے کے قابل ہے جس طرح حضور ﷺ نے کیا تھا، وہ مسجد ہی ہوگی اور اس کے تمام احکام مسجد والے ہی ہوں گے اگرچہ اس مسجد کو بنا کے اچھا نہیں کیا چاہیے تھا کہ آپس کے اختلاف کو مٹانے کی کوشش کرتے، آپس میں متحد ہو کے رہتے اور مسجد ایک ہی رہتی، آپس میں مل کے نماز پڑھتے، آپس میں محبت ہوتی یہ اچھی بات تھی یہ اقدام غلط

ہے لیکن اس مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہیں گے یہ چار مقصد ذکر کیے گئے ہیں جن کے تحت ان لوگوں نے یہ مسجد بنائی تھی۔

"وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنٰى" کا مفہوم:

یہ تو ہمیشہ قاعدہ ہے کہ جھوٹا شخص کبھی بھی اپنے آپ کو جھوٹا نہیں کہتا بلکہ قسمیں اٹھا کے اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ قسمیں اٹھا کے کہیں گے کہ بڑی نیک نیتی کے ساتھ بنائی ہے، بڑے اخلاص کے ساتھ بنائی ہے اس لیے ہر اخلاص کے مدعی کا اعتبار نہیں کیا جاتا چاہے وہ کتنی ہی قسمیں کیوں نہ کھالے، دیکھنا تو یہ ہوتا ہے کہ باقی قرائن اور آثار کیا بتاتے ہیں، آخر زبان دل کے مطابق نہیں ہوتی، دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان سے انسان کچھ کہتا ہے، جس طرح کسی بزرگ کا قول آتا ہے کہ جب سے ہم نے برادران یوسف کا قصہ سنا ہے اس وقت سے ہم کسی رونے والے کا جلدی سے اعتبار نہیں کرتے تو ہر رونے والا بھی سچا نہیں ہوتا اسی طرح ہر قسم کھانے والا بھی سچا نہیں ہوتا البتہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ نہیں ہم نے ارادہ کیا مگر حسنیٰ کا، ہم نے بھلائی کا ہی ارادہ کیا ہے "وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ" اللہ گواہ ہے کہ یہ سب جھوٹے ہیں، ان کی زبان اور ہے اور ان کا دل اور ہے۔

"لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى" کا مصداق:

"لَا تَقُمْ فِيْهِ أَبَدًا" اس مسجد میں آپ کبھی کھڑے نہ ہوئیے یعنی نماز پڑھنے کے لیے اس میں کبھی نہ جائیں "لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى" البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے پہلے دن سے ہی "أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ" تو زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس میں ٹھہرے تو آیات کے شان نزول کے مطابق اس مسجد کا مصداق قطعی طور پر مسجد قباء ہے جو آج بھی الحمد للہ قائم ہے اور آباد ہے اور لوگ جاتے ہیں اور وہاں شوق سے نماز پڑھتے ہیں اور اس کے محراب والی دیوار پر وہ روایت بھی لکھی ہوئی ہے جس کا مفہوم یہی ہے کہ جو شخص گھر سے وضو کر کے نکلے اور مسجد قباء میں آ کے دو رکعت نماز پڑھے تو اس کو عمرہ جیسا ثواب ملتا ہے اس کا قطعی مصداق تو وہی مسجد ہے لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ سے پوچھا گیا کہ "لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى" سے کونسی مسجد مراد ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مَسْجِدِيْ هٰذَا" مسجد نبوی کے متعلق فرمایا کہ یہ مسجد اسس علی التقوی ہے لیکن ان دونوں میں تعارض نہیں ہے کیونکہ وہ مسجد جو قباء میں بنی تھی مخلصین نے بنائی تھی وہ مسجد بھی اسس علی التقویٰ ہے اور حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ بدرجہ اولیٰ اس کا مصداق مسجد نبوی ہے جو حضور ﷺ نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی اور

اس کے اندر زندگی بھر نماز پڑھتے رہے مطلب یہ ہوا کہ اسس علی التقویٰ صرف مسجد قباء نہیں ہے بلکہ مسجد نبوی بھی اس میں بدرجہ اولیٰ شامل ہے تو اس روایت کا یہی معنیٰ ہے کہ مسجد نبوی کو بھی اس کا مصداق بنانا مقصود ہے ورنہ ان آیات کے شان نزول میں تو متعین ہے کہ اس مسجد سے مسجد قباء ہی مراد ہے۔

مسجد قباء کے نمازیوں کی ایک خاص صفت:

"لَاتَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا" آپ اس میں کھڑے نہ ہوں یعنی نماز پڑھنے کے لیے کھڑے نہ ہوں البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد رکھی گئی ہے تقویٰ پر پہلے دن سے ہی وہ زیادہ حق رکھتی ہے اس بات کا کہ آپ اس میں قیام کریں، اب وہاں نماز پڑھنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے ان الفاظ میں "فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا" اس مسجد میں ایسے لوگ ہیں جو پاک صاف رہنے کو پسند کرتے ہیں، ان کی تطہیر کی تعریف فرمائی ہے کہ بہت پاک صاف رہنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے، عقیدے کی صفائی بھی ان میں تھی، بدن کی صفائی بھی ان میں تھی، لباس کی صفائی بھی ان میں تھی تو اس قسم کے لوگ اس مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔

جس وقت یہ آیت اتری تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے جو مسجد قباء میں رہنے والے تھے ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری صفائی ستھرائی کی تعریف کی ہے کہ تم بہت صاف ستھرے رہتے ہو تو کونسا امتیازی نشان ہے جس کی بناء پر اللہ نے تعریف کی ہے؟ وہ کہنے لگے یارسول اللہ! ہماری عادت یہ ہے کہ جس وقت ہم بیت الخلاء میں جاتے ہیں تو ہم ڈھیلے بھی استعمال کرتے ہیں اور ڈھیلے استعمال کرنے کے بعد پانی بھی استعمال کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی وہ چیز ہے جس کی بناء پر خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تمہاری تعریف بیان کی ہے کہ تم بہت صاف ستھرے لوگ ہو۔

استنجاء میں صرف ڈھیلے پر اکتفاء کرنا بھی جائز ہے:

اصل بات یہ ہے کہ عرب کے اندر پانی کی کمی کی بناء پر اکثر و بیشتر لوگ صرف ڈھیلے پر ہی اکتفاء کرتے تھے پانی کے ساتھ استنجاء کرنے کی وہ ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے اور اگر پانی کے ساتھ استنجاء بھی کر لیا جائے تو آپ جانتے ہیں کہ یہ زیادہ صفائی کا باعث ہے تو ڈھیلہ بھی استعمال ہو جائے اور پانی بھی استعمال ہو جائے تو یہ بہت اچھی بات ہے، قباء کے لوگوں کی یہ عادت تھی کہ جہاں بھی جاتے تو یہ ڈھیلے بھی استعمال کرتے اور اس کے

بعد پانی بھی استعمال کرتے تھے تو صرف ڈھیلے پر اکتفاء جائز ہے اس صورت میں جب نجاست اپنے مخرج سے اِدھر اُدھر پھیلی نہ ہو فقہ کی کتابوں کے اندر آپ یہ تفصیل پڑھتے رہتے ہیں کہ اگر نجاست صرف مخرج تک محدود ہو تو ڈھیلے پہ اکتفاء کر لیا جائے اور پانی سے استنجاء نہ کیا جائے تو یہ بالکل درست ہے ہمارے ہاں چونکہ فراوانی کے ساتھ پانی ملتا ہے اس لیے لوگ پانی کے ساتھ استنجاء کرنے کے بہت عادی ہو گئے وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک پانی کے ساتھ استنجاء نہ کیا جائے اس وقت تک نماز نہیں ہوتی تو پانی کے ساتھ استنجاء کے لیے انتظار میں کھڑے رہیں گے چاہے جماعت نکل جائے اس لیے گاہے گاہے ڈھیلہ بھی استعمال کرنا چاہیے تاکہ طبیعت وسوسہ قبول نہ کرے۔

مروجہ بیت الخلاء میں ڈھیلے کا استعمال حرام ہے:

اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اس بات کی فضیلت ہے کہ ایک آدمی ڈھیلہ استعمال کرے اور پھر پانی کے ساتھ بھی استنجاء کرے لیکن جو آجکل بیت الخلاء بنے ہوئے ہیں ان کے بارے میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ان بیت الخلاؤں میں ڈھیلہ کا استعمال حرام ہے کہ لوگ تو اس مسئلہ میں مستحب پہ عمل کرتے ہیں لیکن اس مستحب کے نتیجہ میں جب یہ گٹر بند ہو جاتے ہیں تو اس سے مسلمان جتنی تکلیف اٹھاتے ہیں وہ ایذاء مسلم ہے اور ایذاء مسلم حرام ہے اس لیے اگر اس قسم کے بیت الخلاء میں پیشاب کرنے کی نوبت آجائے تو ڈھیلہ استعمال نہ کرو پانی پہ اکتفاء کر لو، ڈھیلہ کا استعمال اگرچہ افضل ہے لیکن آجکل کے بیت الخلاؤں کے اندر اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔

آیت کا مفہوم:

"اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى التَّقْوٰى" کیا پھر وہی شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقویٰ پہ رکھی، خلوص اور اللہ کی رضاء پر رکھی وہ بہتر ہے یا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایسی گھاٹی کے کنارے پہ رکھی کہ جو گرنے والی ہے یعنی اس کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے پھر وہ عمارت اپنے بانی کو لے کر جہنم میں گر گئی اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا بات یہی صحیح ہے کہ عمارت مضبوط وہی ہوگی کہ جس کی بنیاد اللہ سے ڈرنے پہ رکھی گئی ہو اور اللہ کی رضا پہ ہو یہی قبولیت کی بات ہے اور اس کے ذریعہ سے درجات بلند ہوں گے لیکن جن لوگوں کو ظلم کرنے کی عادت پڑ گئی ہے اس قسم کی صاف باتیں بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

"لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا" ہمیشہ رہے گی وہ عمارت جو ان لوگوں نے بنائی "رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ" ان

کے دل کے اندر کھٹکے کا باعث، ان کے دلوں کے اندر وہ کھٹکتی رہے گی، کانٹے کی طرح چبھتی رہے گی مگر یہ کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ہو جائیں تو پھر یہ تردد ختم ہوگا اس کا حاصل یہی ہے کہ اب ان کی زندگی میں یہ چیزیں ان کے دل سے جائیں گی نہیں جیسے کسی کپڑے کے اوپر اگر کوئی داغ پڑ جائے جو اترنے والا نہ ہو تو کہتے ہیں کہ اب یہ داغ تو اس کپڑے کے ساتھ ہی جائے گا جس کا مطلب ہے کہ اگر کپڑا ختم ہوگا تو یہ داغ ختم ہوگا ایسا نہیں ہوگا کہ کپڑا باقی ہو اور داغ ختم ہو جائے اسی طرح یہ زندہ رہیں اور ان کے دل باقی ہوں اور ان کا نفاق اور تردد دل سے ختم ہو جائے ایسا نہیں ہوگا، جب دل کے ٹکڑے ہوں گے تو یہ ختم ہو جائے گا، زندگی بھر یہ چیز ان کے ساتھ لازم رہے گی" وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ " اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ

بے شک اللہ تعالیٰ نے خرید لیا ہے مؤمنین سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے بدلے

لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۟ وَعْدًا

کہ ان کے لیے جنت ہے، لڑائی کرتے ہیں وہ اللہ کے راستے میں پھر وہ قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں یہ وعدہ ہے

عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْإِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ

اللہ کے ذمہ سچا تورات انجیل اور قرآن میں، کون زیادہ پورا کرنے والا ہے اپنے عہد کو

اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ

اللہ کے مقابلہ میں، پس تم خوش ہو جاؤ اس بیع پر جو تم نے اللہ کے ساتھ کی ہے اور یہ کامیابی ہے

الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ

بہت بڑی ﴿۱۱۱﴾ وہ توبہ کرنے والے ہیں اللہ کی حمد کرنے والے ہیں اللہ کے راستے میں لاتعلق رہنے والے ہیں رکوع کرنے والے

السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

سجدہ کرنے والے ہیں بھلائی کا حکم دینے والے ہیں برائی سے روکنے والے ہیں

وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ

اور اللہ کی حدود کی نگہبانی کرنے والے ہیں بشارت دے دو مؤمنین کو ﴿۱۱۲﴾ نہیں لائق نبی کے

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا أَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْٓا أُولِيْ قُرْبٰى

اور مؤمنین کے کہ وہ استغفار کریں مشرکین کے لیے اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں

مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾ وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ

بعد اس کے کہ ظاہر ہو گیا ان کے لیے کہ وہ جہنم والے ہیں ﴿۱۱۳﴾ اور نہیں تھا استغفار

إِبْرٰهِيْمَ لِأَبِيْهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ

ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مگر ایک وعدہ کی وجہ سے جو اس نے اس سے کر لیا تھا جب ابراہیم کے لیے واضح ہو گیا

اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا كَانَ

کہ وہ تو اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے لاتعلق ہو گئے بے شک ابراہیم نرم دل تھے بردبار تھے (۱۱۴) اور نہیں ہے

اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ

اللہ کہ کسی قوم کو گمراہی میں ڈال دے بعد اس کے کہ اللہ نے اس کو ہدایت دے دی جب تک واضح نہ کر دے ان کے لیے ان چیزوں کو جن سے وہ بچیں

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے (۱۱۵) بے شک اللہ ہی کے لیے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی

يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی یار اور نہ کوئی مددگار (۱۱۶)

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ

اللہ تعالیٰ متوجہ ہوا اپنے نبی پر اور مہاجرین پر اور انصار پر جنہوں نے

اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ

اتباع کی تھی اس نبی کی اس تنگی کی گھڑی میں بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ایک فریق کے دل ٹیڑھے ہو جائیں

مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ لا وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ

ان میں سے پھر وہ متوجہ ہوا ان پر بے شک اللہ ان پر نرمی کرنے والا ہے رحم کرنے والا ہے (۱۱۷) (اور مہربان ہوا) ان تین پر

الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

جن کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا تھا حتیٰ کہ جب ان کے اوپر زمین تنگ ہو گئی باوجود کشادہ ہونے کے

وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ

اور تنگ ہو گئے ان کے اوپر ان کے اپنے ہی دل اور انہوں نے گمان کیا کہ اللہ کے عذاب سے ٹھکانہ نہیں ہے مگر

اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ ع

اللہ ہی کی طرف پھر اللہ نے ان پر توجہ فرمائی تاکہ وہ بھی اللہ کی طرف متوجہ رہیں بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے رحم کرنے والا ہے (۱۱۸)

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

پیچھے منافقین کی مذمت کی گئی تھی اگلی آیات کے اندر مؤمنین کو ان کا منصب یاد دلایا گیا ہے اور ایمان کے تقاضے یاد دلائے گئے ہیں، حاصل ان آیات کا یہی ہے کہ مؤمنین کو کیسا ہونا چاہیے؟ ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ ایمان لانے کے بعد انسان کے اوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اگلی آیات کے اندر مؤمن کے منصب کو واضح کیا گیا ہے جس میں مؤمن کی فضیلت بھی ہے اور اچھے انجام کی نشاندہی بھی ہے۔

اہل ایمان تو اللہ کے ساتھ بیع اور شراء کرتے ہیں:

سب سے پہلے تو اللہ نے یہ ذکر فرمایا کہ جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اللہ کے ساتھ ایک سودا کرتا ہے یہ بھی ایک قسم کی بیع اور شراء ہے، جس وقت آپ کسی کے ساتھ کوئی سودا کرتے ہیں تو اس میں آپ جانتے ہیں سودا کے مکمل کرنے کے لیے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک بائع ہوتا ہے، ایک مشتری ہوتا ہے اور ایک وہ چیز جو بیچی جائے اور وہ چیز جو بدلہ میں دی جائے۔ یہ چار چیزیں ہوں تو بیع والا معاملہ مکمل ہوتا ہے اور جس وقت آپ بیع کرلیں تو اس کا اثر کیا پڑتا ہے؟ جس وقت آپ کوئی چیز بیچ دیں اور دوسرا خرید لے تو اس کے بعد کیا ذمہ داری آتی ہے؟ جو چیز آپ نے بیچ دی وہ چیز آپ اپنے پاس نہیں رکھ سکتے اس پر اب آپ کا تصرف نہیں چلے گا اب اس کے اوپر مشتری کا تصرف چلے گا وہ جو چاہے اس میں تصرف کرے اب آپ اس میں تصرف نہیں کرسکتے ہاں آپ اس کے بدلے قیمت کے حقدار ہیں، مشتری کے ذمہ ہے کہ وہ اس کی قیمت ادا کرے تو قیمت دینا مشتری کے ذمہ ہے تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کو ہر عالم اور جاہل، مؤمن اور کافر سب جانتے ہیں کہ جب کوئی چیز دی جائے پھر اس کے اوپر اپنا اختیار نہیں چلتا پھر اس کے اندر اختیار اسی کا ہوتا ہے جس نے وہ چیز خریدی ہے ہاں البتہ بیچنے والا قیمت کا حقدار ہوتا ہے۔

اب تم جو ایمان لاتے ہو ایمان لانے کے ساتھ تم بھی اللہ کے ساتھ ایک سودا کرتے ہو اپنی اس حیثیت کو یاد رکھو، سودا یہ کیا کہ تم نے جان اور مال اللہ کے سپرد کردیا اور اللہ نے مقابلہ میں جنت کا وعدہ کردیا تو جو شخص ایمان لاتا ہے "اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ" کہہ دیتا ہے گویا کہ اس نے بیع اور شراء کرلیا اب ایجاب اور قبول ہوگیا جب ایجاب وقبول ہوگیا تو اب ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ نہ جان تمہاری رہی اور نہ مال تمہارے رہے تو یہ اللہ کی مہربانی ہے اور

مہربانی کی انتہاء ہے کہ جان دی بھی اسی نے، مال بھی اسی نے دیا اور ہمارے ہاتھ میں دینے کے بعد کہتا ہے کہ آؤ! میرے ساتھ سودا کرلو یہ چیز میرے ہاتھ بیچ دو، دی ہوئی اسی کی ہے جب چاہے لے لے، ہمارا اس میں کیا زور ہے لیکن یہ اس کی عنایت ہے کہ ہماری طرف اس کی نسبت کردی کہ اب یہ جان تمہاری ہے یہ مال تمہارا ہے آؤ! اب میرے ساتھ سودا کرلو اب اگر تم سودا کرلو گے تو میں تمہیں مقابلہ میں جنت دوں گا اب یہ جان اور مال مجھے دے دو اور ہم نے کہہ دیا "آمَنْتُ بِاللّٰہِ "ہم اللہ پہ ایمان لے آئے " لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ " محمد رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ہم نے یہ سودا کرلیا۔

جب یہ سودا ہوگیا تو پھر تم یہ سوچو کہ جان اور مال تم نے دے دیئے اور مقابلہ میں تم نے جنت لینی ہے، اب اللہ سے اپنے مال کی قیمت تو مانگتے ہو لیکن مال اللہ کے سپرد نہ کرو تو یہ کہاں کی عقلمندی ہے؟ لیکن اس مال اور جان کو اللہ کے سپرد کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ایمان لاتے ہی خودکشی کرلو اور سارا مال نکال کے گھر سے باہر پھینک دو، اللہ تعالیٰ آپ سے صرف یہی چاہتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد اپنے مال اور اپنی جان کو اپنا نہ سمجھو، یہ کہو کہ یہ اللہ کا ہے اس لیے ہم اپنی جان میں اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق اب تصرف نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ کے ہم امانت دار ہیں جیسے وہ کہتا جائے گا ہم اپنے مال کو صرف کریں گے بس اتنی سی بات ہے کہ اگر تم اللہ کے احکام کے مطابق اپنی جان اور اپنے مال کو صرف کرو گے تو تم نے جان اور مال اللہ کے سپرد کردیا، جب اللہ کے سپرد کردیا تو اللہ کی طرف سے جنت کا وعدہ ہے اللہ بھی قیمت دے گا۔

اور اگر کوئی موقع آجائے جان کو خرچ کرنے کا اور تم جان کو بچانے لگ جاؤ، اللہ کے حکم کے مطابق میدان میں نہ اترو، کہیں اللہ یہ کہہ دے کہ میرا مال جو تمہارے پاس ہے اس میں سے اتنا وہاں خرچ کردو اور تم اس میں خیانت کرنے لگ جاؤ تو تمہارا مقام وہی ہوگا کہ دوسرے کے ہاتھ چیز بیچ بھی دی لیکن اب دوسرے کی مرضی کے مطابق صرف نہیں کرتے جب اس کی مرضی کے مطابق صرف نہیں کرتے تو پھر تم اللہ کی طرف سے قیمت وصول کرنے کے بھی حقدار نہیں ہو اس لیے مؤمن کو اپنا یہ منصب یاد رکھنا چاہیے۔

اس بیع وشراء میں نفع مؤمن کا ہے:

اور پھر سودا کے اندر دونوں احتمال ہوتے ہیں، بیچنے والا خسارہ میں رہ گیا کہ اس نے قیمتی چیز دے دی لیکن قیمت کم وصول ہوئی اور کبھی خریدار خسارہ میں ہوتا ہے کہ تھوڑی قیمت کی چیز اس نے بہت ساری قیمت میں خرید لی،

دنیا کے اندر جب بھی کوئی سودا کیا جائے تو اس میں دونوں احتمال ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مؤمنو! یہ سودا تمہارے لیے نفع کا ہے تمہیں تو اس پر خوش ہو جانا چاہیے، اس میں غم کی کونسی بات ہے؟ ایک ایسی چیز تم نے دی اول تو دی ہوئی اسی کی ہے

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ایک تو یہ دیا ہوا اسی کا ہے، ہم جس وقت دنیا کے اندر آئے تھے ننگے تھے پاس کچھ بھی نہیں تھا، نہ کوئی قوت، نہ کوئی مال، نہ کوئی دولت، نہ کوئی طاقت تھی جو کچھ دیا اسی نے دیا، وجود اسی نے دیا ہے، طاقت اسی نے دی، صلاحیتیں اس نے دیں، اول تو دی ہوئی بھی اس کی ہے، ساری کی ساری عنایت بھی اسی کی ہے پھر یہ فانی چیز ہے کہ اگر اس طرح سپرد نہیں کرو گے تو آخر یہ چلی جانی ہے، نہ مال پاس رہنے کی چیز ہے اور نہ جان پاس رہنے کی چیز ہے یہ تو اس طرح ہے جس طرح آپ ایک برف کی اینٹ لے آئے اس کو بیچنے کے لیے آپ بازار میں بیٹھ جائیں جتنی جلدی اس کو بیچ دو گے اتنے نفع میں رہ جاؤ گے ورنہ جتنی دیر کرو گے وہ پگھل جائے گی جب پگھل جائے گی تو تمہارے پلے کچھ بھی نہیں رہے گا، یہ زندگی بھی برف کی طرح ایک پگھلنے والی چیز ہے اور مال بھی برف کی طرح بہنے والی چیز ہے اس کو تو جتنی جلدی بیچ کے پیسے کھرے کر لو گے اتنا ہی اچھا ہے ورنہ اگر دیر کرو گے تو دیر کرنے کے ساتھ زائل تو ہو ہی جائے گی تو اس قسم کی فانی چیز بیچ کے تم نے باقی چیز خرید لی یہ تم نے بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی، کبھی تمہارے ذہن میں یہ خیال نہ آئے کہ ہم اللہ کے ساتھ وعدہ کر کے کہاں پھنس گئے، کبھی زکوٰۃ کا حکم آ گیا، کبھی صدقۃ الفطر کا حکم آ گیا، کبھی حکم آ گیا کہ قربانی دے دو، کبھی حکم آ گیا کہ جہاد کے لیے چلو، یہ ہم کہاں پھنس گئے اس قسم کا خیال تمہارے دل میں نہیں آنا چاہیے یہ تو تم نے اللہ کے ساتھ بہت کامیابی کا سودا کیا ہے، عارضی سی چیزیں دے کے دائمی نعمتیں حاصل کر رہے ہو۔

اللہ کی طرف سے بدعہدی کا کوئی احتمال نہیں:

ہاں اس میں البتہ کوئی شوشہ چھوڑ سکتا ہے، کوئی شبہ پیدا کر سکتا ہے تو یہی کر سکتا ہے کہ مال تو ہم نقد دے رہے ہیں اور قیمت ادھار ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس کو ایسے نہ سمجھو کہ اگر تم نے ادھار سودا کر لیا تو وہ وعدہ سے پھر جائے گا اور مشتری تمہارے پیسے دبا لے گا ایسی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سے زیادہ عہد کو پورا کرنے والا کوئی نہیں ہے دوسری بات یہ ہے کہ یہ اللہ کا اتنا پختہ عہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تحریر توراۃ میں بھی دے دی، انجیل میں بھی دے

دی اور قرآن میں بھی دے دی، تین کتابوں کے اندر تو اس کی تحریر دے دی کہ جو شخص یہ چیزیں میرے سپرد کرے گا میں اس کو جنت دوں گا تحریر وہ دیے بیٹھا ہے، سب سے زیادہ باوفا وہ ہے تو اس قسم کا ادھار تو نقد سے بھی بہتر ہوتا ہے بہرحال یہ سودا تمہارے لیے ہر طرح سے مفید ہے اس لیے تمہیں چاہیے کہ جہاں اللہ کا حکم آجائے نہ جان کی پرواہ کرو، نہ مال کی پرواہ کرو کیونکہ ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ تم نے یہ چیزیں اللہ کے سپرد کر دی ہیں پہلی آیت کے اندر تو یہی منصب ذکر کیا گیا ہے۔

آیت کا مفہوم:

پہلی آیت کا مفہوم دیکھ لیجیے "اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ" بے شک اللہ تعالیٰ نے خرید لیا ہے مؤمنین سے، خریدنے والا اللہ ہے اور مؤمنین سے خریدا ہے گویا کہ بیچنے والے مؤمن ہیں، خرید لیا ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے بدلے کہ ان کے لیے جنت ہے گویا کہ قیمت جنت ہے، اب مؤمن جو اللہ سے سودا کر لیتے ہیں یہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں یہ لڑنا جان سپرد کرنے والی بات ہے کہ جہاں جہاد کا موقع آیا تلوار اٹھا کے میدان میں نکل گئے پھر دونوں ہی صورتیں ہیں ہر حال میں تم نے اپنے وعدے کو پورا کر دیا چاہے دشمن کو مار کے آجاؤ چاہے مر جاؤ یہ نہ خیال کرنا کہ مار دیا تو کامیاب اور اگر مر گئے تو ہم ناکام ہو گئے، ناکام ہونے والی یہاں کوئی بات نہیں ہے اللہ کے نام پہ ایک دفعہ نکل آؤ پھر مریں تو شہید ماریں تو غازی، دونوں صورتوں میں کامیاب ہیں تم نے اپنے معاہدے کو پورا کر دیا ہے پھر تمہارے ذمہ یہ نہیں کہ قتل کر کے ہی آؤ تو سمجھیں گے کہ تم کامیاب ہوا ایسی بات نہیں دونوں صورتوں میں تم نے اپنے وعدے کو پورا کر دیا "وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا" اللہ تعالیٰ نے سچا وعدہ کیا ہے توراۃ میں، انجیل میں اور قرآن میں یعنی اس کا ذکر قرآن میں بھی ہے، انجیل میں بھی ہے اور توراۃ میں بھی ہے، تینوں کتابوں کے اندر اللہ نے اپنے اس وعدے کی تحریر دے دی "وَمَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ" اللہ سے زیادہ عہد کو پورا کرنے والا کون ہے؟ اے ایمان والو خوش ہو جاؤ اس سودے پر جو تم نے اللہ کے ساتھ کر لیا ہے "ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ" یہ تو تم نے بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی، ایک فانی چیز کو دے کے باقی رہنے والی چیز کو حاصل کر لو گے، چند روزہ زندگی اللہ کے راستے میں خرچ کر کے ہمیشہ کے لیے راحت حاصل کر لو گے یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

مؤمنین کی صفات حمیدہ:

آگے اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی صفات بیان کی ہیں کہ مؤمنین میں کیا صفات ہوتی ہیں؟ مؤمن توبہ کرنے والے ہوتے ہیں، توبہ کا معنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والے، اس زندگی کے اندر چلتے ہوئے ٹھوکریں لگتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں جب انسان اس دنیا میں اپنا وقت گزارتا ہے تو قدم پھسلتا ہے، ٹھوکریں لگتی ہیں لیکن ایمان کا تقاضہ ہے کہ ٹھوکر لگے تو انسان سنبھل جائے، جہاں قدم پھسلے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال لے اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے یہ مطالبہ کبھی بھی نہیں ہے کہ تم سے کوئی گناہ نہ ہو اور اگر تم سے کوئی گناہ ہوگیا تو تم ایمان سے ہی خالی ہوگئے، تمہارے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں رہا ایسی بات نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے، مؤمن کا کام یہ ہے کہ اگر کہیں اپنی زندگی کے اندر لغزش کھا جاتا ہے، کہیں اس کو ٹھوکر لگ جاتی ہے، کبھی وہ اللہ کے حکم کے خلاف کر بیٹھتا ہے تو وہ بغاوت پہ جم نہیں جاتا بلکہ اس کو جب تنبیہ ہوتی ہے، اپنی بات اس کو یاد آجاتی ہے کہ میرا تو اللہ پہ ایمان ہے تو فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے یہ مؤمن کا کام ہے گویا کہ ایمان کے بعد پہلا قدم توبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو، جہاں کوئی غلطی ہوئی، جہاں کوئی لغزش ہوئی تو فوراً اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ لو۔

جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "كُلُّ بَنِىْ آدَمَ خَطَّاءٌ" آدم کے جتنے بچے ہیں سب خطاءکار ہیں، غلطی سب سے ہوتی ہے "وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ" لیکن ان خطاءکاروں میں سب بہترین خطاءکار وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں، جو خطاء ہو جانے کے بعد اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں، اللہ کے سامنے توبہ کرلیں یہ سب سے بہتر ہیں۔

" اَلْعٰبِدُوْنَ " عبادت کرنے والے ہیں، بندے بن کے رہنے والے ہیں، ہر وقت اللہ کی عبادت کو مدنظر رکھتے ہیں۔

" اَلْحٰمِدُوْنَ " اللہ کا شکر ادا کرنے والے ہیں، اللہ کی نعمتوں کا احساس کرتے ہیں، حمد کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا احساس کیا جائے اور نعمتوں کا احساس کر کے اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جائے کہ یہ اللہ کی دی ہوئی ہے اور اس کو منعم سمجھتے ہوئے اس کی اطاعت کی جائے۔

" اَلسَّائِحُوْنَ " یہ لفظ سیاحت سے لیا گیا ہے اور یہ لفظ پہلے بھی اس سورۃ میں آیا تھا "فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ"

زمین میں چلو پھرو، سیاحت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ پرانے زمانے میں لوگ اللہ کی عبادت کرنے کے لیے گھروں سے نکل جایا کرتے تھے، اپنے ماحول سے نکل جاتے تھے، جنگلات میں رہتے اور پہاڑوں میں رہتے تھے بیابانوں میں رہتے چشموں کا پانی پی لیتے، جنگلی پھل کھا لیتے تھے اور غاروں میں بیٹھ کے اللہ کو یاد کرتے رہتے تھے اور اگر وہ آبادی میں آتے بھی تو اس طرح کہ صبح کہیں شام کہیں، دن کہیں رات کہیں یہ ان کا ایک عبادت کرنے کا طریقہ تھا، ہر قسم کے تعلقات سے مبرّا ہو کر وہ یوں نکل کھڑے ہوتے، دوستیاں، رشتہ داریاں، تعلقات یہ اس قسم کی چیزیں جو اللہ کی طرف متوجہ ہونے سے مانع ہو جاتی ہیں عبادت نہیں کرنے دیتیں تو ان تعلقات سے جان چھڑا کے وہ یوں نکل جاتے تھے۔

ہماری امت میں سرور کائنات ﷺ نے یہ بات واضح کر دی کہ اس قسم کی سیاحت جس میں تعلقات بالکل چھوڑ دیے جائیں اور اہل حق کے حقوق ختم ہوں یہ راہبانہ زندگی اختیار کرنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ" اسلام میں رہبانیت نہیں ہے، یوں تعلقات ختم کرنا ٹھیک نہیں ہے ہاں البتہ اگر کسی درجہ میں علیحدگی اختیار کی جائے کچھ وقت کے لیے تو اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سِيَاحَةُ أُمَّتِي اَلْجِهَادُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ" اللہ کے راستے میں جہاد میں نکل جاؤ تو جتنے دن جہاد میں گزر جائیں گے سارے تعلقات ختم ہو جاتے ہیں یا مسجد کے اندر معتکف ہو کے بیٹھ جاؤ تو تعلقات کم ہو جائیں گے یا حج بیت اللہ کو کسی درجہ میں سیاحت قرار دیا گیا ہے تو اتنا سا تعلق قطع کرنا جس میں اہل حقوق کے حقوق بھی تلف نہ ہوں مقصد بھی حاصل ہو جائے کہ انسان ماحول سے علیحدگی اختیار کر کے ایک اچھی عادت ڈال لے، اللہ کی طرف کچھ دیر کے لیے متوجہ ہو جائے تو اس کو باقی رکھا گیا ہے اس لیے یہاں سیاحت کا مفہوم مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے، بعض نے اس کا مفہوم ذکر کیا کہ "السائحون" روزہ رکھنے والے، روزہ میں بھی کسی درجے میں لاتعلقی ہو جاتی ہے کھانے پینے سے بھی اور بیوی سے بھی اس درجے کی سیاحت بھی برداشت ہے تو سائحون صائمون کے معنی میں آ گیا یا اس کا مصداق ہو گا اللہ کے راستے میں نکلنے والے جس کا مصداق مجاہد بھی ہو سکتا ہے اور طلب علم کے لیے نکلنے والا بھی ہو سکتا ہے، ہجرت کرنے والا بھی ہو سکتا ہے "السائحون" کے اندر یہ سارے مفہوم آ سکتے ہیں، ویسے عام طور پر مفسرین نے اس کا ترجمہ روزہ دار ہی کیا ہے بیان القرآن میں یہی ترجمہ کیا گیا ہے اور حضرت الشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی جامع لفظ بولا ہے کہ بے تعلق رہنے والے تو یہ ترجمہ سیاحت کے مفہوم کے زیادہ قریب ہے۔

"اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ" یہ دونوں لفظ بول کر نماز مراد ہوتی ہے کبھی اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور کبھی رکوع کرتے ہیں "وَالْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ" اور پھر صرف یہی نہیں کہ خود نیکی کرتے ہیں بلکہ نیکی کو پھیلانے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکنے والے ہیں اور آخری بات یہ ہے کہ اللہ کے ضابطوں کی رعایت رکھنے والے ہیں، اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں جو ضابطے اللہ نے بنا دیے ان کی نگہبانی کرتے ہیں، ان کی خلاف ورزی نہیں کرتے یہ مؤمن ہیں جو اس قسم کا کام کرنے والے ہیں "وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ" ان مؤمنین کو بشارت دے دو اچھے انجام کی، اچھا انجام انہی کے سامنے آنے والا ہے۔

ایمان کا تقاضہ:

اگلی آیت کا مقصد ایمان کی یاد دہانی ہی ہے، جس وقت تم اللہ پہ ایمان لے آئے، جان مال سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں بیچ دیا تو اب وہ لوگ جو مشرک ہیں، جو اللہ کے ساتھ اس قسم کا سودا نہیں کرتے ہیں ان کے ساتھ تمہارا محبت کا کوئی تعلق باقی نہیں رہنا چاہیے جس طرح پہلے لاتعلقی کا اعلان کر دیا اور مختلف آیات کے اندر اس کا ذکر کیا گیا کہ اگر اللہ کے مقابلہ میں ان سے محبت زیادہ رکھو گے تو پھر اللہ کے حکم کا انتظار کرو، اللہ کی طرف سے عذاب آئے گا اور ایک آیت میں یہ بھی آیا تھا کہ اگر تمہارے والدین اور رشتہ دار وغیرہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کرتے ہیں تو پھر ان سے دوستی نہ لگاؤ، نہ زندگی کے اندر ان سے دوستی لگانے کی اجازت ہے اور نہ مرنے کے بعد ان سے کوئی ہمدردی رکھنے کی اجازت ہے، زندگی میں بھی ان کے ساتھ محبت کا تعلق نہ رکھو اور مرنے کے بعد بھی ان سے کسی قسم کی ہمدردی نہ رکھو اور اگر کوئی مشرک رشتہ دار مر جائے تو اس کے لیے دعا اور استغفار بھی جائز نہیں ہے۔

شان نزول:

اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہوا ہے کہ ابو طالب جس وقت بیمار ہوئے اور آثار اس قسم کے ہوئے کہ اب ان کا انتقال ہو جائے گا تو یہ ابو طالب ایک ایسا شخص ہے جس نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساری زندگی ہمدردی کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نو سال کے تھے جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد فوت ہو گئے تو اس کے بعد آپ کی سرپرستی ابو طالب نے کی ہے، بچوں کی طرح پالا، اولاد کی طرح رکھا، شادی اپنی سرپرستی میں کی، کاروبار اپنی سرپرستی میں کروایا اور جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اظہار کیا ہے تو اس کے بعد کفار نے جہاں بھی آپ کی مخالفت کی ہے

ابوطالب آپ کے ساتھ رہے حتیٰ کہ جب انہوں نے مقاطعہ کر دیا تھا، بائیکاٹ کر دیا تھا، شعب ابی طالب کے اندر یہ لوگ محصور ہو کے رہ گئے تھے اس وقت بھی ابوطالب ساتھ ہی رہے ہیں، ساری برادری سے کٹے، ساری برادری سے ٹکرائے، ساری پریشانیاں اٹھائیں لیکن بھتیجے کو نہیں چھوڑا لیکن قسمت کی بات ہے کہ مسلمان نہیں ہوا، اولاد مسلمان ہوگئی حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، حضرت عقیل رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے البتہ بڑا لڑکا جو طالب تھا اس کا انتقال کفر پہ ہوا ہے، اس کی وجہ سے ان کی کنیت ابوطالب ہے ویسے اصل نام عبد مناف ہے اور دوسرے تین بچے مسلمان ہوئے ہیں اور تینوں صحابی ہیں۔

اور خود یہ لوگوں کو کہتے رہے کہ یہ اچھا دین ہے اس کو قبول کرو لیکن خود کلمہ نہیں پڑھا اب یہ آخری وقت تھا اگر یہ وقت بھی ٹل گیا تو کیا گنجائش تھی اس لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی درجے کی فکر تھی کہ اگر اس نے کلمہ نہ پڑھا اور اس طرح کفر پہ موت آگئی تو میں آگے جا کے کچھ نہیں کر سکوں گا، اللہ کی رحمت کے دروازے بند ہو جائیں گے تو وہاں بیٹھے ہیں، ترغیب دے رہے ہیں کہ اے چچا! صرف ایک دفعہ کلمہ پڑھ دے تو ہونٹ ہلا میں تیرے ہونٹوں کو اس کلمہ کے ساتھ ہلتا دیکھ لوں تو میں اس کلمہ کی وجہ سے تیری مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جھگڑا کر لوں گا، وہاں تیری سفارش کروں گا تو صرف ایک دفعہ کلمہ پڑھ دے اور اس مجلس کے اندر ابوجہل وغیرہ بھی بیٹھے تھے، مکی زندگی کی بات ہے چونکہ ابوطالب معزز خاندان میں سے تھے تو دوسرے لوگ بھی عیادت کے لیے آئے بیٹھے تھے وہ دوسری طرف زور لگا رہے تھے کہ دیکھو! ابوطالب جاتے ہوئے اپنے باپ کا طریقہ نہ چھوڑ دینا، اس قسم کی باتیں دونوں طرف سے جاری تھیں اسی حال میں آخری وقت آگیا تو ابوطالب نے آخری آخری بات جو کہی وہ یہ کہی کہ میں یہ کلمہ پڑھ کے تیرا دل ٹھنڈا کر دیتا لیکن میں یہ خیال کرتا ہوں کہ مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ قریش کی عورتیں کہیں گی کہ جہنم سے ڈر کے بھتیجے کا کلمہ پڑھ لیا "اِخْتَرْتُ النَّارَ عَلَى الْعَارِ" میں عار برداشت نہیں کر سکتا جہنم کی آگ برداشت کر سکتا ہوں اور آخر آخر میں جو اعلان کیا وہ یہی تھا "اَنَا عَلٰى مِلَّةِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ" میں تو عبدالمطلب کے طریقہ پر ہوں میں تو اسی طریقہ پہ جاؤں گا۔

جب اس نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے روتے ہوئے اٹھے ہیں اور یہ کہتے ہوئے کہ اچھا مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں تیرے لیے کروں گا، تیرے لیے استغفار کروں گا مایوس ہو کے اس محفل سے اٹھ

کے آ گئے اور ابوطالب کا انتقال اسی طرح ہوا، روایات میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ آپ کا گمراہ چچا مر گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ اس کو کہیں دفن کر دو تو سنت کی رعایت کیے بغیر ان کو وہیں دفن کیا گیا ہے جو قریش کا پرانا قبرستان تھا آجکل وہ حصہ مقفل کر دیا گیا ہے، لوگوں کو اس طرف جانے نہیں دیتے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی قبر بھی ادھر ہی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد جو مکہ میں فوت ہوگئی تھی ان کی قبریں بھی وہی ہیں اور ابوطالب کی قبر بھی وہی ہے، اس قبرستان کا نشان اب بھی ہے اور چار دیواری کر کے لوہے کا گیٹ لگا کے اس کو مقفل کر دیا گیا ہے، اس گیٹ کے سوراخوں میں سے تو وہ قبریں نظر آتی ہیں اور آگے وہ جانے نہیں دیتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے وہ آیات اتری تھیں جو دوسری جگہ ہیں "اِنَّکَ لَاتَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ" کہ غم کرنے کی کیا بات ہے ہدایت تیرے اختیار میں تو ہے نہیں جس کو اللہ مناسب سمجھتا ہے اس کو ہدایت دیتا ہے اور اس آیت کے اندر ممانعت کر دی گئی ہے کہ ان کے لیے استغفار کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے تو ان آیات کا شان نزول ابوطالب کے متعلق ہے لیکن عام ضابطہ کے طور پر تمام مؤمنین کو ہدایت دے دی گئی ہے کہ اگر کسی کا کوئی مشرک رشتہ دار فوت ہو جائے تو اس کے لیے استغفار اور دعا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اہل سنت والجماعت کے نزدیک ابوطالب جہنمی ہے:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ابوطالب نے آپ کے ساتھ ساری زندگی ہمدردی کی تو کیا یہ ہمدردی اس کے کام آئے گی، اس کو کوئی فائدہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے نچلے گڑھے میں ہوتا جس طرح عام مشرک ہوں گے لیکن اس نے میرے ساتھ ہمدردی کے ساتھ وقت گزارا ہے تو اب وہ جہنم سے نکلے گا تو نہیں کیونکہ کافر جہنم سے نکل نہیں سکتا لیکن وہ " اَھْوَنُ اَھْلِ النَّارِ " ہوگا تمام جہنم والوں سے ہلکا عذاب اس کو ہوگا، وہ صرف ٹخنوں تک جہنم میں ہوگا باقی بدن آگ سے بچا ہوا ہوگا، رہے گا جہنم کی چار دیواری میں ہی باہر نہیں نکل سکتا ٹخنوں تک آگ میں ہوگا یا ایک روایت میں ہے کہ اس کو آگ کے جوتے پہنائے جائیں گے لیکن ساتھ یہ لفظ بھی ہے کہ ان جوتوں کی وجہ سے اس کا دماغ اس طرح کھولے گا کہ جس طرح ہانڈی پکتی ہے، وہ سمجھے گا کہ میرے سے زیادہ سخت سزا کسی کو نہیں مل رہی لیکن ہوگا " اَھْوَنُ اَھْلِ النَّارِ " تمام جہنم والوں میں سے ہلکا ہوگا از روئے عذاب کے۔

اہل سنت والجماعت کا مسلک یہی ہے کہ ابو طالب کا انتقال کفر پہ ہوا ہے، وہ جہنمی ہے صحیح روایت کے اندر اس کا ذکر آیا ہوا ہے ایمان اس کو نصیب نہیں ہوا، ہمدردیاں اس کی اپنی جگہ رہیں ان ہمدردیوں کی وجہ سے ہی اس کو اہون عذاب ہوگا کیونکہ اس نے دین کی مخالفت نہیں کی، رسول اللہ ﷺ کو تکلیف نہیں پہنچائی، مؤمنوں کے ساتھ برے رویہ سے پیش نہیں آیا تو ان کاموں کی وجہ سے عذاب کی سختی کم ہوگئی۔

البتہ جو شیعہ ہیں وہ اس کو مؤمن ثابت کرتے ہیں اور مؤمن قرار دے کے انہوں نے ان کی قبر پہ جا کے ماتم وغیرہ شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے حکومت نے وہاں آمد ورفت پہ پابندی لگادی، ان شیعوں کے نزدیک وہ مؤمن ہیں جبکہ ہمارے ہاں ایسی بات نہیں ہے صحیح روایت کے اندر اس کے کفر کا ذکر آیا ہوا ہے اور ان آیات کے شان نزول میں مفسرین نے یہ ساری باتیں نقل کی ہیں۔

آیت کا مفہوم:

"مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ" نبی کے لیے مناسب نہیں اور نہ ان لوگوں کے لیے مناسب ہے کہ جو ایمان لے آئے کہ استغفار کریں مشرکین کے لیے یعنی مشرکین کے ساتھ ان کی موت کے بعد بھی کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہیے اگر چہ وہ رشتہ دار ہی ہوں بعد اس کے کہ واضح ہوگیا کہ وہ جہنمی ہیں، جب ان کی موت شرک پہ ہوئی تو یہ بات واضح ہے کہ وہ جہنمی ہیں، کسی کی موت کفر اور شرک پہ نہ آئی ہو تو اس میں احتمال ہے کہ ایمان پہ خاتمہ ہوا ہے، جس طرح آجکل گناہ گار مسلمان ہے تو ان کے لیے تو پھر استغفار کیجیے لیکن ایک آدمی کی زندگی کفر پہ گزری ہے اور وفات سے پہلے اس کا ایمان ظاہر نہیں ہوا تو یہ ظاہر ہے کہ وہ کفر پہ مرا ہے جب یہ کفر پہ مرا ہے تو یہ بات خود واضح ہوگئی کہ یہ جہنمی ہے ان کی مغفرت کا کوئی امکان نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی مغفرت کا دروازہ ہی بند کر دیا ہے تو جب یہ پتہ چل جائے کہ اس کی موت کفر یا شرک پہ ہوئی ہے تو یہ واضح ہوگیا کہ یہ جہنمی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لیے استغفار کا جواب:

باقی یہاں ایک سوال ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد بھی تو مشرک تھا جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو اس کے لیے دعا کی تھی "وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ" میرے

باپ کو بخش دے وہ گمراہوں میں سے ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے دعا کی تھی حالانکہ اس کا انتقال شرک پہ ہوا تھا تو یہ کیسے جائز ہوا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی تو ان کے نمونے پہ چلتے ہوئے کسی اور کو کیوں روک دیا گیا؟ کسی کے دل کے اندر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے یہاں وضاحت کر دی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کا یہ معنی نہیں کہ اس کی وفات کے بعد اس کے لیے اللہ سے مغفرت مانگتے رہے، ان کی یہ دعا ان کی زندگی میں تھی اور جب ان کو پتہ چل گیا کہ ان کا انتقال بھی کفر و شرک پہ ہوا اور بخشا نہیں جا سکتا تو ایسے وقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس سے لاتعلق ہو گئے، اور زندگی میں کسی مشرک کے لیے دعا مانگی جا سکتی ہے کیونکہ مغفرت مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کو ایمان کی توفیق دے دے تا کہ یہ آخرت میں بخشا جائے، زندگی میں یہ دعا کی جا سکتی ہے لیکن جس وقت ان کو پتہ چلا کہ ان کا انتقال بھی شرک پہ ہوا ہے تو وہ بھی لاتعلق ہو گئے، انہوں نے جو استغفار کیا تھا وہ اس لیے تھا کہ ایک تو وعدہ کر کے آئے کہ "سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا" انہوں نے کہا تھا کہ میرے پاس سے نکل جاؤ ورنہ میں تجھے پتھر مار مار کے مار دوں گا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جاتے ہوئے وعدہ کر آئے تھے کہ جب تک ہو سکے گا میں تیرے لیے استغفار کروں گا یہ وعدہ کر آئے تھے اور اس وعدے کی بناء پر اپنے والد کے لیے دعا کرتے رہے لیکن جب پتہ چل گیا کہ وہ بھی جہنمی ہے اور وہ اللہ کا دشمن ہے ایمان اس کی قسمت میں نہیں ہے اور اس کا انتقال کفر پہ ہو گیا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کوئی تعلق نہیں رکھا تو اسی طرح جب تمہیں بھی پتہ چل جائے کہ اس کا انتقال کفر و شرک پہ ہو گیا ہے تو تمہیں بھی لاتعلق ہو جانا چاہیے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمونہ ہمارے لیے یہی ہے کہ زندگی میں دعا کر سکتے ہو کہ اے اللہ! اس کو گمراہی سے بچا لے، ہدایت دے دے اور مغفرت کا سامان کر دے اور لیکن کفر پر انتقال کی صورت میں نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے لیے دعا کی نہ تم کرو۔

آخرت میں ایمان کے بغیر کوئی نسبت کام نہیں آئے گی:

اس میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اگر ایمان نصیب نہ ہو تو کسی نبی کے ساتھ قرب کا تعلق آخرت میں عذاب جہنم سے مانع نہیں ہے جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد سے ملیں گے جب ملاقات ہو گی تو دیکھیں گے کہ گرد آلود چہرہ ہے، رنگ اڑا ہوا ہے، سیاہی طاری ہے، بہت برے

حال میں ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کہیں گے کہ اے ابا! میں تجھے نہیں کہتا تھا کہ میری نافرمانی نہ کر؟ تو آذر آگے سے کہے گا کہ میں اب وعدہ کرتا ہوں میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا لیکن وہ وقت تو اب گزر گیا اب فرمانبرداری کا کونسا موقع رہ گیا لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت ایک بات کہیں گے کہ اے اللہ! تو نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ میں تجھے رسوا نہیں کروں گا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے الفاظ قرآن میں ہیں "وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ الدِّيْنَ" اے اللہ! مجھے قیامت کے دن رسوا نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول کرنے کا وعدہ کرلیا ہوگا جس کی وجہ سے حدیث کے الفاظ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہیں گے اے اللہ! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تجھے رسوا نہیں کروں گا میرے لیے اس سے بڑی رسوائی کیا ہوگی کہ میرا باپ اس حال میں ہے یعنی جب لوگ دیکھیں گے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہے اور اس حال میں ہے تو یہ میرے لیے بڑی رسوائی کی بات ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو خزیان سے بچانے کے لیے یہ بات کہی ہے، باپ کی سفارش کرنی مقصود نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کہیں گے اس رسوائی کو دور کرنے کا یہ طریقہ تو نہیں ہے کہ اب اسے بخش دوں، کافروں کے اوپر میری رحمت حرام ہے یہ تو نہیں بخشا جائے گا ہاں البتہ ایک دوسرا طریقہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھو! جب وہ دیکھیں گے تو وہ ایسے ہوگا کہ جیسے کوئی بجو ہوتا ہے اس طرح اس کی شکل مسخ ہو جائے گی اور اس کی انسانی شکل باقی نہیں رہے گی اور اس کو اس کے پاؤں سے پکڑ کے جہنم میں پھینک دیا جائے گا جب جہنم میں پھینک دیا جائے گا تو اب جتنے لوگ بھی جہنم میں ہوں گے ان میں سے کوئی پہچانے گا ہی نہیں کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد ہے۔

اب اگر کسی کا باپ گداگری کرتا پھر رہا ہے اور کسی کو پتہ ہی نہیں ہے کہ یہ فلاں کا باپ ہے تو اس کا گداگری کرنا اس کے لیے ذلت کا باعث نہیں ہے ہاں اگر کسی کو پتہ ہو کہ یہ فلاں کا باپ ہے اور یہ کام کر رہا ہے تو لوگ کہیں گے دیکھو! کہ خود کیسا ہے اور باپ کس حال میں پھر رہا ہے؟ تو جب اس کو کوئی پہچانے گا ہی نہیں تو نسبت کوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرے گا ہی نہیں، معلوم ہوگیا کہ ایمان کے بغیر بڑے سے بڑے وسیلے بھی کام آنے والے نہیں ہیں، آخرت میں جا کے اگر نجات ہوسکتی ہے تو ایمان کی برکت سے ہوسکتی ہے، ایمان اگر حاصل ہو تو پھر اس قسم کے تعلقات درجات اور ترقی درجات کا باعث بن سکتے ہیں لیکن چھٹکارا اگر ہوگا تو ایمان کی برکت سے ہوگا۔ کتنا

بڑے سے بڑا وسیلہ اور ذریعہ حاصل ہو لیکن ایمان نہیں تو سب بے کار ہے۔

آیت کا مفہوم:

"وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا" نہیں تھا استغفار ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مگر ایک وعدہ کی وجہ سے جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کر لیا تھا "فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ" جب اس کے لیے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ اللہ کا دشمن ہے یعنی اس کا خاتمہ اللہ کی عداوت پہ ہوا ہے "تَبَرَّأَ مِنْهُ" تو اس سے بے زار ہو گئے، بے شک ابراہیم علیہ السلام رقیق القلب تھے، بہت حلیم الطبع تھے اس لیے باپ کی سختیوں کے باوجود، انتہائی درجے کی بے مروتی کے باجود ان کے دل کے اندر رقت تھی جس کی وجہ سے باپ کے لیے روتے رہے اور بردبار تھے کہ اپنے باپ کی ان سختیوں سے وہ مشتعل نہیں ہوئے لیکن جس وقت پتہ چل گیا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے پھر لاتعلق ہو گئے گویا کہ مؤمن اپنے ان تعلقات کی بناء پر موم ہو سکتا ہے لیکن جب وضاحت ہو جائے کہ اب یہ شخص اللہ کا ہونے والا نہیں ہے اور اللہ کے اوپر ایمان لانے والا نہیں ہے تو پھر اس کو پتھر بھی ہو جانا چاہیے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں نمونے ہمارے سامنے آ گئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر تھے یا کوئی اور؟

یہاں "لِأَبِيهِ" کا لفظ آیا ہے اور دوسری جگہ ہے "لِأَبِيهِ آزَرَ" قرآن کریم کا تبادر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد تھے اور وہ کافر تھے، بت فروش تھے بلکہ بت گر تھے جیسا کہ تاریخ کے اندر مذکور ہے اور وہ بخشے نہیں گئے آخرت میں ان کے جہنم میں جانے کا تذکرہ ہے لیکن یہ بات کچھ علماء اور مفسرین کے درمیان زیر بحث آئی ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد نہیں تھا بلکہ چچا تھا اور چچا کو باپ کہہ دیا جاتا ہے یہ بات ظاہر کے خلاف ہے لیکن کہنے والے لوگ بہت بڑے بڑے ہیں، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تو باپ ہی قرار دیا ہے اور روح المعانی والے چچا قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے جو باپ کہا ہے یہ قلت تتبع کی وجہ سے ہے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تلاش زیادہ نہیں کی اور وہ ان کے باپ کا نام تارخ ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے کفر کی کوئی صراحت نہیں ہے اصل میں وہ ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء اجداد میں جتنے لوگ ہیں سب مغفور ہیں، اس بات پہ زور لگا رہے ہیں تفسیر مظہری والے نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے بارے میں تو خیر بہت سارے

لوگوں کا یہی موقف ہے جیسا کہ اس کی تفصیل سورۃ الشعراء میں آئے گی وہاں روح المعانی والے نے بہت سخت جملہ لکھا ہے "اِنِّیْ اَخْشٰی الْکُفْرَ عَلٰی مَنْ قَالَ بِکُفْرِھِمَا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا" حضور ﷺ کے والدین کے متعلق رضی اللہ عنہما کا لفظ بول کے کہتے ہیں کہ جوان کے متعلق کفر کا قول کرے مجھے تو خود اس کے کفر کا اندیشہ ہے اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر تقریباً چھ رسالے لکھے ہیں بہر حال وہ ایک الگ مسئلہ ہے اس کو اس کے مقام پہ ذکر کریں گے، شیعہ آذر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد نہیں مانتے وہ کہتے ہیں یہ باپ نہیں ہیں اور ہمارے علماء میں اختلاف ہے لیکن قرآن کریم کا تبادر اس طرف ہے کہ جہاں ذکر کیا "اب" کے لفظ کے ساتھ ہی ذکر کیا اور حدیث شریف میں بھی جہاں بھی ذکر کیا ہے "اب" کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے، کہیں بھی عم (چچا) کے ساتھ ذکر نہیں آیا باقی یہ ضابطہ کوئی منصوص نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے اصول وفروع کے ساتھ اللہ کا خصوصی معاملہ ہو، نوح علیہ السلام کے بیٹے کا ذکر قرآن میں ہے وہ کافر تھا تو جس طرح فروع کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں ہے اسی طرح نبی کے اصول کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ہے کہ وہ مغفور ہوں گے بہر حال یہ مسئلہ علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے اور تفاسیر کے اندر اس قسم کی روایات موجود ہیں۔

آیات کا مفہوم:

"وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ" یہ اطمینان دلایا ہے کہ اگر پہلے استغفار کر بیٹھے ہو تو یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ جس پہ اللہ تعالیٰ گرفت کرے گا کیونکہ پہلے اس نے ممانعت نہیں کی تھی اگر ممانعت ہو چکی ہوتی اور پھر تم یہ کوتاہی کرتے تو یہ جرم تھا جب ممانعت ہی نہیں کی تو ایسے وقت میں تمہیں گمراہی کے اندر نہیں ڈالا جائے گا تو اس آیت کے اندر یہ اطمینان دلایا ہے، اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہدایت دے دے جس طرح تم ہدایت یافتہ ہو گئے پھر اللہ تعالیٰ اس قوم کو گمراہی میں نہیں ڈالا کرتا جب تک کہ بتا نہ دے کہ تم نے بچنا کن کن چیزوں سے ہے تو پہلے بتائے گا کہ بچنا کن کن چیزوں سے ہے پھر اگر تم نہیں بچو گے تو تب گمراہی کا فیصلہ ہوتا ہے اور جس بات کو اللہ تعالیٰ پہلے واضح نہ کر دے تو ہدایت دینے کے بعد ایسے ہی اس کو گمراہی میں نہیں ڈالتا، لہٰذا اگر تم کسی مشرک کے لیے دعا کر بیٹھے یا کسی کے لیے استغفار کر بیٹھے تو یہ کوئی گمراہی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تمہارے سامنے واضح نہیں کیا تھا اب واضح کر دیا تو اب اگر کوئی اس قسم کا کام کرے گا تو اب وہ مجرم ہوگا "اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "اللہ ہی کے لیے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمینوں کی "يُحْيٖ وَيُمِيْتُ "زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے "وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ "اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی یار اور نہ کوئی مددگار۔

اگلی آیات کے اندران تینوں حضرات کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے اور ساتھ ساتھ باقیوں پر بھی جو اللہ کی عنایت ہوئی تھی اس کو ذکر کر دیا یہ مضمون ضمناً پہلے آپ کے سامنے آچکا ہے، اللہ تعالیٰ متوجہ ہو گیا نبی پر، متوجہ ہوا رحمت کے ساتھ اور مہاجرین وانصار پہ جنہوں نے اس کی اتباع کی تنگی کی گھڑی میں، مشکل وقت میں جو کام آئے، مشکل وقت میں متبع رہے خاص طور پر غزوہ تبوک اس کو غزوہ عسرہ اس لیے کہتے ہیں کہ بہت تنگی کے حالات میں پیش آیا تھا کہ گرمی کا موسم تھا، فصلیں پک رہی تھیں، سفر لمبا تھا، بہت بڑی فوج کے ساتھ مقابلہ تھا تو ایسے وقت میں بعض مخلصوں کے دل بھی ڈوبنے لگ گئے تو جنہوں نے ایسے وقت میں ساتھ دیا ان کے اوپر اللہ کی خصوصی توجہ ہے، جنہوں نے اتباع کی نبی کی اس تنگی کی گھڑی میں بعد اس کے کہ ایک فریق کے دل ٹیڑھے ہو گئے تھے پھر اللہ ان پہ متوجہ ہوا اور ان کو پھسلنے نہیں دیا، ان کو سنبھال لیا بے شک اللہ تعالیٰ مومنوں کے ساتھ نرمی کرنے والا ہے اور رحم کرنے والا ہے۔

اور ان تین پر بھی اللہ متوجہ ہو گیا جن کو پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا، معافی ملنے کے اعتبار سے جن کے معاملہ کو معلق کر دیا گیا تھا اس سے وہی تین افراد مراد ہیں جن کے نام پہلے آئے حتیٰ کہ جب ان کے اوپر زمین تنگ ہو گئی باوجود کشادگی کے، زمین کے تنگ ہونے کا مطلب ہوتا ہے کہ جیسے آپ مدرسہ کے اندر رہتے ہیں تو ہر طرف عزت ہے، احترام ہے، جہاں چاہو بیٹھو تو بڑی کشادگی معلوم ہوتی ہے اور اگر سارا ماحول ہی خلاف ہو جائے کہ کوئی بات کرنے کے لیے تیار نہیں، پاس بٹھانے کے لیے تیار نہیں تو اتنی کشادہ جگہ ہونے کے بعد ایسے محسوس ہو گا جیسے آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور پھر اگر اندر سے دل مطمئن ہو تو پھر بھی وقت آسانی سے گزر جاتا ہے لیکن اگر اندر سے دل ہی پریشان ہو گیا تو پھر ہر طرف سے پریشانی انسان کو گھیر لیتی ہے، ان تین حضرات کا یہی حال ہوا تھا کہ حضور ﷺ نے بائیکاٹ کروا دیا تھا، پچاس دن تک ان سے کوئی بولا نہیں تھا، نہ کوئی گھر کا بولے نہ کوئی باہر کا بولے اور اللہ اور اللہ کے رسول کی ناراضگی کے اندیشہ سے دل بھی انتہائی پریشان تھا تو ایسے تھا جیسے ان کے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی، زمین ان کے اوپر تنگ ہو گئی باوجود کشادہ ہونے کے اور ان کے اوپر ان کی اپنی جانیں بھی تنگ ہو گئیں اور وہ سمجھ گئے کہ اللہ کے

عذاب سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے مگر اللہ کی طرف یعنی اللہ کی طرف سے اگر پکڑ ہوگئی تو اس گرفت سے اللہ کے سامنے جھکنے سے ہی چھٹکارا ہوگا کوئی دوسری جگہ نہیں جہاں ہم بھاگ کے چلے جائیں پھر اللہ تعالیٰ ان پہ متوجہ ہوا تا کہ وہ بھی آئندہ اللہ کی طرف متوجہ رہیں بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ خود ان کی زبانی:

ان تین میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ نہایت شرح وبسط و عجیب موثر طرز میں بیان فرمایا ہے، صحیح بخاری وغیرہ میں ملاحظہ کیا جائے یہاں اس کے بعض اجزاء نقل کیے جاتے ہیں، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تبوک کی مہم چونکہ بہت سخت اور دشوار گزار تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو عام تیاری کا حکم دیا، لوگ مقدور و استطاعت کے موافق سامان سفر درست کرنے میں مشغول تھے مگر میں بے فکر تھا کہ جب چاہوں گا فوراً تیار ہو کر ساتھ چلا جاؤں گا کیونکہ بفضل ایزدی اس وقت ہر طرح کا سامان مجھ کو میسر تھا ایک چھوڑ دو سواریاں میرے پاس موجود تھیں، میں اسی غفلت کے نشے میں رہا کہ ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس ہزار مجاہدین اسلام کو کوچ کا حکم دے دیا، مجھے اب بھی یہ خیال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوگئے تو کیا ہے، اگلی منزل پہ آپ سے جا ملوں گا، آج چلوں کل چلوں اسی امروز و فردا میں وقت نکل گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک پہنچ کر فرمایا کہ "مَا فَعَلَ كَعْبُ بْنُ مَالِكٍ "کعب بن مالک کو کیا ہوا؟ بنوسلمہ کا ایک شخص بولا کہ یا رسول اللہ! اس کی عیش پسندی اور اعجاب و غرور نے نکلنے کی اجازت نہ دی، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تو نے بری بات کہی، خدا کی قسم ہم نے اس میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا، حضور رضی اللہ عنہ یہ گفتگو سن کے خاموش رہے، کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد بہت زیادہ وحشت اس سے ہوتی تھی کہ سارے مدینہ میں پکے منافق یا معذور مسلمانوں کے سوا مجھے کوئی مرد نظر نہیں آتا تھا بہر حال اب دل میں طرح طرح کے جھوٹے منصوبے گانٹھنے شروع کیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی پر فلاں عذر کر کے جان بچالوں گا مگر جس وقت معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیر و عافیت سے واپس تشریف لے آئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں رونق افروز تھے اصحاب کا مجمع تھا، منافقین جھوٹے حیلے بنا کر ظاہری گرفت سے چھوٹ رہے تھے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا میرے سلام کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ آمیز تبسم فرمایا اور غیر حاضری کی وجہ دریافت کی میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر میں دنیا والوں میں سے کسی کے سامنے ہوتا تو آپ دیکھتے کہ میں کس طرح سے زبان زوری اور چرب لسانی سے جھوٹے حیلے بہانے کر کے اپنے کو صاف بچا لیتا مگر یہاں تو معاملہ ایک ایسی ذات مقدس سے ہے کہ جسے جھوٹ بول کر اگر میں راضی بھی کرلوں تو تھوڑی دیر بعد خدا اس کو سچی بات پر مطلع کر

کے مجھ سے ناراض کردے گا برخلاف اس کے کہ سچ بولنے میں گو تھوڑی دیر کے لیے آپ کی خفگی برداشت کرنی پڑے گی لیکن امید کرتا ہوں کہ خدا کی طرف سے اس کا انجام بہتر ہوگا اور آخر کار سچ بولنا ہی مجھے خدا اور رسول کے غصہ سے نجات دلائے گا، یا رسول اللہ! واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس غیر حاضری کا کوئی عذر نہیں ہے جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کے شرف سے محروم ہوا اس وقت سے زیادہ فراخی اور مقدرت کبھی مجھ کو حاصل نہ ہوئی تھی، میں مجرم ہوں آپ کو اختیار ہے کہ جو چاہیں فیصلہ میرے حق میں دیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی اچھا جاؤ اور خدائی فیصلہ کا انتظار کرو۔

تینوں صحابیوں سے معاشرتی مطالبہ:

میں اٹھا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع یہ دو شخص بھی میرے جیسے ہی ہیں ہم تینوں کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ کوئی ہم سے بات نہ کرے، سب علیحدہ رہیں چنانچہ کوئی مسلمان ہم سے نہ بات کرتا تھا، نہ کوئی ہمارے سلام کا جواب دیتا تھا، وہ دونوں تو خانہ نشین ہوگئے شب و روز گھر میں وقف اور گریہ و بکا رہتے تھے میں ذرا سخت اور قوی تھا، مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کر کے دیکھتا تھا کہ جواب میں لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں، جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھتا تو آپ میری طرف سے منہ پھیر لیتے تھے مخصوص اقارب اور محبوب ترین بھی مجھ سے بیگانہ ہوگئے تھے، اسی روز ایک شخص نے بادشاہ غسان کا مجھے خط دیا جس پہ میری اظہار ہمدردی کرنے کے بعد دعوت دی تھی کہ میں اس کے ملک میں آجاؤں وہاں میری بہت آؤ بھگت ہوگی میں نے پڑھ کر کہا کہ یہ بھی ایک مستقل امتحان ہے آخر وہ خط میں نے نذر آتش کر دیا، چالیس دن کے گزرنے کے بعد دربار رسالت سے جدید حکم پہنچا کہ میں اپنی بیوی سے بھی علیحدہ رہوں چنانچہ میں نے اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ میکے چلی جائے اور جب تک خدا کے یہاں سے میرا کوئی فیصلہ نہ ہو جائے وہیں ٹھہری رہے، سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اسی حالت میں اگر موت آگئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ نہیں پڑھیں گے اور فرض کیجئے کہ اگر ان دنوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو مسلمان یہی معاملہ مجھ سے رکھیں گے میری میت کے قریب بھی کوئی نہیں آئے گا۔

غرض پچاس دن اسی حالت میں گزرے کہ خدا کی زمین باوجود کشادگی کے مجھ پہ تنگ تھی بلکہ عرصہ دراز تنگ ہوگیا تھا، زندگی موت سے زیادہ تنگ معلوم ہوتی تھی کہ یکایک جبل سلع سے آواز آئی کہ "یَا کَعْبُ بْنُ مَالِكٍ أَبْشِرْ" اے کعب بن مالک! خوش ہو جا میں سنتے ہی سجدے میں گر پڑا معلوم ہوا کہ اخیر شب میں حق تعالیٰ کی طرف

سے پیغمبر علیہ السلام کو خوشخبری دی گئی کہ ہماری توبہ قبول ہے، آپ ﷺ نے بعد نماز فجر صحابہ کو مطلع فرمایا، ایک سوار میری طرف دوڑا کہ بشارت سنائے مگر دوسرے شخص نے زور سے پہاڑ سے للکارا اس کی آواز سوار سے پہلے پہنچی اور میں نے اپنے کپڑے اتار کر آواز لگانے والے کو دیے پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، لوگ جوق در جوق آتے تھے مجھے مبارک باد دیتے تھے، مہاجرین میں سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے مجھے کھڑے ہو کے مصافحہ کیا، حضور ﷺ کا چہرہ خوشی سے چاند کی طرح چمک رہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے تیری توبہ قبول فرمائی ہے میں نے کہا کہ اس توبہ کا تتمہ یہ ہے کہ میں اپنا کل مال اور جائیداد اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہوں آپ ﷺ نے فرمایا سب نہیں کچھ اپنے لیے روک لو چنانچہ میں نے کچھ حصہ الگ کر کے باقی مال صدقہ کر دیا کیونکہ محض سچ بولنے سے مجھے نجات ملی تھی اس لیے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو آئندہ کبھی بھی جھوٹ نہ بولوں گا اس عہد کے بعد بڑے سخت امتحانات پیش آئے مگر الحمد للہ میں سچ کہنے سے نہیں ہٹا اور نہ انشاء اللہ تازیست ہٹوں گا، یہ واقعہ ہے جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے گویا کہ ان تینوں پر خدا کی مہربانی تو یہی تھی کہ ایمان واخلاص بخشا، نفاق سے بچایا اب نئی مہربانی یہ ہوئی کہ توبہ نصوح کی توفیق دے کر پھر اپنی طرف کھینچ لیا اور کوتاہیوں کو معاف فرما دیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ مَا كَانَ

اے ایمان والو ! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو ﴿۱۱۹﴾ نہیں مناسب

لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا

اہل مدینہ کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو مدینہ کے ارد گرد رہتے ہیں کہ پیچھے رہ جایا کریں

عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ

اللہ کے رسول سے اور نہ یہ کہ اپنی جانوں کی طرف رغبت کریں نبی کی جان سے اعراض کر کے یہ

بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ

اس وجہ سے ہے کہ بے شک نہیں پہنچتی ان لوگوں کو پیاس اور نہ کوئی مشقت اور نہ بھوک اللہ کے راستے میں

اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ

اور نہیں روندتے کسی روندنے کی جگہ کو جو کفار کو غصہ میں ڈالے اور نہیں حاصل کرتے یہ دشمن سے

نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ

کچھ حاصل کرنا مگر لکھا جاتا ہے اس کے بدلے میں ان کے لیے نیک عمل بے شک اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا اجر

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً

محسنین کا ﴿۱۲۰﴾ نہیں وہ خرچ کرتے مال تھوڑا نہ زیادہ

وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا

اور نہیں قطع کرتے وہ کسی وادی کو مگر یہ عمل ان کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ بدلہ دے اللہ ان کو بہترین بدلہ

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا

ان کاموں کا جو وہ کرتے تھے ﴿۱۲۱﴾ نہیں مناسب مؤمنوں کے لیے کہ نکل جایا کریں سارے ہی کیوں نہ

نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ

کوچ کیا ان کی بڑی جماعت میں سے چھوٹی جماعت نے تاکہ وہ سمجھ حاصل کریں دین میں

وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ يٰٓاَيُّهَا

اور تا کہ وہ ڈرائیں اپنی قوم کو جب وہ لوٹ کے آئیں ان کی طرف تا کہ وہ ڈریں ﴿۱۲۲﴾ اے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ

ایمان والو لڑائی کرو ان کافروں سے جو تمہارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ کافر تمہارے اندر محسوس کریں

غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ

سختی اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے ﴿۱۲۳﴾ اور جب کوئی سورۃ اتاری جاتی ہے

فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

تو ان میں سے بعض کہتا ہے کہ تم میں سے کون ہے کہ جس کو زیادہ کیا ہو اس سورۃ نے از روئے ایمان کے پس وہ لوگ

اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ

جو ایمان لے آئے یہ سورۃ بڑھاتی ہے ان کو از روئے ایمان کے اور وہ خوش ہوتے ہیں ﴿۱۲۴﴾ لیکن وہ لوگ جن کے

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا

دلوں میں بیماری ہے تو یہ سورۃ زیادہ کرتی ہے انہیں پلیدی پالیدی کے ساتھ اور وہ مرتے ہیں

وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً

اس حال میں کہ کافر ہوتے ہیں ﴿۱۲۵﴾ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ وہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں ہر سال ایک مرتبہ

اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ

یا دو مرتبہ پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ وہ نصیحت حاصل کرتے ہیں ﴿۱۲۶﴾ اور جب اتاری جاتی ہے

سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ۭ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ

کوئی سورۃ تو جھانکتا ہے ان کا بعض بعض کی طرف کہ کیا تمہیں کوئی دیکھ رہا ہے پھر

انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اٹھ کے چلے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے اس وجہ سے کہ وہ سمجھدار نہیں ﴿۱۲۷﴾

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ

البتہ آگیا رسول تم میں سے ہی گراں ہے اس پر تمہارا مشقت میں پڑ جانا

حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا

حریص ہے تمہارے نفع پر بالخصوص مومنوں کے ساتھ بہت نرمی اور رحم کرنے والا ہے ﴿۱۲۸﴾ پھر اگر یہ پیٹھ پھیر لیں

فَقُلۡ حَسۡبِىَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ

تو آپ کہہ دیجیے کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے اس کے بغیر کوئی معبود نہیں میں نے اس کے اوپر بھروسہ کیا اور وہ رب ہے

الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۱۲۹﴾

عرش عظیم کا ﴿۱۲۹﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

سورۃ اختتام کو پہنچ رہی ہے واقعات تفصیل کے ساتھ گزر گئے خصوصیت کے ساتھ وہ واقعات جو غزوہ تبوک سے تعلق رکھتے ہیں پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کے حال پہ توجہ فرمانے کا ذکر تھا جنہوں نے اس غزوہ میں کوتاہی کی تھی اور پھر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کے اپنی غلطی کا اقرار کر لیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے معاملہ کو ملتوی کر دیا تھا پچاس دن کے بعد پھر ان کی توبہ قبول ہوئی خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر پچھلی آیات میں کیا گیا تھا اگلی آیات میں نصیحت کرنا مقصود ہے کہ آئندہ اس قسم کے حالات نہ ہونے پائیں۔

خوف خدا اور صادقین کی رفاقت کا فائدہ:

پہلے تو یہ کہا کہ اللہ سے ڈرو، دل میں تقویٰ ہونا چاہیے، اللہ کا خوف دل میں ہو اور پھر رفاقت صادقین کی اختیار کرو، صادقین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے قول فعل میں سچے ہیں، جن کا فعل اور قول ایک جیسا ہے، قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہے، دو باتیں آ گئیں دل میں تقویٰ اور صادقین کی رفاقت۔

اصل یہ ہے کہ انسان کے سیدھا رہنے کے لیے اور لغزش سے بچنے کے لیے دونوں باتیں ہی ضروری ہیں،

دل میں خدا کا خوف ہو تو دل شیطان کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے اور قلب کے اندر نافرمانی نہیں گھستی، جب دل کے اندر اللہ کا خوف ہو تو دل میں نافرمانی کے جذبات نہیں رہ سکتے اور اچھے ماحول کے اندر رہنا یہ باہر سے شیطانی حملوں سے حفاظت کرتا ہے کہ جب انسان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے لوگ اچھے ہوں گے اور اس کا ماحول اچھا ہوگا اس نے اپنے اردگرد اچھے لوگوں کو جمع کیا ہوا ہوگا تو پھر برائی قریب نہیں آتی، اچھائی کا ماحول انسان کو اچھائی کی طرف لے جاتا ہے، انسان کی نشو نما میں اس کے ماحول کا بہت اثر ہے تو جس وقت تم ان لوگوں کے ساتھ اٹھو بیٹھو گے کہ جن کی زبان اچھی، جن کا کردار اچھا، جن کے جذبات اچھے، جن کا عمل اچھا تو لازماً ان کے ساتھ مل کر تمہیں بھی اچھے کام کرنے کی عادت پڑے گی۔

اور جہاد کے اندر جن لوگوں سے کوتاہی ہوئی ہو سکتا ہے کہ اس میں کسی درجے میں منافقین کی رفاقت کا دخل ہو کہ منافق خود جہاد کے لیے آمادہ نہیں تھے اور باتیں اس قسم کی کرتے تھے کہ جن سے جہاد کی اہمیت کم ہوتی تھی تو ہو سکتا ہے ان کی باتیں کسی درجے میں اثر انداز ہوئی ہوں جس کی وجہ سے ان پر سستی طاری ہوئی تو یہ خصوصیت کے ساتھ تنبیہ کر دی گئی کہ اپنے رفیق اور اپنے ساتھی ایسے لوگوں کو بناؤ جو کردار کے پکے ہیں، قول کے سچے ہیں تو پھر اس قسم کی کوتاہی نہیں ہوگی۔

نیک صحبت کے فوائد اور بری صحبت کے نقصانات:

صحبت اور رفاقت انسان کے خیالات کے بدلنے میں بہت دخیل ہے اس لیے سرور کائنات ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ تاکید فرمائی کہ بری صحبت سے بچو اور اچھی صحبت اختیار کرو ایک روایت میں ہے "اَلْوَحْدَةُ خَيْرٌ مِّنْ جَلِيْسِ السُّوْءِ وَالْجَلِيْسُ الصَّالِحُ خَيْرٌ مِّنَ الْوَحْدَةِ" برے ساتھی سے تو بہتر ہے کہ انسان تنہائی میں زندگی گزار لے اور تنہائی سے اچھا ساتھی بہتر ہے یعنی اگر کسی کو اچھا ساتھی مل جائے جس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اس کے لیے علم میں اضافہ کا باعث بنے اس قسم کے ساتھی کا اپنے ساتھ رہنا یہ خلوت میں بیٹھنے سے بہتر ہے اور اگر کوئی اس قسم کا دوست ہو جو اس قسم کی باتیں کرتا ہے کہ جس کے ساتھ برائی کو تقویت پہنچتی ہے، انسان کا دل و دماغ خراب ہوتا ہے، خود اس کا کردار خراب ہے اور دوسرے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے تو ایسے دوست سے تنہائی اور علیحدگی بہتر ہے مولانا رومی رحمہ اللہ نے اس بات کو بیان فرمایا کہ "یارِ بد بدتر زمارِ بد" برا دوست مارِ بد سے بھی برا ہے، مارِ بد کا معنی زہریلا سانپ، برا دوست زہریلے سانپ سے بھی برا ہے وجہ اس کی ظاہر ہے کہ سانپ اگر ڈس جائے گا، سانپ اگر کاٹے گا تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ مر جاؤ گے تو یہ کوئی نیا کام نہیں ہے، سانپ کے ڈسنے کے ساتھ مر

کوئی نئی بات نہیں ہے سانپ نہیں ڈسے گا ویسے مر جاؤ گے، بیمار ہو کے مر وگے، کسی حادثہ کا شکار ہو کے مر جاؤ گے اس سے زیادہ تو کوئی بات نہیں ہے، سانپ کے ڈسنے کے ساتھ کوئی نئی بات نہیں پیش آئے گی پس یہی ہے کہ مر جاؤ گے لیکن اگر یار بد کی زہر انسان کو چڑھ جائے تو پھر صرف یہی نہیں کہ وہ مرتا ہے بلکہ اس سے دنیا بھی برباد ہوتی ہے اور آخرت بھی برباد ہوتی ہے۔

سانپ کا ڈسا آخرت میں روئے گا نہیں لیکن یار کا کاٹا روئے گا اور اس کے رونے کی چیخیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر سنائی ہیں "يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا" ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور کہے گا ہائے افسوس میری بربادی کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں فلاں کو دوست نہ بناتا "لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي" میرے پاس نصیحت آگئی تھی لیکن اس دوست نے مجھے اس پر عمل نہیں کرنے دیا، اس خلیل نے مجھے نیکی نہیں کرنے دی یہ اس کی چیخیں ہیں جو اس کی قیامت کے دن ہوں گی اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے تو برے یار کا ڈسا ہوا قیامت میں چیخے گا سانپ کا ڈسا ہوا قیامت میں روئے گا نہیں۔

"اَلْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ" جتنے دوست ہیں وہ سب قیامت کے دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، دشمن بھی اس طرح کہ آج تم جن دوستوں کے متعلق کہتے ہو کہ ان کے بغیر وقت نہیں گزرتا جیسے جب ایک دوست دوسرے دوست سے دور ہو جائے تو کہا کرتے ہیں کہ خاک ایسی زندگی پہ تم کہاں اور ہم کہاں زندگی تو وہی ہے جو اکٹھے رہنے والی ہو لیکن اگر وہ دوست ایسا ہے جو نیکی سے روکتا ہے اور برائی کی طرف لے جاتا ہے اور آپ کی طبیعت کے اوپر اثر ڈالتا ہے تو قیامت کے دن اس دوست کے متعلق یہ جذبات ہوں گے کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ایک مشرق میں ہوتا اور ایک مغرب میں ہوتا اتنی دوری ہمارے درمیان ہوتی کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوتی اس قسم کے دوستوں کے متعلق پھر ایسے جذبات ہوں گے اور "إِلَّا الْمُتَّقِينَ" کہہ کے بتا دیا کہ جن کی دوستی بنیاد تقویٰ پہ ہے ان کی دوستیاں آخرت میں مفید ہوں گی، یہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوں گے کیونکہ جو متقین ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کو تقویٰ کی تلقین کرنے کے لیے معاون ہوتے ہیں اور یہ معاونت آخرت میں بھی مفید ہوگی اور اس رفاقت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت حاصل ہوگی، جس محبت کی بنیاد اللہ سے تعلق پہ ہو یہ عمل اللہ کے ہاں بہت مقبول ہے قیامت کے دن کہ جس وقت سخت گرمی ہوگی لوگ سائے کو ترسیں گے تو سات نیک بخت آدمی ایسے ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دیں گے جس دن کوئی سایہ نہیں ہوگا ان میں ایک یہ بھی ہے "رَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللهِ اِجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ" وہ دو شخص جن کی اللہ واسطے آپس میں محبت

ہے، اللہ کے تعلق کی بناء پر آپس میں تعلق رکھتے ہیں، اکٹھے ہوتے ہیں تو اس محبت پر اور جدا ہوتے ہیں تو اس محبت پر یہ نہیں کہ صرف منہ دیکھی محبت ہے آپس میں ایک دوسرے سے جدا ہوں تو بھی اس محبت پہ ہوتے ہیں۔

اور اسی صحبت کے مسئلہ کو سمجھانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال بھی دی کہ اچھے دوست کی مثال کستوری بیچنے والے کی طرح ہے اگر کوئی آدمی اس کے پاس بیٹھے گا تو کبھی تو وہ خود ہی ہدیۃً دے دے گا جیسے خوشبو بیچنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر پاس بیٹھنے والے کو خوشبو لگا دیتے ہیں تو آپ کو خوشبو حاصل ہو جائے گی اور کبھی ایسا ہو گا کہ آپ قیمتاً خرید لیں گے اور اگر خرید و گے نہیں تو کم از کم جب تک وہاں بیٹھے رہو گے دماغ تو معطر رہے گا تو اسی طرح نیک صحبت ہے کہ جس وقت کسی نیک آدمی کے پاس بیٹھو گے تو بسا اوقات انسان دیکھا دیکھی بغیر کسی مجاہدے کے نیک عادت اختیار کر لیتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کوئی عادت پسند آ گئی تو انسان مشقت اٹھا کے وہ عادت ڈال لیتا ہے اور کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم جب تک اچھے ماحول میں بیٹھو گے تو کوئی اللہ کا نام سنو گے، اللہ کے لیے کیا گیا کوئی کام دیکھو گے تو طبیعت پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا بلکہ اچھا اثر پڑے گا یہ مثال تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک صحبت کی دی۔

اور بری صحبت کی مثال دی بھٹی دھونکنے والے کے ساتھ کہ اگر ان کے ساتھ یاری لگا لو اور ان کے پاس جا کے بیٹھ جاؤ یا تو کوئی چنگاری اڑے گی اور آپ کے کپڑوں کو جلا دے گی اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو آپ جتنی دیر تک اس ماحول میں بیٹھو گے دھوئیں کی وجہ سے آنکھوں سے پانی ٹپکتا رہے گا بہر حال اس میں کوئی اچھی بات نہیں ہے تو برے ماحول کی یہی مثال ہوتی ہے۔

یہ بہت اہم بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہاں ذکر فرمائی ہے کہ اپنے قلب کے اندر بھی تقویٰ پیدا کرو تو تمہارے او پر شیطان کا حملہ نہیں ہو گا اور اپنے ارد گرد صادقین کا مجمع رکھو، صادقین کے اندر شامل ہو کے رہو تو برائی تمہارے قریب نہیں آئے گی اور جب صادقین سے علیحدہ ہو کے کسی دوسرے ماحول میں جاؤ گے تو شیطان کا حملہ ہو جائے گا ورنہ نیکوں کی مجلس میں بیٹھنے والا شیطان کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے یہ تاکید کر دی کہ جب تم اپنے رفقاء ایسے لوگوں کو بناؤ گے تو پھر کسی کام میں کوتاہی نہیں ہو گی۔

"مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا" کا مفہوم:

آگے یہ ترغیب دی گئی ہے دو لفظوں سے نفی نہیں ہے کہ اہل مدینہ شہری لوگ ان کو بھی نہیں چاہیے

اور ارد گرد جو بدو موجود ہیں ان کو بھی نہیں چاہیے کہ اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جائیں، اللہ کے رسول کے مقابلہ میں اپنی جان کو عزیز رکھیں، یہ مناسب نہیں ہے کہ اللہ کا رسول تو گرمی میں طویل سفر پہ جاتا ہے، مشقت اٹھاتا ہو اور تم گھر کے اندر عیش و عشرت میں مبتلاء رہو، سائے میں بیٹھے رہو، گھر کی نعمتیں کھاتے رہو، یہ مناسب نہیں ہے، اللہ کے رسول کے مقابلہ میں اپنی جان کو عزیز نہ سمجھیں، یہ جو ہم ترغیب دے رہے ہیں کہ ایسا تخلف نہیں کرنا چاہیے بلکہ رفاقت اختیار کرنی چاہیے یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے، اس میں نقصان کا کوئی پہلو نہیں ہے، گھر میں بیٹھے رہو گے پیچھے رہو گے تو ٹھیک ہے چند دن کا آرام ہے لیکن پھر خسارہ ہی خسارہ ہے اور اگر اللہ کے نبی کے ساتھ نکلو گے، مشقت اٹھاؤ گے تو اس میں اگر تمہیں ٹھوکر لگے گی تو وہ بھی تمہارے درجات بلند کرے گی، جو تکلیف پہنچے گی وہ اللہ کی رضا کا باعث بنے گی تو ساتھ رہنے میں بہر حال فائدہ ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ نہیں پہنچتی ان کو پیاس نہ کوئی مشقت اور نہ بھوک اللہ کے راستے میں اور نہ چلتے کوئی چلنا جو کفار کے لیے غصہ کا باعث ہو، کوئی اقدام اس قسم کا ہو کہ جس کے ساتھ کافروں کا حوصلہ پست ہوتا ہے، دشمن کو کوئی نقصان پہنچائیں، دشمن سے کوئی چیز حاصل کریں ان سب کی وجہ سے ان کے لیے عمل صالح لکھا جاتا ہے۔

اب یہاں ہے "کُتِبَ لَهُمْ بِهٖ" کہ اس کی وجہ سے عمل صالح لکھا جاتا ہے کیونکہ ان میں سے اکثر کام ایسے ہیں جو غیر اختیاری ہیں، پیاس لگنا غیر اختیاری ہے اس میں آپ کے عمل کا دخل نہیں لیکن پیاس آپ کو لگی اللہ تعالیٰ اس کو بھی آپ کے لیے باعث اجر لکھے گا، بھوک لگنا غیر اختیاری چیز ہے، بھوک کو بھی اللہ آپ کے لیے اجر کا باعث لکھے گا، کوئی مشقت یا کوئی اور کسی قسم کی تکلیف آگئی اور کافروں کا جلنا بھی غیر اختیاری ہے، جلیں گے کافر اور درجات آپ کے بلند ہوں گے، تمہاری وجہ سے اگر کوئی کسی قسم کی تکلیف پہنچے یہ آخرت میں ثواب کا باعث ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ" بے شک اللہ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا گویا کہ احسان کی صفت اپناؤ تو پھر تمہاری بھوک پیاس اور جو قدم بھی اللہ کے راستے میں اٹھے گا سب اجر کا باعث ہے اور احسان یہی ہوتا ہے کہ دل میں خلوص ہو، اللہ اور اللہ کے رسول کی خیر خواہی ہو اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہی عمل کیا جائے تو پھر ہر نقل و حرکت عمل صالح کا باعث ہے۔

اور جو بھی وہ اللہ کے راستے میں خرچ کریں چاہے تھوڑا ہو یا زیادہ اور کسی وادی کو روندیں یہ سب ان کے لیے لکھا جائے گا یہ خرچ کرنا چونکہ اپنا عمل ہے، وادی کو قطع کرنا خود اپنا عمل ہے تو یہ عمل بھی ان کے لیے لکھا جائے گا

اللہ تعالیٰ سب ریکارڈ محفوظ کرلیں گے تاکہ ان کے لیے ان کے عملوں کا بہترین بدلہ دیں دیکھو! یہ کتنے نفع کی چیز ہے جس طرح تمہیں ترغیب دی جا رہی ہے تو اس قسم کے کارآمد سفر کو چھوڑ کے گھر بیٹھ جانا یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے۔

جہاد فرض کفایہ ہے:

اگلی آیات کا حاصل یہ ہے کہ یہ تو واقعہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے، فرض کفایہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی شخص معین کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اجتماعی طور پر ساری قوم کی ذمہ داری ہے یہ اجتماعی ذمہ داری ہے، انفرادی ذمہ داری نہیں ہے، جس طرح کسی مسلمان کا نماز جنازہ پڑھنا اور اس کے کفن دفن کا انتظام کرنا یہ اجتماعی ذمہ داری ہے، یہ ایک فرد کی ذمہ داری نہیں ہے اسی طرح جہاد بھی اجتماعی ذمہ داری ہے اتنے لوگ اگر اس میں لگیں کہ جس سے ضرورت پوری ہو جائے تو باقی سارے کے سارے اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، چند آدمیوں نے مل کے کفن دفن کا انتظام کرلیا، جنازہ پڑھ لیا تو سارے مسلمان اس سے بری ہو جائیں گے تو جہاد میں بھی اتنے لوگوں کو لگنا چاہیے اور باقی لوگ اپنی دوسری ضروریات میں لگیں آخر زندگی میں اور بھی بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں انسانوں کی ضرورت ہے، وہ ہوں گے تو کام بنے گا، وہ نہیں ہوں گے تو کام نہیں بنے گا تو سب کو نہیں جانا چاہیے کچھ لوگ پیچھے بھی رہ جائیں۔

لیکن اگر امام کی طرف سے نفیر عام ہو جائے، اعلان عام ہو جائے تو پھر اس موقع پر جہاد فرض ہو جائے گا کسی کا پیچھے رہنا جائز نہیں ہے جیسا کہ غزوہ تبوک کے موقع پر صورتحال یہی پیش آئی تھی کہ حضور ﷺ کی طرف سے نفیر عام ہو گیا تھا، عام اعلان ہو گیا تھا کہ سب چلو یہی وجہ ہے کہ پیچھے رہنے والوں کے اوپر انکار کیا گیا اور ان کی مذمت کی گئی یا ان کو سزا دی گئی۔

چونکہ اس سلسلہ میں بہت طویل آیات آ گئیں کہ جہاد میں پیچھے رہنے والوں پر ملامت کی گئی تو کوئی شخص یہاں سے یہ تاثر لے سکتا ہے کہ جب بھی جہاد کا موقع آئے تو سب کو نکل پڑنا چاہیے ورنہ جو پیچھے رہ جائیں گے ان کی اسی طرح مرمت ہوگی جس طرح ان کی ہوئی تھی تو یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ جب جہاد کا موقع ہو تو سب کو جانے کی ضرورت نہیں ہے عام حالات میں یہی حکم ہے ہاں البتہ خصوصی حالات کے تحت جب امام کی طرف سے اعلان ہو جائے تو پھر یہ فرض عین ہو جائے گا پھر اگر ضرورت پیش آ جائے تو بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو بھی نکلنا پڑے گا یہ حکم امام کے اعلان پر ہے ورنہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں ہے۔

جہاد کی طرح علم حاصل کرنا بھی فرض ہے:

یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بات کو واضح کرنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ سارے لوگ نہ جایا کریں، بڑی جماعت میں سے کوئی چھوٹی جماعت چلی جائے اور باقی جو رہ جائیں وہ علم حاصل کریں، فقہ فی الدین حاصل کریں، اس ضرورت کو خصوصیت کے ساتھ سامنے رکھا ہے کیونکہ جس طرح جہاد جماعتی طور پر فرض ہے اس طرح جماعتی طور پر تفقہ فی الدین بھی فرض ہے لیکن اس کے دو درجے ہیں، ایک فرض عین کا ہے اور ایک فرض کفایہ کا ہے، فرض عین تو یہ ہے کہ وہ ضروریات جو انسان کو پیش آتی ہیں ان کے احکام حاصل کرے، آپ بالغ ہو گئے تو غسل کے احکام، نماز کے احکام، روزہ کے احکام حاصل کریں، آپ اگر مالدار ہیں تو زکوٰۃ کے احکام، حج کا ارادہ کر لیا ہے تو حج کے احکام، شادی ہوگئی تو بیوی کے حقوق اور اولاد کے حقوق، اپنے خاندان کے حقوق اس قسم کی چیزیں جو ہر شخص کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اتنا علم حاصل کرنا تو ہر کسی کے ذمہ فرض ہے۔

اور اتنا علم حاصل کر لینا کہ سارا قرآن سمجھ میں آجائے، ساری سنت پہ نظر ہو جائے تا کہ کسی کو کوئی واقعہ پیش آجائے اور وہ آپ سے پوچھے تو آپ اس کا جواب دے سکیں یہ فرض کفایہ ہے یہ ہر شخص کے بس میں نہیں ہے اور ہر شخص یہ مہارت بھی حاصل نہیں کر سکتا لیکن جماعت کے اندر اتنے لوگوں کا موجود رہنا ضروری ہے کہ جو بوقتِ ضرورت اس مسئلہ کو حل کر سکیں اگر سارے کا سارا علاقہ اور سارا شہر اس سے خالی ہو جائے کہ کوئی مسئلہ بتانے والا نہیں، فتویٰ دینے والا کوئی نہیں تو ساری کی ساری جماعت اور سارے مسلمان گنہگار ہیں جیسے جہاد فرض ہے اسی طرح علم حاصل کرنا بھی فرض ہے، فرض عین کے درجے میں بھی اور فرض کفایہ کے درجے میں بھی تو یہاں کہا جا رہا ہے کہ جہاد کے موقع پر بھی طالب علموں کو اور پڑھنے پڑھانے والوں کو پیچھے رہ جانا چاہیے تا کہ وہ اپنے علم میں مہارت پیدا کریں، فقہ فی الدین حاصل کریں، جس وقت جہاد کرنے والے جہاد کر کے واپس آئیں تو ان کے سامنے تبلیغ کریں اور انہیں دین کی باتیں سمجھائیں یہ بھی ایک بہت بڑا فرض ہے۔

لیکن یہاں صورت یوں ہو سکتی ہے کہ اگر تو رسول اللہ ﷺ سفر پہ تشریف لے جائیں تو آپ ﷺ کے ساتھ جانے والی جماعت علم حاصل کرے گی اور جب واپس لوٹیں گے تو آ کے پچھلی قوم کو ڈرائیں گے اور اگر رسول اللہ ﷺ شہر میں ہوں اور کوئی جماعت بھیجی ہو تو یہ پیچھے رہنے والے علم حاصل کریں تا کہ جب جہاد کرنے والے واپس آئیں تو یہ ان کے سامنے انذار کریں اس کا مفہوم دونوں طرح ہو سکتا ہے، حضور ﷺ کی زندگی میں دونوں

صورتیں ہوسکتی ہیں بعد میں حال یہی ہوگا کہ جہاد پر جانے والے چلے جائیں اور پیچھے رہنے والے تفقہ فی الدین حاصل کریں اور تفقہ فی الدین حاصل کر کے باقی قوم کو بھی تبلیغ کریں اور جب جہاد کرنے والے واپس آئیں تو ان کو بھی اللہ کے احکام بتائیں تو علم کا درجہ جہاد کے برابر ٹھہرا دیا گیا اس لیے مجاہدین میدان میں جا کے جہاد کریں اور اہل علم اپنے علم پر محنت کریں تا کہ دین کی سمجھ حاصل ہو جائے، دین محفوظ ہو جائے اور دوسروں تک دین پہنچایا جائے یہ بھی کوئی کم درجہ نہیں ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو بھی علم کی طلب میں نکلتا ہے "مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ" جو علم حاصل کرنے کے لیے نکلتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے جہاد کے لیے نکلتا ہے جب تک واپس نہ آجائے اس درجہ کا طالب علم بھی مجاہدین جیسا ہی ہوتا ہے اور اس کی اہمیت واضح ہوگئی کہ جہاد جیسے شغل کے وقت بھی کہا گیا ہے کہ ایک جماعت رہے جو دین کا علم حاصل کرے یہ بہت ضروری ہے۔

اور آجکل ہمارے ہاں جو افراتفری ہوگئی کہ کہیں کوئی تحریک چل پڑے تو لوگ کہتے ہیں کہ سب مولوی طالب علم، سب مدارس والے باہر نکل آئیں یہ بہت بڑی بے اعتدالی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم پہ زوال آگیا اور اس کی وجہ سے علم اٹھتا جا رہا ہے، سب کے میدان میں نکلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ میدان بھی ہاتھ سے گیا اور وہ گوشہ مدرسہ اور مسجد بھی ہاتھ سے گئی یہ افراتفری نہیں ہونی چاہیے جس طرح وہ کام بھی اہم ہے کہ باطل کے خلاف تحریک چلائی جائے اسی طرح یہ کام بھی اہم ہے کہ علم کو محفوظ کرلیا جائے اور دین کی سمجھ پیدا کی جائے سب کو کھینچ لینا ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی عمارت بنانے لگیں تو تقسیم کار ہے کوئی اینٹیں اٹھائے گا، کوئی گارا بنائے گا، کوئی اینٹیں چنے گا، کوئی باہر سے لائے گا یہ سارے اس طرح تقسیم کار کے ساتھ چلیں گے تو عمارت اپنی صحیح رفتار کے ساتھ بنتی چلی جائے گی اور اگر سارے اینٹیں ہی اٹھانے لگ جائیں یا سارے گارا ہی بنانے لگ جائیں تو اس طرح کام خراب ہو جاتا ہے تو دینی ضرورتیں اور دنیوی ضرورتیں بھی اس طرح کی تقسیم چاہتی ہیں کہ کچھ لوگ یہ کام کریں اور کچھ لوگ وہ کام کریں اس لیے پڑھنے پڑھانے والوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ ان تحریکات میں عملاً حصہ نہ لیں بلکہ ان کو چاہیے کہ دین کی سمجھ حاصل کرنے میں لگ جائیں اور جس وقت کامل اور فاضل ہو جائیں تو پھر میدان میں نکل کے قوم کی قیادت کریں، حصول علم کے وقت اس قسم کے مشاغل اختیار کرنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ یہ درجہ بھی جہاد کے برابر ہے اس لیے خلوت میں بیٹھنے والے، درس گاہوں میں بیٹھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم جہاد نہیں کر رہے، دین کی سمجھ حاصل کرنا بھی بہت بڑا جہاد ہے۔

یہاں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ "وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً" مؤمنوں کے لیے یہ مناسب نہیں یعنی عام حالات میں کہ وہ سارے کے سارے ہی کوچ کرلیا کریں "فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ" کیوں نہیں جاتی ان کی بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت "لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ" تا کہ وہ جانے والے فقہ فی الدین حاصل کریں یہ صورت اس وقت صادق آئے گی کہ جب حضور ﷺ کے ساتھ سفر پہ جائیں یا تا کہ وہ باقی رہنے والے فقہ فی الدین حاصل کریں، موقع محل کے مطابق یہ بات دونوں پہ صادق آتی ہے، سرور کائنات ﷺ کی زندگی میں یہ دونوں صورتیں پیش آسکتی تھیں "وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ" اور تا کہ یہ اپنی قوم کو ڈرائیں یہاں وہ ڈرانا ہے جو شفقت کے ساتھ ہوتا ہے "اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ" جس وقت وہ ان کی طرف لوٹ کے آئیں "لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ" تا کہ وہ لوگ بچیں، اللہ کی نافرمانی اختیار نہ کریں۔

"يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ" کا مفہوم:

اے ایمان والو! لڑائی کرو ان کفار کے ساتھ جو تمہارے قریب ہیں یعنی ترتیب جہاد کی یہ رکھو، قریب ہیں یعنی مکان کے اعتبار سے جن کی سرحدیں تمہارے ساتھ لگتی ہیں پہلے تو قتال ان کے ساتھ ہو، قریب والوں کو چھوڑ کے دور والوں کے ساتھ جا کے لڑو گے تو اس میں بسا اوقات کامیابی کی بجائے خطرات زیادہ ہوتے ہیں کہ جن کو چھوڑ کے آپ آگے نکل گئے ہیں وہ فتنہ کھڑا کر سکتے ہیں اس لیے ترتیب ایسی ہونی چاہیے کہ جو قریب والے ہیں پہلے ان سے قتال ہو، قریب کے علاقے فتح ہو جائیں تو پھر آگے چلو جیسا کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں بھی ایسا ہوا اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں بھی ایسے ہی ہوا۔

اور اسی طرح "يَلُوْنَكُمْ" سے مراد قرب نسبی بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نہیں کہ صرف لڑنا غیروں سے ہی ہے اگر اپنے بھی سیدھے نہیں ہیں تو ان کے ساتھ بھی قتال کرو، اقرباء کی محبت میں مبتلاء ہو کے جہاد کو ترک نہ کرو یہ مؤمن کے لیے ایک بہت بڑا امتحان ہے کہ اللہ کے نام پر اپنے اقرباء کے خلاف تلوار اٹھائے جس طرح اس امتحان میں صحابہ کرام مبتلاء ہوئے اور کامیاب رہے اور اگر اپنے اقرباء کی محبت میں مبتلاء ہو کے ان کے خلاف ڈنڈا نہیں اٹھاؤ گے تو یہ کمزوری ہوگی جب دو جماعتیں بن گئیں کافر اور مسلم تو اب چاہے کوئی تمہارے قریب ہیں یا کوئی تمہارے بعید والے ہیں تو اب کسی کا لحاظ نہیں ہے "وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً" وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں، تمہارے اندر نرمی محسوس نہ کریں ان کو یقین ہونا چاہیے کہ اللہ والے اللہ کے نام پر جب اٹھتے ہیں تو پھر یہ نہیں دیکھتے کہ کون ہمارا

رشتہ دار ہے اور کون ہمارا رشتہ دار نہیں ہے جو کافر ہیں، جو اللہ کے منکر ہیں، جو مشرک ہیں ان سب کے مقابلہ میں ان کے جذبات ایک جیسے ہیں "يَلُوْنَكُمْ" کے اندر یہ مفہوم بھی آسکتا ہے جس طرح تبلیغ میں ترتیب بھی یہی ہے کہ "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" "اپنے قریب والے قبیلہ کو ڈراؤ، سرور کائنات ﷺ نے جس وقت تبلیغ کی ابتداء کی تھی تو روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے اترنے کے بعد اپنے سارے خاندانوں کو اکٹھا کیا صفاء پہاڑی کے پاس پھر سب سے پہلے انہی کے سامنے دین پیش کیا اور بنیاد اس بات سے اٹھائی کہ مجھے بتاؤ کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم میری بات مان لو گے انہوں نے کہا کہ بالکل مانیں گے ہم تو بار بار آپ کو آزمائے بیٹھے ہیں ہم نے تو آپ کے اندر سوائے سچائی کے کچھ دیکھا ہی نہیں مطلب ان کا یہ تھا کہ اگرچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس پہاڑ کے پیچھے کچھ نہیں ہے، اس کے دامن میں کوئی لشکر نہیں ہے جو ہم پہ حملہ کرے لیکن اگر آپ ہمیں یہ کہیں گے کہ یہاں کوئی لشکر ہے جو تمہارے اوپر حملہ کرنا چاہتا ہے تو ہم پھر بھی آپ کی تصدیق کر دیں گے کیونکہ آپ سچ ہی بولتے ہیں جھوٹ نہیں بولتے ہیں، حضور ﷺ کی یہ گفتگو خاندان والوں کے ساتھ ہوئی تھی پھر آپ ﷺ نے جب آخرت یاد دلائی، توحید کی دعوت دی تو پھر وہ بدک گئے تو آپ ﷺ نے ابتداء اپنے خاندان سے کی تھی، اپنے اقرباء سے کی تھی جس طرح انذار کی ابتداء اقرباء سے ہے تو اسی طرح لڑائی اور جہاد بھی پہلے اقرباء کے ساتھ ہوگا "يَلُوْنَكُمْ" کے مفہوم میں دونوں باتیں آسکتی ہیں قرب مکانی بھی اور قرب نسبی بھی، لڑو ان کافروں کے ساتھ جو تمہارے قریب ہیں اور چاہیے کہ تمہارے اندر وہ سختی محسوس کریں "وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ" اور اس بات پہ ہمیشہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد متقین کے ساتھ ہے۔

اللہ کی آیات سے کسی کا ایمان بڑھتا ہے تو کسی کا کفر:

"وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ" اب یہ پھر منافقین کا تذکرہ ہے، آخر میں جا کے پھر انہی کی بات کی جا رہی ہے کہ جس وقت کوئی سورۃ اترتی ہے اور اس کے اندر کچھ احکام ہوتے ہیں، کچھ مطالبے ہوتے ہیں تو ان میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے کہ کون ہے تم میں سے جس کو اس سورۃ نے بڑھا دیا ہے ازروئے ایمان کے، یہ بات بطور استہزاء کے ہوتی تھی اس طرح کہہ کے بات کا وزن ہلکا کیا جاتا ہے صراحتاً تو وہ مخالفت نہیں کر سکتے تھے لیکن اس قسم کی باتوں کے ساتھ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مؤمنوں کے لیے تو ہر سورۃ ہی ایمان میں زیادتی کا باعث ہے کیونکہ اس میں جو باتیں بھی اترتی ہیں کسی میں کسی شک وشبہ کا ازالہ ہوتا ہے، کسی میں کوئی نیا حکم آ گیا، کسی

میں اللہ تعالیٰ نے کوئی اور بات واضح کر دی جتنا سن کے مانتے جائیں گے اتنا ایمان بڑھتا چلا جائے گا، ایمان میں پختگی آتی چلی جائے گی، ایمان کا مزہ دوبالا ہوتا چلا جائے گا، ایمان والوں کے دل میں تو یہ آیات ایمان کا اضافہ کرتی ہیں۔

اور جن کے دلوں میں پہلے سے مرض ہے ان کے دل میں پالیدگی موجود ہوتی ہے اور اس پالیدگی کے اوپر اور پالیدگی جو آتی ہے تو اس پالیدی کے اندر اور اضافہ ہو جاتا ہے جیسے صاف ستھری زمین پہ بارش ہو تو یہ بارش اس کے لیے حیات کا باعث ہے اور اگر کوئی مردار پڑا ہے تو اس کے اوپر جتنی بارش ہوگی بدبو کے اندر اتنا ہی اضافہ ہوگا تو یہ بھی اس طرح ہیں کہ جس وقت کوئی سورۃ اترتی ہے، ان کے لیے انقباض کا باعث بنتی ہے، نئے احکام آتے ہیں ان کی یہ تکذیب کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا کفر دن بدن بڑھتا چلا جاتا ہے، نجاست پہ نجاست چڑھتی چلی جاتی ہے، اچھی غذاء کسی صحت مند کو دو گے تو دن بدن اس کی صحت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، قوت میں اضافہ ہوتا جائے گا اور اگر کوئی معدہ کا مریض ہے اور اس کو اچھی غذاء کھلا دو تو وہی غذا اس کے لیے موت کا باعث بھی بن سکتی ہے اس لیے اس کی بیماری میں اضافہ ہو جائے گا تو ایسے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو آیات اترتی ہیں وہ مؤمن کے لیے ایمان کا باعث بنتی ہیں اور ان کے اعمال میں قوت پیدا ہوتی ہے لیکن جن کے دلوں میں مرض ہے، نفاق ہے ان کی پالیدی پر پالیدی چڑھتی چلی جاتی ہے "مَاتُوْا وَهُمْ كَافِرُوْنَ" مر جائیں گے اس حال میں کافر ہوں گے، یہی بیماری ان کے لیے جان لیوا ثابت ہو جائے گی موت تک ان کو ایمان نصیب نہیں ہوگا قلب کے اندر صلاحیت ہو تو اللہ تعالیٰ کی آیات ایمان کا باعث بنیں گی اور اگر قلب کے اندر صلاحیت نہیں ہے تو وہی آیات مزید کفر کا باعث بن جاتی ہیں۔

آگے ان کے حال پہ ایک قسم کا افسوس ہے کہ یہ دیکھتے نہیں کہ ان کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے ہر سال ایک مرتبہ یا دو مرتبہ، مختلف قسم کے واقعات ان کے اوپر آتے ہیں جو ان کے لیے آزمائش بنتے ہیں تو اگر ان کی فطرت سلیم ہوتی تو کسی واقعہ سے سمجھ جاتے کہ اللہ کی طرف سے ہمیں سزاء ہوگئی، اللہ کی طرف سے ہمیں امتحان میں ڈال دیا گیا تو یہ سمجھنے کی کوشش کریں لیکن یہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہی نہیں ہیں کوئی واقعہ آجائے یا کوئی آزمائش آجائے تو نہ یہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور نہ ہی یہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

توبہ اصل کے اعتبار سے دل کا فعل ہے، اللہ کی طرف متوجہ ہونا، یہ توبہ اور استغفار دو لفظ جو آپ بولا کرتے ہیں ان کے اندر فرق یہی ہے کہ استغفار زبان سے ہوتا ہے اور توبہ قلب سے ہوتی ہے، دل اللہ کی طرف متوجہ

ہو جائے اور زبان سے معافی مانگی جائے جب یہ دو باتیں ہو جاتی ہیں تو گویا کہ انسان پوری طرح اللہ کے سامنے نادم ہو جاتا ہے اور پھر اللہ کی طرف سے گناہ کی معافی ہو جاتی ہے جس طرح ایمان ہے کہ دل سے تصدیق بھی ہوگئی اور زبان سے اقرار بھی ہوگیا اسی طرح قلب میں ندامت بھی اور زبان سے استغفار بھی ہوگیا تو توبہ مکمل ہوگئی۔

تذکر عقل کے ساتھ ہوتا ہے کہ نصیحت حاصل کریں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کے دل و دماغ دونوں خراب ہیں یہ واقعات جو انسان کو ہوشیار کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں ایک آدمی غفلت سے چلا جا رہا ہے اور اس کو ٹھوکر لگتی ہے تو عقلمند آدمی فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ میری غفلت کا نتیجہ ہے آئندہ میں آنکھ کھول کے چلوں گا کہ کہیں پھر ٹھوکر نہ لگ جائے سمجھدار آدمی تو یوں کرتا ہے، ہر ٹھوکر سے وہ سبق حاصل کرتا ہے لیکن جس کے دل و دماغ کی صلاحیتیں ہی برباد ہو چکی ہوں تو وہ گڑھے میں بھی گر جائیں انہوں نے پھر بھی آنکھیں بند کر کے ہی چلنا ہے ان کا حال ایسے ہی ہے کہ ان کے اوپر واقعات آتے ہیں اگر یہ سنبھلنا چاہیں تو سنبھل سکتے ہیں، اگر یہ عقل حاصل کرنا چاہیں تو یہ واقعات ان کو سمجھانے کے لیے کافی ہیں لیکن نہ ان کے دل ٹھیک ہیں اور نہ ان کے دماغ ٹھیک ہیں نہ یہ توبہ کرتے ہیں اور نہ یہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

نیک مجلسوں سے منافقین کی بیزاری کا حال:

اور نیک باتوں سے ان کی بیزاری ایسی ہے کہ جس وقت کوئی سورۃ اترتی ہے، اس بات کو ذرا سمجھ لیجیے، کسی مجلس کے اندر آپ بیٹھے ہوں اور وہاں آپ کی مرضی کے خلاف باتیں ہونے لگ جائیں یا کوئی اس قسم کا مطالبہ شروع ہو جائے اس کی سب سے واضح مثال یہ ہے کہ یہ ہمارے بھائی جو تبلیغ کرتے ہیں یہ جب کسی وقت لوگوں کو مسجد میں اکٹھا کر لیتے ہیں اور وعظ و نصیحت کرتے ہیں لیکن بعض لوگ پھنسے پھنسائے آ جاتے ہیں اور جس وقت ان کی طرف سے چلے کا مطالبہ شروع ہوتا ہے تو ان لوگوں کے دلوں پہ بڑا ناگوار گزرتا ہے وہ جس وقت اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو وہ کتنی اچھی بات کی دعوت دیتے ہیں لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ بات جن کی مرضی کے خلاف ہے وہ ایک دوسرے کی طرف جھانکیں گے اور آنکھوں آنکھوں میں ہی باتیں کر لیں گے اور ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جس کی وجہ سے ہم آئے ہیں وہ ہمیں دیکھ تو نہیں رہا ہے کہ اس موقع پہ یہ کھسک گئے تھے اور بعد میں ہمیں الزام دے تو یہ ساری باتیں آنکھوں میں طے کر کے آہستہ سے کھسک جاتے ہیں یہ بھی اسی طرح تھے حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھے ہوتے کوئی سورۃ اترتی جس میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا مطالبہ ہوتا، جہاد کا مطالبہ ہوتا یا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جماعت کو جہاد کے لیے ممتاز کرنا چاہتے تو یہ سمجھتے کہ کہیں یہ ذمہ داری ہم پہ نہ آجائے تو ایک دوسرے سے آنکھیں لڑاتے ہیں، آنکھوں آنکھوں میں باتیں کر کے پھر کھسک جاتے ہیں۔

قرآن کریم میں دوسری جگہ ان کے طرز عمل کو اس طرح ذکر کیا گیا ہے "یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا" ایک دوسرے کی اوٹ لے کے مجلس سے نکل جاتے ہیں، آپ جب اپنی مجلسوں کے اندر دیکھو گے تو اس قسم کے افراد اب بھی تمہیں نظر آئیں گے کہ جب بھی کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے تو آنکھوں آنکھوں میں پروگرام طے کر لیتے ہیں اور چپکے سے نکلنا شروع کر دیتے ہیں اور یہی منافقوں کا حال ہے کہ یہ آپ کی مجلس میں آتے ہیں مؤمن تو آپ کی طرف متوجہ ہو کے بیٹھیں گے، دل کے دروازے کھول کے بیٹھیں گے تا کہ باتیں سیدھی دل میں جائیں اور یہ ایسے ہیں کہ جب کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے تو یہ ایک دوسرے کے ساتھ آنکھیں لڑاتے ہیں اور بچ بچا کے مجلس سے نکل جاتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ کیا اٹھ کے گئے "صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ" اللہ نے ان کی قلوب کو ہی چکر دے دیا، ان کے دلوں کو ہی پھیر دیا اس وجہ سے کہ یہ سمجھدار نہیں ہیں کہ ہمیں ہمارے نفع کی طرف بلایا جارہا ہے یا نقصان کی طرف بلایا جارہا ہے، پس اپنی شہوات پہ چلنے والے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ہی پھیر دیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نرمی اور رحم دلی کے متعلق منافقین کو خطاب:

سورۃ کے آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کو واضح کیا جارہا ہے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت اور عقیدت واضح ہو جائے اور اس عقیدت اور محبت کی وجہ سے اطاعت آسان ہو جائے منافقین کا جذبہ یہ تھا کہ وہ (نعوذ باللہ) اللہ کے رسول کو اپنے لیے ایک مصیبت سمجھتے تھے کہ یہ آگئے اور کبھی کوئی مطالبہ کر لیتے ہیں، کبھی کوئی مطالبہ کر لیتے ہیں، اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے جو اللہ نے تم پر کیا ہے اس نعمت کی قدر پہچانو، یہ ہر وقت تمہارے نفع کی باتیں کرتے ہیں، تمہارے نفع کے بارے میں حریص ہیں، تم کسی مشقت میں پڑو ان کو بڑا ناگوار گزرتا ہے اس قسم کے خیر خواہ اور دل سوزی کرنے والے کو انسان اگر یہ سمجھے کہ یہ ہمارے لیے مصیبت ہے تو اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ منافقین کے جذبات کے خلاف بات کہی جارہی ہے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کو پہچانیں اور اس منصب کو پہچاننے کے بعد آپ کی اطاعت کریں۔

تمہارے پاس رسول آگیا تم میں سے ہی جو جنس بشر میں سے ہے، عربوں میں سے ہے جس کی عادات

اور حالات سے تم اچھی طرح واقف ہو اور ایسے کے ساتھ مانوس ہونا اور عقیدت لگانا آسان ہوتا ہے، تمہارا مشقت میں پڑنا اسے بہت گراں گزرتا ہے، اتنا ہمدرد اور اتنا خیر خواہ ہے کہ مشقت میں تم پڑتے ہو، کوئی تکلیف تمہیں پہنچنے والی ہے اور ناگواری انہیں ہو رہی ہے، بوجھ ان کے اوپر پڑ رہا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مثال بیان فرمائی کہ میرا حال تو اس شخص کی طرح ہے کہ جس نے آگ جلائی اور آگ جلانے کے بعد پتنگے اس میں گر رہے ہیں اور وہ شخص پکڑ پکڑ کے ان کو بچاتا ہے کہ تم آگ میں نہ گرو ایسے ہی میں تمہیں سمجھاتا ہوں اور تم دوڑ دوڑ کے آگ کی طرف جاتے ہو "حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ" تمہارے نفع کے لیے حریص ہے، ہر وقت فکر رکھتے ہیں کہ تمہیں نفع کی طرف لے جائیں، تمہارے بھلے کی فکر کرتے ہیں خصوصیت کے ساتھ مؤمنین کے ساتھ بہت ہی نرمی کرنے والے ہیں اور بہت ہی رحم کرنے والے ہیں یہ خطاب تو مؤمنین کو کیا کہ تمہیں چاہیے کہ ایسے رسول کی مدد کرو۔

اور آگے رسول اللہ ﷺ کو کہہ دیا گیا کہ اگر یہ پیٹھ پھریں اور آپ کی بات یہ نہ مانیں، آپ کی طرف متوجہ نہ ہوں تو آپ کو بھی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کہہ دیجیے کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ عرش عظیم کا رب ہے، آپ پھر یہ کہہ دیجیے تاکہ ان کو پتہ چل جائے کہ اگر ہم ان کی پرواہ نہیں کرتے تو یہ بھی ہماری پرواہ نہیں کرتے۔

فائدہ:

" لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ " سے لے کر آخر تک یہ آیات نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیات ہیں ان کے بعد پھر کوئی آیات نہیں اتریں اور پھر یہ آخری الفاظ جو ہیں "حَسْبِیَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ" اس کی فضیلت بھی حدیث شریف میں بہت آتی ہے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے اور ابوداؤد شریف میں مذکور ہے کہ جو شخص ان الفاظ کو صبح و شام سات مرتبہ پڑھتا رہے اللہ تعالیٰ اس کے تمام ہموم و غموم کے لیے کافی ہو جاتے ہیں۔

" سبحانك اللهم و بحمدك اشهد ان لا اله الا انت استغفرك واتوب اليك "

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
قال اللہ تعالیٰ فی القرآن المجید
ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین
صدق اللہ العظیم
محمد باپ نہیں کسی کا تمھارے مردوں میں سے، لیکن رسول ہے اللہ کا اور مُہر سب نبیوں پر
قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
انا خاتم النبیین لا نبی بعدی
میں "خاتم النبیین" ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں
دارالنفائس

بسم اللہ الرحمن الرحیم
اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد
کما صلیت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم
انک حمید مجید
اللھم بارک علی محمد وعلی آل محمد
کما بارکت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم
انک حمید مجید

هو
الحي
القيوم
کل نفس ذائقة الموت
صدق الله العظيم
قال الله تعالیٰ
القرآن الحکیم